تفسیر مکی

جلد دوم

استاذ العرب والعجم محدث و شیخ
حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ



تفسیرِ مکی

جلد 2

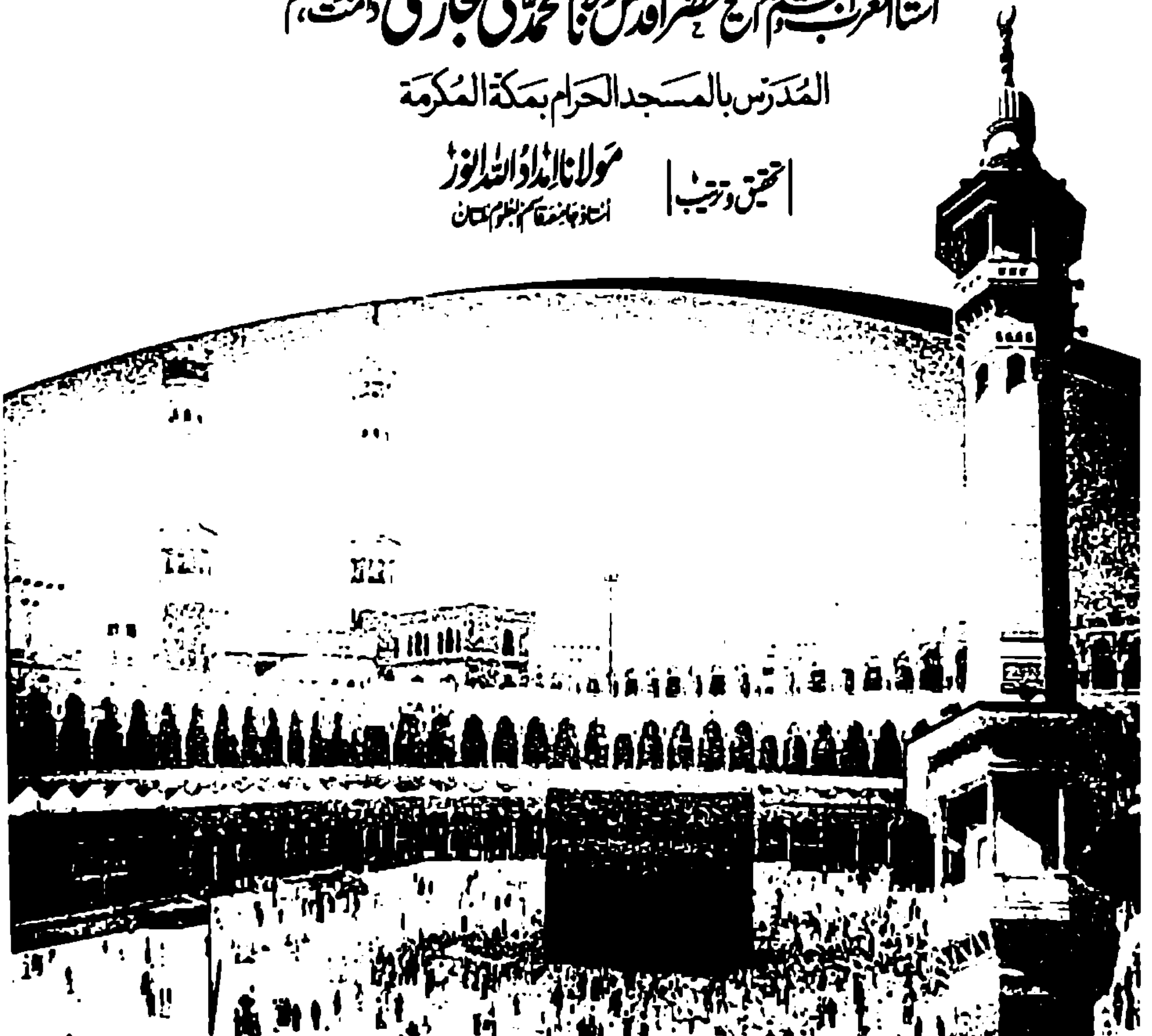
اُستاذ العرب والعجم فضیلۃ الشیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم

المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ

تحقیق و ترتیب

مولانا امداد اللہ انور

اُستاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان





نام کتاب — تفسیر مکی جلد 2

صاحب خطبات — نائب الخطیب بالمسجد الحرام شیخ حضرت اقدس مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم
المدرس بالمسجد الحرام بمکۃ المکرمۃ

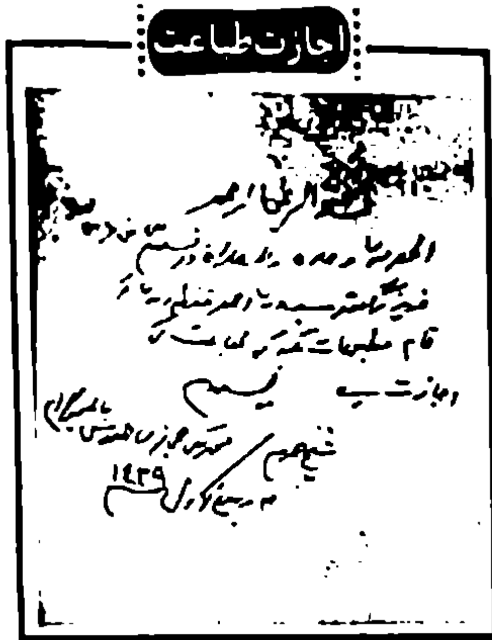
تحقیق و ترتیب — مولانا امداد اللہ انور
استاذ جامعہ قاسم العلوم ملتان

کمپوزنگ — دارالتصنیف معہد الفقیر الاسلامی جھنگ

اشاعت اول — فروری 2019ء

تعداد — 1100

اجازت طباعت





ناشر

مکتبۃ الفقیر

www.Tasawwuf.org

0300-9652292,03228669680

0335-7873390,03101702690

E-Mail : Alfaqeerfsd@yahoo.com

بسم الله الرحمن الرحیم

فہرست مضامین



تفسیر سورۃ البقرۃ 31

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

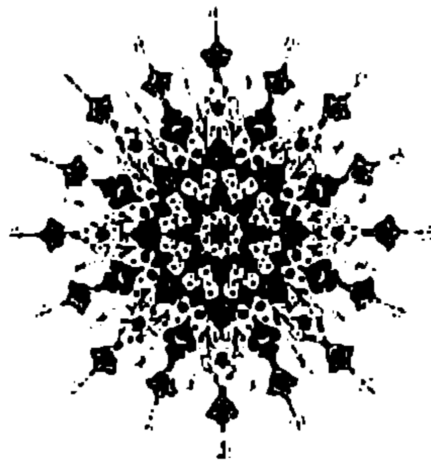
فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین





عرضِ ناشر

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: 1 ...... بیت اللہ، 2 ...... کتاب اللہ، 3 ...... اہل اللہ۔

اور اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھچ آنا امر بدیہی ہے، جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درسِ قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، رمضان ہو یا شوال، حج کا موسم ہو یا عمرے کا، حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کا درسِ قرآن مسجدِ حرام میں بلا ناغہ ہوتا ہے۔ مسجد حرام میں دوسرے مشائخ کے دروس بھی ہوتے ہیں، تاہم جس کثرت سے اور ذوق شوق سے لوگ حضرت مکی مدظلہ کے درس میں شرکت کرتے ہیں، دوسرے دروس میں یہ کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ چنانچہ برصغیر پاک و ہند، بلکہ پوری دنیا میں جہاں بھی اردو دان طبقہ حرم شریف میں آتا ہے، حضرت مکی مدظلہ کے درس سے مستفید ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد مکی مدظلہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحیدِ خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں وہاں عشقِ رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمالِ مہارت سے سامعین کو راہِ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔

حضرتِ اقدس کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستگی، فکرِ آخرت، اخلاص وتقویٰ، اخلاقِ حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر تفسیر ''انوار الحرم'' المعروف ''تفسیرِ مکی'' حضرتِ اقدس کے چند دروس کا مجموعہ ہے۔ جسے اس سے قبل اک اور ادارہ نے شائع کیا تھا اب اسے حضرت اقدس ہی کے حکم پر ''مکتبۃ الفقیر'' شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

اللہ رب العزت اس کتاب اور ''مکتبۃ الفقیر'' دونوں کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین ﷺ

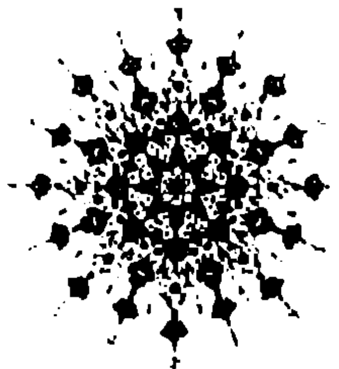
اجازت ہو تو آ کر میں بھی شامل ان میں ہو جاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجومِ عاشقاں ہو گا

قارئینِ کرام! گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی، کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لیے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تا زیست اپنی رضا کے لیے یہ خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور اسے ہماری آخرت کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔

دعاؤں کا طالب:

فقیر سیف اللہ احمد نقشبندی مجددی

مکتبۃ الفقیر



تفسیر سورۃ البقرۃ

رُکُوْعَهَا ۴۰	سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ مَدَنِیَّۃٌ	آیَاتُهَا ۲۸۶

سورۃ البقرۃ مدینہ میں اتری، اس میں ۲۸۶ آیات ہیں اور ۴۰ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اللہ کے نام سے شروع جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

الٓمٓ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ ۚ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ②

الٓمٓ۔ اس کتاب میں (جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے ہیں) کوئی شک نہیں (خدا کے فرمانبردار) ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔

مکی مدنی سورتوں کی پہچان کا ضابطہ:

سورۃ البقرۃ ان سورتوں میں سے ہے جو "سُوَرِ مدنیہ" کہلاتی ہیں۔ یعنی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد نازل ہوئیں۔ جمہور کے نزدیک یہی قول راجح ہے کہ جو سورتیں ہجرت سے قبل نازل ہوئی ہیں وہ "مکی سورتیں" کہلاتی ہیں اور جو سورتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں وہ "مدنی سورتیں" کہلاتی ہیں۔ [الدر المنثور للسیوطی: ۶/ ۳۲۵، علوم القرآن، ص: ۶۰]

سورۂ بقرہ کے بنیادی مضامین:

سورۃ البقرۃ میں جو بنیادی مضمون ہیں وہ اثباتِ توحید، اثباتِ رسالت، اثباتِ معاد اور ان کے علاوہ دوسرے معاملات بھی ہیں، عبادات بھی اور ایمان کے بارے میں اجمالی طور پر بھی اور تفصیلی طور پر بھی تذکرہ ہے۔

سورۂ بقرہ میں بعض مکی آیات:

سورۂ بقرہ حضور ﷺ کی ہجرت کے فوراً بعد نازل ہوئی، لیکن اس کی چند آیات مبارکہ ایسی بھی ہیں جو ہجرت کے بعد مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہیں۔ جب میرے آقا ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ تشریف لے آئے تو اس وقت بعض آیات نازل ہوئیں، حتیٰ کہ اس سورت مبارکہ کی آیت ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ [البقرۃ:۲۸۱] منیٰ میں نازل ہوئی اور حضور ﷺ اس کے بعد ۸۰ دن یا ۹۰ دن زندہ رہے۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۳۵،البقرۃ]

''بقرۃ'' نام کیوں؟

اس سورت کا نام ''سورۃ البقرۃ'' ہے۔ یاد رکھیں کہ سورت کے اندر جو قصہ اور واقعہ ذکر کیا گیا ہوا کثر اسی کی نسبت سے اس سورت کا نام رکھ دیا جاتا ہے۔

سورۂ بقرہ میں احکام کی تعداد:

ایک ہزار اوامر ہیں۔ ''امر'' کہتے ہیں کہ اللہ نے جو حکم دیا ہے کہ یہ کام کرو۔ اور ایک ہزار منہیات ہیں اور حکمتوں میں سے بھی ایک ہزار حکمتیں ہیں اور قصص اور اخبار میں سے بھی ایک ہزار قصص واخبار ہیں۔ بڑا حسنِ اتفاق ہے۔ اس لیے حکم آیا، حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

''جس شخص نے سورۂ بقرہ کو پڑھا، اس کو سمجھا اور اس کو یاد کیا، اس کے لیے رحمت و برکت ہے اور جس نے چھوڑا اس کے لیے حسرت اور بد نصیبی ہے۔'' [صحیح مسلم، حدیث:۸۰۴، باب: فَضْلِ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ]

اس سورت مبارکہ کی عظمت کا اس سے اندازہ کریں کہ حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس سورت کو بارہ سال میں پڑھا ہے اور ان کے بیٹے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے آٹھ سال میں سیکھا ہے۔

[تفسیر القرطبی:۱/۵۲، سورۃ البقرۃ، تحت: الْكَلَامُ فِي نُزُولِهَا وَفَضْلِهَا وَمَا جَاءَ فِيهَا]

سورۂ بقرہ کی بعض آیات کے فضائل وخواص:

احادیث مبارکہ میں سورۂ بقرہ کی بڑی بڑی فضیلتیں آئی ہیں کہ اس کے پڑھنے والے پر اہلِ باطل کبھی قابو نہیں پا سکیں گے۔ [صحیح المسلم، حدیث:۸۰۴، باب: فَضْلِ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ وَسُوْرَةِ الْبَقَرَةِ]

علامہ قرطبی نے لکھا کہ اہلِ باطل سے مراد جادوگر اور ساحر ہیں[1] کہ جو آدمی سورۂ بقرہ کو پڑھتا ہوگا اور خصوصی طور پر اس کی ابتدائی چار آیتیں اور اسی طرح اس کی درمیانی آیات یعنی آیۃ الکرسی اور آیۃ الکرسی کے بعد والی دو آیات کہ ان کو بھی ساتھ پڑھا جائے۔ یعنی ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [البقرة:۲۵۶] تک اور سورت کی آخری تین آیات ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ [البقرة:۲۸۴ تا ۲۸۶] تک پڑھی جائیں تو سبحان اللہ، وگرنہ سورت کی آخری دو آیات کو روزانہ رات کو پڑھ لیا جائے۔ [تفسیر القرطبي:۱/ ۵۲ سورة البقرة، تحت: الكلام في نزولها وفضلها وما جاء فيها]

سورۂ بقرہ کے نام:

حدیث مبارکہ میں ہے کہ اس سورت کا نام "سِنَامُ الْقُرْآن" ہے یعنی قرآن مجید میں سورۂ بقرہ اونٹ کی کوہان کی طرح بلند مقام رکھتی ہے۔ [سنن الترمذي، حديث: ۲۸۷۸، باب: ما جاء في فضل سورة البقرة]

ایک اور حدیث میں ہے کہ یہ سورۃ "سِنَامُ الْقُرْآن" اور "ذِرْوَةُ الْقُرْآن" ہے۔

[المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۵۱۱]

ربطِ سورت:

سورۂ فاتحہ میں اللہ کی حمد و ثناء، ربوبیت اور اللہ کی تمجید، پھر اثباتِ صفات اور پھر اثباتِ معاد اور پھر اقرارِ عبودیت، پھر اقرارِ طلبِ استعانت اور سب سے آخر میں دعا تھی:

[1]......[تفسیر القرطبي:۱/ ۵۲ سورة البقرة، تحت: الكلام في نزولها وفضلها وما جاء فيها]

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝﴾

[الفاتحۃ:۵،۷]

اللہ سے ہم نے دعا مانگی کہ ہمیں سیدھی راہ دکھلا دیجیے اور راہ ان لوگوں کی جن پر آپ نے انعام فرمایا، نہ ان کی جن پر آپ نے غضب کیا اور نہ ان کی جو گمراہ ہوئے۔ اور اس کے بعد ہم نے کہا ''آمین'' کہ اے اللہ! ہماری یہ دعا قبول و منظور فرما۔

فرمایا کہ صراط مستقیم کی جو تم نے دعا مانگی تھی میں نے منظور فرمائی اور اگر اس کا جواب ڈھونڈ نا ہے تو سورۂ بقرہ پڑھو۔ [تفسیر روح المعانی:۱/۸۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ]

حکایت:

ہمارے ہاں بلوچ قوم کے اندر ایک عجیب رسم و رواج ہے! اور آج تک ہے کہ مثلاً اگر کوئی قتل ہو جائے اور اس قتل کا کسی فرد پر، کسی گروہ پر یا کسی جماعت پر الزام لگ جائے اور وہ کہیں کہ ہم بے گناہ ہیں اور مدعی کہیں کہ انہوں نے ہی قتل کرایا ہے تو پھر یہ آگ جلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس پر چلو۔ اگر آپ بے گناہ ہیں تو آپ کو آگ نہیں جلائے گی اور اگر آپ گناہ گار ہیں تو آپ جلیں گے۔ اور وہ چلتے ہیں تو بے گناہ کو کچھ نہیں ہوتا۔

اتباعِ سنت کی مثال...... حکایت:

جب ایک دفعہ اللہ نے مسلمانوں کو عظمت بخشی اور قیصر و کسریٰ کے علاقے فتح ہو گئے، قیصر روم کا علاقہ فتح ہو گیا تو جو صحابی مسلمانوں کے امیر اور انچارج تھے جب ان کی خدمت میں کھانا لایا گیا تو حضرت نے اپنے ہاتھ سے کھانا شروع کیا اور کھانے کے دوران آپ کے ہاتھوں سے گوشت کا ایک ٹکڑا گر گیا تو حضرت نے اٹھایا اور صاف کیا اور کھالیا۔ تو جو بادشاہوں کے غلام کھڑے تھے انہوں نے کہا: ''یہ آپ نے کیا کر دیا؟ آپ ایک متمدن ملک میں آگئے ہیں اور یہاں پر یہ بہت بڑا عیب ہے کہ آدمی اپنے ہاتھ سے چیز کھائے، آپ نے چمچ بھی استعمال نہیں کیا، آپ نے چھری، کانٹا بھی استعمال نہیں کیا اور پھر اتنا چھوٹا سا ٹکڑا گر گیا تو اس کو ختم کریں اور جانے دیں۔ یہاں بڑی بے عزتی کی بات ہے اور توہین آمیز بات ہے کہ آدمی اس کو اٹھائے اور جھاڑے، پھر اس کو کھالے۔ تو وہ صحابی بہت غصہ میں آگئے اور فرمایا:

''ءَ أَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيْبِيْ لِهٰؤُلَاءِ الْحَمْقٰى؟'' [ملفوظات حکیم الامت:۲/۲۲۲، ملفوظ:۳۱۲]

''کیا ان احمق لوگوں کی وجہ سے میں اپنے پیارے نبی ﷺ کی سنت کو چھوڑ دوں؟''

کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنا:

سائنس اس تحقیق کو پہنچی ہے کہ انگلیوں کا چاٹنا صحت کے لیے کتنا مفید ہے۔ اب انہوں نے اتفاق کرلیا ہے کہ جو لوگ کھانے کے بعد اس طرح کا عمل کرتے ہیں ان کے معدہ کے اندر کبھی کینسر پیدا نہیں ہوگا اور کبھی السر نہیں ہوگا۔

الٓمّٓ

حروفِ مقطعات:

اس سورۂ بقرہ کی ابتداء حروفِ مقطعات سے کی گئی ہے۔ اور حروفِ مقطعات کا معنی ہے کہ علیحدہ علیحدہ حرف۔ آپ قرآن کو ملا کر پڑھتے ہیں ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ①﴾ [الفاتحہ: ۱] یہاں آپ نے 'الف' کو، 'لام' کو، 'حاء' کو، 'میم' کو اور 'دال' کو ملا دیا۔ اور الٓمّٓ علیحدہ علیحدہ ہیں، جیسے فرمایا: حٰمٓ یا جیسے: قٓ یا الٓمّٓصٓ۔ یہ حروفِ مقطعات ہیں۔ یہ مقطعات کیا ہیں؟

❀.....بعض علماء فرماتے ہیں کہ ان سورتوں کے اندر جو مضمون ہوتا ہے ان کا خلاصہ ان الفاظ کے اندر چھپا ہوتا ہے یعنی اس سورت کے اندر جو مضامین توحید و رسالت، معاد، معاملات، عبادات اور معاشیات کے آرہے ہیں تو ان کا خلاصہ پہلے لفظوں کے اندر موجود ہے۔ چونکہ ہر آدمی اس باریک بات کو نہیں سمجھ سکتا اس لیے فرمایا: وہاں تک صرف علماء کی رسائی ہوتی ہے، عام آدمی کی رسائی نہیں ہوتی۔

❀.....اور بعض علماء نے فرمایا: سُوَر (سورتوں) کے جو نام ہیں ان حروف سے ان سورتوں کے ناموں کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

❀.....اور بعض علماء نے فرمایا: اللہ کے جتنے نام ہیں مثلاً: کہیں آیا ''الف'' تو اس سے مراد ''اللہ'' ہو گیا اور کہیں آیا ''میم'' تو اس سے اس کی صفتِ ''منان'' کی طرف اشارہ ہے۔ کہیں آیا ہے ''الرٰ'' تو اس سے رحمان اور رحیم کی صفت طرف اشارہ ہے۔ اور کہیں آیا ''حٰمٓ'' تو انہوں نے کہا ''حاء'' سے حمید کی صفت کی طرف اشارہ ہے اور ''میم'' سے مجید کی صفت کی طرف اشارہ ہے۔ تو اللہ کے جتنے اسماء ہیں ان کی طرف اشارہ ان حروف میں ملتا ہے۔

❀.....لیکن یاد رکھیں! جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم، جمہور تابعین اور جمہور مفسرین رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ حروفِ مقطعات اَسرار

ہیں، راز ہیں، اللہ کے سوا ان کا علم کسی کو نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۵، ۳۶، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: الٓمٓ]

......اور بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو ان حروف کا علم دیا، لیکن انہیں آگے تبلیغ اور بیان کرنے کا حکم نہیں تھا، جیسا کہ حضور ﷺ کو منافقین مدینہ کے نام بتلائے گئے، لیکن حکم یہ تھا کہ آپ اس کو زیادہ نہیں کھولیں گے۔ آپ نے صرف ایک صحابی حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو بتلائے۔

حروفِ مقطعات کا معنی معلوم نہیں تو نزول کا کیا فائدہ؟

سوال: حروفِ مقطعات کا ترجمہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تو اس کا قرآن میں نزول کا کیا فائدہ ہوا؟

جواب: یہ دراصل ان کا جہل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً: میں اگر کتاب لکھوں اور ان میں کچھ حروف ایسے لکھ دوں جن کا کوئی مطلب نہ ہو تو یہ واقعی بے فائدہ بات ہے ہے، لیکن اللہ کے کلام کا فائدہ ہے کہ جب ہم پڑھیں گے تو ہمیں ہر حرف پر ایک نیکی مل رہی ہے۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ جب قرآن کا ایک حرف پڑھا جائے تو دس نیکیاں نصیب ہوتی ہیں۔ پھر میرے پاک نبی ﷺ نے مثال بتلائی: ''الٓمٓ'' کو یہ نہ کہو کہ ''الٓمٓ'' ایک حرف ہے، بلکہ ''أَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيمٌ حَرْفٌ'' کہ ''الف'' علیحدہ حرف ہے، ''لام'' علیحدہ حرف ہے اور ''میم'' علیحدہ حرف ہے۔ جس نے ''الٓمٓ'' پڑھا تو اس کی تیس نیکیاں ہو گئیں۔ تو اس کے اندر فائدہ ہے۔ لہٰذا اللہ کا کلام بے فائدہ کیسے ہوا؟ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۹۱۰، باب: مَا جَاءَ فِيمَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِنَ الْقُرْآنِ...]

ایک بات یاد رکھو کہ ایمان بالغیب کی کتنی بڑی اہمیت ہے۔ اگر میں کسی شے کو چھپائے رکھوں آپ کہیں: یہ کیا ہے؟ میں کہوں کہ عینک ہے۔ آپ اس کو مان لیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ میری بات پر ایمان لا رہے ہیں اور میری بات پر یقین کر رہے ہیں۔ تو اس کی اہمیت ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے قرآن میں کچھ ایسے حروف بھی رکھ دیے ہیں کہ جن پر ایمان بالغیب ہی ہو کہ اس کو بس اللہ جانتا ہے۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔

دوسرا اس کے اندر بہت بڑا معجزہ ہے۔ اللہ نے فرمایا: قرآن عربی، نبی بھی عربی، پڑھنے والے بھی عربی، لیکن جو میں نے نہیں سمجھانا چاہا اس کو کوئی نہیں سمجھ سکا۔ اس لیے جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم، علماء، جمہور مفسرین اور تابعین رحمہم اللہ کا راجح قول یہی ہے کہ جب آدمی حروفِ مقطعات پڑھے تو اس کے ذہن میں یہی رہے کہ اس کا حقیقی معنی اللہ جانتا ہے۔

بعض متاخرین علماء رحمہم اللہ نے اس کے کچھ جوابات بھی دیئے ہیں کہ ''الف'' سے مراد اللہ ہے، ''لام'' سے مراد جبرئیل ہے اور ''میم'' سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یعنی قرآن کو اللہ بھیجنے والا ہے، جبرئیل علیہ السلام لانے والے

اور جس پر قرآن اتارا گیا وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

[تفسیر الرازی: ۲/ ۲۵۲، سورۃ البقرۃ، فصل: ھَلِ الْمُرَادُ مِنَ الْفَوَاتِحِ مَعْلُوْمٌ؟]

امام محمد رحمہ اللہ کا جواب:

امام محمد رحمہ اللہ کو لوگوں نے عقلی سوال کے ذریعے سے پھنسانے کی کوشش کی کہ دنیا کا وسط اور سینٹر یعنی مرکزی نقطہ کہاں ہے؟...... اب یہ کتابوں میں تو نہیں ہے، آپ رحمہ اللہ نے عقل سے جواب دیا۔ لمبا چوڑا واقعہ ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ تشریف لائے، دیکھا کہ آج بادشاہوں کا بھی موڈ بگڑا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا: ''امام صاحب! گزارش یہ ہے کہ ہم آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس کا عقل سے جواب دیں۔'' کیونکہ وہ سوالات عقل سے کیے گئے ہیں۔ فرمایا: ''بتلائیں۔'' بادشاہ نے کہا: ''پوری دنیا کا سینٹر اور مرکز کہاں ہے؟'' امام محمد رحمہ اللہ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ کوئی عام آدمی تو نہیں تھے...... ان کے ہاتھ میں عصا تھا، انہوں نے وہیں دائرہ کھینچا اور درمیان میں عصا رکھ کر فرمایا: ''یہ ہے۔'' بادشاہ نے کہا: ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا: ''پیمائش کرالیں۔ اگر یہ جگہ نہ نکلے، یا غلط نکلے تو آپ مجھے سزا دیں۔'' اب پوری دنیا کی کون پیمائش کرائے......؟

اصحابِ کہف اور جنات کا علاج:

اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اصحابِ کہف کا قصہ آیا کہ کچھ نوجوان توحید والے تھے۔ اب ان کے نام نہ قرآن نے بیان کیے اور نہ حضور ﷺ نے بیان کیے، کیونکہ مقصود ایک واقعہ سنانا ہے۔ اب اس میں نام معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن لوگوں نے نام ڈھونڈ نکالے۔ کسی نے کہا: ان کے کتے کا نام ''مکسلمینا'' تھا یا ''کالمینا'' تھا۔ انہوں نے نام ڈھونڈے تو دوسروں نے کہا کہ ان ناموں میں اتنی برکت ہے کہ کسی کو جن پکڑے ہوئے ہو تو یہ نام لکھ کر اس کو دکھلا دو جن بھاگ جاتا ہے۔ سارا قرآن دکھا دو جن نہیں بھاگتا۔ خدا سے ڈرو! ہم کہاں جا رہے ہیں......؟

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ

کتاب اللہ کی حفاظت:

''ذٰلِكَ'' حالانکہ اشارہ بعید کے لیے ہوتا ہے اور قرآن تو قریب ہوتا ہے، لیکن اللہ نے فرمایا جو تم نے دعا مانگی

تھی ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ [الفاتحہ:۵]، اگر وہ ڈھونڈنی ہے تو وہ اس کتاب میں ملے گی۔

اور "ذٰلِكَ الْكِتَابُ" اور وہ کتاب اتنی شان والی ہے! اللہ کا کلام ہے، لوحِ محفوظ کے اندر ہے، آسمانِ دنیا کے اندر بیت العزت کے اندر محفوظ ہے۔ یعنی پہلے اس کو اللہ نے لوحِ محفوظ میں محفوظ کیا، پھر اس کو بیت العزت میں محفوظ کیا، پھر اس کو محمد مدنی ﷺ کے سینے میں محفوظ کیا اور پھر صدرِ مؤمنین میں ہے۔ اس کتاب کی چونکہ شان اتنی بڑی ہے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ [الفاتحہ:۵]

"ایک ایسی کتاب جس میں کوئی شک نہیں۔"

[روح المعاني:۱/۱۰۸، سورة البقرة: الآية: ذٰلِكَ الْكِتَابُ]

سورۂ بقرہ کے فضائل:

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے حضور ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سورۂ بقرہ کوہان ہے، اونچائی ہے۔ [مسند أحمد، احمد بن حنبل، حدیث:۲۰۳۰۰]

جیسے کوہان اعلیٰ چیز ہوتی ہے۔ ویسے تو اللہ کا سارا قرآن اعلیٰ ہے، اللہ کا کلام ہے، لیکن اس میں بعض سورتیں ایسی ہیں جن کو اللہ نے خصوصی فضیلت عطا فرمائی ہے۔

گھر میں سورۂ بقرہ پڑھنے کی برکت:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ۔" یعنی جس طرح قبروں میں جانے کے بعد تکلیف ختم ہوگئی، عبادت ختم ہوگئی، ہر چیز ختم ہوگئی۔ اپنے گھروں کے اندر قرآن پڑھا کرو۔ فرمایا: "جس گھر میں سورۃ البقرۃ پڑھی جاتی ہے اس گھر میں شیطان داخل نہیں ہوتا۔" امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

"حَسَنٌ صَحِيْحٌ." [سنن الترمذي، حديث:۲۸۷۷، باب: مَا جَاءَ فِي فَضْلِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ...]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس گھر کے اندر سورۂ بقرہ پڑھی جائے شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے۔" [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۲، سُورَةُ الْبَقَرَةِ: ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِهَا]

ضعیف روایت کی بعض اقسام:

اگر کسی راوی کے ضعیف ہونے کے بارے میں تمام علمائے جرح و تعدیل متفق ہوں تو اس کی حدیث قابل قبول نہیں۔ اور اگر بعض نے اس راوی کی توثیق کی ہو اور بعض نے انکار کیا ہو تو وہ قابل قبول ہے، کیونکہ اس کے ضعف میں سارے علماء متفق نہیں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جس گھر میں سورۃ البقرۃ پڑھی جائے شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔'' [سنن الدارمی، حدیث: ۳۴۱۸، باب: فِي فَضْلِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں تمہیں ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ آدمی اپنی ٹانگ کے اوپر ٹانگ رکھ کر بے پروا ہو کر بیٹھا رہے اور وہ سورۃ البقرۃ کی تلاوت نہ کرے۔ خبردار! سورۃ البقرۃ کی تلاوت کیا کرو، کیونکہ شیطان اس گھر سے دور بھاگتا ہے جس گھر کے اندر یہ پڑھی جاتی ہے۔ اور سب سے حقیر گھر وہ ہوتا ہے جس میں اللہ کا قرآن اور سورۃ البقرۃ نہ پڑھی جائے۔

[السنن الکبریٰ، حدیث: ۱۰۷۳۳، ذِكْرُ مَا يُجِيرُ مِنَ الْجِنِّ وَالشَّيَاطِينِ]

نبی علیہ السلام کے گھر کی عظمت:

یعنی گھر باعتبار بلڈنگ کے بڑا نہیں ہوتا، گھر تو باعتبار اللہ کی رحمت کے بڑا ہوتا ہے۔ جس گھر میں اللہ کے فرشتے اترتے ہوں، اللہ کے ملائکہ آتے ہوں۔ اب دیکھیں کہ ساری دنیا میں اگر چھوٹے گھر تھے تو میرے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تھے۔ یعنی ایک ایک کوٹھا (کمرہ) بنا ہوا اور آگے صحن اور دروازے بھی نہیں تھے، پردے کے لیے ٹاٹ لگے ہوئے تھے، لیکن اگر ساری دنیا کی بلڈنگیں اور محلات بھی اکٹھے کریں تو اس ایک کوٹھے کی قیمت نہیں بن سکتے جس میں محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مقابلہ کر سکتے ہیں......؟؟ جہاں اللہ کا نبی رہتا ہو، جہاں اللہ کی وحی آتی ہو، جہاں ازواج مطہرات رہتی ہوں اور جہاں چوبیس گھنٹے اللہ کا ذکر ہوتا ہو اصلی گھر تو وہی ہوتا ہے۔ بلکہ اللہ نے فرمایا:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿١٣﴾﴾ [الحجرات: ۱۳]

''اللہ کے ہاں بڑا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔''

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی عظمت:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ......جن کی ابھی روایت پڑھی ہے......ایک دفعہ مدینہ منورہ کے باغ کے اندر کھجور پر

چڑھ رہے تھے۔ایک صحابی نے دیکھا کہ ان کی پنڈلیاں بڑی باریک ہیں تو وہ ہنسنے لگا کہ دیکھو! کتنی باریک پنڈلیاں ہیں!! حضور ﷺ غصہ میں آ گئے، فرمایا: ''تمہیں پتہ ہے!؟ اگر قیامت کے دن ساری دنیا کو ایک طرف رکھا جائے اور دوسری طرف عبداللہ بن مسعود کی پنڈلیاں تو عبداللہ بن مسعود کی پنڈلیوں کا وزن بھاری ہو جائے گا۔'' یعنی اس کو اللہ نے اتنی شان عطا فرمائی ہے۔ظاہر کی طرف نہ جاؤ۔[دلائل النبوۃ: ۳۹۹/۶]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جس شخص نے سورۂ بقرہ کی دس آیات رات میں پڑھیں اس کے گھر کے اندر شیطان داخل نہیں ہوگا۔اور فرمایا کہ چار آیتیں اوّل سورۃ البقرہ سے، آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں اور تین آیتیں آخر سورۃ البقرہ کی۔یہ مجموعی دس آیتیں بن جائیں گی۔اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے قریب بھی شیطان نہیں جائے گا اور اس کے اہل کے قریب بھی شیطان نہیں جائے گا اور نہ اس کو کوئی ایسی چیز پیش آئے گی جو اس کو بری لگے، یعنی اللہ تعالیٰ اس کو جادو سے اور شیطان سے محفوظ رکھیں گے۔

[شعب الایمان، حدیث: ۲۱۸۸، ابن کثیر: ۳۲/۱، ۳۳ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ: ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِهَا]

اب دیکھیں کہ جب شیطان قریب ہی نہ آئے، گھر کے اندر داخل بھی نہ ہو اور شیطان اہل وعیال کے قریب بھی نہ بھٹکے تو آدمی مسائل سے بچ گیا، کید ومکر سے بچ گیا۔

فرمایا کہ یہ آیتیں کسی دیوانے پر بھی پڑھی جائیں جس کو جنون کا دورہ پڑ گیا ہو تو وہ بھی اُٹھ کر بیٹھ جائے گا، وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور پاک ﷺ فرماتے ہیں کہ ہر ایک چیز کی سنام ہے اور قرآن کی سنام سورۃ البقرہ ہے۔جس گھر کے اندر پڑھی جائے تو تین رات تک شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوگا اور اگر دن کو پڑھی جائے تو تین دن تک شیطان داخل نہیں ہوگا۔

[المعجم الکبیر، حدیث: ۵۸۶۴، تفسیر ابن کثیر: ۳۳/۱ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ: ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِهَا]

گھر سے شیطان کے نکل جانے کے بعد گناہ کیوں؟

اس لیے یاد رکھیں کہ بعض لوگ اشکال کرتے رہتے ہیں کہ جب شیطان نکل گیا، جب گھر میں سورۃ البقرہ پڑھی گئی، پھر بھی ہمارے گھر میں گناہ ہوتا ہے، ہمارے گھر میں برائی ہوتی ہے، پھر بھی ہمارے گھر میں منکرات ہوتے ہیں۔اس لیے بات سمجھیں کہ شیطان کا چلا جانا علیحدہ بات ہے، اور جو اثر ہم پر پہلے کر چکا ہے وہ باقی رہتا ہے۔

ایک آدمی انجیکشن لگوائے، سوئی نکل جائے، درد تو رہے گا۔ تو شیطان اتنے عرصہ سے ہمارے ساتھ دوستی بنا چکا ہے، اثرات تو رہتے ہیں۔ اسی طرح شیاطین الجن کے شیاطین الانس بھی ہیں، وگرنہ حقیقت کے اندر یہ بات ہوتی ہے کہ...... اللہ معاف فرمائے!!

ایک شخص نے واقعہ لکھا ہے کہ اس کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی تو اس دن اس علاقہ میں کوئی بزرگ، کوئی عالم آئے ہوئے تھے تو انہوں نے کہا کہ اس بچی کی تحنیک اس بزرگ سے کرالیں، اچھی بات ہے کہ بزرگ اور صالح بندہ ہے۔ تو وہ اس بچی کو لائے، تحنیک ہوگئی اور دعا بھی کردی۔ وہ بچی جب بڑی ہوئی تو اچھی نہ نکلی، اس کا کردار اچھا نہیں تھا۔ ایک دفعہ جب سب گھر والے اکٹھے ہوئے تو کہنے لگے کہ فلاں بزرگ اور اتنے بڑے عالم سے ہم نے تحنیک بھی کروائی، لیکن لڑکی خراب نکلی تو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہاں ایک سمجھدار آدمی موجود تھے، انہوں نے کہا کہ شکر کرو ان کی دعا کی وجہ سے اتنی رکی ہوئی ہے۔ اگر وہ نہ کرتے تو پتہ نہیں کہاں پہنچ گئی ہوتی!؟

اس لیے سورۃ البقرۃ پڑھنے سے شیطان کے اثرات سے ہم بچ جاتے ہیں۔ اگر نہ پڑھی جاتی تو خدا جانے ہمیں کیا کیا پیش آتا!؟ اس لیے قرآن کریم کو ہمیشہ بڑے یقین کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

ہمارے پڑھنے میں اثر کیوں نہیں؟

آج ہمارے پڑھنے میں وہ اثرات کیوں نہیں ہوتے؟ حالانکہ قرآن وہی ہے، مگر ہماری زبان وہ نہیں ہے۔ آج قرآن پاک وہی ہے، لیکن صحابہ کرام کی وہ زبانیں کہاں سے لائیں؟ اور وہ اللہ کے پاک پیغمبر کی زبان مبارک ہم کہاں سے لائیں؟ تابعین اور محدثین کی زبان مبارک ہم کہاں سے لائیں؟ جن کی زبان سے کبھی جھوٹ نہیں نکلتا تھا، جن کے منہ کے اندر کبھی ایک لقمہ حرام کا نہیں جاتا تھا، جنہوں نے کبھی زندگی میں حرام کا کپڑا نہیں پہنا تھا، جو زندگی میں کبھی مشتبہ چیز کے قریب نہیں گئے تھے، جن کی نظریں کبھی حرام پر نہیں اٹھی تھیں، جن کے قدم کبھی حرام پر روانہ نہیں ہوئے تھے، جن کے ہاتھوں نے کبھی گناہ کا کام نہیں کیا تھا اور اگر کبھی ہو گیا تو فوراً بے چین ہو گئے اور چاہتے کہ فوراً ہمیں دنیا میں سزا مل جائے، تاکہ ہم پاک ہو جائیں، ایسے لوگ قرآن پڑھتے تھے۔

حضرت لاہوری رحمہ اللہ اور قرآن میں لذت:

آج ہماری زبانیں آلودہ ہیں، ہمارے دماغ آلودہ ہیں، ہمارے قلب وفکر آلودہ ہیں اور پھر سب سے بڑی بات

یہ ہے کہ آج نہ کھانا حلال ہے اور نہ صدق مقال ہے۔ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ...... اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔...... وہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ کہتے ہیں کہ عبادت میں لذت نہیں ملتی۔ فرماتے کہ ہم نے عبادت تو اللہ کے حکم کے لیے کرنی ہے۔ لذت ملے تو الحمدللہ، نہ ملے تو ہم نے لذت کے لیے تو نہیں کرنی، ہم نے اللہ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ لیکن وہ فرمایا کرتے تھے: الحمدللہ! آج بھی اگر فقیر کے پاس کوئی آدمی آئے اور ایک مہینہ میرے پاس قیام کرے اور کھانا میرے لنگر سے کھائے اور لباس جو میں دوں وہی پہنے اور جو میں ہدایت کروں اس پر عمل کرے تو ایک مہینہ میں اس کی زندگی میں انقلاب آ جائے گا، پھر دیکھے گا کہ اس کو عبادت میں لذت ملتی ہے کہ نہیں......!؟

مشتبہ کینوں سے حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط:

ایک دفعہ حضرت کے ایک تعلق والے تھے اور بہت ہی اچھے آدمی تھے، انہوں نے سردیوں کے موسم میں حضرت کی خدمت میں مالٹے یا کینوؤں کے دو ٹوکرے پیش کیے۔...... اور حضرت جانتے تھے کہ یہ بڑا اچھا آدمی ہے...... آپ نے ہدیہ قبول فرمالیا اور دوسرے دن اس نے محبت سے پوچھا آپ کو ہمارے کینوں پسند آئے؟ میں چن کر لے آیا تھا، خالص اپنے باغ کے ہیں اور بڑے میٹھے ہیں۔ تو حضرت نے فرمایا کہ میں نے نہیں کھائے تھے، طلبہ کو بھیج دیے تھے۔...... ان شاء اللہ...... اچھے ہوں گے۔ تو اس کو بڑا احساس ہوا کہ حضرت نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ حضرت نے نہ کھائے ہوں۔ میں جب بھی کوئی چیز لے آتا ہوں اور حضرت کو پیش کرتا ہوں تو لے لیتے ہیں تو آج آپ نے طلبہ کو بھجوا دیے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے اپنے استعمال کے لیے خود تو قبول نہیں فرمائے۔ تو وہ سمجھدار تھا اس کو شبہ پڑا تو وہ گھر آیا، مزدوروں اور ملازموں سے پوچھا کہ تم لوگوں نے کوئی حرکت تو نہیں کی؟ انہوں نے کہا کہ کوئی حرکت نہیں کی۔ ایک دو مہینے پانی نہیں تھا تو ہم نے ساتھ والے کا پانی چوری کاٹ کر لگالیا تھا اس کی اجازت کے بغیر۔ ہم واٹر کورس کو کاٹ کر پانی لگا لیتے تھے اور صبح کو اس کے پانی کو چالو کر دیتے تھے، اس کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ تو اس نے کہا: شاید اس لیے اللہ نے انہیں محفوظ رکھا ہے کہ ہم اللہ کے بھی نہیں بنے، اپنے بھی نہیں بنے اور شیطان کے بھی نہیں بنے۔ اتنے الجھ کر رہ گئے ہیں:

﴿مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَاۤءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا﴾

[النساء: ۱۴۳]

نہ اِدھر کے رہے اور نہ اُدھر کے رہے۔ نماز بھی پڑھ لی اور فلم بھی دیکھ لی، حضور ﷺ کے روضہ پر جا کر سلام بھی پڑھ آیا اور شیو بھی کرالی، تہجد میں کھڑے ہو گئے، حجرِ اسود سے بھی سینہ لگالیا اور سگریٹ بھی پی لی اور سود بھی کھالیا۔ اس لیے ہم درمیان میں بھٹکے ہوئے لوگ ہیں، نہ تیتر ہیں اور نہ بٹیر ہیں۔ اِدھر قرآن کی تلاوت بھی ہو رہی ہے اور اُدھر گانا بھی سن رہا ہے۔ مرضی آئی تو ریڈیو کا بٹن کھول دیا اور قاری عبدالباسط کی تلاوت سن لی اور سبحان اللہ کہہ رہا جھوم رہا ہے اور تھوڑی دیر گزری تو گانے میں جھوم رہا ہے۔ سبحان اللہ!! گانے میں بھی مزہ آرہا ہے۔ یہ مسلمان ہے۔ آدمی اس مسلمان کا کیا کرے؟ یعنی جو آدمی خالص نہ بنے اس کا کیا کیا جائے......!؟

گناہوں سے حفاظت کا ایک طریقہ:

آپ چالیس دن گناہوں سے توبہ کرلیں اور پورے چالیس دن اپنی نظر کو، اپنے ہاتھوں کو اور اپنی زبان کو بچائیں، حلال کمائیں، حلال کھائیں اور حلال پہنیں، پھر دیکھو کہ انقلاب آتا ہے یا نہیں آتا؟

اہلِ قرآن سب سے مقدم ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ نے ایک جماعت اور فوج بھیجی، جن میں صحابہ میں سے بہت سارے لوگ تھے۔ حضور پاک ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ تم نے کتنا قرآن یاد کیا؟ کون سی سورت یاد کی ہے؟...... ان میں ایک بالکل نوجوان آدمی تھا، جو باقی سب سے باعتبار سن کے کم عمر تھا ......آپ نے پوچھا:

((مَا مَعَكَ؟ يَا فُلَانُ!))

''اے فلاں! تمہارے پاس اللہ کے قرآن میں سے کون سی سورتیں ہیں؟''

اس نے کہا: فلاں سورت بھی یاد ہے اور فلاں سورت بھی یاد ہے اور سورۂ بقرہ بھی یاد ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا سورۂ بقرہ تمہیں یاد ہے؟'' اس نے کہا: ''حضور! مجھے سورۂ بقرہ یاد ہے۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ساری فوج کا امیر بھی میں تمہیں بناتا ہوں۔'' [سنن الترمذي، حديث: ٢٨٧٦، باب: ما جاء في فضل سورة البقرة]

سب سے پہلے آدمی کی نماز دیکھو!

حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام لوگوں کو اور تمام گورنروں کو بحیثیت ایک خلیفہ کے

سب سے پہلی یادداشت لکھی کہ جب تمہیں کوئی آدمی ملازم رکھنا ہو تو سب سے پہلے اس کی نماز کا پتہ کرو کہ نماز کیسی پڑھتا ہے؟

ملازم کے لیے خصوصیات:

اگر تم کسی کو ملازم رکھو تو دو چیزوں کو دیکھو! جو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہی تھیں:

﴿قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾ (یوسف:۵۵)

''یوسف علیہ السلام نے کہا کہ تم مجھے اپنے خزانے پر رکھ لو، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور سمجھنے والا بھی ہوں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کو امیر بنا دو، کیونکہ اس کو سورۂ بقرہ یاد ہے۔ اس جماعت کا جو بڑا سردار تھا اس نے کہا:

''وَاللّٰهِ! مَا مَنَعَنِيْ أَنْ أَتَعَلَّمَ سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ إِلَّا إِنِّيْ خَشِيْتُ أَنْ لَا أَقُوْمَ بِهَا''

''خدا کی قسم! مجھے سورۂ بقرہ یاد کرنے سے کسی چیز نے نہیں روکا، لیکن میں نے اس ڈر سے سورۂ بقرہ کو یاد نہیں کیا کہ یاد کر کے پھر اس پر عمل نہ کروں تو کیسا ہوگا؟''

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۸۷۶، باب: مَا جَاءَ فِي فَضْلِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ]

فرشتے اتر کر اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سن رہے تھے:

حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رات کو کھڑے ہوئے سورۂ بقرہ کی تلاوت کر رہا تھا اور میرا گھوڑا بھی ساتھ بندھا ہوا تھا اور چھوٹا بچہ بھی ساتھ سویا ہوا تھا۔ فرماتے ہیں کہ میں جب قرآن پڑھوں تو گھوڑا اُچھلنے لگ جائے اور میں چپ کروں تو گھوڑا بھی ٹھہر جائے۔ مجھے یاد آیا کہ میرا بیٹا یحییٰ سویا ہوا ہے، ایسا نہ ہو کہ گھوڑا اپنے پاؤں سے اسے کوئی نقصان پہنچا دے۔ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جب میں نے قراءت ختم کی تو آسمانوں کی طرف دیکھا اور جب میں نے صبح حضور ﷺ کی خدمت میں آکر واقعہ سنایا کہ میں سورۂ بقرہ پڑھ رہا تھا۔ جب میں قرآن پڑھتا تھا تو گھوڑا اچھلنا، کودنا اور ڈرنا شروع کر دیتا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم پڑھتے رہتے۔ عرض کیا: یارسول اللہ! میں بچے کے بارے میں ڈر گیا، کیونکہ جانور ہے کہ جھوٹے بچے کو نقصان نہ پہنچا دے۔ اس کے بعد میں نے آسمانوں کی طرف دیکھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بدلی کا ٹکڑا ہے، اس کے اندر دیے روشن ہیں، اس کے بعد وہ دور ہوتے چلے گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((وَتَدْرِيْ مَاذَاكَ؟))

''تمہیں پتہ ہے کہ وہ کیا بدلی تھی؟ اور کیا مصابیح تھے؟''

میں نے عرض کیا: حضور مجھے پتہ نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((تِلْكَ الْمَلَآئِكَةُ دَنَتْ لِصَوْتِكَ))

جب تو اللہ کا قرآن پڑھ رہا تھا تو اللہ کے فرشتے تیرا قرآن سننے کے لیے آئے ہوئے تھے وہ اللہ کے فرشتے تھے۔ اور جب تو نے قرآن ختم کیا تو وہ آسمان کی طرف چلے گئے اور اگر تم پڑھتے رہتے اور صبح ہو جاتی تو تم دیکھتے کہ وہ کھڑے ہوتے، ان میں سے کوئی چھپ نہ سکتا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۵۰۱۸، باب: نُزُوْلِ السَّكِيْنَةِ وَالْمَلَآئِكَةِ عِنْدَ قِرَاءَةِ...]

بہر حال قرآن شریف جہاں پڑھا جاتا ہے وہاں اللہ کی رحمت کے فرشتے نازل ہوتے ہیں اور وہ بھی آ کر قرآن سنتے ہیں۔

اس طرح کا واقعہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی پیش آ چکا۔

جریر بن حازم کہتے ہیں کہ انہوں نے شیخ المدینہ سے سنا کہ حضور ﷺ سے کہا گیا کہ جو رات گزری ہے، حضرت ثابت بن قیس بن شماس کی حویلی میں ایسے معلوم ہوتا تھا کہ وہاں شمعیں اور شعاعیں جل رہی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''معلوم ہوتا ہے کہ اس نے رات سورۂ بقرہ پڑھی تھی۔'' جب ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''ہاں! میں نے سورۃ البقرہ کی تلاوت کی تھی۔'' [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۳، سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ: ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِيْ فَضْلِهَا]

سورۂ بقرہ کی تلاوت کا ثواب:

امام احمد رحمہ اللہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ عبد اللہ بن بریدہ رحمہ اللہ اپنے باپ بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

((قَالَ: كُنْتُ جَالِسًا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ: ''تَعَلَّمُوْا سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ، فَإِنَّ أَخْذَهَا بَرَكَةٌ وَتَرْكَهَا حَسْرَةٌ وَلَا تَسْتَطِيْعُهَا الْبَطَلَةُ.'' قَالَ: ثُمَّ سَكَتَ سَاعَةً ثُمَّ قَالَ: ''تَعَلَّمُوْا سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ وَآلِ عِمْرَانَ، فَإِنَّهُمَا الزَّهْرَاوَانِ يُظِلَّانِ صَاحِبَهُمَا كَأَنَّهُمَا غَمَامَتَانِ أَوْ غَيَايَتَانِ أَوْ فِرْقَانِ مِنْ طَيْرٍ صَوَآفَّ، وَإِنَّ الْقُرْآنَ يَلْقَى صَاحِبَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِيْنَ يَنْشَقُّ عَنْهُ قَبْرُهُ كَالرَّجُلِ الشَّاحِبِ، فَيَقُوْلُ لَهُ:'' هَلْ

تَعْرِفُنِي؟" فَيَقُوْلُ: مَا أَعْرِفُكَ. فَيَقُوْلُ: "أَنَا صَاحِبُكَ الْقُرْآنُ الَّذِي أَظْمَأْتُكَ فِي الْهَوَاجِرِ وَأَسْهَرْتُ لَيْلَكَ، وَإِنَّ كُلَّ تَاجِرٍ مِنْ وَرَاءِ تِجَارَتِهِ، وَإِنَّكَ الْيَوْمَ مِنْ وَرَاءِ كُلِّ تِجَارَةٍ فَيُعْطَى الْمُلْكَ بِيَمِينِهِ، وَالْخُلْدَ بِشِمَالِهِ، وَيُوضَعُ عَلَى رَأْسِهِ تَاجُ الْوَقَارِ، وَيُكْسَى وَالِدَاهُ حُلَّتَيْنِ، لَا يَقُومُ لَهُمَا أَهْلُ الدُّنْيَا فَيَقُولَانِ: بِمَ كُسِينَا هَذَا؟ فَيُقَالُ: بِأَخْذِ وَلَدِكُمَا الْقُرْآنَ. ثُمَّ يُقَالُ: "اقْرَأْ وَاصْعَدْ فِي دَرَجِ الْجَنَّةِ وَغُرَفِهَا، فَهُوَ فِي صُعُودٍ مَا دَامَ يَقْرَأُ هَذًّا كَانَ أَوْ تَرْتِيلًا.))

[مسند أحمد: ۲۲۹۵۰، تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۳، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِهَا مَعَ آلِ عِمْرَانَ]

"فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کی خدمت بیٹھا ہوا تھا، میں نے سنا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: سورۂ بقرہ سیکھو۔ سورۂ بقرہ کو پڑھنا اور محفوظ کرنا باعثِ برکت ہے اور اس کو چھوڑ دینا بڑی ندامت ہے اور اہلِ باطل سورۂ بقرہ پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ سورۂ بقرہ اور آلِ عمران پڑھا کرو، کیونکہ یہ ایسا سبزہ ہے اور ایسے درخت اور شاخیں ہیں کہ جو اپنے پڑھنے والوں پر قیامت کے دن سایہ کریں گی۔ اور سایہ بھی ایسا ہوگا کہ گویا دو بدلیوں کے ٹکڑے ہیں یا درخت یا اڑنے والے پرندے۔ اگر پرندوں کی ایک جماعت پر کھول کر کھڑی ہو جائے تو وہ بھی سایہ کر دیتی ہے تو یہ دو سورتیں قیامت کی گرمی کے دن اپنے پڑھنے والوں کے اوپر سایہ بن جائیں گی اور قرآن اپنے پڑھنے والوں کو قیامت کے دن ایک نوجوان انسان کی شکل میں نظر آئے گا۔ (یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت والے دن اعمال کو اُشکال عطا فرمائیں گے، جو اچھے عمل ہیں وہ اچھی صورت میں آجائیں گے اور اگر برے عمل ہیں تو وہ سانپ، بچھوؤں اور بلاؤں کی شکل میں آجائیں گے اور اس کے بعد) وہ کہے گا: اے آدمی! تو نے مجھے پہچانا کہ میں کون ہوں؟ تو وہ جواب دے گا: میں نے تجھے نہیں پہچانا۔ وہ کہے گا: میں ہی تمہارا وہ ساتھی قرآن ہوں جس کو تو نے دنیا میں اپنا ساتھی بنالیا تھا، میری وجہ سے تو گرمیوں کے اندر پیاسا تھا (یعنی میری وجہ سے تم نے روزے رکھے، تم نے تلاوت کی اور تم نے قرآن پڑھا) اور راتوں کو جاگتا رہا (تو نے رات کو تہجد میں اللہ کا قرآن پڑھا) اور تاجر اپنی تجارت کے پیچھے ہوتا ہے (یعنی جو آدمی تجارت کرتا ہے وہ اپنے مال کا حساب بھی کرتا ہے کہ کتنا فائدہ ہوا؟) آج تمہاری بھی کامیابی کا دن ہے۔ اب جناب اللہ کے فرشتے دائیں طرف آئیں گے اور اللہ کی جنت اس کے بائیں طرف ہوگی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کے سر پر عزت والا تاج رکھیں گے (جیسے دنیا کے اندر بادشاہ تاج پہنتے تھے، قیامت کے دن قرآن پڑھنے والوں کے سروں پر تاج رکھا جائے گا، کیونکہ اللہ کے ہاں عزت والے لوگ وہی ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں)

اس کے سر پر عزت کا اور وقار کا تاج رکھا جائے گا، اس کے والدین کو قیامت والے دن جنت کے ایسے جوڑے پہنائے جائیں گے کہ ساری دنیا والے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ والدین پوچھیں گے کہ ہمیں یہ لباس کیوں پہنائے جا رہے ہیں؟ تو ملائکہ جواب دیں گے: تم نے اپنے بچوں کو جو قرآن پڑھایا تھا اس کا صلہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں آج عطا فرما رہے ہیں۔ اللہ فرمائیں گے کہ حافظ قرآن! تم قرآن پڑھتے جاؤ اور اپنے مدارج پر چڑھتے بھی جاؤ۔ جہاں تمہارا قرآن ختم ہوگا وہیں تمہارے درجات ختم ہوں گے۔"

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرمایا کہ اے لوگو! قرآن پڑھا کرو، کیونکہ قرآن اپنے پڑھنے والوں کی قیامت کے دن شفاعت کرے گا۔

[مسند أحمد، حدیث:٢٢١٣٦، حدیث أبي أمامة الباهلي]

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ يَلْعَنُهُ)) [تفسیر روح المعانی، سورۃ: فاطر، آیۃ:٢٩]

"ایسے بھی میری امت میں قرآن پڑھنے والے آئیں گے جو قرآن پڑھ رہے ہوں گے اور اللہ کا قرآن ان کو لعنت کر رہا ہوگا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت میں ایک ایسی جماعت بھی آئے گی کہ زبانوں پر قرآن ہوگا، حلق سے نیچے بھی نہیں ہوگا (یعنی صرف زبان پر قرآن ہے اور عمل کوئی نہیں ہے اور نہ ہی عقیدہ صحیح ہے)۔"

[صحیح البخاری، حدیث:٦٩٣١، باب: قَتْلِ الْخَوَارِجِ وَالْمُلْحِدِينَ]

قیامت کے دن اعمال کو صورتیں دے دی جائیں گی:

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يُؤْتَى بِالْقُرْآنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَهْلِهِ الَّذِينَ كَانُوا يَعْمَلُونَ))

"قیامت والے دن اللہ کا قرآن بھی لایا جائے گا اور اس پر جو عمل کرنے والے لوگ ہیں وہ بھی لائے جائیں گے۔"

[صحیح مسلم، حدیث:٨٠٥، باب فَضْلِ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ]

اصل میں یہ ہوتا ہے کہ اعمال صالحہ کو بدل دیا جائے گا اور صحائف پیش ہوں گے۔ اور اس طرح ہو سکتا ہے کہ اعمال صالحہ کسی شکل میں آئیں۔ ان تمام احادیث مبارکہ کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس عمل کو ایک شکل عطا فرمائیں گے،

جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ جب آدمی قبر کے اندر ہوگا، ایک بڑی خوبصورت شکل کا انسان آئے گا تو وہ کہے گا کہ آپ کون ہیں؟ تو وہ کہے گا: میں تمہارا وہ عمل ہوں جو تم نے دنیا میں کیا تھا۔ فرمایا کہ میں تمہیں تسلی اور اطمینان دینے کے لیے آرہا ہوں کہ تم اطمینان کرو...... ان شاء اللہ...... اللہ تعالیٰ کی رحمت سے تمہیں نجات ہوگی۔

اسی طرح بعض علماء نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ ان اعمال کو ایک جوہر کی شکل دے دیں گے، ان کا وزن کیا جائے گا اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر قادر ہیں جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا انجام:

جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں حدیث صحیح میں (بخاری شریف میں) واقعہ مذکور ہے کہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جب دیکھیں گے کہ ان کے والد آذر کو فرشتے لیے ہوئے جہنم کی طرف جا رہے ہیں تو وہ اللہ کے آگے درخواست کریں گے کہ اے میرے پروردگار عالم! آپ کا تو وعدہ ہے: ﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑧﴾ [التحریم:۸] کہ ہم قیامت والے دن اپنے انبیاء کو رسوا نہیں کریں گے۔ میرے اللہ! اس سے بڑی میری کیا رسوائی ہو سکتی ہے؟ میرا باپ ہو اور جہنم میں ڈالا جا رہا ہو؟ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ''اے ابراہیم! نیچے دیکھ!'' ابراہیم علیہ السلام نیچے دیکھیں گے اور جب سر اٹھائیں گے تو ان کے والد کی شکل تبدیل ہو جائے گی اور ان کو بجو کی شکل میں بدل دیا جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہمارے فیصلے نہیں بدلتے۔ جو آدمی کفر پر مر گیا اسے تو جہنم میں جانا ہے، لیکن اب ہم نے اس کی شکل بدل دی ہے، اب کسی کو پتہ نہیں لگے گا کہ وہ کون ہے؟ لہٰذا ہم نے انبیاء علیہم السلام کی عظمت کو بھی بحال کر دیا اور اپنا فیصلہ قدرت کا بھی نہیں بدلا، کیونکہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ㊽﴾ [النساء:۴۸] اللہ کا فیصلہ ہے کہ جو کفر اور شرک پر مر گیا اس کی کبھی بخشش نہیں ہوگی اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

اور آذر کا کفر اور شرک قرآن مقدس میں ثابت ہے، وہ کفر اور شرک پر مر گئے، حتیٰ کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب دعا مانگی تو اللہ نے منع فرما دیا کہ جب تک کافر زندہ ہو تو دعا کی جا سکتی ہے کہ اللہ اس کو ایمان نصیب فرما دے، اللہ اس کو ہدایت نصیب کر دے، لیکن اگر اس کی موت کفر پر ہو جائے تو دعا کا فائدہ ہی کوئی نہیں ہے ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۚ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ⑪﴾

[التوبہ: ۱۱۴] ابراہیم علیہ السلام ایک خاص وقت تک دعائیں مانگتے رہے۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ آزر اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بری ہو گئے، لیکن وہ شفقت قیامت میں بھی عود کر آئے گی۔ آخر اللہ کے پیغمبر ہیں اور خلیل ہیں۔ جب آزر کو اس حالت میں دیکھیں گے تو پھر درخواست کریں گے، لیکن اللہ ان کی شکل بدل ڈالے گا۔

قرآن کی شفاعت:

اس لیے علماء نے فرمایا کہ اب قرآن پاک آئے گا، اللہ پاک چاہیں گے تو اس کو ایک خاص شکل عطا فرمائیں گے، وگرنہ قرآن کے آنے کا کیا مطلب ہے؟ قرآن تو اللہ کا کلام ہے، جو اللہ نے خود کلام فرمایا اور خود جبرئیل علیہ السلام کو پڑھایا اور پھر جبرئیل علیہ السلام نے آکر میرے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرآن لایا جائے گا۔

قیامت کے دن اپنے پروردگار کے دربار میں ان لوگوں شفاعت کرے گا جو اس کو پڑھتے ہوں گے، حتیٰ کہ ایک حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ سورت مبارک آکر اللہ کے آگے عرض کرے گی: یا اللہ! میں قرآن کی سورت ہوں؟ اللہ فرمائیں گے: بالکل۔ وہ عرض کرے گی: اے اللہ! میں آپ کے قرآن کی سورت ہوں۔ آپ میرے پڑھنے والے کو جہنم میں نہ بھیجیں، اس کو نجات دے دیں۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی شفاعت کو قبول فرمالیں گے۔ اس طرح سے قرآن بھی شفاعت کرے گا، اللہ کے قرآن کی سورتیں بھی شفاعت کریں گی اور حافظِ قرآن بھی شفاعت کرے گا۔

ایک صحابی کا خواب:

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ایک بھائی نے خواب میں دیکھا کہ لوگ جا رہے ہیں۔ ایک ایسی پہاڑی ہے جو بڑی سخت ہے اور ایک بڑی لمبی گھاٹی ہے اور اس کا عبور کرنا بڑا مشکل ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر دو درخت ہیں، دونوں بڑے سائے والے ہیں۔ وہاں سے آواز آتی ہے کہ تم میں کوئی سورۃ البقرۃ پڑھنے والا ہے؟ سورۃ آلِ عمران پڑھنے والا ہے؟ تو ایک آدمی نے کہا کہ ہاں! میں پڑھنے والا ہوں۔ تو دونوں درختوں کی شاخیں جھکتی آئیں، جھکتی آئیں اور اس کو پکڑا اور گھاٹی پار کرا دی۔ تو انہوں نے کہا کہ دیکھ رہے ہو؟ تو معنی یہ تھا کہ جہنم کی بہت بڑی گھاٹی ہے، لیکن جب کوئی اللہ کا قرآن اور سورۃ البقرہ کا پڑھنے والا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نجات عطا فرما دیتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۴، ذِکْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِهَا مَعَ آلِ عِمْرَانَ]

سورۂ بقرہ اور آلِ عمران نفاق سے بچاتی ہیں:

حدیث مبارکہ میں ہے کہ جو آدمی صبح کو سورۂ بقرہ اور آلِ عمران پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کو شام تک نفاق سے بچائیں گے اور جو شام کو پڑھے گا اللہ تعالیٰ صبح تک اس کو نفاق سے بچائیں گے۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ اس سورت کو روزانہ پڑھا کرتے تھے، سورۃ البقرۃ بھی اور آلِ عمران بھی۔ قرآن کا جو حصہ پڑھا کرتے تھے وہ علیحدہ تلاوت کرتے تھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۴، ذِکْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِهَا مَعَ آلِ عِمْرَانَ]

قانتین میں شمار:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس آدمی نے اس کو رات کو پڑھا اللہ تعالیٰ اس کو ان لوگوں میں لکھیں گے جو قانتین ہیں، یعنی راتوں کو جاگنے والے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۴، ذِکْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِهَا مَعَ آلِ عِمْرَانَ]

سورۂ بقرہ کی بعض خصوصیات وغیرہ:

1 ......حضور ﷺ نے فرمایا کہ سات سورتیں مجھے تورات کے بدلے میں ملیں اور جن سورتوں میں دو سو آیتیں ہیں وہ انجیل کے بدلے میں ملیں اور مجھے مثانی زبور کتاب کے بدلے میں ملی اور اللہ تعالیٰ نے مفصل سورتیں مجھے زیادہ عطا فرمائیں، یعنی جو پہلے انبیاء کو نہیں ملیں۔ [المعجم الکبیر، حدیث:۱۸۷]

2 ......اور فرمایا کہ جس نے یہ سات سورتیں یاد کر لیں وہ عالم ہے، یعنی سورۂ بقرہ، آلِ عمران، مائدہ اور نساء وغیرہ۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۵، ذِکْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ السَّبْعِ الطِّوَلِ]

3 ......حضور ﷺ نے ایک لشکر بھیجا اور ان کا امیر ایک بچے کو بنا دیا جس کو سورۃ البقرۃ یاد تھی۔

[سنن الترمذی، حدیث:۲۸۷۶، بَابُ: مَا جَاءَ فِي فَضْلِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ]

4 ......سورۂ بقرہ حضور ﷺ پر ہجرت کے بعد سب سے پہلے نازل ہوئی اور آخر میں ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴾ [البقرۃ:۲۸۱] صرف یہ آیت منیٰ میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد میرے مدنی پاک اسی (۸۰) دن یا نوے (۹۰) دن زندہ رہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۵، ذِکْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ السَّبْعِ الطِّوَلِ]

5 ......سورۃ البقرۃ ایسے ہے جیسے خیمہ ہو۔

6 ......بعض علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کے اندر ایک ہزار خبر ہے، ایک ہزار امر ہے اور ایک ہزار نہی ہے۔

7 ......اور جن لوگوں نے آیات گنی ہیں وہ کہتے ہیں اس میں دو سو چھیاسی (٢٨٦) آیات ہیں اور اس کے اندر جو کلمات ہیں وہ چھ ہزار دو سو اکیس (٦٢٢١) اور اگر اس کے حروف گنے جائیں تو پچیس ہزار پانچ سو (٢٥٥٠٠) حروف ہیں۔

8 ......حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور سب علماء اور ائمہ نے یہی کہا کہ سورۃ البقرۃ مدنی ہے، ہجرت کے فوراً بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/٣٥، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ السَّبْعِ الطِّوَلِ]

9 ......ایک روایت میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یوں نہ کہو "سورۃ البقرۃ"، "سورۃ آلِ عمران"، بلکہ کہو کہ وہ سورت جس میں بقرہ کا قصہ ہے، جس میں آلِ عمران کا قصہ ہے۔ [شعب الایمان، حدیث: ٢٢٢٦]

لیکن یہ روایت غریب ہے، اس کا مرفوع ہونا صحیح نہیں ہے۔ اس کے اندر ضعیف راوی ہے، جس کی روایت سے حجت نہیں پکڑی جاسکتی۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/٣٥، ذِكْرُ مَا وَرَدَ فِي فَضْلِ السَّبْعِ الطِّوَلِ]

10 ......صحیحین میں ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ منیٰ میں تشریف لے آئے، جہاں جمرہ (کنکری) مارتے ہیں۔ اس کے بطن میں دائیں طرف کھڑے ہوئے اور کعبہ کے بائیں طرف کھڑے ہوئے اور فرمایا: "یہی وہ جگہ ہے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ سورۃ البقرۃ نازل ہوئی۔" [صحیح البخاري، حدیث: ١٧٤٩، باب: مَنْ رَمَى جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ...]

11 ......حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ جنگ میں صحابہ میں کمزوری آرہی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((يَا أَصْحَابَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ!)) [تفسیر ابن کثیر: ١/٣٥، ایضاً، مسند أبي یعلیٰ، حدیث: ٣٦٠٦]

"اے سورت بقرہ والو!"..

شاید یہ یومِ حنین کا قصہ ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ صحابہ کو بلائیں "يَا أَهْلَ الشَّجَرَةِ! يَا أَهْلَ بَيْعَةِ الرِّضْوَانِ! يَا أَصْحَابَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ!" حضور صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اس وجہ سے ان کو طاقت ملے گی۔ جب ان کے کانوں میں آواز پڑی تو ہر طرف سے صحابہ واپس لوٹے اور کفار پر ٹوٹ پڑے۔

12 ......جب مسیلمہ کذاب سے یمامہ کے موقع پر جنگ ہوئی وہاں بھی صحابہ کو بلایا گیا: "يَا أَصْحَابَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ! يَا أَصْحَابَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ!" [تفسیر ابن کثیر: ١/٣٥، ایضاً، مصنف عبد الرزاق، حدیث: ٩٤٦٥]

یعنی اتنی شان والی سورت ہے کہ اس کا نام لینے سے صحابہ رضی اللہ عنہم میں طاقت اور قوت آ جاتی تھی۔ مسیلمہ کذاب کا لشکر زیادہ تھا، کیونکہ وہ ستر ہزار (۷۰۰۰۰) کا لشکر لے کر آیا تھا تو مسلمانوں کے پاؤں اکھڑنے لگے تو مسلمان ایک دوسرے کو پکارتے تھے: ''یَا أَصْحَابَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ! یَا أَصْحَابَ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ!'' یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو ہمت، طاقت اور فتح عطا فرمائی۔ مسیلمہ کذاب مارا گیا اور اس کی بہت سی فوج بھی ماری گئی اور کافی لوگ اسلام بھی لے آئے۔

حروفِ مقطعات:

حروفِ مقطعات کے بارے میں اختلاف ہے:

- ......بعض علماء نے فرمایا: اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ وہ اس کی تفسیر بیان نہیں کرتے۔ خلفائے راشدین اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہی قول تھا کہ اس کی کوئی تفسیر نہیں، بس اللہ جانتا ہے۔ حضرت ابو عامر الشعبی، سفیان الثوری، ربیع بن خثیم اور ابن ابی حاتم نے بھی کہا ہے کہ اس کی تفسیر بس اللہ ہی جانتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۶، البقرۃ: الآیۃ: الٓمٓ]

بعض علماء نے اس کی تفسیر بیان کی، لیکن اس کے معنی کے اندر اختلاف کیا:

- ......حضرت عبدالرحمٰن بن زید، علامہ ابوالقاسم محمد زمخشری اور علامہ سیبویہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ سورتوں کے اسماء ہیں، جیسے ''الٓمٓ تَنْزِیْلُ السَّجْدَة'' تو گویا یہ ''الٓمٓ'' سورت کا نام ہے۔ اور یہ روایت صحیحین میں بھی ہے۔ اس کے بعد مجاہد نے فرمایا: ''الٓمٓ'' ''حٰمٓ'' ''الٓمٓصٓ'' ''صٓ'' گویا یہ چابیاں ہیں کہ اللہ نے ان سے قرآن کی سورتوں کو کھولا اور بیان فرمایا۔ یا یہ قرآن کے ناموں میں سے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت کا نام ہے۔ عام بات بھی یہی ہے کہ اگر کوئی کہے کہ میں نے ''الٓمٓصٓ'' پڑھی ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس نے سورۃ الاعراف پڑھی ہے۔
- ......بعض علماء نے فرمایا ہے کہ ''الٓمٓ'' یا سورتوں کے شروع میں جو حروفِ مقطعات ہیں اللہ کے ناموں میں سے نام ہیں۔ یعنی ''الف'' سے اللہ مراد ہے، ''حاء'' سے حنان مراد ہے اور ''میم'' سے مجید مراد ہے، یا ''حاء'' سے حمید مراد ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ''الٓمٓ'' اللہ کا اسم اعظم ہے۔

- ......ایک قول یہ ہے کہ یہ قسم ہے، جس سے اللہ نے قسم کھائی ہے اور یہ اللہ کے اسماء میں سے ہے۔

❁......بعض نے کہا: یہ مخفف ہے ''أَنَا اللّٰهُ أَعْلَمُ'' کا۔

❁......بعض نے فرمایا کہ یہ حروفِ ہجا ہیں، جیسے الف، با، تا، ثا، اسی طرح اللہ کے اسماء مبارک میں سے یہ حروف لیے گئے ہیں۔

❁......بعض نے فرمایا کہ حروفِ تہجی کے انتیس (۲۹) حروف میں سے یہ تین حروف ہیں۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ انتیس حروف، قاعدہ کے ہر حرف پر غور کریں تو اللہ کے اسماء میں سے کسی نہ کسی اسم کی وہ ابتداء ہے یا تو حروف کی ابتداء اللہ کے اسماء سے ہے یا اللہ کی نعمتوں سے ہے۔ اللہ نے جتنی نعمتیں ہم پر فرمائی ہیں ان کا ذکر اسی میں آ جاتا ہے۔

❁ ......بعض نے کہا کہ اس سے قوموں کی مدتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ فلاں قوم کی اتنی مدت ہوگی اور فلاں قوم کی اتنی مدت ہوگی۔ تو یہ حروف کنایات ہیں۔ ان کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے قوموں کی مدتیں اور راز چھپا دیے، مثلاً قومِ عاد کتنا عرصہ زندہ رہے گی؟ ان کے حروف میں حرف لیں گے اس کے عدد نکالیں گے تو اس کا سنہ نکل آئے گا...... حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے فرمایا کہ آدمی اللہ کے ناموں پر بھی یقین رکھے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے رزق اور نعمتوں میں زندہ ہو تو کتنی تعجب کی بات ہے کہ اللہ کے ساتھ کفر بھی کرے۔ انہوں نے فرمایا کہ ''الف'' اللہ کا مفتاح ہے، ''لام'' اللہ کے نام لطیف کا مفتاح ہے اور اسی طرح ''میم'' اللہ کے اسم مجید کا مفتاح ہے۔ ''الف'' سے اللہ کی نعمتیں اور ''لام'' سے اللہ کا لطف اور ''میم'' سے اللہ کا مجد مراد ہے...... انہوں نے فرمایا کہ جہاں صرف ''الف'' ہو تو ایک سال، ''لام'' ہو تو تین سال، ''میم'' ہو تو چالیس سال ہیں۔ یا ''الف'' سے مراد اللہ ہے، ''لام'' سے مراد لطیف ہے اور میم سے مراد مجید ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۶، البقرۃ: الآیۃ: الٓمٓ]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب اقوال جمع کیے گئے، پھر تمام علماء نے اپنے اقوال کی توفیق یعنی ملانے کی کوشش کی۔ اگر غور کریں تو ان کے اندر کوئی جھگڑا یا تعارض نہیں ہے، جمع کرنا ممکن ہے۔ ان سے سورتوں کی افتتاح بھی کی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر حرف اللہ کے نام اور اللہ کی صفات پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ اللہ نے بعض سورتوں کی ابتداء کی ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ﴾ [سورۃ الحدید: ۱] ﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ﴾ [سورۃ الجمعۃ: ۱] ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ [سورۃ الکہف: ۱]۔ یہ سارے قول جمع ہیں، ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اگر پہلا حرف مثلاً: اللہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے تو اس میں کوئی تعرض کی بات نہیں ہے۔ یا ان حروف سے مراد مدت ہو کہ الف

سے مراد ایک سال، لام سے تیس اور میم سے چالیس تو اکہتر ہو گیا۔ اور اسی طرح ان سورتوں میں جن میں قوموں کے احوال ہیں کہ فلاں قوم سو سال رہی، فلاں قوم دو سال رہی، فلاں قوم چار سال رہی اور فلاں قوم ہزار سال رہی تو یہ بھی ہو سکتا ہے۔

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کبھی ایک حرف ہوتا ہے، لیکن اس کا اطلاق کئی معنوں پر ہوتا ہے، جیسے لفظِ ''أُمَّةٌ'' ایک لفظ ہے، قرآن میں ہے: ﴿إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ﴾ [الزخرف: ۲۲] تو یہاں امت بمعنی دین اور طریقہ ہے۔ اور کبھی لفظ ''أُمَّةٌ'' بولا جاتا ہے اور مراد ہوتا ہے کہ اللہ کا فرمانبردار بندہ، جیسے قرآن میں ہے: ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ [النحل: ۱۲۰]

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۶، البقرۃ: الآیۃ: الٓمٓ]

تو اس لیے ایک لفظ کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے جیسے لفظ ''عَيْنٌ'' عربی کا لفظ ہے۔ اس کا معنی آنکھ بھی ہے، چشمہ بھی جو جاری ہو اور اسی طرح جاسوس پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، اسی طرح ''عَيْنٌ'' نمونہ کو بھی کہتے ہیں، اسی طرح گھٹنے کی ہڈی کو بھی ''عَيْنٌ'' کہتے ہیں، سورج کو بھی ''عَيْنٌ'' کہتے ہیں۔

......اس لیے ہم استعمال کے اندر گئے، جہاں محاورہ آئے گا ''عَيْنٌ طَلَعَتْ'' کہ ''عَيْنٌ'' نکل آیا، یعنی سورج نکل آیا۔

......اگر کہیں محاورہ میں آئے گا: ''عَيْنٌ انْكَسَرَتْ'' کہ ''عَيْن'' ٹوٹ گئی، یہاں گھٹنے کی ہڈی مراد ہے کہ وہ ٹوٹ گئی۔

......اگر ہوگا ''عَيْنٌ جَرَتْ'' کہ ''عَيْن'' چل پڑی تو اس سے مراد یہ ہے کہ چشمہ بہہ پڑا۔

......اگر ہو ''عَيْنٌ أَبْصَرَتْ'' کہ ''عَيْن'' نے دیکھا تو یہاں آنکھ مراد ہے۔

......اسی طرح ''عَيْنٌ اطَّلَعَتْ'' تو یہاں جاسوس مراد ہے کہ اس کو اطلاع مل گئی۔

تو اس لیے ایک لفظ کا اطلاق کئی چیزوں پر ہو سکتا ہے۔ لیکن ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک ہے مجموعہ حرف عین کہ یہ عین، یا اور نون کا مجموعہ ہے۔ امۃ الف، میم اور ہا کا مجموعہ ہے۔ یہ تو مجموعۂ حرف ہے اور یہاں تو ایک حرف ہے، بحث ہو رہی ہے الف، لام اور میم۔ تو یہ علیحدہ مسئلہ ہے اور وہ علیحدہ مسئلہ ہے۔ یہ بات یہاں نہیں، کیونکہ کسی مجموعی حرف کا چند معنوں میں استعمال ہونا وہ علیحدہ چیز ہے، لفظِ ''أُمَّةٌ'' ایک جامع کلمہ ہے، لیکن یہاں تو حرف میں بحث ہو رہی ہے اور کلمہ میں تو بحث ہی نہیں ہو رہی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۶، ۳۷، البقرۃ: الآیۃ: الٓمٓ]

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بڑی دقیق بحث ہے اور تفسیر کا مقام ہی نہیں کہ ہم اس بحث میں پڑیں کہ

مجموعہ کا حصل ایک ہے یا نہیں۔''أُمَّةً'' کا لفظ کئی معانی پر دلالت کر رہا ہے۔اس کا ہم سیاق کلام دیکھیں گے کہ اس سے پہلے جو کلام آ رہا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ ایک حرف کسی خاص معنی کے لیے نہیں ہو سکتا، مثلاً: ایک حرف الف ہے، اس سے مراد دوسری جگہ کہیں کہ اس سے سال مراد ہے۔ اس کے لیے ہمارے پاس دلیل کون سی ہو؟ وہاں تو ہم دلیل رکھتے ہیں: ﴿إِنَّ إِبْرٰهِيْمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۖ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ (النحل: ۱۲۰) کہ پیچھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر موجود ہے۔ یہاں ہمارے پاس کون سا قرینہ ہے؟ ہم کون سا معنی مراد لیں؟ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، اس کے اندر کوئی جمع تطبیق نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے عرب کے شعراء سے حجت پکڑی ہے، لیکن وہاں تو سیاق دلالت کر رہا ہے کہ یہ معنی مراد ہے۔ شاعر نے کہا:

فَقُلْتُ لَهَا قِفِيْ فَقَالَتْ قَافْ
لَا تَحْسَبِيْ أَنَّا نَسِيْنَا الْإِيْجَافْ

''ہم نے کہا کہ ٹھہرو تو اس نے کہا ٹھہر گئی اور تو گمان نہ کر کہ ہم ایجاف کو بھول گئے ہیں۔''

وہاں سیاق سے معلوم ہو رہا ہے کہ ہم نے کہا کہ ٹھہرو تو اس نے کہا ''قَافْ'' ٹھہر گئی یعنی ''وَقَفْتُ'' کہ میں ٹھہر گئی۔

مَا لِلظَّلِيْمِ عَالَ كَيْفَ لَا يَا
يَنْقَدُّ عَنْهُ جِلْدُهُ إِذَا يَا

یہاں تو سیاقِ کلام ہی نہیں، کیونکہ سورت کے شروع میں آ گیا ''الٓمّٓ''۔ پہلے تو کوئی کلام ہی نہیں ہے تو ''میم''، اس سے کیا اشارہ لے سکتے ہیں؟ بہر حال سارے اقوال نقل ہو گئے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۷، البقرۃ: الآیۃ: الٓمّٓ]

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ایک حدیث پاک سے استدلال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ أَعَانَ عَلٰى قَتْلِ مُؤْمِنٍ بِشَطْرِ كَلِمَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ مَكْتُوْبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ: آيِسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ))

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۲۶۲۰، باب: التَّغْلِيْظُ فِي قَتْلِ مُسْلِمٍ ظُلْمًا]

''اگر کسی بندے نے کسی مسلمان کے قتل کرنے میں مدد کی، چاہے آدھے کلمہ کے ساتھ، تو وہ اللہ سے ایسی حالت میں ملے گا کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہو گا ''اللہ کی رحمت سے ناامید''......''

وہ قیامت کے دن قاتل ہی ٹھہرایا جائے گا، یعنی اس نے تو کہنا تھا ''اُقْتُلْ'' کہ اس کو قتل کرو، لیکن اس نے کہا

''اُقِ'' یعنی اشارہ کیا جاہے آدھا کلمہ اس کے منہ سے نکلا ہے...... اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں...... وہ اس میں پکڑا جائے گا اور روز قیامت اس کو قاتل شمار کیا جائے گا۔

⊛...... اور خصیف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ ''فَوَاتِحُ السُّوَر'' تمام کے تمام وضع کردہ حروف ہجاء ہی ہیں، بس انہی سے سورتوں کی ابتداء کی گئی ہے۔

وہ حروف ہجاء جو سورتوں کے شروع میں استعمال ہوئے ہیں ان میں سے اگر مکرر حروف کو گرادیں تو چودہ حروف بنتے ہیں: ''ا ل ھ م ص ر ك ي ع ط س ح ق ن''۔ اگر ان کو جمع کرو تو ''نَصٌّ، حَكِيْمٌ، قَاطِعٌ، لَهٗ، سِرٌّ'' والا جملہ بن جاتا ہے اور یہ حروف کل حروفِ تہجی کا نصف ہیں یعنی کل حروف تہجی ۲۸ ہیں اور ان میں سے ۱۴ استعمال ہوئے ہیں جو نصف ہیں۔ بہر حال کلامِ عرب میں ایسے استعمال ہوتے تھے۔

واقعات:

مشہور ہے کہ ایک بزرگ کی خدمت میں کوئی آدمی آیا اور بڑا عرصہ خدمت کرتا رہا۔ اس کے بعد خدمت کا خلاصہ یہ نکلا کہ جب اس کو موقع ملا تو کہا کہ آپ مہربانی کریں! میں اتنے عرصے سے جو پڑا ہوا ہوں، آپ مجھے سونا بنانے کا نسخہ سکھلا ئیے...... بزرگوں کی خدمت میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اور آپ کو بھی اور سب کو ہدایت دے اور اخلاص عطا فرمائے۔

یہ ابھی دو تین دن کا واقعہ ہے کہ میں حجرِ اسود کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے عشاء کی نماز پڑھی، نفل پڑھے اور بیٹھا رہا۔ اب کوئی آدمی ساتھ بیٹھا ہوا ہو تو لازمی بات ہے کہ بندے کو شرم آتی ہے کہ کہیں ریا نہ ہو جائے کہ یہ دکھلاوے کے لیے نہ پڑھ رہا ہو۔ اصول یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی آدمی وظیفہ میں مشغول ہوتا ہے تو آپ دور چلے جائیں۔ جب فارغ ہو تو آپ اس کو مل لیں۔ خیر! بہر حال وہ فارغ ہونے کے بعد ملا۔ میں نے کہا: ''السلام علیکم! کیا کوئی کام ہے؟'' کہا: ''ہاں جی! کام ہے۔'' میں نے کہا: ''کیا کام ہے؟'' کہا کہ آپ مجھے سونے کا نسخہ بتلادیں۔ میں نے کہا: ''شریف آدمی! اللہ کے کعبہ کے اندر بیٹھا ہوں، اس کعبہ پر بھی اس کا یقین نہ ہوا اور آدمی نسخے بناتا پھرے، اس سے بڑا بے ایمان بھی کوئی ہوگا......!؟ یعنی جس کو اللہ کے گھر میں بھی اللہ کے رزق پر یقین نہیں ہے، خدا کے دروازے پر بیٹھنے سے بڑا بھی کوئی نسخہ ہے......!؟

ایک زمیندار کے دروازے پر ایک میراثی اور ایک نائی ہوتا ہے وہ ان کو نہیں بھولتا تو ہم تو خدا کے دروازے پر

پڑے ہیں تو خدا ہم کو رزق نہیں دے گا؟ وہ بے چارے دیکھتے ہیں کہ ان کی گھڑیاں روزانہ نئی ہوتی ہیں، کپڑے نئے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ ہمیں کہاں کہاں سے بھیجتا ہے؟ اب بھیجنے والے...... الحمدللہ...... ہزاروں ہوں اور پہننے والا ایک ہو تو وہ روز نئی چیز استعمال کرے گا...... اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے...... ہمیں پتہ نہیں ہوتا، ہم سے پورے نہیں ہوتے، ہم اُٹھا اُٹھا کر...... الحمدللہ...... لوگوں کو دیتے رہتے ہیں...... تو لوگوں نے سمجھا کہ شاید یہ سونا بناتے ہیں۔ کوئی کہتے ہیں شاید ہوٹلوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ اب اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے، سوائے اس کے کہ ہم ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھیں۔ اس کے علاوہ تو ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ ہمارا یہ تو ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رزق کا مطلق وعدہ ہے ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ [ھود:٦] ہر زمین پر چلنے والی چیز کا رزّاق میرا رب ہے۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ [الذاریات:٥٨]۔

ایک وعدہ مکہ والوں سے ہے اور وہ خاص وعدہ ہے: ﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ﴾ [قریش:٣] کہ تم اس گھر کے رب کی عبادت کرو ﴿الَّذِيْ أَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّآمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴾ [قریش:٤] میں ان کی بھوک کو بھی دور کردوں گا اور ان کے خوف کو بھی دور کردوں گا اور ان کو امن بھی نصیب کردوں گا اور ان کو رزق بھی نصیب کروں گا۔ تو ہمارے ساتھ تو اللہ تعالیٰ کے دو وعدے ہیں تو ہم کیسے بھوکے رہ سکتے ہیں؟

......یعنی ایک اللہ کا مطلق رزق والا وعدہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔

......ایک مکہ میں رہیں، اللہ کی عبادت کریں اور اللہ کی توحید کا پرچار کریں۔

تو میں نے آپ کو مثال دی ہے کہ زمیندار اپنے میراثی کو نہیں بھولتا اور ہم خدا کا نام لے رہے ہیں اور اس کی توحید کے علمبردار ہیں تو وہ مالک ہمیں کیسے فراموش کردے گا؟ وہ تو ارحم الراحمین ہے۔ اس لیے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے کتنی بڑی بات کہی تھی!!! انہوں نے فرمایا کہ اے میرے رب! اے اللہ! تو نے مجھ پر اس وقت کرم کیا جب میں نے مانگا بھی نہیں اور مجھے فرصت بھی نہیں تھی اور تو نے مہربانی کی...... یعنی جب میں پیدا نہیں ہوا تھا، کیا اپنے پیدا ہونے کے لیے میں نے دعا مانگی تھی؟ یا مجھے پیدا ہونے کی ضرورت تھی؟ اگر میں پیدا نہ ہوتا تو کون سا کام دنیا میں رہ جاتا؟...... تو اس وقت بھی تو نے کرم کیا اور مجھے ماں کا دودھ بخشا، ماں کے پیٹ میں رکھا اور مجھ پر مہربانی کی اور مجھے زندہ سلامت نکالا، پھر عقل دی۔ اب میں اپنے گناہوں پر تیری معافی کا محتاج ہوں تو کیا اب تو کرم نہیں کرے گا؟ یہ ناممکن بات ہے، یہ تو ہمارا یقین نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ یقین ہو تو مٹی بھی سونا بن جاتی ہے، اللہ

کے ساتھ یقین ہو تو زبان کے ساتھ کلمہ نکلتا ہے اور میرا مالک اپنی رحمتیں فرما دیتا ہے۔ اور اگر خدا کے دروازے پر رہنے کے بعد آدمی کا ایمان، ایقان اور یقین درست نہ ہو تو اللہ ہدایت دے اور کوئی مرکزِ ہدایت ہمیں نظر ہی نہیں آتا......تو وہ آدمی بڑا ناراض ہو کر چلا گیا۔ اس نے شاید سمجھا کہ مولوی صاحب نے کعبہ میں جھوٹ بولا کہ مجھے سونا بنانا نہیں سکھلایا، وگرنہ تو میں اس کا نام بھی نہیں جانتا۔

تو وہ آدمی جو بزرگ کی خدمت کرتے رہے تھے ان سے بزرگوں نے کہا کہ "کُلُّ سِرٌّ"۔ ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جیسا کہ ہے "نَصٌّ، حَکِیْمٌ، قَاطِعٌ، لَهٗ، سِرٌّ" تو ان چودہ حروفِ معجمات کو جمع کیا جو غیر مکرر ہیں۔ تو ان بزرگوں نے فرمایا "کُلُّ سِرٌّ"۔ انہوں نے فرمایا کہ بھائی! دنیا کے اندر چار علم ہیں: 1 ......کیمیا۔ 2 ......لیمیا۔ 3 ......سیمیا۔ 4 ......اور ریمیا۔ لوگ تو صرف کیمیا کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں سونا بنانے کے لیے، وگرنہ اور علم اس سے بہت بڑے بڑے ہیں۔ سونا بنانا تو معمولی سی بات ہے، کوئی چیز ہی نہیں۔ تو کیمیا، لیمیا، سیمیا اور ریمیا، یہ چار علم ہیں، ان کو جمع کرو تو "کُلُّ سِرٌّ" بن گیا۔ تو معنی یہ ہے کہ یہ سب اللہ کے راز ہیں۔ اللہ چاہتے ہیں تو کسی پر کھول دیتے ہیں اور کسی پر نہیں کھولتے۔ اگر چاہا تو خضر علیہ السلام پر کھول دیا اور اگر نہیں چاہا تو موسیٰ علیہ السلام کے لیے نہیں کھولا۔ حالانکہ حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت میں بھی اختلاف ہے، کیا وہ نبی بھی تھے یا نہیں تھے؟ لیکن موسیٰ علیہ السلام کی رسالت میں تو کوئی جھگڑا بھی نہیں ہے۔ تو اللہ نے بعض علوم کو خضر علیہ السلام پر کھول دیا، لیکن موسیٰ علیہ السلام پر نہیں کھولا۔ بعض علوم کو اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر کھول دیا اور داؤد علیہ السلام پر نہیں کھولا۔ تو یہ اللہ کے راز ہوتے ہیں، اَسرار ہوتے ہیں۔

❁......ظاہر ہے کہ اگر کلام جملہ کی صورت میں ہو تو تم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر میں کلام حروف کی صورت میں اتاروں تو بھی تم مقابلہ نہیں کر سکتے، ورنہ یہی تو حروف ہیں جو تم رات دن اپنی زبان میں استعمال کرتے ہو، تم بھی ان حروف سے کوئی علیحدہ چیز بنا کر لے آؤ۔ اس قول کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔

❁......علامہ زمخشری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس لیے اللہ نے سارے حروف اکٹھے نہیں رکھ دیے، بلکہ کہیں تین آئے، کہیں دو آئے اور کہیں ایک آیا، یا مختلف سورتوں میں، تاکہ جب سورت اترے تو کافروں کو چیلنج کرے کہ آؤ مقابلہ کرو، ہمارے مقابلہ میں کلام بنا کر لے آؤ۔ اس لیے "صٓ"، "نٓ" اور "قٓ" ایک ایک حرف ہیں۔ اور کہیں دو حرف ہیں: "طٰسٓ"، "حٰمٓ"، "طٰهٰ"۔ اور کہیں تین حروف ہیں: "الٓمّٓ"، "الٓرٰ"۔ کہیں چار حروف ہیں: "الٓمّٓصٓ"۔ کہیں پانچ حروف ہیں: "کٓهٰیٰعٓصٓ"، "حٰمٓ عٓسٓقٓ"۔ کیونکہ کافروں کے کلام میں بھی کہیں کہیں ایک

حرف، کہیں دو حرف اور کہیں تین یا چار یا پانچ ہوتے ہیں۔ تو اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بھی انہی سے مرکب کر کے اپنا کلام بھیجا ہے تو مقابلہ کرو۔

خدا کی قدرت ہے انتیس ۲۹ سورتوں کے اندر یہ مقطعات ہیں۔ فرمایا:

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ [البقرۃ:۱،۱]

﴿الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝﴾ [آل عمران:۱،۲]

﴿الٓمّٓصٓ ۝ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [الاعراف:۱،۲]

﴿الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝﴾ [ابراہیم:۱]

﴿الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ [السجدۃ:۲]

﴿حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝﴾ [الاحقاف:۲]

﴿طٰسٓمٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝﴾ [الشعراء:۱،۲]

﴿كٓهٰيٰعٓصٓ ۝ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝﴾ [مریم:۱،۲]

یعنی اللہ نے حروف بھی وہیں لگائے جہاں قرآن نے تحدی کی کہ اللہ نے قرآن اتارا، اللہ نے اپنی کتاب آپ کی طرف بھیجی۔

قرآن کی ان آیات پر غور کریں تو ان لوگوں کا قول قوی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کے قرآن کا اعجاز ہے بس......!

اور جن لوگوں نے یہ کہا کہ اس سے مراد مدت، اعداد اور سن ہیں اور ان سے حوادث اور نوازل کی معلومات ہو جاتی ہیں، مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ ان سے خطا ہوئی اور انہوں نے ایسے مسئلہ میں دخل دیا ہے جس میں دخل دینے کا حق بھی نہیں پہنچتا۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۳۸، البقرۃ: الآیۃ: الٓمّٓ]

واقعہ:

ابو یاسر بن اخطب یہودیوں کی ایک جماعت کے ساتھ حضور ﷺ کے پاس سے گزرا تو حضور ﷺ یہ پڑھ رہے تھے:

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ﴾[البقرۃ:۱]

وہ اپنے بھائی کے پاس آیا اور کہا کہ آج میں نے سنا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ یہ آیت مبارک پڑھ رہے تھے۔ کہا کہ تم نے یہ خود سنا؟ اس نے کہا: ''جی ہاں'' تو وہ اس جماعت کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں آیا۔ انہوں نے کہا: ''حضور! آج ہمیں پتہ چلا ہے کہ آج آپ نے یہ آیت پڑھی ہے: ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ﴾[البقرۃ:۱]؟'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! میں نے پڑھا۔'' انہوں نے کہا: ''یہ کلام جبرئیل علیہ السلام لایا ہے اللہ کی طرف سے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں!'' اب اس نے کہا: ''حضور! پہلے جتنے انبیاء پر کتاب اتری تھی ان کے اندر تو ایسے حروف مقطعات نہیں ملتے، لیکن اللہ نے کلام آپ پر اتارا ہے اس میں یہ ملتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اسلام اور دین کی مدت اکہتر (۷۱) سال ہے کہ ''الف'' سے ایک، ''لام'' سے تیس اور ''میم'' سے چالیس ہے۔'' تو کہنے لگا کہ اس دین میں ہم کیسے داخل ہوں جو ستر سال کے بعد ختم ہو جائے گا۔ اس نے کہا: ''یہ اکہتر (۷۱) بنتے ہیں۔ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی حروف اترے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''الٓرٰ''۔ کہنے لگا: ''یہ تو اور زیادہ مدت لمبی ہوگئی۔'' ''الف'' ایک، ''لام'' تیس اور ''راء'' دوسو ہوگئے۔'' جب حضور ﷺ نے سارے پڑھے تو کہنے لگے کہ اب ہم گھبرا گئے ہیں کہ پتہ نہیں آپ کو زیادہ مدت ملی ہے یا کم ملی ہے؟ سمجھ نہیں آ رہا ہے، یعنی جب تھوڑی تھی تو نخرے کر رہا تھا۔ اس کے بعد کہنے لگا کہ اٹھو چلو یہاں سے۔ اس کے بھائی نے کہا: ''گھبراتے کیوں ہو؟ ہوسکتا ہے کہ اللہ نے ان کی امت کو سات سو چار سال (۷۰۴) مدت دی ہو، لیکن یہ جھوٹ ہے، ہم تو...... الحمدللہ...... اب پندرھویں صدی میں جا رہے ہیں اللہ کی رحمت سے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۸، البقرۃ: الآیۃ: الٓمّٓ]

﴿الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ﴾ میں اشارہ بعید کا استعمال:

''ذٰلِكَ'' اشارہ ہے اس کتاب کی طرف ''لَا رَیْبَ فِیْهِ'' جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں۔ پہلی صفت ''لَا رَیْبَ فِیْهِ'' ہے کہ جس میں کوئی شبہ نہیں۔ اور دوسری صفت یہ ہے کہ ہدایت ہے ڈرنے والوں کے لیے۔ ''ذٰلِكَ'' اسم اشارہ بعید کے لیے ہے۔ کوئی چیز قریب ہو تو کہا جاتا ہے ''هٰذَا الرَّجُلُ'' اور بعید ہو تو ''ذٰلِكَ الرَّجُلُ''

علمائے قواعد کہتے ہیں ''هٰذَا'' قریب کے لیے اور ''ذَاكَ'' متوسط کے لیے اور ''ذَالِكَ'' بعید کے لیے ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا: ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ''۔ یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ جب کتاب موجود ہے تو دور کا اشارہ کیوں لایا

گیا؟ اللہ نے ''هٰذَا الْكِتٰبُ'' کیوں نہیں فرمایا؟ اس اشکال کے متعدد جوابات دیے گئے ہیں:

1 ......ذَالِكَ، هٰذا کے معنی میں ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے رہتے ہیں، جیسے: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا﴾ [الاسراء:٩]

وہاں اللہ نے فرمایا ''اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ'' یہاں آگیا ''هٰذَا''، حالانکہ سارا قرآن تو مراد نہیں، بلکہ جتنا اتر چکا وہ مراد ہے تو یہاں ''ذَالِكَ'' آنا چاہیے، لیکن ''هٰذَا'' استعمال ہوا۔ تو کہیں اللہ نے قرآن میں فرمایا: ''هٰذَا الْكِتَاب'' اور جب جن حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو انہوں نے کہا تھا: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ [الاسراء:٩] اور کہا تھا: ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا﴾ [الجن:١] اس لیے ''ذَالِكَ'' اور ''هٰذَا'' ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/٣٩، البقرة: الآية: ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

2 ......''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ'' کہ سورۂ فاتحہ تو مکہ میں نازل ہوئی تھی اور سورۂ بقرہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی تو ان دونوں کے درمیان نزول میں کافی بعد آگیا۔ اسی فاتحہ میں ہم نے مانگا تھا: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ [الفاتحہ:٥] اس دعا کو اللہ نے منظور فرما کر قرآن عطا فرمایا کہ صراطِ مستقیم کیا ہے؟ میرا قرآن ہے۔ اسی طرف اشارہ ہے ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ'' میں۔ وہ جو تم نے سورۂ فاتحہ میں دعا مانگی تھی، اس اعتبار سے ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ'' کہنا درست ہے۔

[تفسیر روح المعانی: ١/٨٩، البقرة: الآية: ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

3 ......''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ'' سے پہلے ''الٓمّٓ'' ہے۔ یہ ایک کلام ہو گیا اور گزر گیا تو اب اس کے بعد ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ آیا۔ ''ذٰلِكَ'' سے اسی سورت کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ حضور ﷺ پر اتار رہے ہیں، اسی لیے ''ذٰلِكَ'' اشارہ بعید لایا گیا، کیونکہ پہلا کلام ختم ہو گیا، اب اس کلام اور اسی سورت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

4 ......قرآن باعتبار ظاہر کے اور باعتبار سوَر کے تو قریب ہے، لیکن جو اس میں اَسرار و رموز، حِکَم، مضامین اور معانی ہیں وہ تو اتنے چھپے ہوئے ہیں کہ عام آدمی تو کیا علماء بھی وہاں بڑی مشکل سے پہنچتے ہیں۔ وہ تو ایک بحرِ بے کنار ہے کہ چودہ سو سال گزر گئے، لیکن آج تک دنیا اس کتاب کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ یعنی اپنے تو اپنے رہ گئے، دشمنوں نے بھی اعتراف کیا، نہ ایسی کوئی کتاب آئی ہے اور نہ آئندہ کوئی ایسی کتاب اتر سکتی ہے۔ اس لیے ''ذٰلِكَ'' اسمِ اشارہ بعید کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ [تفسیر الرازي: ٢/٢٥٩، تحت: قَوْلُهٗ تَعَالٰى: ذٰلِكَ الْكِتَابُ]

5 ......اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قرآن کو لوحِ محفوظ میں رکھا: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾

[البروج:۲۱،۲۲]، ساتویں آسمان پر ہے: ﴿وَ اِنَّهٗ فِيْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا﴾ [الزخرف:۴] ہمارے پاس ام الکتاب ہے، اس کے اندر قرآن پاک ہے۔ تو اب لوحِ محفوظ تک کوئی پہنچ نہیں سکتا۔ ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دلھانا چاہیں تو اور بات ہے۔ قرآن لوحِ محفوظ میں اترا، پھر اس کے بعد بیت العزت میں آسمانِ دنیا پر اتارا گیا اور پھر بیت العزت سے تیئیس (۲۳) سال کی مدت میں حضور ﷺ پر اتارا گیا۔ تو ''ذٰلِكَ'' سے اس کتاب کی طرف اشارہ ہے جو لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔ اس لیے اسمِ اشارہ بعید استعمال کیا گیا ہے۔

[تفسیر الرازی:۲/۲۵۹، تحت: قَوْلُهٗ تَعَالٰی: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ]

...... مدینہ منورہ میں مقابلہ یہود کے ساتھ تھا اور تورات میں آپ ﷺ کی صفات وصورت بیان کی گئی تھی۔ تو اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے اسم اشارہ بعید کا استعمال کیا گیا ہے۔

[روح المعانی:۱/۸۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

حضور ﷺ سے پہلے یہودی مدینہ میں کیوں ٹھہرے؟

چونکہ مدینہ منورہ میں یہودی آباد تھے، ان کے بڑے بڑے قبیلے تھے: بنونظیر، بنوقینقاع۔ اسی طرح ان کا سردار کعب بن اشرف تھا۔ اور یہ یاد رکھیں کہ یہ مدینہ منورہ میں کب آباد ہوئے؟ مدینہ منورہ ان کا وطن نہیں ہے، جیسا کہ یہود بے بہود نے اپنا موجودہ نقشہ بنایا ہوا ہے کہ مدینہ ہمارا علاقہ ہے، ہمارا ملک ہے۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اصل میں ان کی تاریخ کیا بتلاتی ہے؟ ان کی تاریخ یہ ہے کہ جب تُبّع آیا جو یمن کا بادشاہ گزرا ہے...... اور کئی تُبّع گزرے ہیں، جیسے مصر کے بادشاہوں کو ''فرعون'' کا لقب ملتا تھا، اسی طرح روم کے بادشاہوں کو ''ہرقل'' کا لقب ملتا تھا، یمن کے بادشاہوں کو ''تُبّع'' کا لقب ملتا تھا..... تو وہ تُبّع جس نے سب سے پہلے اللہ کے کعبہ پر غلاف چڑھایا تھا اس کے پاس یہودی شام سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئے اس انتظار میں کہ اپنی کتابوں میں پڑھ چکے تھے کہ اب زمانہ قریب ہے کہ نبی پیدا ہوگا، جس کا نام ''محمد (رسول اللہ ﷺ)'' ہوگا...... کیونکہ میرے پاک نبی ﷺ کی نشانیاں تورات میں بھی تھیں، انجیل میں بھی تھیں اور زبور وصحائف میں بھی تھیں۔ کوئی پیغمبر اور اللہ کا نبی ایسا نہیں گزرا جس نے آنے والے نبی کی بشارت نہ دی ہو کہ ایک نبی پیدا ہوں گے۔ تاکہ دنیا انتظار میں رہے کہ آنے والا آرہا ہے۔ اور پھر جتنے پیغمبر آئے تو جانے کے لیے، میرے مدنی کو اللہ نے ایسی نبوت دی، آئے تو چھا جانے کے لیے۔ یہ قیامت تک کے لیے نبوت محمد عربی ﷺ کو دی..... تو یہ یہودی وہاں سے ہجرت کر کے اپنا ملک چھوڑ کر

آ گئے۔ یہ مدینہ ان کا ملک نہیں ہے۔ یہ ابتداء سے بھی غدار ہیں اور آج تک بھی غدار ہیں۔ تو یہ مدینے کے پاس ہجرت کر کے آئے۔

ان کے بڑے بڑے مثلاً: کعب بن اشرف، مالک بن سیف یہ انتظار کر رہے تھے کہ وہ نبی پیدا ہوں گے...... کیونکہ انہوں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ ایک آخری نبی پیدا ہوگا، نام اس کا محمد (ﷺ) ہوگا، مکہ میں پیدا ہوں گے اور ان کی ہجرت کا مقام مدینہ منورہ ہوگا۔ تو یہ مدینہ میں آ کر آباد ہو گئے، تا کہ حضور ﷺ آئیں تو ان پر ہم ایمان لائیں گے۔ ایمان لانے کے بعد ہمیں طاقت ملے گی۔ اور اس نبی کے پیدا ہونے سے پہلے ہم اس مقام پر موجود ہوں گے تو اس پر ایمان لائیں گے۔ اصل میں یہ اس لیے یہاں آئے تھے...... لیکن جب آقا سرکار مدینہ ﷺ کی پیدائش ہوئی تو پہلے نبوت کا جو سلسلہ چلا آ رہا تھا وہ بنی اسرائیل میں تھا، کیونکہ جتنے پیغمبر آ رہے تھے وہ بنی اسرائیل میں آ رہے تھے۔ سارے نبیوں کی آپ شان دیکھ لیں! حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، پھر ان کے بھائی، اسی طرح سارا سلسلہ نبوت بنی اسرائیل میں تھا۔ اللہ نے اپنے کلام میں فرمایا کہ بنو اسرائیل کو ہم نے کتنی بڑی فضیلت دی کہ ان کو ہم نے دنیا میں سب سے افضل بنایا اور فرمایا:

﴿اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ [المائدۃ:۲۰]

”تم میں انبیاء پیدا کیے، نبی پیدا کیے، تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں ایسی نعمتیں دیں کہ تم سے پہلے کسی انسان اور جن کو نہیں دیں۔“

تو یہ اس زمانہ میں اسی انتظار میں رہے۔ اب مدنی کی پیدائش ہوئی تو آپ بنی اسرائیل کی بجائے ولدِ اسماعیل میں پیدا ہوئے...... حالانکہ اسماعیل اور اسحاق بھائی ہیں۔ یہ تو بغض ہے۔ جیسے آج کل ہمارے ہاں بغض ہے، وگرنہ مہاجر اور انصار کیا ہیں؟ بھائی ہیں اور ہر مسلمان بھائی ہے، لیکن اللہ رحمت کرے! بھائیوں میں اتنی عداوتیں ہیں کہ اتنی غیروں میں بھی نہیں ہیں...... تو ان کے دل میں بغض آیا کہ ہائے آج نبوت ولد اسماعیل کی طرف منتقل ہو گئی!! بنو اسرائیل کو محروم کر دیا گیا...... اور یہ بھی ان کو پتہ تھا کہ حضور ﷺ خاتم الانبیاء ہیں، کیونکہ وہ میرے مدنی پاک کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو جانتے ہیں۔ یہ مثال ہے کہ آدمی اپنی اولاد کو نہیں بھولتا، دس ہوں، پانچ ہوں، اندھیرے میں بھی بات سنے گا تو کہے گا فلاں بیٹا بول رہا ہے، چل کے آ رہا ہے تو کہے گا کہ معلوم ہوتا ہے کہ میرا بیٹا آ رہا ہے، کھانسی آ جائے تو پتہ چلے گا کہ کھانسی تو میرا بیٹا کر رہا ہے۔ اتنا یقین ہوتا ہے...... تو ان کو یقین تھا کہ

سچے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ خاتم الانبیاء، حبیب الکبریاء ہیں، لیکن جب حضور ﷺ آ گئے تو بغض آ گیا۔ جب بغض آ گیا یہ تو سب سے بڑے دشمن محمد ﷺ کے بنے۔ اور یہ قوم ابتداء ہی سے لالچی تھی: ﴿وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ (البقرۃ: ۱۷۴)

"اللہ کی آیات بدل ڈالتے تھے پیسے لینے کے لیے۔"

اندازہ کریں! تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں! آج بھی انجیل کے اندر یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ یہودیوں سے صرف تیس درہم لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑوا دیا۔ رشوت بھی صرف تیس روپے تھے۔ آج کے اعتبار سے پانچ سو یا ہزار بن جائے گا۔ یعنی ابتداء سے ان کی یہ عادت تھی کہ پیسے لیتے تھے اور آیات کو بدل ڈالتے تھے۔ اللہ رحمت کرے! آج بھی اگر انجیل پر نظر ڈالیں، تورات پر نظر ڈالیں تو آپ حیران ہو جائیں گے! آج بھی ایسی باتیں ان میں موجود ہیں کہ ان کو ایک شریف انسان پڑھ نہیں سکتا۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ لوط علیہ السلام اپنی بیٹیوں سے زنا کرتے تھے...... نعوذ باللہ!...... اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ یہ اللہ کی کتاب ہو سکتی ہے......؟؟ جس میں ایسی باتیں لکھی ہوئی ہوں۔ جہاں یہ لکھا ہوا ہو کہ انبیاء علیہم السلام کا اپنی بیٹیوں نے ناجائز تعلق تھا، جہاں کواکب اور اصنام پرستی لکھی ہو۔ خدا کی شان دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیسی عظمت والی چیز عطا فرمائی ہے!!

اس کتاب میں کوئی شک نہیں:

تو مالک بن یوسف نے آپ ﷺ کی مخالفت شروع کی اور شکوک و شبہات ڈالنے شروع کیے، حضور ﷺ کے بارے میں سیرت بدلنی شروع کی، پیغمبر کے بارے میں صورت بدلنی شروع کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں سورۃ البقرۃ اتار کر فرمایا: ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ [البقرۃ: ۱] یہودیو! تم بڑے عالم بنتے ہو اور اپنے علم پر ناز کرتے ہو تو بتلاؤ کہ "الٓمّٓ" کا ترجمہ کیا ہے؟...... کون جانے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ نہ بتلائے۔ اور فرمایا جس کتاب اور جس نبی کے بارے میں تم شبہات پیدا کرتے ہو تو "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ" یہ کتاب تو ایسی شان والی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

عجیب واقعہ! حضور ﷺ کی تصدیق:

روایت میں آتا ہے کہ ایک دن حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ...... جو یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے، جنہیں حافظِ تورات کا لقب تھا اور جن کو تورات یاد تھی...... ان سے پوچھا کہ عبداللہ بن

سلام! اب تو تم اسلام میں آ گئے، تم نے کلمہ پڑھ لیا، لیکن اب تم یہ بتلاؤ کہ کلمہ پڑھنے سے پہلے تمہیں حضور ﷺ کے بارے میں کوئی شبہ تھا یا کوئی شک تھا کہ آپ ﷺ سچے نبی ہیں؟ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! ہمیں اپنی اولاد میں تو شک ہو سکتا ہے، لیکن حضور محمد ﷺ کی صداقت میں کوئی شک نہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا مطلب؟'' کہنے لگا: ''اے عمر! اپنی اولادوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ ایک عورت کی گواہی ہوتی ہے کہ وہ کہتی ہے کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کون عورت کی گارنٹی دے سکتا ہے؟ اور تو ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ یہ سو فیصد ہمارا بیٹا ہے اور ہماری بیوی نے کوئی غلطی نہیں کی۔ خدا جانے نہ کی ہو یا کی بھی ہو، لیکن کیا ثبوت ہے؟ لیکن اللہ کے نبی ﷺ کے بارے میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں، کیونکہ وہاں تو ایک ایک وضاحت، ایک ایک علامت اور ایک ایک چیز لکھی ہوئی تھی کہ میرے نبی کا نام لکھا ہوا ہے، نسب لکھا ہوا ہے، میرے نبی ﷺ کا خاندان لکھا ہوا ہے، میرے نبی کا جائے مولد لکھا ہوا ہے، میرے نبی کی عادات لکھی ہوئی ہیں، میرے نبی کی صفات لکھی ہوئی ہیں، میرے مدنی کی صورت لکھی ہوئی ہے اور میرے نبی کا مقامِ ہجرت لکھا ہوا ہے۔ اور یہ تفاصیل کہ پھر میرے مدنی کے یار لکھے ہوئے ہیں، خلفائے اربعہ لکھے ہوئے ہیں، ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما لکھے ہوئے ہیں، اصحابِ رسول لکھے ہوئے ہیں اور ان کی نشانیاں لکھی ہوئی ہیں۔ [روح المعانی: ۲/ ۵۲، البقرۃ: الآیۃ: الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ]

جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب قسطنطنیہ فتح فرمالیا تو ایک بوڑھا سا پادری آیا اور اس نے آ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک کاغذ رکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمانے لگے: ''عمر اور عمر کے بیٹے کا یہ مال نہیں ہے۔'' صحابہ حیران ہو گئے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں......!؟ تو فرمایا کہ بڑے پرانے دور کی بات ہے، ابھی ہم کفر کے زمانے میں تھے اور میں شام تجارت کے لیے گیا۔ تجارت کر کے ہم واپس آ رہے تھے تو مجھے شام میں اپنا کچھ سامان بھول گیا، میں قافلے کو چھوڑ کر واپس اپنا سامان لینے کے لیے گیا۔ اتنی دیر میں قافلہ نکل گیا اور قافلہ مجھے نہ ملا۔ میرے پاس نہ زادِ راہ تھا اور نہ سامان تھا اور سارا قافلہ میں تھا، تجارت کا مال سب قافلہ میں تھا۔ میں تھکا ہارا ایک گرجا کے سائے کے نیچے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گزری کہ ایک پادری آ گیا۔ اس نے پوچھا: کیا بات ہے؟ کون ہو؟ میں نے کہا: ''مسافر ہوں۔'' اس نے کہا: ''یہاں کیوں بیٹھے ہو؟'' میں نے کہا کہ بھول گیا ہوں، قافلہ سے بچھڑ گیا ہوں۔ تو اس نے کہا: ''چلو اندر چلو۔'' مجھے اپنے گرجا میں لے گیا اور اس کا دروازہ بند کر دیا۔

اندر مٹی کا ایک ڈھیر پڑا تھا، ایک پھاوڑا لوہے کا پڑا تھا۔ مجھے کہا: ''پھاوڑا اٹھا لو اور یہ مٹی کا ڈھیر یہاں سے اٹھا

کر وہاں رکھو۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ یہ کہہ کر چلا گیا اور دروازہ بند کر گیا۔ اور عمارت اتنی مضبوط تھی کہ میں نہ دروازہ توڑ سکتا تھا، نہ میں باہر نکل سکتا تھا۔ اب میں حیران پریشان! میں کیوں مٹی اٹھاؤں؟ میں کوئی مزدور ہوں؟ میں کوئی اس کا نوکر ہوں؟ میں چپ کر کے بیٹھ گیا تو دو، تین یا چار گھنٹے کے بعد وہ دوبارہ آیا اور آ کر دیکھا کہ میں ٹیک لگا کر سویا ہوا تھا۔ اس نے مجھے اٹھایا اور کہا: ''تم نے کام کیوں نہیں کیا؟'' میں نے کہا کہ میں کوئی تمہارا نوکر ہوں کہ کام کروں؟ اس نے مجھے پھاوڑا مارنے کی کوشش کی تو میں نے اس سے پھاوڑا لے کر اسے ختم کر دیا...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ لگا ہو تو کفر مر جاتا ہے۔ تو اس پادری کی کیا طاقت تھی......؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ضرب تو لوگ آج تک برداشت نہ کر سکے، چودہ سو سال گزر گئے، لوگ آج بھی نام سنتے ہیں تو خوف زدہ ہو کر چیختے ہیں......

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اب دو باتیں ہو گئیں: ایک بھولا ہوا مسافر۔ دوسرا اس سے ایک بندہ مر گیا۔ ملک پرایا، علاقہ پرایا۔ میں وہاں سے بھاگا۔ میں دروازہ تو کھول سکتا تھا، چابی موجود تھی۔ دروازہ کھول کر میں بھاگا بھاگا سفر کرتا رہا، بھٹکتا رہا، پھرتا رہا، کہیں کوئی جائے پناہ ملے۔ پھر تھک ہار کر ایک جگہ محفوظ مقام میں جا کر بیٹھ گیا، تا کہ وہاں رات گزار سکوں۔ دن ہو گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

فرماتے ہیں کہ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک اور پادری آ گیا۔ میں نے سوچا کہ ابھی ایک سے جان چھوٹی تھی، اب دوسرا آ گیا۔ اس نے آ کر پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ میں نے کہا: ''مسافر ہوں، مکہ کا رہنے والا ہوں، راستہ بھول گیا ہوں اور قافلہ سے بچھڑ گیا ہوں۔'' اس نے کہا کہ اچھا آئیں! آپ میرے ساتھ چلیں۔ وہ مجھے اندر لے گیا اور روشنی کی اور غور سے میرے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا، پھر پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا: ''عمر'' تو کہا: ''باپ کا نام کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''خطاب'' تو پوچھا: قبیلہ کون سا ہے؟ میں نے کہا: ''قریش'' تو کہا: ''پیدا کہاں ہوئے؟'' میں نے کہا: ''مکہ میں۔'' پوچھا: کام کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا: ''کچھ نہیں، تجارت کرتے ہیں۔ کبھی یمن آ گئے اور کبھی شام آ گئے۔'' اس نے کہا: ''اچھا ٹھیک ہے۔'' اس نے مجھے رات کو رکھا اور کھانا کھلایا اور میری بڑی خدمت کی اور بڑی عزت کی اور بڑا احترام کیا۔ اور مجھ سے پوچھا کہ آپ کا قافلہ کس راستہ سے نکلا تھا؟ میں نے کہا: ''فلاں راستے سے۔'' اس نے کہا: ''میں بڑے تیز رفتار گھوڑے مہیا کرتا ہوں اور اپنے ملازمین آپ کے ساتھ کر دیتا ہوں۔ چونکہ قافلہ جماعت کی وجہ سے آہستہ چلے گا، گھوڑے دوڑیں گے اور وہ آپ کو جلدی پہنچا دیں گے، لیکن ایک کاغذ ہے، مہربانی کر کے یہ جو میرا گرجا ہے اور اس کا علاقہ ہے، مجھے پرچہ پر لکھ دیں کہ جب

آپ بادشاہ بنیں گے تو یہ علاقہ مجھ سے نہیں چھینا جائے گا اور نہ مجھ سے ٹیکس لیا جائے گا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم عجیب آدمی ہو! میں ایک عرب آدمی ہوں، مکہ میں پیدا ہوا، قریش کا ایک عام آدمی ہوں، مجھے تو مکہ میں بھی سردار بن جانے کی امید نہیں اور تم مجھے یہاں قسطنطنیہ کا بادشاہ بنا رہے ہو۔ اس نے کہا: ''عمر! بات سنو! اگر تم بادشاہ نہیں بنو گے تو میں اس کاغذ کا کیا کرلوں گا؟ اور اگر تم بن گئے تو تمہیں لکھ کر دینے میں کیا حرج ہے؟ بادشاہ تو ملک کے ملک دے دیتے ہیں، میں تو تم سے گرجا مانگ رہا ہوں اور گرجہ کے ساتھ والی زمین کہ اس کا کوئی جزیہ مجھ سے نہ لیا جائے، کوئی خراج اور عشر نہ لیا جائے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ہنستا رہا اور میں نے کہا: ''جو مرضی آئے تم لکھو، میں دستخط کر دیتا ہوں۔'' میں نے سوچا! کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ ٹھیک بات کر رہا ہے، میں نے کون سا بادشاہ بننا ہے؟ وہ پرچہ لکھ کر لے آیا، میں نے اس پر دستخط کر دیے۔ اور اس سے پوچھا کہ تم یہ باتیں کیوں کر رہے ہو؟ اس نے کہا: ''میں ایسے بات نہیں کر رہا، اس وقت پوری روئے زمین پر مجھ سے بڑھ کر تورات کا کوئی عالم نہیں ہے، میں سب سے بڑا تورات اور انجیل کا عالم ہوں اور میں نے ان کتابوں میں جو نشانیاں پڑھی ہیں وہ تمہارے اوپر صادق آتی ہیں کہ ایک نبی پیدا ہوں گے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، تم اس کے خلیفہ بنو گے اور یہ سارا ملک تمہارے نیچے ہوگا، تم اس کو فتح کرو گے، یہاں اس کے دین کا جھنڈا گاڑو گے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں وہاں سے ہنستا ہوا چلا آیا، نہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی تصور تھا اور نہ کوئی خیال تھا، میں وہ بات بھول گیا۔ آج وہی بوڑھا، وہی لکھا ہوا میرے سامنے لے کر بیٹھا ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ آج تو آپ بادشاہ ہیں۔ تو میں نے کہا کہ یہ عمر اور عمر کے بیٹے کی جائیداد نہیں ہے۔ میں بادشاہ نہیں ہوں، میں خلیفہ ہوں، اللہ کے حکم کو چلانے والا ہوں، میں اللہ کے حکم میں کوئی تجاوز نہیں کر سکتا۔ جو اسلام فیصلہ کرے گا وہی ہوگا۔ عمر کیا کرے گا؟ اس میں تو اللہ کا دین چلے گا، جو عمر کا حکم ہوگا۔

تو اس طرح یہود پہچانتے تھے۔ صرف میرے مدنی پاک کو نہیں، بلکہ ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کو بھی پہچانتے تھے۔ ان کی علامات کو بھی پہچانتے تھے، مگر بد بخت ایمان نہیں لاتے تھے۔ وہ تقریر کرتا تھا کہ کوئی اللہ کا کلام نہیں، یہ وہ نبی ہی نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں فرمایا:

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ [البقرۃ:۱]

''الْكِتَاب'' قرآن کا نام ہے۔ ''الْكِتَاب'' پر الف لام ہے، جیسے فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝﴾ [الکہف:۱] تو ''الْكِتَاب'' پر الف لام لگانے سے ایک طاقت اور شان

پیدا ہوئی کہ کتاب ہے تو قرآن ہی ہے۔ قرآن کو کتاب اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا مادہ 'ک' 'ت' اور 'ب' ہے۔ اس مادہ کا معنی ہوتا ہے جمع کرنا۔ آپ لکھتے ہیں کہ کاتب نے کتابت کی، مختلف چیزوں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ اس لیے فوج کے لشکر کو "کَتِیْبَۃ" کہتے ہیں، کیونکہ اس میں کوئی فوجی کدھر کا اور کوئی فوجی کدھر کا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب حروف آئیں گے تو کلمات بنیں گے اور جب کلمات جمع کریں گے تو آیات اور آیات کو جمع کریں گے تو سورتیں بنیں گی اور سور کو جمع کریں گے تو کتاب بنے گی۔ اس لیے فرمایا "ذٰلِکَ الْکِتَابُ"، کیونکہ قرآن میں بھی مختلف سورتیں اور آیات جمع ہیں۔

[روح المعانی: ۱/ ۹۰، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ]

دوسری جگہ قرآن میں ہے جب جبرئیل علیہ السلام پڑھتے تھے تو حضور پاک ﷺ بھی ساتھ ساتھ قرآن پڑھتے تھے، تاکہ قرآن بھول نہ جائے تو اللہ نے فرمایا:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿١٦﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿١٩﴾﴾ [القیامۃ: ۱۶ تا ۱۹]

یہاں تھوڑی جمع شدہ کا نام قرآن ہوگیا، نام تو کتاب بھی ہوسکتا تھا، جیسے: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ﴾ [ابراہیم: ۱] لیکن یہاں فرمایا: "الْكِتٰبُ"۔ ایک جگہ نکرہ ہے اور ایک جگہ معرفہ ہے۔ معرف باللام کبھی تفخیم کے لیے ہوتا ہے، یعنی کسی چیز کی شان بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے، جیسے: "رَجُلٌ عَظِیْمٌ"، "رَجُلٌ کَرِیْمٌ"، اسی طرح کتاب کیسی شان والی کتاب!! اور کبھی کبھی الف لام لگا دیتے ہیں، تاکہ پتہ چلے کہ ہم کون سی کتاب کی بات کر رہے ہیں؟ وہ کتاب قرآن ہے۔ آپ نے فاتحہ میں جو مانگا تھا: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿٥﴾﴾ [الفاتحۃ: ۵] وہی ہے جو ہم نے آپ کو دیا ہے۔

کتاب کا ایک معنی:

کبھی کبھی کتاب کا معنی ہوگا فرض کیا گیا۔ مادہ "کُتِبَ" ہوگا، جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ﴾ [البقرۃ: ۱۷۸]

جیسے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ [البقرۃ: ۱۸۳]

لفظ کتاب کا ہے، لیکن معنی فرض ہے۔ فرض کیا ہم نے آپ لوگوں پر روزہ اور ہم نے فرض کیا آپ لوگوں پر قصاص۔ اگر کوئی قتل ہوجائے تو قاتل سے قصاص لیا جائے تو یہاں بمعنی فرض کے ہے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ [البقرۃ:١٨٠]

اللہ نے فرمایا: ہم نے تم فرض کردیا ہے کہ جب موت قریب آئے تو وصیت تیار رکھو۔

دو گواہوں کے ساتھ وصیت کرو، تاکہ بعد میں جھگڑے نہ ہوتے رہیں، خاندان نہ لڑتا رہے، بلا وجہ آپس میں سر پھٹول نہ ہوتی رہے۔ تم وصیت لکھ ڈالو اور دو گواہ بھی بنا ڈالو، تاکہ بعد میں کسی قسم کی بات نہ ہو۔ تو ایسی کتاب جس میں اللہ نے فرائض بیان کیے اپنے حکم بیان کیے تو اب اللہ تعالیٰ کے احکام و فرائض یا نص کتاب یا قرآن اس کا ہر حکم قطعی بھی ہے اور یقینی بھی ہے۔ اللہ کے قرآن کا جو بھی حکم ہوگا وہ قطعی ہوگا، یقینی ہوگا، یعنی وہ ظنی نہیں ہوگا، یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ اس میں ذرہ سا بھی ظن پایا جائے، بلکہ اس میں قطعیت ہوگی اور یقین ہوگا کہ بالکل اللہ کا حکم ہے۔ اس لیے آگیا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾، ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ﴾، ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ یہاں ﴿كُتِبَ﴾ فرض کے معنی میں آگیا۔ تو اللہ کا ہر حکم قطعی اور یقینی ہوتا ہے، اس میں ذرہ برابر کوئی ظن اور گمان اور کوئی شبہ نہیں ہوتا، اس لیے فرمایا: ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ'' [تفسیر الرازي: ٢/٢٦٠، البقرۃ: تحت: مَدلُول لَفظِ کتاب']

اور قرآن کا نام ''قرآن'' بھی آیا اور ''الکتاب'' بھی آیا اور اسی طرح قرآن کا نام ''الفرقان'' بھی آیا، ''ذکر'' بھی آیا، ''شفاء'' بھی آیا، ''ھدیٰ'' بھی آیا، ''مبشرا و نذیرا'' بھی آیا اور اسی طرح قرآن کا نام ﴿إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝﴾ [الطارق: ١٣، ١٤] بھی آیا، اسی طرح قرآن کا نام آیا: ﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۝ فِي كِتَابٍ مَكْنُونٍ ۝ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۝﴾ [الواقعۃ: ٧٧ تا ٧٩]، اسی طرح قرآن کا نام ''مثانی'' بھی آیا، اللہ نے فرمایا: ہم نے آپ کو ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۝﴾ [الحجر: ٨٧] دیا۔ اسی طرح قرآن کا نام ''حدیث'' بھی آیا ہے: ﴿اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا﴾ [الزمر: ٢٣] اور کہیں فرمایا: ''﴿فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ۝﴾ [المرسلات: ٥٠] تو کہیں فرمایا ''مَوْعِظَة'' اور کہیں ''ذکر'' فرمایا۔

[تفسیر الرازي: ٢/٢٦٠ تا ٢٦٤، البقرۃ: تحت: مدلول لفظ کتاب']

تفسیر:

تو یاد رکھو! قرآن کے بھی کئی نام ہیں: قرآن...... ذکر...... کریم...... قول فصل...... موعظہ...... ھدیٰ...... اور

رحمۃ۔ ان میں سے ''الکتاب'' بھی ہے، اس لیے یہاں فرمایا: ''الْكِتَاب''۔ یہی کتاب ایسی ہے جو اصل کتاب کہلانے کی مستحق ہے، اس لیے اس کو معرف باللام لائے۔

کتاب اللہ اور کلام اللہ میں فرق:

یادرکھو! قرآن سے پہلے جتنی کتابیں اتریں ہیں وہ ''کتاب اللہ'' تو تھیں، لیکن ''کلام اللہ'' نہیں تھیں۔ اللہ نے تقریباً چار ساڑھے چار سو کتابیں اتاری ہیں، ان میں معروف چند کتابیں ہیں۔ جو معروف ہیں وہ: تورات، زبور، انجیل، صحائفِ ابراہیم اور صحائفِ موسیٰ، ورنہ کتابیں زیادہ ہیں۔ وہ ساری ''کتاب اللہ'' تھیں، لیکن ''کلام اللہ'' نہیں تھیں۔ یہ شرف صرف قران کو ملا ہے کہ قران ''کلام اللہ'' بھی ہے اور ''کتاب اللہ'' بھی ہے۔ کتاب کا معنی ہے لکھا ہوا، جیسے آپ کے پاس کوئی خط آئے، کوئی پوچھے تو کہیں گے کہ خط لکھا ہوا آیا ہے۔ کلام کہتے ہیں کہ جو بولا جائے۔ خط پڑھیں گے تو کہیں گے کہ اس نے خط لکھا ہے، یہ نہیں کہیں گے کہ اس نے بات کی ہے۔ کوئی آدمی پوچھے گا تو آپ کہیں گے کہ فلاں آدمی نے کہا، وہ کہے گا بات کی، تو آپ کہیں گے کہ بات تو نہیں کی، لیکن خط لکھا ہے۔ اسی طرح باقی جتنی کتابیں ہیں وہ لکھی ہوئی کتابیں اللہ نے اپنے پیغمبروں کو دے دیں، لکھی ہوئی تورات دے دی، لکھی ہوئی انجیل دے دی، لکھی ہوئی زبور دے دی، لکھا ہوا صحیفہ دے دیا۔ وہ ''کتاب اللہ'' تو بن گئے، لیکن ''کلام اللہ'' نہ بنے۔ کلام اللہ صرف قرآن ہے جس کو اللہ نے خود کلام کیا، خود جبرئیل علیہ السلام پر پڑھا اور جبرئیل علیہ السلام کو پڑھایا۔ پھر جبرئیل علیہ السلام نے آکر میرے مدنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو قرآن کو ''کتاب اللہ'' بھی کہیں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پہلی کتابیں آج تک محفوظ نہیں ہیں، چونکہ وہ ''کتاب اللہ'' تو تھیں، لیکن ''کلام اللہ'' نہیں تھیں۔ تو قرآن قیامت تک محفوظ ہے، کیونکہ اللہ کی ذات حی اور قیوم ہے تو اس کا کلام کیسے ختم ہوگا؟ جیسے اس کی ذات کو فنا نہیں آئے گی، اسی طرح اس کے کلام کو بھی فنا نہیں آئے گی۔ اس کا کلام بھی قیامت تک محفوظ اور باقی رہے گا یہ شرف اسی کو ملا ہے۔ اس لیے فرمایا:

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱]

تو اس لیے اس کو معرف باللام لایا گیا کہ ہم نے جو آپ کے اوپر اتاری ہے ''الکتاب'' ہے۔

لفظِ ''قرآن'' کا استعمال بعض اور کل قرآن پر درست ہے:

اسی طرح مسئلہ سمجھ لیں کہ اگر قرآن کی صرف ایک سورت ہو تو بھی ہم اس کو قرآن کہیں گے، دو سورتیں ہوں تب

بھی ہم کہیں گے قرآن، دو آیتیں ہوں تو بھی ہم کہیں گے قرآن۔ یعنی قرآن کا اطلاق جیسے ساری کتاب پر ہوتا ہے اسی طرح تھوڑے سے حصہ پر بھی اس کا اطلاق ہوگا۔ جیسے اس آیت میں ہے:

﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ [الاعراف:۲۰۴]

''جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور چپ رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

یہ نہیں کہ جب سارا قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور جب تھوڑا پڑھا جائے تو نہ سنو۔ چاہے تھوڑا بھی پڑھو تو اس کے لیے لفظِ ''قرآن'' آیا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جب جنات نے قرآن سنا تھا تو کہا:

﴿فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا﴾ [الجن:۱]

''کہنے لگے کہ ہم تو عجیب قرآن سنا ہے!!''

حالانکہ حضور ﷺ نے سارا قرآن تو نہیں پڑھا تھا، صرف ایک سورت پڑھی تھی۔ جزء پر بھی قرآن کا اطلاق ہوتا ہے، اسی لیے آتا ہے کہ جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو میرے ماننے والے سجدے میں گر جاتے ہیں اور جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو ان کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ پورا قرآن تو ہر وقت کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! جیسے قرآن کا اطلاق کامل قرآن پر ہے، اسی طرح اس کے جزء پر بھی قرآن کا اطلاق ہے، اسی طرح لفظِ ''کتاب'' ہے۔ [روح المعاني: ۱/۹۰، البقرة: الآية: ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ]

اشارہ بعید لانے کی وجہ:

7 ......اللہ نے حضور ﷺ سے سورۂ مزمل میں وعدہ کیا تھا:

﴿إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا﴾ [المزمل:۵]

اب وہ وعدہ پورا ہونا شروع ہوا، اسی کی طرف اللہ نے اشارہ کیا کہ یہ وہ قول ہے۔ اس لیے اشارہ بعید لایا گیا ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ''۔ [روح المعانی: ۱/۸۹، البقرة: الآية: ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ]



الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ

شک سے پاک کتاب:

اس کتاب کی دو صفات ذکر کی گئی ہیں:

1 ......"اَلْکِتَاب" کی پہلی صفت "لَا رَیْبَ فِیْہِ" ہے۔

اور "اَلْکِتَاب" سے مراد قرآن ہے۔ "رَیْب"، رَابَ یَرِیْبُ سے ہے، کسی چیز کے بارے میں شک ہو، جیسے قرآن مقدس میں آتا ہے: ﴿رَیْبَ الْمَنُوْنِ﴾ [الطور:۳۰]

اسی طرح محاوراتِ عرب میں مشتمل حدیث میں ہے:

((دَعْ مَا یُرِیْبُکَ إِلٰی مَا لَا یُرِیْبُکَ.))

[سنن الترمذي، حديث:۲۵۱۸، سنن النسائي، حديث:۵۷۱۱، اَلْحَثُّ عَلٰى تَرْكِ الشُّبُهَاتِ]

"ان چیزوں کو تم چھوڑ دو جن میں شک پڑ جائے، ادھر آ جاؤ جن میں شک نہ ہو۔"

یعنی اگر آپ کے دل میں بلا وجہ شک ہو رہا ہے کہ پتہ نہیں حلال ہے یا حرام ہے؟ تو ان کو چھوڑ کر پکی بات کی طرف آ جاؤ۔ تو قرآن کی پہلی صفت آئی ہے کہ جس میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں، یعنی قرآن کا ہر حکم قطعی بھی ہے، یقینی بھی ہے اور اس کے اندر کسی قسم کا کوئی شک اور شبہ نہیں ہے۔

ہمیشہ شک وشبہ کی دو وجوہ ہوتی ہیں:

1 ......ایک تو اس چیز کے اندر کوئی ایسی بات ہے جس کی وجہ سے شک پڑ رہا ہے۔

2 ......یا یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن اس پڑھنے والے کے دماغ وفہم کے اندر نقص ہے جس کی وجہ سے وہ قرآن کو سمجھ نہیں پا رہا، وہ ایک حقیقت کو سمجھ نہیں رہا۔

سوال:

لوگ کہتے ہیں کہ کافر یہود ونصاریٰ اور ہندو وغیرہ قرآن کو نہیں مانتے تو اللہ تعالیٰ نے کیسے کہہ دیا کہ اس میں کوئی شک نہیں؟ ان لوگوں کو شک ہوا تو اس لیے انہوں نے نہیں مانا۔

جواب:

تو اس کی اصل وجہ سمجھیں کہ جو لوگ شک کر رہے ہیں ان کے فہم کے اندر تو نقص ہے، لیکن قرآن کے اندر کوئی شبہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے باقاعدہ چار مقام پر چیلنج کیا ہے:

1 ......ایک جگہ فرمایا:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ﴾ [البقرة: ٢٣]

2 ......دوسری جگہ فرمایا:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا﴾ [الاسراء: ٨٨]

3 ......تیسری جگہ فرمایا:

﴿قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ﴾ [ھود: ١٣]

تو اب وہ دس سورتیں بھی بنا کر نہ لا سکے۔ پھر اللہ نے فرمایا: آپ ان کو پھر چیلنج کریں کہ اگر دس سورتیں بھی نہیں بنا سکتے تو ﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ﴾ چلو تم قرآن کے مقابلے میں ایک سورت بنا کر لے آؤ ﴿وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ [البقرة: ٢٣] اور اللہ کے سوا اپنے تمام مدد کرنے والوں کو بلاؤ، ان کو پکارو کہ قرآن کے مقابلہ میں ایک سورت بنا کر دکھائیں؟ ﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا﴾ [البقرة: ٢٤] نہ زمانہ ماضی میں کوئی بنا سکا اور نہ قیامت تک کوئی قرآن کا مقابلہ کر سکے گا۔ ایک سورت بھی نہیں بنا سکتے تو یہاں تک تین چیلنج دیے۔

4 ......فرمایا:

﴿فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ﴾ [الطور: ٣٤]

اگر تم ایک سورت نہیں بنا سکے تو ایک آیت بنا کر لے آؤ۔ چلو قرآن کے مقابلہ میں ایک آیت اور ایک بات لے آؤ، ایک چیز کا تم مقابلہ کرو، اگر تمہیں شک ہے کہ یہ نبی ﷺ خود بناتے ہیں، کیونکہ آپ عربی ہیں اور کبھی تم کہتے ہو کہ یہ سیکھتا ہے اور پرانی کتابوں سے قصہ کہانیاں بنا بنا کر ہمیں سناتا ہے تو تم مقابلہ نہ کر سکے۔

[تفسير الرازي: ٢/٢٦٦، البقرة: تحت: تفسير قوله تعالى: لا ريب فيه]

اس زمانہ میں کوئی مقابلہ نہ کر سکے اور آج ہم پندرھویں صدی میں جا رہے ہیں، آج تک قرآن کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکا۔

آپ اندازہ کریں کہ ہم تو مسلمان ہیں، لیکن جو کافر ہے ایڈورڈ گبن انگلستان کا بہت بڑا مؤرخ گزرا۔ اس نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ محمد (ﷺ) ایک ایسی کتاب لے کر آئے ہیں جو تمام شکوک وشبہات سے محفوظ ہے، دنیا کی کوئی کتاب قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور حضور ﷺ ایسی کتاب لائے ہیں جس کے اندر ایسی قطعی اور یقینی باتیں ہیں کہ جو سورج طلوع ہوتا ہے وہ غروب بھی ہوتا ہے اور ہر غروب ہونے والی چیز فانی ہوتی ہے اور ہر فانی چیز زائل ہوتی ہے اور ہر زوال پذیر معدوم ہوتی ہے۔ جو معدوم ہوتی ہو وہ کیسے کسی کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ اور دنیا کی ساری کتابوں میں اوہام پرستی ہے۔ تورات اور انجیل کی طرف دیکھیں تثلیث کا عقیدہ منسوب کیا ہوا ہے کہ خدا تین ہیں۔ یہ کوئی عقل کی بات ہے......!!؟

ہندوؤں کی کتابوں اور عیسائیوں کی بائبل میں غلط باتیں:

اور تورات اور انجیل کے اندر اب تک یہ لکھا ہوا ہے کہ انبیاء گناہ کرتے تھے......نعوذ باللہ...... یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کا اپنی بیٹیوں کے ساتھ ناجائز تعلق تھا۔ ایسی کتابیں اللہ کی طرف منسوب ہو سکتی ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے......!؟؟ اور ادھر قرآن میں دیکھیں کہ اگر کہیں نکاح کی بات کی ہے، کہیں اگر میاں بیوی کے تعلق کی بات کی ہے، کہیں زوجیت کے حقوق کی بات کی ہے تو ایسی جامع اور کامل بات کی ہے اور ایسی مکمل بات کی ہے کہ جسے ایک مرد بھی پڑھ سکتا ہے اور ایک کنواری بچی بھی بیٹھ کر پڑھ سکتی ہے، ایک نوجوان بھی پڑھ سکتا ہے۔ دوست بھی پڑھ سکتا ہے اور دشمن بھی پڑھ سکتا ہے۔ یعنی اس لفظ کے اندر کوئی ایسی بات نہیں جس میں ثقل پایا جائے، یا عظمت کے لحاظ سے کمزوری ہو۔ یہ صفت اگر ملی ہے تو صرف قرآن پاک کو ملی ہے۔ اگر آپ وید اٹھا کر دیکھ لیں اور ہندوؤں کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں! ایسی ایسی باتیں آپ کو ملیں گی انسان ان کو پڑھ ہی نہیں سکتا ہے، حالانکہ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ وید بھی آسمانی کتابیں ہیں اور ان کے دعوئی کے مطابق اور بھی آسمانی کتابیں ہیں اور ان میں انسانی مرد اور عورت کے اعضا تناسل کی پوجا کے بارے میں لکھا ہے۔ بھلا! یہ خدا کی کتاب ہو سکتی ہے؟ دنیا کی کسی کتاب کا آپ مطالعہ کریں، وید اٹھا کر دیکھ لیں اور آج دنیا میں جو چار اناجیل موجود ہیں: 1 انجیل متّیٰ ہے، 2 انجیل لوقا ہے، 3 انجیل یوحنا ہے 4 اور انجیل مرقس ہے۔ جتنی اناجیل ہیں اور تورات ہے۔ دنیا میں زبور کے نسخے بھی

موجود ہیں: زبو نمبر ۱، نمبر ۲، نمبر ۳ یوں کر کے ایک سو پچاس سبق اس کے ہیں، لیکن وہ محرف اور مبدل ہو چکے ہیں۔ ایک شریف آدمی ان کو پڑھ نہیں سکتا ہے۔ ان سے مقابلہ کیا جائے تو وہ تو پڑھنے کے قابل بھی نہیں ہیں کہ شرافت والا انسان ان کو اپنی زبان پر لے آئے۔ (تفصیل کے لیے کتاب ''تحفۃ الہند'' اور احقر امداد اللہ انور کی کتاب ''دفاعِ اسلام'' یعنی اسلام پر کفار کے اعتراضات اور ان کے جواب کو ملاحظہ کریں) ایک اللہ کا قرآن ہے کہ آج تک دنیا اس کا مقابلہ نہیں کر سکی۔

تفسیر:

قرآن پر جتنے شکوک وشبہات اور اعتراضات دشمنوں نے کیے ہیں، اللہ نے ان کا باقاعدہ جواب دیا ہے۔

❁......کافروں نے کہا تھا کہ حضور ﷺ شاعر ہیں، قرآن نے جواب دیا:

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ﴿٤١﴾﴾ [الحاقۃ:۴۱]

❁......کافروں نے حضور ﷺ کو کاہن کہا تو قرآن نے جواب دیا:

﴿وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾﴾ [الحاقۃ:۴۲]

کہ کاہن تو اوٹ پٹانگ بات کرتے ہیں کبھی کوئی بات سچی ہوئی اور سینکڑوں باتیں جھوٹی ہوگئیں، لیکن قرآن نے جو بات کی ہے وہ ڈنکے کی چوٹ پر کی ہے۔ آج تک دنیا کی کوئی طاقت اس کے سچ کو نہیں جھٹلا سکی ہے۔

قرآن کی سچائی اور علوم:

اگر آپ قرآن کے اعجاز پر نظر ڈالیں تو قرآن مقدس نے تو ایسی باتیں فرمائی ہیں کہ پندرہ سو سال گزرنے کے بعد جدید علوم اور جدید تحقیقات اور نئی دنیا کے پڑھے لکھے سکالرز اور ریسرچ کرنے والے لوگ اعتراف کر رہے ہیں کہ جو قرآن پندرہ سو سال پہلے ایک نبی امی ﷺ نے (سرزمین عرب میں جہاں کوئی ادارہ نہ تھا) جو تعلیم بخشی تھی وہ کامل تھی اور ہماری تعلیم ناقص ہے۔

لاریب کتاب:

اللہ نے فرمایا: قرآن میں شبہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اب دیکھیں انفسِ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اللہ ہر شبہ سے، نقص سے اور صفاتِ نقصان سے پاک ہے تو اس کا کلام بھی پاک ہے۔ اب یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ قرآن تو اللہ کا

کلام ہے، لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ نبی تک پہنچتے پہنچتے کوئی تبدیلی ہوگئی ہو؟ جیسے:...... اللہ معاف فرمائے...... بد باطن لوگ ہیں۔ ان کا عقیدہ بھی یہی ہے...... اللہ ہدایت دے......

اب اللہ نے قرآن میں سند بھی بیان کر دی کہ اس کو کس نے اتارا ہے؟ فرمایا: ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الواقعۃ: ۸۰] اور فرمایا: ﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾ [فصلت: ۴۲] اور فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ﴾ [القدر: ۱]۔ فرمایا: ﴿اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ﴾ [البقرۃ: ۹۹]۔ اور فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ [الحجر: ۹] اتارنے والا خدا ہے جو پاک ہے۔

اور اس کے بعد لانے والا کون ہے؟ فرمایا:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ [الشعراء: ۱۹۳]

''اس قرآن کو لے کر اترنے والا الروح ہے۔''

روح حضرت جبرئیل علیہ السلام کا لقب ہے۔ اور آگے اللہ نے ایسی صفات بیان نہیں کی کہ وہ طاقت والا ہے عظمت والا ہے، بلکہ فرمایا ﴿الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ ایسے فرشتے نے اتارا جس کا لقب روح ہے اور وہ فرشتہ امانت والا ہے، جس میں خیانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس فرشتے نے راستہ میں کوئی ردوبدل کیا ہو۔

اس لیے قرآن بار بار کہتا ہے:

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۴۴]

''کیا تمہیں عقل نہیں ہے؟''

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ [محمد: ۲۴]

''تم قرآن میں ڈوب کر تدبر نہیں کرتے ہو؟ غور وفکر نہیں کرتے ہو؟ کیا اللہ نے تمہارے دلوں پر تالے لگا ڈالے ہیں؟''

اس لیے ہمیں حکم ہے کہ ہم قرآن پاک کو سمجھیں، اس لیے آیا ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ [الشعراء: ۱۹۳] یہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا نام موجود ہے: ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ﴾ [البقرۃ: ۹۷] جبرئیل علیہ السلام کا نام موجود ہے، لیکن یہاں لقب آیا ہے اور وہ بھی روح آیا۔ قرآن میں دوسری جگہ ہے: ﴿يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا﴾ [النبا: ۳۸] جبرئیل علیہ السلام ایک صف میں ہوں گے اور ملائکہ ایک صف میں ہوں گے۔ یہاں لقب روح آیا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں:

ایک وجہ یہ ہے کہ جیسے روح لطیف چیز ہے، اسی طرح اللہ کے ملائکہ اور فرشتے بھی لطیف اور نورانی مخلوق ہیں۔

اس میں کوئی شک کرے کہ جبرئیل علیہ السلام کو قرآن لاتے ہوئے نہیں دیکھا ہے تو اللہ نے فرمایا: کیا تم نے اپنی روح دیکھا ہے جو تمہارے اندر موجود ہے؟ تو کیا تمہارے نہ دیکھنے سے روح ختم ہو جاتی ہے؟ کیا تمہارے انکار کرنے سے روح نہیں ہوگی؟ تو وہ روح جو تمہارے جسم میں داخل ہے اور ایک ایک عضو میں سرایت کیے ہوئے ہے تمہیں تو وہ روح نظر نہیں آئی تو تم اس روح کو کیسے دیکھ سکتے ہو؟ اتارنے والا پاک ہے اور لانے والا بھی پاک ہے۔

اور اتارا کس پر؟ تو فرمایا:

﴿عَلٰی قَلْبِکَ﴾ [الشعراء: ۱۹۴]

آپ کے دل پر کہ جسم میں افضل مقام دل ہے۔ حضور ﷺ سراپا افضل، لیکن آپ کا دل افضل سے بھی افضل ہے۔ چونکہ اللہ کا قرآن افضل ہے، لانے والا فرشتوں میں افضل ہے اور اس کا مستقر آسمانوں میں لوحِ محفوظ افضل ہے، آسمانِ دنیا میں بیت العزت افضل ہے، زمین میں بھی جو سب سے افضل جگہ نظر آئی وہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا دل ہے۔

تو اب حضور ﷺ سے لے کر اللہ تک سند ایسی جڑ گئی کہ ان کے درمیان میں کوئی بد باطن تو شبہ کرے، لیکن ایمان والا شبہ نہیں کرسکتا۔ اس لیے فرمایا:

﴿الٓمّٓ ۞ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۞﴾ [البقرۃ: ۱، ۲]

اللہ کا قرآن ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی بد باطن خود شبہات بناتا رہے تو یہ اس کی عقل کی خرابی ہوگی۔

قرآن کا نزول صرف آپ ﷺ پر ہی ہوا:

جیسے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن تو اصل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اترا تھا۔ ان کے عقیدہ کے اندر یہ بات ہے کہ جبرئیل علیہ السلام بھول کر محمد عربی ﷺ پر اترے۔ اور جھوٹے کا حافظہ تو ہوتا نہیں ہے۔ جھوٹے آدمی کا کیا حافظہ ہوگا......؟ وہ صبح کو کوئی بات کرے گا تو شام کو اسی کا الٹ کر دے گا۔ سچی بات اگر آپ بیس سال بعد بھی پوچھیں تو سچا آدمی سیدھی بات کرے گا۔ اور جھوٹ بولنے والا آدمی دو دن پہلے جو آپ سے بات کہے گا چار دن کے بعد وہی بات نہیں کہہ سکتا، ضرور اس میں ہیر پھیر کرے گا۔

ان لوگوں نے یہ نہ سوچا کہ قرآن تو ایک دن میں اترا نہیں، قرآن تیئس (۲۳) سال کی مدت میں اترا ہے اور

تیئس (۲۳) سال اللہ کا فرشتہ بھولتا چلا گیا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی نہ کہا کہ فرشتہ تو میرے پاس آنا تھا رہا۔ تیئس (۲۳) سال گزر گئے وہ تو کہیں اور چلا جاتا ہے۔ کوئی ایک دن یا ایک دفعہ کی بات ہوتی تو عقل مان لیتی لیکن تیئس (۲۳) سال کی مدت ہے۔ اچھا آپ قران دیکھیں کہ کتنی جگہوں پر اترا؟ مکہ میں اترا، غار حرا میں اترا، منیٰ میں اترا، حدیبیہ میں اترا، عرفات میں اترا، خیبر میں اترا، اور حنین میں اترا اور کون کون سی جگہ ہے جہاں اللہ کا قرآن نہیں اترا؟ کیا ہر جگہ وہ بھولتا رہا؟

لطف کی بات یہ ہے کہ جب قرآن اترنا شروع ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر سات سال تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال تھی۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ جوان ہوئے تو قرآن تقریباً پورا ہو گیا تھا۔ خدا کی قدرت ہے کہ ادھر شباب کمال ہوا اور ادھر قرآن پورا ہو چکا۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ آیا تو قرآن پہلے جمع ہو چکا، کیونکہ قرآن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع ہو گیا تھا۔ پھر چودہ سو سال گزر گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تو کبھی اعتراض نہیں کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان مبارک سے تو کوئی قول ثابت نہیں، اگر جبرئیل علیہ السلام نے ......نعوذ باللہ!...... امانت پوری نہ اتاری تو جس نبی پر اتاری گئی تو ان کی امانت میں بھی شک پڑ گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہہ دیتے کہ میرے پاس کیوں آئے ہو؟ علی کے پاس جاؤ، تم تو بھول کر میرے پاس آ گئے ہو۔ اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ اس قسم کے جو کم عقل لوگ ہوتے ہیں یا اپنے بغضِ باطن کی بنا پر باتیں بناتے پھریں، ان کی تو زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔ اب ایک آدمی ایسا ہو جو یہ کہے کہ کعبہ شریف یہاں نہیں ہے، تو آپ کیا کر لیں گے؟ جیسے کوئی اگر مجنون کسی عقل والے کو کہے کہ یہ پاگل ہے، کیونکہ جو پاگل ہوتا ہے وہ سب کو کہتا ہے کہ یہ پاگل ہے، حالانکہ پاگل وہ خود ہوتا ہے۔ تو قرآن نے دعویٰ کر دیا کہ قرآن میں کوئی شبہ نہیں اور نہ لانے والے میں شبہ ہے اور نہ جس کے سینے میں اتارا گیا اس میں شبہ ہے، نہ جنہوں نے قرآن جمع کیا ان کی صداقت میں کوئی شبہ ہے۔ اس لیے فرمایا:

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲،۱]

لہٰذا قرآن میں جو عقیدہ کا بیان ہے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے، لہٰذا قرآن نے جو اعمال بتلائے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے اور پھر قرآن نے جو ہمیں عبادات سکھلائیں ہیں اس کے اندر کوئی شبہ نہیں ہے، قرآن میں جو معاملات کا بیان ہے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے، قرآن میں قصص اور اخبارات کا بیان یعنی پہلے نبیوں کے قصوں کا بیان ہے۔

آپ نے دیکھا نہیں ہے کہ یہودیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتحان کے لیے پوچھا تھا کہ وہ چند نوجوان جو غار میں

چھپے تھے، ان کا کیا قصہ ہے؟ اور ایک بادشاہ کا کیا قصہ ہے کہ جہاں تک سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے وہاں تک پہنچا اور جہاں تک غروب ہوتا ہے وہاں تک پہنچا، وہ کون تھا؟ اور روح کے بارے میں بتلائیں کہ روح کیا ہوتی ہے؟ جب قرآن نازل ہوا تو یہود جرات نہ کر سکے کہ یہ واقعہ ایسا نہیں ہے۔ جب حضور ﷺ نے ان کو اصحاب کہف کا قصہ بیان کر دیا، جب حضور ﷺ نے ذوالقرنین کا قصہ بیان کر دیا اور حضور پاک ﷺ نے جب روح کے بارے میں اللہ کا فرمان سنا دیا تو اس پر بس نہ کی، بلکہ اسی سورت میں اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اور خضر علیہ السلام کا قصہ بھی سنا دیا۔ پھر کوئی ماں کا لال اعتراض کی جرات نہ کر سکا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو اس لیے قرآن نے باقاعدہ دعویٰ کیا ہے۔ یہ پہلی صفت کا بیان تھا۔ [تفسیر الرازي: ٢١/٣٩١، الاسراء: الآیۃ: وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ]

ہدایت کے درجات:

2 ...... دوسری صفت ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ [البقرۃ: ٢]

قرآن سراپا ہدایت ہے اور ہدایت کرنے والا ہے ان لوگوں کو جو ڈرنے والے ہیں۔ ہدایت کے کئی مراحل ہیں، کیونکہ ضرر بھی مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی ضرر عقیدہ میں آتا ہے، کبھی ضرر اقوال میں آتا ہے، کبھی ضرر افعال میں آتا ہے، کبھی ضرر ہمارے جسم کو پہنچتا ہے اور کبھی ضرر ہماری روح کو پہنچتا ہے۔ اور پتہ نہیں کہ کل کیا کیا ضرر آئیں گے؟ اللہ نے فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ جیسے ضرر کی کوئی حد نہیں، اسی طرح ہدایت کے بھی درجات ہیں۔ پھر اللہ نے سب مخلوق کو ہدایت دی۔ یہ ہدایت عامہ ہے۔ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ [الفاتحۃ: ٥] کے اندر ساری تفصیل گزر چکی ہے۔

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ سے ہدایت کا آخری درجہ ہدایت خاص الخاص مراد ہے۔ یہ ان کو نصیب ہوتا ہے جو متقی ہیں، اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔

تقویٰ کے تین مدارج ہیں:

1 ...... پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی کفر سے نکل کر اسلام میں آجائے۔ یہ ہے تقویٰ، یعنی شرک و کفر سے بچنا اور اسلام کو قبول کرنا۔ یہ تقویٰ کی پہلی منزل ہے۔

2 ...... تقویٰ کا دوسرا درجہ ہے: ''اِتِّقَاءٌ عَنِ الْمَعَاصِيْ'' کہ کبائر سے بچے، جو بڑے بڑے گناہ ہیں ان سے بچے، جیسے: شراب پینا، کسی انسان کو قتل کو کر دینا، زنا کرنا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، فساد فی الارض، پاکدامنوں پر

تہمت لگانا، چغلی کرنا اور صغیرہ گناہوں پر اصرار کرنا۔ یعنی اگر کبھی صغیرہ گناہ ہو جائے تو اس پر ڈٹا نہ رہے، کیونکہ صغیرہ گناہ پر اگر آدمی اصرار کرے تو کبیرہ بن جاتا ہے۔ مثلاً: ایک گناہ ہے، اس کو کر دو تو صغیرہ ہے، لیکن اگر تم اس کو بار بار کرتے رہو تو وہ کبیرہ بن جاتا ہے۔ اس لیے اب تقویٰ کا درجہ ہوا کہ پہلے شرک سے بچ گیا، پھر گناہوں سے بچ گیا اور چھوٹے گناہوں پر اصرار نہیں کرتا کہ کبھی چھوٹا گناہ ہو گیا تو فوری طور پر وضو کیا، نماز پڑھی، عبادت کر لی، تاکہ گناہ فوراً دھل جائے اور اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((يَا عَائِشَةُ! إِيَّاكِ وَمُحَقِّرَاتِ الذُّنُوبِ)) [سنن الدارمی، حدیث: ۲۷۶۸، باب: فِي الْمُحَقَّرَاتِ]

"عائشہ! خبردار! خیال رکھنا! چھوٹے گناہوں سے بچنا۔"

جب بھی آگ جلائی جاتی ہے تو چھوٹی چھوٹی لکڑیوں سے جلائی جاتی ہے۔ یہی چھوٹے چھوٹے گناہ بڑے بن کر آدمی کو برباد کر دیتے ہیں۔

قرآن سے وابستگی کی وجہ سے عرب میں برکات:

جن کے کھانے پینے کا یہ عالم تھا کہ حاجیوں کا انتظار کرتے تھے کہ جب جہاز آئے گا تو حاجیوں سے ہم چاول خرید لیں گے اور گندم، تیل، گھی اور دالیں لے لیں گے۔ ہمارا سارا سال گزر جائے گا۔ پھر اگلے سال حاجی آ جائیں گے۔ یعنی جن کی معیشت کا یہ عالم تھا، جن کے پاس کوئی سڑک نہیں تھی، مدینہ منورہ جاتے تو آٹھ دن لگ جاتے تھے اور جاتے جاتے آدمی کے جوڑ ہل جاتے تھے، بڑے پہاڑ کی سڑک ہے اور کبھی بارش ہو گئی تو مہینہ کو راتوں کو بیٹھے رہتے تھے، مہینہ مہینہ تک قافلے مدینہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے، پانی رکے تو وہاں سے گزریں۔ بدامنی کا یہ عالم تھا کہ آٹھ آنے کے لیے بندوں کو گولی مار دی اور پیسے نہیں نکلتے تھے تو کہتے تھے کہ میری کمپنی کو نقصان ہو گیا، جو مر گیا اس کا کوئی غم نہیں، بس میری گولی کا نقصان ہو گیا۔ اندازہ کریں کہ پھر اللہ نے ان پر رحمت کی تو اس کی وجہ کیا تھی کہ جب یہاں کے مؤسسین نے اللہ کے قرآن کو سینے سے لگایا اور انہوں نے انگریزوں کو کھل کر کہہ دیا: ہم آپ کی ہر بات مان لیں گے، آپ سے ہر کنٹیکٹ کر لیں گے، لیکن ہم اپنے ملک میں قرآن اللہ کا مانیں گے اور اس کے رسول کا فرمان چلائیں گے۔ اللہ پاک نے فرمایا: اچھا! تم نے قرآن کو سینے سے لگا لیا، ہم زمین کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے خزانے تمہارے اوپر کھولے۔ ساری دنیا اللہ کی محتاج ہے۔ آپ جدھر نظر ڈالیں، پہاڑوں میں چلے جائیں، آپ کو مدرسہ ملے گا، آپ کو ہسپتال ملیں گے، آپ کو جنگل کے خیمہ میں اے سی چلا کر سویا ہوا ملے گا، وہیں جنریٹر لگایا ہوا

ہے، وہیں بجلی چل رہی ہے، یعنی اونٹ چرانے کے لیے گاڑیاں رکھی ہوئی ہیں جو ہمارے ہاں منسٹر کو نہیں ملتیں۔ جن کے اونٹ زیادہ ہوتے ہیں ان کو جنگل میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اب شام کو اکٹھا کرنا ہے تو کیسے کریں؟ تو جیپوں میں جا رہے ہیں۔ جو ہمارے ہیں بچارو بڑے انسان کا سمبل بن گیا وہ یہاں اونٹ چرانے کے کام آتی ہے، وہ کوئی یہاں اعزاز والی گاڑی نہیں سمجھی جاتی۔ وہ تو اونٹ چرانے کے لیے گاڑی ہے، جس میں بیٹھ کر اونٹ پکڑ کر لے آئے، مال بھر لیا۔ وجہ کیا ہے؟ کہ صرف اللہ کے قرآن کے ساتھ تعلق ہے، اللہ کے رسول پر ایمان ہے۔ دعا کریں! اللہ تعالیٰ اسی طرح قرآن وسنت کے نظام کو قیامت تک قائم ودائم رکھے اور ہر مفتن کے فتنہ سے قیامت تک محفوظ رکھے اور ہر مفسد کے فساد سے محفوظ رکھے۔ تو یہ قرآن کا وعدہ ہے! اپنے ملک میں تجربہ کرلو۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے امیر المؤمنین! کیا آپ کبھی ایسے راستے سے گزرے ہیں جو راستہ بڑا خطرناک ہو اور کانٹے دار جھاڑیاں اور ادھر ادھر بڑے گڑھے ہوں اور راستے میں کیچڑ بھی ہو؟ جب آپ وہاں سے گزریں گے تو کیسے گزریں گے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں اپنے کپڑے اوپر کرلوں گا اور انہیں کس لوں گا اور نظر راستے پر جمالوں گا، پاؤں جما جما کر اور بچا بچا کر رکھوں گا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہی تو تقویٰ ہے۔'' [التذكرة في الوعظ للقرشي، ص ۱۲۷]

(۳)......تقویٰ کا تیسرا درجہ: سو دل میں کسی کا بھی خیال نہ آئے، بس اللہ سے لو لگائی اور کسی کی طرف رجوع نہیں ہوتا۔

تقویٰ کا معیار:

اس کو قرآن نے کہا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ [آل عمران:۱۰۲]

اللہ سے ڈرو جیسی اس کی شان ہے اس کے مطابق ڈرنا۔ اور وہ ڈرنا ہے کیا؟ کہ اب دل میں کسی غیر کا خیال ہی نہیں ہے۔ نفع ہوتا ہے تو الحمد للہ!......نقصان ہوتا ہے تو الحمد للہ!......

حکایت:

ایک اللہ والے بیٹھے ہوئے تھے، انہیں اطلاع ملی کہ حضرت! آپ کا فلاں عزیز فوت ہوگیا ہے۔ فرمایا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہ!''۔ تھوڑی دیر کے بعد اطلاع ملی کہ اللہ نے آپ کے فلاں عزیز کے گھر میں بچہ دیا ہے تو کہا:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!''...... میرے جیسا کوئی جاہل مرید بھی بیٹھا ہوا تھا...... اس نے کہا: ''عجیب بات ہے کہ کوئی فوت ہو تو آپ خوش ہیں کوئی پیدا ہو تو آپ خوش ہیں۔ حالانکہ خوشی خوشی ہوتی ہے، غمی غمی ہوتی ہے۔ آپ کو موت کی خبر ملی تو آپ نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!''۔ بچہ ہونے کی خبر ملی تو آپ نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!''۔ یہ عجیب بات ہوئی!! انہوں نے کہا: ''میں نے تو اس بات پر نہیں کہا تھا۔ جب مجھے موت کی خبر ملی تو میں نے اپنے دل پر غور کیا کہ تمہیں تو کوئی گڑ بڑ نہیں ہوئی۔ دیکھا تو دل اپنے مقام پر ٹھیک ہے تو میں نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!'' کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے میرے دل کو ہدایت پر رکھا ہے، یہ نہیں بہکا۔ جب خوشی کی خبر ملی تو میں نے اپنے دل کو ٹٹولا، کہیں خوشی میں آ کر حدود سے تو نہیں نکلتا؟ لیکن وہ اپنی حالت پر تھا تو میں نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!''۔ میں تو اس پر اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ موت و حیات تو ہوتی رہتی ہے۔ کوئی پیدا ہوگا، کوئی مر جائے گا۔ تم اُدھر سوچتے رہے اور میں ادھر سوچتا رہا۔

یہ تقویٰ کا مقام ہوتا ہے کہ جب آدمی کا دل اپنے رب کے کفر اور شرک سے توبہ کر لے اور پھر اللہ کے سوا ہر کسی سے تعلق توڑ لے اور ایک اللہ کا بن جائے۔ تو وہ تقویٰ کا آخری درجہ ہے۔ تو اللہ نے فرمایا کہ جیسے جیسے تمہارے اندر تقویٰ کا درجہ ہوگا ویسے ویسے ہدایت ملے گی۔ جتنا تیرے اندر مقامِ تقویٰ ہوگا اتنا حصہ ہدایت کا قرآن سے ملے گا۔ جن کے اندر بالکل تقویٰ نہیں، کافر ہیں، مشرک ہیں، ان کو بالکل ہدایت نہیں ملتی اور جو مسلمان تو ہیں، لیکن گناہوں سے نہیں بچتے، انہیں کچھ نہ کچھ ہدایت ملتی ہے اور جو اصل ہدایت ہے اور مقامِ ہدایت ہے، وہ ان کو ملے گا جو تقویٰ کے آخری درجہ پر ہوں گے۔ یعنی جس طرح ہدایت کے تین درجے ہیں، اسی طرح تقویٰ کے بھی تین درجے ہیں۔

''اَلْکِتَاب'' سے مراد:

کتاب سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اس سے مراد قرآن ہے۔ بعض علماء نے مثلاً: ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک قول پیش کیا ہے کہ ''اَلْکِتَاب'' کے اندر الف لام جنس کے لیے ہے، اس سے مراد تورات، زبور، انجیل اور ساری وہ کتابیں ہیں جو گزر چکی ہیں۔ تو ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قَدْ اَبْعَدَ النُّجْعَةَ''۔ یہ عرب کا محاورہ ہے کہ اس نے اپنی اونٹنی کو دور بٹھایا۔ مقصد یہ ہے کہ دور کی کوڑی لے آیا۔ ایسی بات جس کو محاورۂ عرب میں کہتے ہیں کہ فلاں آدمی نے ہم سے اونٹنی علیحدہ کر لی اور دور جا کر بٹھائی، اس نے ایسی بات کی اس کو علم ہی نہ ہو۔ بلا وجہ تکلف میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے کہ ﴿الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ﴾ بات قرآن کی کر رہے ہیں اور اشارہ تورات، انجیل کی طرف چلا گیا۔ اس لیے مفسر رحمہ اللہ نے اس قول کی تردید فرمائی ہے، بتلا دیا کہ ''اَلْکِتَاب'' سے مراد قرآن ہے، جو اللہ نے اپنے

پاک نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اتارا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

اور اسی قرآن کو "اَلْكِتَاب" کے نام سے اللہ نے کئی مقام پر ذکر فرمایا، جیسے فرمایا:

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ [آل عمران: ۳]

اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝﴾ [الکہف: ۱]

"اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ" اس لیے "اَلْكِتَاب" قرآن کا نام ہے۔ "اَلْكِتَاب" "اَلْقُرآن" "اَلْمَثَانِي"، "اَلشِّفَاء"، "ذِكْر"، "نُوْر" وغیرہ یہ سارے قرآن کے اسماء ہیں۔ تو "اَلْكِتَاب" سے مراد قرآن ہے۔ اس لیے فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایسا تکلف کیا کہ جس کا علم نہیں ہے۔

اگر قرآن میں ذرہ برابر بھی شک ہوتا تو کیا چودہ سو سال سے کافروں نے معاف کر دیا ہوتا؟ کوئی بات نکال کر نہ لے آتے؟ دیکھیں! تمام کفر آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں، لیکن مسلمانوں کے خلاف سب اکٹھے ہیں۔ یہود ونصاریٰ اور نصاریٰ کے فرقے اور یہودیوں کے فرقے ہیں اور ہندو ہیں اور ہندوؤں کے کتنے فرقے ہیں، برہمن ہیں، وشوا پریدش ہیں اور وہ ایک دوسرے کو اتنا بڑا دشمن سمجھتے ہیں! یعنی جو برہمن ہیں ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر وید کی تعلیم کا حقدار ہے تو برہمن ہے، یعنی شودر وغیرہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کتاب کو پڑھ سکیں یا سن سکیں۔ اگر کوئی آدمی ان کو سنا دے تو کہتے ہیں کہ سیسہ پگھلا کر ان کے کان میں ڈالو کہ ان کے کان میں ہمارا وید کیوں گیا ہے؟ یعنی دشمنی کی انتہا دیکھ لیں! اگر برتن کو بھی ہاتھ لگا لیں تو کہیں گے کہ یہ پلید ہو گیا ہے۔ لیکن جب مسلمانوں کا مقابلہ آ جائے تو تمام ملت کفر ایک ہو جاتی ہے "اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ"۔ پھر یہودی بھی اکٹھے ہوں گے، نصرانی بھی اکٹھے ہوں گے، پھر تمام کفر اکٹھے ہو جائیں گے، پھر ان کو پتہ ہے کہ اصل مقابل ہمارا اسلام ہے، باقی تو دنیا میں کوئی مذہب ہے نہیں، ان کا تو کوئی وجود ہی نہیں۔ اس لیے علماء فرماتے ہیں:

((اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ)) [تفسیر المنار: ۶/ ۳۴۶]

کفر ایک ملت ہے، چاہے وہ شرق میں ہو یا غرب میں ہو، چاہے شمال میں ہو یا جنوب میں ہو۔ اسی طریقہ سے اللہ نے ہمیں قرآن میں بتلا دیا کہ کفار جو ہیں "اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ" یعنی وہ جتنے آپس میں لڑ پڑیں، لیکن جب اسلام کا مقابلہ آئے گا تو دوست بن جائیں گے۔ دیکھیں کہ میرے نبی خاتم الانبیاء حبیب الکبریاء سیدنا محمد ﷺ کا جب

مقابلہ ہوا، مکہ کے مشرکین میں کتنے قبائل تھے! بنو ثقیف علیحدہ ہیں، بنو ہذیل علیحدہ ہیں، بنو کلاب علیحدہ ہیں، بنو زہرہ علیحدہ ہیں، بنو لوئ علیحدہ ہیں، پھر سب قبائل کا خدا بھی علیحدہ ہے، طائف والوں کا خدا علیحدہ، بنو قریش کا خدا علیحدہ، تین سو ساٹھ بت جو رکھے ہوئے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ مختلف قبائل کے خدا تھے، جو خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے ہر کسی کا خدا علیحدہ تھا۔

اولیاء کرام کی قبروں پر جانا:

جیسے ہم سے ہر کسی کا کام علیحدہ ہے، ہم نے بھی تقسیم کیا ہوا ہے کہ بیٹا لینا ہے تو سیہون شریف جائیں گے قلندر کی دربار پر اور اگر بیماریاں درست کرانی ہیں تو بابا فرید گنج شکر کی دربار پر جائیں گے اور اگر کوئی ترقی اور ملازمت اور اقتدار پر جاتا ہے تو پہلے داتا صاحب کی مزار پر چادر چڑھا کر حاضری دے کر پھر کام شروع کریں گے، پھر ووٹ لے کر لڑیں گے، کیونکہ حضرت ووٹ کی بڑی مدد فرماتے ہیں...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ...... دعا کریں اللہ مسلمانوں کو ہدایت عطا فرمائے۔ ان تمام اولیاء کی درباروں پر جا کر عبرت حاصل کرو کہ میرا مولیٰ! جو ساری زندگی تیری عبادتیں کرتے رہے، جو اتنے پیارے تھے وہ بھی مٹی میں چلے گئے اور ہم نے بھی اسی مٹی میں آنا ہے۔ ان کی قبروں پر جانے کا مقصد یہ تھا کہ عبرت پکڑو اور ان کی زندگیوں سے سبق لو۔ آخر کوئی تو وجہ ہے کہ وہ لوگ فوت ہوگئے، لیکن آج بھی دنیا ان کے لیے دعائیں کر رہی ہے۔ تو ہم بھی آج ایسا عمل کریں کہ ہمارے مرنے کے بعد بھی کوئی ہمیں یاد کرے۔ ان کی قبروں پر جانے کا یہ مقصد تھا کہ دعا کریں کہ یا اللہ! ان کی قبروں کو اپنی رحمت کے ساتھ بھر دے۔ جب ہم اللہ کے اولیاء کے لیے دعائیں مانگیں گے تو اللہ کی رحمت ہم پر برسے گی کہ یہ بندہ گناہ گار ہو کر میرے ولی کے لیے دعا کر رہا ہے تو میں ارحم الراحمین ہوں تو اس کو کیوں نہ عطا کروں؟ تو یہ مقصد تو نہیں تھا کہ ہم وہاں جا کر فریادیں کریں، نذریں چڑھائیں اور استغاثے کریں اور جا کر طواف کریں اور بچے مانگیں اور الٹے پاؤں چلیں۔ یہ تو...... نَعُوْذُ بِاللّٰہِ!...... ایسے ہو گیا کہ جو شرک کی اعلیٰ سے اعلیٰ قسم ہو وہ یہاں ہو گی۔

تو بہر حال مقصد یہ تھا کہ ان قبائل کے خدا الگ تھے، طائف والوں کا خدا الگ ہے۔ آپ پڑھ چکیں ہیں کہ ابرہہ نے کعبۃ اللہ پر چڑھائی کی تو بنو ثقیف نے ان کو کہہ دیا کہ ہمارے خدا کو نہ چھیڑو، ہم تمہارا راستہ نہیں روکتے، جاؤ کعبہ گرانا ہے تو گرا دو، ہمیں کعبہ سے کیا ہمدردی......؟ ہمیں قریش سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، ان پر حملہ کرنا چاہتے ہو تو لاکھ کرو، لیکن ہمارے مقدر کو نہ گرانا، ہمارے یہاں آ کر ہمارے خدا کو نہ چھیڑنا۔ ابرہہ نے کہا: ٹھیک

ہے، میں بھی نہیں چھیڑتا، میں تو کعبہ کو گرانے کے لیے جا رہا ہوں۔

حضور ﷺ کے مقابلہ میں کفار کا اتحاد:

لیکن جب میرے مدنی پاک ﷺ کے مقابلے کا وقت آیا تو سب اکٹھے ہو گئے۔ یہود کے تین قبائل تھے: 1......بنونضیر 2......بنوقریظہ 3......اور بنوقینقاع، جو مدینہ میں آباد تھے اور تینوں کی دشمنیاں تھیں۔ سب کے سردار علیحدہ تھے، لیکن حضور ﷺ کا مقابلہ آیا تو اکٹھے ہو گئے۔ یعنی جب حضور ﷺ نے مدینہ پاک میں خندق کھودی مدینہ پاک کی حفاظت کے لیے تو وجہ یہ تھی کہ تمام احزاب اکٹھے ہو گئے، مدینہ والے بھی اکٹھے ہو گئے اور مکہ والے بھی اکٹھے ہو گئے۔ تو اب حضور ﷺ نے فرمایا: ''اب ہم ان تمام قوتوں کا مقابلہ کیسے کریں گے؟'' تو حضرت سلیمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''حضور! ہمارے فارس میں جنگ کا طریقہ یہ ہے کہ دشمن کو روکنے کے لیے ہم خندق کھودتے ہیں، کیونکہ دشمن اس خندق کو عبور نہیں کر سکتا۔ کیسے عبور کرے گا؟ ہم اس کو تیروں کی بوچھاڑ میں رکھ لیں گے۔ اگر کوئی گھوڑے سے کودے گا دو ہزار اکٹھے تو نہیں کود یں گے۔'' یہ تجویز آپ ﷺ کو بڑی پسند آئی تو آپ نے خود مدینہ کے گرد خندق کھودی۔ مسلمانوں کی حفاظت کی وجہ یہ تھی کہ کفر مل گیا تھا، اس لیے جب اسلام کے خلاف کوئی بات ہو گی تو کفر متحد ہو جائے گا۔

مسلمانوں کی حالتِ زار:

اور بدقسمتی یہ ہے کہ مسلمان اکٹھا نہیں ہوتا...... إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... اللہ مسلمانوں کے حال پر رحم فرمائے۔ مسلمان کا یہ عالم ہے کہ اگر ساتھ گھر میں آگ لگی ہے تو پوچھا جائے تو کہے گا کہ میرا گھر محفوظ ہے۔ اگر کسی کا بیٹا اغوا ہو جائے تو کہتے ہیں کہ یہ ہوتا رہتا ہے۔ جب اپنا بیٹا اغوا ہو تو چیختا ہے، پھر رونا شروع کرتا ہے، اس کو دوسروں کے بیٹے کا درد نہیں ہوتا۔ کافروں کو دیکھو کہ ان کا کہیں ایک آدمی بھی مر جائے تو پورا ملک کھڑا ہو جائے گا، ایک مسلمان کا خون اتنا سستا ہے کہ جہاں بہا دو، جہاں کوئی مسلمان مر جائے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ وجہ کیا ہے؟ کہ آج اسلام کا صرف نام باقی رہ گیا ہے اور مسلمان ایک قانونی مسلمان ہے، ایک رسمی مسلمان ہے کہ ہمارے پاسپورٹ میں، ایڈنٹی کارڈ میں لکھا ہوا ہے کہ ہم مسلمان ہیں، وگرنہ آج ہم مسلمانوں کے اندر نہ اسلام والا عقیدہ ہے، نہ اسلام والے اخلاق ہیں، نہ اسلام والا کردار ہے، نہ وہ عمل ہے اور نہ وہ افعال ہیں۔ صرف ایک نام ہے۔

آپ اندازہ کریں! اگر چند لڑکے تاریخ اٹھا کر دیکھیں کہ اپنی فریاد کافروں کے ذریعہ سندھ سے عرب لکھ کر بھیجیں تو عرب سے محمد بن قاسم اُٹھا اور کفر کو مارتا ہوا ملک فتح کر ڈالے کہ مسلمان لڑکیوں کی عزت پر حملہ کیوں کیا گیا؟ اور آج کون سا ملک ہے جہاں مسلمان بیٹیوں کی عزت پامال نہیں کی جاتی؟ جہاں اب اجتماعی آبرو ریزی کی جاتی ہے اور اس کے بعد ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے، انہیں زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ مسلمان پھر بھی زندہ ہے، ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ جب تک کوئی ہماری بیٹی کو نہ جلائے ہمیں تکلیف ہی نہیں ہوتی۔ یہ ہماری بے حسی کی وجہ ہے کہ ہم بس اسلام کے نام لیوا ہیں، ورنہ اب ہمارے اندر بات باقی نہیں رہی۔

''رَیْبٌ'' کا معنی:

اور ''رَیب'' کبھی حاجت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے''قَضَیْنَا مِنْ تِہَامَۃَ کُلَّ رَیْبٍ''(تہامہ میں آئے تو ہم نے ہر حاجت پوری کر لی۔) یہاں حاجت کے معنی میں ہے تو ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ②﴾ [البقرۃ:۲] میں ''رَیب'' کا کیا معنی ہوگا؟ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہاں ''رَیب'' شک کے معنی میں ہے۔

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''رَیب'' کا معنی شک ہے، مجھے اس میں کسی کا اختلاف نہیں ملا اور قرآن مجید کی دیگر آیات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں ''رَیب'' بمعنی شک ہے۔ جیسے: ﴿الٓمّٓ ① تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ②﴾ [السجدۃ:۱،۲]

اور بعض نے فرمایا ہے کہ ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ②﴾ بظاہر تو خبر ہے کہ قرآن ایسی کتاب ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں، لیکن کبھی صیغہ خبر کا ہوتا ہے اور مراد ''نہی'' ہوتی ہے۔ اب یہ ہوگا ''لَا تَرْتَابُوْا'' کہ اس میں شک نہ کرو۔ یہ اللہ کا قرآن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب بھی کسی نے غور کیا تو اس کو ماننا پڑا کہ یہ اللہ کا قرآن ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ]

کفار کا قرآن کو اللہ کا کلام ماننا: حکایت:

کفار نے دار الندوہ مسجد الحرام کے اندر بیٹھ کر اپنی میٹنگ کی اور غور کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام پڑھتے ہیں یہ کیا ہے؟ کسی نے کہا: پتہ نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ جادو ہے۔ کسی نے کہا: یہ جادو نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہانت کی قسم ہے کہ کاہن لوگ بھی ایسی باتیں کرتے ہیں، مسجع قسم کی عبارتیں پڑھتے اور بناتے ہیں اور ایک دوسری کے ساتھ ملاتے

ہیں۔تو ولید بن مغیرہ...... جوان کا بڑا دانا اور بہت مالدار آدمی تھا......اس نے کہا کہ ایسا کرو کہ تم جانتے ہو کہ میں علم و عقل والا ہوں اور میں سحر اور غیر سحر میں فرق کر سکتا ہوں۔تم یہاں بیٹھو، میں ابھی محمد (ﷺ) کی خدمت میں جاتا ہوں، ان سے جا کر کلام سنتا ہوں اور واپس آ کر تم کو بتاتا ہوں کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے۔

حضور ﷺ مسجد الحرام میں بیٹھے تھے۔ولید بن مغیرہ آ گیا، آ کر سلام کیا اور کہا: یا ابن عمی! (کیونکہ رشتہ داری تو سب کے ساتھ تھی) اے بھتیجے! میں تیرے پاس آیا ہوں، جو تم قرآن سناتے ہو وہ کیا ہے؟ ہمیں سیدھی بات تو بتلا۔ فرمایا: یہ تو اللہ کا کلام ہے۔اس نے کہا: چلو مجھے کچھ سنائیں۔حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہی تو میں چاہتا ہوں تو ولید بن مغیرہ بیٹھ گیا تو حضور ﷺ نے پہلے اللہ کی حمد و ثنا کی اور پھر قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔سورۂ غافر کی آپ نے تلاوت فرمائی۔ابھی آپ چار آیتوں پر پہنچے اور جب حضور ﷺ نے پڑھا: ﴿إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ﴾ [غافر: ۷] تو اس نے کہا: بس کریں! آگے میں سن ہی نہیں سکتا۔اور ولید وہاں سے ڈرا اور تھر تھر کانپتا ہوا سیدھا گھر چلا گیا۔یہ ولید بن مغیرہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا باپ ہے۔دیکھیں! بیٹا ''بطل الاسلام'' ہے اور باپ اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

وہ گھر چلا گیا اور ابوجہل پریشان کہ ولید کو حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا تھا، ولید کہاں گیا؟ انہوں نے دیکھا تو کہا: یہاں تو نہیں ہے۔تو ابوجہل کہنے لگا اور بات سنو!؟ معلوم ہوتا ہے کہ ولید بھی گیا، اس نے بھی قرآن سن لیا، وہ بھی مسلمان ہو گیا۔اس نے ہماری طرف آنا تھا، ہماری طرف نہیں آیا تو کدھر چلا گیا؟ ٹھہرو! میں جاتا ہوں اور میں اس کو دوبارہ بھنکاتا ہوں۔ابوجہل اس کے گھر کے دروازہ پر پہنچا اور اس کو بلایا کہ معلوم ہوتا ہے تمہارے اوپر بھی محمد (ﷺ) کا اثر ہو گیا، تم بھی حکومت کا ارادہ رکھتے ہو، اس لیے محمد سے مل رہے ہو۔اس کو غصہ آ گیا کہ میں کوئی غریب ہوں کہ حضور کے ساتھ اس لیے ملوں؟...... حالانکہ ابوجہل کا مقصود اس کو چڑانا تھا......اس نے کہا: سنو! جو حضور پڑھتے ہیں وہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے اور نہ یہ جادو ہے۔اور کہا: ''إِنَّ فِيهَا حَلَاوَةً'' کہ قرآن میں ایک حلاوت ہے، اس کلام میں ایک مٹھاس ہے اور پھر اس کلام کے اندر ایک جڑ ہے اور اس کلام کا اوپر معلوم ہوتا ہے کہ صبر سے لدا ہوا ہے اور اس کے اندر ایک تر و تازگی معلوم ہوتی ہے کہ ابھی یہ قرآن اترا ہے تو یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔محمد (ﷺ) کی بات ٹھیک ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔اگر غور کرنے پر آئیں تو دشمنوں کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔[دلائل النبوة: ۲/۱۹۹، باب: اعتراف مشركي قريش بما في كتاب الله]

قرآن کا اعجاز:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب شعراء جب قصیدے لکھتے تھے تو کعبہ پر لگا دیتے تھے کہ کوئی ہمارا مقابلہ کرنے والا ہو تو جواب لکھ کر کعبہ پر لٹکائے؟ اس کو کہتے تھے "سَبْعَةٌ مُعَلَّقَةٌ" اب بھی یہ کتابیں ملتی ہیں......اب بھی عرب کا ایک ملک ہے، وہاں کسی نے شادی کرنی ہو تو وہ اشتہار دیتا ہے کہ جس لڑکی کو معلقات یاد ہوں وہ اپنا نام ظاہر کرے، میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے قرآن حفظ کیا جاتا ہے، وہاں لڑکیاں "سَبْعَةٌ مُعَلَّقَةٌ" کو حفظ کرتی ہیں اور پھر وہ گھر میں جھنڈا باندھ دیتی ہیں کہ اس گھر میں وہ لڑکی موجود ہے تو ایسے کئی گھروں میں جھنڈے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہاں جا کر رشتہ مانگتے ہیں۔ حالانکہ "سَبْعَةٌ مُعَلَّقَةٌ" کیا ہے؟ شاعروں کا کلام ہے، غلط قسم کی اس کے اندر کئی باتیں ہیں، تمام باتیں عشق اور شاعری کی ہیں، کیونکہ ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ﴾ [الشعراء: ۲۲۴]۔ ہاں! ایک یہ ہے کہ طالب علم ادب پڑھنے کے لیے اس کو پڑھے، لیکن اس کے اندر تو کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس کو پڑھا جائے کہ جو لڑکی اس کو یاد کرے اس پر فخر کرے۔ فخر تو وہ کرے جس کو قرآن حفظ ہو......

بہرحال ایک آدمی کو سوجھی تو اس نے قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت ﴿إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝﴾ [سورۃ الکوثر] لکھ کر کعبہ پر لٹکا دی۔ اب جو شاعر آئے اور غور کرے تو کہے کہ اس کا کیا مقابلہ کریں؟ جتنے شعراء تھے عاجز آ گئے۔ آخر ایک شاعر تھا، عقل والا تھا، اس نے لکھ دیا: "وَاللّٰهِ! لَيْسَ هٰذَا مِنْ كَلَامِ الْبَشَرِ" (اللہ کی قسم! یہ بندے کا کلام ہی نہیں ہے) تو ہم مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں......؟

قرآن کی سچائی کا ایک واقعہ:

اندازہ کریں کہ چودھویں صدی کی بات ہے یورپ میں عیسائیوں کا...... جو سب سے بڑا پادری ہے......اس کے ساتھ احمد دیدات کا مناظرہ ہوا۔ تو ہمارے مناظر نے کہا: "پہلے بات سنو! باقی جھگڑے بعد میں کر لیں گے کہ میں تمہیں بائبل کا ایک صفحہ بتاتا ہوں کہ فلاں صفحہ تم اس مجمع کے سامنے پڑھ دو، کہیں عبارت میں ادھر ادھر ہیر پھیر نہ کرنا، پوری عبارت پڑھ دو تو میں تمہیں کہوں گا کہ تم جیت گئے۔" اب جناب اس نے کہا: "کیوں یہ ضروری ہے کہ میں پڑھوں؟" اس نے کہا: "ہاں بھائی! اللہ کا کلام جو ہے، اس کو پڑھو۔ مجھے تم کہہ دو میں قرآن پڑھتا ہوں۔ جب تمہارے پاس اللہ کی کتاب ہے تو تم پڑھتے ہوئے کیوں شرماتے ہو؟ تم ڈرتے ہو یا تمہیں شرم آتی ہے؟" آخر اس

سے کہا مجھے پتہ ہے کہ تم زہر کا پیالہ پی لو گے، لیکن تم اس کو نہیں پڑھ سکو گے، کیونکہ تمہیں پتہ ہے کہ اس کے اندر اتنی گندی باتیں بھری ہوئی ہیں تو یہ خدا کا کلام کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اس کی جرات نہ ہوئی کہ اس بائبل کا ایک ورق بھی پڑھ سکتا۔ لیکن قرآن چودہ سو سال ہو گئے ہیں، جہاں مرضی آئے آج بھی چیلنج کر کے اس کو پڑھ سکتے ہیں۔ یعنی قرآن کو ہر طرح سے آزمایا گیا ہے۔

ایک گانے والے کا اسلام لانا:

قریب ہی زمانہ میں ایک بہت بڑا مغنی اور موسیقار ہے، اس نے اسلام قبول کیا ہے۔ اس نے اسلام کیوں قبول کیا؟ اس نے کہا کہ میرے اللہ نے اتنا علم دیا ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنے منہ سے آواز نکالے تو میں اس کی ایک سر بنا لیتا ہوں، تو میں نے قرآن پر ریسرچ کی اور سارے قرآن پر ریسرچ کرنے کے بعد میرے سامنے ایک جگہ ایسی آئی کہ مجھے علم موسیقی کے اعتبار سے شبہ پڑا۔

جیسے رکانہ پہلوان نے حضور ﷺ سے ملاقات کی تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''اسلام لے آؤ'' تو اس نے کہا: ''حضور! میں پہلوان آدمی ہوں، مجھے پتہ نہیں ہے کہ آپ سچے ہیں۔ میرے پاس تو ایک آزمائش ہے کہ میرے پاس طاقت ہے، آپ میرے ساتھ کشتی کریں۔ اگر آپ مجھے گرا دیں تو میں سمجھ جاؤں گا کہ آپ نبی ہیں۔ مجھے طاقت کے بغیر کوئی گرا نہیں سکتا۔ میں تو کشتی کے ذریعہ امتحان لوں گا، کیونکہ میرے پاس طاقت ہے۔ اگر آپ مجھے گرا دیں تو میں سمجھ جاؤں گا کہ یہ کوئی اور طاقت ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''ٹھیک ہے! میں کشتی لڑتا ہوں۔'' حضور ﷺ نے رکانہ سے باقاعدہ کشتی لڑی اور جب رکانہ گر گیا تو اس نے کہا: ''حضور! ایک دفعہ اور، پتہ نہیں میں کیسے گر گیا؟'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم پھر لڑ لو۔'' اب نبی کا مقابلہ کون کرے؟ تو حضور ﷺ نے پھر پکڑا اور گرا دیا تو اس نے کہا: ''ایک دفعہ پھر لڑتے ہیں۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''ٹھیک ہے، اٹھو!'' تو ایک دفعہ اور گرا دیا تو اس نے کہا: ''میں کلمہ پڑھتا ہوں۔ آپ واقعی اللہ کے نبی ہیں۔'' میں نے اپنی طرز پر امتحان لینا ہے۔

پہلوان اپنی نظر سے سوچے گا، موسیقی والا اپنی نظر سے سوچے گا اور علمِ ہندسہ والا اپنی نظر سے سوچے گا۔

[الخصائص الکبریٰ ۱/۲۱۲، باب: الآیۃ فی مصارعتہ صلی اللہ علیہ وسلم رکانۃ]

شہد کی مکھی کا کمال:

یعنی دنیا کے آج جتنی آرکیٹکٹر ہیں ان کو بلائیں اور ان کے سامنے رکھیں کہ اللہ نے جو قرآن میں نحل شہد کا نقشہ

کھینچا ہے ﴿وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ﴾ [النحل:٦٨] اللہ نے فرمایا کہ ہم نے سمجھایا ہے شہد کی مکھی کو کہ پہاڑوں میں اور درختوں پر اپنا چھتہ کیسے بناتا ہے؟ اور شہد کی مکھی جو اپنا چھتہ بناتی ہے ہر خانہ مسدس ہے اور ایک خانہ کا دوسرے سے فرق ہو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟ تمام دنیا کے انجینئر لے کر آئیں، اس کے مقابلہ میں آ کر بنا دیں جو ایک مکھی نے بنایا، کیوں نہیں بنا سکتے؟ کیونکہ اس کو سکھلانے والے نے جو سکھلایا ہے۔ اس کے اندر مکھی کا کمال تو نہیں ہے، اصل کمال تو اس ذات کا ہے جس نے اس کو سکھلایا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ ریاضی دان ہوتے ہیں، انہوں نے قرآن کو حساب سے سمجھا۔ انہوں نے کہا کہ ضرب، جمع اور تقسیم، تو اس چکر میں انہوں نے کہا کہ قرآن تو کہتا ہے ﴿وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا﴾ [الکھف:٢٥] قرآن میں ہے کہ اصحاب کہف غار میں تین سو سال اور زیادہ نو سال رہے، تو یہ کیا مطلب ہوا؟ اور صرف یہ بھی نہیں کہا: "ثَلَاثَ مِائَةٍ وَتِسْعًا" بلکہ فرمایا: ﴿ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا﴾ تو انہوں نے حساب لگایا کہ قمری سال کے دن کتنے بنتے ہیں اور شمسی سال کے دن کتنے بنتے ہیں؟ قمری حساب میں ہر سو سال پر تین سال بڑھ جاتے ہیں، اس لئے تین سو سال شمسی پر قمری حساب سے نو سال مزید ہو گئے۔ اب انہوں نے حساب سے پرکھا۔

اور اسی طرح قرآن میں ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ [البقرۃ:٢٦١] سات کو سو سے ضرب دو تو سات سو ہو جائے گا۔ اس میں تو ضرب کا قاعدہ بھی موجود ہے، کیونکہ جو حساب دان اور ریاضیات کے ماہر تھے انہوں نے قرآن مقدس کو حساب کی نظروں میں جانچا۔

علم موسیقی والے نے علم موسیقی کے ذریعہ قرآن کو جانچا۔ اور کہتا ہے کہ ایک آیت پر آ کر میں پھنس گیا، وہ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تو میں ایک عالم کی خدمت میں گیا اور ان سے عرض کی کہ ایک آیت مجھے سمجھ نہیں آ رہی...... وہ آواز اور لحن جو اس کا فن ہے وہ نہیں بن رہا...... انہوں نے پوچھا: کون سی آیت ہے؟ کہا: ﴿لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ﴾ [الغاشیۃ:٢٢] یہ بات نہیں بن رہی۔ تو انہوں نے کہا: "آپ مجھے بتاؤ کہ ﴿لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ﴾ تم اس کو سین کے ساتھ پڑھتے ہو یا صاد کے ساتھ پڑھتے ہو؟ اس نے کہا: "جی! میں تو صاد کے ساتھ پڑھ رہا ہوں۔" فرمایا: "یہی تو غلطی ہے، اس کو سین کے ساتھ پڑھو۔" وہ کہتا ہے کہ جب میں نے اس کو

سین کے ساتھ پڑھا تو جو میری آواز تھی فوراً بن گئی۔ تو میں نے کہا کہ اب مجھے کلمہ بھی پڑھا دو۔ مجھے سمجھ آ گیا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے...... یہ اللہ کا کلام ہے۔

واقعہ معراج سے قرآن کی تصدیق:

یعنی قرآن مقدس کو جس طرح بھی دشمنوں نے آزمایا ہے اور جس طرح بھی انہوں نے امتحان لیا ہے، مثلاً: اللہ کے قرآن نے خبر دے دی کہ میرے نبی کو معراج ہوا ہے۔ اب جب خبر آ گئی تو کافروں نے یوں آزمایا کہ سب اکٹھے ہو کر حضور ﷺ کی خدمت میں آ گئے اور کہنے لگے کہ آپ معراج پر تشریف لے گے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! تو انہوں نے پوچھا کہ کہاں تشریف لے گئے؟ تو آپ نے فرمایا: مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک گیا۔ تو انہوں نے کہا: آپ ایسا کریں! یہ بتلائیں کہ ہمارا ایک قافلہ شام کی طرف گیا تھا تو کیا وہ قافلہ بھی آپ کو راستہ میں ملا تھا؟ جب شام گئے تھے تو کیا اس قافلہ کو دیکھا تھا؟ تو اس طرح وہ امتحان لینے کے لیے آ گئے کہ جب آپ خبر دے رہے ہیں کہ اللہ نے آپ کو اسراء اور معراج کرایا ہے تو قافلہ والے ملے تھے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ''قافلہ ہمیں ملا تھا، بلکہ جب وہ قافلہ آ جائے تو تم ان سے پوچھنا کہ میری سواری جب گزری تو ان کی ایک اونٹنی ڈر گئی اور وہ دوڑی تو اس کا سوار گر گیا اور اس کا بازو ٹوٹ گیا تو وہ تمہارے سامنے ٹوٹے ہوئے بازو والا آ جائے گا۔'' انہوں نے کہا: ''عجیب بات ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' فرمایا: ''جب آ جائیں تو پوچھ لینا۔'' پھر ان بدبختوں نے پوچھا کہ وہ ہمارا قافلہ کب پہنچے گا؟......او بدبختو! قافلہ تمہارا ہے، حضور کو بتانے کا کیا تعلق ہے؟ یعنی کیا حضور ﷺ اس لیے گئے تھے کہ تمہارے قافلہ والوں کے پروگرام گنتے رہیں کہ کب پہنچے گا؟......لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ فلاں دن جب سورج نکلے گا تو قافلہ مکہ میں پہنچے گا۔ اب جناب اسی دن وہ سارے پہاڑ پر بیٹھے ہوئے ہیں کہ سورج نکلے تو دیکھیں۔ اب جوں ہی سورج نکلا تو قافلہ نظر آیا۔ جب قافلہ پہنچا تو ان سے پوچھا کہ تمہارا کوئی آدمی گرا تو نہیں؟ تو اس نے کہا: پتہ نہیں، کوئی اتنی تیز رفتار چیز گزری کہ اونٹنی ڈر گئی اور میں گرا اور میرا بازو ٹوٹ گیا۔ تو ان دشمنوں نے قرآن کو یوں آزمایا۔

[تفسیر الالوسی: ۸/۷، الاسراء: الآیۃ: سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا]

''لَا رَيْبَ'' پر وقف بھی کر سکتے ہیں:

ایک قراءت یوں ہے: ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ یعنی اس کتاب کے اندر کوئی شک نہیں ہے۔

اور بعض قراء نے ﴿الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ﴾ کہ ﴿لَا رَيْبَ ۛ﴾ پر وقف کر دیا ہے کہ اللہ کا قرآن ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ اور قرآن میں کیا ہے؟ ﴿فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞﴾ اس میں ہدایت ہے ڈرنے والوں کے لیے، لیکن ﴿لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ یوں وقف کرنا زیادہ بہتر ہے۔

جب ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ پر وقف کریں گے تو ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞﴾ قرآن کی صفت بنے گی۔ اور اگر ریب پر وقف کریں تو معنی ہوگا کہ اس میں ہدایت ہے لیکن اس کو سراپا ہدایت کہنا زیادہ ابلغ، واضح اور زیادہ اولیٰ ہے۔

''هُدًى'' یا تو مرفوع ہے صفت کے اعتبار سے یا اس پر نصب پڑھی گئی ہے باعتبار حال کے کہ اللہ نے فرمایا کہ قرآن ہدایت ہے، لیکن ان لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں، جو تقویٰ اختیار کرنے والے ہیں۔ جیسے دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۞﴾ [فصلت: ۴۴]

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۹، البقرۃ: تحت الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

ہدایت متقین کے ساتھ خاص ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن ہدایت ہے متقین کے لیے، قرآن ہدایت ہے ڈرنے والوں کے لیے۔ تو متقین کے ساتھ ہدایت کو خاص کیوں کیا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن تو سراپا ہدایت ہے، لیکن اس ہدایت سے نفع وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، پوچھا:

((يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِبْنُ جَدْعَانَ كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ يَصِلُ الرَّحِمَ وَ يُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ))

انہوں نے عرض کیا: حضور! ابن جدعان ہمارے قبائل میں گزرا ہے، یعنی قریش میں وہ بڑا اچھا آدمی تھا، صلہ رحمی کرتا تھا، غریبوں کو کھانے کھلاتا تھا اور یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں کی خبر گیری کرتا تھا، ''فَهَلْ ذَاكَ نَافِعُهٗ؟'' کیا یہ چیز اس کو قیامت میں فائدہ پہنچائے گی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں!'' تو بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: کیوں فائدہ نہیں دے گی؟ فرمایا: ''وہ کبھی ایمان لایا ہی نہیں اور اس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یا اللہ! میری مغفرت فرما دے اور قیامت والے دن سے نجات عطا فرما۔'' اس کا تو قیامت پر ایمان ہی نہیں۔ جو ایمان ہی نہ لایا، جس نے آخرت

کی بھلائی مانگی ہی نہ ہو اور آخرت پر یقین ہی نہ ہو تو اس کو آخرت کی بھلائی کیوں ملے گی؟

[صحیح مسلم، حدیث: ۳۶۵، بَابُ الدَّلِيلِ عَلَى أَنَّ مَنْ مَاتَ عَلَى الْكُفْرِ...]

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! ہدایت اس کو کیوں ملے جو ہدایت لینا ہی نہ چاہے۔ مثلاً: ایک آدمی بیمار ہے اور مریض ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جا کر دوائی لیتا ہے۔ ڈاکٹر بہت سمجھ دار ہے۔ نسخہ بھی اس نے بہت اچھا لکھا ہے، لیکن مریض دوا استعمال ہی نہیں کرتا۔ تو اب نہ دوا کا قصور ہے اور نہ ڈاکٹر کے نسخہ کا قصور ہے۔ قصور اس کا ہے جو اس کے حکم پر چل کر اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہا۔ اس لیے خداوند قدوس نے قرآن مقدس میں متعدد دفعہ یہ بات فرمائی ہے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ [الاسراء: ۸۲]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ہی قرآن اترا انہوں نے انکار کیا، پھر قرآن اترا پھر انکار کیا تو ان کا نقصان بڑھ گیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس سے مومنوں کو فائدہ ہوگا، کیونکہ اصل میں تو قرآن فی نفسہٖ سراپا ہدایت ہے، لیکن "لَا يَنَالُهُ إِلَّا الْأَبْرَارُ"۔ (ہدایت کو نہیں پہنچتے مگر جو پاک لوگ ہیں) جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ﴾ یہاں تمام لوگوں کو خطاب ہے ﴿قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ [یونس: ۵۷] تو قرآن ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی ہے، لیکن مومنین کے لیے، جو علاج کرانا چاہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

ہدایت کا معنی نور بھی ہے:

حضرت ابن عباس، حضرت مرۃ الہمدانی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما اور اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" کا معنی ہے "نُوْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ" کہ قرآن متقین کے لیے روشنی ہے، اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے، اللہ سے تقویٰ کرنے والوں کے لیے۔ تو قرآن متقین کے لیے نور ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ہونے کا مطلب:

اللہ ہدایت فرمائے کہ بعض لوگ غلط فہمیوں میں پڑ جاتے ہیں۔ قرآن کے بارے میں آ گیا کہ قرآن نور ہے، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آیا کہ نور ہیں۔ وہ اس جھگڑے میں پڑ گئے کہ انبیاء علیہم السلام نور ہیں، بشر نہیں ہیں۔ قرآن نے بھی کہا ہے کہ نور۔ اصل مراد یہ ہوتی ہے، اللہ کے بندو! سمجھا کرو! اللہ نے قرآن کو بھی نور فرمایا ہے،

اللہ نے پاک پیغمبر ﷺ کو بھی نور فرمایا ہے۔ نور کا معنی کیا ہوتا ہے؟ نورِ ہدایت، نورِ نبوت اور نورِ ایمان۔ تو نور اس لیے کہا جاتا ہے کہ آدمی اندھیرے میں بھٹکتا ہے، اندھیرے میں چلے جاؤ تو کبھی پاؤں ادھر پڑے گا اور کبھی اُدھر پڑے گا اور کبھی غار میں پڑے گا، کبھی کانٹوں پر پڑے گا۔ اور اگر روشنی ہوگی تو دیکھ کر چل رہا ہے۔ تو قرآن نور ہے، وہ کھول دیتا ہے کہ یہ توحید ہے اور یہ شرک ہے، یہ سنت ہے اور یہ بدعت ہے، یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے اور یہ کام کرنے والے ہیں اور یہ کام نہ کرنے والے ہیں۔ اس لیے اس کو نور کہا گیا کہ جیسے روشنی میں چلنے والا آدمی ٹھوکروں سے بچ جاتا ہے، اسی طرح قرآن وسنت پر عمل کرنے والا آدمی بدعت سے بچ جاتا ہے۔ اور جس نے میرے مدنی پاک ﷺ کا دامن پکڑ لیا، حضور ﷺ کی سنت پر چل پڑا تو گویا وہ بھی ایک نور میں آ گیا، ایک روشنی میں آ گیا۔ اس لیے اللہ نے مؤمن کو بھی فرمایا کہ ایمان ایک نور ہے:

﴿اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾

''اللہ مومنوں کے دوست ہیں۔ وہ ان کو اندھیروں سے نکالتے ہیں نور کی طرف۔''

کفر اندھیرا ہے اور ایمان نور ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــــُٔھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرة:۲۵۷]

''اور جو کافر ہیں وہ شیاطین کے دوست ہیں (اور شیاطین کیا کرتے ہیں) کہ لوگوں کو نور (ایمان) سے نکال کر اندھیروں میں ڈالتے ہیں۔ یہ سب جہنم والے ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ قرآن بھی نور ہے، ایمان بھی نور ہے اور انبیاء ﷩ کو بھی اللہ نے فرمایا کہ نور ہیں۔ اسی طرح اللہ نے نورِ بصارت بھی دیا ہے، اسی طرح نورِ بصیرت بھی دیا ہے۔ تو اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ جنس بھی نور ہو جائے اور جنسِ بشریت کا انکار کر دیا جائے۔

حضرت سفیان ثوری ﷫ نے حضرت حسن بصری ﷫ سے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ متقی اس کو کہتے ہیں:

''اِتَّقَوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ'' جو اللہ نے ان پر حرام کیا وہ اس سے بچ گئے۔

''وَأَدُّوْا مَا فَرَضَ عَلَيْهِمْ'' اور ان چیزوں کو ادا کیا جو اللہ نے ان کے اوپر فرض کر دیا ہے۔

یہ تقویٰ کا دوسرا درجہ ہے۔ تقویٰ کا پہلا درجہ تھا کہ کفر اور شرک سے بچ جانا اور دوسرا درجہ ہے کہ کبائر سے بچ جانا

اور صغائر پر اصرار نہ کرنا۔

حضرت ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھ سے امام اعمش رحمہ اللہ نے پوچھا کہ متقین کا کیا معنی ہے؟ میں نے ان کو بتلایا اور کہا کہ تم کلبی رحمہ اللہ سے جا کر پوچھو کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ جب میں ان کی خدمت میں آیا تو انہوں نے فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ﴾ [النجم:۳۲]

متقی ان کو کہتے ہیں جو کبیرہ گناہوں سے بچنے والا ہو۔ جب انسان کبائر سے بچنا شروع کر دے تو اللہ اس کو چھوٹے گناہوں سے بھی بچا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پھر میں امام اعمش رحمہ اللہ کے پاس آیا۔ میں نے کہا: حضرت کلبی رحمہ اللہ نے یہ فرمایا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ یہی بات ٹھیک ہے۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۳۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

متقین کی صفات:

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا:

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾

اب متقین کی کیا تعریف ہے؟ تو حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا: قرآن نے خود تعریف بیان کر دی:

﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۳]

جن کے اندر یہ صفات ہوتی ہیں وہ متقی ہیں:

1. ......غیب پر ایمان لانے والے،
2. ......نمازوں کو قائم کرنے والے،
3. ......اور جو اللہ نے انہیں رزق دیا ہے اسے اللہ کے راستہ پر خرچ کرنے والے۔

یہی تو متقین کی صفت ہے۔ قرآن نے خود بیان کر دی۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لفظِ "متقین" ان تمام اقوال کو شامل ہے، یعنی شرک سے بچنے والے، گناہوں سے ڈرنے والے، کبائر سے بچنے والے، حرام سے بچنے والے، اللہ کے عذاب سے ڈرنے والے، رب سے امید رکھنے والے، غیب پر ایمان لانے والے، نمازیں قائم کرنے والے اور اللہ نے جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ

کرنے والے۔ یہی ساری صفتیں متقین کی ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۹، البقرۃ: الآیۃ: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ]

مباح کاموں سے بچنا:

امام ترمذی نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ أَنْ يَكُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ حَتّٰى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهٖ...))

''بندہ متقین کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ مباح کاموں کو نہ چھوڑ دے۔''

یعنی ایک مباح کام ہے کہ اگر کر لیں تو کوئی حرج نہیں ہے، تو وہ اس سے بھی بچ رہا ہے کہ میں ایسے کام سے بھی بچوں کہ اس کے کرنے میں کچھ حرج ہو، یعنی جو ایک بالکل مشتبہ چیز سے بھی بچ رہا ہے۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۴۵۱]

اور اس لیے تقویٰ کا آخری درجہ یہ ہے کہ دل اللہ کے سوا سب سے غافل ہو جائے، کوئی ذرا سی چیز میں شبہ آیا ہے اس سے بھی بچ جائے، یہ تقویٰ کا آخری درجہ ہے کہ کفر و شرک سے بھی بچ گیا، کبائر سے بھی بچ گیا اور وہ تمام چیزیں جن میں تھوڑا سا بھی خدشہ ہے تو ان سے بچ گیا کہ خطرہ تو ہے کہ ایسا کام کیوں کریں؟ ممکن ہے کہ اس میں خیر نہ ہو اور میں ناجائز کے اندر پڑ جاؤں۔ یہ اعلیٰ درجہ ہے جو انبیاء ﷺ کو نصیب ہوتا ہے، صدیقین، شہداء اور صالحین کو نصیب ہوتا ہے۔

حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تقویٰ کے واقعات:

آپ نے پڑھا نہیں کہ حضور ﷺ تشریف لا رہے ہیں، آپ ﷺ کو بے انتہاء بھوک کی پریشانی ہے۔ راستہ کے اندر ایک کھجور کا دانہ پڑا ہوا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اٹھا بھی لیا اور فرمایا: بڑی شدید حاجت ہے اور مجھے بڑی شدید بھوک لگی ہوئی ہے، لیکن خدا جانے ایہ صدقہ کا ہو، زکوٰۃ کا ہو، لہٰذا میں نہیں کھاتا۔ یہ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ اور اعلیٰ مقام ہوتا ہے۔

اس لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ کا غلام آپ کے لیے شام کو پیالے میں دودھ لاتا تھا، رکھ دیتا تھا اور حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ رات کو تشریف لاتے تو اس کو نوش فرماتے تھے۔ ایک دن آپ تشریف لائے تو دودھ موجود تھا، اس کو نوش فرمایا، لیکن دودھ زیادہ تھا۔ غلام سے پوچھا کہ آج میرا دودھ زیادہ ہے؟ انہوں نے کہا: ''حضرت! اصل وجہ یہ ہے کہ آج میں خرید کر نہیں لایا، پرانے دور میں...... جب میں کافر تھا تو...... اس

وقت قبیلے کے کچھ لوگ تھے، ان کو کسی بچھو نے کاٹ لیا تھا۔ میں زمانہ جاہلیت میں کوئی منتر پڑھتا تھا۔ میں نے اس کا علاج کیا تھا اور منتر پڑھا تھا تو وہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ اور وہ آج اتفاق سے مجھے مل گئے تو ان کے پاس بکریوں کا ریوڑ تھا، انہوں نے مجھے دودھ پلایا اور دیا کہ لے جاؤ اپنے سردار کو بھی پلا دینا۔ تو وہ دودھ میں لے آیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حلق کے اندر انگلیاں ماریں اور قے کی کوشش کی۔ روایت میں آتا ہے کہ ان کے غلام کہتے ہیں کہ مجھے ڈر ہو گیا کہ اسی کے اندر حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فوت نہ ہو جائیں۔ اتنی تکلیف کے ساتھ آپ نے اپنے معدہ کو خالی کیا۔ اور کہا کہ اے میرے اللہ! میرے بس میں صرف اتنا تھا، اس کے علاوہ میری رگوں میں اس کا اثر ہو تو مجھے خود معاف فرما دینا۔ حالانکہ کیا تھا؟ کوئی حرام تو نہیں تھا؟ اگر نوکر لے آیا تھا، اس کو کہیں سے بھی ملے، اس کے لیے ہدیہ تھا۔ اب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو غلام نے دیا ہے، کوئی حرام تو نہیں ہے، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی احتیاط تھی کہ اس نے زمانہ جاہلیت میں جو منتر پڑھے تھے، پتہ نہیں وہ منتر شرکیہ ہوں، وہ کفر والے ہوں، اسلام اور قرآن کے خلاف ہوں تو ان چیزوں پر اس کو معاوضہ ملا۔ یہ معاوضہ حرام ہو تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے پیٹ میں حرام چلا جائے۔ یہ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ ہے۔ [صحيح البخاري، حديث: ۳۸۴۲، باب: أيام الجاهلية]

آپ دیکھیں کہ...... خدا نہ کرے!...... ایک آدمی چوری کرتا ہے...... ہمیں تو پتہ نہیں ہے...... اس نے کہا: "حضرت! یہ تسبیح میں آپ کے لیے ہدیہ لایا ہوں۔" مجھے کیا پتہ چوری کرتا ہے یا کیا کرتا ہے؟ اب میرے لیے تو وہ شرعاً حرام نہیں ہے، اس لیے کہ اگر اس نے مجھے کہا کہ یہ آپ کے لیے ہدیہ ہے اور مجھے علم نہیں ہے اور یہ حکم بھی نہیں ہے کہ یہ تحقیق کروں کہ کہاں سے کما کر لایا ہے؟ لیکن جو متقی لوگ ہیں، جیسے دیکھیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو برا اثر محسوس ہوا تو فوراً قے کر دی کہ میرے بدن میں کوئی ایسی چیز نہ جائے جس کے اندر ذرا سا بھی اشتباہ پایا جائے۔ یہ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ ہے۔

ایک عورت کا واقعہ:

ایک عورت سے زنا کا کام ہو گیا، کسی کو علم نہیں ہے، کوئی مدعی نہیں ہے اور کسی نے نہیں دیکھا، لیکن خود آئی کہ یا رسول اللہ! میں نے زنا کیا ہے اور میں حاملہ ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کو لے جاؤ اور اپنے گھر میں رکھو۔ جب یہ بچہ پیدا ہو جائے، فارغ ہو جائے اور نفاس کی مدت گزر جائے تو اس کو لے آنا۔" جب نفاس کی مدت گزری تو وہ عورت پھر آ گئی کہ یا رسول اللہ! مجھے پاک کر دیں...... دنیا میں پتھر کھانے منظور ہیں، جہنم کی آگ منظور

نہیں...... صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جب ہم اس عورت کو لے گئے تو اس کو کہا کہ کپڑے اپنے اوپر باندھ لو، کہیں پتھر لگنے سے پردہ نہ کھل جائے۔ تو اس کو پتھر مار مار کر مار دیا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جنازہ پڑھایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعتراض بھی کیا: یارسول اللہ! رجم ہوئی، زنا کیا اور اسی سزا میں ماری گئی، آپ نے جنازہ کیوں پڑھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمر! تمہیں پتہ نہیں ہے کہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر مدینہ کے ستر گناہگاروں پر تقسیم کروں تو سب کو جنت میں لے جائے۔'' [صحیح مسلم، حدیث: ۱۶۹۶، بَابُ: مَنِ اعْتَرَفَ عَلَى نَفْسِهِ بِالزِّنٰی]

حرام کے پیسوں سے حج:

حدیث کے اندر ہے کہ اگر تیرا کھانا پینا حرام سے ہے اور تیرا پیسہ حرام سے ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زور زور سے کہے گا: ''یا رب! یارب! یارب!'' ...... أَنّٰى يُسْتَجَابُ لَهُ؟...... کہاں سے دعا منظور ہو؟ [صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۱۵، بَابُ: قَبُولِ الصَّدَقَةِ مِنَ الْكَسْبِ الطَّيِّبِ]

اس لیے حدیث میں آیا ہے کہ جب حرام پیسے سے حج کریں گے تو کہا جائے گا: ''لَا لَبَّيْكَ وَ لَا سَعْدَيْكَ'' جاؤ! ہمیں تمہارے حج کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم نے حج تمہارے منہ پر مار دیا ہے۔ [مسند البزار، حدیث: ۸۶۳۸]

متقین کو روزِ قیامت خدا تعالیٰ کا دیدار ہوگا:

ابوحمزہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابی وائل رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک آدمی آیا، اس کا نام ابوعفیف تھا، تو اس کو شقیق بن سلمہ نے کہا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی کوئی بات ہمیں سنائیں۔ انہوں نے کہا: ''ہاں! سناتا ہوں۔ میں نے ان سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ قیامت میں ایک بہت بڑے چٹیل میدان میں سب جمع کیے جائیں گے تو پکارنے والا فرشتہ اللہ کے حکم سے پکارے گا: ''أَيْنَ الْمُتَّقُونَ؟'' کہاں وہ لوگ جو متقین ہیں، اللہ سے ڈرنے والے؟ وہ اللہ کے سامنے آئیں گے تو اللہ تعالیٰ بغیر حجاب کے ان کو اپنا دیدار کرائیں گے اور کوئی پردہ بھی حائل نہیں ہوگا۔ [شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة: ۳/۵۵۲، حدیث: ۸۶۴]

دیدارِ خداوندی حق ہے:

ایک دن میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے، چودھویں کا چاند نکلا ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم کو اس چودھویں کے چاند کے دیکھنے میں کوئی شک ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ''حضور! چودھویں کے چاند میں کسی کو شک

ہوسکتا ہے؟'' پہلی کے چاند میں تو شک ہوسکتا ہے کہ کسی کو نظر آئے اور کسی کو نظر نہ آئے، لیکن جب چودھویں کا چاند کامل مکمل سامنے کھڑا ہو تو سارے دیکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ قیامت والے دن تم اپنے پروردگار کی زیارت کرو گے اور پروردگار کی زیارت میں تمہیں کوئی شک نہیں ہوگا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۳۶، بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالَى: وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ]

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ بعض شان والے بندوں کو ہر مہینے زیارت نصیب ہوگی، بعض شان والوں کو ہفتے میں زیارت نصیب ہوگی، بعض لوگوں کو روزانہ اللہ کا دیدار نصیب ہوگا اور بعض لوگ ایسے شان والے ہوں گے جن کو اجازت ہوگی کہ جب چاہیں اپنے پروردگار کی زیارت کریں۔

تو فرمایا کہ منادی ندا کرے گا کہ متقین کہاں ہیں؟ جب وہ سامنے آئیں گے تو اللہ ان کو زیارت کرائیں گے اور کوئی پردہ حائل نہیں ہوگا۔ تو میں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ایسے متقی جن کو اللہ کا دیدار ہوگا وہ کون ہیں؟ مُتَّقُوْن کی تعریف کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ''متقی وہ لوگ ہیں جو شرک سے بچ گئے، جو اللہ کے سوا ہر چیز کی عبادت سے بچ گئے، اَصنام کی عبادت سے بچ گئے اور جنہوں نے اپنی عبادت خالص اللہ کے لیے کر لی کہ عبادت اللہ کے سوا کسی کی نہیں کریں گے، یہ لوگ اپنے پروردگار کے دیدار کے بعد جنت میں چلے جائیں گے۔

[شرح أصول اعتقاد أہل السنۃ والجماعۃ: ۳/ ۵۵۲، حدیث: ۸۶۴]

تقویٰ کے بعد نیک بیوی بڑی نعمت ہے:

حدیث مبارک میں آیا ہے: حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بہتر چیز جس سے بندہ فائدہ اٹھا کر جنت میں جاتا ہے وہ تقویٰ ہے، اس کے بعد نیک بیوی ہے۔ جب خاوند نظر ڈالے تو خوش ہو جائے، جب خاوند حکم کرے تو وہ فرمانبرداری کرے، اگر خاوند کوئی قسم کھا بیٹھے تو بیوی سچا کر دکھلائے (مثلاً: خاوند کہے: خدا کی قسم! میری بیوی نے گناہ نہیں کیا تو بیوی نے بھی بچ کر دکھلایا) اور اگر خاوند غائب ہو جائے تو اپنے نفس کی بھی اور خاوند کے مال کی بھی حفاظت کرنے والی ہو۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۱۸۵۷، بَابُ أَفْضَلِ النِّسَاءِ]

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

جو غیب کی تصدیق کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

سورۃ البقرۃ کی اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

❁...... ''اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ'' جو لوگ ایمان لاتے ہیں بن دیکھے،

❁...... ''وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ'' اور قائم کرتے ہیں نماز کو،

❁...... ''وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ'' اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے کچھ حصہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں۔

اب متقین کی صفات کا بیان ہے۔ پہلے تو مطلقاً ذکر کیا تھا کہ اللہ سے ڈرنے والے اور اب ان کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔

متقین کی صفات:

﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ﴾[البقرۃ:۳]

اس آیت مبارکہ کے اندر تین صفات کا ذکر آیا ہے:

1 ......پہلی صفت ہے: ایمان بالغیب۔ جب تک یہ باتیں ذہن نشین نہ ہوں قرآن وسنت کو سمجھنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ پہلی صفت ہے: ایمان بالغیب۔

2 ......دوسری صفت ہے: اقامۃ الصلوات۔

3 ......اور تیسری صفت ہے: انفاق کہ اللہ نے جو مال دیا ہے اس سے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا۔

ایمان کی تعریف:

ایمان اور اسلام دو لفظ ہیں۔ ایمان کا معنی لغت کے اعتبار سے تصدیق کرنا، یعنی کسی شخص کی لائی ہوئی بات پر اعتماد کرتے ہوئے تصدیق کرنا۔ یہ لغوی معنی ہے۔ اور شریعت کے اعتبار سے معنی یہ ہے: ''اَلتَّصْدِیْقُ بِجَمِیْعِ مَا جَآءَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰہِ (ﷺ)'' کہ اللہ کے رسول ﷺ جو لائے ہیں ان پر اعتماد بھروسہ کرتے ہوئے اس پر ایمان لانا، اس کی تصدیق کرنا۔ محسوسات کو محسوس کر کے، جیسے کسی چیز کا رنگ دیکھ کر یا اس کے وجود کو محسوس کر کے ماننے تو یہ ایمان نہیں ہے۔ ایمان یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی کے اعتماد و بھروسہ پر جو وہ کہے اس کو مان لیں، تب ایمان ہے۔ ہمارے حواس میں وہ چیز حاصل نہ ہو۔ اگر حواس سے ہم اس چیز کو معلوم کر رہے ہیں تو اس کو ایمان نہیں کہتے۔

''یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ'' میں اجمال ہے اور آگے ''اٰمَنَ الرَّسُوْلُ'' کے اندر تفصیل ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ قرآن اپنی تفسیر خود کرتا ہے۔ قرآن میں ایک جگہ اجمال ہوگا اور دوسری جگہ تفصیل ہوگی، ایک جگہ ابہام ہوگا، اس کو دوسری

جگہ اللہ کھول دے گا تو "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ" میں ایمان کی تفصیل آرہی ہے کہ اللہ کے نبی بھی اور مؤمن بھی ایمان لائے، حالانکہ اللہ کو ہم نے نہیں دیکھا اور اللہ کے فرشتوں اور اتاری ہوئی کتابوں اور رسولوں کو ہم نے نہیں دیکھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا، لیکن نزولِ وحی کی کیفیات، فرشتے اور جنت وجہنم وغیرہ کو نہیں دیکھا تھا۔

ایمان کا نمونہ:

ملحد اور زندیق اس کو کہتے ہیں کہ لفظ تو قرآن کے مانتا ہے، لفظ تو اسلام کے مانتا ہے، لیکن اس کی تشریح اپنی طرف سے کرتا ہے، اس تشریح کو نہیں مانتا جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرماتے ہیں۔ اب دیکھیں! ہم نے دن رات میں کتنی نمازیں پڑھنی ہیں؟ پانچ پڑھنی ہیں۔ ان پانچ نمازوں کا پڑھنا، ان پانچ نمازوں کا وقت، ان پانچ نمازوں کا طریقہ، ان پانچ نمازوں کے فرائض، ان کے وجوب، ان کے ارکان، ان کے واجبات اور ان کے مستحبات کس نے سمجھائے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھائے ہیں۔ اب اگر کوئی آدمی کہے کہ فجر کی نماز پڑھنی ہے، لیکن جب چاہیں گے پڑھیں لیں گے۔ یا جیسے بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ پانچ نمازیں دس دن کی اکٹھی پڑھتے ہیں۔ یا نمازیں اکٹھی، لیکن اس طرح نہیں مان رہے جس طرح ہمیں محمد پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا تو یہ ایمان نہیں ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو نماز پڑھتے ہیں۔ بھائی! تم لاکھ نماز پڑھو، لیکن جب اللہ نے فرمایا کہ نماز کا نمونہ میرا مدنی پاک ہے۔ جب اللہ نے فرمادیا کہ ایمان کا نمونہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو اس لیے جب تک ہم ان کے نمونہ پر نہیں اتریں گے تو ایمان والے نہیں۔ لہٰذا ایمان کی موٹی بات یاد رکھیں۔

بعض ایمانیات کا منکر بھی مسلمان نہیں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتماد، بھروسہ اور یقین کرتے ہوئے جو چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں ان کو ماننے کا نام ایمان ہے۔ اگر دس باتیں مانے اور ایک بات نہ مانے تو تب بھی ایمان نہیں ہوگا، اس لیے کہ اللہ نے خود فرمایا:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ [البقرة:٨٥]

اللہ نے فرمایا: یہودیوں کی طرح تم اللہ کی کتاب کی کچھ باتیں تو مانتے ہو اور کچھ باتوں کا انکار کرتے ہو۔ اللہ نے فرمایا: جو ایسا کرتے ہیں:

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ [البقرة:۱۱۴]

بعض کتاب پر ایمان ہو اور بعض پر نہ ہو اور وہ یہ ہے کہ ایک آدمی کہے: میرا اللہ پر ایمان ہے، رسول پر ایمان ہے، قرآن پر ایمان ہے اور شریعتِ رسول پر ایمان ہے، لیکن سود والا مسئلہ سمجھ نہیں آرہا، اس کے بغیر ہمارا گزارہ نہیں ہوسکتا۔ تو اب کیا نتیجہ نکلا کہ ساری باتیں مان لیں، لیکن ایک بات نہیں مانی تو کیا ہوگا؟ خود ہی فیصلہ کرلیں۔

بعض کفریہ باتیں:

لوگ کہتے ہیں کہ مولویوں کو کافر بنانے کی عادت ہے۔ لوگ بڑا الزام لگاتے ہیں کہ ان کا کام ہی یہی ہے کہ وہ کافر ہے اور یہ کافر ہے۔ یہ مولوی کافر بناتے نہیں ہیں، بلکہ کافر بتلاتے ہیں۔ بات سمجھا کریں! کافر بنانا علیحدہ بات ہے اور بتلانا علیحدہ بات۔ مولوی کی کہاں طاقت ہے کہ کسی کو کافر بنادے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ کسی کو مسلمان بناسکتا ہے اور نہ کسی کو کافر بناسکتا ہے۔ مولوی کا کام یہ ہے کہ وہ کفر کے بارے میں بتلاتا ہے کہ بھائی! جو ختمِ نبوت کا منکر ہے وہ کافر ہوگا۔ وہ بتلا تا رہا ہے اور وہ جواب جہاں جہاں پایا جائے وہ خود کافر بنتا رہے۔ مولوی نے تو اس کو کافر نہیں بنایا، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مولوی اس کو کافر بنائے۔ مولوی نہ کسی کو کافر بناتا ہے اور نہ بنا سکتا ہے، ویسے لوگ ناراض ہوتے ہیں۔ اب اللہ کا قرآن یہ کہتا ہے کہ ایک حکم کو مانے اور ایک حکم کو نہ مانے تب بھی کافر ہے، مسلمان نہیں۔ مسلمان کب بنے گا؟ جب ساری شریعت...... جو میرے مدنی سرکار لائے ہیں...... تمام شریعت پر ایمان لے آئے۔ اور ایمان بھی کیسے لے آئے کہ بس ٹھیک ہے! اللہ رسول کا فرمان ٹھیک ہے۔ ویسے حضرت گزارہ نہیں ہوسکتا، ویسے بینکنگ کے بغیر ملک نہیں چل سکتا، لیکن اگر آپ سے مولوی کہتے ہیں کہ اللہ و رسول کہتے ہیں: حرام ہے تو ٹھیک ہے، حرام ہو پھر بھی یہ مؤمن نہیں ہے، حالانکہ وہ مان تو رہا ہے، لیکن جبر سے اور اکراہ سے، زبردستی اور ڈر سے کہ لوگ مجھے کافر کہنا نہ شروع کردیں، لہٰذا میں کہہ دوں کہ ٹھیک ہے کہ سود ہے تو حرام، لیکن گزارہ نہیں ہوسکتا۔ اللہ نے فرمایا: نہیں تم مؤمن تب بنو گے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ [النساء:۶۵]

اللہ نے فرمایا: میرے مدنی! مجھے تیرے رب کی قسم! ہرگز لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے جب تک تیرے حکم کو نہ مانیں۔ حکم بھی ایسا کہ پھر دل میں تنگی بھی نہ ہو، پھر دل میں انقباض بھی نہ ہو، بس تیرا حکم ہے اور "اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا"

اسی میں بھلائی اور بہتری ہے۔ یہ کتنا بڑا جہل اور دھوکہ ہے کہ میرے پاک نبی ﷺ نے جب اسلام کا اعلان فرمایا، اپنی زندگی میں مدینہ منورہ سے اور اس کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دور، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا دور، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا دور گزرا، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور گزرا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا دور گزرا...... ایمان سے کہیں! اس دور میں کسی جگہ اور کسی ملک اور کسی کونہ میں اسلام تھا، انہوں نے کوئی سود کا کاروبار کیا تھا؟ اس وقت اسلام نے ترقی کی ہے یا تنزلی کی ہے؟ انہوں نے بائیس لاکھ مربع میل پر اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے، وہ ملک کیسے چلتے رہے؟ اُس دور میں آخر تجارت کیسے ہوتی رہی؟ نقل وحمل کیسے ہوتی رہی؟ اس وقت بھی دنیا میں مال آتے تھے، یعنی یمن، شام آتے تھے، تجارت کے معاملات تھے، پھر اسلام پھیلتا چلا گیا، قیصر کو رگڑ ڈالا، ادھر دریائے نیل سے نکلتا ہوا ہسپانیہ تک پہنچا، ادھر چین تک صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے، تو اُس دور میں اسلام بغیر ان محرمات کے چل سکتا ہے؟ جی ہاں! اب بھی چل سکتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس وقت تو چل سکتا تھا اور اب نہیں چل سکتا؟ اللہ کا نبی جو وضو کرنا سکھلاتا ہے، ناک میں پانی ڈالنا سکھلاتا ہے، جو ہمیں استنجاء کرنا سکھلاتا ہے، جو ہمیں مسواک کرنا سکھلاتا ہے، کیا کوئی ایک ایسی چیز کو ہمیں بغیر سکھلائے ہوئے چلے گئے جس پر پوری دنیا کا دارومدار ہے؟ تو اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ ایمان کا معنی یہ ہے: ''اَلتَّصْدِیْقُ بِمَا جَآءَ بِهِ الرَّسُوْلُ'' کہ میرا مدنی جو چیز لائے وہ سب اللہ کا فرمان ہے، سب کا ماننا ضروری ہے۔

حضور ﷺ وہی حکم دیتے ہیں جو اللہ کا حکم ہوتا ہے:

اس لیے سیدنا امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر کروڑوں سلام اور کروڑوں رحمتیں ہوں، کتنا بڑا عبقری اور ذہین انسان تھا! کتنا دور اندیش تھا کہ حضور ﷺ کے منبر پر کھڑے ہوئے فرمایا: ''یَآیُّهَا النَّاسُ!'' اے لوگو! خبردار ایک وقت آئے گا لوگ کہیں گے کہ آیت الرجم تم قرآن میں نہیں پاتے ہیں۔ خبردار! ''رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَرَجَمَ أَبُوْبَكْرٍ وَرَجَمْنَا'' میرے مدنی ﷺ نے خود رجم کی، ابوبکر نے خود رجم کی اور ہم بھی رجم کرتے ہیں۔ اور اللہ کے نبی اللہ کے حکم کے بغیر کوئی بات کہہ ہی نہیں سکتے۔ خیال کرنا! ایسے ملحد اور زندیق نہ پیدا ہو جائیں جو فرق کر دیں کہ ہم اللہ کا حکم مانتے ہیں اور رسول اللہ کا حکم نہیں مانتے۔ اگر مجھے ڈر نہ ہوتا کہ بعض باطل فرقے اور بعض گمراہ فرقے عمر پر الزام لگا دیں گے کہ اس نے قرآن میں زیادتی کی ہے، مجھے خدا کی قسم ہے! تو میں قرآن کے حاشیہ پر وہ حکم لکھ دیتا جو اللہ نے اپنے نبی کو دیا تھا:

((اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ إِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھُمَا اَلْبَتَّۃَ نَکَالًا مِّنَ اللّٰہِ))

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۸۲۹، سنن ابن ماجہ، حدیث: ۲۵۵۳، باب: الرجم]

(یہ آیت منسوخ التلاوۃ اور باقی الحکم ہے) کہ اگر کوئی شادی شدہ مرد یا عورت زنا کریں تو رجم کیا جائے۔ یہ حکم میں قرآن پر لکھ دیتا، لیکن بعض گمراہ فرقے آئیں گے، وہ کہیں گے کہ عمر نے اللہ کے قرآن میں اضافہ کیا ہے، اس لیے میں نہیں لکھتا، لیکن خبردار رہنا! یاد رکھنا! ﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۝ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝﴾ [النجم: ۳،۴] کہ میرا مدنی تو وحی کے سوا بولتا نہیں ﴿وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ ۚ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ۚ﴾ [الحشر: ۷] جس کام کا میرا رسول حکم دے اس کو پکڑ لو اور جس کام سے روکے اس سے رک جاؤ۔ جب حضور ﷺ نے رجم کا حکم دیا ہے تو انکار کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اگر اللہ نے میرے مدنی کو رجم کا حکم نہیں دیا تھا اور حضور ﷺ نے رجم کا حکم دے دیا پھر تو حضور ﷺ ان کے قتل کے مرتکب ہوں گے۔

ابوجہل کا دل سے حضور ﷺ کو ماننا اور زبان سے انکار کرنا:

ابوجہل کعبۃ اللہ کا طواف کر رہا تھا۔ اس کا ایک دوست آیا ہوا تھا، وہ اس کو طواف کرا رہا تھا...... کعبہ شریف کا طواف ابوجہل بھی کرتا تھا، طواف کر لینے سے کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم طواف کرتے ہیں، ہم نمازیں پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، تہجد پڑھتے ہیں اور ایک ٹانگ پر کھڑے ہوئے ساری رات وظیفہ پڑھتے ہیں، ہم کیسے مشرک ہیں؟ ابوجہل بڑے طواف کرتا تھا...... وہ طواف کر رہا تھا تو اس کا ایک دوست بھی ساتھ تھا۔ تو اس نے پوچھا کہ ابوجہل! دیکھو! میری اور تمہاری دوستی ہے، آج تم مجھے ایک سیدھی بات بتاؤ۔ اس نے کہا: ''کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''میں نے سنا ہے کہ مکہ میں ایک نبی پیدا ہوئے ہیں، جن کا نام محمد رسول اللہ (ﷺ) ہے، تم اس کو جانتے ہو؟'' اس نے کہا: بالکل۔ اس نے کہا: ''کمال کرتے ہو! محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں، ہمارے رشتہ دار ہیں، بالکل جانتے ہیں، بنو ہاشم کے خاندان سے ہیں، اعلیٰ خاندان سے ہیں۔'' اچھا یہ بتاؤ کہ وہ جو کہہ رہا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اللہ کا نبی ہوں، میرے اوپر اللہ کا قرآن اترا ہے، وحی اتری ہے، اس بات میں وہ سچا ہے یا جھوٹا ہے؟ ابوجہل نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور اس نے کہا کہ تم دوست ہو، تمہارے ساتھ جھوٹ نہیں بولتا...... یعنی کعبہ کا طواف کرتے ہوئے جھوٹ بولتے ہوئے ابوجہل کو بھی شرم آئی تھی، آج مسلمان کو شرم آتی ہے؟ مسلمان کعبہ کا طواف کرتے ہوئے حاجی کی جیب کاٹ لیتا ہے۔ عمرہ والے رو رہے ہوتے ہیں کہ کسی کا

پاسپورٹ غائب، کسی کا ٹکٹ غائب اور کسی کے پیسے غائب۔ کیا یہاں یہودی جیب کاٹنے کے لیے آتا ہے؟ یا نصرانی آتا ہے؟ یا ہندو لعنتی آتا ہے؟...... تو اس نے کہا: ''وہ جو کہتا ہے سچ کہتا ہے، جو اپنی رسالت نبوت کا کہہ رہے ہیں۔'' اس نے کہا: ''تم عجیب بات کر رہے ہو'' ''لَبِثَ فِيْنَا سِنِيْنَ'' ۔ کہنے لگا ہمارے اندر حضور کے چالیس سال گزرے ہیں، اس ذات نے کبھی کسی بندے پر جھوٹ نہیں بولا تو رب پر کیسے جھوٹ بولے گا کہ میرے خدا نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے......!؟ اتنا بڑا جھوٹ تو ناممکن ہے۔ تو اس دوست نے کہا: ''پھر تم مان کیوں نہیں لیتے؟ یعنی جب بات سچی ہے۔'' تو اس نے کہا: ''برادری کا جھگڑا ہے۔''

ماننے کا نام ایمان ہو گیا، اسلام کا معنی ہے اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کرنا، استسلام یعنی اپنے آپ کو اسلام کے سپرد کر دینا۔

ایمان اور اسلام میں فرق:

اس لیے قرآن نے ایک مقام میں ایمان اور اسلام کا فرق کیا ہے کہ ایمان کا معنی ہے ماننا اور اسلام کا معنی ہے اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کرنا اور اقرار کرنا۔ اس لیے اس لغوی معنی کے اعتبار سے قرآن نے ایک جگہ فرق کیا ہے اللہ نے فرمایا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ [الحجرات: ۱۴]

میرے مدنی! یہ دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ ان سے کہو: تم ایمان تو نہیں لائے، بلکہ یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں، اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اور فرمایا:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ﴾ [النساء: ۱۴۵]

فرمایا: منافقین جہنم کے سب سے نیچے والے طبقہ میں ہوں گے، کیونکہ زبان سے اقرار کرتے ہیں، لیکن اندر سے نہیں۔

اب ایک آدمی کے دل کے اندر تو ہے، لیکن زبان سے اقرار نہیں ہے تو بھی ایمان نہ بنا۔

﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ﴾ [البقرۃ: ۱۴۶]

﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ﴾ [النمل: ۱۴]

یہودی جانتے تھے کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) سچے نبی ہیں، لیکن زبان سے اقرار نہیں کرتے تھے، اس لیے آپ زیادہ جھگڑوں میں نہ پڑیں۔

سلف صالحین کی جو تعریف ہے وہی جامع ہے۔ بات سمجھ لو کہ ایک گونگا ہے، زبان سے اقرار نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ تو مجبور ہے، اس لیے ایمان کی جامع تعریف یہ ہے:

''اَلْإِيْمَانُ تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ وَإِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِالْأَرْكَانِ.''

''دل میں بھی تصدیق ہو اور زبان سے بھی اقرار ہو اور پھر سارا بدن اس اقرار کی گواہی دے۔''

ایمان اعمال صالحہ کا حصہ ہے یا نہیں؟

باقی جو علماء کے اندر اختلاف ہے کہ جزء مانتے ہیں یا نہیں مانتے؟ وہ علمی مسئلے ہیں۔ حالانکہ بات سب کی ایک ہے، صوری نزاع ہے، حقیقی نزاع ہے ہی نہیں۔ اصل نزاع تو فرق باطلہ سے ہے، جو معتزلہ، کرامیہ، قدریہ اور جبریہ ہیں۔ اور پھر فرقِ ضالہ سے نزاع ہے جو خوارج ہیں، روافض ہیں، جو راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ حالانکہ سب کے نزدیک ایمان کی جامع تعریف کیا ہوئی؟ تصدیق بالقلب۔ تصدیق کا محل دل ہے۔ جیسے نیت کا مقام دل ہے، اسی طرح تصدیق کا مقام دل ہے۔ اصل ایمان کی جڑ اور بنیاد وہ تصدیق ہے جو دل میں ہے۔ اور اقرار باللسان زبان سے اقرار ہے: ''شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ''۔ اچھا! اب تصدیق بھی ہو، اقرار باللسان بھی ہو اور ہاتھ پاؤں سارا بدن گواہی بھی دے۔ یہ ایمان ہے۔ آپ دیکھیں کہ آپ کو بخار ہے تو ڈاکٹر کہے گا: یہ بخار ایسے نہیں ہے، کوئی اندر انفیکشن ہے۔ وہ کہے گا: اس کا گلا چیک کرو، جی اس کا گلا ٹھیک ہے۔ ناک چیک کرو، ناک ٹھیک۔ پیٹ چیک کرو، اس نے کہا: ہاں! پیٹ کے اندر ذرا گڑبڑ ہے۔ تو اس نے کہا کہ آنتوں کے اندر انفیکشن ہے، اس کی وجہ سے بخار ہوا ہے۔ تو یہ بتلانے کا ذریعہ ہے کہ اس کے اندر کوئی گڑبڑ ہے۔ بخار کا اثر بدن پر آ جائے اور ایمان کا اثر بدن پر نہ ہو تو یہ عجیب ایمان ہوا!! لیکن ہیں ہم مسلمان، اگرچہ نہ ہماری شکل سے ایمان نظر آئے، نہ ہماری عقل سے ایمان نظر آئے، نہ ہمارے لباس سے ایمان نظر آئے، نہ ہمارے کردار میں ایمان نظر آئے، نہ ہماری سیرت میں ایمان نظر آئے، نہ صورت میں ایمان نظر آئے اور نہ ہمارے کردار میں ایمان نظر آئے، بلکہ اگر ہمارے دس آدمی انگریزوں میں چھوڑ دیں تو انگریز نظر آئیں، ہندوؤں میں چھوڑ دیں تو ہندو نظر آئیں، سکھوں میں چھوڑ دیں تو سکھ نظر آئیں، نصرانیوں میں چھوڑ دیں تو نصرانی نظر آئیں اور گانے بجانے والوں میں چھوڑ دیں تو آپ

کو بالکل ایسے نظر آئیں۔ یہ ایمان تو نہ ہوا۔ ایمان تو تب ہوگا جب دل میں تصدیق ہو، زبان پر اقرار ہو اور عمل بالارکان (بالاعضاء) ہو۔ کیا معنی؟ کہ اگر آپ نماز پڑھتے ہیں تو ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں یا نہیں ہلاتے؟ آپ وضو کریں گے اور اس کے بعد نماز میں رکوع اور سجدوں میں جائیں گے تو پورا بدن تصدیق کر رہا ہے، بلکہ ایمان ہے، کیونکہ پورا بدن اطاعت میں لگا ہوا ہے۔ اور اگر اطاعت کا اظہار ہمارا بدن نہیں کر رہا، ہمارے ارکان اور جوارح نہیں کر رہے، ہاں! فرق صرف اتنا ہے کہ بعض خاص خاص اعمال ہیں، جن کے بارے میں محدثین نے کہا کہ ان کا منکر کافر ہو جاتا ہے، ورنہ وہ کہتے ہیں کہ ایمان میں کمال پیدا نہیں ہوتا۔ بعض عمل ایسے ہیں جن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرما دیا، مثلاً: حضور ﷺ نے فرما دیا:

''جو ایک نماز جان بوجھ کر چھوڑ دے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔'' [المعجم الاوسط، حدیث: ۳۳۴۸]

اس لیے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فتویٰ دیا کہ جو شخص ایک فرض نماز جان بوجھ کر چھوڑ دے، کوئی عذر اور بیماری نہیں، کوئی تکلیف اور مجبوری نہیں تو وہ کافر ہو گیا، ایمان سے خارج ہو گیا اور اس کا نکاح بھی ختم ہو گیا۔ اور فرماتے ہیں کہ اگر اسی حالت میں مر گیا تو اس کا جنازہ نہ پڑھا جائے اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں بھی دفن نہ کیا جائے۔ کیونکہ دیکھو کہ قرآن آپ لوگوں کو کیا کہہ رہا ہے ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ [البقرۃ: ۳] ایمان بالغیب کے بعد دوسری صفت نماز کی آئی ہے۔ جب ہمارے ہاں وہ صفت ہی نظر نہ آئے تو کیسا ایمان ہے؟ اور میرے مدنی ﷺ نے بھی فرما دیا:

((اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ، مَنْ أَقَامَهَا أَقَامَ الدِّيْنَ وَمَنْ هَدَمَهَا هَدَمَ الدِّيْنَ))

''نماز دین کا ستون ہے۔ جس نے نماز کو قائم رکھا اس نے دین کو قائم رکھا اور جس نے اس کو گرایا اس نے دین محمد مصطفیٰ ﷺ کو ختم کر دیا۔'' [تفسیر الشعراوی: ۱۲۵۸]

اور فرمایا:

((بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۶۲۰، باب: ما جاء في ترك الصلاة]

''مسلمان بندے اور کفر کے درمیان فرق نماز کے چھوڑنے کا ہے۔

تو ((بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ)) کیا ہے؟ فرمایا: ((تَرْكُ الصَّلَاةِ)) کہ نماز کا چھوڑنا ہے۔

اور فرمایا:

((اَلصَّلٰوةُ صِلَةٌ بَيْنَ الْعَبْدِ وَرَبِّهٖ.)) [التفسير الوسيط للوحيلي، ج:۱:۱]

''بندے اور اس کے رب کے درمیان جو تعلق اور رسی ہے وہ نماز ہے۔ (جب نہیں تو اللہ سے تعلق ختم ہو گیا)۔''

حضور ﷺ کے احکام کا انکار کفر ہے:

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک قول ہے کہ ہم اس پر کیسے ایمان لائیں؟ فرمایا: ایمان تب مکمل ہوگا جب میرے حکم پر بھی اور میرے مدنی کے حکم پر بھی اسی طرح کار بند رہو گے۔ یہ تحقیق ہمارے ذمہ ہوگی کہ کیا یہ حکم واقعی اللہ کے رسول کا ہے یا نہیں؟ اس میں تو تحقیق ہو سکتی ہے، لیکن جب یہ تحقیق ہو جائے کہ یہ اللہ کے رسول کا حکم ہے، اب اس کا انکار کفر ہے۔

منافق کا قصہ:

جیسا کہ بڑا مشہور واقعہ ہے کہ ایک منافق اور یہودی کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ یہودی کہتا تھا کہ ہم فیصلہ محمد (رسول اللہ ﷺ) سے کرائیں گے اور منافق کہتا تھا کہ ایسا کرتے ہیں، حضور ﷺ بڑے مصروف ہیں اور آپ کے پاس بڑا کام ہے، ہم حضور ﷺ کے پاس فیصلہ کے لیے نہیں جاتے، بلکہ کسی اور سردار سے فیصلہ کرواتے ہیں۔ یہودی نے کہا: ''عجیب بات ہے! تم نبی کا کلمہ پڑھتے ہوئے کہتے ہو کہ ہمارے نبی ہیں اور میں تو یہودی ہوں، میں آپ ﷺ کو نہیں مانتا، لیکن مجھے آپ ﷺ کا فیصلہ منظور ہے۔ بہرحال یہودی کو پتہ تھا کہ میں حق پر ہوں اور مدنی حق کا فیصلہ کریں گے۔ وہ کبھی یہ سوچ نہیں سکیں گے کہ اِدھر مؤمن ہے، ایمان والا ہے اور اُدھر یہودی ہے۔ جب عدل ہوگا تو عدل میں برابری ہوگی، اس میں ذرہ کے برابر بھی فرق نہیں ہوگا۔ وہاں نہ مذہب کی رعایت کی جائے گی اور نہ قومیت کی رعایت کی جائے گی۔ اور نہ وہاں لسانیت کی رعایت کی جائے گی اور نہ صوبائیت کی رعایت کی جائے گی۔

﴿وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ [النساء:۵۸]

انصاف کے ترازو میں فیصلہ تولا جائے گا۔ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے، حضور ﷺ نے مقدمہ سنا تو آپ نے یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا، کیونکہ یہودی کا حق تھا۔ اور منافق...... جو اوپر سے کلمہ پڑھتا تھا، اندر سے ایمان نہیں تھا...... اس نے کہا: ''اچھا ایسا کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس چلتے ہیں...... کیونکہ منافق کو یہ خیال تھا کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑا سخت آدمی ہے، کفر کے ساتھ اس کی بنتی نہیں ہے، خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہودیوں سے بغض اور دشمنی ہے اور میرا مدعی یہودی ہے، یقیناً حضرت عمر رضی اللہ عنہ میری رعایت کریں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے اور آکر واقعہ پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ تم دونوں ٹھہرو! میں ابھی فیصلہ کی کتاب لے کر آتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر میں گئے اور تلوار لے کر آئے اور تلوار مار کر منافق کی گردن کو اڑا دیا۔ اس کے بعد پورے مدینہ میں شور ہوگیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کلمہ پڑھنے والے کو مار دیا کیونکہ منافق ظاہراً کلمہ پڑھتا تھا، ظاہراً تو نمازیں بھی پڑھتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں معاملہ آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَقَتَلْتَ رَجُلًا؟ يَا عُمَرُ!)) [تفسیر ابن کثیر: ۲/۳۴۸]

''اے عمر! تو نے ایک ایسے آدمی کو مار ڈالا جو کلمہ پڑھتا تھا: ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ''؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! جو آپ کا فیصلہ قبول نہ کرے، عمر کے پاس تلوار ہے، میں اور دوسری باتیں جانتا ہی نہیں، میرے نزدیک دو اور دو چار ہوتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دشمن:

یہی وجہ ہے کہ آج چودہ سو سال گزر گئے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دشمن معاف نہیں کرتے۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں کفر کے متعلق ذرہ لچک نہیں تھی۔ انہوں نے کہا: ''حضور! اس نے آپ کے فیصلہ کا انکار کیا، میں نے اس کو مار ڈالا ہے۔ میری گردن حاضر ہے، اس کو اڑا دیں۔ بہر حال میرے جذبات کا فیصلہ یہ ہے، میرے ضمیر کا فیصلہ یہ ہے کہ جو میرے مدنی پاک کا فیصلہ نہ مانے وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔ ابھی یہ بحث ہو رہی تھی کہ اللہ نے قرآن اتارا کہ میرے مدنی! ہم نے آسمان سے عمر کا فیصلہ قبول کرلیا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ [النساء: ۶۵]

''ہرگز وہ مومن نہیں ہوسکتے مجھے تیرے رب کی قسم ہے! اے محمد مصطفیٰ! کہ جن کا فیصلہ آپ فرمائیں اور وہ آپ کے فیصلہ کو تسلیم نہ کریں، میں تیرے رب کی یعنی اپنی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ مومن نہیں ہے۔ (اور عمر نے جو فیصلہ کیا درست کیا ہے)۔''

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۲، النساء: الآیۃ: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ]

انکارِ حدیث کفر ہے:

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ اگر ایک آدمی کہے کہ قرآن کی بات تو ہم مان لیتے ہیں، لیکن حدیث میں تو بہت ساری باتیں ہیں...... ان احادیث کی بات جو ہم تک پہنچی ہے...... پتہ نہیں کہ صحیح ہو یا نہ ہو؟ جو بات حدیث متواتر صحیح سے ثابت ہو جائے گی اس پر بھی ہم اسی طرح ایمان لائیں گے جس طرح اللہ کے قرآن پر ہم ایمان لاتے ہیں، کیونکہ حدیث مبارک دراصل تشریح، تفسیر اور بیان ہے اللہ کے قرآن کا، جو اللہ نے اپنے محمد مصطفیٰ ﷺ پر اتارا ہے۔

اسی طرح یاد رکھو! اگر دل میں ایمان ہے اور زبان پر اقرار نہیں، تب بھی وہ مسلمان نہیں ہے۔ یعنی دل میں مانتا ہے کہ اسلام تو بڑا سچا دین ہے اور حضور ﷺ کی ذات بھی بڑی مبارک ہے، لیکن کلمہ نہیں پڑھتا تو اس وقت تک وہ مؤمن نہیں کہلائے گا جب تک زبان سے اقرار نہ کر لے۔ اور ایک آدمی زبان سے تو کلمہ پڑھتا ہے، لیکن دل میں ایمان نہیں تو پھر بھی ایمان نہیں ہوگا۔

اور اس کی جامع تعریف محدثین اور سلف صالحین نے فرمائی ہے۔ اس کو یاد کر لیں کہ ایمان کا معنی کیا ہے؟ ''تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ'' کہ دل میں پکی تصدیق ہو، ''اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ'' کہ زبان پر کلمہ شہادت ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کا اقرار ہو۔

عبادات کامل ایمان کے لیے ضروری ہیں:

اور پھر ''عَمَلٌ بِالْأَرْكَانِ''۔ جو اللہ نے ہمیں اعضا دیے ہیں یہ بھی گواہی دیں کہ ہم نے واقعی اسلام قبول کیا ہے، مثلاً: آپ نے ایک درخت لگایا ہے۔ اب ایک سال گزر گیا، دوسرا سال گزر گیا۔ نہ شگوفے نکلتے ہیں، نہ اس پر پتے لگتے ہیں اور نہ وہ سبز ہو رہا ہے، سوکھتا ہی جا رہا ہے، کھڑا ہے، لیکن ابھی گرا نہیں ہے تو آپ کہیں گے: اس کی جڑ زمین میں صحیح نہیں لگی، یہ صحیح خوراک نہیں لے رہا۔ تو جب تک دل میں تصدیق نہیں ہوگی تب تک ایمان نہیں ہوگا۔ اگر اقرار اور اعتراف نہیں ہوگا تب بھی ایمان نہیں ہوگا اور اگر دونوں چیزیں ہیں، لیکن کوئی پھل نہیں لگ رہا، ہمارے اعضا پر ایمان اسلام کی کوئی شکل نظر نہیں آ رہی تو پھر بھی ایمان نہیں ہوگا۔ بلکہ ایمان یہ ہے کہ دل میں تصدیق ہو، زبان پر اقرار ہو اور اقرار کے ساتھ عمل ہو، پھر جا کر ایمان کی دولت مکمل ہوگی۔

اسی طرح اگر دور سے ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے تو دور سے آپ کو نظر آئے گا کہ یہ مسلمان ہے کہ کعبہ کی طرف

کھڑا ہے، رکوع بھی کر رہا ہے، سجدہ بھی کر رہا ہے۔ آپ اس کو نہیں جانتے، لیکن اس کو دور سے دیکھنے کے بعد فوراً فیصلہ کریں گے کہ یہ مسلمان ہے۔ ایک آدمی بھگوان کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہے، آپ فیصلہ کرلیں گے کہ ہندو ہے۔ اگر سورج کی طرف منہ کر کے کھڑا ہے تو آپ فیصلہ کرلیں گے کہ یہ کواکب کا پوجنے والا ہے۔ آگ جلا کر آگ پر کھڑا ہے، آپ فیصلہ کرلیں گے کہ یہ آتش پرست ہے۔ اس لیے اگر مؤمن کے بدن سے کوئی ایمان کی چنگاری بھڑکتی ہوئی نظر نہیں آتی، کوئی علامت نظر نہیں آتی، نہ اس کی صورت میں اسلام نظر آتا ہے، نہ اس کی سیرت میں اسلام نظر آتا ہے، صرف زبانی کہہ دینا کہ چھوڑو! ہم بھی مسلمان ہیں۔ یہ قانونی مسئلہ تو ہے کہ کلمہ پڑھ رہا ہے، اس کو ہم مسلمان کہیں گے، لیکن حقیقی معنوں میں یہ مؤمن نہیں ہے۔ اس لیے ایمان یہ ہوا کہ دل میں تصدیق، زبان پر اقرار اور ارکان پر عمل کرنا۔

"اَلْإِيْمَانُ: التَّصْدِيْقُ بِالْقَلْبِ وَالْإِقْرَارُ بِاللِّسَانِ وَالْعَمَلُ بِالْأَرْكَانِ."

ایک ایمان کی حقیقت کا مرتبہ اطمینانِ نفس ہے۔ یہ ایمان کا اونچا مرتبہ ہے ﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ﴾ (الفجر: ۲۷) قرآن نے اس کو نفس مطمئنہ کا درجہ دیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ أَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ))

[شرح السنۃ: ۱/ ۲۱۳، مشکوۃ: ۱۶۷]

"تم مؤمن نہیں بن سکتے جب تک تم اپنی تمام خواہشات کو میرے تابع نہ کردو۔"

جب یہ مرتبہ آجاتا ہے کہ اپنی تمام خواہشات کو نبی پاک ﷺ کے تابع کردے تو پھر نفسِ مطمئنہ حاصل ہوتا ہے۔ اپنی خوشی یا غمی، دکھ سکھ، غرض ہر قول وعمل حضور ﷺ کے تابع ہو۔

اجمالی ایمان کا ذکر:

"يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" ایمان کا معنی یہ ہے حضور ﷺ کی ذات جو کچھ اللہ کی طرف سے لائی اس کا ماننا بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے۔ محسوسات، مبصرات یا مشاہدات کو ماننے کا نام ایمان نہیں ہے، بلکہ حضور ﷺ کے فرمانے پر اللہ کے رسول کی بات ماننا ایمان ہے "يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" میں ایمان کا اجمال ہے۔

غیب کی تعریف:

جو چیز جمیع حواس خمسہ کے ساتھ بھی ہمیں معلوم نہ ہو سکے وہ غیب ہیں۔ اگر حواسِ خمسہ سے معلوم کرلیں تو وہ غیب

نہیں ہوتا۔ حواسِ خمسہ جہاں کام نہ کریں وہ چیز غیب ہے، جیسے: وحی کا اترنا، وجودِ باری تعالیٰ، وجودِ ملائکہ اور جنت و جہنم وغیرہ، یہ سب حواس سے معلوم نہیں ہو سکتے، ان کا علم صرف رسول اللہ ﷺ کے بتانے سے ہی ہو سکتا ہے۔

غیب اور غائب میں فرق:

غیب اور غائب میں فرق ہے:

- ......غائب وہ ہے جو نہ تجھے دیکھے اور نہ تو اسے دیکھے۔
- ......غیب وہ ہوتا جو ہمیں تو نظر نہ آئے، لیکن وہ تمہیں دیکھ لے تو کوئی حرج نہیں۔

لہٰذا غائب اور غیب میں بڑا لطیف فرق ہے۔ جیسے ہم ملائکہ کو نہیں دیکھ سکتے، لیکن ملائکہ تو ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ ہم اللہ کو نہیں دیکھ سکتے، لیکن اللہ پاک تو ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح جنات کو ہم نہیں دیکھ سکتے، لیکن جنات تو ہمیں دیکھ رہے ہیں، لیکن ہم سے غیب ہیں۔ تو اس لیے اللہ تعالیٰ پر غیب کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن غائب کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ پاک تو موجود ہے اپنے علم کے ساتھ، اس کا علم ہر ہر ذرہ کو محیط ہے۔

غیب کا مالک اللہ ہے، اس لیے قرآن کا فیصلہ سنیں، اللہ نے فرمایا:

﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾ [النمل:۶۵]

''میرا مدنی! کوئی نہیں جانتا آسمانوں اور زمینوں میں غیب کو مگر اللہ۔ اور آگے فرمایا: میرا مدنی پاک! آپ امت کو سمجھائیں! جو قبر پر کھڑے ہو کر مدد مانگ رہے ہیں، قبروں والوں کو پکار رہے ہیں، یا ان بتوں کو پکار رہے ہیں، ان کو تو خود پتہ نہیں ہے کہ یہ قبروں سے کب اٹھیں گے؟ جب ان کو اپنا پتہ نہیں ہے تو تمہارا حال انہوں نے کیسے جان لیا ہے؟ ﴿وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾ ان کو تو یہ شعور بھی نہیں، خبر بھی نہیں ہے کہ ہم نے کب اٹھنا ہے؟

واقعہ معراج پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایمان:

حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ایمان لائے۔ جب آپ ﷺ معراج سے واپس آئے، ابھی تک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس حضور ﷺ خود بھی نہیں آئے، بلکہ ابو جہل اپنی کمپنی کو لے کر آ گیا، کہنے لگا: ''اے ابو بکر! اب تو ہماری بات مان لو! ہم نہ کہتے تھے...... معاذ اللہ!...... حضور دیوانے ہیں؟ ہم نہ کہتے تھے...... نعوذ باللہ...... اِنَّهٗ لَمَجْنُوْن۔'' ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کیا بات ہے؟'' انہوں نے کہا: ''اب تو بات ہی کھل گئی، حضور (ﷺ)

فرماتے ہیں کہ میں رات مسجد اقصیٰ گیا تھا۔ پھر مسجد اقصیٰ سے آسمانوں پر بھی گیا اور جنت میں بھی گیا، ساری سیر کر کے واپس مکہ میں آ گئے۔ اب دیکھو بھلا! یہ عقل والی بات ہے؟ مانی جا سکتی ہے؟ کئی مہینوں اور سالوں کا سفر اور پانچ سو سال کا سفر اور حضور ﷺ نے رات رات میں کر لیا؟'' ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ان جھگڑوں کو چھوڑو! یہ بتاؤ! جو تم کہہ رہے ہو وہ تم نے حضور ﷺ سے سنا؟ حضور ﷺ نے خود فرمایا؟'' انہوں نے کہا: ''ہاں ہاں!'' تو فرمایا: ''میرا ایمان ہے، انہوں نے سچ کہا ہے۔''...... تو یہ ایمان ہے کہ دیکھا نہیں ہے، سمجھ میں آنے والی بات بھی نہیں ہے اور حواسِ خمسہ سے معلوم ہونے والی بات بھی نہیں ہے...... انہوں نے کہا: جب حضور ﷺ نے فرما دیا تو بات ہی ختم ہوئی۔ اس کے بعد چوں چرا کرنے کی کیا بات ہے؟ حضور ﷺ نے فرما دیا، بس سرِ تسلیم خم ہے، اب ہم نے گردن جھکا دی ہے۔ [روح المعانی، الاسراء: الآیۃ: سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ]

ایک دیہاتی کا حضور ﷺ پر ایمان لانے کا عجیب واقعہ!

حدیث میں آتا ہے کہ میرے آقا ﷺ قافلہ کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں۔ ایک لاغر اونٹنی ہے اور اس پر ایک بدو بیٹھا ہوا ہے، وہ بے چارہ بھی لاغر ہے۔ اس نے اشارہ کیا تو حضور ﷺ نے قافلہ روک لیا۔ اس نے کہا: ''قافلہ والو! مہربانی کرو اور مجھے مدینہ پاک کا راستہ بتا دو۔'' حضور ﷺ نے اندازہ لگا لیا اور پوچھا: کیوں بھائی! کیوں مدینہ کا راستہ پوچھتے ہو؟ اس نے کہا: ''میں نے سنا ہے کہ وہاں اللہ کا نبی آیا ہے، محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، ان کی خدمت میں جانا چاہتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''...... الحمدللہ!...... میں ہی اللہ کا نبی ہوں، میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں، جن کو تم ڈھونڈنے جا رہے ہو۔'' تو وہ بالکل بدو ہے، دیہات میں رہنے والا ہے، اَن پڑھ ہے، لیکن اس نے بات کتنی پیاری کی کہا: ''عَلِّمْنِي مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ'' حضور! مجھے سکھلا دیں، پڑھا دیں جیسے آپ کو اللہ نے پڑھایا ہے۔''

حضور ﷺ نے ایمان پڑھانا شروع فرما دیا، وہ خاموش ہو کر سنتا رہتا ہے۔ حضور ﷺ نے ساری شرطیں ختم کر لیں:

((آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ.))

جب حضور ﷺ نے اپنی بات مکمل فرمائی تو اس نے کہا: ''قَدْ أَقْرَرْتُ بِذٰلِكَ'' جو کچھ آپ نے پڑھایا میں

اقرار کرتا ہوں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: ''قَدْ أُقْرِرْتُ بِذٰلِكَ'' ابھی اس نے کاف پورا ادا نہیں کیا تھا کہ اونٹنی کا پاؤں کسی غار میں گیا تو وہ بے چارہ گرا اور گردن ٹوٹ گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی سے اتر آئے اور اس کے سر کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا...... اتنا بڑا نصیب!!...... اور فرمایا:

((عَمِلَ قَلِيلًا وَأُجِرَ كَثِيرًا.))

دیکھو! تمہارا ساتھی کتنا خوش نصیب ہے کہ کام تو تھوڑا کیا، لیکن بڑا اجر لے گیا کہ ابھی اقرار کیا اور ابھی موت آگئی۔ جنتوں میں پہنچ گیا اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں آ گیا۔ اور جنازہ پڑھنے والا خاتم الانبیاء سید الاولین و الآخرین شفیع المذنبین حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبرئیل مجھے ابھی بتلا رہے ہیں کہ کئی دن ہو گئے فاقہ کے ساتھ گزارہ کر کے بے چارہ کئی دن سے مجھے ڈھونڈ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ملا دیا۔

[مسند احمد، حدیث: ۱۹۱۵۸]

دین کی کچھ اشیاء پر ایمان لانے کا حکم:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تمام چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اگر کوئی بعض پر ایمان لائے اور بعض پر ایمان نہ لائے تو اس کو مؤمن نہیں کہتے۔ اگر ایک آدمی ایمان کی باتوں میں متردد ہے، متشکک ہے، اس کو کہیں گے کہ کفر کے قریب چلا گیا، اس کو کافر نہیں کہیں گے، لیکن جب وہ انکار کر دے تو کافر ہو جائے گا۔

ایمان کا جزء کفر سے بیزاری:

ایمان لانے کے بعد کفر سے بھی براءت کا اظہار کرے۔ ایمان صرف یہی نہیں کہ ایمان لے آؤ، بلکہ ایمان لانے کے بعد کفر سے براءت کا اعلان کرے:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرٰهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ ۚ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ۚ﴾ [الممتحنة: ۴]

اللہ نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور آپ کی امت کے لیے کیا بہترین نمونہ ہے ابراہیم علیہ السلام کا کہ انہوں نے اور ایمان والوں نے کافر قوم سے کہا:

﴿إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ۚ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ﴾

[الممتحنة: ۴]

اے کافرو! سن لو! ہم تم سے بھی اور تمہارے خداؤں سے بھی بے زار ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کی طرح آپ کفر سے بے زاری کا اعلان کرو۔ یہ نہیں کہ میں مؤمن ہوں اور کافروں سے یاری پکی ہے اور دلوں کے تعلقات بھی پکے اور ہر بات پر کفر پر بھروسہ بھی ہے اور ہے مؤمن......!!!

﴿قُلْ يَاأَيُّهَا الْكَافِرُونَ ① لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ② وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ③ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ ④ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ⑤ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ⑥﴾ [سورۃ الکافرون]

فرمایا: جتنا بھی کفر ہے اور گمراہ فرقے ہیں ان سب سے ڈنکے کی چوٹ سے براءت کا اعلان کرنا پڑے گا کہ جو قرآن کا منکر ہے ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں، جو حضور ﷺ کا منکر ہے ان سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہیں، جو اللہ کے اوامر و نہی اور احکام کا منکر ہے ان سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہیں، باقاعدہ ان سے براءت کا اظہار کرو۔ جب تک ان سے براءت کا اظہار نہیں کرو گے اس وقت تک ایمان پکا نہیں ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ آپ کہیں کہ سب کو ہم راضی کرلیں کہ اگر آپ کبھی مندر میں جائیں تو گھنٹے کھنکھٹانے شروع کردیں اور اگر آپ کبھی کافروں کی قبروں پر جائیں تو وہاں بھی چادریں چڑھانا شروع کردیں۔ وہاں تم نے کس ایمان سے چڑھائیں اور یہاں کس ایمان سے چڑھائیں؟ اور یہ ایمان تو نہ ہوا، بلکہ......نعوذ باللہ!......تماشہ ہوا کہ اگر ہمیں صحابہ کا دشمن کوئی مل گیا تو کہا: کوئی بات نہیں، آخر ان سے ملیں گے جلیں گے تو بات سمجھ آئے گی، حضرت! بالکل دوری بھی تو بہتر نہیں ہے، آخر ان سے ہمیں تعلقات تو رکھنے پڑیں گے۔

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک نماز چھوڑنے والے کا حکم:

﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾ اگر مؤمن ہے تو نماز کو قائم کرے گا اور نماز قائم نہ کرے تو سمجھو کہ مؤمن نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک نماز جان بوجھ کر چھوڑ دے تو کافر ہوجاتا ہے اور اس کا نکاح بھی ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد اگر اولاد پیدا ہوگی تو وہ ولد الزنا ہوگی۔ اگر خاوند نمازی ہے اور عورت بے نمازی ہے تب بھی نکاح ختم ہوگیا ہے۔ اگر مرجائے تو اس کا جنازہ بھی نہ پڑھیں اور اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن بھی نہ کریں۔ کیونکہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے ایمان کے ساتھ پہلی چیز ہی نماز بیان کی ہے۔ تو جب اقامت الصلوۃ کی صفت نہیں آرہی تو ایمان کدھر گیا؟

اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ جِهَارًا.)) [المعجم الاوسط، رقم:۳۳۴۸]

''جو شخص ایک نماز بھی جان بوجھ کر چھوڑے تو کافر ہو گیا۔''

[شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة حديث:۱۵۲۰]

کیونکہ نماز ''اَلصَّلٰوةُ صِلَةٌ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الرَّبِّ.'' اللہ اور بندے کے درمیان سلسلہ ہے جو نماز جوڑے ہوئے ہے۔ اگر نماز چھوڑ دی تو اللہ سے سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جب اللہ سے تعلق ٹوٹ گیا تو پھر ایمان کہاں رہے گا؟

اقامتِ صلوۃ کا معنیٰ:

نماز قائم کرنے کا معنی یہ ہے کہ نماز کو تمام فرائض وسنتوں کے ساتھ ٹھیک ٹھیک پورا پورا ادا کرنا۔ جہاں اللہ نے تعریف میں ذکر کیا وہاں ذکر ''اقامت'' کا ملتا ہے اور جہاں مذمت میں ذکر کیا وہاں لفظ ''مصلین'' کا ملتا ہے۔ فرمایا:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝﴾ [الماعون:۴،۵]

اور فرمایا:

﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۝ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝﴾ [القیامۃ:۳۱،۳۲]

اور جہاں مدح ہے، فرمایا:

﴿وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ﴾ [النساء:۱۶۲]

﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ [البقرۃ:۳]

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ [الاسراء:۷۸]

''اَقِمِ الصَّلٰوةَ'' وہاں پر لفظ اقامت ہے۔ اقامت کا معنی ہے کہ نمازوں کو اس کے تمام حقوق کے ساتھ ادا کرنا، یعنی شرائط وارکان اور فرائض وواجبات کے ساتھ ادا کرنا۔

''مُتَّقِيْنَ'' کی تیسری صفت یہ ہے کہ جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا۔

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۳]

حضرت ابو جعفر الرازی رحمہ اللہ نے حضرت علاء بن المسیب رحمہ اللہ سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایمان نام ہے تصدیق کا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۰، البقرۃ: ۱۱ آیۃ: الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ]

اور تصدیق کا معنی ہوتا ہے ماننا اور علم کا معنی ہوتا ہے جاننا۔ جیسے علم و معرفت حاصل ہو تو وہ ہوتا ہے جاننا اور ایمان کا معنی یہ ہے کہ صرف جان نہیں، بلکہ مان بھی لیا جائے۔

کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر نہیں ہے:

معتزلہ کے فرقوں نے اہل السنۃ کی ایمان کی تعریف میں تمام و الجماعت کی مخالفت کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا اور وہ ایمان سے نکل جاتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں دوسرا فرقہ ہے، وہ کہتا ہے کہ مرتکب کبیرہ گناہ کرتا بھی رہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ ایمان موجود ہے، لہٰذا کوئی کبیرہ گناہ اس کو نقصان نہیں دے گا۔ تو انہوں نے بعض آیات مبارکہ اور بعض احادیث مبارکہ میں اپنی پسند کے مطابق تاویلات کر ڈالی ہیں۔

جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' دَخَلَ الْجَنَّۃَ.))

''جو شخص ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کہے گا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔''

صحابی نے سوال کیا: ''وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ؟'' اگرچہ وہ زانی ہو، چور ہو تب بھی وہ جنت میں جائے گا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ'' اگرچہ وہ زانی ہو، چور ہو تب بھی وہ جنت میں جائے گا۔ اس نے پھر پوچھا، پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' دَخَلَ الْجَنَّۃَ، وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ))

حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑے ناراض بھی ہوئے اور فرمایا: ''عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ'' ابوذر! تم بار بار جو پوچھ رہے ہو وہ جنت میں جائے گا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۵۸۲۷، باب: الثیاب البیض]

تو اب اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ زنا کرتا رہے۔ مقصد بیان کرنے کا یہ ہوتا ہے کہ جیسے کوئی آدمی کہے کہ بیمار ہوں تو آپ پوچھتے ہیں: کیا بیماری ہے؟ آپ کہیں: خیر ہے، کچھ نہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ نزلہ زکام کوئی بیماری نہیں ہوتی، نزلہ زکام بیماری ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ مجھے ٹی بی ہو گیا، یا کہتا ہے کہ کینسر ہو گیا ہے، یا کہتا ہے

کہ ڈاکٹروں نے تحقیق کی ہے کہ تمہارے دل کے دو وال کام نہیں کر رہے، تو بہت خطرناک بات تھی۔ تو کہنے کا مقصد یہ تھا کہ جب ایمان میں داخل ہوگیا تو وہ کفر سے تو نکل آیا، باقی گناہ کفر کے مقابلے میں تو چھوٹے ہیں۔ یہ مقصد نہیں تھا کہ جو زنا کرتا ہے تو کرتا رہے، جو چوری کرتا ہے تو کرتا رہے، کیونکہ زنا پر باقاعدہ حد (سزا) آئی ہے۔ اسی پاک پیغمبر ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

((لَا يَزْنِي الزَّانِي حِينَ يَزْنِي فَهُوَ مُؤْمِنٌ)) [صحیح البخاری، حدیث:۶۸۰۹، باب: إثم الزناة]

''جب زانی زنا کرتا ہے تو ایمان نکل جاتا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝﴾ [الاسراء:۳۲]

اسی طرح ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں آکر کہنے لگا کہ حضور! میں زنا کے معاملہ میں بڑا مجبور ہوں، مجھے زنا کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم یہ قبول کرو گے کہ کوئی آدمی تمہاری والدہ کے ساتھ ایسا کام کرے؟ یا تمہاری بہن کے ساتھ ایسا کام کرے؟ یا تمہاری بیٹی کے ساتھ ایسا کام کرے؟'' اس نے کہا: نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم بھی جس پر نظر ڈالتے ہو وہ بھی تو کسی کی بہن ہے، کسی کی بیٹی ہے، یا کسی کی ماں ہے۔'' [مجمع الزوائد، حدیث ۵۴۳، باب: فِي أَدَبِ الْعَالِمِ]

اس لیے ہمیشہ بیان سے مقصود سمجھانا ہوتا ہے کہ جہاں ایمان کا پہلو بیان کیا جا رہا تھا وہاں بیان یہ ہوا کہ چاہے زانی ہے، یا چور ہے، یا گناہگار ہے، لیکن کافر تو نہیں، کفر کے مقابلہ میں تو یہ بیماریاں چھوٹی ہیں۔ یہ مراد نہیں کہ یہ بیماری ہی نہیں، یا یہ گناہ ہی نہیں۔ تو اس وجہ سے معتزلہ اہل سنت والجماعت کے خلاف ہوئے۔ بعض نے کہہ دیا کہ مرتکب کبیرہ جنت میں داخل ہی نہیں ہوگا، وہ کہتے ہیں کہ قرآن فرما دیا:

﴿اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ [آل عمران:۱۳۳]

﴿وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ [الشعراء:۹۰]

اللہ کا قرآن فرماتا ہے کہ جنت ہم نے متقین کے لیے تیار کی ہے۔ اور جنت قیامت والے دن قریب کر دی جائے گی متقین کے لیے۔

جب جنت متقی کے لیے ہے تو جس نے زنا کیا وہ متقی نہیں، بلکہ وہ تو فاسق ہوگیا۔ جس نے چوری کی وہ متقی نہیں،

بلکہ فاسق ہوگیا۔ جب وہ فاسق ہوگیا تو وہ جنت میں کیسے جائے گا؟ حالانکہ یہ بات بھی غلط ہے۔ آپ نے پڑھا ہے جس طرح تقویٰ کے مدارج ہیں:

❁...... پہلا درجہ یہ ہے کہ کفر وشرک سے بچ جائے۔ جو آدمی کفر وشرک سے بچ گیا وہ بھی متقین میں شامل ہوگیا۔

❁...... متقین کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ کفر وشرک سے بھی بچ جائے اور کبائر سے بھی بچ جائے اور صغائر پر اصرار نہ کرے۔ وہ بھی تقویٰ کا ایک اعلیٰ درجہ ہے۔

❁...... اور اس کے بعد تقویٰ کا درجہ ہے: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] وہ ایسا درجہ ہے کہ دل میں اللہ کے سوا کوئی علاقہ بھی باقی نہ رہے، سب چیزوں سے تعلق ختم ہو جائے ماسوا اللہ تبارک وتعالیٰ کے۔

جب اس نے کلمہ پڑھا تو آدمی متقین کی صف میں داخل ہوگیا تو وہ جنت کا حق دار بن گیا۔ اس لیے قرآن پاک فرماتا ہے کہ قیامت والے دن جب کافر دیکھیں گے کہ مومنوں کی شفاعت ہو رہی ہے، انبیاء بھی شفاعت کر رہے ہیں، ملائکہ بھی شفاعت کر رہے ہیں، حافظ قرآن بھی شفاعت کر رہے ہیں، اللہ کے قرآن کی سورتیں بھی شفاعت کر رہی ہیں اور پھر اللہ کے سارے اولیاء بھی شفاعت کر رہے ہیں تو اب کافر کہیں گے:

﴿فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ ۝ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ ۝﴾ [الشعراء: ۱۰۰، ۱۰۱]

''ہائے ہمارا تو کوئی سفارشی بھی نہیں ہے اور نہ ہی آج ہمارا کوئی دوست اور ہمدم ہے۔''

''حَمِيمٍ'' کہتے ہیں وہ جو خاص قریبی تعلق والا ہو۔ اس لیے علماء نے فرمایا:

''شَافِعِينَ'' جمع کا صیغہ آیا ہے، ''صَدِيقٍ'' مفرد کا۔ چونکہ دنیا میں سفارشی تو بڑے پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن صدیق بہت قلیل ہوتا ہے۔ اس لیے صدیق کا لفظ افراد کے ساتھ لایا گیا۔

اور اس کے بعد کہیں گے:

﴿فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝﴾ [الشعراء: ۱۰۲]

''کاش! ہمیں دنیا میں جانے کا پھر ایک دفعہ موقع ملے، ہم بھی ایمان والوں میں سے ہو جائیں گے۔''

اب مطلب یہ ہوا کہ جو گناہگار ہیں تو شفاعت بھی ان کی ہوگی، جو گناہگار ہی نہیں اس کو شفاعت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ تو بغیر شفاعت کے اوّل دفعہ میں جنت میں چلے جائیں گے۔ شفاعت کی ضرورت ان کو پڑے گی جو

ایمان دار ہیں، لیکن گناہ گار بھی ہیں۔ ایمان دار ہیں، لیکن خطار کار بھی ہیں۔ ایمان دار ہے، لیکن کبائر بھی ذمہ لگے ہوئے ہیں، جہنم کا پروانہ مل گیا ہے۔ ان کو ضرورت ہے کہ کوئی ان کی شفاعت کرے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

((أَنَا أَشْفَعُ فَأُشَفَّعُ... حَتّٰى يُقَالَ لِيْ: هَلْ رَضِيْتَ؟ يَا مُحَمَّدُ!، أَقُوْلُ: رَضِيْتُ يَا رَبِّ! رَضِيْتُ يَا رَبِّ! رَضِيْتُ يَا رَبِّ!))

آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک دفعہ شفاعت نہیں کروں گا، بلکہ شفاعت کروں گا، پھر شفاعت کروں گا، پھر شفاعت کروں۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اتنی بار اللہ کے آگے شفاعت کروں گا، یہاں تک کہ مجھے کہا جائے گا کہ اے محمد ﷺ آپ راضی ہو گئے یا کہ نہیں؟ تو میں کہوں گا: "اے پروردگار عالم! میں راضی ہو گیا، میں راضی ہو گیا، میں راضی ہو گیا۔" [مسند أحمد، حدیث:۲۸۰۶]

اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

"كُنَّا نَعُدُّ أَهْلَ الْبَيْتِ أَرْجٰى آيَةً فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ."

ہم اہل بیت سب سے زیادہ امید والی آیت قرآن میں یہ سمجھتے ہیں: ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ﴾ [الضحیٰ:۵] اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ میرے مدنی مصطفیٰ ﷺ! ہم آپ کو آخرت میں اتنا دیں گے، اتنا دیں گے کہ ہم آپ کو راضی کر دیں گے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ یہ آیت بڑی امید دلانے والی آیت ہے، کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ حضور ﷺ اتنے کریم ہیں، اتنے مہربان ہیں اور اتنے رحمۃ للعالمین ہیں! آپ ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک آپ کی امت سے کوئی ایک بھی جہنم میں پڑا ہوا ہو۔ [التوحید لابن خزیمۃ: ۲/ ۶۷۳]

اس لیے فرمایا کہ شفاعت تو گناہ گاروں کی ہوگی۔ اس لیے عقیدۂ اہل سنت والجماعت بڑا جامع عقیدہ ہے کہ ایمان دل کی تصدیق ہے، اس کے بعد زبان سے اقرار ہے اور اس کے بعد ہمارے اعضاء اس اقرار پر گواہی دیتے ہیں کہ ہم صحیح معنوں میں اللہ پر ایمان لا چکے ہیں، اللہ کی کتابوں پر ایمان لا چکے ہیں۔

ایمان کے معانی:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایمان کا ترجمہ تصدیق سے فرمایا ہے۔

حضرت زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایمان عمل کا نام ہے۔

حضرت ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یُؤْمِنُوْنَ'' کا معنی ہے ''یَخْشَوْنَ'' کہ وہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اور جو اللہ سے ڈرے گا تو لازمی بات ہے کہ وہ فرمانبرداری کرے گا۔

اصل میں یہ سب صورتاً اختلاف ہے، وگرنہ اہل سنت والجماعت متفق ہیں...... ماشاء اللہ!...... کوئی جھگڑا نہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۰، البقرۃ: الآیۃ: اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ]

نکات وفرق:

حضرت ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اولیٰ اور راجح ترجمہ یہ ہے کہ مومنین کی صفت ایمان بالغیب ہوگی باعتبار قول کے بھی، باعتبار اعتقاد کے بھی اور باعتبار عمل کے بھی۔ اس کے اندر تینوں چیزیں آ گئیں: اعتقاد بھی آ گیا، قول بھی آ گیا اور عمل بھی آ گیا۔ جیسا کہ سلف صالحین نے فرمایا: ''اَلْاِیْمَانُ تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ وَاِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِالْاَرْکَانِ۔''

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۰، البقرۃ: الآیۃ: اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ]

مفسر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خشیت اللہ یعنی اللہ سے ڈرنا یہ ایمان کے اندر داخل ہے کہ جب ہم نے تصدیق کی ہے اور جو کلمہ ہم نے کہا ہے عمل بھی اس کی گواہی دے، یعنی ہم نے کلمہ پڑھا ہے ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' (کوئی معبود برحق نہیں، مگر اللہ اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔) تو جب ہم نے یہ کلمہ پڑھا تو ہمارا عمل بھی اس کی تصدیق کرے۔ جب اللہ کے سوا کوئی عبادت لائق ہی نہیں تو غیر کی عبادت کا کیا معنی ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم نے جو قول واقرار کیا تھا، تمہارا عمل اس کی تصدیق نہیں کر رہا۔ اقرار تو یہ تھا کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں اور عبادت تو تم غیروں کی کر رہے ہو کہ نذر ونیاز، استغاثہ ہے، قربانی ہے، پکارنا ہے، رکوع ہے، سجدہ ہے اور مانگنا ہے، یہ سب عبادت ہے، اللہ کے سوا کسی غیر کے لیے جائز نہیں۔

آپ دیکھیں کہ نماز پڑھ رہے ہیں تو کس کے لیے؟ اللہ کے لیے، طواف کر رہے ہیں تو کس کے لیے؟ اللہ کے لیے، اگر ملتزم پر آ کر مانگ رہے ہیں تو کس سے مانگیں؟ اللہ سے۔ اور حج والے دنوں میں منیٰ میں قربانی کرتے ہیں تو اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہیں۔ نماز، رکوع، سجدہ کرنا، پکارنا اور ہاتھ اٹھا کر مانگنا دعا بھی عبادت ہے، نذر ونیاز، دنبے جانور ذبح کرنا، یہ سب عبادت ہے، یہ ساری چیزیں اللہ کے لیے تھیں۔ جب ہم غیر کے لیے کریں گے تو گویا ہم نے جو اقرار کیا تھا ہمارا عمل اس کے خلاف جا رہا ہے۔ یعنی ہم کہہ تو رہے ہیں کہ ہم مدینہ شریف جا رہے ہیں، لیکن

ہم نے سڑک جدہ والی لی ہوئی ہے۔ او بھائی مدینہ شریف تو ادھر ہے۔ تو کہا کہ نہیں جی! ہم تو مدینہ شریف جا رہے ہیں۔ مدینہ شریف جانا تب ہے جب تمہاری نیت بھی وہیں جانے کی ہو، تمہاری سڑک بھی مدینہ والی ہو، رخ بھی مدینہ کی طرف ہو، پھر تو تمہاری منزل کٹے گی۔ بس والا چھ گھنٹے میں پہنچ جائے گا اور پیدل والا دو چار دن میں پہنچ جائے گا، لیکن پہنچ جائے گا، کیونکہ سڑک مل گئی، راستہ مل گیا۔ اس لیے جو اعلیٰ درجات والے ہوں گے وہ جنت میں جلدی پہنچ جائیں گے اور جو دوسرے درجہ والے ہوں گے وہ ذرہ لیٹ پہنچیں گے اور تیسرے درجہ والے ان کے بعد پہنچے اور ہم جیسے گناہ گار لیٹ پہنچے، لیکن پہنچ تو گئے، لیکن جو آدمی کہے کہ مدینہ جا رہا ہوں، جبکہ سڑک الٹی ہے تو وہ الٹا مدینہ سے دور تو ہو رہا ہے، وہ مدینہ کے قریب نہیں ہو رہا۔ وہ جتنا سفر کر رہا ہے مدینہ منورہ سے دور ہوتا جائے گا۔

اسی طرح سمجھیں کہ جو آدمی اللہ اور اس کے رسول کے فرمان پر چل رہا ہے وہ اللہ کے قریب ہو رہا ہے، اللہ کے پیغمبر کے بھی قریب ہو رہا ہے۔ اور جو اللہ اور اللہ کے رسول کا نام لیتا ہے، لیکن اس کا عمل حضور ﷺ کی سنت کے مطابق نہیں ملتا، حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق نہیں ملتا اور حضور ﷺ کے احکام کے مطابق نہیں ملتا تو وہ اتنا ہی سنت سے دور ہو رہا ہے اور اللہ سے دور ہو رہا ہے۔ لاکھ دعویٰ کرتا رہے کہ میں حضور ﷺ کو چاہتا ہوں تو یہ دعویٰ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، جب تک عمل اس دعویٰ کی تصدیق نہ کر دے۔ مثلاً: آپ میرے ساتھ وعدہ کریں کہ آپ میرے گھر میں آئیں گے۔ یہ آپ نے مجھے قول اور اقرار دیا اور آپ نہیں آئے تو آپ نے اس وعدہ کو نہیں نبھایا، بلکہ خلاف کیا۔ یعنی قول کچھ تھا اور عمل کچھ تھا۔ یہ منافق کی تو صورت ہے، ایمان والے کی نہیں ہوتی۔

منافق یہ کرتے تھے کہ کہتے کچھ تھے اور عمل کچھ ہوتا تھا۔ ظاہر میں آ کر حضور ﷺ کے بڑے عاشق بنتے تھے، اندر دشمنی ہے۔ ظاہر میں آ کر حضور ﷺ کے ہاتھ چوم رہے ہیں اور حضور ﷺ کے ساتھ بیٹھ رہے ہیں، بڑے صدقے کر رہے ہیں اور اندر بغض بھرا ہوا ہے۔ تو اس لیے اگر دل میں تصدیق ہے تب زبان پر اقرار آئے، اگر دل میں تصدیق نہیں تو اقرار کا فائدہ کوئی نہیں۔ اگر اقرار آئے گا اور دل میں تصدیق نہیں تو اقرار کا فائدہ کوئی نہیں ہے۔ اگر اقرار آیا تو اقرار کے سچے ہونے کے لیے عمل کے ساتھ گواہی دے گا کہ ہم نے جو قول و اقرار کیا ہے میں اس کو نبھا رہا ہوں۔

آپ دیکھیں کہ کسی آدمی سے آپ نے قرضہ لینا ہو اور وہ آپ کو نہ دے تو آپ کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے لاکھ ریال دینا ہے تو کم از کم کچھ دینا شروع کرو تو میں سمجھوں کہ تم دینے والے ہو۔ جو تم نے وعدہ کیا ہے اس پر کچھ عمل تو

کرو، کچھ پریکٹیکل طور پر تم ثابت کرو کہ تم قرضہ کی ادائیگی کرنا چاہتے ہو۔ اور کہتے ہو کہ آپ کا قرضہ بالکل پکا۔ بھائی! پھر دے دو۔ جناب! ابھی نہیں ہے، تو تم کہو گے کہ اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے دینا ہی نہیں چاہتے ہو۔ اس لیے آدمی اگر اپنی زبان سے اللہ کی توحید کا دعویٰ کرے اور عشقِ نبی کا دعوی کرے اور عمل میں بدعت ہو، عمل کے اندر سنت کی مخالفت ہو، عمل کے اندر غیر اللہ کی شرکت ہو تو مطلب یہ ہوا کہ عمل اس کے قول کی تصدیق نہیں کر رہا۔ اسی بات کو سمجھیں! اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو اور مجھے بھی اس کی سمجھ دیں۔

لفظِ ''ایمان'' جامع کلمہ ہے:

لفظِ ''ایمان'' جامع کلمہ ہے۔ اللہ پر ایمان لانا، اللہ کی کتابوں پر ایمان لانا، اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا اور جو کچھ آپ نے اقرار کیا ہے اس کو بالفعل یعنی کر کے دکھانا۔ ایمان کا معنی لغت کے اعتبار سے تصدیق ہے، جیسے قرآن پاک میں بھی یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے ''يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ'' تو یہاں صرف تصدیق کے معنی میں آیا ہے اور جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ سے کہا تھا:

﴿وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ﴾ [یوسف:۱۷]

''ابا جان! آپ ہماری تصدیق نہیں کریں گے، آپ ہماری بات نہیں مانیں گے۔ اگرچہ ہم سچے ہیں۔''

تو لفظِ ''ایمان'' محض تصدیق کے معنی میں آرہا ہے۔

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ [العصر:۳]

اب اس آیت کے اندر اللہ نے ایمان اور عمل صالح کو اکٹھا بیان کیا ہے۔ اگر تم نے ایمان کا لغت کے اعتبار سے معنی دیکھنا ہو تو وہ صرف تصدیق قلبی کا نام ہے، لیکن اگر ایمان کا شرعاً معنی مراد لیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ تصدیق بھی ہو، اقرار بھی ہو اور عمل بھی ہو۔ یہ تینوں چیزیں ہوں۔ علامہ ابن کثیر نے اہل سنت والجماعت کے قول کو ذکر کیا ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۰، البقرۃ: الآیۃ: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم مانتے تو ہیں کہ اللہ ہمارے رب اور حضور ﷺ ہمارے نبی، خاتم الانبیاء، امام الانبیاء اور رحمۃ للعالمین ہیں، لیکن یہ دیکھیں کہ عمل بھی گواہی دے رہا ہے یا نہیں؟ اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا عمل بھی اس کی گواہی دیتا ہو۔ ایک آدمی کہے کہ میں حضور ﷺ کو مانتا ہوں اور حضور ﷺ نے حکم دیا ہے کہ نماز پڑھو اور وہ نماز نہیں پڑھتا ہے تو کیا وہ حضور ﷺ کو مانتا ہے؟ اگر مانتا تو ان کے فرمان کی تعمیل کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ

میں حضور ﷺ کا پکا عاشق ہوں...... سبحان اللہ!...... جی ہماری زندگی ہی عشقِ نبی ﷺ کا نام ہے اور صورت وہ جو نبی ﷺ کے خلاف ہے، لباس نبی پاک ﷺ کے خلاف ہے۔ کہتا ہے کہ روضہ پر قربان جاؤں...... سبحان اللہ!...... حضور ﷺ کا روضہ دیکھتے ہوئے سینہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے، لیکن جب ہاتھ پھیرتے ہیں تو داڑھی پر کچھ نہیں لگتا۔ یہ عجیب سینہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے!! یہ تو نفاق ہے کہ بندہ دعویٰ محبت کا کرے اور عمل اس کے خلاف کرے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو تھوڑا سا ایک تولہ کا بوجھ جو نبی ﷺ کے لیے نہیں اُٹھا تا وہ دو من کا بوجھ اٹھا لے گا؟ ہم داڑھی پر اس لیے نہیں زور دیتے کہ داڑھی آپ رکھیں گے اور فائدہ ہمیں ہوگا، یا داڑھی آپ منڈائیں گے تو اس کی وجہ سے مجھے پکڑا جائے گا؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آدمی یہ ایک تولہ وزن حضور ﷺ کی محبت میں برداشت نہیں کر سکتا تو کون من کا وزن برداشت کرے گا؟ ایک آدمی اپنی شکل بھی حضور ﷺ کے مطابق بنانے کے لیے تیار نہیں ہے تو محبت کا دعویٰ کتنا بڑا جھوٹ ہے......؟!!!

آپ نے دیکھا نہیں ہے کہ لوگ لیلیٰ مجنوں کے قصے سناتے ہیں کہ ایک کتا آیا تو اس نے اس کے قدم چوم لیے تو لوگوں نے کہا کہ تم پاگل ہو گئے ہو؟ اس نے کہا: ''میں کتے کے قدم تھوڑا چوم رہا ہوں؟ یہ ان گلیوں سے آیا ہے جہاں لیلیٰ رہتی ہے۔ تو وہ کتے سے پیار کر رہا ہے اور تم محمد مدنی ﷺ کی داڑھی سے پیار نہیں کرتے اور ہو تم نبی ﷺ کے عاشق۔ یہ کونسا عشق ہے؟ یہ عشق کی کون سی قسم ہے؟ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں! اللہ ہمیں صحابہ والا عشق نصیب کرے، اللہ پاک ہمیں اہلِ بیت والا عشق نصیب کرے اور اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اولیاء اللہ والا عشق نصیب کرے۔ ہم صحیح معنوں میں غلام محمد بن جائیں، اللہ ہمیں حضور ﷺ کے قدم قدم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمادے۔ تب عشق ہوتا ہے کہ عشق کا اثر بھی تو ظاہر ہونا چاہیے۔

اکثر ائمہ: امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ ایمان اس چیز کا نام ہے کہ دل میں تصدیق ہو، زبان پر اقرار ہو اور بدن اس اقرار اور قول کی گواہی دینے والے ہوں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۰، البقرۃ: الآیۃ: اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ]

اس لیے علماء فرماتے ہیں کہ ایمان میں زیادتی بھی ہوتی ہے اور ایمان میں نقصان بھی ہوتا ہے۔ یہ صوری اختلاف ہے، اس میں جھگڑا کوئی نہیں ہے۔ بعض کہتے ہیں نفسِ ایمان میں زیادتی ہوتی ہے، بعض کہتے ہیں کہ ایمان کا جو پھل ہوتا ہے اس میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے۔ بات ایک ہے۔ بعض نے کہا: درخت تو ایک ہے، لیکن کسی کو

پھل ایک من لگ گیا، کسی کو ڈیڑھ من لگ گیا، کسی پر دو من لگ گیا اور کسی پر چار من لگ گیا۔ تو پھل زیادہ لگ گیا، درخت وہی ہے۔ بعض نے کہا: درخت مضبوط ہوگا تو پھل کو برداشت کرے گا۔ اگر درخت ہی کمزور ہو تو پھل کا متحمل کیسے ہو سکتا ہے؟ تو لہٰذا ان اختلافات میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اہل سنت والجماعت کا مذہب یہی ہے اور اسی پر اجماع ہے۔ اللہ نے فرمادیا:

﴿وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾ [الانفال:۲]

''اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور ترقی دیتی ہیں۔''

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ ایمان کا معنی ہے ڈرنا۔ اگر اللہ سے نہیں ڈرتا تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا ایمان بھی نہیں ہوگا۔ تو اللہ کا ڈر بھی ہونا چاہیے۔

﴿الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ﴾ [الانبیاء:۴۹]

''جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں۔''

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ ﴿٣٣﴾﴾ [ق:۳۳]

''جو پروردگار عالم رحمٰن سے بن دیکھے ڈر گیا اور وہ اپنا دل لے آیا جھکنے والا اطاعت کرنے والا وہ بندہ کامیاب ہوگا۔''

اصل عالم کون؟

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر آپ دیکھیں! تو دل کے اندر ڈر کا پیدا ہونا علم اور ایمان کا خلاصہ ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ [فاطر:۲۸]

اللہ سے کون ڈرتے ہیں؟ جو علم والے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۱، البقرۃ: الآیۃ: الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ]

اس لیے علماء نے فرمایا کہ عالم اس کو نہیں کہتے جس نے پی ایچ ڈی کر لیا ہو، عالم اس کو نہیں کہتے جس نے ڈبل ایم اے کر لیا ہو اور عالم اس کو نہیں کہتے جس نے بڑی سٹڈی کر کے پوری دنیا کی کتابیں پڑھ ڈالی ہوں، بلکہ عالم کا علم دیکھنا ہے تو اس کی خشیت کا اندازہ لگاؤ۔ جتنا اللہ سے ڈرنے والا ہے اتنا بڑا عالم ہے۔ اگر اللہ سے ڈرنے والا نہیں

تو اس کے علم کی کوئی حقیقت نہیں، کوئی فائدہ نہیں، بلکہ اس کی مثال ایسے ہو جائے گی ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ﴾ [الجمعۃ: ۵] اللہ نے فرمایا: جیسے اہلِ تورات کو ہم نے تورات کا علم دیا، لیکن ان کا نتیجہ ایسے نکلا جیسے گدھے پر کتابیں لاد دو۔ گدھے پر کتابیں لاد دو تو کیا گدھا پڑھ جائے گا؟ اس پر تو لکڑیوں کا بوجھ لاد دو یا کتابیں لاد دو تو برابر ہے اور گدھا تو گدھا رہے گا۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ جب کسی کو دیکھنا ہو کہ یہ عالم ہے تو اس کے عمل پر نظر ڈالو کہ وہ اللہ سے کتنا ڈرنے والا ہے؟

ہمارے ہاں عالم کہتے ہیں کہ جو زیادہ مطالعہ والا ہو، جو زیادہ پڑھا لکھا ہو، جس کے پاس بڑی بڑی ڈگریاں ہوں، نماز نہ پڑھتا ہو، روزہ نہ رکھتا ہو، سگار منہ میں رکھے، بخاری شریف کی حدیثیں بیان کرتا ہو، وہ بڑا عالم ہوتا ہے۔ تو شریعت میں اس کو عالم نہیں کہتے، بلکہ اس کو سب سے بڑا جاہل کہا جاتا ہے۔ عالم وہ ہوتا ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہو۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان!

اب دیکھیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کوئی بڑی بڑی ڈگریاں حاصل نہیں کیں، لیکن جس مرتبہ پر صحابہ رضی اللہ عنہم پہنچے، اس مرتبہ پر کوئی مومن پہنچ سکتا ہے؟ اس زمانہ میں کوئی یونیورسٹی نہیں، کوئی کالج نہیں، کوئی کورس نہیں، کوئی ڈگریاں نہیں۔ بعض صحابہ نے دو حدیثیں حضور ﷺ سے سنیں، ان کو سینے سے لگا لیا اور ان پر چل پڑے۔ بعض صحابہ نے صرف تین حدیثیں حضور ﷺ سے روایت کی ہیں اور بعض صحابہ کی ایک ایک حدیث ہے، لیکن صحابہ اس مرتبہ پر پہنچے کہ میرے اللہ نے عرش سے گواہی دی کہ میرا مدنی محمد مصطفیٰ ﷺ! میں صحابہ سے راضی ہو گیا ہوں، ان کے دلوں کو بھی میں نے دیکھ لیا ہے ﴿اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ﴾ [الحجرات: ۳] ان کے دلوں کو میں نے مانجھ دیا ہے اور ان کو اچھی طرح کسوٹی پر رکھ کر پرکھ لیا ہے اور یہ تیرے صحابہ خالص ایمان والے ہیں۔ اور کہیں فرمایا:

﴿اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ﴾ [الانفال: ۴]

اور کہیں فرمایا:

﴿اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ [المجادلۃ: ۲۲]

اور کہیں فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [البقرۃ:۵]

کہیں فرمایا:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [الفتح:۱۸]

اور کہیں فرمایا:

﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾ [المائدۃ:۱۱۹]

ان کے پاس تو کوئی ڈگری نہیں تھی، بلکہ بعض صحابہ تو غسل کے ترجے بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ تو معنی پوچھنے کے لیے امہات المومنین کی دروازے پر آجاتے تھے۔...... بلکہ میرے نبی پاک ﷺ نے اتنی بڑی مثال دی ہے! حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کھجور کے درخت پر چڑھ رہے تھے۔ ان کی پنڈلیاں بڑی بارک تھیں وہ نظر آرہی تھیں۔ ایک صحابی نے دیکھا تو ان کو ہنسی آگئی کہ دیکھو! کتنی باریک باریک پنڈلیاں ہیں!! ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے بچے کی پنڈلی ہو۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا کہہ رہے ہو عبداللہ بن مسعود کی پنڈلیوں کو دیکھ رہے ہو؟ فرمایا: ''مجھے اللہ کی قسم ہے کہ اگر قیامت والے دن میزان میں عبداللہ بن مسعود کی پنڈلیاں ہوں اور سارے زمین و آسمان دوسرے پلڑے میں ہوں تو ان کی پنڈلیوں کا وزن بھاری ہو جائے گا۔'' [دلائل النبوۃ: ۴/۳۹۹]

آپ اندازہ فرمائیں! میرے اس صحابی کی اتنی بڑی شان ہے!! اس سے اندازہ اور یقین فرمائیں کہ اصل عالم وہ ہوتا ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہو، عالم وہ نہیں ہوتا کہ جمعہ پڑھاتا ہو تو وگ لگالے، ایک گاؤن لگالیا اور جب باہر نکلے تو اس کو اتار دیا۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں فرمایا:

﴿الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا﴾ [الجمعۃ:۵]

یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے:

﴿يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِن بَعْدِ مَوَاضِعِهِ﴾ [المائدۃ:۴۱]

یہ وہی لوگ ہیں:

﴿وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ [البقرۃ:۱۷۴]

یہ وہی لوگ ہیں:

﴿لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ [التوبہ: ٣٤]

عالم وہ ہوتا ہے جس کے قدم قدم میں خشیت ہو جس کے قدم قدم میں اتباع ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فوت ہوئے، تاریخ میں موجود ہے کہ ان کے جنازہ کو دیکھ کر نوے ہزار (۹۰۰۰۰) کافروں نے کلمہ پڑھ لیا۔ اور آج ہمارا مولوی کافر بنا تو سکتا ہے، لیکن مسلمان نہیں بنا سکتا۔ میرے خیال میں مسلمان آج تک ایک بھی نہیں بنا، پتہ نہیں کوئی بن گیا ہو اور ہمیں نہ بتایا ہو تو علیحدہ بات ہے، وگرنہ ہمیں دیکھ کر جو کچھ اس کے اندر پہلا ایمان ہے وہ بھی بھاگ جائے گا۔ وہ کہے گا: جب مولویوں کا یہ حال ہے، اس کے گھر میں فلمیں چلتی ہیں، اس کی بیٹیاں پردہ نہیں کرتیں، ان کی لڑکیاں اسکرٹیں پہنتی ہیں، ان کی لڑکیاں کالجوں میں پھرتی ہیں، مخلوط ماحول میں تعلیم حاصل کرتی ہیں، مولویوں کے گھر میں نہ زکوۃ کا حساب اور نہ صدقات کا حساب ہے، یہ تو صرف ہمیں سنانے کے لیے مولوی بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ دوستوں کو کہتا ہوں کہ دیکھو! انگریز نے بھی کبھی آپ کو خط لکھا ہے کہ آپ اپنی لڑکی کو اسکرٹ پہناؤ۔ آپ میں سے کسی کو انگریز کا خط ملا ہو تو مجھے بھی بھیج دینا، میں فوٹو کاپی کرا کر شائع کر دوں گا۔ یا کسی نے اس کو لکھا ہے کہ تم بلاؤز پہناؤ یا تم اپنی لڑکی کے بال کٹواؤ۔ وہ اپنی لڑکی کو ننگا کر کے مارکیٹ میں لے آیا ہے، کسی نے نہیں کہا: ''اس نے پریکٹیکل اپنی لڑکی کو پیش کیا ہے۔'' تم نے دیکھ دیکھ کر اپنی لڑکیوں کو بھی اس رنگ میں رنگ دیا ہے۔ ہم نے لوگوں کو پردے کا کہا ہے، لیکن نمونہ بن کر پیش نہیں کیا۔ ہم اگر نمونہ بنا کر پیش کرتے ہیں کہ پردہ کوئی کھا نہیں جائے گا، پردے میں تعلیم بھی ہو سکتی ہے، علم بھی ہو سکتا ہے، پردے میں کالج میں بھی جا سکتی ہے، پردے میں آپ اپنے کاروبار زندگی بھی سرانجام دے سکتے ہیں۔ اسلام نے تو پردہ تیری عزت کے لیے رکھا ہے، تیری عصمت کے لیے رکھا ہے۔ اسلام نے پردہ تمہیں قید بنانے کے لیے تو نہیں رکھا، اسلام نے تو یہ رکھا ہے کہ آپ دیکھیں کہ جو انگوٹھی بازار میں ایک ریال کی ملتی ہے تو آپ کبھی فکر نہیں کریں گے، لیکن اگر یہ ڈائمنڈ کی ہو تو آپ اس کو تجوریوں میں رکھ کر اس کو تالے لگائیں گے۔ اسلام نے تو عورت کو ایک قیمتی جوہر قرار دیا ہے۔ اب اس کی جس طرح چاہو حفاظت کرو، لیکن ہم نے چونکہ یہ باتیں زبانی کلامی تو کی ہیں، لیکن شام کو جب ہم نے دیکھا کہ مولوی صاحب خود اپنی بیگم کو لے کر سیر کر رہے ہیں تو آپ نے کہا: اگر مولوی کی بیگم باہر نکل سکتی ہے تو میری بیگم کوئی مجرم ہے؟ وہ نکل سکتی ہے۔ اگر مولوی کے گھر میں وی سی آر پر فلمیں لگ سکتی ہیں تو ہمارے گھر میں بھی لگ سکتی ہیں۔

یہ فرق ہے کہ اصل عالم وہ ہوتا ہے جس کو اللہ کا ڈر ہو۔ جب اللہ کا ڈر ہوگا تو غلط کام کرے گا ہی نہیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے فرمایا:

﴿اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [فاطر:۲۸]

﴿مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبِۨ﴾ [ق:۳۳]

ایمان بالغیب کا ایک اور معنی:

بعض علماء کے نزدیک "یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" کا معنی ہے کہ جیسے ظاہر میں تصدیق کرتے ہیں اسی طرح غیب میں بھی تصدیق کریں۔ یہ نہیں کہ مؤمنوں کے سامنے تو تصدیق کریں، جب واپس جائیں تو مکر جائیں۔

نکات:

بلکہ "یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کَمَا یُؤْمِنُوْنَ بِالشَّهَادَةِ" جیسے لوگوں کے سامنے کہتے ہیں کہ ہم ایمان والے ہیں اسی طرح جب گھر میں بھی ہوں تو کہیں کہ ایمان والے ہیں، علیحدہ ہوں تو ایمان والے ہیں۔ یہ نہیں کہ لوگوں کے سامنے حاجی بن جائیں، عمرہ والے بن جائیں اور لوگوں کے سامنے متقی پرہیزگار بن جائیں اور جب علیحدہ ہوں تو...... اللہ معاف کریں!...... دنیا کا وہ فعل کریں جو کافر بھی نہیں کرتے ہیں۔

﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ﴾

[البقرۃ:۱۴]

اللہ نے فرمایا کہ جو منافق لوگ ہیں جب وہ مؤمنوں کے ساتھ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم کیوں فکر کرتے ہو؟ ہم تو مسلمان کے ساتھ ٹھٹھہ، مخول کر رہے ہیں۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم کوئی مسلمان نہیں ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۱، البقرۃ: الآیۃ: الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ]

ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ آج ہمارا حال یہی تو نہیں ہے۔ یعنی اگر ہمیں بھی کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اسلام کا دشمن ہو، جیسے وہ بات کرے ہم راضی ہوں۔ ہمیں اگر یہودی کی دوستی مل جائے ہم راضی ہیں، ہندو کی دوستی مل جائے ہم راضی ہیں، نصرانی کی مل جائے ہم راضی ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اسلام بڑا عدل والا ہے، اسلام کے اندر بڑی وسعت ہے اور اسلام میں بڑی رواداری ہے، آپ سے ہمارا کیا جھگڑا ہے؟ آپ سے ہمارا کیا اختلاف ہے؟

اسلام تو ایک عالمی مذہب ہے اور سب کو اپنی پناہ میں لینے والا ہے۔تم بھی ہمارے بھائی ہو،تم بھی ہمارے دوست ہو۔اور اسی طرح اگر کسی جگہ جائیں اور وہاں بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہوگا کہ ہم تو اہل بیت کے غلام ہیں،ہم تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ماننے والے ہیں،ہم تو اہل بیت کو اپنا مقتدا اور پیشوا مانتے ہیں۔اور دوسری جگہ جائیں،اگر وہاں اہل سنت والجماعت کا زور ہے تو کہتے ہیں کہ ہم پکے سنی ہیں۔اور جہاں توحید والے ہوں تو کہیں گے: ہم تو بڑے پکے موحد ہیں۔

خیر! یہ تو عام بات ہے،یعنی جدھر جائیں ان کے ساتھ راضی ہوجانا۔یہ منافق کا کام ہے کہ جو ملے اس کے ساتھ راضی ہوجائے۔آج کل کہتے ہیں کہ یہ آدم سوشل ہے،بڑے مزاج کا آدمی ہے۔دیکھو جی! اس کو جس محفل میں بٹھادو سب راضی ہیں۔ مانا ہے کہ ایمان کے لحاظ سے بالکل بے غیرت ہے۔ اگر سب راضی ہوتے تو میرے مدنی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ راضی ہوجاتے......؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سب راضی ہوگئے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام لے کر،دین لے کر اور قرآن لے کر مکہ میں آئے تو کیا خیال ہے مکہ والے سارے آپ کے ساتھ ہوگئے؟ تو جب میرے پاک نبی رحمتِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم پر سارا جہاں راضی نہیں ہوا تو تم پر کیسے راضی ہوگیا؟ مطلب یہ ہوا کہ وہ راضی نہیں ہوئے۔

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ﴾ [البقرة:١٢٠]

"یہود اور نصاریٰ تم سے کبھی راضی نہیں ہوں گے جب تک تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو۔"

اگر وہ تم سے راضی ہیں تو مطلب یہ ہے کہ تم ان کی کوئی اتباع کر رہے ہو۔اگر تم ان کی اتباع نہ کرتے تو قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ ہرگز تم سے راضی نہ ہوں گے۔اس لیے فرمایا: "يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ كَمَا يُؤْمِنُوْنَ بِالشَّهَادَةِ" ایسا نہ کرو کہ:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴾ [المنافقون:١]

اللہ نے فرمایا: میرے پاک نبی! جب آپ کے پاس ان منافقین کی جماعت آتی ہے اور آکر کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں،حالانکہ اللہ تو جانتا ہے کہ آپ میرے رسول ہیں،لیکن یہ جھوٹے ہیں اور جھوٹی گواہی دے رہے ہیں۔

اس لیے فرمایا: جب لوگوں سے چھپے ہوں تب بھی ایمان پر اور اگر نہ چھپے ہوں تب بھی ایمان پر اور اللہ سے ڈرنے

والے اپنے گھر کے اندر ہوں تب بھی اللہ سے ڈرنے والے۔ مؤمن کی شان یہ ہے کہ جو ظاہر میں ہے وہی اندر ہے اور جو اندر ہے وہ ظاہر میں ہے۔ ان کے اندر نفاق ہوتا ہی نہیں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۱، البقرۃ: الآیۃ: اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

غیب کیا ہے؟

غیب وہ ہوتا ہے جس کا علم ہمیں حواسِ خمسہ سے نہ ہو سکے۔ اللہ نے ہمیں حواسِ خمسہ دیے ہیں۔ بعض چیزیں ہم سن کر حاصل کرتے ہیں، بعض چیزیں ہم دیکھ کر حاصل کرتے ہیں، بعض چیزیں ہم چکھ کر حاصل کرتے اور ہیں، بعض چیزیں ہم سونگھ کر حاصل کرتے ہیں۔ مثال: پانی ٹھنڈا ہے یا گرم تو ہاتھ لگا کر دیکھتے ہیں، یعنی چھو کر دیکھتے ہیں۔ کعبہ کے غلاف کا رنگ سیاہ ہے یا سرخ، دیکھ کر ہم نے فیصلہ کر لیا۔ یہ خوشبو جو آ رہی ہے کون سی ہے؟ سونگھ کر معلوم کر لیا۔ غیب وہ ہے جہاں حواسِ خمسہ سارے زور لگائیں پتہ نہیں چلتا، نہیں معلوم ہو سکتا۔ وہ غیب ہے۔ ایسے غیب کا علم صرف خاصۂ خدا ہے، اللہ کے سوا کسی کو علمِ غیب نہیں ہوتا۔ اور جو چیزیں اللہ کے نبی ﷺ نے اللہ کے حکم سے ہمیں بتلائیں۔ ہم غیب پر ایمان لائے، ہم نے اللہ کو نہیں دیکھا، لیکن ہمارا ایمان ہے۔ ہم نے جنت کو نہیں دیکھا، لیکن ہمارا ایمان ہے۔ ہم نے ملائکہ کو نہیں دیکھا ہے، ہم نے جنات کو نہیں دیکھا ہے، ہم نے عذابِ قبر کو نہیں دیکھا ہے، لیکن چونکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے، اس لیے ہمارا ایمان ہے۔ یہ چیزیں ہم اپنے حواسِ خمسہ سے معلوم نہیں کر سکتے کہ جنت کہاں ہے؟ کیسے ہے؟ اور جہنم کہاں ہے؟ اسی طرح اللہ کے ملائکہ حق ہیں، لیکن ملائکہ کو کیسے دیکھیں؟ نہ ان کو آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں، نہ ان کو چھو سکتے ہیں اور نہ ہم ان کو معلوم کر سکتے ہیں، لیکن جب حضور ﷺ نے فرما دیا تو ہم نے مان لیا کہ ملائکہ برحق ہیں۔ تمام اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے ''اَلْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ'' جنت بھی حق ہے، نار بھی حق ہے، عذابِ قبر بھی حق ہے۔ اب عذابِ قبر ہمیں نظر نہیں آتا۔ اس قبر کو کھولو پھر بھی ہمیں نظر نہیں آتا۔ ایک کے ساتھ دوسری قبر ہے، بظاہر ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ نیک آدمی کی قبر کیسے کھلے گی؟ قبر کیسے وسیع ہو جائے گی؟ لیکن حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ جس پر راضی ہوتے ہیں اس کی قبر کو وسیع کر دیا جاتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جو حضور ﷺ فرما رہے ہیں وہ برحق ہے۔ وہ عالمِ برزخ ہے اور وہ عالمِ غیب ہے۔ عالمِ دنیا اور عالمِ برزخ الگ الگ ہیں اور آخرت الگ عالم ہے۔

یوں سمجھ لیں جیسا کہ آپ زمین پر ہیں تو یہاں کچھ حالات علیحدہ ہیں، ہوائی جہاز پر بیٹھیں اور جب دس ہزار کی

بلندی پر چلے جائیں تو احوال الگ ہیں، جب تیس ہزار فٹ کی بلندی پر چلے جائیں تو وہاں احوال الگ ہیں اور اگر ایک لاکھ فٹ کی بلندی پر مثلاً نکل جائیں، وہاں آکسیجن کے احوال اور ہر چیز کے احوال بدل جاتے ہیں۔ جو چیزیں ہمیں سمجھ نہیں آرہیں وہاں جا کر سمجھ آجاتی ہیں۔

اسی طرح دیکھیں کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے۔ اگر ہوائی جہاز پر سفر کریں اور مشرق کی طرف جارہے ہوں تو سورج بڑی جلدی نکلے گا اور اگر سفر مغرب کی طرف ہے اور غروب بھی مغرب کی طرف ہے تو دیر سے غروب ہوگا اور اگر آپ واپس آرہے ہیں تو سورج بڑی جلدی ڈوبے گا۔ سورج مغرب کی طرف جارہا ہے، آپ مشرق کی طرف جا رہے ہیں تو لازمی بات ہے رفتار میں فرق آجائے گا اور ٹائم میں بھی فرق آجائے گا، لہٰذا جو دنیا کے حالات ہیں وہ الگ ہیں، قبر کے حالات الگ ہیں۔

آپ دیکھیں کہ ماں کے پیٹ میں بچہ ہوتا ہے۔ پہلے ایک پانی کا بلبلہ ہے، پھر ایک بچہ بن گیا، ہاتھ پاؤں بن گئے، ٹانگیں بن گئیں اور سر بن گیا۔ جتنا بچہ بڑا ہوتا ہے اتنا اللہ رحم کو پھیلا دیتے ہیں۔ اب حالانکہ کوئی تصور کر سکتا ہے کہ اتنی چھوٹی سی چیز اتنی پھیل جائے؟ اور بچہ بڑے آرام سے اندر ہے۔ ایک دن بھی نہیں، نو مہینے تک پیٹ میں رہے۔ تو اللہ پاک بھی قبر کو پھیلا دیں گے اور ہمیں نظر نہ آئے تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ وہ دنیا ہی الگ ہے، وہ علم غیب ہے۔ اور ہمیں حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق ایمان لانا ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: غیب کے بارے میں علماء کے بڑے اقوال ہیں، لیکن تمام کے تمام اقوال متفق ہیں اور سب صحیح ہیں۔ اللہ پاک سے دعا کریں! اللہ پاک ہمیں صحیح ایمان نصیب فرمائے، اللہ ایمان پر قائم رکھے، اللہ ایمان پر موت عطا فرمائے، حضور ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے اور قیامت والے دن بھی ہمیں حضور ﷺ کا قرب نصیب فرمائے۔

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۳]

مسئلہ علم غیب:

مثال کے طور پر: میرے جیب میں کیا ہے؟ آپ کو پتہ نہیں ہے۔ اگر میں آپ کو بتا دوں پھر غیب نہیں رہا۔ تو اللہ نے جب اپنے انبیاء پر وحی بھیج دی، ان کے دلوں میں اللہ نے القا فرما دیا، یا اپنے کسی ولی کے دل میں ایک بات

ڈال دی اور انہوں بتلا دی تو وہ غیب نہیں ہے۔ غیب تب تھا جب تک غیب والے نے خبر نہیں دی تھی، اس لیے قرآن فرماتا ہے کہ انبیاء کو اخبار عن الغیب، انباء عن الغیب اور اطلاع علی الغیب ہوتی ہے۔ قرآن نے کسی جگہ نہیں کہا کہ انبیاء کو علم غیب ہے، لیکن اللہ غیب پر مطلع فرما دیتے ہیں، غیب کی اللہ خبر دے دیتے ہیں، غیب کی خبروں سے اللہ ان کو آگاہ کر دیتے ہیں۔ اگر غیب کا یہ معنی یاد رہے تو سارے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ اب ایک آدمی نے کسی مشین کے ذریعے سے معلومات کر لیں، یہ غیب نہیں ہے۔ کسی نے کمپیوٹر کے ذریعہ سے ہمیں معلومات فراہم کر دیں تو غیب نہیں ہے۔ کس نے رسد کے ذریعہ سے، دوربین کے ذریعہ سے ہوا کی رفتار کا اندازہ بتلا دیا تو یہ غیب نہیں ہے۔ کسی نے قاتلوں کے بارے میں خبر دی تو یہ غیب نہیں۔ کسی نے تمہیں شمس و قمر کے جریان کا حساب لگا کر ان کے گرہن کے بارے میں خبر دے دی تو یہ غیب نہیں ہے، کیونکہ یہ ہم حساب کر رہے ہیں۔ جو چیزیں ہمیں حساب سے معلوم ہو جائیں، عقل سے معلوم ہو جائیں اور کسی کے بتلانے سے معلوم ہو جائیں وہ غیب ہوتا ہی نہیں۔ غیب وہ ہوتا ہے جہاں یہ سارے اعضاء بے کار ہو جائیں۔ اب جتنی عقل دوڑائیں......؟ اللہ کو دیکھ سکتے ہیں؟ نہ اللہ کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ اللہ کو عقل کے ذریعہ سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ کی تو ہم صفات دیکھتے ہیں کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا، مخلوق کو پیدا فرمایا۔ یہ دلالت کر رہے ہیں کہ ان کا پیدا کرنے والا کوئی ہے، لیکن اللہ کی ذات کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اسی لیے فرعون بدبخت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا:

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [الشعراء: ۲۳]

تم یہ بتلاؤ کہ تمہارا رب کیا ہے؟ کس چیز سے بنا ہوا ہے؟ کس دھات سے بنا ہوا ہے؟ کیا چیز ہے؟...... سونا ہے؟ چاندی ہے؟ اب موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا﴾ [مریم: ۶۵]

فرمایا: اے جاہلو! رب کے بارے میں کیسے بتا سکتا ہوں؟ میرا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے۔

﴿قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ [الشعراء: ۲۶]

جو تمہارا بھی رب ہے، جو تمہارے باپ دادا کا بھی رب ہے، جو ان کو پیدا کرنے والا ہے۔ فرعون! تم تو اب رب بنے ہو، تمہارے پیدا ہونے سے پہلے رب کون تھا؟ تمہارے باپ کو کس نے پیدا کیا؟ تمہارے دادا کو کس نے پیدا

کیا؟ تو اللہ کی قدرتوں اور صفات کو دیکھ کر ہم ایمان لائے، لیکن اللہ کی ذات کو تو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہمارا اللہ موجود ہے اور عرش پر مستوی ہے، جیسے اس کی شان کو زیب دیتا ہے، لیکن ان کی ذات میں کوئی بحث کر ہی نہیں سکتا۔ یہ ایمان بالغیب ہے۔ ہم نے خدا کو بن دیکھے مان لیا، حواسِ خمسہ اور عقل تو وہاں پہنچ ہی نہیں سکتے۔

ایک ذریعہ تھا کہ اگر ہم دیکھ لیتے تو اپنے خدا کو پہچان لیتے تو وہ ذریعہ بھی ختم ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا:

﴿رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ﴾ [الاعراف: ۱۴۳]

اے میرے پروردگار! جیسے مجھ سے کلام فرمایا، مجھے اپنی زیارت بھی نصیب فرما دے۔

﴿قَالَ لَن تَرَانِي وَلَٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ﴾ [الاعراف: ۱۴۳]

اللہ نے فرمایا: تم ہرگز نہیں دیکھ سکتے ہو۔ چلو تمہاری خواہش ہے دیکھنے کی تو پہاڑ کی طرف نظر ڈالو اور اس کے بعد پھر سوچنا کہ تم مجھے دیکھ سکتے ہو یا نہیں دیکھ سکتے؟

﴿فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا﴾ [الاعراف: ۱۴۳]

اللہ نے اپنی تجلی پہاڑ پر ڈالی، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔ اب جناب ہوش آیا تو عرض کیا: ''سُبْحَانَكَ'' تیری ذات پاک ہے، واقعی! ہم نہیں دیکھ سکتے، ہماری طاقت نہیں ہے کہ ہم برداشت کر سکیں۔ کتنا بڑا پہاڑ!! ایک تجلی برداشت نہیں کر سکا، ایک عاجز انسان پروردگار کی تجلی کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ ﴿تُبْتُ إِلَيْكَ﴾ جو کچھ میں نے سوال کیا مجھے معاف فرما دیں۔ تو اللہ کو دیکھنے کی طاقت بھی نہیں ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کو چھو بھی نہیں سکتے تو عقل خدا تک کیسے پہنچ سکتی ہے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو اب ہم نے مانا کہ ہمارا ایک خدا ہے، اس کی ذات برحق ہے اور اس کی صفات برحق ہیں۔ وہ خالق ہے، رازق ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے، ستار ہے، جبار ہے، قہار ہے اور فعال لما یرید ہے۔ اس کا نام ایمان بالغیب ہے۔

اللہ کے فرشتوں پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ اب اللہ کے فرشتوں کو بھی ہم نہیں دیکھ سکتے، ان کو اصلی شکل میں تو ہم دیکھ نہیں سکتے، اگر وہ انسان کی شکل میں آئیں تو پھر ہم فرق نہیں کر سکتے۔ ہمیں کیا پتہ کہ انسان ہے یا فرشتہ ہے؟ جیسے حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما نے آ کر اِدھر اُدھر سے پکڑ لیا اور ان کو کہا کہ جاؤ ہمارے لیے کھجوریں لے آؤ۔ انہوں نے سمجھا حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے۔ حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ ان کو کھلانے کے لیے کھجوریں لاتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ٹھہرو ٹھہرو! یہ تو جبرئیل علیہ السلام

ہے، دحیہ کلبی تونہیں ہے۔ تو اب اگر انسان کی شکل میں ہوں تو ہم جان نہیں سکتے۔ اگر وہ اپنی شکل میں آئیں تو ہم دیکھ نہیں سکتے، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ ملائکہ موجود ہیں، ملائکہ کراما کاتبین ہیں، قرآن کی مجالس پر سایہ کر کے کھڑے ہیں، ملائکۃ اللیل ہیں، ملائکۃ النہار ہیں، ملائکۃ الرحمۃ ہیں، ملائکہ العذاب ہیں، حملۃ العرش اور حملۃ الکرسی ہیں۔ ہمارا ایمان ہے۔ تو یہ ایمان بالغیب ہے۔ ہم نہ ملائکہ کو سمجھ سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ انہیں چھو سکتے ہیں اور نہ انہیں ہم مل سکتے ہیں۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے آمنہ کے لال! ہم یوں تلوار کا اشارہ کرتے ہیں، ابھی ہماری تلوار کافر تک نہیں پہنچتی، لیکن اس کی گردن پہلے کٹ جاتی ہے، یہ کیا بات ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جب تلوار چلا رہے ہوتے ہو تو ملائکہ بھی تلوار چلا رہے ہوتے ہیں، ان کی تلوار تم سے پہلے کام کر جاتی ہے۔ تو اب صحابہ کو ملائکہ نظر نہیں آ رہے، سمجھ نہیں آ رہے، سامنے دشمنوں کی گردنیں کٹ رہی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تو ملائکہ پر ایمان ہے۔ ایمان بالغیب ہے۔ اللہ کی کتابوں پر ایمان، اللہ کے رسولوں پر ایمان ہے کہ کتابوں کا اترنا بھی ہم نے نہیں دیکھا اور وحی کا آنا بھی ہم نے نہیں دیکھا۔ تو یہ بھی ایمان بالغیب ہے۔

اور اسی طرح وملائکتہ و کتبہ و رسلہ، اسی طرح موت کے بارے میں والبعث بعد الموت کہ مرنے کے بعد ہم نے اٹھنا ہے اور یہ ہم نے نہیں دیکھا ''وَجَنَّتُهٗ وَ نَارُهٗ وَ لِقَائُهٗ'' اللہ کی جنت کو بھی ہم نے نہیں دیکھا، جہنم کو بھی ہم نے نہیں دیکھا اور قیامت والے دن اللہ کے ساتھ لقا ہوگا وہ بھی ہم نے نہیں دیکھا۔ تو یہ ایمان بالغیب ہے کہ وہ چیزیں ہیں جو حواس خمسہ سے معلوم نہ ہو سکیں ان پر ایمان لے آنا، یہ ایمان بالغیب ہے۔

اور اس کا بہت بڑا مقام اور بہت بڑا مرتبہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نصیب فرما دے۔ یہ کوئی عام چیز تو نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت حق ہے۔ اب کافر اپنی عقل دوڑاتے پھر رہے ہیں کہ جنت کہاں ہے اور کدھر ہے؟ اور جہنم کدھر ہے؟ ہم نے کہا کہ تمہیں ملے یا نہ ملے، تمہاری عقل ناقص ہو سکتی ہے، تمہاری معلومات ناقص ہو سکتی ہیں، ہمارے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان غلط نہیں ہو سکتا۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ میں جنت کے اندر گیا ہوں تو بات ختم ہو گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جنت کی سیر کی ہے، بات ختم ہو گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے جہنم دکھائی گئی اور اس میں میں نے دیکھا کہ بعض لوگوں کو جہنم کی لگامیں چڑھا چڑھا کر لے جایا جا رہا ہے تو میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: ''یہ وہ مولوی ہیں جو حق کا کلمہ نہیں کہتے تھے، لوگوں کو گمراہ

کرتے تھے۔" حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ انگارے کھا رہے ہیں۔ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: "یہ یتیموں کا مال کھانے والے ہیں۔" حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جہنم دیکھی ہے، لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ جہنم حق ہے اور جنت حق ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے جبرئیل علیہ السلام کو اس کی اصل شکل میں دیکھا ہے۔ لہٰذا ہمارا ایمان ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: مجھے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بیت المقدس میں ملے ہیں، پھر آسمانوں پر بھی ملے ہیں، ہمارا ایمان ہے۔ اب یہ باتیں ہم عقل سے یا حواسِ خمسہ سے تو معلوم نہیں کر سکتے تو اس کا نام ایمان بالغیب ہے۔ اس لیے فرمایا کہ متقین لوگ وہ لوگ ہیں ﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ جو ایمان لاتے ہیں بن دیکھے ان چیزوں پر جہاں ان کے حواسِ خمسہ کی رسائی نہیں ہوتی۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت مرۃ الہمدانی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غیب وہ چیزیں ہیں جو غائب ہیں، بندے ان کو نہیں دیکھ سکتے، ان پر ایمان لانے کا نام غیب ہے۔ کوئی جنت کا مسئلہ ہے، یا جہنم کا مسئلہ ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۱، البقرۃ: الآیۃ: اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

اس لیے یاد رکھیں کہ غیب خاصۂ خدا ہے، اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں۔ یہ عقیدہ رکھیں۔ اور بعض ہمارے لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں، یا خدا بہتر جانے کہ خود مسئلہ نہیں سمجھتے۔ اللہ پاک رحمت فرمائیں! وہ کہتے ہیں کہ عالم الغیب ہونا خدا کی شان ہی نہیں ہو سکتی، عالم الغیب تو ہوتا ہی نہیں ہے، اس لیے انہوں نے قرآن کا ترجمہ لکھا اور جہاں لفظِ "نبی" آیا "يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ" [الاحزاب: ۱] تو ترجمہ کیا کہ "اے غیب کی خبر دینے والے!" کہا کہ نبی کا معنی ہی یہی ہوتا ہے کہ جو غیب کی خبر دیتا ہو۔ تو انہوں نے کہا کہ اللہ کے آگے تو ہر چیز موجود ہے، اللہ کے آگے جب کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں تو غیب کیسے ہوئی؟ غیب تو وہ ہوتا ہے کہ جو ہمارے آگے چھپی ہوئی ہو، ہم دیکھ نہیں سکتے، تو یہ صفت نبی کی ہو سکتی ہے، ولی کی ہو سکتی ہے۔ اللہ کے آگے تو کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔

حالانکہ "غیب" کا ترجمہ یہ نہیں کہ اللہ کے آگے نہیں، بلکہ "غیب" اس کو کہتے ہیں کہ جو چیزیں مخلوق سے چھپی ہوئی ہیں وہ غائب ہیں "مَا غَابَ عَنِ الْعِبَادِ" کہ اللہ کے آگے تو کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بھی فرمایا:

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴾ [الانعام: ۷۳]

اللہ کی صفت کیا ہے؟ کہ غیب کے علم والے، چھپی ہوئی اور ظاہر چیزوں کے جاننے والے۔ یعنی چھپی ہوئی جو تم سے چھپی ہوئی ہیں ان کے جاننے والے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے آگے چھپی ہوئی ہوں تو وہ غیب والے بنیں گے۔ جو چیزیں مخلوق سے چھپی ہوئی ہیں ان کو بھی جاننے والا ہے، ہمارے اس دل کے اندر کوئی چیز ہے ہم سے بھی چھپی ہوئی، لیکن اس کو جاننے والا اللہ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جو چیزیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ پاک سے لے آئے ہم نے نہیں دیکھا، لیکن ہمارا ایمان ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ غیب کا معنی قرآن ہے، کیونکہ جب قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تو ہم نے نہیں دیکھا، لیکن ہمارا ایمان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ جو شخص بھی اللہ پر ایمان لایا تو وہ غیب پر ایمان لایا، کیونکہ اللہ کو تو ہم نے دیکھا نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۱، البقرۃ: الآیۃ: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

اس امت کی فضیلت:

(حدیث) حضرت عبدالرحمن بن یزید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا ذکر آگیا کہ صحابہ کی کیا شان ہے؟ صحابہ کی کیا عظمت ہے؟ اور صحابہ کن کاموں میں ہم سے سبقت لے گئے؟ تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جہاں تک ہمارے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا تعلق ہے جن لوگوں نے دیکھا ہے تو دیکھا ہے، آپ کا وجود بھی دلالت ہے کہ آپ سچے ہیں، لیکن اصل بات تو ان کی ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، ان چیزوں پر جن کو انہوں نے دیکھا نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا بڑی بات ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ دیکھیں گے تو دلیل ہے کہ آپ سچے نبی ہیں۔ اس لیے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اصل بات تو ان لوگوں کی ہے جو بن دیکھے ایمان لائے۔ فرمایا:

﴿الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۱، البقرۃ: الآیۃ: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

اس کا یہ مطلب نہ ہوا کہ بعد والے لوگ افضل ہیں، بلکہ انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم ہیں، عشرہ مبشرہ ہیں رضی اللہ عنہم، پھر جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ ساری دنیا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی، یہ صحابہ کی شان ہے، تاکہ دوسروں میں بھی ایمان کا جذبہ پیدا ہو کہ تم ٹھیک کہتے ہو صحابہ کی بڑی شان ہے، لیکن ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کو دیکھا نہیں ہے، کمال تو تمہارا ہے کہ تم بن دیکھے ایمان لے آئے۔ وہ ایک دوسرے کی تفخیم کر رہے تھے، وگرنہ جو حضور ﷺ کو ایک نظر دیکھے، دنیا کا کوئی بندہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس آدمی نے ایک منٹ کے لیے بھی میرے نبی ﷺ کو ایمان کے ساتھ دیکھا ہے تو وہ اس مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے کہ ساری دنیا کے اولیاء اللہ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم کا مقام اولیٰ واعلیٰ ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تو غیب پر ایمان لائے، انہوں نے بھی تو وحی اترتے نہیں دیکھی، ان کو بھی تو کیفیتِ رسالت کا علم نہیں تھا، ان کو بھی تو اللہ تعالیٰ کی رؤیت نہیں ہوئی، ان کو بھی تو ملائکہ کی رؤیت نہیں ہوئی، ان کو بھی تو جنت اور نار کی رؤیت نہیں ہوئی، ان کا بھی تو ایمان بالغیب ہے تو اس لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ کہتے ہیں کہ ہم نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ جو آپ نے حدیث حضور ﷺ سے سنی ہو ہم کو سناؤ۔ انہوں نے کہا: بہت اچھا! میں تمہیں بہت اعلیٰ حدیث سناتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ ہم حضور ﷺ کی خدمت میں تھے، سفر میں تھے یا غزوہ میں اور ہم نے رسول پاک ﷺ سے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! آپ یہ بتائیں کہ صحابہ سے بھی کوئی افضل ہے؟ ہم لوگ آپ پر ایمان لائے، آپ کے ساتھ مل کر کفار سے جہاد کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! ایسے لوگ بھی آئیں گے جن کی ایسی شان ہوگی، جنہوں نے مجھے دیکھا بھی نہیں ہوگا اور مجھ پر ایمان لے آئیں گے۔ حضور ﷺ نے بعد میں آنے والوں کی فضیلت بیان کی ہے۔

حضرت صالح بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو جمعہ الانصاری رضی اللہ عنہ بیت المقدس میں تشریف لے آئے وہاں نماز پڑھنے کے لیے...... کیونکہ مسجدِ حرام اور مسجد نبوی ایسی مسجدیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی فضیلت عطا فرمائی ہے۔ یعنی اگر کوئی مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھے تو پانچ سو نمازوں کے برابر ثواب ہے اور مدینہ پاک کی مسجد نبوی میں نماز پڑھے تو ایک نماز ہزار نمازوں کے برابر ہے اور اگر کوئی مسجد حرام میں نماز پڑھے تو ایک نماز ایک لاکھ کے برابر ہے۔...... تو فرماتے ہیں کہ وہ صحابی تشریف لے آئے کہ بیت المقدس کی مسجد میں نماز ادا کریں اور جب انہوں نے نماز ادا کی تو اس دن ہمارے ساتھ رجاء بن حیوۃ رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ جب ابو جمعہ نماز پڑھ کر جانے لگے ہم ان کے ساتھ نکلے، تاکہ ان کی پیروی کریں اور ان کو عزت کے ساتھ رخصت کریں۔...... تو یہاں سے علماء نے مسئلہ نکالا کہ اگر کوئی عالم آئے، کوئی شان والا آئے اور اللہ کا صالح بندہ آئے تو اس کی تکریم کرنا، اس کو پہنچانا، ساتھ جا کر سواری پر بٹھانا، یہ بھی سنتِ محمد رسول اللہ ﷺ ہے۔...... جب ہم ان کو چھوڑنے کے لیے روانہ ہوئے

تو انہوں نے کہا کہ ٹھہرو کہ تم لوگوں نے میرا استقبال کیا، پھر مجھے چھوڑنے کے لیے چلے ہو تو تمہارے لیے انعام ضروری ہے، لیکن میرے پاس کیا انعام ہے......

''أُحَدِّثُكُمْ بِحَدِيْثٍ سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ''

میں تمہیں انعام دیتا ہوں، میں تمہارا حق ادا کرتا ہوں، میں تمہیں محمد مصطفیٰ ﷺ کی حدیث سناتا ہوں۔

''قُلْنَا: هَاتِ رَحِمَكَ اللّٰهُ!''

ہم نے کہا کہ ہم کو جلدی سناؤ! اللہ پاک تم پر رحم کرے۔

یہ تو بڑا انعام ہے کہ ہمیں حضور ﷺ کی کوئی بات پہنچ جائے۔ اصل میں ایمان والوں کے لیے ہدیہ ہی قرآن اور حدیث ہے جو ایمان والا اور مسلمان ہے۔ اور جس کے دل میں ایمان نہ ہو، اسلام نہ ہو وہ تو کہے گا کہ کوئی گانا اچھا لے آؤ، کوئی کیسٹ اچھی لے آؤ، فلم اچھی لے آؤ۔ تو یہ اپنا اپنا تعلق ہے۔ جن کا تعلق جن سے جڑا ہے۔ اگر رحمٰن سے جڑا ہے تو رحمٰن کے بندوں کی باتیں اچھی لگیں گی اور اگر شیطان سے جڑا ہے تو شیطان کے بندوں کی باتیں پیاری لگیں گی، تعلق کی بات ہے، جس سے تیرا تعلق بن گیا۔ رحمٰن سے تعلق ہے تو رحمٰن کے بندے، یعنی اللہ کے انبیاء علیہم السلام اور رسول اللہ ﷺ کے اولیاء، علمائے حق کی باتیں تمہیں پسند آئیں گی، تمہیں پیاری بھی لگیں گی اور تم بار بار بھی سنو گے۔ اور اگر تعلق شیطان سے جڑ گیا ہے تو لازمی بات ہے کہ کبھی گانے سنو گے، کبھی فحش فلمیں دیکھو گے، کبھی کیسٹ سنو گے اور کبھی رقص دیکھو گے۔ یہ تعلق کی بات ہے۔

جس طرح سائکالوجسٹ یعنی ماہرِ نفسیات ہوتے ہیں، جو نفسیاتی علاج کرتے ہیں اسی طرح علما بھی لوگوں کی دینی نفسیات کو پہنچاتے ہیں۔ جیسا کہ ایک ڈاکٹر تھے، میں نے ان سے کہا کہ ایک لڑکا ایسے ایسے ہے تو اس کے بارے میں بتائیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر گھر میں کیسٹ ہے تو وہ کیسا ہے؟ اس نے کتابیں کون سی پڑھیں ہیں؟ اس سے ہم اندازہ لگالیں گے کہ اس کا ذہن کدھر جارہا ہے؟ ہمیں اندازہ ہوجائے گا کہ وہ ذہنی طور پر کس عشق میں مبتلا ہے، کس بیماری میں مبتلا ہے، کس عذاب میں پڑا ہے؟ کیونکہ اس کے دماغ کا جن چیزوں سے تعلق ہے وہ ظاہر ہوگا۔ اس لیے اصولی بات ہے کہ اگر آپ گھر میں بیٹھے ہیں اور قرآن کی آواز آرہی ہے، کار میں بیٹھے ہیں اور قرآن شریف لگا ہوا ہے، کیسٹ دیکھی تو قاری عبدالباسط کی ہے، یہ فلاں عالم اور فلاں عالم کی ہے تو آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ اس کا تعلق اللہ والوں کے ساتھ ہے۔ اور اگر آپ وہاں جائیں اور وہاں قوالیاں ہوں، فلمیں ہوں اور گانے

ہوں تو اندازہ لگا لیں گے کہ اس کا تعلق کن کے ساتھ ہے۔ یہ تو فوری فیصلہ ہے ایک منٹ میں ہو سکتا ہے اس سے آپ اپنے بچوں کا اور اپنے دوستوں کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کا رجحان کدھر جا رہا ہے اللہ کی طرف ہے یا شیطان کی طرف ہے۔

اس لیے انہوں نے کہا کہ جلدی ہمیں حدیث سناؤ تو انہوں نے فرمایا کہ ہم بھی حضور ﷺ کے ساتھ تھے اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے:

((قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللهِ! هَلْ مِنْ قَوْمٍ أَعْظَمُ مِنَّا أَجْرًا؟))

''ہمارے علاوہ بھی کوئی قوم ہوگی جس کو زیادہ ثواب ملے گا؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری کیا بات ہے! تم نے تو میری زیارت کر لی، میں تمہارے پاس وحی لاتا ہوں۔ اصل مرتبہ تو ان لوگوں کا ہوگا جن کو یہ قرآن پہنچے گا، نہ انہوں نے مجھے دیکھا، نہ قرآن کو دیکھا، پھر ایمان لائیں گے، اس کے بعد اس پر عمل بھی کریں گے۔ تو ان کو اللہ تعالیٰ دہرا اجر عطا فرمائیں گے۔

[مجمع الزوائد، حديث: ١٦٦٩٢، باب: ما جاء فيمن آمن بالنبي صلى الله عليه وسلم ولم يره]

علمائے حدیث کا اس بارے میں اختلاف ہے، میں نے شرح بخاری کے اندر اس حدیث پر مفصل بحث کر دی ہے۔ یعنی یہ لوگ باعتبار ایک وجہ کے افضل ہوں گے، من حیث المجموع افضل نہیں ہوں گے، من حیث المجموع صحابہ افضل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی کی کوئی ایک چیز زیادہ ہوتی ہے، مثلاً: حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ نے حسن کی صفت عطا فرمائی، حضرت ایوب علیہ السلام کو اللہ نے صبر کی صفت عطا فرمائی، موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے اپنے ساتھ کلام کی صفت عطا فرمائی، لیکن جب جمیع صفات کو اکٹھا کریں گے تو سب سے افضل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد اگر تابعین آئیں، ان کے اندر بھی بعض بڑی بڑی صفتیں ہوں گی، سب سے بڑی صفت ہے کہ بن دیکھے محمد عربی ﷺ پر ایمان لائے، بن دیکھے اللہ کی وحی پر ایمان لائے، لیکن جب ساری صفات کو ہم جمع کریں گے تو افضل اصحاب رسول رضی اللہ عنہم بنیں گے، کیونکہ وہ بھی ملائکہ پر بن دیکھے ایمان لائے، جہنم پر بن دیکھے ایمان لائے، جنت پر بن دیکھے ایمان لائے تو وہ ایمان بالغیب میں بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے، پھر حضور ﷺ کی صحبت بھی مل گئی، لہٰذا اس وجہ سے تو ہمیں ثواب زیادہ ملا، لیکن مجموعی وجہ سے سب سے اعلیٰ درجہ اصحاب رسول رضی اللہ عنہم کا بنے گا۔

روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سوال کیا: تم یہ بتاؤ! ''أَيُّ الْخَلْقِ أَعْجَبُ إِلَيْكُمْ إِيمَانًا؟'' ساری مخلوق میں تمہیں ایمان کن کا پسند ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوچ کر کہا کہ فرشتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ملائکہ کی کون سی بڑی بات ہے!؟ اللہ کے قریب رہتے ہیں۔ وہ ایمان لے کر نہیں آئیں گے تو کون لائے گا؟ یہ تو کوئی بڑی بہادری نہیں ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ''اَلنَّبِیُّوْنَ'' کہ حضور! سب سے زیادہ ایمان کا مرتبہ تو نبیوں کا ہوسکتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نبی کیوں ایمان نہ لاتے؟ ان پر تو براہِ راست اللہ کی وحی آرہی ہے۔ ان کا ایمان لانا تو آسان ہے کہ ڈائرکٹ اللہ کے ساتھ تعلق ہے۔ ہم نے کہا: ''حضور! ہم آپ پر ایمان لے آئے اور آپ کی اتباع کی۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! تم بھی کیوں ایمان نہ لاتے؟ تم نے محمد رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے۔ تم نے جب حضور ﷺ کو دیکھ لیا تو بات ختم ہوگئی۔ حضور ﷺ کو دیکھنا کوئی چھوٹی سی بات ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا: حضور! آپ بتائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہوں گے جو تمہارے بعد آئیں گے۔ ان کو تو صرف قرآن پہنچے گا، کتابیں پہنچیں گی، انہوں نے مجھے بھی نہیں دیکھا، کوئی چیز بھی نہیں دیکھی، لیکن پھر بھی وہ ایمان لائیں گے اور عمل کریں گے۔ وہ سب سے زیادہ اللہ کو پسند ہیں۔''

[دلائل النبوۃ: ۶/۳۲۸، تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۲، البقرۃ: الآیۃ: الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ]

یہ ٹھیک ہے، سب جزوی فضیلت ہوتی ہے، کلی نہیں۔ جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں حیا کی صفت زیادہ تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ میں قضا کی صفت زیادہ تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اندر شجاعت کی اور عدالت کی اور کفر سے لڑائی کی صفت زیادہ تھی اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ میں صدق کی صفت زیادہ تھی، لیکن جب ساری صفات کو جمع کریں گے تو سب سے افضل میرے مدنی محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ حضور ﷺ کے بعد سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ پھر عشرہ مبشرہ، اصحابِ بدر، اصحابِ حدیبیہ، پھر سارے صحابہ رضی اللہ عنہم، پھر تابعین پھر تبع تابعین رحمہم اللہ اور ان کے بعد درجہ بدرجہ مجموعی صفات کا ذکر ہے۔

اس حدیث کے اندر ایک راوی مغیرہ بن قیس البصری ٹھیک نہیں کہ اس کا اعتبار نہیں ہے، کیونکہ وہ منکر الحدیث ہے، لیکن اس حدیث کو ابویعلیٰ نے بھی ذکر کیا ہے، ابن مردویہ نے بھی اپنی تفسیر میں اس کو ذکر کیا ہے۔ اس کے اندر ضعف تو پایا جاتا ہے، لیکن جب بہت سارے طرق جمع ہوجائیں تو ضعیف بات مضبوط ہوجاتی ہے۔ اور ایک روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہے جو حضور ﷺ کے خادم ہیں۔ ان سے اس کے ہم معنی مرفوعاً روایت کی

گئی ہے۔

ایک حدیث میں جعفر بن محمود اپنی دادی (بدیلہ بنت اسلم) سے روایت کی ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز میں نے بنی حارث میں پڑھی اور ہم بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہے تھے...... کیونکہ مسلمان پہلے مسجد اقصیٰ کی طرف نماز پڑھتے تھے...... چنانچہ ہم دو رکعتیں پڑھ چکے تھے۔ ایک آدمی آیا، اس نے اسی حالت میں خبر دی کہ حضور پاک ﷺ نے مسجد اقصیٰ سے مسجد حرام کی طرف منہ موڑ لیا ہے تو اسی نماز میں ہم مڑ گئے۔ تو مردوں کی جگہ عورتیں آگئیں اور عورتوں کی جگہ مرد آگئے، کیونکہ مرد پہلے آگے تھے اور عورتیں پیچھے تھیں۔ جب کعبہ بدل گیا تو ہماری جگہ پر مرد آگئے اور ہم مردوں کی جگہ پر آگئیں پھر عورتیں پیچھے ہوگئیں۔...... یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ آگے ہو گئیں، یہ خیال رکھنا! کیونکہ عورت فرض نماز میں آگے ہو تو بعض ائمہ کے نزدیک نماز بالکل فاسد ہو جاتی ہے، گو بعض ائمہ کہتے ہیں کہ نماز ہو جاتی ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ ایسا کرو، وہ بھی کہتے ہیں کہ اگر عورتیں آگے آگئیں تو نماز ہو جائے گی۔ یہ علیحدہ بات ہے، وگرنہ حکم ہے کہ پہلے مردوں کی صفیں بنائیں۔ جب مردوں کی صفیں پوری ہو جائیں تو بچوں کی صفیں بنائیں۔ جب ان کی صفیں پوری ہو جائیں تو پھر عورتوں کی صفیں بنائیں۔ تو بی بی صاحبہ کہتی ہیں کہ جب ہم نے کعبۃ اللہ کی خبر سنی تو کعبہ کی طرف مڑ گئے۔ حضور ﷺ کو ہماری خبر پہنچی، حضور ﷺ نے فرمایا:

((أُولٰئِكَ قَوْمٌ اٰمَنُوْا بِالْغَيْبِ))

یہی لوگ ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

انہوں نے دیکھا بھی نہیں، ان کو پتہ بھی نہیں۔ ان کو حکم پہنچا تو فوراً تبدیل ہوئے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۲، البقرۃ: الآیۃ: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ]

ایمان بالغیب کا معنیٰ ہی یہی ہے کہ بن دیکھے اپنے نبی پر اعتماد کرتے ہوئے بات کو مان لینا۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ واقعی حضور ﷺ نے یہ خبر دی ہے؟ یہ تحقیق ہمارے ذمہ ہوگی۔ جب یہ پتہ چل جائے کہ یہ فرمانِ نبی ﷺ ہے تو بس ہمارا کام یہ ہے کہ ہم گردن جھکائیں۔ کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ کا فرمان آگیا، بس بات ہی ختم ہوگئی۔ اور اسی طرح جتنے ائمہ کرام ہیں، یاد رکھو! وہ سب بھی محمد مصطفیٰ ﷺ کے غلام ہیں، اللہ کے نبی ﷺ کے تابع ہیں، اللہ کے نبی ﷺ کے فرمانبردار ہیں اور اللہ کے نبی ﷺ کے احکام کو کھول کر بیان کرنے والے ہیں۔ دعا کریں اللہ ہمیں صحیح معنوں میں ایمان بالغیب نصیب فرمائے، حضور ﷺ کی محبت نصیب فرمائے، صحابہ اور اہل بیت کی محبت

نصیب فرمائے، اولیاء اللہ کی محبت نصیب فرمائے اور اپنے صالح بندوں سے ہمارا تعلق بنائے، اسی پر ہمیں موت آئے اور جنت میں ہمیں اکٹھا فرمائے۔

نماز کے اوقات کے لیے امامتِ جبرئیل علیہ السلام:

﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ﴾

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي)) [صحیح البخاری، حدیث:۶۳۱، باب: الأذانِ لِلْمُسَافِرِ، إِذَا كَانُوا جَمَاعَةً]

اللہ کے پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نمازیں ایسے ادا کرو جیسے میں ادا کرتا ہوں، میں پڑھتا ہوں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں بھی بتلایا، فرمایا:

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتٰبًا مَّوْقُوتًا﴾ [النساء:۱۰۳]

اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر نماز فرض کر دی ہے اور ان کے اوقات کی تعیین کر دی ہے۔

اب ان اوقات کا قرآن نے کہیں خود بھی ذکر کیا ہے:

﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۖ إِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ﴾ [الاسراء:۷۸،۷۹]

اللہ تعالیٰ نے کہیں نماز کے اوقات کی تفصیل بھی بیان فرما دی۔ اب دیکھیں کہ نبی علیہ السلام بھی عربی، قرآن بھی عربی، نماز اتنی اہم چیز ہے کہ اللہ نے جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا، جبرئیل علیہ السلام نے آکر امامت کرائی۔ حالانکہ اندازہ فرمائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو امام الانبیاء ہیں، لیکن چونکہ نماز کی تعلیم دینی مقصود تھی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اللہ نے بھیجا، جا کر نماز کے اوقات اور نماز کا طریقہ صرف زبانی نہ سمجھاؤ، بلکہ تم امام بنو اور میرا مدنی مقتدی بنے۔ یعنی نماز کتنی اہم چیز ہے! تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دس نمازیں پڑھائیں: پانچ نمازیں اول وقت میں اور پانچ نمازیں آخری وقت میں، کیونکہ ہر نماز کا ایک وقتِ اوّل ہے اور ایک آخرِ وقت ہے۔ جیسے صبح کی نماز ہے تو طلوعِ فجر سے، صبح صادق سے وقت شروع ہو گیا اور سورج کے نکلنے کے وقت ختم ہو گا۔ اگر سورج نے نکلنا شروع کر دیا تو وقت ختم ہو گیا۔ اسی طریقہ سے ظہر کا وقت ہے، عصر کا وقت ہے، مغرب کا وقت ہے اور عشا کا وقت ہے۔ پانچ

نمازیں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اوّل وقت میں پڑھائیں اور پانچ نمازیں آخر وقت میں۔ پھر حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کر دیا کہ حضور! ان دو وقتوں کے درمیان میں نماز کا وقت ہے، اپنی امت کو سمجھائیں۔

ادنیٰ اعلیٰ کو نماز پڑھا سکتا ہے:

اور اسی سے ائمہ اور محدثین نے مسئلہ نکالا کہ اگر کوئی آدمی شان میں کم ہو تو وہ شان والے کا امام بھی بن سکتا ہے، حالانکہ شان میں زیادہ حضور ﷺ ہیں، جبرئیل علیہ السلام تو آپ کے خادم ہیں، جبرئیل علیہ السلام تو آپ کے دروازے پر حاضر ہونے والے ہیں، جبرئیل علیہ السلام تو بغیر اذن کے گھر میں داخل بھی نہیں ہو سکتے، لیکن امام بن سکتے ہیں تو معلوم ہوا کہ مفضول بھی کبھی فاضل کا امام بن سکتا ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ کے امام حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی بنے ہیں، اسی طرح سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی امام بنے ہیں، لہٰذا اس میں بھی امت کے لیے تعلیم ہوتی ہے۔ کبھی امام باعتبار علم اور مرتبہ کے کم ہوتا ہے، لیکن اقتداء کرنے والوں میں اس سے بڑے بڑے عالم ہوتے ہیں، نماز ٹھیک ہو جاتی ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھی۔ اور اسی سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ نماز کی کتنی بڑی اہمیت ہے کہ جبرئیل علیہ السلام خود نماز پڑھانے کے لیے آئے ہیں اور حضور ﷺ ان کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہیں۔

نماز کی اہمیت:

اسی طرح علماء نے لکھا ہے، اس بات پر غور کریں! شریعت کے جتنے احکامات ہیں، یعنی اللہ پاک نے قرآن پاک میں جتنے احکامات بھیجے ہیں، روزے کے بارے میں، زکوٰۃ کے بارے میں، جہاد کے بارے میں، نکاح وطلاق کے بارے میں، ارث میراث کے بارے میں، تجارت کے بارے میں، معاملات کے بارے میں، عبادات کے بارے میں، امانات کے بارے میں اور اخبار اور قصص انبیاء والمرسلین ہیں، لیکن تمام احکام جبرئیل علیہ السلام لے کر آئیں ہیں۔ حج فرض قرآن میں ہوا، لیکن جبرئیل علیہ السلام لایا ہے، روزہ رمضان کا فرض ہوا، لیکن جبرئیل علیہ السلام لایا ہے۔ اسی طرح جہاد کا حکم نازل ہوا، جبرئیل علیہ السلام لایا ہے۔ اسی طرح نکاح وطلاق بیعت کے حکم آئے، جبرئیل علیہ السلام لائے ہیں۔ ایک نماز اتنی بڑی چیز ہے کہ جس کا حکم جبرئیل علیہ السلام نہیں لائے، بلکہ خود محمد عربی ﷺ لائے ہیں۔ نماز جب فرض ہوئی ہے تو معراج کی رات میں اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو خود حکم دیا۔ تو نماز اتنی اہم چیز ہے۔ اسی سے آپ اندازہ فرمائیں کہ تمام

عباداتِ بدنیہ میں اور حقوق اللہ میں اس کی اتنی اہمیت ہے کہ سب سے پہلی چیز نماز ہے۔

اور اسی طرح فرمایا کہ قیامت والے دن عبادات بدنیہ میں سے جس کا سب سے پہلے سوال کیا جائے گا وہ نماز کے بارے میں ہوگا۔ اور یہ بھی حدیث مبارک میں آیا کہ جو نماز کے سوال میں پاس ہو گیا آئندہ بھی سمجھو کہ پاس ہو گیا، لیکن جو نماز کے امتحان میں فیل ہو گیا باقی میں بھی فیل ہو گیا۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۴۱۳، باب: ما جاء أنّ أوّل ما یُحاسَبُ بہ العَبدُ...]

اس لیے فرمایا: ''إِقَامَةُ الصَّلٰوةِ، إِقَامَةُ الصَّلٰوةِ''

میرے پاک نبی ﷺ نے فرمایا:

((اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّیْنِ)) [شعب الایمان، حدیث: ۲۵۵۰، باب: الصَّلاۃ]

''نماز دین کا ستون ہے۔''

اگر ستون گرا دو تو عمارت خود بخود گر جائے گی۔ عمود کہتے ہیں جس پر خیمہ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر اس میں عمود نکال دیں تو خیمہ نیچے آ جائے گا۔ جس بندے کے اندر نماز نہیں تو گویا دین ختم ہو چکا ہے۔

اس طریقہ سے حضور پاک ﷺ نے فرمایا:

((اَلصَّلٰوةُ صِلَةٌ بَیْنَ الْعَبْدِ وَبَیْنَ الرَّبِّ))

بندے اور رب کے درمیان میں ایک صلہ ہے، سلسلہ ہے اور ایک کڑی ہے جس نے عبد کو رب سے جوڑا ہوا ہے۔ اگر یہ کڑی ٹوٹ گئی تو گویا بندے کا تعلق اللہ سے ٹوٹ گیا۔ جب اللہ سے تعلق ٹوٹ گیا تو انسان کے پاس باقی کیا بچ گیا؟

اور اسی طرح حدیث مبارکہ کے اندر آیا کہ نماز مؤمن کی معراج ہے، یعنی عروج کی حد ہے۔

[روح البیان: ۶/ ۳۵، الحج: الآیۃ: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا ارْکَعُوا وَاسْجُدُوا]

((أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهٗ يَرَاكَ))

حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم نماز کو ایسے ادا کرو گویا کہ تم اپنے خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر وہ پہلا مرتبہ حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم یہ یقین ہو کہ مجھے میرا رب دیکھ رہا ہے۔ [صحیح البخاری، حدیث ۴۹، باب: الإیمان]

اس لیے قرآن نے کہا ہے:

﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ﴾ [المومنون:۲]

خشوع، تواضع اور عاجزی کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ اور عین نماز میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ان کا قلب بھی اور قالب بھی، دل بھی اور جسم بھی عبادت کے اندر متوجہ ہوں اور ادھر اُدھر، یمین، شمال، جنوب، لہولعب ان چیزوں سے احتراز کرتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے: ایک آدمی نے نماز پڑھتے ہوئے ایک دو دفعہ داڑھی کو کھجایا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''اگر اس کے دل کے اندر خشوع ہوتا تو بدن کے اندر بھی خشوع ہوتا۔'' کیونکہ سارا نظام دل سے چل رہا ہے۔ اگر دل میں اللہ کا ڈر آجائے تو آپ دیکھتے نہیں کہ آنسو بہہ رہے ہیں؟ آدمی رونا شروع کر دیتا ہے، تھر تھر کانپ رہا ہے، کیونکہ دل میں اللہ کا ڈر داخل ہو گیا ہے تو اس کا پورے بدن پر اثر ہوتا ہے۔ تو اگر نماز ہمارے دلوں کے اندر داخل ہو جائے اور خشوع داخل ہو جائے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نماز کے اندر چاہا تو کھیل بھی لیا، کبھی آگے ہوئے، کبھی پیچھے ہو گئے، کبھی جیب میں ہاتھ ڈال کر چیز بھی نکال لی، کبھی گھڑی پر ٹائم دیکھنا شروع کر دیا اور کبھی بلا وجہ اپنا رومال ٹھیک کرنا شروع کر دیا۔ یہ نماز کے خلاف ہے۔

عملِ کثیر سے نماز خراب ہو جاتی ہے:

یہ عمل کثیر ہے اور عمل کثیر کے اندر علماء کا اختلاف ہے کہ بعض ائمہ کے نزدیک عملِ کثیر نماز میں جائز ہے۔ کیا معنی؟ کہ اگر ضرورت پڑ جائے تو جائز ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ عمداً کرو، وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ تم بلا وجہ بغیر ضرورت عمل کثیر کرتے رہو۔ عملِ کثیر کی تعریف کیا ہوتی ہے کہ دونوں ہاتھ کام میں لگ جائیں یا دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ نماز میں معلوم نہیں ہوتا، اگر نماز میں ہوتا تو ایسا کام نہ کرتا۔

بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ عمل کثیر سے بھی نماز ہو جاتی ہے۔ جب کوئی حاجت ہے، کوئی مجبوری ہے اور کوئی ضرورت درپیش آ گئی ہے۔ وہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور بی بی عائشہ گھر سے باہر تھیں۔ انہوں نے کنڈی کھٹکھٹائی تو حضور ﷺ نے چند قدم آگے چل کر کنڈی کھول کر، پھر چند قدم پیچھے گئے۔ اس حدیث مبارک سے انہوں نے استدلال کیا ہے۔ تو اصل میں پہلے یہ دیکھیں کہ وہ گھر کا دروازہ جہت قبلہ میں تھا۔ اگر گھر کا دروازہ قبلہ کی طرف نہ ہوا اور آدمی کا سینہ ہی قبلہ سے پھر جائے تو پھر تو نماز ہی ختم ہو گئی۔ وہ تو سب ائمہ کے نزدیک ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ میرے پاک نبی ﷺ کبھی فرض نماز گھر نہیں پڑھتے

تھے، حضور ﷺ نفل نماز پڑھ رہے تھے۔ اور جب نفل نماز ہو تو اس کے اندر بڑا توسع ہوتا ہے بہ نسبت فرض نماز پڑھنے کے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ بڑی اہم ضرورت ہے کہ ام المومنین گھر سے باہر کھڑی ہے، ضرورت درپیش آگئی ہے۔ تو اس لیے اگر کوئی ضرورت ہے، کوئی حاجت ہے تو وہاں ان کے نزدیک اجازت ہے اور بغیر ضرورت کے جیسے کہ آج کل...... اللہ رحمت کرے...... بعض آدمی نماز پڑھتے پڑھتے ٹوپی اتار کر پھینک دیتے ہیں اور بعض آدمی بلاوجہ اپنے رومال بناتے رہیں گے، بعض بلاوجہ ادھر دیکھ لیں گے اور کبھی اُدھر دیکھ لیں گے۔ یہ تو بلاضرورت ہے اور یہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔

نماز میں ادب سے کھڑا ہونا:

جب آدمی اس مقام پر کھڑا ہو کہ 'کَاَنَّکَ تَرَاہُ'' اپنے خدا کو دیکھ رہے ہیں تو جب خدا کو دیکھنا نصیب ہو جائے تو ادھر ادھر نظر ہٹ نہیں سکتی۔ اگر خدا کو دیکھنا نصیب نہ ہو اور یہ یقین ہو جائے کہ خدا ہمیں دیکھ رہا ہے۔ آپ ہائی کورٹ میں کھڑے ہوں تو آپ جج کے سامنے ہلتے ہی نہیں، جب گارڈ آف آنر ہو رہا ہوتا ہے آپ مجسٹریٹ کے آگے ہلتے ہی نہیں کہ جیسے لکڑی کے بنے ہوئے بندے ہیں، معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے اندر جان بھی ہے۔ تو اب اگر بندوں کے سامنے اتنا خشوع ہے تو نمازوں میں اللہ کے سامنے ہمارا کتنا خشوع ہونا چاہیے؟ اس لیے فرمایا: ''وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ'' [البقرة: ۳] کہ مؤمنوں کی صفت یہ ہے کہ جو نمازوں کو قائم کرتے ہیں۔ نماز کو قائم کرنے کے یہ معنی نہیں ہے کہ سویا رہے اور جب آنکھ کھلی تو نماز پڑھ لی، یا آدمی اپنے کام کے اندر لگا ہوا ہے اور لگا ہوا ہے، اب دیکھا کہ ظہر کا وقت بالکل جا رہا ہے، پانچ منٹ باقی ہیں تو ''اللهُ أكبَرُ'' کہہ کر نماز کو سر سے اتار لو، تو یہ 'اقامة الصلوة'' نہیں ہے۔ ''اقامة الصلوة'' یہ ہے کہ ارکان و شروط کے ساتھ نماز ادا کرنا۔ اگر آدمی کا وضو نہ ہو اور وہ نماز پڑھ لے، بلاوجہ قبلہ کی طرف توجہ نہ کرے تو یہ تمام چیزیں ضروری ہیں، ان کے بغیر نماز نہیں ہوگی۔ نماز تب ہوگی جب سارے شروط، ارکان اور فرائض کے ساتھ ادا کریں۔

تمام نمازیں اللہ کی ہیں:

خدا کی شان ہے کہ دیکھیں! اللہ نے نماز کے بعد سنتیں رکھی ہیں کہ ہر نماز کے بعد سنتیں ہیں اور پھر نفل ہے اور واجبات ہیں، حالانکہ فرض نماز بھی اللہ کے لیے ہے اور نفل والی نماز بھی اللہ کے لیے۔ یہ بھی لوگوں کو غلط فہمی ہے،

سمجھتے ہیں کہ شاید سنت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ فرض تو اللہ کے ہیں اور سنت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور نفل پیر کے لیے ہے۔ آخر سب کو راضی کرنا ہے ناں! یاد رکھنا! نفل بھی نماز ہے، سنت بھی نماز ہے، واجب بھی نماز ہے اور فرض بھی نماز ہے۔ اور تمام نمازیں اللہ کے لیے ہیں۔ فرمایا:

﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ [الانعام: ۱۶۲]

اللہ نے فرمایا: میرے مدنی! آپ فرما دیں کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، یا نفل کسی اور کے لیے ہے۔ سنت کا معنی ہوتا ہے طریقہ، یعنی وہ طریقہ جو ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ عشاء کے بعد دو سنتیں پڑھنی ہیں، یہ بتلایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہے۔ نفل کا معنی ہے کہ یہ زائد عبادت ہے، نافلہ ہے کہ اگر ہم پڑھ لیں گے تو اللہ ہمیں ثواب عطا فرمائیں گے، نہیں پڑھیں گے تو ہم گناہ گار نہیں ہوں گے۔ وگرنہ نماز ساری کی ساری اللہ کے لیے۔ فرائض، واجبات، سنت اور نوافل سب اللہ کے لیے ہیں۔

ہر نماز کو الگ الگ مقرر کرنے کی وجہ:

اب اللہ نے فرمایا کہ فرض پڑھو۔ اب ہم نے عشا کے چار رکعت فرض پڑھ لیے، بات ختم ہوگئی، پھر دو سنتیں علیحدہ رکھی گئیں، پھر تین وتر علیحدہ رکھے گئے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر اللہ پاک چاہتے تو فرما دیتے کہ فرض چھ رکعت پڑھ، لو پھر دو رکعت علیحدہ سنتیں اور تین رکعت وتر۔ پانچ رکعت یہ اور چار فرض تو نو (۹) ہو گئے۔ تو ایسے فرما دیتے کہ نو (۹) رکعت پڑھو تو ان کو علیحدہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ علماء نے لکھا ہے کہ یہ اللہ کا اپنے بندوں پر رحم ہے، اللہ ارحم الراحمین ہیں، یہ ان کا رحم ہے۔ میری نماز جیسا کہ پڑھنی چاہیے کوئی پڑھ سکتا ہی نہیں، اس کا حق ادا کر سکتا ہی نہیں۔ اب اس کے لیے اور تھوڑی سی سنتیں رکھ دو، واجبات اور نفل رکھ دو۔ اللہ فرمائیں گے جو فرضوں میں کمی ہے ان کو سنتوں سے پوری کرو اور سنتوں میں جو کمی ہے وہ نوافل سے پوری کرو، تاکہ میرے بندے کی نماز صحیح ہو جائے۔ اگر اس کے اندر کوئی خشوع میں کمی آگئی، خضوع میں کمی آگئی اور کوئی ادائیگی میں کمی آگئی تو بعد میں جو ہم نے سنتیں پڑھی ہیں، ان کو ڈال کر برابر کیا جائے گا۔ تو یہ اللہ کی اپنے بندوں پر خصوصی رحمتیں ہیں۔ اس لیے جو اللہ والے ہوتے ہیں وہ اسی لیے محنت کرتے ہیں کہ تہجد بھی نہ جائے، اشراق بھی نہ جائے، ضحیٰ بھی نہ جائے، اوابین بھی نہ جائے، تحیۃ الوضو بھی نہ جائے اور تحیۃ المسجد بھی نہ جائے، تاکہ ہماری نوافل اتنی زیادہ ہو جائیں کہ فرضوں کی کمی اللہ کی رحمت سے پوری ہو جائے۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں نماز اتنی اہم چیز ہے کہ اس کی کمی کے لیے باقی

ساری نمازیں رکھیں، تا کہ بندے کی نماز صحیح ہو جائے۔

پچاس کی بجائے پانچ نمازیں:

اور اس کے بعد اندازہ فرمائیں کہ نمازیں جب فرض ہوئیں تو ابتداء پچاس نمازیں فرض ہوئیں، پھر پچاس نمازوں میں سے حضور پاک ﷺ کے بار بار معافی مانگنے سے پانچ پانچ کم ہوئیں، حتیٰ کہ پانچ باقی بچیں۔ اللہ نے فرمایا: میرے مدنی محمد ﷺ! اب پانچ نمازیں رہیں گی ﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ [ق:۲۹] اللہ کا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ آپ کی امت پڑھے گی پانچ اور لکھیں گے ہم پچاس۔ ﴿مَن جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُۥ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰٓ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ [الانعام:۱۶۰]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نماز:

بہرحال آپ نماز کا اندازہ فرمائیں کہ امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہیں اور صفیں درست فرما رہے ہیں اور دشمن صفوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے موقع حاصل کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر خنجر کے ساتھ حملہ کیا۔ اور خنجر اتنے زور سے مارا کہ سیدنا امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کا پورا پیٹ مبارک کھول دیا، آنتیں باہر آ گئیں، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ...... جو پیچھے کھڑے ہوئے تھے...... ان کو اشارہ کیا کہ آپ مصلیٰ پر آ جائیں۔ تو فوراً حضرت نے وہاں کپڑا باندھ لیا اور نماز ادا کی۔ اس سے آپ نماز کی اہمیت کا اندازہ لگائیں اور صبر کا عالم دیکھیں کہ جو صحابہ پیچھے صفوں میں کھڑے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمیں پتہ ہی نہیں لگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید ہو رہے ہیں یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ ہو گیا ہے، یعنی پوری مسجد میں کوئی شور ہوا ہی نہیں۔ اور ہمارا خشوع بھی آپ کو یاد ہے کہ لوگ جمعہ کی نماز پڑھ رہے تھے، اچانک پانی کا ایک پائپ پھٹ گیا تو ساری مخلوق مزے سے بھاگ کر نکل گئی اور کچھ لوگ راستے میں مر گئے۔ یہ تو حرم میں نماز پڑھنے والوں کا خشوع ہے۔ اور جو ہمارے ملک میں پڑھتے ہوں گے وہ آپ خود اندازہ کر لیں۔ ایک دفعہ نماز پڑھ رہے تھے۔ زمزم کے پانی کے ڈول ہوتے ہیں، ایک کو دوسرے کے اوپر سٹاک کر دیتے ہیں کہ بعد میں بھر بھر کر ہر جگہ رکھیں گے، وہ گرا تو پلاسٹک کے ڈول تھے تو اتنی آواز پیدا ہوئی، لوگوں نے نماز چھوڑ دی اور یہ گئے اور وہ گئے...... إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ...... یہ مسلمانوں کی نماز ہے۔ ذرا آپ اندازہ کریں! اللہ پاک ہمارے حال پر رحم فرمائیں! نماز تو یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہمیں پتہ ہی نہیں لگا، صرف

ہمیں شبہ ہوا کہ آواز کچھ بدلی ہوئی ہے۔ آواز بھی تو ملتی تھی، حضرت عبداللہ بھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے، باپ بیٹے کی آواز بھی مل رہی تھی۔ جب نماز ختم ہوئی تو پھر یہ پتہ چلا کہ...... اللہ اکبر!...... اتنی بڑی بات ہوگئی، سیدنا امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ ہوگیا ہے اور وہ کافی زخمی ہو گئے۔ بہر حال قاتل کو پکڑ لیا گیا، لیکن نماز کا اتنا بڑا مسئلہ تھا۔ [صحیح ابن حبان، حدیث: ۶۹۱۷]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں تمام گورنرز کو یہ آرڈر جاری کیے تھے کہ جس آدمی کو نوکری دینی ہو، ملازمت دینی ہو اور عہدہ دینا ہو سب سے پہلے اس کی نماز کی تحقیق کرو۔ اگر وہ نماز کے اندر پورا ہے تو اس کو نوکری دے دو۔ اگر وہ نماز کے اندر پورا نہیں ہے تو جو اللہ کا چور ہے وہ تمہارا امین کیسے بن سکتا ہے؟ جو اللہ کی عبادت میں چوری کرتا ہے تو وہ تمہارے مال کا کیسے امین بن سکتا ہے؟ یہ تو ایک اصول تھا۔

[موطا مالك، حديث: ٦، باب: وقوت الصَّلَاة]

یاد رکھیں! میں اللہ کے کعبہ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آج اگر اسلامی ملکوں میں صرف اسی چیز کا فیصلہ کر لیں تو اللہ کی رحمت سے نوے پرسنٹ بیماریاں ختم ہو جائیں گی۔ ہم ڈگری دیکھتے ہیں، لیکن نماز نہیں دیکھتے، اس کا ایمان اور اسلام نہیں دیکھتے۔ ہم اس کی دولت کو دیکھتے ہیں، لیکن اس کے ایمان اور اسلام کو نہیں دیکھتے۔ تو جب وہ کرسی پر آئے گا تو وہ سارے کام کرے گا، لیکن ایک اللہ والا کام نہیں کرے گا۔ اس لیے حکم تھا کہ سب سے پہلے اس کی نماز دیکھو کہ وہ نماز کیسے پڑھتا ہے؟ اگر نماز خشوع سے پڑھتا ہے اور نماز صحیح وقت پر پڑھتا ہے تو اعتماد کرو۔

پھر لوگ مثال دیتے ہیں کہ حضرت! ہم نے کئی نمازی دیکھے ہیں، ان کا اندر نہ پوچھو۔ ہم نے دیکھا ہے کہ صف اوّل میں نماز پڑھتے ہیں، لیکن پھر بھی ایسے ہیں۔ اصل میں بات کیا ہے کہ ایک لاکھ نمازیوں میں اگر دس چور ہیں تو اس کی مثال دیتے ہیں۔ بھائی! اگر تم نے پرسنٹیج نکالنی ہے تو یوں نکالو کہ ایک سو نمازی لے لو اور ایک سو بے نمازی لے لو۔ پھر ان کی دو سال کے لیے آزمائش کرو۔ پھر دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اب یہ نہیں کہ سارے حرم کے نمازیوں میں چار آدمی ڈھونڈ لو کہ فلاں آدمی غلط ہے۔ اور بے نمازی لاکھوں کی تعداد میں ہوں تو ان پر نظر نہ پڑے۔ یہ کوئی عدل وانصاف تو نہیں ہے۔ انصاف تب ہوگا جب برابر کا عدد آئے۔ ایک ہزار اِدھر سے ہوں اور ایک ہزار اُدھر سے ہوں، ایک لاکھ اِدھر سے ہوں اور ایک لاکھ اُدھر سے ہوں۔ پھر دیکھیں کہ نمازیوں کا پلڑا...... ان شاء اللہ!...... ہر معاملہ میں بھاری ہوگا۔

زبان سے نماز کی نیت کب کرے؟

اور اس میں یہ بات بھی یاد رکھ لیں کہ ہمارے ملکوں میں جب...... ماشاء اللہ!......نماز پڑھتے ہیں تو نیت ہی اتنی لمبی کرتے ہیں کہ امام فاتحہ پڑھ لیتا ہے اور وہ ابھی نیت کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں ایک رواج ہے۔ چار رکعت نماز عشا فرض اللہ تعالیٰ کے لیے، منہ طرف قبلہ شریف اور پیچھے اس امام کے "اللہ اکبر"۔ اتنے امام فاتحہ کے بعد سورت پر پہنچ گیا۔ ایسے موقع میں ایسی نیت کا استحضار دل میں کر کے فوراً امام کی اقتداء میں چلے جانا چاہیے۔ نیت میں نماز کی تعیین فرض ہے، مگر زبان سے کہنا ضروری نہیں۔ ہاں! جس کو وہم وغیرہ کی وجہ سے دل میں نیت کا ثبات نہ ہو تو وہ وہم سے بچنے کے لیے زبان سے کہہ لے، ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نیت کا مقام دل میں ہوتا ہے کہ اب ہم عشا کی نماز کے لیے رکے ہوئے ہیں، یہی نیت کافی ہے بس! "اللہ اکبر"۔

نماز کے کچھ آداب:

اور یہ بھی یاد رکھیں کہ بعض لوگ یونہی "اللہ اکبر" کہہ دیتے ہیں۔ نماز تو ہو جائے گی، لیکن افضل طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں کعبہ کی طرف ہوں اور کان کے برابر ہوں اور پھر "اللہ اکبر" کہے۔ انگوٹھے کانوں کی لو کے برابر تک آ جائیں۔ یہ ضروری ہے۔ اب سینہ پر ہاتھ باندھنا بھی حدیث میں ہے، ناف پر ہاتھ باندھنا بھی حدیث مبارک میں ہے اور ناف سے نیچے باندھنا بھی حدیث مبارکہ میں ہے جو مستدرک، ابن ابی شیبہ میں باقاعدہ مذکور ہے۔ اور قیام کے اندر نظر سجدے والی جگہ پر رہے اور امام سے کبھی سبقت نہ کریں۔ ابھی امام نے "اللہ اکبر" نہیں کہا اور ہم اس سے پہلے "اللہ اکبر" کہہ دیں تو ہماری نماز نہیں ہوگی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب امام تکبیر کہے تو تب تم تکبیر کہو، جب وہ رکوع کرے تب تم رکوع کرو، جب وہ سجدہ کرے تب تم سجدہ کرو اور جب وہ سلام پھیرے تب تم سلام پھیرو۔ امام کے پیچھے چلنا ہے، امام کی اقتداء کرنی ہے اور امام کی اتباع کرنی ہے۔ یہ نہیں کہ ہم امام سے سبقت کر جائیں۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۷۳۴، باب: إيجاب التكبير،...]

اگر کوئی سبقت کرے تو اتنی وعید ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی امام سے پہلے رکوع سے سر اٹھائے اللہ اس کے چہرے کو گدھے کا چہرہ بنا دے۔ اتنی سخت وعید آئی ہے!!

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۹۱، باب: إثم من رفع رأسه قبل الإمام]

فرمایا: پھر تمہارا امام بنایا کیوں گیا ہے؟ "إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ" اس لیے کہ تم اس کی پوری پوری اقتداء کرو۔ تو یہ نماز میں خصوصی خیال کیا کرو۔

اور ہمارے لوگ بڑی زیادتی کرتے ہیں کہ جب امام "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کہے گا تو ابھی امام کا "وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" بھی پورا نہیں ہوگا اور یہ حجر اسود پر پہنچ جائیں گے۔ یہ بھی بالکل خلاف ہے۔ جب تک امام مکمل سلام نہ پھیرے تو تم بھی سلام نہ پھیرو، حتیٰ کہ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ امام دونوں طرف سلام پھیرے اب مقتدی بعد میں سلام کہے، تاکہ سبقت کا خوف ختم ہو جائے، ورنہ ایک طرف سلام پھیرنے سے بھی نماز پوری ہو جاتی ہے، لیکن احتیاط اسی کے اندر ہے کہ اب کوئی غفلت کر ہی نہیں سکے گا، اس لیے کہ اب امام نے دونوں طرف سلام پھیر لیا ہے۔

اسی طرح نماز کے اندر یاد رکھیں کہ بعض ہمارے بھائی نماز پڑھتے ہیں "اللہ اکبر...... اللہ اکبر" فوراً نماز نہیں ہوتی، یہ پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے۔ کیونکہ امام الانبیاء امام المتقین سید الاولین والآخرین شفیع المذنبین ﷺ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صحابی نے آکر نماز پڑھی۔ نماز پڑھ کر آیا اور حضور ﷺ کو سلام کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((اِرْجِعْ فَصَلِّ، فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ))

"جا کر پھر نماز پڑھو، تم نے گویا نماز پڑھی ہی نہیں ہے۔"

وہ گیا اور اس نے پھر نماز پڑھی اور دوبارہ آیا تو حضور ﷺ فرمایا:

((اِرْجِعْ فَصَلِّ، فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ))

دوبارہ نماز پڑھو۔ آگے "لَمْ" نافیہ ہے کہ بالکل تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ اس نے پھر نماز پڑھی اور پھر آیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ دوبارہ نماز پڑھو۔ اس کو تنبیہ فرمائی۔ مقصد یہ تھا کہ پہلی دفعہ سمجھ جائے گا، دوسری دفعہ سمجھ جائے گا اور تیسری دفعہ سمجھ جائے گا، لیکن وہ اللہ کا بندہ ہمارا بھائی تھا۔ چوتھی دفعہ اس نے کہا: حضور! مجھے تو اسی طرح آتی ہے اور تو مجھے نہیں آتی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندے! ایسے نماز نہیں ہوتی۔ جب رکوع کرو "حَتّٰى تَطْمَئِنَّ رَاكِعًا" رکوع میں پورا بدن ٹیڑھا ہو اور پشت سیدھی ہو اور اطمینان ہو جائے اور پھر جب سجدہ کرو تو اطمینان سے کرو۔ (یعنی حضور ﷺ نے اس کو نماز کے فرائض اور واجبات سکھائے)۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۷۵۷، باب: وُجُوبِ الْقِرَاءَةِ لِلْإِمَامِ...]

کیا معنی ہے کہ جب رکوع میں جاؤ تو کم سے کم درجہ ہے کہ "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ" تین دفعہ پڑھیں، وگرنہ

پانچ دفعہ، سات دفعہ، گیارہ دفعہ، اگر اکیلے ہوں جتنا زیادہ پڑھیں۔ تو بہر حال جو ہمارے حضرات اللّٰہ اکبر...... اللّٰہ اکبر کرتے رہتے ہیں اور تین دفعہ بھی ایسا پڑھتے ہیں کہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے ایک دفعہ بھی پڑھا ہے کہ نہیں پڑھا۔ یہ بات غلط ہے۔ ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' آرام سے ادا کریں اور پتہ ہو کہ آپ اپنے منہ سے کیا لفظ نکال رہے ہیں، جلدی میں نہ پڑھیں۔ پتہ لگے کہ میں اپنے رب کی تسبیح بیان کر رہا ہوں، جو اعلیٰ ہے، جس کی صفت اعلیٰ ہے، سب سے بلند ہے اور سب سے برتر ہے۔ تو اس لفظ کا ہمیں پتہ تو چلے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں؟ اس لیے نماز کے اندر ہمیشہ خصوصی خیال رکھا کریں۔ اسی طرح یاد رکھیں کہ نماز کو ہمیشہ جماعت کے ساتھ ادا کریں۔ جو نماز جماعت کے ساتھ ادا نہ کرے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک بکری ریوڑھ سے علیحدہ ہو جائے۔ تو جب بھی کوئی بھیڑیا حملہ کرے گا تو سب سے پہلے علیحدہ بکری پر حملہ کرے گا۔ فرمایا:

((مَنْ شَذَّ شُذَّ إِلَى النَّارِ.)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۱۶۷، باب: مَا جَاءَ فِي لُزُومِ الْجَمَاعَةِ]

''جو علیحدہ ہوا گویا جہنم میں جا پڑا۔''

فرمایا:

((فَإِنَّ يَدَ اللهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ.)) [سنن النسائی، حدیث: ۴۰۲۰، قَتْلُ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ]

''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے۔''

اور فرمایا کہ جو عمداً جماعت کو چھوڑے گویا اس نے نماز نہیں پڑھی۔

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۷۹۳، باب: التَّغْلِيظِ فِي التَّخَلُّفِ عَنِ الْجَمَاعَةِ]

اور اسی طرح نماز مسجدوں میں ادا کرو، جماعت کے ساتھ ادا کرو اور وقت پر ادا کرو۔ یعنی اتنا حکم ہے کہ آپ مسجد میں آئے اور جماعت ہوگئی اور جماعت آپ کو نہیں ملی تو آپ نے ادھر ادھر دیکھا اور بھی کوئی ساتھ نہیں ملا تو حکم ہے کہ آدمی گھر لوٹ جائے اور اپنے بیوی بچوں کو پیچھے کھڑا کر کے خود امام بن جائے، تا کہ جماعت سے محروم نہ ہو جائے، یعنی جماعت اتنی ضروری ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جب مرضی آئے اور جہاں مرضی آئے وہاں کھڑے ہو کر اکیلے پڑھ لو۔

اسی جماعت میں برکتیں ہیں، اسی کے اندر رحمتیں ہیں۔ اسلام دین وحدت ہے، اسلام کے اندر اتفاق اور یونٹی اور آپس میں ملنے کا سبق ہے۔ تو جماعت کی اہمیت اور مسجد کی اہمیت دو باتیں یاد رکھیں۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ نماز کسی حال میں معاف نہیں ہے سفر میں بھی معاف نہیں ہے اور گھر میں بھی معاف نہیں ہے۔حتیٰ کہ حالتِ جنگ میں جب گولیوں کی بوچھاڑ چل رہی ہو اور تیر و تفنگ ٹکرا رہے ہوں، اس وقت بھی نماز معاف نہیں ہے۔ وہاں بھی حکم ہے کہ وہاں صلوۃ الخوف ادا کی جائے، وہاں بھی ہر شکل میں نماز پڑھی جائے گی۔ اسی طرح یاد رکھیں! میری بعض بہنیں اپنی ماہواری کے دنوں میں پاک ہو گئیں، مثلاً: عصر کو، لیکن اس نے کہا کہ چلو چھوڑو! اب مغرب کے بعد غسل کروں گی۔ یہ ظلم ہے اور بہت بڑا گناہ ہے۔ جب عصر کو پاک ہو گئی تو فوراً غسل کر کے نماز ادا کرتی۔ یہ نہیں کہ اپنے غسل کو اور دو نمازوں کو بلا وجہ مؤخر کر دے۔ اس لیے ہمیشہ ان چیزوں کا لحاظ رکھیں۔

اسی طرح اگر کسی نے ایک نماز عمداً چھوڑ دی، یعنی کوئی عذر نہیں، نہ بیماری ہے، نہ کچھ، لیکن دوستوں میں بیٹھا ہوا ہے، گپیں لگا رہا ہے۔ بھائی! نماز کا ٹائم ہے۔ او جی! ٹھیک ہے، پڑھ لیں گے۔ نماز نہ پڑھی تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ابن القیم اور بڑے بڑے مقابلہ کے جو علماء اور ائمہ گزرے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ جو ایک نماز چھوڑ دے وہ کافر ہو جاتا ہے، چاہے مرد ہو یا عورت۔ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کا نکاح بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جب کافر ہو گیا تو نکاح ختم ہو گیا، کیونکہ نکاح تو مسلمان کا ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر عورت نے نماز نہ پڑھی تو تب بھی نکاح ٹوٹ گیا۔ مرد نے عمداً نماز چھوڑ دی تب بھی نکاح ختم ہو گیا۔ وہ فرماتے ہیں: اگر اس کے بعد توبہ نہیں کی اور رجوع نہیں کیا تو اس کے بعد اولاد زنا سے پیدا ہو گی۔ اسی حالت میں مر جائے تو اس پر جنازہ بھی نہ پڑھو اور مسلمانوں کے قبرستان میں بھی اس کو دفن نہ کرو۔ (یہ حنبلیوں کا مذہب ہے۔ ہمارا احناف کا مذہب یہ ہے کہ وہ کافر نہیں ہوتا، سخت گناہگار ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو جیل میں ڈالا جائے جب تک توبہ نہ کرے۔ مگر نکاح بھی نہیں ٹوٹتا اور وہ مسلمان ہے، مگر عمل کافروں والا کیا ہے۔ بہر حال! نماز کسی حالت میں بھی معاف نہیں ہے۔ امداد اللہ انور) اندازہ فرمائیں کہ ایک نماز چھوڑنے کا یہ عذاب ہے اور میرے پاک نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں لوگوں کو حکم دوں کہ نماز پڑھو اور اقامت کا حکم دوں کہ تکبیر کہو، پھر دیکھوں کہ جو لوگ جماعت میں نہیں ہیں ان کے گھروں کو میں لکڑیاں جمع کرا کر اپنے ہاتھوں سے آگ لگا دوں۔ تو جن گھروں کو حضور ﷺ جلا ڈالیں گے کیا وہ سبز ہو جائیں گے؟ یعنی جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتے۔

[صحيح البخاري، حديث: ۶۴۴، باب: وُجُوبِ صَلَاةِ الْجَمَاعَةِ]

اسی لیے صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص جماعت میں نہ ہوتا تو ہم اندازہ کر لیتے تھے کہ وہ منافق ہے یا

ہم اندازہ کر لیتے تھے کہ وہ بیمار ہے، وگرنہ یہ ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہو اور جماعت میں حاضر نہ ہو......؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اور جس جگہ نماز نہ ہو اس کے بارے میں بھی حدیث پاک موجود ہے۔ حضور ﷺ سفر میں آرہے اور آپ نے سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ تم نگرانی کرو، ہم تھکے ہوئے ہیں، شاید نیند آجائے۔ تو تم نگرانی کے لیے بیٹھو، تاکہ ہماری نماز ضائع نہ ہو جائے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اونٹ کا پالان رکھ کر اس پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا کہ جب صبح صادق ہوگی تو میں فوراً اٹھادوں گا۔ فرماتے ہیں: اللہ کی شان ہے کہ مجھے بھی نیند آگئی اور خدا کی شان ہے کہ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم تھکے ہوئے تھے ان کو بھی نیند آگئی اور میرے محمد عربی ﷺ کو بھی نیند آگئی۔ اور سب سے پہلے میرے آقا ﷺ کی آنکھ کھلی تو سورج نکل چکا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بلال کو فوراً بلاؤ۔ بلال رضی اللہ عنہ کو بلایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اچھی نگرانی کی ہے! انہوں نے عرض کیا: حضور! جس اللہ نے آپ کو سلا دیا اس نے مجھے بھی سلا دیا۔ اگر اللہ کا نبی سو گیا تو میں بھی سو گیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا جلدی کرو! اس وادی سے نکلو۔ اس وادی میں شیطان ہے، اس لیے ہماری نماز رہ گئی۔ [صحیح مسلم، حدیث: ٦٨٠، باب: قَضَاءُ الصَّلَاةِ الْفَائِتَةِ]

تو جس گھر میں نماز نہ ہو تو سمجھو اس میں شیطان رہتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ مسلمان کا گھر ہو اور نماز نہ ہو، یہ نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں کی مسجدیں ہوں اور نماز نہ ہو اور یہ نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں کا محلہ ہو اور نماز نہ ہو۔ نماز اتنی بڑی چیز ہے کہ حضور ﷺ جب جنگ کا حکم دیتے تھے اور اپنے صحابہ کو فرماتے تھے کہ صبح کے وقت میں شب خون نہ مارا کرو، انتظار کیا کرو۔ اگر بستی سے اذان کی آواز آجائے تو اس بستی پر حملہ نہ کرنا، اگر آذان کی آواز نہ آئے تو پھر حملہ کر دینا۔ یعنی ایک مسلمان بھی اگر اذان دے دے تو پوری بستی بچ گئی۔ [سنن الترمذی، حدیث: ١٥٤٩]

تو اذان اور نماز علامتِ ایمان ہیں اور ان کا ترک کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ ہمیں إِقَامَةِ صَلٰوة نصیب فرمائے۔ خلاصۂ درس یہ ہوا کہ متقین کی پہلی صفت ایمان ہے اور دوسری صفت اقامۃ صلوۃ ہے۔ اندازہ کریں کہ اقامۃ صلوۃ کا تنا ساتھ لگا ہوا ہے کہ اگر اقامۃ الصلوۃ نہیں تو گویا ایمان ہی نہیں۔ یہ تصور بھی نہیں ہوسکتا کہ ایمان ہو اور اقامۃ الصلوۃ نہ ہو۔ اس لیے فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣﴾﴾ [البقرۃ: ٣]

قرآن سراپا ہدایت ہے:

آپ ابتداء میں پڑھ چکے ہیں کہ ایک جامع لفظ آ گیا ''الْمُتَّقِيْنَ'' کا۔ اور یہ قرآن مقدس کا اسلوب بیان ہے کہ ایک جگہ پر اجمالی طور پر بات فرماتے ہیں تو دوسری جگہ اس کی تفصیل بیان فرما دیتے ہیں۔ وہاں تو ایک جامع مانع مکمل ایک لفظ استعمال فرمایا گیا کہ قرآن سراپا ہدایت ہے، کن کے لیے؟ جو متقین ہیں۔ متقین کا لفظی معنی ہوتا ہے کہ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ چونکہ ڈرنا ہی اللہ تعالیٰ کی ہر فرمانبرداری کی بنیاد ہے۔ اب متقین کی تفصیل میں اللہ تبارک وتعالیٰ بیان فرما رہے ہیں کہ متقین کون ہیں؟ ان کو کیسے پہچانیں اتنے بڑے معاشرے کے اندر؟ تو پہلی صفت ان کی یہ ذکر کی گئی کہ ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ اور دوسری صفت اقامة الصلوة تھی۔

تفسیر:

تیسری صفت: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ ''مِمَّا'' اصل میں ''مِنْ مَا'' تھا۔ ادغام کر دیا جائے تو پڑھا جاتا ہے ''مِمَّا''۔ تو ''مِنْ'' ''تبعیض کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہم نے ان کو رزق دیا ہے اس میں سے کچھ خرچ کرتے ہیں۔ تبعیض کا معنی ہوتا ہے بعض۔ اور پھر فرمایا: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ کہ مؤمنین کی صفت یہ ہے کہ جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، کیونکہ رزق دینے والے اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں۔ اس میں سے بھی اللہ نے سارا نہیں مانگا کہ جو ہم نے آپ کو دیا ہے وہ سارے کا سارا آپ لٹا دیں۔ صاف بات ہے کہ ایمان بھی اللہ اور اللہ کے رسول پر لائے تو اب اقامة الصلوة یعنی عبادت بھی اللہ کی کرتے ہیں اور خرچ بھی اللہ کے راستے میں، اللہ کی فرمانبرداری میں کرتے ہیں، لیکن ''مِمَّا'' یعنی تھوڑا سا۔ اسی طرح مؤمنوں کی صفات میں ذکر کیا گیا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ [الفرقان: ٦٧]

''ایمان والے لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو اسراف نہیں کرتے، فضول خرچی نہیں کرتے اور اللہ کی راستوں کو اختیار کرتے ہیں۔''

اور اسی طرح صفت آئی:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ [آل عمران: ۹۲]

اللہ نے فرمایا کہ نیکی کیا ہے؟ یہ کہ تم اللہ کے راستے میں وہ چیز خرچ کرو جو تمہیں محبوب ہے۔

اسی طرح فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً﴾ [البقرۃ: ۲۷۴]

مؤمنوں کی صفت یہ ہے کہ دن ہو یا رات ہو، ظاہر ہو یا چھپے ہوئے ہو، ہر جگہ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرتے ہیں۔

اسی قرآن مقدس میں کئی مقامات میں فرمایا:

﴿وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ [المنافقون: ۱۰]

اللہ نے فرمایا: تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو جو اللہ نے تمہیں رزق عطا فرمایا ہے۔ اس میں سے بھی کچھ تم اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ انفاق فی طاعۃ اللہ مؤمنوں کی صفت ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ کے راستہ میں خرچ کر رہا ہے تو وہ متقین میں سے ہے اور اگر شیطان کے راستے میں خرچ کر رہا ہے تو فاسقین اور مسرفین میں سے ہے۔ انعامات میں اللہ نے ہمیں نشانیاں دکھلائیں۔

اگر ہم کافر پر نظر ڈالیں گے، یہودی ہے، نصرانی ہے، ہندو ہے، وشنی ہے، سکھ ہے، بدھ مت ہے، ہم دیکھیں گے کہ بڑا پڑھا لکھا ہے، لیکن اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں تو پہلی صفت ہی ختم ہوگئی۔ پہلی صفت ایمان والی پائی گئی تو ہم دیکھیں گے کہ اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃِ، يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ جو نمازوں کو قائم کرتے ہیں۔ اگر نماز قائم نہیں کر رہا تو سمجھیں گے کہ یہ بھی متقین میں سے نہیں بن رہا۔ اور تیسری صفت ہے ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۳] اور خرچ کرتے ہیں جو ہم نے ان کو دیا ہوا ہے۔ اگر وہ اللہ کی اطاعت میں اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا تو ہم سمجھیں گے کہ یہ متقین کی صفت سے متصف نہیں ہوا۔ اس لیے اللہ نے صفات بیان فرمائیں۔

انفاق سے کیا مراد ہے؟

اب خرچ کرنے سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد زکوٰۃ ہے، کیونکہ یہ معاملہ ایمان کی صفتوں میں آ رہا ہے تو ایمان میں صرف زکوٰۃ فرض ہے باقی تو صدقات ہیں۔ اصل چیز تو زکوٰۃ ہے کہ جہاں بھی نماز کا حکم آیا ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّكٰوۃَ﴾ [النساء: ۷۷] جہاں جہاں مؤمنوں کی صفت دیکھیں گے ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوۃِ فٰعِلُوْنَ﴾ [المؤمنون: ۴] زکوٰۃ اور نماز کو اکٹھا ذکر کیا گیا۔ [ابن کثیر: ۱/۴۲، البقرۃ: الآیۃ: وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ]

زکوٰۃ کی فرضیت:

یہی وجہ ہے کہ خاتم الانبیاء ﷺ کی وفات ہوئی تو لوگوں نے زکوٰۃ سے انکار کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم زکوٰۃ نہیں دیتے، حالانکہ وہ نماز بھی پڑھتے تھے اور اسلام کا اقرار، کلمہ، نماز، روزہ، ہر چیز کرتے تھے، لیکن صرف زکوٰۃ کا انکار کر دیا اور اللہ کے قرآن میں ایسی تاویل کی جو قرآنی آیات کے مخالف ہے اور حدیث رسول پاک ﷺ کے بھی مخالف ہے۔ اس لیے علماء نے فرمایا: وہ انسان ملحد اور زندیق ہوتا ہے کہ جو اللہ کے قرآن کے الفاظ کو اس کے معنی کے بجائے اپنے مطابق تاویل کرے کہ قرآن کا لفظ تو مان رہا ہے، لیکن اس کا ترجمہ اپنی منشا سے کر رہا ہے، اس کی تفسیر اپنی منشا سے بیان کر رہا ہے تو وہ ملحد اور زندیق ہوتا ہے۔ اس کی مثال کہ قرآن نے ہمیں حکم دیا زکوٰۃ کا، اللہ کے نبی ﷺ کو حکم ملا تھا:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ﴾

[التوبۃ:۱۰۳]

میرے نبی! آپ مؤمنوں کے مال سے صدقہ واجبہ یعنی زکوٰۃ وصول کریں، تاکہ ان کے اموال بھی پاک ہو جائیں، ان کے دل بھی پاک ہو جائیں۔ پھر ان کے لیے دعا بھی کیا کریں کہ اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آپ کی دعا ان کے لیے باعثِ رحمت اور باعثِ سکون ہوگی۔

منکرینِ زکوٰۃ سے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جنگ:

تو انہوں نے کہا کہ جب حضور ﷺ کی وفات ہو گئی تو ہمیں اب حضور ﷺ کی دعا ملتی نہیں تو ہم زکوٰۃ کیوں دیں؟ زکوٰۃ تو خاص حکم ہے۔ تو انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے بہت بڑا چیلنج ہو گیا، یعنی آپ کے لیے مسندِ خلافتِ رسول ﷺ پر بیٹھنے کے بعد سب سے بڑا چیلنج مسیلمہ کذاب تھا اور سب سے بڑا چیلنج منکرینِ زکوٰۃ تھا۔ انہوں نے کہا: ہم زکوٰۃ نہیں دیتے۔ سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی فوجوں کو منظم کیا اور مسیلمہ کذاب سے بھی جہاد کیا، حالانکہ مسیلمۃ الکذاب کا ستر ہزار کا لشکر تھا، اس سے سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ نے جنگ لڑی اور اللہ نے فتح دی، فتنۂ ارتداد کو آپ نے ختم کیا اور جھوٹے نبی کا آپ نے ہمیشہ کے لیے قلع قمع کر دیا۔

اور جب مسئلہ منکرینِ زکوٰۃ کا پیدا ہو گیا تو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حکم جاری فرمایا کہ مسلمانو! یاد رکھو کہ جو

آدمی زکوٰۃ دینے سے انکار کرے گا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا، میں اس کے ساتھ جنگ لڑوں گا۔ وہ مسلمان نہیں ہے، وہ کافر ہے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمادیا تو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جیسے ذہین آدمی فرماتے ہیں کہ میں بھی حیران ہوگیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور عرض کیا: ''تَقْتُلُ اَھْلَ الْقِبْلَۃِ؟'' قبلہ والوں سے لڑوگے جو مسلمان ہیں، کلمہ پڑھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں؟

کسی ایک بھی فرض کا انکار کفر ہے:

اسی سے مسائل سمجھ لیا کریں۔ آج کل ہمیں دھوکہ ہو رہا ہے کہ ہم تو پکے مسلمان ہیں، ایک سود والا مسئلہ نہیں مانتے، باقی تو ہم پکے ہیں۔ یاد رکھیں کہ ایک مسئلہ کا انکار پوری شریعت کے انکار کے برابر ہے۔ اگر ایک آدمی پورے قرآن کا انکار کرے تب بھی کافر ہے اور اگر ایک آیت کا انکار کرے تب بھی کافر ہے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' سے ''وَالنَّاس'' تک انکار کرے، اسی طرح سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر میرے آقا سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک نبی علیہ السلام کا انکار کرے تب بھی کافر ہے اور اگر ایک لاکھ چوبیس ہزار کا انکار کرے تب بھی کافر ہے۔ جیسے اللہ کے تمام نبیوں پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح قرآن پاک کے تمام احکامات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور ایمان بھی ایسا کہ دل میں کوئی تنگی بھی نہ رہے اور کوئی کرکری بھی نہ رہے، گھبراہٹ بھی نہ رہے، بلکہ انشراحِ صدر کے ساتھ کہے ''اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا'' اللہ کا حکم ہے اور ہمارا ایمان ہے اور اس میں خیر ہے۔ بہت لمبی چوڑی بحثوں اور باریکیوں میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

تجارت حلال، سود حرام ہے:

﴿وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ﴾[البقرۃ:۲۷۵]

اللہ نے بیع تجارت کو حلال کیا اور ربوا کو حرام کیا۔ بیع بھی عربی کا لفظ ہے اور ربوا بھی عربی کا لفظ ہے۔ اب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نکتہ بیان فرمادیا کہ ہر وہ قرض جو نفع کو کھینچے وہ ربوا ہے۔ ایک موٹی سی بات بتلادی کہ آپ نے کسی کو قرض دیا ایک ہزار اور کہا کہ مجھے ایک ہزار بیس دینا تو قرض سے زیادہ کا نفع حاصل کرنا ربوا میں آگیا۔

اسی طرح علماء نے لکھا ہے کہ مثلاً: آپ سے کسی نے دس ہزار ریال قرض لیا ہے، آپ نے قرضہ دے دیا۔ آپ سڑک پر کھڑے تھے، وہ آدمی اپنی گاڑی میں گزرا۔ اس نے کہا کہ آئیں جناب! آپ نے جہاں جانا ہو میں آپ

کو وہاں پہنچادوں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر وہ قرضہ لینے سے پہلے بھی پہنچایا کرتا تھا پھر تو بیٹھ جائے، وگرنہ بیٹھے گا تو یہ بھی ربوا ہے کہ آپ نے قرضہ دینے کے بعد اس سے فائدہ حاصل کیا۔ اور میرے مدنی ﷺ کا فرمان ہے:

((كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفِعَةً فَهُوَ رِبٰوا)) [کنزالعمال، حدیث:۱۵۵۱۶]

''قرض پر جو فائدہ حاصل کیا جائے وہ ربوا ہے۔''

اس لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (حنفی تو سارے بنتے ہیں کہ حنفی ہے اور سنی ہے اور ڈیڑھ ڈیڑھ گز لمبے القاب ہیں) نے ایک آدمی کو قرضہ دیا اور قرضہ لینے کے لیے گئے تو اس وقت شدید گرمی کا وقت تھا۔ اس کے دروازے پر کنڈی کھٹکھٹائی اور ہٹ کر دھوپ میں کھڑے ہو گئے اور دس منٹ یا پانچ منٹ یا خدا جانے کچھ دیر بعد گھر والا اپنے گھر سے باہر آیا۔ دیکھا کہ امام صاحب کھڑے ہیں تو دوڑا اور بھاگا اور کہا کہ حضرت! آپ کوئی آدمی بھیج دیتے، کوئی شاگرد بھیج دیتے، آپ خود میرے دروازے پر آ گئے عین گرمی میں اور پھر دھوپ میں کھڑے ہیں، آپ دروازے کے سائے کے نیچے کھڑے ہو جاتے۔ فرمایا: ''میں نے آپ سے قرضہ لینا ہے۔ اگر میں تمہارے گھر کا سایہ استعمال کروں تو قیامت والے دن مجھے خدا نہ پکڑ لے کہ میں نے نفع اٹھایا۔ تو دیوار کے سایہ سے بھی نفع اٹھانے سے میں ڈرتا ہوں کہ خدا پکڑ نہ لے۔''

اس لیے فقہا کرام نے لکھا ہے کہ جن عمارتوں میں، جن بلڈنگوں میں سود کا کاروبار ہوتا ہو اس کے سائے کے نیچے بیٹھنا بھی درست نہیں ہے، کیونکہ آپ حرام کی چیز کا سایہ سر پر رکھ رہے ہیں۔ اتنا بچنے کا حکم دیا ہے۔

بینک کا سود:

اور ہم کہیں کہ جناب! حضور ﷺ کے زمانہ کا ربوا اور تھا۔ وہ جناب ساہوکار ربوا دیتا تھا غریب کو لوٹنے کے لیے۔ اب تو ربوا دونوں طرف ہے، غریب بھی دیتا ہے اور امیر بھی دیتا ہے۔ غریب بھی اگر بینک میں پیسے رکھے تو اسے بھی ربوا ملتا ہے، یہ تو جناب جانبین سے ہے۔ حالانکہ یہ ڈبل ربوا ہے۔ پہلے ایک طرف سے یہ گناہ ہوتا تھا اور اب وہی گناہ دو طرف سے شروع ہو گیا، لیکن وہ کہتے ہیں کہ نہیں جناب! وہ ربوا اور تھا۔ اور اللہ فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ [آل عمران:۱۳۰]

تم دوگنا، چار گنا اور دس گنا...... جیسا زمانہ جاہلیت میں لیتے تھے...... وہ نہ لو، البتہ چار پرسنٹ، سات پرسنٹ

اور دس پرسنٹ تو بڑی معمولی سی بات ہے۔ آخر دیکھو جی! بینک بھی تو چلانے ہیں، کوئی سروس چارج ہمیں بھی تو لینا ہوگا، وگرنہ یہ بینکنگ کا سسٹم کیسے چلائیں گے؟ ان تاویلات کا معنی تو یہ ہوا کہ جیسے آج کوئی آدمی کہہ دے کہ قرآن میں اللہ نے جس خنزیر کو حرام کیا ہے وہ اس زمانہ میں تھا، اب ہمارا خنزیر تو صاف ستھرا ہے۔ کتا بھی وہی حرام ہے جو حضور ﷺ کے زمانہ میں تھا، اب تو کتا کاروں میں بیٹھتا ہے، اس کا منہ چوما جاتا ہے اور اس کو نہلایا جاتا ہے، شیمپو لگایا جاتا ہے۔ وہ غلیظ کتے تھے جو گلیوں میں پڑے رہتے تھے، وہ حرام تھے۔ پھر تو اس طرح پوری شریعت بدل گئی۔

اس لیے دیکھیں کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نظر کہاں پڑی؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آ کر کہا: امیر المومنین! آپ کیا کر رہے ہیں؟ وہ نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور کعبہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور حضور ﷺ آمنہ کے لال کا فرمان ہے:

((مَنْ صَلّٰى صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَأَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ.))

''جو آدمی ہماری نماز کی طرح نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور ہمارے ذبح شدہ جانور کو کھائے تو وہ ہم میں سے ہے ہماری جماعت میں سے ہے۔''

[صحیح البخاري، حدیث: ۳۹۱، باب: فَضْلِ اسْتِقْبَالِ الْقِبْلَةِ]

تو یہ لوگ نماز بھی پڑھتے ہیں، قبلہ کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں اور ذبیحہ بھی کھاتے ہیں اور پھر آپ ان کے قتال کا حکم دے رہے ہیں کہ میں ان کے ساتھ لڑوں گا؟ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جوش میں آئے اور جلال آ گیا۔ آپ نے غصہ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سینے میں ہاتھ مارا اور فرمایا:

''أَجَبَّارٌ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَ خَوَّارٌ فِي الْإِسْلَامِ؟''

''عمر! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کفر کے زمانہ میں تو تو بڑا بہادر بنا پھرتا تھا اور اسلام کے بعد تو اتنا کمزور ہو گیا ہے؟''

جاؤ! میرے راستہ سے ہٹ جاؤ۔ اگر کوئی ایک رسی بھی زکوٰۃ میں دیا کرتے تھے، اگر اس رسی کو بھی روک لیا تو میں اس کے لیے جہاد کروں گا۔ حالانکہ رسی کوئی زکوٰۃ نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تھوڑا سا بھی انکار کیا، معمولی سی زکوٰۃ بنتی تھی وہ بھی نہیں دی تو میں قتال کروں گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ڈر گیا اور میں ہٹ کر آ کر مسجد نبوی میں بیٹھ گیا اور میں سوچنے لگ گیا۔ کہتے ہیں:

''وَاللّٰهِ مَا هُوَ إِلَّا أَنْ قَدْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، فَعَرَفْتُ أَنَّهُ الْحَقُّ''

تھوڑی دیر گزری، اللہ نے میرا سینہ بھی کھول دیا جیسے اللہ نے ابوبکر کا سینہ کھولا اور میں نے جان لیا کہ یہی حق ہے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۹۹، بابُ: وُجُوبِ الزَّكَاةِ، مشکاۃ المصابیح، بابُ: مَنَاقِبِ أَبِي بَكْرٍ]

اور میں دوڑا اور کہا: ابوبکر! تجھے مبارک ہو! مجھے سمجھ آگئی ہے۔ تم حکم کرو، عمر تیرا سپاہی بن کر لڑے گا۔ بات سمجھ آگئی، تمہاری بات سچی ہے۔ کیونکہ آج اگر کوئی زکوٰۃ سے انکار کرے اور ہم چپ کر جائیں تو کل نماز کا انکار کردے گا، ایک جماعت قربانی کا انکار کردے گی، ایک جماعت حج کا انکار کردے گی۔ یہ جی! گرمیوں کے زمانہ میں خواہ مخواہ پیسے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پچاس پچاس ہزار جمع کرو، مسکینوں کو دے دو، غریبوں کو دے دو، جو ہسپتال میں بیمار پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس پیسے نہیں ہیں اور تم حج کے لیے جا رہے ہو، کون سی عقلمندی والی بات ہے؟ اس طرح دین کا انکار ہوتا چلا جائے گا۔ اور یہ باتیں وہ کرتے ہیں جنہوں نے کبھی مریضوں کو دس روپے بھی نہیں دیے۔ مقصد صرف اسلام دشمنی ہوتا ہے۔

ایک قادیانی کا دھوکہ:

اصل میں بات سمجھ تب آتی ہے جب ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ جیسے کسی دور میں ایک قادیانی یہاں آگیا، بڑی لمبی بات ہے۔ بہرحال پکڑا گیا۔ پولیس کے سامنے جب بات ہوئی تو اس سے پوچھا گیا کہ تم قادیانی ہو؟...... وہ سمجھدار تھا...... اس نے کہا: نہیں میں مسلمان ہوں۔ انہوں نے کہا: یہ مولوی لوگ ہیں، ان کو ہمارے ساتھ کوئی غصہ ہوتا ہے۔ جس پر بھی ناراض ہوتے ہیں کہہ دیتے ہیں کہ قادیانی ہے۔ قادیانی تو کافر ہوتا ہے، میں تو مسلمان ہوں۔ مجھے مقامِ ابراہیم سے نماز پڑھتے ہوئے انہوں نے پکڑا ہے، میں نماز پڑھ رہا تھا۔ یہ قرآن شریف کی حمائل میرے گلے میں ہے، حج کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اگر میں قبلہ کو قبلہ نہ مانتا تو میں حج کرنے کے لیے کیوں آتا؟ اب کون سی بات رہ گئی ہے میرے مسلمان نہ ہونے میں؟ تو پولیس والا یہاں کا تھا، اس کو کیا پتہ کہ یہ لوگ کیسے منطقی ہوتے ہیں؟ تو وہ حیران ہوگیا!! اس نے کہا کہ مولوی صاحبان! کیا آپ لوگوں کا دماغ خراب ہوگیا ہے؟ آپ مسلمان کو پکڑ کر لے آئے ہو۔ ہم نے کہا کہ یہ بظاہر شریف آدمی ہے، مگر قادیانی ہے۔ اس نے کہا: یہ کلمہ پڑھ رہا ہے، اس کے گلے میں قرآن ہے اور تم نے نماز پڑھتے ہوئے تو اس کو پکڑا ہے۔ ہم نے کہا کہ آپ لمبی چوڑی بحث میں نہ جائیے، یہ تو آپ کو ان کی منطق سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ہم اس کے ملک کے بندے ہیں، ہمیں وہاں کا پتہ ہے۔ آپ اس سے یہ پوچھو کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں تمہارا کیا اعتقاد ہے؟ آپ اس سے قرآن شریف نہ سنیں، نہ آپ اس

سے حدیث سنیں اور نہ کعبہ شریف کے فضائل سنیں۔ دولفظی بات ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو تم کیا سمجھتے ہو؟ اس نے پوچھا کہ بتلاؤ۔ تو اس نے کہا کہ وہ تو نبی تھا۔ بس بات نکل آئی۔ اس پولیس آفسر نے کہا کہ مولوی صاحب! اب تم فارغ ہو، مجھے مسئلہ سمجھ آگیا ہے۔ اس نے پکڑ کر اس کو مارا کہ تم بے ایمان کافر، تم قرآن گلے میں کیسے ڈالے کھڑے ہو؟ تم ہمارے قرآن والے نبی کو تو مانتے ہی نہیں تو پھر تمہیں کیا حق ہے کہ تم قرآن کو گلے میں لٹکاؤ اور دھوکہ دو؟ یا تو تم اس قرآن والے نبی کو مانو اور اسی قرآن میں لکھا ہوا ہے: خاتم النبیین۔ اب تم یہاں بہانے کرتے پھرو کہ خاتم کا معنی مہر ہوتا ہے اور حضور ﷺ نے مہر لگا دی ہے اور جسے مہر لگا دیں گے وہ نبی بن جائے گا۔ اللہ کے نبی ﷺ کی اطاعت کرنے سے آدمی صدیق بن جاتا ہے تو نبی کیوں نہیں بن جاتا؟ تو ﴿وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ [النساء:٦٩] تو پھر اطاعت کرنے سے ...... معاذ اللہ ...... آدمی خدا بھی بن جائے۔ یہ تو عجیب منطق ہوئی کہ پورے دین کو الٹ ڈالیں۔ اس لیے علما نے فرمایا: ﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ سے مراد زکوۃ ہے۔

تفسیر:

زکوۃ فرض ہے، اس کا انکار کفر ہے اور نہ دینا یا تساہل کرنا فسق ہے۔ اور بعض علماء کے نزدیک ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ عام ہے، اس سے مراد زکوۃ بھی ہے اور صدقۂ فطر، صدقہ واجب، ماں باپ کا خرچ بھی، بیوی بچوں کا خرچ اور مسلمان پر کسی اہم ضرورت میں خرچ کرنا، سب شامل ہے۔

[ابن کثیر:١/ ٤٢، البقرۃ: الآیۃ: وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ]

نیکی کے کاموں میں فضول خرچی نہیں ہوتی:

(واقعہ) حضرت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو اس زمانہ میں ایک لاکھ درہم بھیجے۔ حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے پاس پیسے پہنچے تو آپ نے یوں خیرات کرنا شروع کیے کہ اس کو دے دو، اس کو بھیج دو۔ اور ایک دو دنوں کے اندر وہ سب کے سب ختم ہو گئے۔ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ ہم نے جو ایک لاکھ درہم بھیجے تھے وہ تو ایک دو دن میں ہی ختم ہو گئے تو انہوں نے حضرت کو خط لکھا:

"لَا خَيْرَ فِي الْإِسْرَافِ"

"مال کو لٹانا کوئی بھلائی کی بات نہیں ہوتی کہ آدمی بالکل لٹا دے۔"

حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کو جب خط ملا تو اسی خط پر لکھ دیا:

"لَا إِسْرَافَ فِي الْخَيْرِ وَالسَّلَامِ"

"خیر کے کاموں میں فضول خرچی نہیں ہوتی (فضول خرچی ہوتی ہے برے کاموں میں)۔"

فضول خرچی کا معنی یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ کی معصیت اور نافرمانی میں خرچ کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ...... جو اللہ کے ولی گزرے ہیں...... وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں ایک کروڑ بھی خرچ کرو تو اسراف نہیں ہے اور حرام میں ایک پیسہ بھی خرچ کرو تو اسراف ہے۔

صدقہ خیرات میں اللہ کی رضا جوئی:

اور اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ ہمارے دیے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب خرچ کرتے ہیں تو مقصد صرف میری رضا ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات ذکر کیے:

﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۞ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۞﴾ [الدھر: ۹،۸]

"مسکینوں کو کھلاتے ہیں، یتیموں کو کھلاتے ہیں، قیدیوں کو کھلاتے ہیں اور ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم جو تم کو کھلا رہے ہیں اللہ کی رضا کے لیے ہے اور کوئی مقصد نہیں، کوئی اپنی حمد وثنا نہیں۔"

اسی طرح انفاق کے بارے میں میرے آقا سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک ہے:

((أَنْفِقْ بِلَالًا وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِقْلَالًا.))

بلال خرچ کرو اللہ کے راستہ میں، جو ہمارا عرش والا مالک ہے، اس سے رحمت کی امید رکھو، غم نہ کرو کہ ہم بھوکے مرجائیں گے، غم نہ کرو اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرو۔

[مجمع الزوائد، حدیث: ۶۹۹ ۴، باب: فِي الْإِدِّخَارِ]

اور اسی طرح میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ہر دن جب سورج نکلتا ہے، آسمانوں سے اللہ کے دو فرشتے اترتے ہیں، ان کی ڈیوٹی صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ شام تک دعا کرتے رہتے ہیں، ایک کہتا ہے:

((اَللّٰهُمَّ! أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَيَقُولُ الْآخَرُ: أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا))

"اے اللہ! جو تیرے راستہ میں خرچ کر رہا ہے اس کو اور زیادہ عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے: جو بخل کر رہا ہے اس کا پہلا

مال بھی ہلاک و برباد کر دے (اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا خرچ کرو)۔"

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۴۴۲، باب: قَوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی: فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰی وَاتَّقٰی]

اور اسی طرح قرآن نے فرمایا:

﴿وَمَآ أَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ [سبا:۳۹]

جو تم خرچ کرتے ہو میرے راستہ میں، اللہ کا فیصلہ ہے "فَهُوَ يُخْلِفُهٗ" وہ اس کا بدل دیں گے۔ جب اللہ وعدہ کر لیں کہ بدلہ دیں گے تو کیا اللہ کے وعدے میں کوئی شک ہے؟ ایک بادشاہ کو بھی آپ کوئی ہدیہ پیش کریں تو وہ بھی اچھا بدلہ دے گا، اپنی شان کے مطابق بدلہ دے گا۔ اور جو خزائن السماوات والارض کا مالک ہے، اس کے راستہ میں جب خرچ کریں گے تو وہ بھی اپنی شان کے مطابق بدلہ دے گا۔

اور آقائے نامدار خاتم الانبیاء ﷺ کی طبیعت میں بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے کتنی پیاری حدیث بیان کی! صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا تو فرمایا کہ میرے مدنی ﷺ اتنے سخی تھے کہ خاص طور پر آپ کی سخاوت رمضان کے مہینہ میں دیکھنے کے قابل ہوتی تھی، میرے مدنی ﷺ اتنے سخی تھے جیسے تیز ہوا چلتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تیز ہوا چلتی ہے تو دوست کو اور دشمن کو، اپنے کو اور پرائے کو سب کو لگتی ہے۔ تو میرے مدنی ﷺ کی خیرات بھی اپنا، پرایا، دوست اور دشمن سب کے لیے عام ہوتی تھی۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶، کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ؟]

اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے خادم تھے اور حضور ﷺ کے حکم پر خرچ کرتے تھے۔ ایک دفعہ قرضہ اتنا زیادہ ہو گیا کہ آپ بازار میں جا رہے تھے تو ایک یہودی دکاندار تھا، اس نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا کہ بلال! کیا بات ہے؟ اتنا عرصہ تم مال لیتے رہے ہو اور پیسے نہیں دیتے ہو۔ خبردار! اگر تم نے مجھے کل تک پیسے ادا نہ کیے تو تیرے گلے میں کپڑا ڈال کر مدینہ کے بازار میں تجھے بیچ دوں گا اور میں تمہارا سودا کروں گا اور اپنے پیسے کاٹ لوں گا اور جو تمہیں خریدے گا تم اس کے غلام بن جاؤ گے۔ تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ گھبرائے ہوئے اور ڈرے ہوئے حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! مجھے آج یہودی نے پکڑ لیا، قرضہ ہو گیا ہے اور پیسے نہیں ہیں اور آپ کے خزانے میں بھی نہیں ہیں کہ میں ادا کر دوں، اس لیے میں بڑا پریشان ہوں، وہ مجھے کل بیچ دے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: پھر تم نے کوئی حل سوچا ہے؟ پیسے تو میرے پاس بھی نہیں۔ اس نے کہا کہ حضور!

ایک حل میں نے سوچا ہے کہ آپ اگر اجازت دیں تو میں مدینہ شریف سے بھاگ جاتا ہوں، میں دور کہیں بستی میں چلا جاؤں گا۔ جب اللہ آپ کو پیسے دے دیں، جب آپ قرضہ اتار دیں گے اور مجھے خبر ملے گی تو میں واپس آ جاؤں گا۔ اس وقت تک میں دور رہوں گا، چھپ جاؤں گا وہ مجھے کہاں پکڑے گا؟ حضور ﷺ مسکرا دیے اور فرمایا: ٹھیک ہے، اچھا تم اپنے گھر جاؤ۔

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صبح کا وقت تھا، حضور ﷺ کا خادم پہنچا کہ حضور ﷺ بلا رہے ہیں۔ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: مسجد نبوی کے دروازے پر دو اونٹنیاں مال سے لدی ہوئی بیٹھی ہیں، وہ مال اتار لو اور اس سے قرضہ اتارو۔ جو بچے اس کو خیرات کر دو۔ یہ تھا انفاق فی سبیل اللہ۔

تیس ہزار درہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں آئے اور آپ روزے سے تھیں۔ ایک دن میں آپ نے سارا اللہ کے راستے میں تقسیم کر دیا۔ اور جب افطار کا وقت آیا تو ایک سوکھی روٹی کا ٹکڑا اور ایک پانی کا گلاس تھا۔ تو آپ کی خادمہ نے عرض کیا: یا ام المومنین! اگر ہمیں بھی کوئی دو تین درہم دے دیتیں تو ہمارے گھر میں ایک دن تو اچھا کھانا پک جاتا؟ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم نے یاد ہی نہیں کرایا۔ اگر یاد کراتی تو میں دے دیتی۔ اس لیے فرمایا کہ یہ بھی متقین کی صفت میں سے ہے اللہ کے راستے میں خرچ کرنا۔ فرمایا:

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳﴾ [البقرۃ: ۳]

نفلی صدقات کا ثواب:

یاد رکھو! جو تم خرچ کرتے ہو اس کے دس گنا کا تم سے پکا وعدہ ہے۔ فرمایا:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾

ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں دیں گے اور اللہ تیرے اخلاص کے مطابق راضی ہو جائیں تو "سَبْعَ مِائَةِ ضِعْفٍ" سات سو گنا بھی بڑھا دیں۔ اور اگر حرم میں ہو تو ایک کا لاکھ گنا بڑھا دیں۔ اس لیے حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: حج زیادہ کیا کرو، بار بار عمرے کیا کرو۔ بار بار عمرہ کرنا دو چیزوں کو مٹا دیتا ہے:

1 ......ایک فقر کو اور غریبی کو مٹا دیتا ہے۔ 2 ......اور ایک گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

[مسند أحمد بن حنبل، حدیث: ۱۵۶۹۴]

زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ:

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کا اپنے اہل و عیال کا خرچہ ادا کرنا ہے اس کی حیثیت کے مطابق۔ تو اس آیت میں زکوٰۃ کے نازل ہونے سے پہلے کا حکم ہے۔ جب زکوٰۃ آ گئی تو وہ فرض ہو گئی۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نفقات کا معنی ہے کہ ایسے خیرات کے کام کہ جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کی جائے، یعنی اللہ کے راستہ میں خیرات کرنا، قربانی کرنا، صدقہ کرنا۔ اللہ کا تقرب تلاش کرنا اور اس کے بعد اس میں جد و جہد کرنا، حتیٰ کہ اس کے بعد فرائض کی آیت نازل ہو گئی:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ﴾ [التوبۃ: ۶۰]

جب یہ حکم آیا تو اصل یہی زکوٰۃ کا ہے، باقی سب صدقاتِ نافلہ ہیں، یعنی زکوٰۃ فرض ہے اور اسی طرح اہل و عیال کا خرچہ انسان پر واجب ہے۔ اگر والدین مسکین ہیں تو والدین کا خرچہ اولاد پر شرعاً واجب ہے۔ اور صدقہ فطر جو رمضان کے بعد ادا کرتے ہیں اور اسی طرح صاحبِ نصاب کا قربانی کرنا وہ بھی ضروری ہے۔ تو یہ ساری چیزیں ﴿وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ﴾ میں آ گئیں۔ [ابن کثیر: ۱/۴۲، البقرۃ: الآیۃ: وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ]

آیت میں نفقات سے مراد:

حضرت ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ آیت زکوٰۃ کے حکم کو بھی شامل ہے اور صدقات کے حکم کو بھی شامل ہے، جمیع نفقات کو شامل ہے۔ یہ سب سے زیادہ راجح قول ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے ذمہ لگا دیا ہے کہ وہ فرائض بھی ادا کریں، واجبات بھی ادا کریں اور نفلی صدقات بھی ادا کریں، چاہے زکوٰۃ ہو یا ان لوگوں کا نفقہ جو آدمی کے ذمہ واجب ہے، جیسے بیوی بچوں کا نفقہ، یا بعض رشتہ دار غریب ہیں، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک عام ارشاد فرمایا: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ﴾

[ابن کثیر: ۱/۴۲، البقرۃ: الآیۃ: وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ]

دولت سے بیزاری کا فائدہ:

ایک آدمی نے آ کر حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی خدمت میں اس زمانے کی سونے کی اشرفیاں پیش کیں۔

حضرت نے فرمایا کہ مجھے تو ضرورت نہیں ہے تو اس نے کہا کہ آپ طلباء میں، مسکینوں میں اور مدرسہ میں غریب طلبا میں خرچ کردیں۔ فرمایا کہ یہ سونا ہے، میں اس کو بیچنے جاؤں، پھر اس کے پیسے لے کر آؤں، طلباء پر خرچ کروں تو اللہ نے تمہیں بھی عقل دی ہے اور دماغ دیا ہے، کوئی اندھے نہیں ہو، معذور نہیں ہو، تم خود لاکر طلباء پر خرچ کردو۔ اب وہ بے چارہ خاموش ہوگیا، لیکن تھا وہ بھی پکا اور ضدی مرید تھا۔ جب حضرت نماز پڑھنے کے لیے گئے تو اس نے حضرت کے جوتے کے اندر رکھ دیے۔ حضرت نماز پڑھ کر جب واپس آئے تو شریعت کا حکم ہے کہ جب مسجد سے نکلتا ہو اور جوتا پہننا ہو تو پہلے جوتے کو ہلالو، تاکہ کوئی اس کے اندر کیڑا مکوڑا، کوئی ایذا دینے والی چیز نہ بیٹھی ہو۔ جب حضرت نے سنت کے مطابق اس کو ہلایا تو جناب سونے کی گنیاں (اشرفیاں) باہر آگئیں۔ حضرت مسکرائے اور فرمایا کہ جو لوگ اس کے پیچھے بھاگتے ہیں یہ ملتی نہیں اور جو لوگ ان کو چھوڑ کر اللہ کے بن جاتے ہیں تو جوتوں میں پڑتی ہیں۔

تو فرمایا: بھائی! ان کو اٹھالو، مجھے ضرورت نہیں ہے۔ [ارواحِ ثلاثہ یعنی حکایاتِ اولیاء، ص: ۲۱۰]

اسلام کی بنیاد پانچ چیزیں:

(حدیث) میرے آقا ﷺ نے فرمایا: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزیں ہیں:

- ......سب سے پہلے ''شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ
- ......''وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ'' اور نمازوں کا قائم کرنا،
- ......زکوٰۃ کا ادا کرنا،
- ......اللہ کے گھر کا حج ادا کرنا،
- ......رمضان کا روزہ رکھنا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۸، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ]

اس کے بارے میں بہت ساری احادیث ہیں جو فضیلت نماز میں آئی ہیں۔

اسلام میں اَفراد کا وزن ہے:

نماز...... اسلام اور کفر کا بنیادی فرق ہے۔ اسلام میں چیز کا وزن ہے اور کفر میں عدد ہے۔ کفر میں آدمی گنے جاتے ہیں اور اسلام میں تولے جاتے ہیں۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ ساری دنیا ایک طرف اور حضرت محمد رسول ﷺ ایک طرف، لیکن کافر کہیں گے کہ نہیں! بلکہ سب کا ووٹ برابر ہے، یعنی کافروں کے زمانہ میں کوئی نبی بھی ووٹ

ڈالے تو ایک ووٹ شمار ہوگا، کیونکہ ان کے نزدیک تو ووٹ برابر ہے۔ یہ بڑی عقل والی قوم ہے اور بڑے سمجھدار لوگ ہیں کہ ان کے نزدیک عالم بھی برابر ہے اور جاہل بھی برابر ہے، کافر بھی برابر ہے اور مسلمان بھی برابر ہے، شہید بھی برابر ہے اور مردہ بھی برابر ہے، بہت بڑا لیڈر بھی برابر ہے اور گھٹیا سے گھٹیا آدمی بھی برابر ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ نہیں! وزن کرو کہ اللہ کے نبی ﷺ کے بعد ساری مخلوق میں جو مرتبہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو ملا ہے اور کسی کو نہیں ملا، ان کے بعد عثمان وعلی رضی اللہ عنہما کو جو مرتبہ ملا ہے وہ کسی کو نہیں ملا، ان کے بعد جو مرتبہ عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم کو ملا ہے کسی کو نہیں ملا ہے اور ان کے بعد اصحابِ بدر رضی اللہ عنہم کو جو مرتبہ ملا ہے وہ کسی کو نہیں ملا۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم سونے کا پہاڑ خیرات کرو اور میرا صحابی ایک مٹھی بھر جو خیرات کرے تو تم اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳۶۷۳] سونے کے پہاڑ کو بھی دیکھ لو اور ایک مٹھی بھر جو کو بھی دیکھ لو تو آج کے حساب سے چار آنے بھی نہیں بنیں گے۔ یعنی اگر صحابی چار آنے خیرات کرے اور تم جبل اُحد کے برابر سونا خیرات کرو...... یعنی کھرب ہا ڈالر بن جائیں گے...... اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے، کیونکہ اس میں جو اخلاص کا وزن ہے وہ تیرے اخلاص کا نہیں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴

اور وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے جو (قرآن) آپ کی طرف اترا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے اترا (تورات وغیرہ) اور وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

آسمانی کتابوں پر ایمان:

متقین کی صفات بیان کی جا رہی ہیں ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ [البقرۃ: ۲، ۳] ان کی پہلی صفت تھی ایمان بالغیب، دوسری صفت آئی اقامۃ الصلوۃ اور تیسری صفت تھی الانفاق فی طاعۃ اللہ۔ اب اس آیت میں فرمایا کہ وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو اللہ نے آپ پر اتاری ہے، یعنی قرآن مقدس اور اسی طرح ان کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے جو کتابیں حضور پاک ﷺ سے پہلے انبیاء پر اللہ نے نازل فرمائیں۔ یوں سمجھیں کہ اگر کوئی کتب منزل من اللہ سابقہ کا انکار کرے تو وہ مؤمن نہیں ہوگا، کیونکہ وہ کتابیں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف انبیاء پر مختلف اوقات میں اتاریں۔ ان میں معروف اور مشہور کتابیں: تورات، انجیل، زبور، صحائفِ ابراہیم اور صحفِ موسیٰ ہیں، لیکن کتابیں سابقہ انبیاء پر

بہت زیادہ اتری ہیں، حتیٰ کہ بعض روایات میں ان کی تعداد سینکڑوں میں آئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء پر نازل فرمائیں ہیں، کیونکہ اگر صرف رسولوں کی تعداد دیکھی جائے تو انبیاء کی تعداد تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور ان میں جو رسول ہیں ان کی تعداد تقریباً تین سو تیرہ ہے، یعنی اصحاب بدر کی تعداد کے مطابق ہے۔

جب اتنی تعداد میں رسول اور لاکھ سے زائد انبیاء ہیں تو یہ بات قرین قیاس ہے کہ کتابیں بہت اتاری گئیں، ان میں سے صرف چند مشہور ہیں۔ جیسے قرآن مقدس میں بعض ملائکہ کا نام آیا ہے جو معروف و مشہور ہیں۔ ان کا اللہ نے قرآن پاک میں ذکر فرما دیا ہے۔ اس میں جبرئیل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام، جہنم کے فرشتے مالک اور بادلوں کے فرشتے رعد کا نام آیا اور دیگر ملائکہ کی تعداد تو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ ان کی تعداد کتنی ہے؟ ملائكة السموات ہیں، ملائكة الارض ہیں اور حملة العرش ہیں، اسی طرح ملائكة الرحمة ہیں، ملائكة العذاب ہیں۔ ان کی حقیقی تعداد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

تو بہر حال بعض علماء نے ساڑھے تین سو اور بعض نے ساڑھے چار سو کا بھی قول نقل کیا ہے کہ اتنی کتابیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اتاری ہیں اور وہ تمام کتابیں برحق ہیں۔ جیسے اللہ کے قرآن پر ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ کا کلام بھی ہے اور اللہ کی کتاب بھی ہے، اسی طرح ان سابقہ کتابوں پر جو کتابیں اللہ تعالیٰ نے واقعتاً اپنے انبیاء علیہم السلام پر اتاری ہیں ان پر بھی ہمارا ایمان ہے کہ وہ تمام کتب سماویہ و تمام کتب منزل من اللہ برحق ہیں، اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی ہیں۔ جیسے کہ تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان ضروری ہے۔ اگر ایک آدمی کسی ایک نبی کا بھی انکار کرے تو گویا وہ سارے انبیاء کا انکار کر رہا ہے، اسی طرح کوئی ایک رسول کا انکار کرے تو گویا کہ وہ سارے رسولوں کا انکار کر رہا ہے۔ تو بعینہٖ اسی طرح اگر کوئی آدمی کتب سماویہ منزل من اللہ میں سے ایک کا انکار کرے تو گویا کہ وہ اللہ کے قرآن کا بھی منکر ہے کہ اللہ کا قرآن ان کتابوں کی تصدیق کر رہا ہے۔ اللہ کا قرآن ہی ہمیں خبر دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء علیہم السلام پر بھی کتابیں اتاری ہیں تو اگر کوئی ان کا انکار کرے تو گویا وہ اللہ کے قرآن کا انکار ہوا۔ اسی طرح جب ان انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہمیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے تو اگر کوئی آدمی کسی ایک پیغمبر کا انکار کر دے تو گویا اس نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا، کیونکہ جب خبر دینے والے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ آپ کی خبر سچی ہے تو ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ جیسے ہم تمام انبیاء علیہم السلام پر اجمالاً ایمان لائیں گے کہ تمام اللہ کے نبی برحق ہیں اور اسی طرح تمام سابقہ اللہ کی

اتاری ہوئی کتابیں برحق ہیں، لیکن ہم چونکہ حضور پاک ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے والے ہیں تو ہمارے لیے واجب العمل اور واجب الاتباع شریعت محمد ﷺ کی ہے۔ یعنی ہم موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول اور اللہ کا نبی مانیں گے، تورات کو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب مانیں گے، لیکن تورات کے احکام ہمارے لیے ضروری نہیں ہیں، کیونکہ جب قرآن آ گیا تو ساری شریعتیں ختم ہو گئیں۔ ہاں! یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض احکام ایسے ہیں کو تورات میں بھی موجود تھے اور اللہ نے ان کو حضور ﷺ کے زمانہ میں باقی رکھا جیسا کہ رجم کا معاملہ ہے۔ رجم کا معاملہ تورات میں بھی موجود تھا، یعنی خدا نہ کرے! اگر کسی شادی شدہ مرد اور عورت نے زنا کیا، اس نے اقرار کرلیا، یا چار گواہوں نے دیکھا اور ثابت ہو گیا تو اس کی سزا رجم ہے۔ اور رجم کا معنی یہ ہے کہ ان کو پتھر مار مار کر مار دیا جائے گا۔ تو یہ سزا شریعت محمدی ﷺ میں بھی موجود ہے اور بعینہٖ یہی سزا تورات میں بھی موجود ہے۔

تورات اور قرآن میں مسئلہ رجم کا بیان:

حضور ﷺ کے زمانہ میں یہودیوں کا ایک مقدمہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا۔ اصل میں یہودیوں نے یہ سوچا تھا کہ شاید اسلام میں کوئی گنجائش ہوگی، اسلام میں کچھ نرمی ہوگی، کیونکہ اسلام عالمی دین ہے اور پھر اس کے لانے والے بھی رحمۃ للعالمین ہیں تو شاید اس معاملہ میں ہم یہ کہہ دیں گے کہ فیصلہ تو ہم نے اللہ کے نبی سے کرایا ہے اور ہمیں فائدہ ہو جائے گا۔ حضور ﷺ کے پاس جب وہ مقدمہ آیا تو آپ ﷺ نے پوچھا: تمہارے نبی کی شریعت میں اس معاملے کے بارے میں کیا حکم ہے؟...... تو اب انہوں نے بات کو چھپانے کی کوشش کی، کیونکہ وہ اصل میں چاہتے تھے کہ ہمارے آدمی سزا سے بچ جائیں...... انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں تو ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی سے کوئی ایسا گناہ ہو جائے تو ہم اس کے چہرے پر سیاہی مل لیتے ہیں اور ان کو بازاروں میں پھرا لیتے ہیں اور ان کو کچھ بید تعزیر کے طور پر مار دیے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں۔ حضور ﷺ نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر فرمایا: ''أَعْطُوْنِي الْكِتَابَ'' تم اپنی تورات لے آؤ جو تمہارے پاس موجود ہے۔ وگرنہ اس میں بھی وہ کافی ردّ و بدل کر چکے تھے۔ تو جب تورات کو لے کر آئے اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ فلاں جگہ کھولیں تو جب اس جگہ کو کھولا تو وہ یہودی عمداً اس آیت پر ہاتھ رکھ رہا تھا، تاکہ وہ آیت رجم نظر نہ آئے، لیکن حضور ﷺ کو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ خبر دے چکے تھے اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جو علمائے تورات تھے، جو تورات کے بہت بڑے عالم اور تورات کے بہت بڑے حافظ سمجھے جاتے تھے۔ تو حضور ﷺ نے عبداللہ

بن سلام رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے دکھانے والے کو کہا: ''اِرْفَعْ يَدَكَ'' کہ اپنا ہاتھ اٹھاؤ۔ جب اس نے ہاتھ اٹھایا تو آیت رجم موجود تھی۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۶۸۱۹، بَابُ الرَّجْمِ فِي الْبَلَاطِ]

بہر حال میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ رجم کا حکم تورات میں بھی موجود تھا اور اللہ کے قرآن میں بھی موجود ہے۔ تو ان احکامات پر تو ہم بالکل عمل پیرا ہوں گے، لیکن جن کا ذکر اللہ کے قرآن میں نہیں آیا تو ان پر ہم اجمالاً ایمان لائیں گے کہ اللہ کی کتابیں سب کی سب برحق ہیں، لیکن ہم تابع ہوں گے شریعتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کے کروڑوں صلوۃ وسلام ہوں۔

نسخ احکام پر اعتراض وجواب:

اب بعض مستشرقین یعنی یہودی، نصرانی اور اسی طریقہ سے اعداء اسلام مسلمانوں کو پریشان کرنے کے لیے اور ان کے دل ودماغ میں شکوک وشبہات ڈالنے کے لیے ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ اگر اللہ کی اتاری ہوئی شریعت برحق ہے اور اللہ تعالیٰ ''عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ'' ہیں اور اللہ تعالیٰ ''علام الغیوب'' ہیں تو پھر یہ کیا وجہ ہوئی کہ پہلے ایک شریعت آئی، ایک کتاب آئی، پھر اس کو منسوخ کر دیا گیا۔ پھر اس کے بعد ایک کتاب آئی، اس کے بعد اور کتاب آئی اور اس کے بعد اور کتاب آئی اور احکام بدلتے چلے گئے۔ جو تورات میں تھے وہ انجیل میں نہیں ہیں، جو انجیل میں تھے وہ تورات میں نہیں ہیں اور جو زبور داؤد میں تھے وہ ان دونوں کتابوں میں نہیں ہیں۔ تو اس تغیر اور تبدل کی کیا ضرورت تھی؟ اگر تبدل اور تغیر کی ضرورت تھی تو...... نعوذ باللہ...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کو کچھ چیزیں بھول گئیں کہ پہلے یہ نازل نہیں کیا، بعد میں اس کو نازل کیا، یا...... نعوذ باللہ...... آپ کے خدا سے غلطی ہوگئی۔ پہلے اس کو پتہ نہیں تھا کہ یہ آرڈر کب تک چلے گا اور کچھ عرصہ کے بعد یہ ناقابل عمل ہوگا کہ اس کو تبدیل کرنا پڑا۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ جب اللہ ایک ہے اوّل سے آخر تک تو یہ ساری دنیا کی ہدایت کا ذریعہ بن جاتا تو بار بار کتابوں کا تبدیل کرنا اور بار بار احکام کا تبدیل کرنا یہ عجیب بات ہے۔

(جواب) یہ محض اعتراضات ہوتے ہیں اور یہ صرف مسلمانوں کے دل ودماغ میں شکوک ڈالنے کے لیے ہے اور ان سے خاص طور پر وہ نوجوان زیادہ متاثر ہوتے ہیں جو ابتداء میں سکولوں میں پڑھتے ہیں اور بعد میں کالجوں میں پڑھتے ہیں اور پھر یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں۔ اور ان میں جو پیسے والے لوگ ہیں باہر کے ملکوں کی کفار کی یونیورسٹیوں میں جا کر تعلیم حاصل کرتے ہیں تو ایسی باتیں سن کر وہ گھبرا جاتے ہیں، حالانکہ یہ بات یاد رکھیں کہ نسخ کا

یہ معنی نہیں ہوتا کہ پہلا حکم غلط ہو۔ نسخ کا مطلقاً معنی تبدیلی حکم ہے، یعنی پہلے ایک حکم تھا، اب اس حکم کو تبدیل کر کے دوسرا حکم دے دیا گیا۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہوتی ہے کہ جیسے جیسے نشوونما ہوگی اسی طرح اس میں تبدیلی عین فطرت ہوتی ہے۔ مثلاً: ایک بچہ پیدا ہوا، اس کی غذا دودھ ہوتی ہے اور جیسے جیسے وہ بڑا ہوگا تو اس کی غذا میں تبدیلی آئے گی، پھر جب دو سال کا ہو جائے گا تو پھر اور تبدیلی آ جائے گی، پھر جب شباب پر پہنچ جائے گا تو اور تبدیلی آئے گی اور پھر جب بڑھاپا شروع ہوگا تو غذا تبدیل ہونا شروع ہو جائے گی۔ تو اب دنیا کا کوئی عقلمند انسان یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد جو ہمیں غذا ملی ہے ساری زندگی وہی غذا دی جاتی، تبدیل کیوں ہو گئی؟ تو یہ ایک جہالت والی بات ہے۔ جیسے ایک بچے کی نشوونما ہوتی گئی اور تقاضے بڑھتے گئے اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں اس کے لیے تبدیل فرماتے گئے۔

بعینہٖ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک مرض کے لیے ایک ڈاکٹر دوائی تجویز کرتا ہے۔ پہلے اس کو تسہیل دیتا ہے، پھر اس کو ایسی دوائیاں دیتا ہے کہ جس سے معدہ میں تقویت آئے اور اس کا نظامِ ہضم مضبوط ہو جائے۔ تو اب اگر کوئی اعتراض کرے کہ ڈاکٹر نے پہلا نسخہ بدل ڈالا تو کیا ڈاکٹر پاگل تھا؟ دراصل اعتراض کرنے والا پاگل ہوگا، کیونکہ جیسے جیسے بیمار کی طبیعت بدلتی گئی ویسے ویسے نسخے تبدیل ہوتے گئے۔ یہ نہیں تھا کہ پہلا نسخہ ہی غلط تھا۔ وہ اپنی جگہ ٹھیک تھا، لیکن جب طبیعت کے اندر تغیر اور تبدل آ گیا تو اب اس کے تقاضے کے مطابق اس نسخہ میں تبدیلی کر دی گئی۔ اب حضرت آدم علیہ السلام کے بعد جب پہلی پہلی شریعت آئی تو حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت کا زمانہ تھا۔ تو اس زمانہ میں اس وقت کی ضروریات اور اس وقت کے تقاضے اور اس وقت کے حالات مختلف تھے اور حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں اور تھے۔ (حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے آئے ہیں) اسی طرح آہستہ آہستہ چلتے آئیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تقاضے اور تھے، پھر عیسیٰ کے زمانہ میں تقاضے اور تھے۔ پھر میرے آقا ﷺ کا زمانہ آیا تو اس میں حالات اور تغیر پر آ گئے۔ تو جیسے جیسے انسانوں کی بہتری تھی، بندوں کی بھلائی تھی، اسی طرح اللہ نے اپنے احکامات جاری فرما دیے۔ دیکھیں کہ جو آپ کے والدین میں قوت تھی وہ آپ میں نہیں، ان کے والدین میں جو قوت، تحمل اور برداشت تھی وہ آپ کے والدین میں نہیں ہے اور اب جو آپ کے اندر ہے وہ آپ کی اولاد میں نہیں ہے۔ اور آگے جو اولادیں آئیں گی اور کمزور تر آئیں گی۔ اس لیے اللہ کے تمام کے تمام احکام برحق اور صحیح ہیں، حالات اور اپنے اپنے وقت کے مطابق ان کی ضرورت تھی اور وہ بالکل صحیح تھے اور منطبق تھے۔ جیسے جیسے

بندوں میں تغیر آتے گئے ان کے مطابق اللہ نے اپنی رحمت سے اپنے احکامات میں تبدیلی فرمائی۔

باقی رہا کہ ایک کتاب ہوتی تو اس کو بھی سمجھ لیں کہ ایک قسم کے مسائل وہ ہوتے ہیں جن کو اصولی مسائل کہا جاتا ہے اور ایک قسم کے مسائل وہ ہوتے ہیں جن کو فروعی مسائل کہا جاتا ہے۔ اصول کے جتنے مسائل ہیں وہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک ان میں کوئی فرق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو مسئلہ توحید کا حکم حضرت آدم علیہ السلام کو دیا وہی حکم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی دیا۔ اب حضور ﷺ کو بھی حکم ہے کہ اللہ سے مانگیں، اللہ ہی دینے والے ہیں اور اللہ ہی مغفرت فرمانے والے ہیں اور یہی حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [الاعراف: ۲۳]، یہی نوح نے کہا: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ﴾ اور یہ دعا میرے مدنی مصطفیٰ ﷺ نے مانگی۔

اسی سے آپ اندازہ لگائیں کہ جو اصول دین کے مسائل ہیں مثلاً: توحید کا مسئلہ ہے، نبوت اور رسالت کا مسئلہ ہے اور اسی طرح آخرت کا مسئلہ ہے، ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں، ان میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں، ان میں کسی قسم کا کوئی تعارض نہیں ہے۔ البتہ جو فروعی مسائل ہیں ان میں جیسا کہ میں نے ابھی مثال دے کر عرض کیا تھا کہ وہ عین فطرت کے مطابق ہیں، عین حالات کے مطابق ہیں، جو حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے بتائے، جو حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ نے بتلائے اور جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بتائے۔

جیسے آپ نے قرآن مقدس میں پڑھا ہے کہ جب جنوں نے میرے آقا ﷺ کی زبان مبارک سے اللہ کا کلام مبارک سنا تھا، جس کے بارے میں قرآن مقدس میں پورا واقعہ موجود ہے کہ کوئی جنوں کی جماعت گزری اور حضور ﷺ تلاوت فرما رہے تھے۔ انہوں نے سنا تو کہا:

﴿يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى﴾ [الاحقاف: ۳۰]

''اے ہماری قوم! ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے جو پہلے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے سنی تھی۔''

اور آج محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے سنی ہے، ان کو سمجھ آ گئی، حالانکہ وہ جن تھے، وہ انسانوں سے زیادہ عقل نہیں رکھتے، کیونکہ اشرف المخلوقات انسان ہے۔ انسان کو اللہ نے بہت بڑی عقل عطا فرمائی جنات تو ان کے تابع ہوتے ہیں، لیکن ان جنات نے قرآن سننے کے بعد فوراً یہ اندازہ لگا لیا کہ یہ اسی طرح کا کلام ہے جو موسیٰ علیہ السلام سنایا کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے فوراً کہا:

﴿يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝﴾

[الاحقاف:۳۰،۳۱]

جنات کو بھی سمجھ آ گئی کہ یہ وہی بات ہے جو موسیٰ علیہ السلام نے بتائی تھی۔

اسی سے آپ اندازہ لگائیں کہ سب سے پہلی وحی جو ہمارے آقا ﷺ پر اتری اور حضور ﷺ نے جا کر ورقہ بن نوفل کو بتایا کہ ایسے ایسے واقعہ ہوا۔ ایک خوبصورت چہرے والا آدمی آیا اور اس نے غار میں آ کر مجھے حکم دیا کہ پڑھو:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝﴾ [العلق:۱]

جب ورقہ بن نوفل نے سنا تو فوراً پہنچ گیا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترا کرتا تھا۔ اب دیکھیں کہ ورقہ بن نوفل کو کسی نے جا کر پٹی نہیں پڑھائی تھی اور جنات کو کسی نے جا کر پٹی نہیں پڑھائی تھی کہ تم تصدیق کرو، لیکن انہوں نے حالات کو دیکھ کر اور ان آیات کو سن کر، احکامات پر نظر ڈال کر فوراً اندازہ لگا لیا کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اسی طرح فرشتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی اترا کرتا تھا۔

تو اس لیے یہ کہنا کہ کتاب ایک ہونی چاہیے تو یہ بات غلط ہے۔ اصلاً کتاب ایک ہے، اس میں تمام احکام اصولیہ ایک ہی ہیں۔ اگر اس میں کوئی تغیر اور تبدل آیا ہے تو وہ صرف اتنا ہے جو فروعی مسائل اور فروعی احکامات میں آیا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں پر یہ ذمہ داری رکھی ہے کہ وہ تمام انبیاء علیہم السلام پر بھی ایمان لے آئیں اور تمام انبیاء علیہم السلام پر جو اللہ نے کتابیں نازل فرمائیں ہیں ان پر بھی ایمان لے آئیں۔

اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ اسلام کتنا وسیع مذہب ہے کہ سب کو ماننے کا حکم دے رہا ہے کہ قرآن تمام انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کر رہا ہے اور اللہ کا قرآن تمام کتب کی تصدیق کر رہا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ اختلاف کی بات تو تب ہو جب اللہ کا قرآن تردید کر رہا ہو۔ تو تمام کتب ساویہ تمام کتب منزل من اللہ کی تصدیق کرتا ہے۔

کتاب اللہ اور کلام اللہ میں فرق:

اور اسی سے یہ اندازہ بھی فرما لیں کہ جتنی کتابیں اتری ہیں ان میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اللہ کی کتب ہیں، لیکن ان کو کلام اللہ کا درجہ نہیں ملا۔ وہ سب کتاب اللہ تھیں، لیکن کلام اللہ نہیں تھیں۔ کلام اللہ کا کیا معنی ہے......؟ ایک ہے متکلم کلام کرے اور ایک ہے کہ آپ کو کتاب بھیجے۔ جیسے آپ یہ کہیں کہ آج فلاں آدمی نے مجھے یہ کہا ہے کہ آپ پوچھیں

کہ آپ سے ملاقات ہوئی ہے؟ تو آپ کہیں کہ ملاقات نہیں ہوئی، لیکن اس نے خط میں مجھے یہ کہا ہے۔ تو خط میں لکھنا گو اس کا کلام ہے، لیکن اس کو کتاب کہا جاتا ہے، کلام نہیں کہا جاتا۔ تو موسیٰ علیہ السلام کو تورات ملی تو ان کو پوری کی پوری کتاب الواح پر لکھی ہوئی اللہ نے عطا فرمائی تو وہ کتاب اللہ تو بن گئی، لیکن تورات پڑھ کر موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے نہیں سنائی، اس لیے وہ کلام اللہ نہیں کہلا سکتی۔ اسی طرح انجیل ہے، اسی طرح زبور ہے اور اسی طرح صحائف ہیں اور سابقہ کتابیں ہیں۔ ان سب کو کتاب اللہ ہونے کا شرف تو حاصل ہے، لیکن اللہ کا کلام ہونے کا مقام ان کو نہیں ملا۔ یہ صرف قرآن مقدس کو حاصل ہے کہ یہ کتاب اللہ بھی ہے اور کلام اللہ بھی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پورا قرآن جبرئیل علیہ السلام اور جبرئیل علیہ السلام نے اللہ کے حکم کے مطابق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑھا ہے۔ تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب کا اعزاز ہے کہ اللہ نے خود کلام فرمایا، پھر جبرئیل علیہ السلام نے آ کر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس باقاعدہ ایک ایک آیت پڑھی، اللہ نے آپ کے سینہ مبارک میں اس کو جما دیا۔ یہ شرف صرف قرآن کو ملا، تورات و انجیل کو نہیں ملا۔

''نَزَّلْنَا'' اور ''اَنْزَلْنَا'' میں فرق:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ [البقرۃ:۴]

اور ایک لفظ آپ نے قرآن میں بار بار پڑھا ہے کہ کہیں تو آتا ہے: ﴿اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ اور کہیں آتا ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾ [النساء:۱۷۴] اور کہیں آیا: ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [الاعراف:۱۵۷] یعنی ''اَنْزَلَ یُنْزِلُ'' کے باب میں۔

اور کہیں قرآن میں آیا ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [الحجر:۹] اور کہیں آیا: ﴿اَنْزَلْنَا﴾ اور کہیں آیا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ [القدر:۱] تو یہاں بھی ﴿اَنْزَلْنَا﴾ ہے۔ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ [البقرۃ:۱۸۵] اور اس میں آیا: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ [البقرۃ:۴]۔

تو معنی ہوتا ہے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا، کیونکہ علوم وقواعد کے اندر یہ قاعدہ ہے کہ ''کُلَّمَا زَادَ فِي الْبِنَاءِ زَادَ فِي الْمَعْنٰى'' جتنی چیز بناء میں زیادہ ہوگی تو معنی میں زیادہ ہو جائے گی۔ یعنی ایک دفعہ اس کے اوپر زبر ہے اور ایک دفعہ اس کے اوپر شد لگ گئی ہے، جیسے ایک ''قَتَلَ'' اور ایک ''قَتَّلَ''۔ تو ''اَنْزَلْنَا'' کا معنی یہ ہے کہ پورا پورا قرآن

اتار دیا جائے اور ''نَزَّلْنَا'' کا معنی ہے کہ تھوڑا تھوڑا قرآن اتارا جائے۔ تو یہ دونوں باتیں قرآن میں موجود ہیں:

❁......اللہ نے لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر ایک دفعہ پورا قرآن اتار دیا اور بیت العزت میں آ کر محفوظ کر دیا۔

❁......اور پھر بیت العزت سے تیس سال کے اندر تھوڑا تھوڑا حضور پاک ﷺ پر اترتا رہا۔

مسئلہ ختم نبوت کا ثبوت:

اور اسی آیت مبارکہ سے ختم نبوت کا مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اللہ نے فرمایا: ﴿بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾ (جو اتارا ہم نے آپ کی طرف اور جو اتارا ہم نے آپ سے پہلے۔) اگر آپ کے بعد کوئی نبی ہوتا تو یہ بھی ہوتا کہ آپ کے بعد جو اتارا۔ جب بعد کا ذکر نہیں ہے اور صرف دو چیزوں کا ذکر ہے: جو ہم نے کتاب آپ پر اتاری یا آپ سے پہلے اتاری۔ آپ کے بعد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا یہ مسئلہ بھی ہمیں سمجھ آ گیا کہ حضور ﷺ خاتم الانبیا ہیں، اس لیے ''لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ لَا مَعْصُوْمَ بَعْدَهُ وَلَا رَسُوْلَ بَعْدَهُ وَلَا شَرِيْعَةَ بَعْدَ شَرِيْعَتِهِ وَلَا كِتَابَ بَعْدَ كِتَابِهِ'' یہ اللہ کا حکم ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بعد میں دعویٰ کرے کہ...... نعوذ باللہ!...... میں بھی نبی ہوں اور مجھ پر بھی فرشتہ اترتا ہے، جیسا کہ مسیلمۃ الکذاب نے دعویٰ کیا، اسود عنسی نے دعویٰ کیا، اسی طرح مسیلمہ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی نے دعویٰ کیا کہ مجھ پر بھی وحی آتی ہے، مجھ پر بھی فرشتہ اترتا ہے اور پھر اس نے فرشتوں کے نام بھی عجیب رکھ دیے۔ کہتا ہے کہ ایک ٹیچی فرشتہ ہے، وہ مجھ پر اترا کرتا ہے۔ تو بہر حال یہ جھوٹا دعویٰ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اتارنے کے بعد کسی کتاب کے اتارنے کا ذکر ہی نہیں کیا، بلکہ یہ فرما دیا ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۗ﴾ [الاحزاب: ۴۰]

تو اس لیے یہاں بھی ارشاد ہوا:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾ [البقرة: ۴]

اور ایمان کے بارے میں پڑھ چکے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی فرما دیا:

''يُصَدِّقُوْنَ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ''

''ایمان لاتے ہیں یعنی تصدیق کرتے ہیں جو اتارا ہم نے آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے بھی۔''

[ابن کثیر: ۱/ ۴۳، البقرة، الآية: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ]

تفسیر:

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ [البقرۃ:۴]

''اور وہ آخرت پر یقین کرنے والے ہیں۔''

تو اب اس کے اندر ایک بات قابل غور ہے کہ ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا تذکرہ گزر چکا ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ [البقرۃ:۳]

جس میں ایمان بالغیب، اقامہ صلوۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر تھا، اس آیت سے بھی وہی مراد ہیں۔ وہ ایمان لاتے ہیں جو ہم نے اتارا آپ کی طرف۔ یا اس سے مراد کوئی اور لوگ ہیں، اس کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد کے مفسرین کرام رحمہم اللہ کے کچھ اقوال منقول ہیں۔ جو صفتیں ہم نے پہلے پڑھی ہیں یہ بھی انہی کی صفتیں ہیں اور اس کو کہا جاتا ہے عَطْفُ الصِّفَاتِ عَلَى الصِّفَاتِ۔ جیسے ایک آدمی کے بارے میں کہیں کہ فلاں شخص نمازی بھی ہے، روزہ دار بھی ہے، حاجی بھی ہے، زکوۃ ادا کرنے والا بھی ہے، غریبوں پر بھی رحم کرتا ہے اور بڑے خلق والا ہے۔ تو اب یہ ساری اسی کی صفتیں ذکر کی جارہی ہیں۔ صفتوں کا عطف صفتوں پر آرہا ہے۔

1 ...... تو ایک قول تو یہی ہے کہ وہی لوگ مراد ہیں جو غیب پر ایمان لانے والے ہیں، نماز قائم کرنے والے ہیں، اللہ کے راستے میں خرچ کرنے والے اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اتارا گیا اس پر ایمان لانے والے ہیں، جو آپ سے پہلے کتابیں اتاری گئیں ان کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

2 ...... اس بارے میں دو قول اور ہیں کہ پہلے میں خطاب اہل عرب کو تھا اور دوسرے سے مراد اہل کتاب ہیں۔

کیونکہ ہم لوگ تو پہلی کتابوں کو اجمالی طور پر مانیں گے تو گویا دونوں شریعتوں پر عمل کیا، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو لوگ غلط عقیدے پر تھے ان کا تو ذکر ہی نہیں ہے، جو صحیح معنوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانتے تھے، انجیل کو اللہ کی کتاب مانتے تھے اور انجیل پر عمل کرتے تھے، انہوں نے گویا انجیل پر بھی عمل کیا اور قرآن پاک پر بھی عمل کیا، کئی نصرانی اسلام لے لائے۔ اسی طرح یہود میں جو لوگ صحیح معنوں میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، ان کی کتاب تورات پر ایمان رکھتے تھے اور پھر جب ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ملا تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہ وہ پہلے تورات کے عالم تھے، پھر قرآن کے بھی عالم بن گئے۔

اس لیے قرآن نے دوسری جگہ فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ﴾ [القصص: ۵۴]

''ان کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ ثواب عطا فرما دیں گے۔''

یعنی ایک پہلے نبی پر ایمان لانے اور اس کی کتاب پر عمل کرنے کا اور ایک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور اس کی کتاب پر عمل کرنے کا۔

3 ...... علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: پہلے بھی مومنون العرب ہیں اور آخر میں بھی مومنون العرب ہیں اور یہ عطف الصفات علی الصفات ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

ان آیات سے یہ معلوم ہوا کہ جیسے اللہ تعالیٰ کے قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طریقہ سے سابقہ کتب منزل من اللہ پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔

تورات وانجیل اب محرف ہو چکی ہیں:

لیکن ان پر ہم ایمان اس طرح لائیں گے کہ جو کتاب اللہ نے اتاری تھی بس اس پر ہمارا ایمان ہے، اب تو وہ تبدیل ہو گئی ہیں۔ دنیا میں چار انجیل موجود ہیں، اسی طرح تورات کے اندر ردو بدل ہو گیا، یعنی اس کے الفاظ بھی بدل ڈالے گئے اور اس کے معانی بھی بدل ڈالے گئے۔ ہمارا ایمان صرف ان پر ہو گا جو اللہ نے اتاری تھیں۔

ایک شبہ کا ازالہ:

اسی طرح بعض لوگ فریب دیتے ہیں کہ جب ﴿وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ﴾ پر ایمان ضروری ہے تو پھر تو یہودی و نصرانی بھی جنت میں جائیں گے، کیونکہ ﴿وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ﴾ پر ان کا ایمان موجود ہے۔ یہ ایک فریب ہے، کیونکہ ﴿وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ﴾ اس سے پہلے ﴿بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ﴾ ہے۔ جب وہ حضور ﷺ پر اتری ہوئی کتاب پر ایمان نہیں لائے تو گویا کہ وہ اپنی کتاب پر بھی ایمان نہیں لائے، اس لیے کہ اگر ان کا تورات وانجیل پر ایمان ہوتا تو اسی تورات وانجیل کے اندر لکھا ہوا ہے کہ ایک نبی ہوں گے جن کا نام محمد (ﷺ) ہو گا۔

اس میں تو لکھا ہوا ہے ''مَوْلُودٌ بِمَكَّةَ'' مکہ میں پیدا ہوں گے، مدینہ کی طرف ہجرت فرمائیں گے، صدقہ کا مال نہیں کھائیں گے، ہدیہ قبول فرمائیں گے، آپ اپنی موٹی پنڈلی پر چادر باندھیں گے، آپ وضو فرمانے والے ہوں

گے اور آپ اوقات صلوۃ کا بڑا خیال رکھنے والے ہوں گے۔ تو یہ ساری نشانیاں موجود ہیں اور پھر قرآن نے باقاعدہ اس بات کی تصدیق کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سارے انبیاء علیہم السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان کرتے آئے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری بعثت کے بعد جو مجھ پر ایمان نہیں لائے گا...... چاہے وہ یہودی ہے، یا نصرانی ہے...... وہ کفر پر مرے گا، اس کا خاتمہ کفر پر ہوگا۔ وہ اس وقت تک مؤمن نہیں کہلائے گا جب تک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ نہیں پڑھے گا۔

ایک نحوی نکتہ:

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۴] "يُؤْمِنُ" میں جملہ فعلیہ آ گیا ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ [البقرۃ: ۴]۔ جملہ فعلیہ تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے اور جملہ اسمیہ استمرار اور دوام پر دلالت کرتا ہے تو ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ کا معنی ہوگا کہ جو بھی اللہ کا قرآن اترا وہ ایمان لائے، پھر اترا ایمان لائے، پھر اترا پھر ایمان لائے، یعنی جب تک آیات نازل ہوتی گئیں ایمان لاتے گئے، تصدیق کرتے گئے۔ اور آخرت پر ایسا یقین ہے کہ یہ نہیں کہ ہوا اور مٹ جائے، بلکہ دائمی اور استمرار ہے کہ آخرت پر ان کا ایمان، آخرت پر ان کا یقین کامل بھی ہے اور دائمی بھی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کبھی کبھی تو مانیں اور کبھی کبھی نہ مانیں، متذبذب ہو جائیں، یا شبہات میں پڑ جائیں۔ اس لیے فرمایا: ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۴]

صرف ماننے والے اور مان کر عمل کرنے والے برابر نہیں ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صرف آخرت کا مان لینا کافی نہیں ہے، اس لیے کہ جو شخص ہر وقت آخرت کی تیاری میں لگا ہوا ہے، عبادت و اعمال کی پابندی کرتا ہے اور گناہوں سے بچتا ہے اس کو آخرت پر یقین ہے، اس کو پتہ ہے کہ دنیا میری عارضی منزل ہے۔ اس لیے اگر دنیا میں کبھی گناہ ہو جاتا ہے تو فوراً توبہ استغفار کرتا ہے۔ اور جو شخص گناہوں کی پرواہ نہیں کرتا اور عبادات کو عمل میں نہیں لاتا اس کا آخرت پر یقین نہیں ہے۔ اگر یقین ہوتا تو وہ اس طرح آخرت، قبر و حشر کے عذاب سے غافل نہ ہوتا۔

آپ نے فرمایا کہ کیا باتیں کرتے ہو؟ اللہ کے فرشتے نے صور پر منہ رکھا ہوا ہے اور نظریں اٹھائی ہوئی ہیں کہ کب حکم ہوتا ہے اور پھونک ماروں۔ تو میں کپڑے پہننے میں کیوں اپنا وقت ضائع کروں۔ تو یہ اب عین الیقین والی

بات ہے، گویا حضور ﷺ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اس مرتبہ کو یقین پہنچ گیا ہے، فرشتہ تو پھونک مارنے کے لیے تیار کھڑا ہے اور تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔

﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾

''یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔''

اس آیت مبارکہ میں ''أُولَٰئِكَ'' کا تعلق سابقہ آیات مبارکہ سے ہے۔ سورۃ البقرۃ کی ابتداء میں گزر رہا تھا ﴿ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ [البقرۃ:۲] کہ یہ کتاب ہے جو اللہ نے اتاری ہے حضور ﷺ پر یعنی قرآن مقدس اس میں کوئی ریب کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ لیکن ہدایت ان کو ہوتی ہے جو ڈرنے والے ہیں۔ پھر ان ڈرنے والوں کی صفات ذکر کی گئی ہیں۔

جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں اب ان کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ''أُولَٰئِكَ'' یعنی ''اَلْمُتَّصِفُوْنَ بِهٰذِهِ الصِّفَاتِ الْمَذْكُوْرَةِ بِالْاٰيَاتِ الْمَذْكُوْرَةِ'' جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں وہی لوگ ہدایت پر ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (البقرۃ:۵)

اور جن کی صفتیں آپ پڑھ چکیں ہیں یہی لوگ جو فلاح پانے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کو دنیا اور آخرت کی فلاح ملنے والی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنی مخلوقات پیدا فرمائی ہیں ان میں سے جو اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار ہیں، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں ان کے لیے فلاح ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے انکار کیا، اللہ کے پیغمبروں کی تکذیب کی اور اللہ کے احکامات سے روگردانی کی ان کے لیے حرمان ہے، خسران ہے ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ﴾ وہ دنیا میں بھی نقصان میں رہے اور آخرت میں بھی نقصان میں رہیں گے۔

یہاں اللہ نے دو دفعہ ''أُولَٰئِكَ'' فرمایا، اس لیے ہدایت پر بھی وہی ہیں۔ کافروں کے بارے میں ایک جگہ آیا ہے:

﴿أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾ (الاعراف:۱۷۹)

تو غفلت اور ان کو جو انعام کے ساتھ تشبیہ دی گئی وہ ایک چیز ہے اور یہاں عطف کے ساتھ لایا گیا تو یہاں یہ واضح کیا گیا کہ ہدایت علیحدہ مرتبہ ہے اور اس کے بعد جو اس پر نتیجہ مرتب ہو رہا ہے وہ علیحدہ مرتب ہے۔ اور مفسرین کے نزدیک مکرر اس لیے لایا گیا کہ انہی کے اندر اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور فلاح کو بند کر دیا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ علیٰ استعلاء کے لیے ہوتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے ''فُلَانٌ عَلَى الْحَقِّ...... فُلَانٌ عَلٰی

الْبَاطِلِ ''تو علی استعلاء کے لیے ہے۔تو جو لوگ ان صفات کے ساتھ موصوف ہیں گویا کہ وہ ہدایت کے اوپر مستعلی ہو چکے ہیں۔ایک ہوتا ہے کہ ہدایت ان پر ہو اور ایک ہے کہ انسان خود ہدایت پر مستعلی ہو جائے،اس لیے قرآن مقدس کی آیات میں اگر دیکھا جائے تو مراتب ہیں:

- ...... پہلا مرتبہ انابت کا آتا ہے ﴿وَأَنِيبُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ﴾ (الزمر:۵۴)۔
- ......اس کے بعد ہدایت کا مرتبہ آتا ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ جس کو چاہتے ہیں ہدایت نصیب فرما دیتے ہیں۔
- ......اور ہدایت کے بعد استقامت کا مرتبہ ہے کہ ہدایت بھی نصیب ہو جائے اور پھر آدمی اس پر جما رہے،اس پر مستقیم ہو اور پھر متزلزل نہ ہو،اس کے اقدام میں کوئی لغزش نہ آئے تو وہ استقامت کا مرتبہ ہے۔
- ......اور بعض علماء نے فرمایا کہ اس سے بھی ایک اعلیٰ مرتبہ ہے کہ ﴿وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾ (الکہف:۱۴) کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں پر اپنی قدرت کاملہ سے جیسے اس کی شان کو زیبا ہے اس کو مضبوط کر دیتے ہیں اور اس کو تھام لیتے ہیں کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کے دلوں کو تھام لیں تو پھر وہاں کسی قسم کا خدشہ باقی نہیں رہتا۔

تو اس لیے فرمایا کہ جن لوگوں کی یہ صفات ہیں گویا کہ وہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور ''هُدًى'' کا معنیٰ ''هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ'' میں گزر چکا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ کے تفسیری علوم:

علامہ سندھی رحمہ اللہ نے جب ہجرت کے زمانہ میں حرم مکہ میں پناہ لی ہوئی تھی اور آپ مکہ شریف میں رہتے تھے اور تقریباً بیس سال کی مدت یا اس سے کم یا زیادہ یہاں گزاری تو پہاڑ پر آپ نے ایک چھوٹا سا گھر لیا ہوا تھا اور اسی میں رہتے تھے۔اور اتنا بڑا عالم،اللہ نے جس کو قرآن کا اور حدیث کا بڑا علم عطا فرمایا تھا کہ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں،یعنی ان کو تفسیرِ قرآن سے بڑا تعلق تھا۔والد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس وقت ہماری جوانی تھی اور صحت تھی اور والد صاحب خود بھی مدرس تھے۔فرماتے ہیں کہ سورۃ التحریم سے لے کر آخر قرآن تک ہم نے ان سے تفسیر پڑھی ہے۔جب ان کے پاس پڑھنے کے لیے جاتے تھے تو تمام تفسیریں جو اس وقت میسر آتی تھیں ان کا ہم مطالعہ کرتے تھے کہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت پر یہ لکھا ہے،ابن جریر رحمہ اللہ نے اس پر یہ لکھا ہے،قرطبی رحمہ اللہ نے اس پر یہ لکھا ہے،معالم التنزیل میں اس پر یہ لکھا ہے،جلالین رحمہ اللہ نے اس پر یہ لکھا ہے اور بیضاوی رحمہ اللہ نے اس پر یہ لکھا ہے۔تو تمام تفاسیر کو دیکھنے کے بعد ہم حضرت کے پاس تیار ہو کر پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔تو جب

حضرت تفسیر شروع کرتے تو معلوم یہ ہوتا تھا کہ ان تمام تفاسیر کے علاوہ اللہ نے ان کو علم عطا فرمایا ہے کہ ہمیں وہ بات کسی کتاب میں میسر ہی نہیں آتی تھی، کسی تفسیر میں ہمیں وہ بات ملتی ہی نہیں تھی جو حضرت ہمیں سبق میں پڑھاتے تھے، ایسے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی الہامی تقریر ہے۔ حضرت بیٹھے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے دل ودماغ میں کوئی بات ڈال رہے ہیں اور وہ بیان کر رہے ہیں، کیونکہ وہ بات تو تفسیروں میں ملتی ہی نہیں تھی۔ فرماتے تھے کہ میں نے ایک دن جرأت کر کے کہہ دیا کہ حضرت! آپ پہاڑ پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ہم دو چار آدمی آپ کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں، اگر آپ اللہ کے حرم میں مسجد الحرام میں درس دینا شروع کر دیں تو ہزاروں لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ اب پہاڑ پر چڑھ کر کون پڑھنے کے لیے آئے گا؟ کوئی ایک دو یا تین یا چار آئیں گے جن کو تفسیر پڑھنے کا شوق ہے۔ اگر آپ حرم میں ہوں گے، درس ہوگا، ہزاروں آدمی سنیں گے اور سینکڑوں طلبہ استفادہ کریں گے اور آپ کے علوم سے فائدہ اٹھائیں گے۔ تو فرماتے ہیں کہ حضرت غصہ میں آگئے اور فرمانے لگے: تم عجیب بات کرتے ہو!! اب تو پڑھنے والے بھی مرگئے اور پڑھانے والے بھی مرگئے۔ ہم نے تو اپنی زندگی گزارنے کے لیے بس یہاں پناہ لی ہوئی ہے، اللہ کے دروازے پر پڑے ہوئے ہیں اور زندگی کے دن ہیں جو ہم پورے کر رہے ہیں۔ کیا انہی لوگوں کو پڑھاؤں جو صبح کو پڑھتے ہیں اور شام کو منافقت کرتے ہیں؟ میں ان لوگوں کے پڑھانے کے لیے باقی رہ گیا ہوں؟

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی سیاسی تدابیر:

فرمایا: ہم ابھی طالب علم تھے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ نے حکم فرما دیا کہ تم نے فلاں ملک میں جانا ہے۔ اس کے بعد ہمیں ادب سے ڈر کر یہ پوچھنے کی جرات ہی نہیں ہوئی کہ حضرت کیوں جانا ہے؟ مجھے جو حکم مل رہا ہے کہ آپ فلاں ملک چلے جائیں، نہ ہوائی جہاز ہے اور نہ بحری جہاز ہے اور نہ ریل گاڑیاں ہیں اور نہ ٹکٹیں ہیں، پیدل جانا پڑے گا، کوئی کرایہ بھی ملے گا یا نہیں ملے گا۔ اور پھر جائیں گے تو کیوں جائیں گے؟ میں وہاں کیا کروں گا؟ فرماتے تھے کہ اساتذہ کا اتنا ادب تھا کہ جب شیخ نے حکم دے دیا کہ تم نے جانا ہے تو بس جانا ہے۔ یہ ہمیں پوچھنے کی جرات ہی نہیں ہوئی کہ ہم نے کیوں جانا ہے؟ حضرت! وہاں جانے کا کوئی مقصد ہے؟ تو وہ چل پڑے کہ استاد نے جب فلاں ملک جانے کا حکم دیا ہے، جو مقصد ہوگا اس کی اطلاع پہنچائیں گے۔ اس کے بعد ہم چل پڑے اور چھ مہینے پیدل سفر کرنے کے بعد منزل مقصود پر پہنچے تو وہیں آدمی انتظار میں تھا کہ حضرت کا یہ حکم ہے اور تم نے یہ

یہ کرنا ہے۔تو وہ اطلاع ہمیں چھ مہینے پیدل چلنے کے بعد ملی تو اس کے اندر بھی حکمتیں تھیں کہ اگر حضرت بتلا دیتے کہ تم نے یہ یہ کام کرنا ہے اور ہم پکڑے جاتے تو راز نکل جاتا۔تو اس لیے ہمیں تو بتایا نہیں اور بھیج دیا اور ہم نے جو کرنا تھا وہ دوسرے راستہ سے وہاں پہنچا دیا، تاکہ اگر خدانخواستہ انگریز پکڑ بھی لے تو ان کو تو کوئی پتہ نہیں ہوگا کہ میں کیوں جا رہا ہوں؟ وہ مار بھی ڈالیں گے تو بات تو نہیں نکلے گی۔تو فرمایا کہ اس زمانہ میں وہ استاذ پڑھانے والے تھے اور ہم پڑھنے والے تھے اور اب نہ پڑھانے والے رہ گئے اور نہ پڑھنے والے رہ گئے۔اور وہی لوگ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہیں۔

کامیابی کا معنی:

کامیاب کا کیا معنی ہے؟ ہم اس کو کامیاب سمجھتے ہیں جس کے پاس دولت اور دنیا کی تمام آسائشیں ہوں۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا کہ جو تم کھا رہے ہو وہ گویا ختم ہو گیا اور جو تم پہن رہے ہو وہ بوسیدہ ہو گیا۔فرمایا: جو تم اللہ کے راستے میں دیتے ہو وہی تمہارا محفوظ ہو رہا ہے، وہی قیامت میں تمہارے کام آئے گا۔

[صحیح مسلم، حدیث:۲۹۵۸، کِتَابُ الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ]

اور جو وقت تم نے دوستوں میں گزار دیا وہ ضائع ہو گیا، جو سونے میں گزار دیا وہ بھی ضائع ہو گیا اور جو تم نے اپنی دنیا کمانے میں گزار دیا وہ بھی ضائع ہو گیا۔تو اصل فلاح کیا ہے کہ جو وقت اللہ کے راستے میں آئے۔اس لیے فرمایا:

﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۝﴾ (البقرۃ:۵)

''یہی لوگ دنیا میں بھی کامیاب ہیں اور آخرت میں بھی کامیاب ہیں۔''

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ﴾ وہ اللہ کی طرف سے ایک نور پر اور ایک روشنی پر ہوتے ہیں، استقامت پر ہوتے ہیں اور ہمیشہ اس پر جمے رہتے ہیں۔

﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۝﴾

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''الْمُفْلِحُونَ'' کا معنی کامیابی ہے۔یعنی ان کو وہ مل گیا جو وہ چاہتے تھے اور جس شر سے بچنا چاہتے تھے اس سے بچ گئے۔اور یہی کامیابی ہے کہ مومن چاہتا ہے کہ اللہ کی رضا مل جائے اور شیطان کے شر سے بچ جائے۔جب اس نے اپنے اندر یہ صفات پیدا کر لیں تو اس نے مقصود حاصل کر لیا۔جب

مقصود حاصل کر لیا تو کامیاب ہو گیا۔

علامہ ابن جریر ؒ نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ ﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ کا اشارہ مؤمنین اہل الکتاب کی طرف ہے، جو اہل کتاب میں سے ایمان لائے جن کی صفت اللہ نے قرآن میں بیان کی: ﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ﴾ (البقرۃ: ۴) جیسا کہ آپ پہلے اس کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ مؤمنین عرب کی طرف اشارہ ہے، دوسرا قول کہ مؤمنین اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ﴾ یہ ما قبل سے منقطع ہوگا اور مبتدا ہوگا اور اس کی خبر ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ہوگی۔ ﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ (البقرۃ: ۳) علیحدہ ہے۔ اصل قول یہی ہے کہ یہ سب کے لیے ہے، چاہے وہ مؤمن عرب کے ہوں یا وہ مؤمن اہل کتاب کے ہوں، جیسا کہ سدی نے ابی مالک سے، انہوں نے ابی صالح سے، انہوں نے ابن عباس ؓ سے روایت کی ہے اور اسی طرح حضرت ابن مسعود ؓ سے اور اسی طرح اصحاب رسول ؓ سے روایت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں فریقوں کو، یعنی مؤمن عرب اور مؤمن اہل کتاب کو ﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ میں جمع کر دیا ہے۔

علامہ ابن کثیر ؒ فرماتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ پہلی جو صفتیں ہیں مؤمن اہل عرب یا مؤمن اہل کتاب کے لیے علیحدہ خاص نہیں، بلکہ تمام مؤمنین کے لیے ہیں کہ جیسے اہل کتاب اپنے پیغمبر علیہ السلام پر بھی ایمان لائے اور ہمارے پیغمبر ﷺ پر بھی ایمان لائے، تو ہم بھی اپنے پیغمبر ﷺ ایمان لائے اور پہلی کتابوں پر بھی ایمان لائے۔ لہٰذا یہ صفت عام ہے اور تمام مؤمنین کے لیے آئی ہے ﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ یہ نہیں ہے کہ یہ جملہ صرف اہل کتاب کے لیے ہو اور مؤمنین اہل عرب کے لیے نہیں ہے۔

[ابن کثیر: ۱/ ۴۴، الآیۃ: أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ]

حضرت عبد اللہ بن عمر ؓ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام ؓ نے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں عرض کیا:

''يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّا نَقْرَءُ مِنَ الْقُرْآنِ فَنَرْجُوا''

ہم قرآن پڑھتے ہیں تو ہمیں امید ہو جاتی ہے کہ ہم بھی جنت میں جائیں گے، ہم بھی کامیاب ہوں گے، یعنی جب آیات رحمت پڑھتے ہیں تو ہمیں امیدیں لگ جاتی ہیں۔

''وَ نَقْرَءُ مِنَ الْقُرْاٰنِ فَنَکَادُ اَنْ نَیْأَسَ''

اور ہم قرآن پڑھتے ہیں اور قریب ہوتا ہے کہ ہم بالکل نا امید ہو جائیں۔ جب ہم آیاتِ عذاب اور آیاتِ وعید پڑھتے ہیں تو ہم گھبرا جاتے ہیں کہ پتہ نہیں کہ ہمارا کیا ہوگا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں اور جہنم والے کون ہیں؟ جب صحابہ نے پوچھا کہ حضور ہمیں بتلائیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: سورۃ البقرۃ پڑھو ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ ...... وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۱ تا ۵] حضور ﷺ نے فرمایا کہ جن میں یہ صفتیں پائی جائیں وہ جنت والے ہیں: جو غیب پر ایمان لائیں، نمازیں قائم کریں، اللہ کے راستے میں خرچ کریں اور جو اللہ پاک نے اپنے پیغمبر پر اتارا ہے اس پر ایمان لائیں اور جو پہلے پیغمبروں پر کتابیں اتاری گئیں ان سب پر بھی ایمان لے آئیں تو یہی لوگ ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں اور یہی لوگ اہل جنت ہیں۔ اور اس کے بعد فرمایا: اس کے آگے پڑھو۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓي اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾
[البقرۃ: ۶،۷]

ان آیات میں فرمایا: ''هٰؤُلَاءِ أَهْلُ النَّارِ'' یہی لوگ ہیں جو جہنم والے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! دعا فرمائیں کہ اللہ پاک ہمیں اہل جنت میں سے بنائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ سے لے کر ﴿عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ تک اہلِ نار ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا: کیا ہم ان میں سے نہیں ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! یہی بات ہے آپ لوگ اہل جنت ہیں۔

[ابن کثیر: ۱/ ۴۴، ۴۵، الآیۃ: اُولٰٓئِكَ عَلٰي هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ...]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

''بے شک جو لوگ کافر ہو گئے ان کے لیے برابر ہے چاہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓي اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

''اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا (دائمی) عذاب ہے۔''

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾﴾ [البقرة:٦]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "کَفَرُوْا" کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے حق کو چھپا دیا۔ اصل میں کفر کا معنی ہوتا ہے چھپانا، اسی مادہ سے مکفرات بھی استعمال ہوتا ہے۔ تو کفر کا معنی ہے حق کو چھپا دینا، حق پر پردہ ڈال دینا اور حق کو نہ ماننا اور انکار کرنے کا معنی بھی یہی ہے، حق کا انکار کر دینا، حق کو چھپا دینا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے "سَتَرُوْا" اور فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ ان کی موت کفر پر ہوگی۔ "سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ إِنْذَارُكَ وَ عَدَمُهُ إِنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِمَا جِئْتَ بِهِ" ان کے لیے برابر ہے کہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، یہ ہرگز اس چیز پر ایمان نہیں لائیں گے جو آپ لائے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے۔ "سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ" ان کے لیے برابر ہے، آپ کے لیے برابر نہیں ہے، کیونکہ آپ کو تو ڈرانے کا ثواب ملے گا۔ یہاں بھی لفظ آیا ہے ﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾﴾ [البقرة:٦] اور سورۂ یسین میں بھی آیا ہے ﴿وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠﴾﴾ [یٰس:١٠]

خوف اور انذار میں فرق:

قرآن مجید میں انبیاء کے تذکرہ کے ساتھ اِنذار کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسے: ﴿أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ﴾ (البقرة:٦)، اسی طرح ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٤٥﴾﴾ (الاحزاب:٤٥) کہ اللہ نے پاک پیغمبر ﷺ کو "بَشِیْرٌ" مومنین کو خوشخبری سنانے والا "نَذِیْرٌ" منکرین کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ تو "نَذِیْرٌ" "أَنْذَرَ یُنْذِرُ" کا معنی ہوتا ہے ڈرانا اور اسی طرح عربی کے اندر ایک اور لفظ استعمال ہوتا ہے "تَخْوِیْفٌ" خوف سے۔ اس کا معنی بھی ہوتا ہے ڈرانا، لیکن تخویف اور انذار میں ایک بڑا لطیف فرق ہے۔ ایک ہوتا ہے کسی کو خوفناک کر دینا، کسی کو خوف دلانا، کسی کو ڈرانا۔ اور ایک ہوتا ہے انذار، وہ ڈرانا ایسے ہے جیسے آپ کسی دشمن کو بھی دیکھیں گے تو ڈر جائیں گے تو اس میں آپ کو خوف آئے گا، آپ سانپ کو دیکھیں گے تو ڈر جائیں گے، اسی لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ جو آپ کے ہاتھ میں ہے اس کو زمین پر ڈالو۔ جب انہوں نے ڈالا تو وہ سانپ بن گیا تو اب موسیٰ علیہ السلام ڈر کے مارے دوڑے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ﴿٢١﴾﴾ [طٰہٰ:٢١]

یہاں لفظ خوف ہے۔ اللہ نے یہ نہیں فرمایا "خُذْهَا وَلَا تُنْذِرْ" کیونکہ وہ خوف عدو کی وجہ سے تھا۔ اور ایک

ہوتا ہے انذار اور یہ وہ ڈرانا ہوتا ہے جس میں رحمت اور مودّت بھی شامل ہو، یعنی اس لیے ڈرا رہے ہیں، تا کہ آپ کا فائدہ ہو۔ باپ اپنے بیٹے کو ڈراتا ہے کہ یہ کام نہ کرو، استاذ اپنے شاگرد کو ڈراتا ہے کہ بھائی اتم غفلت نہ کیا کرو۔ اس میں ایک محبت بھی شامل ہوتی ہے۔ اصل میں اس کا فائدہ مطلوب ہوتا ہے کہ بیٹے کو نقصان نہ پہنچے، میرے شاگرد کو نقصان نہ ہو کہ وہ جاہل نہ رہ جائے۔

انبیاء علیہم السلام بھی جو ڈرانے کے لیے آتے ہیں اس ڈرانے کے پیچھے بھی ایک رحمت کا جذبہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ بے چارے جہنم میں نہ چلے جائیں، آگ میں نہ جل جائیں، یہ کافر بننے کے بعد دنیا اور آخرت کا نقصان نہ اٹھائیں۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو نذیر بنا کر بھیجتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری مثال ایسے ہے کہ جیسے کوئی اڑنے والے پرندے آگ میں گر رہے ہوں اور کوئی آدمی کپڑا لے کر ان کو ہٹا رہا ہو کہ آگ میں نہ جل جائیں تو اس سے اس کا مارنا مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کے دل میں ان کو آگ سے بچانا مقصود ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہاری مثال بھی ایسی ہی ہے کہ تم جہنم میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمہیں کھینچ کھینچ کر نکال رہا ہوں۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۴۸۳، باب: الِانْتِهَاءِ عَنِ الْمَعَاصِي]

اس لیے انبیاء علیہم السلام کے لیے جہاں جہاں بھی قرآن میں لفظ آئے گا وہاں آئے گا نذیر۔ ﴿ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ (البقرۃ:۶)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٩٦﴾﴾ (یونس:۹۶)

''بیشک جن لوگوں کے بارے میں تمہارے رب کی بات طے ہو چکی ہے (کہ وہ ایمان نہ لائیں گے یقیناً) وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

﴿وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۴۵)

''اور اگر آپ (ان) اہل کتاب کے سامنے (دنیا بھر کی) تمام دلیلیں پیش کر دیں تب بھی یہ (کبھی) آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں گے۔''

ان آیات سے مقصود یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غمگین نہ ہوں۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑے رؤف رحیم ہیں۔ جب کافر

اسلام نہیں لاتے تھے تو حضور ﷺ کو بڑا رنج ہوتا تھا، آپ ﷺ کے دل پر یہ بات گراں گزرتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے نبی! آپ غم نہ فرمائیں۔ جن کے مقدر میں ہم نے بدبختی لکھ دی ہے وہ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے اور جن کے ذمہ ہم نے ہدایت لکھ دی ہے وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں کافر سے مراد وہ ہے جو انکار کرے اس کا جو اللہ نے اتارا ہے، وہ کہتے رہیں کہ ہم ایمان لائے ان پر جو آپ سے پہلے کتابیں اتری ہیں۔

[ابن کثیر: [illegible] الآیۃ: أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ]

اسی طرح ایک حدیث مبارک میں آتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص میرے آنے کے بعد مجھ پر ایمان نہیں لے آتا وہ کافر ہے۔ یعنی وہ لاکھ دعویٰ کرتا پھرے کہ میں موسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہوں، عیسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہوں، لیکن اللہ نے قرآن میں حضور ﷺ کے بارے میں فرمایا کہ جو آپ پر ایمان نہیں لاتا وہ بھی کافر ہے۔

جس کی تفسیر خود قرآن میں موجود ہو، جس کی تفسیر فرمانِ رسول ﷺ میں موجود ہو، اس میں کسی اور تفسیر کی طرف نہیں جا سکتے۔ ایک وہ لفظ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے اس کا ترجمہ بیان نہیں فرمایا، اس میں تو دو باتیں ہو سکتی ہیں، لیکن جس آیت کا ترجمہ خود حضور ﷺ نے بیان فرما دیا اب اس کے اندر دو باتیں ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور وہ لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ دیکھو! ان کے اندر بھی تو اختلاف ہے۔

ائمہ مجتہدین کے درمیان فروعی اختلاف:

جب کسی ایک مسئلہ میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کچھ اور فرماتے ہوں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کچھ اور فرماتے ہوں، امام شافعی رحمہ اللہ کچھ اور فرماتے ہوں اور امام مالک رحمہ اللہ کچھ اور فرماتے ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس مسئلہ کے قرآن و حدیث میں صراحتاً کوئی معنی متعین نہیں ہوا۔ یاد رکھیں کہ جو باتیں قرآن و حدیث میں صراحتاً بیان ہو چکی ہیں ان میں تمام ائمہ کرام کبھی بھی اختلاف نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر: نمازِ عشاء ہے، اس کی کتنی رکعت ہیں؟ چار ہیں۔ کبھی کسی امام نے یہ نہیں کہا کہ تین رکعتیں ہیں۔ اور مغرب کی نماز کی تین رکعت ہیں، کبھی کسی نے نہیں کہا کہ چار رکعتیں پڑھو۔ فجر کی نماز میں دو رکعتیں ہیں، کبھی کسی امام کا یہ قول نہیں ملے گا کہ تین رکعتیں پڑھیں۔ جو چیزیں نص قطعی سے یا احادیث متواترہ مشہورہ سے ثابت ہیں اور جو قطعی الثبوت ہیں، ان میں ائمہ کا کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔ ائمہ کا اختلاف کہاں ہوتا ہے؟ جہاں مسئلہ قرآن میں بھی نہیں ملا، حدیث رسول ﷺ میں بھی نہیں ملا

اور صحابہ سے بھی ہمیں کوئی چیز معلوم نہیں ہو رہی، اب مسئلہ میں اختلاف کی صورت آتی ہے۔ تو اب مجتہدین اجتہاد فرماتے ہیں، وہ بھی قرآن وسنت کی روشنی میں اجتہاد کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی عمل تھا۔ جب ان کو کوئی قرآن وحدیث میں نہیں مل رہا ہوتا تھا تو کبھی سارے صحابہ بیٹھ کر ایک بات کا فیصلہ کرتے تھے اور انفرادی طور پر اس مسئلہ کو حل کرتے تھے۔

تو جہاں یہ بات ہوتی ہے کہ وہ احادیث مبارکہ مل جاتی ہیں جن احادیث میں اختلاف ہوتا ہے تو وہاں مسائل میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے۔ مثلاً: ایک حدیث میں آیا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کے نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے تھے اور ایک حدیث مبارکہ میں آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چار رکعتیں پڑھتے تھے تو اب دونوں فرمانِ رسول ہیں، دونوں افعالِ رسول ہیں۔ تو بعض ائمہ نے دو رکعت والی حدیث کو لے لیا، ظہر سے پہلے بس دو رکعت سنت ہیں، اس کے علاوہ چار رکعت سنت نہیں ہیں، بعض ائمہ نے اس چار رکعت والی حدیث کو لے لیا۔ اب دونوں راستہ سے نہیں ہٹے، دونوں نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کیا۔ تو اس لیے اگر کوئی مثال دیتا ہے کہ ائمہ میں اختلاف ہے تو جواب یہ ہے کہ ائمہ میں کبھی بھی اصول میں اختلاف نہیں ہوتا، قرآن وحدیث سے جو مسئلہ ثابت ہو جائے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ اگر کہیں کوئی اختلاف ہوتا ہے تو اولیٰ اور افضل اور غیر افضل کا ہوتا ہے۔ کسی امام کو حدیث مبارکہ پہنچی نہیں ہوتی یا کسی امام کو پہلی حدیث پہنچی ہے اور حدیث ناسخ نہیں پہنچی ہے، دوسرے امام کو وہ ناسخ حدیث پہنچ گئی۔ تو تمام ائمہ اربعہ برحق ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں فرمائے، انہوں نے جو دین کی خدمت کی ہے اللہ تعالیٰ اس کو اور زیادہ قبول فرمائیں اور ہمیں ان کا احترام اور ادب اور ان کے علم سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائیں۔

موجودہ اختلافات:

تو اس لیے ہمیشہ یاد رکھا کریں! یہ باطل فرقے بڑے دھوکے دیتے ہیں۔ دیکھو! ان میں تو آپس میں جھگڑا، ان میں تو آمین میں جھگڑا ہے، حالانکہ کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ آمین تو دونوں کہتے ہیں، جھگڑا تو زور سے کہنے یا آہستہ کہنے میں ہے۔ یہ بھی حدیث موجود ہے، وہ بھی قرآن کی آیت موجود ہے، حالانکہ آمین کا تو کوئی مخالف نہ ہوا، بس اختلاف یہ ہوا کہ آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ سے کہی جائے۔ بعض نے کہہ دیا کہ زور سے کہنے میں زیادہ ثواب ہے اور بعض نے کہا آمین چونکہ دعا ہے اور دعا جتنی آہستہ کی جائے اتنی اللہ کے ہاں قبول ہوتی ہے۔ تو اب

دونوں کا استنباط قرآن اور حدیث محمد مصطفیٰ ﷺ سے ہے۔

خاتم النبیین کا صحیح معنی کیا ہے؟

لیکن جب لوگوں نے اللہ کے قرآن کے خلاف تاویل کی کہ قرآن نے کہا کہ خاتم النبیین، انہوں نے کہا کہ خاتم کا معنی ہے مہر اور مہر کا معنی یہ ہے کہ جب تک حضور ﷺ کی مہر لگتی جائے گی نبی بنتے چلے جائیں گے۔ تو اب انہوں نے یہ ترجمہ کیا، حالانکہ اگر مہر کا معنی لیا جائے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تحریر ختم ہو تو وہاں مہر لگ گئی، جب نفاذ بند ہو تو وہاں مہر لگ گئی، اب نہ اندر کی چیز باہر آئے گی اور نہ باہر کی چیز اندر جائے گی۔ تو مہر بھی تو ختم کرنے والی ہوتی ہے۔ جب اللہ نے آپ کو ختم بنا دیا تو آپ پر آ کر نبوت ختم ہو گئی اور اس کا ترجمہ حضور ﷺ نے خود کر دیا:

((أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ وَلَا نَبِيَّ بَعْدِي.)) [الترمذی، حدیث: ۲۲۱۹، بَابُ: مَا جَاءَ لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰی...]

''میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔''

فرمایا:

((أَنَا خَاتَمُ الْأَنْبِيَاءِ.)) [المستدرک علی الصحیحین، ۸۳۹۰، کِتَابُ: الْفِتَنِ وَالْمَلَاحِمِ]

''میں انبیاء کے آخر میں آیا ہوں۔''

اور تم پر امت ختم ہو گئی۔ تمہارے بعد امت کوئی نہیں اور میرے بعد نبی کوئی نہیں۔ جب میرے مدنی پاک ﷺ نے اتنی واضح بات سمجھا دی تو اب اس میں کوئی تاویل کرے، کوئی تحریف کرے، کوئی اس میں تبدیلی کرے تو اس کے کفر میں کسی کو شک نہیں ہو گا۔ اس لیے فرمایا کہ جو اللہ نے قرآن اتارا اگر کوئی اس کا انکار کرے تو کفر ہے اور جو قرآن و حدیث میں میرے مدنی پاک ﷺ کا کھلا فرمان ہے، اس کے اندر اپنی طرف سے تحریف و تبدیلی کرے تو وہ بھی کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو کفر کے فتنوں سے بچائے اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مسلمانوں کو صراط مستقیم پر چلائے۔

آپ دیکھیں کہ دنیا کے اندر فتنوں کی یلغار ہے، دنیا میں فتنے اتنے پھیل گئے ہیں ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝﴾ [الروم: ۴۱] قادیانیت کا فتنہ ہے، کہیں آغا خانیت کا فتنہ ہے، کہیں خوارج اور نواصب کا فتنہ ہے، کہیں منکرین قرآن کا فتنہ ہے، کہیں منکرین حدیث کا فتنہ ہے، کہیں منکرین ائمہ و محدثین کا فتنہ ہے اور کہیں تاویل و تحریف کرنے والوں کا فتنہ ہے۔ آج جو آدمی اسلام پر قائم

دائم ہے اور مذہب اہل سنت والجماعت پر پکا ہے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے ہدایت میں رکھا ہے۔
ورنہ میری کیا طاقت ہے، گمراہ ہونے میں کیا دیر لگتی ہے! کسی کو بگاڑنا بڑا آسان ہے، لیکن کسی کا سنوارنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ اگر آپ نے ایک بلڈنگ کو گرانا ہو تو کتنی دیر لگتی ہے؟ لیکن اگر آپ نے اس کو بنانا ہو تو سالہا سال لگتے ہیں۔ اگر آپ ایک آدمی کو نمازی بنانا چاہیں تو بڑی محنت کرنی پڑے گی، لیکن اگر بے نمازی بنانا چاہیں تو ایک منٹ بھی نہیں لگتا۔ کسی آدمی کو اگر بگاڑنا ہے تو بڑا آسان ہے، لیکن کسی آدمی کو سنوارنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

عیسائیوں کے پاس حضور ﷺ کی شبیہ:

ایک دفعہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سفر کیا اور ایک گرجا میں پہنچے۔ گرجا کا پادری ان کو اپنے ساتھ لے کر گیا اور ایک الماری کھولی۔ اس الماری کے اندر تصویریں لگی ہوئی تھیں ...... یہودیوں اور نصرانیوں کو تصویریں بنانے کا پرانا مرض ہے، ابھی آپ ان کے میوزیم کے اندر جائیں، بڑے بڑے عجائبات ہیں، ان کے اندر ممی اور تمثیلات بناتے ہیں کہ یہ بادشاہ گزرا اور یہ بادشاہ گزرا۔ ان کے پورے مجسمے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض سنگ مرمر پتھروں کے بنے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض دوسرے کسی مسالے کے بنے ہوتے ہیں۔ یعنی اپنے بڑوں کو یاد رکھنے کی، مجسمہ سازی کی بیماری ان میں آج بھی موجود ہے۔...... بہرحال اس پادری نے ایک الماری کھولی اور کہا کہ اس میں دیکھو! تمہارے وہ نبی جو مکہ میں پیدا ہوئے ہیں اس کی شکل ان میں کہیں ملتی ہے؟ انہوں نے کہا: اس میں تو نہیں ہے۔ اس نے سب سے آخری الماری کھولی، اس کو جب کھولا تو ہم نے کہا یہ محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم حیران ہو گئے! اسی طرح بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا نے بھی دیکھا تو انہوں نے پوچھا کہ تم نے یہ تصویر کیسے بنوائی ہے؟ اس نے کہا کہ ہماری کتابوں کے اندر ذکر موجود ہے، کتابوں کو سامنے رکھ کر تخیل کے ساتھ مصورین نے یہ تصویریں تیار کی ہیں۔ تو ہمیں یقین ہے کہ یہ آخری نبی ہیں۔

ہرقل کا حضور ﷺ کی تصدیق کرنا:

اور اسی طرح ہرقل...... جو روم کا بادشاہ ہے...... جب اس نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کے بارے میں پوچھا، ایک سوال کیا، دوسرا سوال کیا، تیسرا سوال کیا۔ جب سوال ختم ہوئے تو وہ کہنے لگے: خدا کی قسم! اگر میں اس جگہ ہوتا جہاں محمد مدنی (ﷺ) موجود ہیں، میں ان کے قدم دھو کر پی لیتا، یہ آخری نبی ہیں۔ تو وہ بھی نشانیاں پہچان کر سمجھ گیا اور اس یقین پر پہنچ گیا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں۔ اب بھی دنیا میں منصف قسم

کے مؤرخ گزرے ہیں یا موجود ہیں۔ انہوں نے کتابیں لکھی ہیں، چاہے وہ نصرانی ہیں، چاہے یہودی ہیں، لیکن ان کو بھی یہ بات ماننی پڑی ہے کہ دنیا میں سب سے افضل اور سب سے اکمل اور سب سے کامل ذات اگر کوئی آئی ہے تو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے۔

کفار کو کبھی تبلیغ کا فائدہ نہیں ہوگا:

تو اللہ نے فرمایا: میرا مدنی! ان کے پاس تیری نشانیاں موجود ہیں، ان کی کتابوں میں تیرا ذکر موجود اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے وعدہ موجود ہے، لیکن اس کے بعد بھی یہ ایمان نہیں لائے تو ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، اس لیے کہ اتنی نشانیوں اور علامتوں کے بعد بھی یہ منکر ہو چکے ہیں۔

تفسیر:

ابوجعفر رازی رحمہ اللہ نے یہ لکھا ہے کہ یہ دو آیتیں ان دو لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کے مقابلے کے لیے اپنی اپنی کفر کی جماعتوں کی قیادت کی۔ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴾[ابراہیم:۲۸]

''کیا آپ نہیں دیکھتے ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ کی نعمتوں کا جواب ناشکری سے دیا؟ اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں ڈال دیا۔''

وہ ہلاکت کا گھر کون سا ہے؟ ﴿جَهَنَّمَ ۚ یَصْلَوْنَهَا ۭ﴾ وہ جہنم جو ان کو جلائے گی۔

[ابن کثیر: ۱/ ۴۵، الآیۃ: اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ...]

پتہ نہیں میری عبادت منظور ہی نہ ہو، پتہ نہیں میرا عمرہ قبول ہی نہ ہو، پتہ نہیں میری نمازیں قبول ہی نہ ہوں، پتہ نہیں میرے اندر خطا ہو جائے اور اللہ پکڑ لے اور رحمت کی امید بھی رہے کہ اگر میں اتنا گندا ہوتا تو اللہ اپنے گھر میں تو نہ آنے دیتا، بہرحال اگر بلا لیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ میرا رب راضی ہے۔ کوئی اپنے گھر میں تب ہی بلاتا ہے جب راضی ہو اور جب ناراض ہو تو کوئی اپنے گھر میں آنے دیتا ہے؟ ایک بندہ بھی ناراض ہو تو کہتا ہے: میرے گھر میں نہیں آنا۔ ایک بھائی بھی ناراض ہو تو کہتا ہے کہ میرے گھر میں تیرا داخلہ بند ہے۔ ایک افسر بھی ناراض ہو تو کہتا

ہے کہ ضلع سے نکل جاؤ۔ ضلع بدر کر دیتے ہیں، کبھی کبھی تو ڈویژن بدر کر دیتے ہیں اور کبھی ملک بدر کر دیتے ہیں۔ ائیر پورٹ سے اترو تو باہر نہیں نکلنے دیتے کہ تمہارا تو اس ملک میں ہی داخلہ بند ہے۔ جب اللہ کسی کو بلا کر اپنے گھر میں داخل کر دے، اللہ اپنے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مدینہ منورہ میں حاضری کی توفیق دے دے، مسجد نبوی میں حاضری کی توفیق دے دے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ راضی ہے تو اپنے شہر میں داخل ہونے دیا ہے، لیکن ہماری غلطیاں ہیں کہ پھر بھی ہم ٹھیک نہ ہوں۔ اگر ہم قریب آنے کے بعد بھی اپنے رب کو راضی نہ کر سکیں اس نے تو ہمیں اندر آنے دیا، اس نے تو ہمیں اپنے گھر آنے کی توفیق دے دی، اب اس کی نعمتوں سے ہم نے کیسے فائدہ اٹھانا ہے؟ دیکھیں کہ بادشاہ جب کسی کو بلوائے تو اب اس کو چاہیے کہ دیکھے کہ میں نے بیٹھنا کیسے ہے؟ میں نے بات کیسی کرنی ہے؟ بادشاہ کسی کے آگے کھانا رکھ دے تو اس کا کام ہے کہ دیکھے کہ میں نے کیا کھانا ہے اور کیا نہیں کھانا؟ میں کوئی ایسی حرکت نہ کروں کہ بدتمیز کہلوایا جاؤں، ایسی غلطی نہ کروں کہ مجھے محروم کر دیا جائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے تو ہمیں اپنے گھر میں بلا لیا، اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے اندر تبدیلی لائیں، اپنی صورت کے اندر تبدیلی لائیں، اپنی سیرت کے اندر تبدیلی لائیں اور اپنے کردار کے اندر تبدیلی لائیں، تاکہ ہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنے والے بن جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق چلنے والے بن جائیں۔

قرآن پڑھنے سے امید وخوف:

ایک حدیث کے اندر آتا ہے:

((قِيلَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّا نَقْرَءُ مِنَ الْقُرْآنِ فَنَرْجُوْا وَ نَقْرَءُ فَنَكَادُ أَنْ نَيْأَسَ))

صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم قرآن پڑھتے ہیں تو امیدیں لگ جاتی ہیں اور پھر قرآن پڑھتے ہیں تو ہم مایوس ہو جاتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آؤ میں تمہیں بتلاؤں! فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝﴾ [البقرۃ:٦]

یہ لوگ جہنمی ہیں، کیا تم ان میں سے ہو؟ کہا: "لَسْنَا مِنْهُمْ" ہم ایسے تو نہیں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم بالکل ایسے نہیں ہو، یہ تو کافروں کی صفت ہے۔

[ابن کثیر: ۱/۴۵، الآیۃ: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ...]

ایمان نہ لانے کی خبر کی توجیہ:

''لَا یُؤْمِنُوْنَ'' کیوں آیا؟ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلے جملہ کی تاکید کر رہا ہے، وگرنہ بات تو پہلے آگئی کہ ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔ فرمایا ''لَا یُؤْمِنُوْنَ'' یہ جملہ پہلے جملہ کے تاکید کے لیے آیا ہے۔

[ابن کثیر: ۱/ ۴۵، الآیۃ: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ....]

اصل بات یہ ہوتی ہے...... اللہ رحمت فرمائے!...... آدمی کے ٹھیک ہونے کی ایک سٹیج ہوتی ہے، دیکھیں! مثلاً: ایک جسمانی بیماری ہے، آدمی علاج کرا رہا ہے، کرا رہا ہے۔ اب ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھا، انہوں نے تحقیق کی کہ یہ کینسر ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ آپ علاج کرائیں یا نہ کرائیں یہ بچ تو نہیں سکتا، بس اب اس کا علاج کرنا اور نہ کرنا برابر ہے۔ جو زندگی کے دن مقدر ہیں وہ پورے کرے گا، لیکن اس کو فائدہ نہیں ہوگا، بچ نہیں سکتا، اس کو گھر لے جائیں، تاکہ اپنے رشتہ داروں میں جا کر مرے۔ یہ جسمانی بیماریوں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح روحانی بیماریوں میں بھی ہوتا ہے۔ ایک آدمی زنا میں لگ گیا، شراب میں لگ گیا، ہیروئن میں لگ گیا، آپ علاج کر رہے ہیں، ہسپتالوں میں داخل کر رہے ہیں، علماء کے پاس لے جا رہے ہیں، اللہ کے اولیاء کے پاس لے کر جا رہے ہیں، لیکن وہ اور بگڑتا جا رہا ہے، آخر آپ نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں ہو سکتا، اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔

اسی طرح کافروں کی بھی ایک اسٹیج ہے۔ جب وہ اس مقام پر آگئے تو اللہ نے خود فرما دیا کہ ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، یہ نہیں ایمان لاتے۔ اس سے بڑی بدبختی کی آخر کون سی سٹیج ہوگی کہ جن کی عدمِ ہدایت کی خبر اللہ خود اپنے پیغمبر ﷺ کو دے دے؟ اور جو حضور ﷺ کے ڈرانے سے نہ ڈرے، وہ کسی اور کے ڈرانے سے کیا ڈرے گا؟ حضور پاک ﷺ کے کہنے سے جس نے کلمہ نہیں پڑھا وہ کسی مولوی کے کہنے سے کیا کلمہ پڑھے گا؟ اس لیے فرمادیا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝﴾ [البقرۃ: ۶]

ان کے لیے ڈر نہ ڈرانا برابر ہے، یہ کفر پر رہیں گے، یہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔

اسی لیے علماء نے لکھا کہ آپ خود اپنے دل کا امتحان کریں۔

ترکیب آیت:

''لَا یُؤْمِنُوْنَ'' پہلے جملے کی تاکید ہے۔ اور بعض نے فرمایا کہ یہ جملہ خبر بنے گا۔ ''اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' حرف

مشبہ بالفعل اور اس کا اسم آگے ''لَا یُؤْمِنُوْنَ'' اس کی خبر ہے کہ تحقیق جن لوگوں نے کفر کیا وہ اللہ کے علم میں کافر ہیں، ایمان نہیں لائیں گے۔ درمیان میں اپنے نبی ﷺ کی تسلی کے لیے فرمادیا:

﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ [البقرۃ:٦]

اس ترکیب میں یہ جملہ معترضہ بنے گا۔ اصل جملہ ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا يُؤْمِنُوْنَ'' تھا۔ اس صورت میں ''لَا يُؤْمِنُوْنَ'' خبر بنے گا اور پہلی صورت میں ''لَا يُؤْمِنُوْنَ'' جملہ مؤکدہ بنے گا۔

[ابن کثیر: ١/ ٤٥، الآیۃ: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ...]

کیا آدمی اپنے اختیار سے کفر اختیار کرتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس کی ان آیات مبارکہ میں ارشاد فرمایا:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾

[البقرۃ:٧]

''مہر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر، ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور انکے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

یعنی جو کافر اور مشرک ہیں اور اللہ کے علم میں جنھوں نے کفر پر مرنا ہے اللہ نے ان کے دلوں پر، ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے۔ کیونکہ ہر چیز اللہ کے علم میں ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ پیدا ہونے کے وقت ہی اللہ مہر کر دیں۔ اگر پیدائش کے وقت اللہ مہر کر دیں تو پھر اس کو ہدایت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر اس کو سزا دینا عدل کے مطابق نہیں ہوگا۔ اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ پیدا کرنے سے پہلے بھی اور پیدا کرنے کے بعد بھی ہر چیز چونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے تو وہ پہلے اس بارے میں خبر عطا فرما دیتے ہیں اور عام پڑھنے والے کو دھوکہ لگتا ہے کہ اللہ نے کافر ہونا اس کو مقدر میں ہی لکھ دیا تو اس کا کیا قصور ہے؟ ...... نعوذ باللہ! ...... اس کے مقدر میں ہی زنا لکھا ہوا تھا، وگرنہ اس کا کیا گناہ ہے؟ یہ بات غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر بندے کو دین فطرت پر پیدا فرماتے ہیں۔ قرآن میں فرمایا:

﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ﴾ [الروم:٣٠]

''اللہ کی بنائی ہوئی اس فطرت پر چلو جس پر اس نے تمام لوگوں کو پیدا کیا ہے۔''

اور حضور ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ))

''ہر پیدا ہونے والا بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔

''[صحیح البخاری، حدیث:١٣٨٥، باب: مَا قِيلَ فِي أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ]

ہر پیدا ہونے والا بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اس کا دل صاف ہے اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس میں خیر شر، علم جہل اور اچھائی برائی ان کی تمیز، ادراک، عقل، شعور، حواسِ خمسہ، یہ سب عطا کرتے ہیں۔ یعنی انسان کو بلکہ ہر حیوان کو یہ سب عطا فرما دیتے ہیں۔ جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۝﴾[الاعلیٰ:١تا٣]

''اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا اور ٹھیک انداز سے پیدا فرمایا اور پھر اللہ نے اس کو ہدایت بھی عطا فرمائی، اللہ نے اس کو سمجھ بوجھ تمیز بھی عطا فرمائی۔''

ان تمام ہدایات کے باوجود جب بندہ گمراہی پر چلتا ہے اور ظلمات میں الجھ جاتا ہے اور شرور کے اندر پھنس جاتا ہے اور پھر وہ بڑھتا بڑھتا اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اب اس کا ہدایت پر آنا مشکل ہوتا ہے تو پھر اللہ اس کے دل پر مہر کر دیتے ہیں اور وہ ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے ان گناہوں اور تکذیب اور انکار کی وجہ سے یہ واقعہ ہوتا ہے۔ اللہ پاک پہلے خبر دے دیتے ہیں تو لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اللہ میاں نے اس کو مسلمان کر دیا اور اس کو کافر کر دیا، اس کا کیا قصور ہے اور اس کی برائی کیا ہے؟ یہ تو اللہ کی مرضی ہے، اللہ قادر ہیں، وہ جس کو چاہیں ہدایت دے دیں، جس کو چاہے ہدایت نہ دیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ بھی فیصلہ ہے:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ۝﴾[الاسراء:١٥]

''ہم کسی قوم پر عذاب نہیں بھیجتے جب تک اپنے پیغمبر بھیج کر حجت پوری نہ کر دیں۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے پھر نبی پیدا فرمائے، اللہ نے کتابیں نازل فرمائیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں عقل عطا فرمائی اور اللہ نے ہمیں حواسِ خمسہ عطا فرمائے، یعنی آج دنیا میں کون سا آدمی ہے جو حق اور باطل میں امتیاز نہیں کر سکتا، لیکن فرق اتنا ہوتا ہے کہ جو حق کی تلاش میں ہوتا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ حق کے راستے کھول دیتے ہیں اور جو گمراہی میں بڑھتا ہے اور انتہاء کو چھو لیتا ہے، پھر اللہ اسے اس کی گمراہی میں غرق کر دیتے ہیں، ان کے دلوں پر پردے لگ جاتے ہیں، مہریں لگ جاتی ہیں اور ہمیشہ کے لیے وہ ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں، ورنہ اللہ تبارک و تعالیٰ عدل والے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے کبھی کسی بندے پر ظلم نہیں فرمایا۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۵۷]

''ہم نے ان کافروں پر ہرگز ظلم نہیں کیا، مگر انہوں نے اپنے نفسوں پر خود ظلم کیا ہے۔''

کہ وہ اپنے خالق کو بھول گئے، اپنے مالک کو بھول گئے اور اپنے پیدا کرنے والے کو بھول گئے۔ اور بندوں کو خدا بنالیا، مردوں اور زندوں کو حاجت روا بنالیا۔ کسی نے قبر کو خدا بنالیا، کسی نے درختوں کو خدا بنالیا، کسی نے چاند اور سورج کو خدا بنالیا اور کسی نے آگ کو خدا بنالیا، حالانکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ آگ بھی بندوں کے لیے ہے، یہ چاند سورج بھی بندوں کے لیے ہیں، یہ زمین بھی بندوں کے لیے ہے اور دریا بھی بندوں کے لیے ہیں، یہ تو سارے اللہ نے ہی ہماری خدمت کے لیے پیدا کیے ہیں۔ اگر ہم خادم کو مخدوم بنادیں، مملوک کو مالک بنادیں اور مخلوق کو خالق بنادیں تو یہ ہماری جہالت ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف میں تو کوئی حرج نہیں آتا۔

انسان کے اندر علم حاصل کرنے کی قوتیں:

قرآن میں ان تین چیزوں کا ذکر زیادہ آتا ہے: ایک تو ہے دل، دوسری سمع اور تیسری بصر ہے۔ ان چیزوں کا اللہ نے قرآن مقدس میں زیادہ ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ بھی ایک قوت چکھنا۔ چکھنے سے بھی آپ معلوم کرتے ہیں کہ یہ میٹھا ہے یا کھٹا ہے، یہ دل اور نظر بھی نہیں بتاسکتی کہ یہ میٹھا ہے یا کھٹا ہے، جب تک کہ زبان پر نہ لگے۔ اسی طرح یہ گلاس اگر میرے سامنے ہے تو میں شکل سے، دل سے، اور کان سے یا آنکھ سے فیصلہ نہیں کرسکتا کہ یہ پانی ٹھنڈا ہے یا گرم ہے جب تک کہ میں اس کو ہاتھ نہ لگاؤں، لیکن یہ دو قوتیں چکھنے کی اور چھونے کی بڑی کند ذہن قوتیں ہیں، ان سے علم تو حاصل ہوتا ہے، لیکن ہیں بڑی بلید اور کند ذہن کہ جب تک ہم پکڑیں یا چکھیں ناں اس وقت تک کچھ بھی نہیں بتاتیں۔ پکڑنے کے بعد آپ بتاسکتے ہیں کہ یہ ٹھنڈا ہے یا گرم ہے، حالانکہ ان کے اندر جاننے کی طاقت ہے، لیکن اتنی کمزور طاقت کہ جب تک عقل نہ ہو یہ فائدہ نہیں دیتیں۔ ان سے طاقت ور سننے والی قوت ہے، اس سے علم حاصل ہوتا ہے اور دیکھنے سے علم حاصل ہوتا ہے اور پھر یہ ساری چیزیں دماغ میں آتی ہیں اور اصل چیز دل ہے، اس لیے اللہ نے ان تین چیزوں کا زیادہ ذکر کیا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ [الاسراء:۳۶]

قیامت کے دن کانوں کے بارے میں، دیکھنے کے بارے میں اور دل کے بارے میں سوال ہوگا۔ تو وہاں بھی ان تین چیزوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح فرمایا:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾[الاعراف:۱۷۹]

اللہ نے فرمایا: ان کافروں کے دل ہیں، لیکن سمجھتے نہیں۔ ان کی آنکھیں ہیں، لیکن دیکھتے نہیں۔ ان کے کان ہیں، لیکن سنتے نہیں۔ وہاں ان تین چیزوں (دل، کان اور آنکھوں) کا ذکر ہے۔ اسی طرح فرمایا:

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ﴾[ق:۳۷]

فرمایا: قرآن کے اندر بڑی نصیحت ہے، لیکن ان کے لیے جن کا دل ہے یا جو کان سے سنتے ہیں اور وہ حاضر ہوتے ہیں اور پوری توجہ سے قرآن کو سنتے ہیں، ان کے لیے قرآن بڑی نصیحت ہے۔

تو آپ سارے قرآن میں دیکھیں! زیادہ ذکر انہیں کا آئے گا:

﴿اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾[النحل:۱۰۸]

اور کہیں فرمایا:

﴿وَّجَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ﴾[الانعام:۲۵]

اور کہیں فرمایا:

﴿وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾[النساء:۱۵۵]

کیونکہ جتنا ہمیں علم ملا ہے ہم نے اللہ کے بارے میں سنا ہے، اللہ کی صفات کو سنا ہے اور پھر اللہ کی صناعت کو دیکھا ہے تو اللہ پر ایمان لے آئے۔ سننے اور دیکھنے سے اللہ نے ہمیں اتنی بڑی نعمت عطا فرمائی۔ حضور پاک ﷺ کے بارے میں ہم نے سنا، ہم نے زیارت نہیں کی اور اسی طرح جنت جہنم اور انبیاء، جزا وسزا کے بارے میں بھی یہ ساری چیزیں ہم نے سنی ہیں، پھر ہمارے دل میں آئی ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے لیے ہدایت کا ذریعہ بنایا ہے، اسی لیے اکثر آیات میں اللہ نے سننے کو دیکھنے پر مقدم فرمایا ہے، جیسے ابھی آپ پڑھ رہے ہیں:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓي اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾[البقرۃ:۷]

سننے والی قوتیں پہلے ہیں اور آنکھوں کا ذکر بعد میں ہے، قوتِ سامعہ کا ذکر پہلے ہے اور قوتِ باصرہ کا ذکر بعد میں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سب سے پہلے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ قوتِ سامعہ سے ہوتا ہے، باصرہ سے بعد میں ہوتا ہے۔

مثلاً: آپ سوئے ہوئے ہیں، آپ نیند میں ہیں۔ اب کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو سب سے پہلے آپ آواز سنیں گے۔ جب آپ رات کو سوتے ہیں تو الارم لگاتے ہیں کہ جب الارم کی گھنٹی بجے گی تو آپ پہلے سنیں گے اور اسی طرح اللہ نے اگر قرآن اتارا ہے تو میرے محمد مدنی مصطفیٰ ﷺ کے دل پر اترا ہے، فرمایا:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝﴾

[الشعراء: ۱۹۳ تا ۱۹۵]

اسی لیے اللہ نے فرمایا:

﴿لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝﴾ [الحج: ۴۶]

"میرا مدنی! آنکھیں اندھی نہیں ہوتی، اصل اندھا تو وہ ہوتا ہے جو دل کا اندھا ہو۔"

لیکن اندھے وہ ہیں جو دلوں کے اندھے ہو جائیں۔ آنکھوں کا اندھا ہونا تو ایک عارضی چیز ہے، لیکن اصل اندھا وہ ہے جو دل کا اندھا ہو۔ اسی لیے فرمایا:

﴿لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا﴾ [الحج: ۴۶]

اور کہیں فرماتے ہیں:

﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝﴾ [الاعراف: ۱۷۹]

ان کے دل ہیں، لیکن ان سے سمجھتے نہیں ہیں، ان سے سوچتے نہیں ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ سب سے اہم چیز انسانوں کا دل ہے۔ اور اسی پر قرآن ہے:

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ﴾ [ق: ۳۷]

اسی پر حدیث ہے:

((أَلَا! إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا! وَهِيَ الْقَلْبُ.)) [صحیح البخاری، حدیث: ۵۲، باب: فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ]

"(فرمایا:) انسان کے بدن میں ایک ٹکڑا ایسا ہے وہ ٹھیک ہو جائے تو سارا بدن ٹھیک ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب

ہو جائے تو پورا بدن خراب ہو جاتا ہے خبردار وہ دل ہے۔''

اور اسی طرح دیکھیں اگر دل کو نکالیں آپ کے سارے اعضاء کاٹ ڈالیں تو آپ کو کوئی پتہ نہیں ہوگا۔ اگر دل کو سلا دیا جائے اور سارے اعضاء کو کاٹ دیا جائے تو دل کو کوئی احساس نہیں ہوگا۔ جب دل حرکت کرنی شروع کر دے گا تو اب بادشاہ دل ہے۔ اب جب انگلی میں درد ہوگا تو اس کو احساس ہوگا، پاؤں میں درد ہوگا تو احساس ہوگا، ناخن میں تکلیف ہوگی تو احساس ہوگا۔ یہ دل ایک قسم کا حاکم ہے، ایک قسم کا بادشاہ ہے اور باقی سارے اعضاء اس کے غلام ہیں۔ اس لیے علمائے اسلام فرماتے ہیں کہ اصل مرکزِ علم دل ہے۔ دل سے دماغ میں بات منتقل ہوتی ہے، پھر دماغ اس بادشاہ کا حکم چلاتا ہے سمع پر، بصر پر، ہاتھوں پر اور زبان پر۔

اب آپ دیکھیں کہ آپ بیٹھے ہوئے ہیں تو سب سے پہلے کوئی آواز آئے گی تو دماغ حکم دے دے گا کہ سنو! کیا ہو رہا ہے؟ اب دل میں آیا، اس نے دماغ کو آرڈر کیا، دماغ نے کان کو حکم دیا کہ سنو سنو! کیا ہو رہا ہے؟ اس نے کہا کہ کوئی جھگڑا ہو رہا ہے۔ اس نے کہا: اچھا سننے سے سمجھ لیا تو اس نے آنکھوں کو حکم دیا کہ تم دیکھو۔ تو اصل دل میں آئے گا تو دل دماغ کو آرڈر کرے گا اور دماغ پر ان غلاموں کو حکم دے گا کہ جلدی سے اپنی ڈیوٹی سنبھالو، جلدی سے سنو اور مجھے بتلاؤ کہ یہ کیا شر ہے؟ کیا شور ہے؟ کیا آواز ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟ تو اصل بات دل میں آتی ہے تو دل دماغ کو آرڈر کرتا ہے، دماغ قوتِ سامعہ کو، قوتِ باصرہ کو آڈر کرتا ہے۔ اگر اس سے بھی تسلی نہ ہو تو پاؤں کو حکم دیتا ہے کہ وہاں جا کر دیکھو کہ کیا ہو رہا ہے؟ تو پاؤں ادھر دوڑ پڑیں گے۔ ایسے کبھی بھی پاؤں نہیں دوڑیں گے جب تک دماغ حکم نہیں کرے گا کہ اس کو دھکا دو اور اس کو دور کرو، ایسا نہ ہو کہ تیرے اوپر گر جائے۔ دل سوچے گا ہاتھ پاؤں تب کام کریں گے۔

اسی سے ایک اور مسئلہ علماء نے لکھا ہے کہ جس جس کام کے لیے اللہ نے جو چیز پیدا کی ہے وہ اپنے کام میں لگی ہوئی ہے، مثلاً: دماغ یہ نہیں کر سکتا کہ کان کو حکم دے کہ تم دیکھو، کان سے دیکھنے کا کام لے سکتا ہے، آنکھ سے سننے کا کام لے سکتا ہے اور ہاتھوں سے چلنے کا کام لے سکتا ہے۔ تو جب ہر چیز اپنے دائرے میں اپنا کام کر رہی ہے تو اسی لیے بندوں کو حکم ہے کہ جو تیرا دائرہ ہے اسی میں کام کرو۔ جب اس سے تم باہر نکلو گے تو پھر ناکامی ہی ناکامی ہوگی، پھر اس کے بعد فساد ہوگا، اس کے بعد جھگڑے ہوں گے اور اس کے بعد دنیا میں انتشار پھیلے گا۔

ان میں سب سے اہم دل ہے تو اللہ نے فرمایا:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾[البقرۃ:۷]

اب دیکھیں! جب دل پر مہر لگ گئی، دل سوچ ہی نہیں رہا تو وہ دماغ کو احکامات ہی نہیں دے گا۔ جب دماغ کو احکامات نہیں دے گا تو دماغ آگے کانوں اور آنکھوں کو احکامات ہی نہیں دے گا۔ تو جب مہر کا عالم یہ ہے کہ دل پر بھی مہر لگ گئی، کانوں پر بھی مہر لگ گئی اور آنکھوں پر بھی پردے آگئے تو ہدایت کے ملنے کا امکان ہی ختم ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ کفار اور مشرکین اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرآن سنتے تھے، اللہ کے کعبہ کا طواف کرتے تھے، کعبۃ اللہ کے اندر داخل ہوتے تھے اور باقاعدہ احرام باندھتے تھے، بچہ پیدا ہو جاتا تو عقیقہ کرتے تھے، قربانی کرتے تھے، سارا کام کرتے تھے، لیکن اللہ کی توحید سمجھ نہ آئی۔

آج بھی آپ دنیا میں دیکھ لیں! کتنے مسلمان ہیں جو نمازیں بھی پڑھ رہے ہیں، رمضان شریف میں روزے بھی رکھ رہے ہیں، حج بھی کر رہے ہیں، زکوتیں بھی ادا کر رہے ہیں، خیراتیں بھی دے رہے ہیں، اور ساتھ ساتھ قبر پر سجدہ بھی کر رہے ہیں، حالانکہ یہ سارے کام کر رہے ہیں، دن میں پانچ دفعہ نماز پڑھتے ہیں، پانچ دفعہ اقرار کرتے ہیں ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾[الفاتحہ:۴] اور پانچ دفعہ دن میں اللہ کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، لیکن پھر قبر پر بھی کھڑے ہیں۔ روزانہ نماز میں کھڑے ہیں ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۹ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ ۝﴾[سورۃ الفاتحہ] روزانہ سیکھ رہے ہیں کہ ہم نے دعا کس سے مانگنی ہے؟ ہدایت ہم نے کس سے مانگنی ہے؟ ہمارا مالک کون ہے؟ یوم الدین کا مالک کون ہے؟ عبادت ہم نے کس کی کرنی ہے؟ مدد ہم نے کس سے مانگنی ہے؟ سب کچھ بھی کر رہے ہیں اور وہاں بھی بیٹھے ہوئے ہیں "یَا شَیْخُ عَبْدُ الْقَادِرِ! شَیْئًا لِلّٰهِ، یَا مُعِیْنَ الدِّیْنِ اَجْمَیْرِیْ! مدد کن، مدد کن" کے وظیفے بھی پڑھ رہے ہیں اور ہیں مسلمان۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اعضاء میں سے جب کوئی عضو غلط ہو جائے تو پھر اس کی بات سمجھ نہیں آتی۔ یوں سمجھ لیں کہ عینک ہے، اس کا شیشہ سفید ہے۔ میں اگر اس کو نظر پر چڑھا لوں تو اس کو ہر چیز اپنے اصلی رنگ میں نظر آئے گی۔ اگر اس کو سبز شیشہ لگا لیں تو آپ کو سبز نظر آئے گا، سرخ عینک لگا لیں تو آپ کو سرخ نظر آئے گا، سیاہ شیشہ لگا لیں تو آپ کو سیاہی نظر آئے گی۔ جب آنکھوں پر پردہ آجائے تو پھر قرآن صحیح معنوں میں نظر نہیں آتا، جب کانوں پر مہر لگ جائے تو حق کی بات اندر داخل ہی نہیں ہو سکتی اور جب دلوں کے اندر مہر لگ جائے تو اللہ کا قرآن سمجھ نہیں آتا۔ اس لیے دعا کریں

کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو مہر اور زنگ سے اور گناہوں کی سیاہی سے محفوظ رکھے۔

وگرنہ دیکھیں کہ مسلمان ہے، کعبۃ اللہ میں کھڑا ہے، اللہ کے گھر میں ہے۔ اب دیکھیں کہ کتنے لوگ ہیں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں مانتے، حالانکہ مدینہ میں جاتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام پڑھنے کے بعد کس پر سلام پڑھا جاتا ہے؟ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور اس کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر، لیکن وہ پھر بھی نہیں مانتے۔ یعنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں کو اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روزہ مبارک میں سلا دیا ہے، بھائی تمہاری قبر اگر کسی پیر کی قبر کے ساتھ بن جائے تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مہربانی کرنا اگر میری موت آئے تو مجھے بھی وہاں دفن کرنا، تاکہ میں قیامت میں اس پیر صاحب کے ساتھ ہوں گا تو مجھے نجات ہو جائے گی۔ یعنی پیر ایک قبرستان میں آجائے تو وہ تو لاکھوں مردے بخشوا لیتا ہے، جو میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں سوئے ہوئے ہیں ان پر ایمان نہیں آرہا، کیا وجہ ہے کہ دلوں پر مہریں لگ گئی ہیں، بات سمجھ میں نہیں آتی ہے، آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے، سامنے کھڑے ہیں، بات سمجھ نہیں آرہی ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پڑھا جاتا ہے یہ ان کی قبر مبارک نہیں ہے، بلکہ ان کا گھر مبارک ہے کہ یہاں بی بی صاحبہ کا گھر تھا، بی بی صاحبہ کی قبر مبارک جنت البقیع میں ہے، یعنی جو جنت البقیع میں ہے اس پر تو صلوٰۃ وسلام پڑھا جائے اور جو مدنی کے پہلو میں سویا ہوا ہے اس پر ......نعوذ باللہ!...... لعنت بھیجی جائے تو اس سے زیادہ کوئی اندھا ہوگا!؟ وجہ کیا ہے؟ وجہ وہی ہے کہ آنکھوں پر پردہ آگیا، بات سمجھ نہیں آرہی، حقیقت نظر نہیں آرہی۔

بندے کو سچائی کی تلاش ہے، لیکن سچائی سمجھ ہی نہیں آرہی۔ ان کو ضرورت ہے، وگرنہ وہ مدینہ میں کیوں آئیں؟ ضرورت تو ان کو بھی ہے، وہ بھی ہدایت کی تلاش میں ہیں، لیکن چونکہ آنکھوں پر پردہ ہے، وہ حقیقت کو دیکھ نہیں سکتے۔ جن کی آنکھوں پر پردہ نہیں ہے وہ جب مکہ میں آتا ہے، مدینہ میں آتا ہے، جتنا بڑا گناہ گار ہو، کتنا بڑا مشرک ہو اور جتنا غلط عقیدے والا ہو واپس جاتا ہے تو اس کا عقیدہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ یہ روضہ مبارک ہے اور حضرت امام الانبیاء، افضل الانبیاء، سید الاولین، رحمۃ للعالمین، خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک ہے، یہ نبی ہے خدا نہیں ہے، جس پر موت نہ آئے کہ خدا تو موت سے پاک ہے، خدا کی قبر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں کھڑے ہو کر کہتے ہیں ''اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!'' معلوم ہوا کہ ہم نے سلام بھیجنا ہے، ہم نے درود بھیجنا ہے اور ہم نے مانگنا نہیں، بلکہ مانگنا اللہ سے ہے۔ آگے چلتا ہے تو ابی بکر رضی اللہ عنہ نظر

آتا ہے، آگے چلتا ہے تو عمر رضی اللہ عنہ نظر آتا ہے، اس کو مسئلہ سمجھ آ جاتا ہے کہ...... سبحان اللہ!...... یہ ایسے وزیر ہیں، ایسے شیخین ہیں کہ زندگی میں بھی ساتھ رہے اور موت میں بھی ساتھ رہے، قبر میں بھی ساتھ رہے اور حشر میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوں گے۔ اب اس نے سلام پڑھ لیا، رخ اس نے قبلہ کی طرف کر لیا اور ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ مسئلہ سمجھ آ گیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مانگنا بھی شرک ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مانگنا بھی شرک ہے اور اللہ کے نبیوں سے مانگنا بھی شرک ہے۔ جب سلام پڑھتے ہو تو ادھر رخ کر لو، دعا مانگنی ہو تو پھر اللہ کی طرف رخ کر لو۔ تو اگر ہم اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں مانگ سکتے تو دوسروں سے کیسے مانگ سکتے ہیں؟ وزیروں سے کیسے مانگ سکتے ہیں؟ اب دیکھو کہ جب مکہ مدینہ سے جائے گا تو عقیدہ ٹھیک ہو گا کہ نہیں ہو گا؟

بالکل صاف عقیدہ ہو جائے گا کہ اچھا جن پر موت آتی ہے وہ بشر ہو سکتا ہے، انسان ہو سکتا ہے، اللہ کا نبی ہو سکتا ہے، وہ خدا نہیں ہو سکتا اور اسی طریقے سے سیدنا ابوبکر و سیدنا عمر رضی اللہ عنہما خدانخواستہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے نہ ہوتے تو ان کے دامن میں نہ ہوتے، ان کے قدموں میں نہ ہوتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک میں نہ ہوتے۔ اور ہم کو تو جنت ملے گی اور وہ تو جنت میں سو رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا بَيْنَ بَيْتِي وَ مِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ.))

''میرے گھر سے لے کر میرے منبر تک جنت کا ٹکڑا ہے۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۱۹۵، باب: فَضْلِ مَا بَيْنَ الْقَبْرِ وَالْمِنْبَرِ]

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں سلا دیا ہے، مسئلہ سمجھ آ گیا، پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر کے پاس آئے گا، پھر جنت البقیع میں آئے گا جہاں آلِ نبی ہیں، ازواجِ نبی ہیں، اصحابِ رسول ہیں، امام دار الہجرۃ امام مالک رحمہ اللہ ہیں، سب قبروں میں سوئے ہوئے ہیں، مسئلہ سمجھ آ جائے گا۔

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝﴾ [الرحمن: ۲۶، ۲۷]

یا اللہ! اگر ان پر فنا آ گئی ہے، صرف تیری ذات باقی ہے، جس پر کبھی فنا نہیں آئے گی۔ تو اگر اللہ دلوں کے پردے کھول دے تو سارا مسئلہ سمجھ آ جاتا ہے اور اگر دلوں پر مہر لگ جائے تو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس کے باوجود بھی...... نَعُوْذُ بِاللّٰهِ! ثُمَّ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ! ثُمَّ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ!...... شیخین کو ماننے پر تیار نہیں۔ مکہ والے کعبہ شریف کا طواف کر رہے ہیں، طواف جب ختم ہو جاتا ہے تو پھر ''ہبل'' کے پاس آ جاتے ہیں، پھر ''لات'' کے پاس آ جاتے

ہیں، پھر بتوں کے پاس آجاتے ہیں اور صفا و مروہ پر دوڑ رہے ہیں تو صفا پر بھی بت رکھا ہے اور مروہ پر بھی بت رکھا ہے۔ اسی طرح بعینہٖ جن لوگوں کی آنکھوں پر پردہ آجاتا ہے وہ جب کعبہ میں آتے ہیں تو شرک کرتے ہیں، نکلتے ہیں تو شرک کرتے ہیں۔ جیسے آئے، اسی طرح خالی چلے گئے۔ مسئلہ سمجھ ہی نہیں آرہا، لیکن جن کے لیے اللہ نے راہیں کھول دی ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے لیے ہدایت کا راستہ آسان فرما دیتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓي اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ [البقرۃ:۷]

مہر کر دی ہے اللہ نے ان کے دلوں پر۔

مہر کیسے لگتی ہے؟

بعض علماء نے فرمایا کہ یہ مجاز ہے، یہ ضروری نہیں کہ وہ مہر ہمیں نظر آئے، بلکہ ان اعضاء سے جب فائدہ حاصل نہیں ہوا تو گویا کہ ان پر مہر لگی ہوئی ہے۔

لیکن محققین علماء نے لکھا ہے کہ حقیقتاً اللہ تبارک وتعالیٰ مہر لگا دیتے ہیں ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ ان کے دلوں پر بھی مہر ہوتی ہے، ان کے کانوں پر بھی مہر ہوتی ہے ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ﴾ [الاعراف:۱۷۹] ان کی آنکھیں ہیں، لیکن دیکھتے نہیں۔ ان کے کان ہیں، لیکن سنتے نہیں۔ ''لَا يَفْقَهُوْنَ، لَا يَعْقِلُوْنَ'' ہدایت کی بات نہیں سمجھتے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے جو گناہ کیے ہیں، جو کفر کیا ہے اور جو شرک کیا ہے اس نے ان کو ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔ جب گھیر لیا ہے تو گویا گناہ اس پر چھا گئے، اوپر اللہ نے مہر کر دی، [ابن کثیر:۱/۴۵] جیسا کہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک نکتہ لگ جاتا ہے، جب دوسرا گناہ کرتا ہے تو دوسرا نکتہ لگ جاتا ہے، اسی طرح گناہوں سے سیاہ نکتے لگتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ دل سیاہ ہو جاتا ہے اور جب دل سیاہ ہو جائے پھر آدمی کو گناہ گناہ ہی نظر نہیں آتا۔

[سنن الترمذی، حدیث ۳۳۳۴ سورۃ: ویل للمطففین]

اللہ تعالیٰ ہمیں، آپ کو اور ہر مسلمان کو ایسے حال سے بچائے۔ (آمین)

تفسیر:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اَلْخَتْمُ عَلَى الْقَلْبِ وَالسَّمْعِ'' اللہ تعالیٰ

دلوں پر بھی اور کانوں پر بھی مہر فرما دیتے ہیں۔ رین طبع سے کم ہے۔ رین کے بعد طبع ہے اور طبع سے بھی زیادہ شدید أقفال ہے، جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس میں فرمایا:

﴿كَلَّا بَلْ سكتة رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [المطففين: ۱۴]

رین کا معنی ہوتا ہے دلوں پر رین، میل، زنگ جم جانا۔ اور طبع کا معنی ہوتا ہے مہر لگ جانا۔ اور پھر فرمایا ﴿عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ [محمد: ۲۴] کہ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں؟ تو أقفال طبع سے بھی زیادہ شدید ہے۔

حضرت اعمش رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے ہمیں مثال کے طور پر سمجھایا، فرمایا کہ دیکھو! جیسے یہ ہاتھ ہے تو گویا یہ ہاتھ ایک دل ہے۔ دل جب گناہ کرتا ہے تو ایک انگلی بند ہوگئی، پھر جب گناہ کرتا ہے تو دوسری انگلی بند ہوگئی، پھر گناہ کیا اور بند ہوگئی، پھر گناہ کیا تو پوری مٹھی بند ہوگئی، اس پر مہر لگا دی گئی۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے مثال دے کر سمجھایا کہ جیسے ہاتھ کھلا ہوا ہے، اس کو آہستہ آہستہ بند کرتے چلے جائیں اور اس کے اوپر مہر لگا دیں تو دل کا عالم بھی یہی ہوتا ہے کہ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو دل تھوڑا بند ہوگیا، اور گناہ کیا تو مزید بند ہوگیا، اور گناہ کیا تو مزید بند ہوگیا، اور گناہ کیا تو مزید بند ہوگیا، حتیٰ کہ پورا بند ہوگیا اور اوپر مہر لگ گئی۔ [ابن کثیر: ۱/ ۴۵، الآیۃ: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ]

حضرت مجاہد رحمہ اللہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ دراصل ایک ہی چیز ہے کہ رین کا معنی بھی وہی ہے: دلوں پر زنگ جم جانا، اور طبع کا معنی بھی وہی ہے یعنی اس کو رین بھی سمجھا جاتا ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے یہ ترجمہ بھی کیا ہے کہ ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ جب کافروں نے اپنے تکبر کی وجہ سے اعراض کیا، اور جب ان کو اللہ کی توحید کی دعوت دی گئی انہوں نے اس کو نہ سنا۔ اس کو بطور مثال کہہ دیا گیا کہ ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ گویا کہ ان کے دلوں پر مہریں ہیں، یعنی حقیقت میں ان کے دلوں پر مہر نہیں، بلکہ ان کے اعراض اور نہ سننے کو بطور مثال یا بطور تشبیہ کہہ دیا گیا۔ جیسے کہا جاتا ہے "إِنَّ فُلَانًا أُصَمَّ عَنْ ذٰلِكَ" کہ فلاں آدمی کو ہم ملنے گئے تو گونگا بن گیا، یعنی بولا نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ گونگا یا بہرہ ہوتا ہے، بلکہ ایک مثال دی جاتی ہے کہ فلاں کی بات سنی نہیں ہے۔ تو بعض علماء نے یہ ترجمہ بھی کیا ہے، لیکن مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات بالکل غلط ہے، کیونکہ جب اللہ نے قرآن میں ارشاد فرما دیا ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ اللہ نے خود مہر فرمائی ہے ان کے دلوں پر بھی، ان کے کانوں پر بھی، تو اس کا یہ ترجمہ کرنا کہ یہ مثال

ہے اور یہ تشبیہ ومجاز ہے، درست نہیں ہے۔ علامہ زمخشری نے پانچ وجوہات اس آیت کے ترجمہ میں نقل کی ہیں، لیکن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ سب ضعیف ہیں۔

اصل وجہ یہ ہے کہ وہ معتزلی ہے اور معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ مہر کر دینا کسی کے دل کو ہدایت سے بند کر دینا یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے، تو...... نعوذ باللہ...... یہ صفت قبیح ہے، اللہ تعالیٰ ہر قبح سے پاک ہیں، لہٰذا یہاں حقیقی معنی مراد نہیں لیتے، بلکہ مجازی معنی مراد لیتے ہیں۔ تو مفسر نے فرمایا کہ اس کے اعتزال کی وجہ یہ ہے، وگرنہ اگر وہ قرآن پر نظر دوڑاتا کہ ﴿فَلَمَّا زَاغُوٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ [الصف:۵] کہ جب انہوں نے کجی اختیار کی تو اللہ نے ان کے دلوں کو بھی ٹیڑھا کر دیا ہے۔ اور فرمایا:

﴿وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ [الانعام:۱۱۰]

''جس طرح یہ لوگ پہلی بار (قرآن جیسے معجزے پر) ایمان نہیں لائے، ہم بھی (ان کی ضد کی پاداش میں) ان کے دلوں اور نگاہوں کا رخ پھیر دیتے ہیں، اور ان کو اس حالت میں چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں۔''

تو اللہ تعالیٰ کا ہر کام عدل ہے، اللہ تعالیٰ کا ہر کام احسن ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ تمام صفاتِ نقصان سے پاک ہے۔ جب کافروں نے اس کی مخلوق ہونے کے باوجود اس کا انکار کیا تو اللہ نے ﴿جَزَآءً وِّفَاقًا﴾ (النبا:۲۶) اس کی سزا کے طور پر مہر فرما دی، لہٰذا بلا وجہ اللہ تعالیٰ کے کلامِ ظاہر کے ترجمہ کو چھوڑ کر بعید از کار تاویلات کا سہارا لینا اچھا نہیں ہوتا۔ [ابن کثیر: ۱/۲۶، الآیۃ: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ]

اس لیے فرمایا: یہ حقیقت ہے کہ جب کافر کفر میں بڑھ جاتا ہے، جب مشرک شرک میں بڑھ جاتا ہے تو انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں آ جاتا ہے، اللہ کے قرآن کی تکذیب کرتا ہے، اللہ کے قرآن کو جھٹلاتا ہے، اللہ کے پیغمبروں کو جھٹلاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی سزا کے طور پر اس کے دل کو بند فرما دیتے ہیں۔

آپ دیکھیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام دنیا میں کیوں بھیجے گئے کہ لوگوں کو ہدایت دیں، لیکن جب حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کو ساڑھے نو سو سال تک دعوت دی، جب قوم والے ایمان نہ لائے، کفر میں بڑھتے گئے، بڑھتے گئے تو آخر اللہ کے نبی علیہ السلام نے بھی دعا کی:

﴿وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَي الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا﴾ [نوح:۲۶]

''اور کہا: حضرت نوح علیہ السلام نے یا اللہ! اب دنیا پر کوئی کافر کا گھر بھی باقی نہ رہے۔''

﴿إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا﴾ [نوح: ۲۷]

یا اللہ! اگر یہ کافر زندہ رہے تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے ﴿وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا﴾ ان کی آنے والی نسلیں بھی نہیں پیدا ہوں گی، مگر فاجر یا کافر۔ کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام نے تو کئی نسلیں دیکھ لیں، دادا دیکھ لیا، پھر اس کی اولاد، پھر اس کی اولاد، پھر اس کی اولاد، آپ کی ایک ہزار پچاس سال عمر تھی۔ لہٰذا اللہ کے نبی جب ان کے ایمان سے مایوس ہو گئے تو اللہ سے ان کی ہلاکت کی دعا کی۔ اللہ تو ''علیم بذات الصدور'' ہیں، اللہ جانتے ہیں کہ یہ بندہ اب ہدایت کے قابل نہیں رہا، اب اس کے اندر ہدایت کی صلاحیت ہی نہیں رہی تو پھر وہ بھی ہمیشہ کے لیے مہر فرما دیتے ہیں:

﴿خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ [البقرۃ: ۷]

تو قرآن مقدس کا ترجمہ وہ ہونا چاہیے جو اللہ پاک نے قرآن پاک میں خود بیان فرمایا اور ترجمہ ہمیشہ وہی ہونا چاہیے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

قرآن کا ترجمہ کرنے کے اہل کون؟

اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ قرآن کا ترجمہ یا تفسیر ان لوگوں کو کرنا چاہیے جن کو اللہ کے قرآن کا بھی پورا پورا علم ہو، حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی پورا پورا علم ہو، آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی پورا پورا علم ہو، آثار تابعین کا بھی پورا پورا علم ہو اور اسی طرح ادب اور نحو کے قواعد اور اصول کا بھی پورا پورا علم ہو، وگرنہ اللہ کے قرآن کی ایک ایسی تفسیر اور ایسا ترجمہ بیان کرنا جو تابعین سے ثابت نہ ہو، صحابہ سے ثابت نہ ہو یہ راستے سے بھٹک جانے والی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ باطنیہ راستے سے بھٹک گیا، جس نے اللہ کے قرآن کی تفسیروں کو بدل ڈالا اور کہا کہ یہ ظاہری تفسیر ہے اور ایک باطنی تفسیر علیحدہ ہے۔ جیسے اللہ نے بنی اسرائیل کو فرمایا تھا کہ ایک گائے ذبح کرو۔ تو وہ کہتے ہیں کہ یہ گائے کا قصہ ایک اشارہ ہے، مراد یہ تھی کہ تم اپنے نفس کو ذبح کرو، اس کو گائے کے نام سے ذکر کیا گیا ہے، وگرنہ گائے کے ذبح کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ اللہ کے قرآن کو چھوڑ دینا ہے۔ قرآن حضرت محمد رسول اللہ خاتم الانبیاء حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے اور اللہ نے جیسے قرآن اتارا ہے، اسی طرح قرآن کے جو معانی ہیں وہ اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خود پڑھا دیے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ قرآن لفظاً اور معناً صحابہ رضی اللہ عنہم کو پڑھا دیا، پھر اس کا عملی

نمونہ پیش کیا۔

مفسرین فرماتے ہیں اگر وہ فرقہ باطنیہ والے ان آیات کو دیکھ لیتے تو ایسی بات نہ کہتے اور ایسی تاویلیں نہ کرتے۔

دلوں کا پھیرنا اللہ کے اختیار میں ہے:

امام قرطبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے مہر کردی ہے ان کے دلوں پر ﴿بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ [النساء:١٥٥] اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی ہے ان کے کفر کی وجہ سے۔ اور انہوں نے وہ حدیث مبارک بھی بیان کی ہے کہ دلوں کا پھیرنا بھی میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْ قَلْبٍ إِلَّا بَيْنَ أُصْبُعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ إِنْ شَاءَ أَقَامَهُ وَإِنْ شَاءَ أَزَاغَهُ.))

[سنن ابن ماجہ، حدیث:١٩٩، باب: فيما أنكرت الجهمية]

((اَلْقُلُوْبُ بَيْنَ أُصْبُعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ اللّٰهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَآءُ وَيُصَرِّفُهَا كَيْفَ يَشَآءُ.))

[سنن الترمذی، حدیث:٢١٤٠، باب: ما جاء أنّ القلوب بين أصبعي...]

''دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی انگلیوں کے اندر ہیں، وہ جس طرح چاہیں دلوں کو پھیر دیں (چاہیں تو ہدایت دے دیں، چاہیں تو گمراہی میں ڈال دیں)۔''

اسی لیے میرے آقا ﷺ دعا مانگتے تھے:

((يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ! ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ))

''ہمارے دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو دین پر ثابت فرمادے۔''

[سنن الترمذی، حدیث:٢١٤٠، باب: ما جاء أنّ القلوب بين أصبعي...]

تو جب دلوں کا پھیرنا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے تو ان پر مہر کرنا بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

[ابن کثیر:١/٣٦، الآیۃ: ختم اللہ علی قلوبهم وعلی سمعهم]

دل کا سیاہ ہونا:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک روایت بیان کی ہے کہ دنیا میں جو فتنے آتے ہیں ان کی مثال دیتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا:

((تُعْرَضُ الْفِتَنُ عَلَى الْقُلُوْبِ كَالْحَصِيْرِ عُوْدًا عُوْدًا، فَأَيُّ قَلْبٍ أُشْرِبَهَا نُكِتَ فِيْهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ.)) [صحیح مسلم،حدیث:۲۳۱،بَابُ بَيَانِ أَنَّ الْإِسْلَامِ بَدَأَ غَرِيبًا...]

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک پر چھا ہوتا ہے۔ جیسے وہ ایک ایک پتا ہوتا ہے، بناتے جاتے ہیں تو مصلیٰ بن گیا، پر چھان بن گیا۔ کھجوروں کے گوشے لے لیتے ہیں، پھر اس کے پتوں سے یہ بناتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا کہ جو فتنے آتے ہیں وہ بھی ایک ایک کر حملہ آور ہوتے ہیں۔ تو جن کے دل نے ان کا اثر قبول کر لیا ان کے دل میں سیاہی بھرنی شروع ہوگئی اور جن کے دل نے ان کا اثر قبول نہیں کیا اس کو نہ لیا تو اس کے دل میں صفا اور نکتہ بیضاء پیدا ہو گیا۔

تو جن لوگوں کا دل اللہ صاف فرما دیتے ہیں ان کو فتنوں سے کچھ نہیں ہوتا، وہ فتنوں کے دوران بھی دین اسلام پر قائم رہتے ہیں۔ اور جن کے دل سیاہ ہو جاتے ہیں وہ ایسے ہو جاتے ہیں جیسے کوئی مٹی کا کوزہ (لوٹا) بالکل بند کر دیا جائے اور اس کے اوپر کوئی چیز لگا دی جائے کہ اب اس کے اندر کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی اور باہر بھی نہیں نکل سکتی۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ برائی کو برائی نہیں سمجھتے، بلکہ بھلائی کو برائی سمجھتے ہیں اور برائی کو بھلائی سمجھتے ہیں۔

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک حق تفسیر وہی ہے جو حدیث رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا أَذْنَبَ ذَنْبًا كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فِي قَلْبِهِ))

جب مومن بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، پھر اگر توبہ کر لے تو وہ دھل جاتا ہے۔ اگر پھر گناہ کر لے تو پھر نقطہ لگ جاتا ہے، توبہ نہ کرے تو ہوتے ہوتے بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس کے گناہوں کی وجہ سے وہ سیاہی دلوں کے اوپر چھا جاتی ہے۔ تو اس لیے پھر اس کو عبادت میں لذت نہیں ملتی۔ (اور یہ سیاہی ظاہری نہیں ہوتی، بلکہ باطنی ہوتی ہے۔)

[السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث:۲۱۳۸۲]

دلوں اور کانوں پر مہر لگنے کا معنی:

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب گناہ بار بار دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں تو دلوں کو بند کر دیتے ہیں۔ اور جب دل بالکل بند ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر مہر لگ جاتی ہے۔ اور جب

مہر لگ جاتی ہے تو اب ایمان اس کے اندر داخل نہیں ہوسکتا اور کفر اندر سے باہر نکل نہیں سکتا۔ اسی کو اللہ نے بیان فرمایا: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ﴾ (البقرۃ:۷)۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے برتن کو بند کر دینے کے بعد اوپر مہر لگا دیتے ہیں یا لفافہ کو بند کر کے اوپر مہر لگا دیتے ہیں۔ اب باہر کی کوئی چیز اندر نہیں جاسکتی اور اندر کی چیز باہر نہیں جاسکتی۔ اللہ نے جب کافروں کے دلوں پر مہر لگا دی تو اب ایمان اندر داخل نہیں ہوسکتا اور کفر باہر نہیں نکل سکتا۔

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ﴾ یہاں وقف ہے۔ کیونکہ یہ جملہ پورا ہو گیا۔ ﴿وَعَلٰٓي اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ﴾ یہ جملہ تامہ علیحدہ ہے۔ کیونکہ مہر دلوں اور کانوں پر ہوتی ہے اور آنکھوں پر ''غِشَاوَةٌ'' یعنی پردہ ہوتا ہے۔ تو لہٰذا وقف تام ہو جائے گا۔ ''غِشَاوَةٌ'' کا معنی ہے پردہ، جیسا کہ حضرت سدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی یہی ترجمہ بیان فرمایا ہے ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ کہ ان کے دلوں پر مہر ہے، وہ اللہ کے قرآن کو سمجھتے نہیں ہیں۔ ان کے کانوں پر مہر ہے، وہ اللہ کے قرآن کی دعوت کو سنتے نہیں ہیں۔ ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، وہ سیدھا راستہ دیکھتے نہیں ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہی ارشاد فرمایا کہ ان کے دلوں پر بھی مہر ہے، ان کے کانوں پر بھی مہر ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

[ابن کثیر: ۱/۴۶، الآیۃ: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ]

کفر کی معافی ہے منافقت کی نہیں:

اسی لیے حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں جہاں کافروں کے لیے دعا کی، اللہ نے قبول فرمائی۔

سیدنا ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کافرہ تھیں تو ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں کہ میری والدہ کافرہ ہے اور آپ کی شان میں بڑی بے ادبی اور گستاخی کے ایسے الفاظ کہہ جاتی ہے جو میں برداشت نہیں کر سکتا، لیکن میں ماں کو مار بھی نہیں سکتا، اس کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ میری ماں ہے۔ اگر میں صبر کرتا ہوں تو آپ کی شان میں گستاخی ہوتی ہے برداشت کرتا ہوں تو برداشت نہیں ہوتا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کر دی۔ آپ نے فرمایا:

((اَللّٰهُمَّ اهْدِ أُمَّ أَبِي هُرَيْرَةَ)) [مسلم باب الفضائل ۱۵۸، مسند احمد، شرح السنۃ]

"یا اللہ! ابو ھریرہ کی اماں کو ہدایت عطا فرما۔"

حضور ﷺ نے دعا فرمائی۔ سیدنا ابی ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں حضور ﷺ کی مجلس سے واپس اپنے گھر میں آیا تو میری والدہ غسل کر کے کپڑے پہن کر تیار بیٹھی تھیں۔ اور مجھے کہا: ابی ھریرہ! مجھے جلدی جلدی حضور ﷺ کے پاس لے چلو۔ میں نے کہا: عجیب بات ہے کہ حضور ﷺ کے پاس جا کر وہاں کوئی بے ادبی نہ کرے تو میں نے کہا: اماں جان! آپ نے وہاں کیا لینا ہے؟ انہوں نے کہا: باتیں نہ کرو اور مجھے جلدی جلدی وہاں لے چلو۔ بوڑھی ماں تھیں۔ فرماتے ہیں: میں ان کی لکڑی پکڑ کر ٹیک لگاتے لگاتے آہستہ آہستہ حضور ﷺ کی خدمت میں لے آیا۔ جب حضور ﷺ کی خدمت میں آئیں تو کہا کہ حضور! مجھے کلمہ پڑھا دیں، میں مسلمان ہوتی ہوں۔ تو حضور ﷺ نے کلمہ پڑھا دیا۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۹۱، بَابُ: مِنْ فَضَائِلِ أَبِي هُرَيْرَةَ الدَّوْسِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ]

بہر حال جب حضور ﷺ نے دعا مانگی تو فوراً قبول ہوگئی، لیکن منافق ایسے بد بخت ہیں کہ ان کے بارے میں اللہ نے پاک پیغمبر ﷺ کو فرما دیا کہ ان کا جنازہ نہ پڑھا کریں، ان کی قبروں پر نہ حاضر ہوا کریں، ان کے لیے دعا نہ کیا کریں۔ اگر آپ ان کے لیے ستر دفعہ بھی بخشش مانگیں گے تو بھی اللہ ان کو معاف نہیں کریں گے۔ تو نفاق اتنا شدید اور خطرناک فتنہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر مسلمان کو نفاق سے بچائے۔

جعلی پیر:

اللہ معاف فرمائے! ابھی ہم یورپ کے سفر میں تھے۔ وہاں لوگوں نے بتلایا کہ یہاں ایک دو پیر صاحبان ایسے آئے ہیں کہ پیر بن گئے۔ اب لوگ بے چارے ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں تو لوگوں نے تعویذ لینے شروع کیے اور دو دو سو اور چار چار سو آدمی ہر وقت دروازے پر کھڑا ہے۔ مکان بن گئے، بلڈنگیں بن گئیں، کاریں مل گئیں اور اس کے بعد جو بھی لڑکی گئی اس کی عزت محفوظ نہیں رہی۔ آخر...... نعوذ باللہ...... ایک دو لڑکیوں کا کیس ہوا، پکڑے گئے۔ حکومت نے پکڑا اور جیلوں میں پڑے ہیں۔ یعنی انجام یہ ہے کہ اب ظاہر کیا کیا اور اندر کیا کیا؟ اس کو نفاقِ عملی کہتے ہیں، یعنی عمل میں نفاق ہے، وگرنہ تو مسلمان ہیں، کلمہ تو پڑھتے ہیں۔

حالاتِ حاضرہ:

میں ایک دفعہ کسٹم میں آ رہا تھا تو جب سامان رکھا تو کسٹم کا جو آفیسر تھا وہ نوجوان لڑکا تھا، شاید کہیں دیکھا ہوگا۔ تو

وہ کہنے لگا کہ شیخ! آپ اس بیگ کا تالا کھول دیں اور اس کے بعد بند کر دیں۔ میں نے کہا کہ بھائی! آپ دیکھ لیں۔ اس نے کہا: مجھے شرم آتی ہے کہ آپ حرم میں پڑھاتے ہیں اور میں کئی دفعہ آپ کا درس سن چکا ہوں تو اب میں آپ کی تلاشی لوں، مجھے تو اچھا نہیں لگتا، لیکن اس نے کہا: حضرت! ہم کیا کریں؟ لوگ داڑھیوں میں ہیروئن چھپا کر لے آتے ہیں، ہم نے پکڑے ہیں، داڑھی کے اندر ہیروئن کی پڑیاں باندھی ہوئی ہیں اور کچھ عورتیں پکڑیں گئیں جن کو کیپسول کھلا دیے گئے کہ بعد میں پیٹ سے نکال لیں گے اور زیادہ ہو گئے۔ اور کوئی کیپسول پھٹ گیا تو وہ مر گئی۔ جب مر گئی تو کیپسول نکل آئے، کیا کوئی انسان داڑھی کا استعمال یوں کرے کہ لوگ سمجھیں کہ داڑھی والا ہے اور وہ اندر چور ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے!! اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام داڑھی والے بدنام ہو جاتے ہیں، تمام داڑھی والوں کی عزت دنیا میں ختم ہو جاتی ہے۔ ایک آدمی گندا عمل کرے گا، لیکن سارے ذلیل ہو جائیں گے۔ ایک مچھلی سارے جال کو گندا کر دیتی ہے، ایک پیشاب کا قطرہ پڑ جائے تو دو من دودھ حرام ہو جائے، ایک گندگی کہیں لگا دو سارے گھر میں بدبو ہو جائے گی۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ گناہ تو کوئی ایک کرتا ہے، بری حرکت تو ایک کرتا ہے، لیکن انجام یہ ہوتا ہے کہ ہر داڑھی والا ان کی نظر میں مشکوک ہو جاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے! کوئی لوگ ایسے آئے کہ ٹانگوں پر پلستر چڑھائے ہوئے ہیں، انہوں نے سمجھا کہ بے چارے کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے، لیکن اس نے پلستر کے نیچے نشہ باندھا ہوا ہے۔ اب اگر کوئی آئے تو اس کو ایکسرے مشین میں لے جاتے ہیں کہ پہلے ایکسرے کرو، کیونکہ وہ تنگ آ گئے ہیں۔ جب ہمارے حالات اور اعمال یہ ہوں تو پھر ہمارے عمل کے مطابق ہم سے نمٹا جائے گا، وگرنہ تو یہ ہوتا تھا کہ مسلمان کا چہرہ دیکھنے کے بعد کافر مسلمان ہو جاتے تھے، مسلمانوں کی ملاقات سے کافر مسلمان ہو جاتے تھے اور اب ہماری داڑھیاں دیکھنے کے بعد بھی اعتبار نہیں، حج پڑھنے کے بعد بھی اعتبار نہیں، حاجی بننے کے بعد بھی اعتبار نہیں اور نمازی بننے کے بعد بھی اعتبار نہیں۔ حرم کے اندر کتنے لوگ ہوتے ہیں جو بے چارے رو رہے ہوتے ہیں، کسی کا پاسپورٹ غائب ہے، کسی کا پرس غائب ہے اور کسی کے جوتے غائب ہیں۔ کوئی جن لے جاتے ہیں؟ یہودی لے جاتے ہیں؟ یا باہر سے کوئی کافر ہندو چوری کرنے کے لیے آتا ہے؟ مسلمان ہے، نماز پڑھنے کے لیے آیا، جوتا لے کر چلا گیا۔ پرانا جوتا ہو اس کو کبھی بھی نہیں اٹھاتے، نیا جوتا ہو۔ آپ ''اللہ اکبر'' کہیں گے اور ادھر جوتا ختم۔ اب اللہ کے حرم میں چوری کرنے کے لیے آیا ہوا ہو تو آدمی کیا کرے!؟ اس لیے اللہ

پاک سے دعا کریں کہ اللہ پاک ہمیں نفاقِ اعتقادی سے بھی بچائے اور نفاقِ عملی سے بھی بچائے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں (منافق ہیں) جو کہتے ہیں ہم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور وہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

وہ اللہ اور ایمان والوں سے دھوکہ بازی کرتے ہیں اور وہ دراصل کسی کو دھوکہ نہیں دیتے، مگر اپنے آپ کو اور وہ نہیں سوچتے۔

سورۂ بقرہ کی پہلی چار آیات خالص متقین کے لیے تھیں، جو اندر باہر سے سچے مومن ہوں، ان کی صفات کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے ذکر فرمایا۔ اور دوسری قسم ان کے مقابلہ میں پکے کافر، کھلے ہوئے کافر، اندر سے بھی کافر، باہر سے بھی کافر، یعنی زبانی طور پر بھی کفر اور باطنی طور پر بھی کفر۔ اب ان آیات میں ایک تیسری قسم کا ذکر ہے کہ جو لوگ ظاہر میں ایمان لاتے ہیں اور باطن کے اندر کفر کو چھپائے ہوئے ہیں، اس کو قرآن پاک کی اصطلاح میں منافق فرمایا گیا ہے۔ منافق کا معنی یہی ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر باطن کے خلاف ہو، اس کا فعل قول کے خلاف ہو، اس کی ظاہری وجاہت اس کے چھپے ہوئے کے خلاف ہو، اس کا نام نفاق ہے۔ اور منافق باعتبار جرم کے بھی زیادہ خطرناک ہے اور باعتبار ضرر کے بھی، یعنی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تیرہ آیات مبارکہ میں ان کے احوال کو کھول کر بیان فرمایا ہے۔ مومنین کی صفات میں چار آیتیں آئیں اور کافروں کے احوال میں صرف دو آیات آئیں، لیکن منافقین کے بارے میں تیرہ آیات ہیں، جو سورۃ البقرہ میں ہیں۔ اور اسی طرح مختلف سورتوں میں اللہ نے منافقین کے بارے میں بڑا کھول کھول کر بیان فرمایا ہے، جیسے ''سورۃ المنافقون'' میں منافقین کے احوال کو بیان کیا گیا ہے۔

ان آیات کے نزول کے وقت مدینہ کے معروضی حالات:

حضور ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لے آئے مدینہ میں دو بڑے قبیلے: اوس اور خزرج آباد تھے۔ یہ بہت بڑے قبیلے تھے، اللہ نے ان کو دولت اسلام سے مالا مال فرما دیا، وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہو گئے اور حضور ﷺ

کے جانثار اور فدائی بن گئے۔ ابھی میرے آقا حبیب کبریا ﷺ مکہ مکرمہ میں تھے کہ مدینہ منورہ سے تھوڑے تھوڑے لوگ آکر حضور ﷺ کی بیعت فرماتے رہے اور اسلام قبول کرتے رہے تو سب سے پہلی بیعت ''بیعة العقبة'' ہے۔ منیٰ کے اندر جب آپ جاتے ہیں تو جہاں جمرة العقبة ہے...... اصل میں یہ ''العقبة'' اس وادی کا نام ہے، اس سے کچھ پہلے یعنی تقریباً چار سو یا پانچ سو قدم پہلے ایک جگہ ہے، جہاں سب سے پہلے مدینہ منورہ سے سات آدمی آئے اور حضور ﷺ تشریف لے گئے اور آپ نے جا کر ان کو اسلام سکھایا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ کوئی آدمی ہمیں عطا فرمائیں جو مدینہ منورہ میں رہ کر ہمیں قرآن کی تعلیم دے۔ حضور ﷺ نے ایک صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو اس ڈیوٹی پر بھیجا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ذمہ لگایا کہ آپ مدینہ منورہ جا کر ان مسلمانوں کو بھی قرآن پڑھائیں اور ان کے علاوہ کو دعوت اسلام دیں۔...... انہوں نے وہاں جا کر بڑی محنت کی اور...... الحمد للہ!...... دوسرے سال میں سات کے بجائے ستر آدمی اسلام لانے کے لیے حاضر ہوئے۔ تو اب ...... الحمد للہ!...... مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی کافی تعداد ہوگئی۔ ادھر جب مشرکین کا ظلم و جور بڑھ گیا، جب ظلم و طغیان حد سے نکل گیا تو حضور ﷺ نے صحابہ کو ہجرت کا حکم دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور پھر بعض لوگوں نے وہیں سے مدینہ کی طرف ہجرت کر لی اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے سیدھا مکہ مکرمہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ تو اب انصار نے جن کی آپس میں بہت بڑی دشمنیاں اور بہت بڑے جھگڑے تھے، لیکن اللہ نے ان کو اسلام کی دولت سے مالا مال کر دیا اور وہ آپس میں بھائی بھائی اور ''رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ'' کی تفسیر بن گئے اور انصار نے مہاجرین کو اپنا بھائی بنالیا اور اسلام مدینہ منورہ میں پوری قوت کے ساتھ جلوہ فگن ہوا اور اسلام کو اللہ نے غلبہ نصیب فرما دیا۔

تو اب کچھ قبائل ایسے تھے جن کا یہودیوں سے زیادہ تعلق تھا، کیونکہ یہود بھی مدینہ منورہ میں آباد تھے۔ بنو قریظہ اور بنو نضیر یہودیوں کے دو بڑے قبائل تھے۔ اور ان کے سردار کعب بن الاشرف اور عبد اللہ بن ابی، جد بن قیس تھے، تو ان لوگوں نے یہ دیکھا کہ اسلام اب قوت پکڑ گیا ہے، ایک طاقت بن گیا ہے تو انہوں نے یہ سوچا کہ ظاہری طور پر ہم مسلمان ہو جائیں، تا کہ ہماری جان مال بچ جائے۔ اگر مسلمان غالب آ گئے تو ان کے ساتھ ہم ملے ہوئے ہوں گے، ہمیں فائدہ حاصل ہوگا، جان و مال بھی بچ جائیں گے، اموال غنیمت بھی حاصل ہوں گے اور جب یہ فتوحات کریں گے تو ان میں بھی ہماری شرکت ہو جائے گی۔ اور اگر مسلمان یہاں کمزور ہو گئے تو اندر ہم نے

کافروں سے کہا ہوا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ کھڑے ہیں۔ تو ان لوگوں نے اسلام کو، مسلمانوں کو اور حضور ﷺ کو اپنے علم کے مطابق دھوکہ میں مبتلا کیا اور آ کر اسلام کا اظہار کر دیا۔ مسجدوں میں آنے لگ گئے، نمازیں پڑھنے لگ گئے، حضور ﷺ کے قریب بیٹھنے لگ گئے اور کبھی کوئی سریہ یا غزوہ ہوا تو وہ بھی حضور ﷺ کے ساتھ چل پڑے۔ ظاہر وہ اسلام کرتے رہے، لیکن ان کے اندر کفر تھا، اسی طرح ان کو حضور ﷺ کے ساتھ دشمنی رہی اور اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کرتے تھے کہ مسلمانوں کے احوال معلوم کر کے کافروں کو پہنچا دیتے تھے، یہودیوں کو پہنچا دیتے تھے۔ اور جب یہودیوں کو ملتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم تو آپ کے مخلص ہیں، ہم تو اپنے دین پر قائم ہیں، ہم تو صرف مسلمانوں کے رعب سے اور ان کی دہشت سے ڈر کر اسلام کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اور جب بھی ان کو موقع ملا مسلمانوں کو ہر مقام پر نقصان پہنچانے کی پوری پوری کوشش کی۔

جیسا کہ قرآن مقدس میں بھی ایک مفصل واقعہ کا ذکر ہے۔ ایک دفعہ حضور پاک ﷺ ایک غزوہ میں تشریف لے گئے۔ واپسی پر آپ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا، ایک جگہ آپ نے اپنا قافلہ مبارک اُتارا...... ہوتا یہ تھا کہ راستہ میں صحرا کے اندر کچھ کنویں ہوتے تھے، وہاں کچھ عرصہ تک پانی رہ گیا اور کچھ عرصہ کے بعد پانی خشک ہو گیا۔ ایک کچے کنویں پر حضور ﷺ کے غلام، آپ کے خادم پانی بھرنے کے لیے آئے۔ وہاں عبداللہ بن ابی...... جو منافقوں کا سب سے بڑا سردار تھا...... اس کے نوکر اور ملازم بھی پانی بھرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ تو صحابہ نے کہا کہ سب سے پہلے حضور ﷺ کے پانی کے مشکیزے کو بھر لیں کہ صاف پانی حضور ﷺ کو ملے اس کے بعد صاحبین حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا پانی بھرا جائے گا اور اس کے بعد تمام صحابہ پانی بھر لیں ان کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے تو عبداللہ بن ابی کے ایک ملازم نے اس صحابی سے جھگڑا کیا ان کی آپس میں لڑائی ہوئی جب نوکر نے عبداللہ بن ابی کو بات سنائی تو اس نے فوراً اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور کہنے لگا: دیکھ لیا ہے مسلمان اب اتنی طاقت پکڑ گئے ہیں کہ ہمیں پانی بھی نہیں بھرنے دیتے؟ سب سے پہلے حضور ﷺ کا پانی بھرا جائے گا، اس کے بعد مہاجروں کا پانی بھرا جائے گا اور اس کے بعد ہم مدینہ والوں کا پانی بھرا جائے۔ یہ سب تم لوگوں کی کمزوری ہے کہ تم مدینہ والوں نے ان کا استقبال کیا، ان کو اپنے گھر پیش کیے اور ان کو اپنے باغات پیش کیے۔ ان لوگوں کو بغیر محنت کے دولت مل گئی، تمہاری دولت پر پلتے رہے اور آج تمہارے مقابلے پر کھڑے ہو گئے ہیں، لہٰذا یہاں بیٹھ کر حلف اٹھاؤ اور قسم اٹھاؤ:

﴿يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ۚ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ

الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٨﴾ [المنافقون:٨]

"جب ہم مدینہ جائیں گے، ہم طاقت والے ہیں، یہ کمزور ہیں، ہم عزت والے ہیں، ان کو ہم مدینہ سے نکال دیں گے۔"
اور یہ بھی فیصلہ کرو:

﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۭ وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٧﴾﴾ [المنافقون:٧]

کہ حضور ﷺ کے صحابہ پر جو خرچہ کرتے ہو، ان کی امداد کرتے ہو اور جو ان کا مالی تعاون کرتے ہو وہ سب کچھ بند کر دو۔ تو عبداللہ بن ابی نے یہ باتیں کیں اور اپنے اپنے قبیلہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا۔ اور مدینہ منورہ جب پہنچے تو یہ بات حضور ﷺ تک بھی پہنچ گئی کہ عبداللہ بن ابی نے ایسی ایسی باتیں کی ہیں ﴿لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ﴾ اس نے کہا: اقتصادی طور پر مسلمانوں کو نقصان پہنچاؤ۔

اور یہ یہود کی بہت پرانی پالیسی ہے کہ سب سے پہلے مسلمانوں کو اقتصادی طور پر کمزور کیا جائے۔ آج بھی آپ ہندوستان میں دیکھ لیں، ہندوؤں نے ان ان علاقوں میں اور ان ان مقامات پر حملہ کیا ہے جہاں مسلمانوں کی تجارت تھی، جہاں مسلمانوں کی فیکٹریاں تھیں، جہاں مسلمانوں کی انڈسٹریاں تھیں اور جہاں مسلمانوں کے پاس ایک اقتصادی قوت تھی۔ سب سے پہلے انہی کو جلایا گیا، انہی کو لوٹا گیا، تاکہ مسلمان اقتصادی طور پر کمزور ہو جائے۔ یہ یہود نے پہلا سبق پڑھا تھا اور انہی سے یہ سب ہندوؤں نے لیا ہے۔

ان لوگوں نے بھی پہلی پہلی بات یہی کی کہ ﴿لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ﴾ اللہ کے نبی کے ساتھیوں پر خرچ بند کر دو، ان کی امداد بند کر دو۔ جب تم امداد بند کر دو گے تو یہ منتشر ہو جائیں گے، بکھر جائیں گے۔ آخر پیٹ پالنا ہے۔ کمانے کے لیے یا مزدوری کرنے کے لیے یہ مختلف علاقوں میں چلے جائیں گے۔ اللہ نے اسی جگہ فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [المنافقون:٧]

میرے مدنی! تمام آسمان اور زمین کے خزانوں کا میں مالک ہوں۔ یہ کہاں تک مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے؟ یہ منافق جاہل ہیں، یہ تو سمجھ نہیں پا رہے، آسمانوں کے خزانوں پر یہ پابندی لگا سکتے ہیں؟ زمینوں کے خزانوں کو یہ روک سکتے ہیں؟ اور یہ جو ایسی باتیں کر رہے ہیں ہم مدینہ سے نکال دیں گے، ان کو پتہ نہیں ہے کہ ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ

وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾ [المنافقون: ۸] اصل عزت کا مالک اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، اصل عزت اللہ کے نبی کے لیے ہے اور اصل عزت پکے ایمان والوں کے لیے ہے، لیکن یہ منافق ہیں، ان باتوں کو سمجھتے نہیں۔ اور خدا کی شان یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی، جو رئیس المنافقین تھا، یعنی منافقوں کا سردار تھا اور اس کا بیٹا پکا مسلمان تھا، بالکل صحیح معنوں میں عاشقِ رسول تھا۔

جب حضور پاک ﷺ کو خبر ملی تو آپ نے عبداللہ بن ابی کو بلایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے ایسی بات کی ہے؟...... اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ جو آدمی زیادہ قسمیں کھائے تو سمجھ لو کہ منافقت کر رہا ہے، کیونکہ زیادہ قسمیں کھانا بھی جھوٹے بندے کی علامت ہوتی ہے۔ جو سچا آدمی ہے اس کو قسم کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک آدمی سچ بولتا ہے، سچی بات کرتا ہے، اسے کہیں بھی تو کہے گا کہ میں قسم کیوں کھاؤں؟ میں تو سچی بات کہہ رہا ہوں، مجھے قسم کھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ اگر قسم کھائے گا تو کبھی کوئی مجبوری ہوگی، کوئی جھگڑا ہوگا، کبھی کوئی فیصلہ ہوگا، لیکن جو آدمی بات بات پر قسمیں کھائے اور اپنی ہر بات کو قسم سے شروع کرے، علماء نے لکھا ہے کہ یہ بھی علامت ہے اس کے جھوٹے ہونے کی کہ جب اس سے کسی قسم کا مطالبہ ہی نہیں کیا، لیکن وہ بلا وجہ کہہ رہا ہے کہ اللہ کی قسم ہے! مجھے خدا کی قسم ہے! مجھے اللہ کی قسم ہے! میں سچ کہہ رہا ہوں...... عبداللہ بن ابی نے حضور ﷺ کے سامنے آکر قسمیں کھائیں ''وَاللّٰهِ! يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!'' اللہ کی قسم ہے! آقا! ہم نے یہ بات کبھی سوچی بھی نہیں ہے، بلا وجہ صحابی غلط رپورٹ پہنچا کر ہم کو لڑانا چاہتا ہے۔ حضور ﷺ نے ان کی ظاہری باتوں پر اعتبار فرما لیا اور اس کو کہا: ٹھیک ہے، تم نے نہیں کہا، اور بات ختم کر دی۔ اور قافلہ کو حکم دے دیا کہ قافلہ چلائیں۔ قافلہ چلتا رہا اور حضور پاک ﷺ نے قافلہ کو آرام بھی نہیں کرنے دیا۔

[تفسیر الرازی، الآیۃ: يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ...]

اس کی وجہ یہ تھی کہ قافلے والے چلتے رہیں اور چلتے چلتے اتنے تھک جائیں کہ ان کو آپس میں کوئی جھگڑے کا خیال پیدا نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ آپس میں لڑائی ہو جائے اور قتلِ عام ہو جائے اور اللہ کا رسول ﷺ بھی ان کے اندر موجود ہو۔

تو جب مدینہ کے اندر پہنچ گئے تو عبداللہ بن ابی اپنے گھر کی گلی کے اندر داخل ہونے لگا تو اس کے بیٹے نے تلوار نکال لی اور گلی کے دروازے پر کھڑا ہو گیا، اس نے کہا ''وَاللّٰهِ! لَا يَدْخُلُ'' خدا کی قسم ہے! میں تمہیں آج اپنے گھر

میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔ اس نے کہا: تم عجیب بات کرتے ہو! تم میرے بیٹے ہو، میں تمہارا باپ ہوں، تم ایسے بے ادبی کر رہے ہو؟ اس نے کہا: جو محمد عربی ﷺ کا بے ادب ہو اس سے باپ اور بیٹے کا کیا تعلق ہے؟ تم نے کہا ہے کہ ہم عزت والے ہیں اور...... نعوذ باللہ...... صحابہ ذلت والے ہیں۔ جب تک یہ کلمہ تم واپس نہ لو، اپنی زبان سے اقرار نہ کرو کہ میں ذلیل ہوں اور اللہ عزت والے ہیں پھر تو تم گھر میں داخل ہو سکتے ہو، ورنہ میری تلوار فیصلہ کرے گی۔ لوگوں نے سمجھایا۔ اس نے کہا: سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں اللہ کے پیغمبر ﷺ کے بارے میں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایک لفظ سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اور کتابوں میں آتا ہے کہ عبداللہ بن ابی نے آخر کہا کہ ٹھیک! وہ عزت والے ہیں اور ہم ذلت والے ہیں۔ اس نے کہا: اب تم جا سکتے ہو، ذلیل بن کر رہ سکتے ہو، لیکن مسلمانوں سے عزیز بن کر نہیں رہ سکتے ہو، تم اپنی ذلت کا اعتراف کرو۔

[روح المعانی: الآیۃ: وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ]

یہ وہ منافق تھے جنہوں نے اسلام کو بار بار نقصان پہنچایا۔ جنگِ احد کے موقع پر جب آپ ﷺ اپنے صحابہ کو لے کر کافروں کے مقابلے کے لیے نکلے، یہ بدبخت عبداللہ بن ابی چار سو آدمیوں کی جماعت کو لے کر پیچھے آ گیا۔ کہنے لگا کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں جاتے، مدینہ منورہ کے اندر رہ کر لڑنا چاہیے، مدینہ سے باہر جا کر ہم کیسے مقابلہ کر سکیں گے؟ اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی جماعت ٹوٹ جائے، وحدت ٹوٹ جائے۔ جب ایک ہزار کا لشکر جا رہا ہو، چار سو آدمی بھاگ جائے، باقیوں کے دل بھی کمزور ہو جاتے ہیں۔ اس وقت منافقوں کا کردار یہی تھا، کسی طرح مسلمانوں کو نقصان پہنچایا جائے اور انہوں نے اتنی بڑی بڑی سازشیں کیں۔

ایک دفعہ میرے آقا خاتم الانبیاء حبیب کبریا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ یہودیوں کے علاقے میں، یہودیوں کا جہاں مسکن تھا، یہودیوں کا جہاں قلعہ تھا، ان کے مکانات تھے، ایک قتل کے معاملہ میں جھگڑا تھا، حضور ﷺ اس کا فیصلہ فرمانے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ علاقہ والے پیسہ اکٹھا کر کے دیت ادا کر دو، تاکہ یہ جھگڑا ختم ہو جائے تو اس ضمن میں میرے آقا ﷺ تشریف لے گئے۔ اور یہودیوں کو اطلاع دینے والے یہی منافق تھے کہ حضور ﷺ آ رہے ہیں۔ ان یہودیوں نے بظاہر یہ کیا کہ اپنے قلعہ کے نیچے دیوار کے نزدیک ایک جگہ بنائی اور وہاں بڑا اچھا انتظام کیا اور مسند بنائی کہ حضور ﷺ کو یہاں بٹھائیں گے، بظاہر تو انہوں نے استقبال کا انتظام کیا، لیکن ایک بدبخت کو اس قلعہ کی دیوار کے اوپر چھپا دیا کہ جب حضور (ﷺ) بیٹھ جائیں تو تم اوپر سے

پتھر گرا دو، تا کہ حضور (ﷺ) شہید ہو جائیں اور ہمارا جو جھگڑا ہے یہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ میرے آقا ﷺ تشریف لے جا رہے تھے، اللہ نے جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا اور اپنے پاک نبی ﷺ کو باخبر کر دیا کہ آپ کے دشمنوں نے یہ پروگرام بنایا ہے، آپ وہاں نہ جائیں۔

آپ اندازہ فرمائیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُوْنَ کَرَجُلٍ وَاحِدٍ اَوْ کَمَا قَالَ ﷺ)) [صحیح مسلم، حدیث: ۲۵۸۶، باب: تَرَاحُمِ الْمُؤْمِنِیْنَ...]

مومن ایسے ہیں جیسے ایک جسد ہے، ایک قالب ہے، ایک بدن ہے۔ اگر انگلی میں تکلیف ہوئی تو پورے بدن کو تکلیف ہوگی۔ اگر مسلمان مشرق میں ہوگا تو مغرب کا مسلمان تڑپے گا۔ اگر مغرب میں مسلمان ہوگا تو مشرق کا مسلمان تڑپے گا۔ اور آج کیا عالم ہے کہ ڈیڑھ ارب مسلمان دنیا کے اندر موجود ہیں اور مسلمان مر رہے ہیں، کٹ رہے ہیں، جل رہے ہیں اور ہم ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' بھی نہیں پڑھ سکتے، ہم ان کے لیے دعائیں بھی نہیں مانگ سکتے اور ہم ان کے لیے کوئی غیرت ایمانی کا مظاہرہ بھی نہیں کر سکتے۔ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والے کون ہیں؟ مسلمان ہیں۔ مسلمان مسلمان کے خلاف لڑتا ہے، مسلمان کو مسلمان کے خلاف لڑایا جاتا ہے۔ اسی طرح دیکھ لیں کہ آج جن مجاہدین نے چودہ سو سال پہلے کی تاریخ جہاد کو زندہ کر دیا تھا، آج دیکھیں کہ وہی مجاہدین آپس میں دست و گریبان ہیں، ایک دوسرے پر گولیاں چلا رہے ہیں اور ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں۔ وجہ کیا ہے کہ جب کفر نے دیکھا کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے تو انہوں نے منافق مسلمانوں کو خریدا اور اندر ڈال دیا۔ وہ منافق اب دونوں کو ملنے ہی نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان منافقین کے فتنوں سے محفوظ فرمائے۔ اللہ نے ان آیات مبارکہ میں منافقین کے احوال کو بڑا کھول کر بیان کیا ہے۔

اس کے بعد بات کو سمجھیں کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں جو منافق تھے وہ اعتقادی منافق تھے کہ زبان سے کہتے تھے ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۸] لیکن اللہ نے فرمایا: یہ زبانی کہہ رہے ہیں لیکن، اندر سے مسلمان نہیں ہیں۔

عملی منافق اور ملحد:

اور ایک ہوتا ہے عملی منافق کہ ظاہراً کلمہ بھی پڑھتا ہے، حضور ﷺ کو بھی مانتا ہے، آخرت کو بھی مانتا ہے اور

قیامت کو بھی مانتا ہے، لیکن اس کا عمل شریعت کے مخالف ہے۔ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، لیکن نماز نہیں پڑھتا، کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، لیکن روزہ نہیں رکھتا، کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، جہاد نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، حج نہیں کرتا، زکوۃ نہیں دیتا، شراب پیتا ہے، سود کھاتا ہے، غلط کام کرتا ہے، دعویٰ تو اسلام کا کرتا ہے، لیکن عمل کافروں اور فاجروں والے کر رہا ہے۔ اس کو عملی طور پر منافق کہا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک ملحد ہوتا ہے، ایک زندیق ہوتا ہے۔ ملحد وہ ہوتا ہے جو اللہ کے قرآن کے ظاہر کو تو مانتا ہے، لیکن اس کے ترجمہ کو ایسے بگاڑتا ہے کہ قرآن کی باقی آیات اور فرمانِ محمد ﷺ کے خلاف ہوتا ہے، اسی کو ملحد بھی کہا جاتا ہے اور اسی زندیق بھی کہا جاتا ہے، حتیٰ کہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ جیسے حضور ﷺ کے زمانہ میں منافق ہوتے تھے، اب ہمارے زمانہ میں زندیق ہیں کہ ظاہراً قرآن پڑھتے ہیں، قرآن مانتے ہیں، لیکن قرآن کے ترجمہ کو بدل دیتے ہیں، ظاہراً اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اسلام کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہوتے، اسلام کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے۔ یہ عملی نفاق ہے۔ اور عملی نفاق آجائے تو...... اللہ معاف کرے!...... آہستہ آہستہ آدمی منافقین کی صف میں چلا جاتا ہے۔

منافقین کی بخشش نہیں ہوگی:

اور منافقین کے بارے میں اللہ نے قرآن مقدس میں فرمایا:

﴿إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا﴾ [النساء: ۱۴۵]

منافق کو قیامت والے دن جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں رکھا جائے گا اور وہاں ان کو دردناک سزا دی جائے گی۔ اسی لیے جب حضور ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے لیے نماز جنازہ پڑھی اور اس کے لیے دعائے مغفرت کی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن نازل کر کے فرمادیا:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ أَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾

[التوبة: ۸۴]

میرے محمد مدنی! اگر ان منافقوں کا کوئی مرجائے ان کا جنازہ بھی نہ پڑھیں اور ان کی قبر پر بھی کھڑے نہ ہوں، کیونکہ یہ اصل میں اللہ سے کفر کرنے والے ہیں، اللہ کے رسول کا انکار کرنے والے ہیں۔ باقی آپ اگر ان کے

لیے بخشش مانگتے ہیں تو فرمایا:

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ؀﴾ [التوبۃ:۸۰]

میرے نبی! آپ ان کے لیے بخشش مانگیں یا نہ مانگیں، چاہے ستر دفعہ بھی مانگیں، میں ان کو ہرگز نہیں بخشوں گا، کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو دین سے نکل گئے، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان سے نکل گئے، یہ وہ لوگ ہیں جو ہدایت سے نکل گئے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کو، مسلمانوں کو، اللہ کے انبیاء کو اور اللہ کے رسولوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ تو نفاق اتنی خطرناک چیز تھی کہ صحابہ کرام نفاق سے بہت ڈرتے تھے۔

اعمالِ صالحہ میں مسلمان کی حالت میں فرق:

میرے پاک نبی ﷺ کے ایک صحابی ہیں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ، ایک دفعہ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے: ''نَافَقَ حَنْظَلَةُ'' حنظلہ تو...... نعوذ باللہ...... منافق ہوگیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہیں کیا ہوگیا؟ تم تو پکے مومن ہو، تم کیسے منافق ہوگئے؟ اس نے کہا: حضور! جب آپ کی مجلس میں بیٹھتے ہیں تو دل کی حالت اور ہوتی ہے، دل کے اندر نورِ ایمان ٹھاٹھیں مارتا ہے، دل روشن ہوتا ہے اور دل کے اندر ماسوائے اللہ اور اللہ کے رسول کے اور کوئی خیال نہیں رہتا، لیکن جب ہم اپنے گھر میں چلے جاتے ہیں، بیوی میں، بچوں میں، مال میں اور کاروبار میں تو وہاں جاکر وہ بات نہیں رہتی، وہاں جاکر وہ حالت نہیں رہتی، تو لہٰذا جب حالت بدل گئی کہ آپ کی مجلس میں کچھ ہوتی ہے اور گھر میں جانے کے بعد کچھ ہوتی ہے، لہٰذا یہی تو نفاق ہوگیا، یہی تو منافقت ہوگئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں! یہ بات نہیں ہے، بلکہ جو میری صحبت میں کیفیت ہوتی ہے اگر وہی کیفیت ہمیشہ تمہاری رہ جائے تو گلیوں میں اور بستروں پر اللہ کے فرشتے اتر کر تمہیں مصافحہ کرنے کے لیے آئیں۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۷۵۰، باب: فَضْلِ دَوَامِ الذِّكْرِ وَالْفِكْرِ فِي أُمُورِ الْآخِرَةِ]

مدینہ منورہ کے اندر جتنے بھی منافق تھے میرے اللہ نے اپنے پاک نبی حضرت محمد ﷺ کو ان منافقوں کے ناموں کی بھی خبر دے دی تھی، اللہ نے بتلا دیا کہ فلاں بن فلاں منافق ہے اور فلاں بن فلاں منافق ہے۔ اللہ نے باقاعدہ ان کے ناموں کی بھی خبر دے دی تھی۔ حضور ﷺ نے صرف ایک صحابی...... جن کا نام حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ تھا، جن کا لقب صاحبِ سرِ رسول اللہ ﷺ تھا۔ یعنی جو رازدارِ رسول پاک ﷺ تھا...... ان کو حضور ﷺ نے بتلا

دیا تھا کہ فلاں اور فلاں منافق ہیں، تاکہ اللہ نے مجھے جو بتلایا ہے میں آگے پہنچادوں، لیکن اس کو زیادہ کھولنے کی اللہ کی طرف سے اجازت نہیں تھی۔ اس لیے حکم تھا کہ جو منافق ہیں آپ جان گئے، ہم نے بتلا دیا، لیکن آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ جیسے اسلام کو غلبہ ملے گا، یہ اپنی موت خود مر جائیں گے، آپ ان کو سزا بھی نہ دیں۔ وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ ان منافقوں کو مدینہ میں سزا دیتے تو قتل و قتال ہوتا، کیونکہ وہ اسلام کے باغی تھے، وہ محمد عربی ﷺ کے باغی تھے اور اسلام ابھی نیا نیا پھیلا تھا، پوری دنیا میں ایک بات پھیل جاتی کہ حضور ﷺ اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں، حضور ﷺ کلمہ پڑھنے والوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں تو اس لیے اللہ کی حکمت تھی۔ اللہ نے آپ کو باخبر کر دیا، لیکن سزا دینے کی اجازت نہ دی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ منافق کا جنازہ نہیں پڑھتے تھے:

حضرت امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ جب حضور ﷺ کا زمانہ گزر گیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو اگر کسی آدمی کا جنازہ آتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑی دور بیٹھ کر دیکھتے کہ جنازہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ شریک ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اگر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جنازہ کے اندر ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شریک ہوتے، ان کو تسلی ہو جاتی کہ یہ منافق کا جنازہ نہیں ہے۔ اور اگر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی آہستہ آہستہ چلے جاتے کہ منافق کی نماز کیوں پڑھوں؟

''مَنْ'' کا استعمال:

''مَنْ'' کا استعمال مفرد میں بھی ہوتا ہے اور جمع میں بھی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ﴾ [سورۃ محمد:١٦] میں ''مَنْ'' مفرد ہے۔ اور دوسری جگہ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ﴾ [یونس:٤٢] میں جمع کے لیے ہے۔ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ﴾ اور آگے ہے ﴿اٰمَنَّا﴾ تو یہاں جمع کا فائدہ دے رہا ہے۔

ایمانیات:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ [البقرۃ:٨]

وہ کہتے کہ ہمارا ایمان ہے اللہ پر اور یوم آخرت پر۔ صرف اللہ پر اور آخرت پر ایمان لانے کا ذکر ہے تو اتنا ایمان تو کافی نہیں۔ اللہ پر ایمان، اللہ کے نبی پر ایمان، اللہ کے ملائکہ پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان اور اللہ کے

رسولوں پر ایمان بھی ضروری ہے۔ تو یہاں صرف دو چیزوں کا ذکر آیا ہے: ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی اوّل اور آخر کو ذکر کر دیتے ہیں اور درمیان کی ساری چیزیں خود بخود سمجھ آجاتی ہیں، جیسے فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾[البقرۃ:۱۱۵]

مشرق بھی اللہ کے لیے ہے اور مغرب بھی اللہ کے لیے ہے۔ اب دیکھیں مشرق اور مغرب کے درمیان میں کتنی چیزیں ہیں، وہ بھی ساری اللہ کے لیے ہیں، تو لہٰذا ایک جانب مشرق کا ذکر آگیا اور دوسری جانب مغرب کا ذکر آگیا تو مراد یہ ہے کہ ساری کائنات اللہ کے لیے ہے۔ یا جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ میرا حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایمان ہے تو اس کا معنی بھی یہ ہے کہ میرا سب پر ایمان ہے۔ جب اللہ پر ایمان لائے گا تو اللہ کی کتابوں پر بھی ایمان لائے گا، اللہ کے فرشتوں پر بھی ایمان لائے گا، اللہ کے رسولوں پر بھی ایمان لائے گا۔ اور جب آخرت پر ایمان لائے گا تو اس کے لیے اعمالِ صالحہ کرے گا، گناہوں سے بھی بچے گا، منکرات سے بھی بچے گا اور فواحش سے بھی بچے گا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں اوّل اور آخر ایمانیات کا ذکر کر دیا۔

ایمان ہو تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسا!

حضرت بخاری رحمہ اللہ...... اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں فرمائیں اور جتنے علمائے حق فوت ہو گئے ہیں اللہ ان سب کی قبروں کو باغ جنت بنا دیں، جتنے زندہ ہیں اللہ ان کی حفاظت فرمائیں اور ان کو صحت وعافیت کے ساتھ دین کی خدمت عطا فرمائیں۔...... حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری فرماتے تھے کہ بھائی سچی بات پوچھتے ہو تو یہ ہے کہ ایمان ہو تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہو۔ بڑی عجیب مثال دیتے تھے! فرماتے تھے کہ ایمان ہو تو صدیق کا ہو اور کفر ہو تو ابوجہل کا ہو، درمیان میں کچھ نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ صبح کو مسلمان اور شام کو ڈھیلا اور اگر شام کو پکا تو صبح ڈھیلا تو پھر یہ کیا اسلام ہوا؟ ذرہ ذرہ بات پر تو بھاگے، ذرا تکلیف آئی تو اسلام چھوڑ دیا، ذرا مصیبت آئی تو اسلام چھوڑ دیا، ذرا پریشانی آئی تو اسلام چھوڑ دیا تو یہ انتہائی طور پر منافقانہ عمل ہے۔ فرماتے تھے کہ دو ہی مقام ہے: یا تخت مقام ہو گا یا تختہ مقام ہو گا آزادی کا۔ جب آزادی ملتی ہے تو آدمی یا تو تخت پر ہو یا تختہ پر ہو کہ جان چھوٹ گئی۔ تو دیکھیں کہ ایمان ہو تو صدیق رضی اللہ عنہ کا ہو کہ جس نے دیکھا ہے تب بھی مان لیا، نہیں دیکھا تب بھی مان لیا۔ اور معراج کی رات میں موجود نہیں ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بھی نہیں سنا، ابوجہل کافروں کو لے کر آیا اور آکر کہنے لگا: اے ابوبکر!

"هَلْ سَمِعْتَ مَا قَالَ صَاحِبُكَ؟"

"کیا تو نے سنا ہے کہ تیرا ساتھی کیا کہہ رہے ہیں؟"

آپ نے فرمایا: کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ تیرے دوست کہتے ہیں کہ رات کو میں مسجد اقصیٰ گیا، سدرۃ المنتہیٰ پر گیا، جنت دیکھی، ساری سیر کی اور رات بھی ختم نہیں ہوئی کہ میں مکہ میں واپس آ گیا۔ یہاں زمین پر مہینوں کا سفر اور اوپر سالوں کا سفر اور رات میں طے ہو گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ابوجہل! تم ایک بات بتاؤ کہ جو تم بات کہہ رہے ہو یہ بات میرے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے؟ اس نے کہا: ہم ابھی سن کر آ رہے ہیں۔ فرمایا "صَدَقَ رَسُوْلُ اللهِ" اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو سچ فرمایا ہے۔ اگر جبرئیل علیہ السلام آسمانوں سے ایک منٹ میں آ سکتا ہے تو کیا محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جا سکتے......!؟ یہ کون سی بڑی بات ہے۔

[المستدرک علی الصحیحین للحاکم، حدیث: ۴۴۰۷]

تو اس لیے فرماتے تھے کہ ایمان ہو تو صدیق جیسا ہو، کفر ہو تو ابوجہل کا ہو کہ سامنے کنکریاں ابوجہل کے ہاتھ میں ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتا ہے کہ اگر آپ بتا دیں کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے تو میں کلمہ پڑھتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عجیب آدمی ہو! یہ تو معمولی سوال ہے کہ میں یہ بتا دوں کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ اچھا تو تم ایسا کرو کہ جو تیرے ہاتھ میں ہے وہ بتلا دے کہ میں کون ہوں؟ تو اس نے کہا: اچھا جی! تو کنکریوں نے کلمہ پڑھ لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب تو کلمہ پڑھ لو۔ اس نے کہا: جادو ہے، میں نہیں مانتا۔

تو بہر حال کفر بھی واضح ہے اور ایمان بھی واضح ہے، لیکن خطرناک وہ ہے جس کو اللہ نے فرمایا:

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ﴾ [البقرۃ:۹]

یا اپنے زعم میں اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور جو ایمان لائے ہیں ان کو دھوکہ دے رہے ہیں، جبکہ وہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ [آل عمران:۱۱۹] ہیں، ﴿يَعْلَمُ خَآىِٕنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ﴾ [غافر:۱۹] ہیں، لیکن جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ دیا اس نے اللہ کو دھوکہ دیا، جس نے مسلمانوں کو دھوکہ دیا اس نے اللہ کو دھوکہ دیا، اس لیے اللہ کا نام عظمت کے لیے آیا۔ اور اللہ نے فرمایا: یہ بد بخت نہیں سمجھتے ﴿وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾ [البقرۃ:۹] یہ اللہ کو بھی دھوکہ نہیں دے سکتے، مومنوں کو بھی دھوکہ نہیں دے سکتے، اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ یہ تو سمجھ رہے ہیں کہ ہم بڑے کامیاب ہیں، شیطان بھی ہمارے ساتھ ہے اور کافر بھی

ہمارے ساتھ ہیں۔

نفاق کا معنی:

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نفاق کا معنی ہے "إِظْهَارُ الْخَيْرِ وَإِسْرَارُ الشَّرِّ" کہ آدمی ظاہر تو کرے خیر اور بھلائی، لیکن دل میں شر چھپا رکھا ہو۔ [ابن کثیر: ۱/۴۷، الآیۃ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللهِ...]

ایک ادیب نے بھی بڑی عجیب مثال دی ہے! اس نے کہا کہ دنیا کا جو پیسہ ہے، نوٹ ہیں، یورو ہے، دنیا کی کوئی کرنسی ہے، یعنی دنیا کے اندر آج تک کوئی ایسی کرنسی نہیں چھپی جس کے دونوں طرف کا سورج ایک ہو اور اس کے بھی دو منہ ہوتے ہیں اور ایک طرف اور ہوتا ہے اور دوسری طرف اور ہوتا ہے، اس لیے اس نے کہا کہ یہ پیسہ بھی کسی کے پاس نہیں رہتا اور کسی کا یہ خیر خواہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ بھی ذُو وَجْهَيْنِ ہے، اس کے بھی دو رُخ ہوتے ہیں۔ اور اس لیے فرمایا کہ نفاق کے معنی ہی یہ ہے کہ "إِظْهَارُ الْخَيْرِ وَإِسْرَارُ الشَّرِّ" کہ خیر کو ظاہر کرے اور شر کو چھپا کر رکھے۔

علامہ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ منافق وہ ہوتا ہے کہ جس کا قول کچھ ہو اور فعل کچھ ہو، کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے، اس کا باطن کچھ ہے اور ظاہر کچھ ہے، اس کا داخل ہونے کا راستہ الگ ہے اور باہر نکلنے کا راستہ الگ ہے، یعنی جہاں موقع ملا ادھر نکل گیا اور اس کا حاضر ہونا الگ ہے اور غائب ہونا الگ ہے۔

یہودیوں میں سے جو ایمان لائے ان میں ایک عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا ہے۔ ویسے یہودیوں میں سے اور لوگ بھی مسلمان ہوئے ہیں: عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے چار ساتھی اور بھی ہیں: ایک کا نام اسد، دوسرے کا نام اسید، تیسرے کا نام ثعلبہ، چوتھے کا نام ابن یامین اور پانچویں عبداللہ بن سلام ہیں رضی اللہ عنہم۔ یہ لوگ یہود میں سے تھے اور اسلام لائے اور اللہ نے پھر ان کو خالص اسلام نصیب کر دیا، ظاہر اور باطن سے پکے مسلمان ہو گئے، اسی طرح ابن سوریہ اور دوسرے لوگ بھی اسلام لائے۔ بہت تھوڑے لوگ تھے یہود میں سے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔

منافقین کی ایک وجہِ عداوت:

لیکن مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے اس وقت بھی نفاق نہیں تھا، کیونکہ مسلمانوں کے پاس کوئی طاقت نہیں تھی، کوئی قوت نہیں تھی، بلکہ مسلمانوں میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود

یہودیوں کے ساتھ معاہدے کیے، مشرکینِ عرب کے ساتھ معاہدے کیے، قبائل کے ساتھ معاہدے کیے، کیونکہ ابھی اسلام کو اتنی قوت اور طاقت نہیں ملی تھی۔ اسلام کے اندر سب سے پہلا غزوہ غزوۂ بدر ہے، اس غزوہ بدر الکبریٰ کے اندر اللہ نے اسلام کو عزت دی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور اسلام کو غلبہ نصیب ہوا۔ کفار کے ۷۰ سردار مارے گئے اور کفار کے ۷۰ آدمی قید ہو گئے۔

عبداللہ بن ابی بن سلول یہ آدمی مدینہ کے اندر بڑا سردار تھا اور قبیلہ خزرج کے ساتھ تعلق رکھتا تھا، یہ دونوں قبیلوں کا بڑا سمجھا جاتا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں ان قبائل والوں نے بھی اتفاق کر لیا تھا کہ مدینہ منورہ کی بادشاہی اس کو دے دیں گے، اس کو مدینہ منورہ کا بادشاہ بنا دیں گے، لیکن اللہ پاک کی قدرت کا نظارہ یہ ہوا کہ حضور پاک ﷺ تشریف لائے اور اسلام آیا اور صحابہ رضی اللہ عنہم آئے تو وہ سب انصار اسلام کے اندر داخل ہو گئے اور عبداللہ بن سلول کی سرداری اور تاج والی بات رہ گئی۔

حدودِ حرم کی تعظیم:

واقعہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور اتنی بڑی شان والے ہیں! وہ جب عمرہ کرنے کے لیے یا حج کرنے کے لیے مکہ مکرمہ میں آتے تھے تو مسجد تنعیم ...... جہاں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نام سے مسجد بنی ہوئی ہے وہاں چونکہ حرم کی حد ختم ہوتی ہے...... تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رہنے کے لیے جو خیمے لگاتے تھے وہ حرم سے باہر لگاتے اور اپنی عبادت کے لیے جو خیمے لگاتے وہ حدِ حرم میں لگاتے تھے، یعنی آپ نماز کے لیے حرم میں آجاتے، عبادت کے لیے حرم کی حد میں آجاتے اور پھر کھانا کھانے کے لیے، رات رہنے کے لیے اپنے دوسرے خیموں میں چلے جاتے۔ تو صحابہ نے کہا کہ اتنی تکلیف ہوتی ہے۔ فرمایا: مجھے ڈر لگتا ہے کہ نوکر سے کوئی سخت بات کر لوں، مجھے ڈر لگتا ہے کہ گھر والوں سے حدودِ حرم کے اندر کوئی سخت لفظ کہہ دوں، اس لیے میں اپنی رہائش کو وہاں رکھتا ہوں اور اپنی عبادت کو اللہ کے حرم کے اندر رکھتا ہوں۔

اسلام اچھا مذہب ہے، مگر مسلمان بے عمل ہیں:

نیکسن کی بیٹی نے ایک کتاب لکھی ہے، اس کے اندر اس نے لکھا ہے کہ دنیا کے مذاہب میں سب سے اچھا مذہب اسلام ہے اور سب سے گندے لوگ مسلمان ہیں۔ ان کا مذہب سب سے اچھا ہے، اعلیٰ ہے، ایسا مذہب دنیا

میں دیکھا نہیں۔ میں نے یہودیت پڑھی، نصرانیت پڑھی، بدھ مت پڑھا ہے، ہندوازم پڑھا ہے، میں نے دنیا کے ہر مذہب کا مطالعہ کیا ہے، دنیا کے اندر اسلام سے اچھا مذہب کوئی نہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ سب سے گندے بھی مسلمان ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت:

اور دیکھیں کہ غیرت اور محبت یہ ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیبیہ میں بیٹھے ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کعبہ میں کھڑے ہیں۔ مکہ کے مشرکین نے کہا: عثمان! تمہارے ہم پر احسان ہیں، تمہیں اجازت ہے کہ طواف کرلو، عمرہ کرلو اور صفا دوڑلو۔ انہوں کہا کہ یاد رکھو! محمد مدنی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تک عمرہ نہیں کریں گے میں بھی نہیں کروں گا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ نہ کریں اور میں عمرہ کرلوں، صحابہ عمرہ نہ کریں اور میں عمرہ کرلوں۔ یہ ایمان تھا، یہ محبت تھی۔

ان آیات کے اصل مصداق:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جو قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے منافق تھے اور پھر جو لوگ ان کے طریقہ پر چلنے والے ہیں۔ اسی طرح اوس اور خزرج کے بارے میں ابوالعالیہ، حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے بھی فرمایا کہ ان آیات میں اللہ نے جن منافقین کو ذکر کیا ہے وہ مدینہ منورہ میں رہتے تھے اور قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے یا قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں تنبیہ کی کہ ان کے بارے میں قران میں تیرہ آیتیں نازل فرمائیں، اللہ نے سورۃ المنافقون نازل فرمائی، تاکہ مسلمان منافقوں کے دھوکہ میں نہ آئیں، ان کے ظاہری ایمان پر نہ جائیں، جھوٹی قسموں کا اعتبار نہ کریں اور کسی فساد کے اندر نہ پڑ جائیں۔ [ابن کثیر: ۱/۴۷، الآیۃ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللهِ...]

اور اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پہلی امتیں بھی گمراہ ہوئی ہیں اور فرقوں میں بٹ گئی ہیں اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پہلی امتیں بہتر فرقوں مین بٹ گئیں اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی اور تہتر فرقوں میں تمام جہنمی ہوں گے، صرف ایک فرقہ نجات والا ہوگا اور وہی کامیاب ہوگا، وہی جنتی ہوگا۔ تو جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ اس کامیاب گروہ کی علامت کیا ہوگی؟ فرمایا:

((اَلَا! مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۶۴۱، باب: مَا جَاءَ فِي افْتِرَاقِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ]

''جنہوں نے میرا طریقہ اور میرے صحابہ کا طریقہ پکڑ لیا وہ کامیاب ہیں۔''

ایمان میں مضبوطی کی حکایت:

ایک ضعیف مخلوق بی بی سمیہ رضی اللہ عنہا ایک کمزور عورت ہے اور مقابلہ پر کفر کی طاقت ہے۔ ابوجہل نے پورا زور لگا دیا کہ تم اسلام کو چھوڑ دو۔ بی بی صاحبہ نے کہا کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے کے بعد اور شہادتین کے اقرار کے بعد انکار کر دوں۔ ابوجہل نے اسے مارا، اسے قتل کی دھمکی دی، لیکن بی بی صاحبہ اپنے ایمان پر اسی طرح جمی رہیں، حتیٰ کہ ابی جہل نے اتنا ظلم کیا کہ دو اونٹ بڑے سرکش قسم کے منگوائے اور بی بی صاحبہ کی ٹانگوں میں رسیاں باندھ کر ان اونٹوں سے باندھا گیا اور ان اونٹوں کو مختلف سمت دوڑایا گیا اور بی بی صاحبہ کے ٹکڑے ہو گئے۔ اور اس ظالم نے اپنے ہاتھ سے نیزہ مارا اور بی بی صاحبہ کا جسد دو ٹکڑے ہو گیا، لیکن زبان پر ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کی اسی طرح شہادت موجود تھی۔ یہ ایمان والے تھے، اس طرح کہ پہاڑ تو اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے، لیکن یہ مومن اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلاف:

اسلام کا پرچم پورے عرب سے نکل کر ایشیا تک اور پوری دنیا تک پھیل گیا۔ اب دشمنوں نے فیصلہ کیا کہ اسلام کو ہم مقابلہ سے نقصان نہیں پہنچا سکتے تو اب انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھا اور عبداللہ بن سبا نے جو یہودی النسل تھا اس نے جماعت پیدا کی۔ انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا، مسلمان بن گئے اور یہی لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا ذریعہ بنے۔ اور وہیں سے دیکھ لیں کہ جوں ہی جنگیں شروع ہوئیں، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو مدینۃ الرسول میں شہید کیا گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک شہر میں مظلوماً شہید کیا گیا، گھر میں بند کیا گیا، ان کا محاصرہ کیا گیا، ان کا پانی بند کیا گیا، ان کو حرم آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جس شخص نے پورے مدینہ والوں کو پانی پلایا تھا، آج خود پانی پینے کے لیے ترس رہا تھا، قرآن پڑھتے ہوئے شہید کیا گیا۔ قتل کرنے والے کون لوگ تھے؟ وہ جو ظاہراً مسلمان تھے۔ اور جوں ہی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی، اس کے فوراً بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے والے وہی لوگ تھے جنہوں نے سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلایا۔ اور اس کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ ایک طرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حمایت کی اور دوسری طرف بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا...... جو حج اور عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ تشریف

فرماتھیں...... ان کو آکر بھڑکایا گیا کہ عثمان رضی اللہ عنہ مظلوم شہید ہو گئے ہیں اور جن لوگوں نے شہید کیے ہیں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قریب ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلوں کا بدلہ نہیں لینا چاہتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بدگمان کیا گیا کہ اس وقت امت کو آپ کی ضرورت ہے، آپ تمام امت کی ماں ہیں۔ جب آپ بحیثیت ام المومنین کے، باعتبار رشتہ داری کے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ کریں گی تو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کا ساتھ دیں گے، کیونکہ وہ آپ کے بیٹے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے بدلہ لیں گے، ورنہ اس وقت تک ان کی کیا خلافت ہے کہ قاتلوں کو نہ پکڑا جائے؟ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل کہ جنہوں نے مدینہ منورہ میں ظلم کیا اور ان کو قتل کیا، انہوں نے ادھر بی بی صاحبہ کو اکسایا اور ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھڑکایا کہ بی بی صاحبہ ہزاروں کا لشکر لے کر تمہارے مقابلہ پر آرہی ہیں کہ تمہیں خلافت سے ہٹادیں۔ اگر آپ پورے اسلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں کہ لڑنے والے کون تھے؟ وہ جنہوں نے اسلام کا لباس پہنا ہوا تھا، جو کلمہ شریف پڑھتے تھے اور جو اپنے آپ کو پکا مسلمان کہتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں سے چلے اور حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے ابا جان سے عرض کیا: ابا جان! یہ دشمن ہے جو آپ کو بھی اور اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی لڑانا چاہتا ہے، یہ منافقین کا گروہ ہے، سازشی ٹولہ ہے، یہ یہودیت کے ایجنٹ ہیں، دشمنانِ اسلام ہیں، آپ اپنی اماں سے کیسے مقابلہ کریں گے؟ وہ تو آپ کی ماں ہیں، ام المومنین ہیں، مہربانی کریں! آپ اپنی فوجیں لے کر مقابلہ پر نہ جائیں، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ مجھ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اور اگر ایسی بات ہو جائے تو بحیثیت خلیفہ برحق کے، بحیثیت ایک خلیفہ راشد کے دفاع کرنا میرا حق ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ چلے۔ راستے میں دونوں لشکر آمنے سامنے ہو گئے: ایک طرف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ہیں اور ہزاروں کا لشکر ہے اور دوسری طرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا لشکر ہے۔ دونوں طرف صحابہ کا لشکر ہے۔ دونوں نے پڑاؤ کیا۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے پیغام بھیجا کہ یا ام المومنین! میں یہ چاہتا ہوں کہ جھگڑے سے پہلے مل بیٹھیں، آپس میں ڈائیلاگ کرلیں، مذاکرات کرلیں، تاکہ خدا کرے کہ یہ بات کسی طرح طے ہو جائے۔ بی بی صاحبہ نے قبول کرلیا۔ درمیان میں خیمہ لگایا گیا، ماں بیٹے کی ملاقات ہوئی۔ پوچھا کہ اماں جان! آپ کیا چاہتی ہیں؟ فرمایا: میں تو کچھ نہیں چاہتی، صرف ایک مطالبہ ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے شریعت کے مطابق قصاص لیا جائے اور میں کچھ نہیں چاہتی۔ آپ خلیفہ برحق ہیں، آپ خلیفہ راشد ہیں، آپ دامادِ نبی ہیں، آپ سیدہ فاطمۃ الزہراء کے شوہر ہیں، آپ کاتب الوحی ہیں اور آپ وہ آدمی ہیں جن کے بارے میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا تھا کہ سب سے زیادہ

فیصلہ کرنے والے کون ہیں؟ علی ہیں۔ اور جس کو حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں یمن کی طرف امیر بنا کر بھیجا۔ اماں نے کہا: آپ میرے بیٹے ہیں، ہمیں نہ خلافت سے غرض ہے اور نہ اقتدار سے غرض ہے، نہ کرسی سے غرض ہے، ہمارا تو صرف ایک ہی مطالبہ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے نبی ﷺ کے حرم کی حرمت کو تہہ و بالا کر ڈالا ہے، مدینہ کی بے حرمتی کی ہے، مظلوم سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو ان کے گھر میں قرآن پڑھتے ہوئے قرآن مقدس پر شہید کیا، ان کی داڑھی مبارک کو پکڑا گیا، ان کی پسلیوں پر کودتے رہے، ان کا جنازہ رکھا رہا، ظالم ان کو دفن کرنے کی اجازت نہیں دے رہے، وہ لوگ آپ کے قریب ہیں، آپ پہلے ان سے قصاص لیں، ان کو قرآن کے مطابق سزا دیں، اس کے بعد آپ بیٹھیں، ہم تو آپ کے تابع ہیں۔ تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے جب ساری بات سنی تو آپ نے فرمایا: اے ام المومنین! آپ اندازہ کریں اور بتلائیں کہ آپ کو مجھ سے کیا توقع ہے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں؟ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ صرف محسن اسلام نہیں ہیں، وہ تو ذاتی طور پر میرے محسن ہیں کہ جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا مرحلہ آیا تو میرے گھر میں ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ حضور ﷺ نے رشتہ منظور فرما لیا اور میں مسجد نبوی میں اداس بیٹھا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ گزرے، مجھے فرمایا: کیا بات ہے؟ آپ کیوں محزون بیٹھے ہیں؟ تو میں نے عرض کیا: حضور ﷺ نے اپنی لخت جگر کا رشتہ قبول فرما لیا ہے، لیکن میرے گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ دو اونٹنیاں پالی تھیں کہ میں ان پر لکڑیاں اٹھا کر پیسے اکٹھے کروں گا، لیکن حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے میری اونٹنیاں ذبح کر ڈالیں، اب میرے گھر میں کوئی چیز نہیں ہے، میں شادی کیسے کروں؟ تو حضرت عثمان نے مجھے سینے سے لگایا اور فرمایا: علی! کیوں گھبرا رہے ہو؟ شادی تیری ہوگی، دولت میری ہوگی۔ وہ تو مجھ پر ذاتی احسان کرنے والا ہے، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ تو وہ ہے ''تَسْتَحْيِي مِنْهُ الْمَلَائِكَةُ'' جس سے اللہ کے فرشتے حیا کرتے ہیں، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ وہ ہے کہ ان کے استقبال کے لیے حضور ﷺ اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ تو وہ ہے جس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم! اگر اور کوئی بھی بیٹی باقی ہوتی تو میں عثمان کو دیتا، دو بیٹیاں جس کے گھر میں محمد رسول اللہ ﷺ کی ہیں، جو ذو النورین ہے، جو ذی حیاء ہے، جو داماد محمد مصطفی ﷺ ہے اور سب سے پہلے اسلام پر خرچ کرنے والا، جس نے تبوک کے موقع پر نو سو اونٹ، ایک سو گھوڑے اور چار ہزار دینار اس زمانہ میں پیش کیے، حضور رضی اللہ عنہ کے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیا، حضور ﷺ اپنے دامن میں ان پیسوں کو لے کر ہلاتے تھے اور چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا اور فرمایا: عثمان! ''فَاعْمَلْ مَا شِئْتَ'' عثمان! آج کے بعد تو جو چاہے کر، تیری بخشش کا محمد ذمہ دار ہے۔

فرمایا: اے اماں جان! کیا بات کر رہی ہیں؟ عثمان کو اگر علی نہیں پہچانتا تو کون پہچانے گا؟۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ آدمی جس نے حفاظتِ قرآن کے بارے میں خدمت کی۔ اللہ نے قرآن کی ایک ظاہری حفاظت کی، ایک قرآن کی باطنی حفاظت کی، ایک اللہ نے حفاظت قلب مصطفیٰ ﷺ میں کی، چوتھی مؤمنین کے سینوں میں حفاظت کی اور پانچویں حفاظت کی کہ قرآن کو جمع کر کے ایک کتاب کی شکل میں محفوظ کر دیا۔ یہ پانچویں حفاظت کا کام اللہ نے عثمان رضی اللہ عنہ سے لیا ہے، تو میں عثمان کو بھول سکتا ہوں؟ اماں نے فرمایا: پھر بات کیا ہے؟ تم اس کے قصاص کے بارے میں کیوں اتنی غفلت فرما رہے ہو؟ سیدنا علی...... كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهُ...... نے فرمایا: اماں جان! اصل مصیبت یہ ہے کہ جن ظالموں نے شورش ڈالی ہے، جن ظالموں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مہر کو غلط استعمال کیا ہے، جن ظالموں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پروانے کو تبدیل کیا ہے اور محمد بن ابی بکر کے خلاف اس کے قتل کرانے کا حکم نامہ جاری کرایا ہے، انہی ظالموں نے میری بیعت بھی کر لی ہے۔ اگر میں فوراً ان پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو میرا داخلی استحکام خطرے میں پڑ جائے گا اور میں نظام کو کنٹرول نہیں کر سکوں گا۔ آپ مجھے کچھ عرصہ کے لیے مہلت دے دیں، تاکہ میری حکومت مستحکم ہو جائے، میں اقتدار پر اچھی طرح تمکین حاصل کر لوں۔ اس کے بعد...... اللہ میرا گواہ ہے!...... آپ ام المومنین ہیں، سب سے پہلے علی کا ہاتھ عثمان کے قاتلوں کی گردنوں پر ہوگا۔ اماں جان مان گئیں، دونوں میں صلح ہو گئی، ماں اور بیٹا دونوں...... الحمدللہ!...... خوش ہو گئے۔ بی بی صاحبہ نے اتنا عرض کیا کہ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کی مرضی ہے، آپ مدینہ آنا چاہتی ہیں تو اَهْلًا وَّ سَهْلًا، کیونکہ مدینہ منورہ آپ کا گھر ہے اور ہم چشم براہ ہیں اور میں آپ کے اونٹ کی مہار پکڑ کر آپ کو مدینہ لے جاؤں۔ اگر مناسب سمجھتی ہیں تو فی الحال بصرہ چلی جائیں، تاکہ دشمنوں کو شورش کا موقع نہ ملے اور وہ ہمیں مزید نہ لڑا سکیں، جب تک کہ میں اس معاملہ پر کنٹرول کر لوں۔

بات ختم ہو گئی، لیکن وہ ظالم وہ سبائی ٹولہ، یہودیت کے خود کاشتہ پودے، یہودیت کے ایجنٹ، جب ان کو یقین ہو گیا کہ ماں بیٹے میں بات ختم ہو گئی تو انہوں نے کہا کہ اب ہمیں تو قصاصِ عثمان میں قتل کیا جائے گا، انہوں نے فوراً چال چلی...... یہ ہیں وہ لوگ جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کو قتل کرتے ہیں، اسلام کا نام لے کر اسلام کے دشمن بنتے ہیں، قرآن کا نام لے کر حدیث کا انکار کرتے ہیں اور اسی طرح یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو حضور ﷺ کا نام لے کر اللہ کی توحید کا انکار کرتے ہیں، یہ اسلام کے نام پر دھوکہ دینے والے گروہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے فتنے سے محفوظ

رکھے...... اب دیکھیں کہ ایک طرف سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہ حمایت ہے اور دوسری طرف انہوں نے رات کو بیٹھ کر ایک فیصلہ کرلیا۔ وہ کوئی ساٹھ یا ستر آدمی تھے...... آپ اندازہ فرمائیں کہ صحابہ کا ہزاروں کا لشکر ہے اور منافقین اور وہ لوگ جو اسلام کے دشمن تھے، ان کی تعداد ساٹھ یا ستر کے درمیان تھی، لیکن آپ جانتے ہیں کہ جب آگ جلانی ہو تو ایک بچہ بھی جا کر بلڈنگ کو جلا سکتا ہے، لیکن اگر بلڈنگ بنانی ہو تو ہزاروں مزدور اور معمار چاہییں، مٹیریل چاہیے، وقت چاہیے، لیکن اگر آگ لگانی ہو تو ایک تیلی پھینکنے سے ایک بڑی سے بڑی بلڈنگ جل جائے گی......

بہر حال ان لوگوں نے آپس میں فیصلہ کرلیا کہ رات کو جب خوابِ غفلت میں ہوں، سو جائیں...... کیونکہ اس وقت سب کو اطمینان ہو گیا، دونوں فریق مطمئن ہو گئے، دونوں کے دل صاف تھے، ان کے دلوں میں ایمان تھا، صداقت تھی...... لہٰذا مطمئن ہو کر سو گئے تو انہوں نے کہا کہ آدھے آدمی بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکر میں چلے جائیں اور آدھے آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں چلے جائیں اور وہاں جا کر قتلِ عام شروع کردیں اور شور یہ مچائیں کہ علی کی فوج آگئی اور جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں آئیں، وہ یہ شور مچائیں کہ بی بی عائشہ نے حملہ کردیا۔

اندھیری رات تھی، ان ظالموں نے اس طرح اپنی جماعت کو تقسیم کر کے دونوں فوجوں میں حملہ کرایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو جاگتا گیا، سنتا گیا کہ حضرت علی نے حملہ کردیا، بی بی عائشہ نے حملہ کردیا۔ دونوں طرف سے صحابہ اٹھتے گئے، تلواریں پکڑتے گئے۔ دس ہزار اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہوئے، ایک دو، یا چار پانچ سو نہیں، دس ہزار اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہوئے اور دس ہزار وہ مومنین جنہوں نے ایمان میرے مدنی کی گود میں بیٹھ کر سیکھا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر جنہوں نے بیعت کی تھی، جنہوں نے قرآن اترتے دیکھا تھا، جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نمازیں پڑھیں تھیں، وہ ان منافقوں کے دھوکہ میں آگئے۔ آپ کی اور ہماری کیا طاقت ہے؟ آپ اور ہم جیسے کمزور مسلمانوں کا کیا حال ہوسکتا ہے؟

اس لیے میرے عزیز دیکھیں کہ اسلام کو نقصان ہمیشہ منافقین نے پہنچایا۔ ایک طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک جماعت پیدا کرلی کہ کمال کرتے ہو، حضرت علی تو خود دین سے ہٹ گیا ہے۔ اندازہ کریں! انہوں نے کہا: وہ کیسے؟ حضرت علی نے کہا کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کردیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی پر دوسری عورت سے شادی کرلی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کو دکھ پہنچایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی سے مشکیزے میں پانی بھرواتا رہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا چھ مہینے تک صاحبِ فراش رہیں اور اس نے رات کو دفن کر کے جنازہ پڑھ دیا کہ جو

بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو تکلیفیں پہنچی تھیں کوئی راز ظاہر نہ ہو سکے۔ تو خوارج کا فتنہ پیدا کیا، جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا چین حرام کر دیا، ساری زندگی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے۔ یہ وہ فتنے ہیں جنہوں نے اسلام کو نقصان پہنچایا۔ یاد رکھیں کہ دشمن تو دشمن ہوتا ہے۔

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ، ختمِ نبوت کے بڑے عالم تھے۔ وہ ایک چھوٹی سی مثال دے کر سمجھایا کرتے تھے کہ بیٹا! اگر کوئی آدمی بازار کے اندر دودھ بیچ رہا ہو اور آدمی اس سے دودھ لینے کے لیے جائے کہ مجھے ایک کلو دودھ کی ضرورت ہے، لیکن دودھ والا کہے کہ ایک کلو دودھ تب دوں گا جب ایک پاؤ پانی بھی ساتھ خریدو۔ تو کوئی خریدے گا......؟ کوئی بھی نہیں خریدے گا، وہ کہے گا: پاگل ہو گیا ہے، پانی تو مفت مل رہا ہے، نل سے مل رہا ہے، پانی کے پیسے کیوں بھروں؟ اگر اسی پانی کو دودھ میں ملا دے تو مولوی مکی بھی خریدے گا اور بڑا عقل والا بھی خریدے گا، کیونکہ وہ پانی اب دودھ میں مل گیا ہے، نظر نہیں آ رہا ہے۔ اس لیے کفر بھی اسلام کو دھوکہ نہیں دیتا، کفر بھی اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا، کفر بھی اسلام کے سامنے دیوار نہیں بن سکتا، لیکن جب اس کو اسلام کا لبادہ اوڑھا دیا جائے تو لوگ بے وقوف بن جاتے ہیں۔

آج آپ دیکھیں! ایمان سے بتلائیں کہ دنیا کے اندر جتنا شرک ہو رہا ہے وہ محبت کے پردے میں ہو رہا ہے، جو لوگ قبروں پر جھکتے ہیں، جو لوگ قبروں پر سجدے کرتے ہیں، قبروں پر منتیں مانتے، نذر و نیاز اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں، یہ کیا ہے؟ محبت کا پہلو ہے۔ اللہ کے اولیاء سے محبت کے پہلو میں شرک کرایا جا رہا ہے، اولیاء اللہ کی محبت کا رنگ چڑھایا گیا۔ جس شرک کو مٹانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم آئے تھے ہمیں وہیں لے جایا جا رہا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ اللہ کے اولیاء ہیں، ان کی تعظیم ضروری ہے، یہ اللہ کے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں، اللہ نے عظمت دی ہے، یہ روضے والے بزرگ ہیں، یہ مرتبہ والے بزرگ ہیں، ان کی قبروں پر طواف کرو اور ان سے مانگو گے تو یہ آگے کہیں گے تو تمہاری فریاد پوری ہو جائے گی۔ انبیا سے محبت میں بدعات کی جا رہی ہیں اور بدعات کا نتیجہ شرک تک جاتا ہے۔

اسی طرح اولیاء میں دیکھیں کہ لوگوں نے قرآن کا دعویٰ کیا کہ ہم اہلِ قرآن ہیں، اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اتارا، ہم تو قرآن کو ماننے والے ہیں۔ اب دعویٰ قرآن کا کیا اور اندر کیا ہے کہ حدیثِ رسول کا انکار ہے کہ جب آپ کوئی حدیث پیش کریں گے تو وہ کہیں گے: چھوڑو! یہ تو بندوں کی باتیں ہیں، کوئی اللہ کی باتیں تو نہیں ہیں،

حدیث تو ایک انسان کا کلام ہے اور ایک انسان نے سنا ہے اور صدیوں تک ہم تک پہنچا ہے، اس کی کیا حفاظت ہو سکتی ہے......؟ اس کو چھوڑیں! اللہ نے کلام اتارا ہے، ہم صرف قرآن کے پابند ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اوپر لبادہ قرآن کا اوڑھا گیا اور انکارِ حدیث کا فتنہ نکلا۔ جب حدیث کا انکار ہو گیا تو نماز ختم، کیونکہ قرآن میں تو اتنا ہے کہ نماز پڑھو۔ اب کیسے پڑھو؟ یہ تو حدیثِ رسول بتلائے گی اور حدیث رسول کا تو انکار ہو گیا۔ قرآن کے اندر حکم ملا کہ زکوۃ دو، لیکن کتنی ادا کرو؟ سونے کی کتنی ہے؟ چاندی کی کتنی ہے؟ بکریوں کی کتنی ہے؟ گایوں کی کتنی ہے؟ اونٹوں کی کتنی ہے؟ زمین نہری کا عشر کتنا ہے؟ اور زمین جس پر بارشوں سے سبزہ اگتا ہے اس پر کتنا عشر ہے؟ یہ سب کچھ تو حدیث رسول اللہ ﷺ بتلائے گی۔ دعویٰ کیا اہلِ قرآن ہونے کا اور حدیثِ رسول اللہ کا انکار نکلا۔

اسی طرح محبتِ اہلِ بیت کا دعویٰ کیا کہ ہم اہلِ بیت کے غلام ہیں، ہم حضور ﷺ کی اولاد کے غلام ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غلام ہیں، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے غلام ہیں، سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے غلام ہیں، بی بی سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے غلام ہیں۔ اور نتیجہ کیا نکلا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی دشمنی اور رنگ چڑھا اہل بیت کی محبت کا۔ اندر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ دشمنی کہ بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو میراث نہیں ملی تو ابوبکر نے ظلم کیا۔ دیکھو کہ حضور ﷺ کی بیٹیوں کو کرسی پر نہیں بیٹھنے دیا، خود مکہ والے بیٹھ گئے۔ دیکھو جی! بڑی زیادتی کی۔ تو نتیجہ یہ نکلا اوپر پردہ جب محبتِ اہلِ بیت کا چڑھایا گیا اور اندر سے بغضِ صحابہ نکل آیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے منافقت کے پہلو کو بہت کھول کر بیان کیا، کیونکہ سب سے زیادہ نقصان دینے والے منافق ہی ہوتے ہیں۔

یہ منافق ایمان نہیں لائیں گے:

جب انہوں نے کہا تھا ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ [البقرۃ:۸] قرآن نے یہ نہیں کہا ''وَمَا اٰمَنُوْا'' یہ ایمان نہیں لائے، بلکہ قرآن نے فرمایا: ''وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ'' (نہیں ہیں وہ ایمان لانے والے۔) وجہ کیا ہے؟ کہ مبالغہ کا جملہ ہے اور پھر جملہ اسمیہ ہے۔ فرمایا کہ میں علام الغیوب ہوں، میں عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ میں سرائر کا اور ضمائر کا جاننے والا ہوں، مجھے ان کے دلوں کا پتہ ہے، مجھے ان کے مستقبل کا پتہ ہے، ان کے ماضی کا پتہ ہے، ان کے موت تک کے حالات کا پتہ ہے اور میں خود خدا گواہی دے رہا ہوں کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

صحابہ کے حق میں احتیاط:

جیسا کہ میرے نبی ﷺ نے فرمایا:

((اللَّهَ اللَّهَ فِي أَصْحَابِي، لَا تَتَّخِذُوهُمْ غَرَضًا بَعْدِي، فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّي أَحَبَّهُمْ، وَمَنْ أَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِي أَبْغَضَهُمْ، وَمَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِي، وَمَنْ آذَانِي فَقَدْ آذَى اللَّهَ وَمَنْ آذَى اللَّهَ فَيُوشِكُ أَنْ يَأْخُذَهُ)) [سنن الترمذی، حدیث: ۳۸۶۲، باب: فِيمَنْ سَبَّ أَصْحَابَ النَّبِيِّ ﷺ]

میرے صحابہ کو برا نہ کہا کرو، میرے صحابہ سے جو محبت کرتا ہے گویا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور جو میرے صحابہ سے بغض رکھتا ہے گویا وہ مجھ سے بغض رکھتا ہے اور جو میرے صحابہ کو ایذا پہنچاتا ہے گویا اس نے مجھے ایذا پہنچائی، اور جو مجھے ایذا پہنچائے گویا اس نے اللہ کو ایذا پہنچانے کی کوشش کی اور جو اللہ کو ایذا پہنچانے کی کوشش کرے گا اللہ اس کو پکڑے گا۔

اہلِ جہالت کا دھوکہ:

ایک دوسری آیت میں فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ [الاحزاب: ۵۷]

''جو آدمی اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچائے......''

وہاں رسول ﷺ کا ذکر ہے اور یہاں ﴿يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ [البقرۃ: ۹] میں ایمان والوں کا ذکر ہے، رسول کا ذکر نہیں ہے، تاکہ مسئلہ سمجھ آجائے۔ کیونکہ بعض جاہل جب یہ آیتیں پڑھتے ہیں ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ [الاحزاب: ۵۷] جس نے اللہ کو ایذا دی اس نے رسول کو ایذا دی، جس نے اللہ کی اطاعت کی اس نے رسول کی اطاعت کی۔ اور جس نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ تو وہ......نعوذ باللہ...... جہالت سے یا کم فہمی سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ رسول خود خدا ہے، اس کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے، اس کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے اور اس کو ایذا پہنچانا خدا کو ایذا پہنچانے کے برابر ہے، تو معلوم ہوا کہ......نعوذ باللہ...... ظاہر میں نبی ہے اور اندر سے خدا ہے۔ اس لیے اللہ نے یہاں ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ فرما دیا، تاکہ کوئی آدمی غلط فہمی میں مبتلا نہ کر سکے، بلکہ معنی یہ ہے کہ اگر ایمان والے کو بھی نقصان پہنچا تو گویا کہ اللہ کو نقصان پہنچا رہے ہو۔ یہ نہیں۔

اللہ اللہ ہوتا ہے اور نبی نبی ہوتے ہیں اور ایمان والے ایمان والے ہوتے ہیں۔ اس لیے ﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ﴾ فرمایا۔

﴿وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۹]

اللہ نے فرمایا کہ حضور ﷺ یہ منافق سمجھتے ہیں کہ ہم مومن کو دھوکہ دے رہے ہیں، حالانکہ یہ کسی کو دھوکہ نہیں دے رہے، مگر اپنے آپ کو دھوکہ میں ڈال رہے ہیں، کیونکہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس طرح ہم دھوکہ دیں گے، لیکن اللہ توان کے راز کھول دے گا۔ آخر منافق تو کھل جاتا ہے۔ آپ نے دنیا میں دیکھا ہے کہ جو لوگ ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر سنائیں، جب دونوں پر بات واضح ہوجاتی ہے تو دونوں طرف سے لعنتی بن کر بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: اچھا! اس نے لڑایا؟ اور وہ بھی کہتا ہے کہ اسی نے لڑایا تھا۔ اللہ نے فرمایا کہ جب ہم کھول دیں گے ﴿مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝﴾ [النساء:۱۴۳] فرمایا: منافقوں کا حال یہ ہوگا کہ نہ ادھر کے رہیں گے اور نہ ادھر کے رہیں گے، کیونکہ جس کو اللہ گمراہ کرے اسے کوئی راستہ نہیں دکھا سکتا۔

منافق اللہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے:

منافق اپنی جہالت کی وجہ سے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جس طرح ہم بظاہر ایمان لا کر مومنوں کو دھوکہ دئے ہوئے ہیں، اسی طرح ہم اللہ کو ظاہری ایمان کا دھوکہ دے کر جنت میں چلے جائیں گے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝﴾ [المجادلۃ:۶]

اللہ پاک ان سب کو دوبارہ زندہ کریں گے۔

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ﴾ [المجادلۃ:۱۸]

اللہ کے آگے بھی جھوٹی قسمیں کھائیں گے۔ جیسے تمہارے آگے جھوٹی قسمیں کھاتے تھے، وہاں بھی جھوٹی قسم کھا کر یہ سمجھیں گے کہ ہم بچ جائیں گے۔ جیسے مدینہ منورہ میں وہ مسلمانوں کے سامنے جھوٹی قسم کھا کر بچ جاتے تھے تو یہاں بھی ہمارا کام چل جائے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰي شَيْءٍ ۭ﴾ [المجادلۃ:۱۸]

اور وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم اس طرح کسی نہ کسی چیز پر، کسی نہ کسی مقام پر ہیں، لیکن......:

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ﴾ [المجادلۃ:١٨]

''خبردار! یہ جھوٹے لوگ ہیں۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ کو کون دھوکہ دے سکتا ہے؟ دھوکہ تو اس کو ہو سکتا ہے جو جاننے والا نہ ہو، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ جو علام الغیوب ہیں، جو عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہیں، اس کے آگے دنیا کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔

لیکن منافقین یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے دھوکہ کا وبال انہی پر پڑے گا۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کے کئی مقامات پر فرمایا ہے:

﴿وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾ [البقرۃ:٩]

اور کہیں فرمایا:

﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا﴾ [الطارق:١٥تا١٧]

تو کہیں فرمایا:

﴿وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ [الانفال:٣٠]

اس لیے فرماتے ہیں کہ اللہ نے اس آیت کے اندر ارشاد فرمایا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ فرمایا، ورنہ جب وہ آئے تھے تو پہلے دن ہی اللہ پاک واضح کر دیتے۔ جیسے کوئی کافر سرکشی میں پڑ جائے تو اللہ فرماتے ہیں: اس کو اس کی سرکشی میں چھوڑ دو:

﴿وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ [البقرۃ:١٥]

اس کو اپنے کفر کی اور فساد کی آخری حد تک جانے دو، تاکہ وہ اپنی گمراہی کے انجام کو پہنچ جائے۔

منافقین کا دھوکہ:

ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی سوال کرے کہ یہ جو منافق ہیں یہ اللہ اور مومنین کو کیسے دھوکہ دینے والے ہیں؟ یہ تو تقیہ کر رہے ہیں، اپنی اندر والی بات پر پردہ ڈال رہے ہیں۔ یعنی ایک ہوتا ہے کہ آدمی تقیہ کرے اور ایک ہے دوسرے کو دھوکہ میں ڈال دے، اسلام جو ظاہر کر رہا ہے تو یہ تقیہ ہے اور اندر کفر چھپا ہوا ہے، جیسا کہ روافض تقیہ

کو اپنا دین سمجھتے ہیں۔......نعوذ باللہ!......حتیٰ کہ انہوں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ جو تقیہ نہ کرتا ہو وہ مومن ہی نہیں ہے۔ انہوں نے کتابوں کے اندر لکھا ہے کہ اسلام کے اور دین کے نو جز تقیہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ یعنی ظاہر کچھ ہو اور باطن میں کچھ ہو۔ اس لیے انہوں نے اپنی کتابوں کے اندر لکھا ہے کہ کبھی اہل سنت والجماعت کے جنازے کے اندر شریک بھی ہونا پڑے تو ظاہری طور پر سنی کا جنازہ بھی پڑھ لیا کرو، یعنی جنازہ میں کھڑے ہو جاؤ، لیکن اس کے لیے دعائے مغفرت کرنے کی بجائے یہ دعا کرو کہ اے اللہ! اس پر لعنت کر، اس کو جہنم میں ڈال، اے اللہ! اس کو عذاب دے۔ لوگ سمجھیں گے کہ جنازے کی دعا مانگ رہا ہے، جنازہ پڑھ رہا ہے، حالانکہ وہ اندر یہ دعا کر رہا ہے۔

مفسر فرماتے ہیں کہ یہ خداع بھی ہے، دھوکہ بھی ہے کہ یہ لوگ دھوکہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم اپنا اسلام ظاہر کر کے مسلمانوں سے بھی بچ جائیں گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نعمتیں بھی ہمیں ملیں گی۔

مفسر ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ اشکال ہو کہ منافقین تو تقیہ کر رہے تھے، کیونکہ انہوں نے اپنے اندر کی بات پر پردہ ڈالا ہوا تھا اور اپنا کفر چھپایا ہوا تھا، انہوں نے کسی کو دھوکہ تو نہیں دیا تھا؟ تو جواب یہ ہے کہ محاوراتِ عرب میں جو آدمی اپنی زبان سے جو اس کے دل کے اندر ہے اس کے خلاف کہے، تاکہ اس سے نجات پا جائے جس سے وہ ڈر رہا ہے، اس کو مخادع بھی کہتے ہیں۔ اس لیے ان کو یہاں بھی مخادع کہا گیا ہے۔ [ابن کثیر: ۱/ ۴۸، الآیۃ: یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا...]

مسلمان کا جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہنا:

ایک بات یاد رکھیں کہ قرآن میں آتا ہے:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۰۶﴾ [النحل: ۱۰۶]

کبھی کسی مسلمان کو بھی یہ حالت پیش آجاتی ہے کہ وہ کافروں کے قبضہ میں آگیا، انہوں نے کہا: اگر زبان سے تم کفر کا اظہار کرو گے تو ہم چھوڑیں گے، وگرنہ نہیں چھوڑیں گے۔ تو وہاں جان بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو اجازت دی ہے کہ اگر اس کا دل ایمان پر پکا ہے اور صرف بے چارے نے جان بچانے کے لیے ظاہری طور پر کلمۂ کفر کہہ دیا ہے تو اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرما دیں گے۔ اس کا اور اس کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ

اس آیت کو استعمال کر کے تقیہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس کے اندر تو ایمان تھا اور اس کے اندر تو کفر ہے ﴿اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ [النحل: ۱۰۶] وہ اندر ایمان کو چھپا رہا ہے اور وہی تو نجات کا ذریعہ ہے۔ یہ تو اپنے اندر ایمان کو نہیں چھپا رہا ہے، یہ ایمان کو ظاہر کر رہے ہیں اور اندر کفر کو چھپا رہے ہیں۔ تو یہاں تو بالکل برعکس معاملہ ہے۔ [ابن کثیر: ۱/ ۴۸، الآیۃ: يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...]

واقعہ:

ایک صحابی قید ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کر لو غیر اللہ کے نام پر تم کوئی چیز ذبح کر دو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ اس نے کہا: غیر اللہ کے نام پر میں کیا ذبح کروں؟ انہوں نے کہا: تمہارے پاس اور کچھ بھی نہیں ہے تو تم ایک مکھی پکڑ لو اور اس کو ذبح کر دو۔ بات تو صرف یہی ہے کہ اللہ کے نام کے سوا غیر کے نام پر ذبیحہ ہے۔ اس نے کہا: بات سنو! تم مجھے قتل کر دو، تم مجھے جلا دو، میں تو شرک نہیں کروں گا۔...... تو یہ بڑی عزیمت کا مقام ہے...... تو بے چارہ قتل ہو گیا، اللہ کے راہ میں شہید ہو گیا۔

واقعہ:

اسی طرح ایک صحابی قید ہو گئے۔ اور بادشاہ کافر تھا۔ اس نے اس صحابی سے کہا کہ اگر تم میری پیشانی پر بوسہ دے دو تو میں تمہیں رہا کر دوں گا، نہیں تو میں تجھے قتل کر دوں گا۔ اس نے کہا: تم مجھے قتل کر سکتے ہو، لیکن کافر کی پیشانی پر میں بوسہ نہیں دوں گا۔ اس کے بعد بادشاہ نے کہا کہ تم ایسا کرو کہ جتنے مسلمان قید میں ہیں، اگر تم مجھے بوسہ دے دو، ان کو بھی میں چھوڑ دوں گا۔ اس نے کہا: میں بوسہ دیتا ہوں، باقی مسلمانوں کی اگر جان بچتی ہے، ان پر تو میں اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، میری وجہ سے تمام مسلمان بے چارے تو نہ مارے جائیں۔ اس لیے اس نے بوسہ دیا تو حضور ﷺ نے دونوں کو سراہا۔ فرمایا: جس نے جان دے دی، لیکن اس نے شرک کو گوارہ نہیں کیا، اس نے عزیمت پر عمل کیا اور جس آدمی نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو چھڑا لیا اس نے رخصت پر عمل کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تو دلوں کے بھید جاننے والے ہیں، اور اللہ تبارک وتعالیٰ جانتے ہیں کہ اس کے دل کے اندر کیا ہے۔

تقیہ اور دھوکہ کی مثال:

یہ مخادع اور منافق اور تقیہ باز جو ہوتے ہیں یہ تو اندر کفر چھپائے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے

دھوکہ دے رہے ہیں، اس لیے جب ان سے بات کرو تو کہیں گے: صحابہ کے دشمن کو تو ہم لعنتی سمجھتے ہیں۔ صحابہ کو جو گالی دیتا ہو اللہ اس پر قہر کرے، اللہ اس پر عذاب کرے۔ تو اب مسلمان سنی گھبرا جاتا ہے، کمال ہے وہ تو صحابہ کو مان رہے ہیں، وہ تو کہتے ہیں کہ صحابہ کا دشمن لعنتی ہے، لیکن ان کے نزدیک صحابہ صرف چار ہیں، باقی ان کے نزدیک صحابہ ہیں ہی نہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد تمام لوگ اسلام چھوڑ کر نکل گئے، صرف چار آدمی مسلمان باقی رہے۔ تو کوئی مسلمان نہیں رہا تو جب وہ صحابہ کا نام لیتے ہیں تو مراد چار صحابہ ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک سارے اصحابِ رسول اللہ مراد نہیں ہوتے۔ تو یہ دھوکہ دینا ہے۔ اور ایک یہ ہوتا ہے کہ ایسی بات کی جائے کہ اس سے دو باتیں سمجھ آ رہی ہوں مخاطب ایک معنیٰ سمجھ رہا ہو اور متکلم دوسرا معنیٰ مراد لے رہا ہو۔ اور جان بچ جائے۔ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ اس کو آپ منافقت نہیں کہیں گے۔ منافقت تو وہ ہوتی ہے کہ اندر کفر ہے اور ظاہر اسلام کر رہا ہے، اندر حضور ﷺ کا دشمن ہے اور باہر منافقت ظاہر کر رہا ہے اور اندر قرآن کا مخالف ہے اور ظاہراً قرآن کو چوم رہا ہے۔

توریہ کلام:

یہ توریہ ایک کلام ہوتا ہے جو ذومعنی ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہجرت کی رات میں جا رہا تھا اور میرے آگے حضور ﷺ جا رہے تھے اور راستہ میں اتفاق سے ایک آدمی نکل آیا تو اس نے مجھ سے پوچھا:

"مَنْ هٰذَا الرَّجُلُ؟ يَا أَبَابَكْرٍ!"

اے ابوبکر! یہ کون آدمی ہے جو تمہارے آگے جا رہا ہے؟ اب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اب میرے لیے بڑا مشکل مقام آ گیا کہ اگر میں بتاتا ہوں کہ آپ اللہ کے نبی حضرت محمد ﷺ ہیں تو دشمن کو پتہ چل جائے گا کہ حضور ﷺ جا رہے ہیں۔ اور اگر میں نہیں بتاتا تو جھوٹ بنتا ہے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زبان سے جھوٹ نکلنا بڑا مسئلہ ہے تو فوراً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دماغ میں اللہ نے ڈالا اور آپ نے فرمایا:

"هٰذَا رَجُلٌ يَهْدِيْنِيَ السَّبِيْلَ"

"یہ وہ انسان ہے جو مجھے راستہ دکھلاتا ہے۔"

اس پوچھنے والے نے یہ سمجھا کہ کوئی عام آدمی ہے جو اس کو راستہ بتلا رہا ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دل میں سمجھا کہ اللہ کے نبی ﷺ راستہ ہی دکھلانے کے لیے آئے ہیں، ہمیں صراطِ مستقیم دکھلا رہے ہیں۔ تو یہ

کلام کے اندر توریہ ہوتا ہے۔

[صحیح البخاری، حدیث:۳۹۱۱، باب ھجرۃ النبی ﷺ...]

اس قسم کے کلام میں توریہ استعمال کرنا جائز ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنی بیگم کے ساتھ جب سفر فرما رہے تھے تو راستہ میں ایک بڑا ظالم بادشاہ تھا۔ کوئی شادی شدہ مرد اگر گزرتا تو اس کی عورت کو چھین لیتا تھا اور...... نعوذ باللہ...... اس کی بے حرمتی کرتا تھا اور اگر عورت شادی شدہ نہ ہو، باپ بیٹی ہوں، یا بہن بھائی ہوں تو اس کو وہ نہیں چھیڑتا تھا، اس کا اپنا ایک مزاج تھا۔ تو حضرت ابراہیم الخلیل علیہ السلام جب گزرے تو اس کے کارندوں نے آ کر بی بی صاحبہ کو روک لیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اگر وہ ظالم بادشاہ تجھ سے پوچھے کہ تم کون ہو تو کہہ دینا کہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہن ہوں۔ حالانکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی تھیں، لیکن بہن سے مراد کیا تھا کہ بیوی چاہے بیوی ہو، لیکن باعتبار دین کے تو بہن ہوتی ہے، کیونکہ ہر کلمہ پڑھنے والا بھائی ہے۔ ''إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ'' [الحجرات:۱۰] یہ تو اس رشتہ کی وجہ سے بیوی بن گئی، کوئی بیٹی بن گئی، کوئی ماں بن گئی، وگرنہ بحیثیت ایک مسلمان کے سب بہن بھائی ہیں۔ تو اس وقت روئے زمین پر حضرت ابراہیم علیہ السلام مسلمان تھے یا بیوی کلمہ پڑھنے والی تھی اور کوئی آدمی ہی نہیں تھا۔ تو بی بی صاحبہ نے جا کر کہہ دیا۔ یہ بظاہر ایک صورت بنتی تھی، حقیقتاً ایک کذب تھا اور اللہ کے پیغمبر جھوٹ سے پاک ہوتے ہیں، اللہ کے پیغمبر گناہوں سے پاک ہوتے ہیں، اللہ انہیں اپنی رسالت کے لیے چن لیتے ہیں۔ تو اس لیے توریہ علیحدہ چیز ہے۔

ایک وقت پر اگر آدمی امتحان میں آ جائے اور ایمان پر پکا ہے ﴿إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾ [النحل:۱۰۶] یہ علیحدہ چیز ہے، لیکن نفاق، خدع علیحدہ چیز ہے۔ ان کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں ہے، کیونکہ یہ شر چھپا کر خیر ظاہر کر رہے ہیں، کفر چھپا کر اسلام ظاہر کر رہے ہیں۔ منافقین اپنے کفر کی وجہ سے، اپنے شکوک کی وجہ سے اور اپنے نفاق کی وجہ سے اپنے نفسوں کے ساتھ بھی برائی کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بھی ناراض کر رہے ہیں۔

اور منافق کی دوسری علامت یہ ہے:

((إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ))

''جب وعدہ کرے گا تو اس کے خلاف کرے گا۔''

اور تیسری علامت یہ ہے:

((وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ)) [صحیح البخاری، حدیث:۳۳، باب: علامة المنافق]

''جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔''

اور اسی طرح ایک حدیث مبارکہ میں آتا ہے:

((إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) [صحیح البخاری، حدیث:۲۴۵۹، باب: إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ]

یہ بھی منافق کی علامت ہے کہ جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ کرے، گندی گندی گالیاں دے اور فحش گالیاں دے تو یہ بھی نفاق کی علامت ہے۔ مسلمان کبھی زبان سے گالی نہیں دیتا۔

منافق کے مقابلہ میں مومن کی صفات:

(حدیث) حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيءِ))

[سنن الترمذی، حدیث:۱۹۷۷، باب مَا جَاءَ فِي اللَّعْنَةِ]

''مومن طعن کرنے والا کسی پر لعنت بھیجنے والا، فحش گوئی کرنے والا اور بدتمیزی کرنے والا نہیں ہوتا۔''

مومن فاحش نہیں ہوتا اور نہ فحش گو ہوتا ہے اور نہ فحش کو پسند کرتا ہے اور نہ وہ گرے ہوئے اخلاق کا آدمی ہوتا ہے کہ گری ہوئی باتیں کرے اور گری ہوئی حرکتیں کرے۔

اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَكُونُ الْمُؤْمِنُ لَعَّانًا)) [سنن الترمذی، حدیث:۲۰۱۹، باب: مَا جَاءَ فِي اللَّعْنِ وَالطَّعْنِ]

مومن لعنت کرنے والا نہیں ہوتا کہ ہر بات میں اس پر لعنت کرے اور اُس پر لعنت کرے۔ یہ مومن کی صفت نہیں ہے کہ ان کی زبان پر لعنت کا ذکر ہو، زبان پر گالی ہو، ان کی زبان پر بری بری باتیں ہوں، یا وہ وعدہ خلافی کرے، یا وہ جھوٹ بولتا ہو۔ یہ تمام منافقوں کی صفات ہیں۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنی حرکات میں، اپنی سکنات میں اور اپنے اعمال میں خود نظر ڈالے کہ میرے اندر کوئی منافق کی علامت تو نہیں آگئی؟ میرے اندر کوئی کفر کی علامت تو نہیں آگئی؟ میرے اندر کوئی ضلالت اور گمراہی کی علامت تو نہیں آگئی۔

مسلمان دھوکہ نہیں دے سکتا...... واقعہ:

میرے والد صاحب رحمہ اللہ نے بھی سنایا اور میں نے بھی شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمہ اللہ کی کتابوں کے اندر

پڑھا ہے۔ پہلے دور کے اندر ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں، دار العلوم دیو بند کے اندر بہت بڑے استاد تھے حافظ تھے اور نابینا تھے۔ اس زمانہ میں گھڑی وغیرہ ہوتی نہیں تھی، گھڑی کا رواج نہیں تھا، پوری دنیا میں کسی بڑے آدمی کے پاس ہوتی ہوگی۔ عام طور پر انہوں نے لکڑیاں اور لوہے کی کیلیں لگائی ہوئی ہوتی تھیں کہ اگر سایہ یہاں تک آجائے تو آٹھ بجے ہیں، یہاں تک آگیا ہے تو زوال آگیا، یہاں آگیا تو مثلِ اوّل ہوگئی اور یہاں آگیا تو مثلِ ثانی ہے۔ تو اس طرح مساجد میں لوہے کی کیلیں لگا کر اوقات کا حساب لگایا جاتا تھا۔ تو جب سایہ آتا تھا، مثلاً ۱۲ بجے کو سایہ آتا تھا تو سب بچوں کی چھٹی کر دیتے تھے۔ آپ کی نظر پہلے کمزور تھی تو وہ طالب تو بڑے شرارتی ہوتے ہیں تو وہ جا کر اس کیل کو آگے کر دیتے تھے، تاکہ جلدی سایہ پہنچ جائے۔ اور استاد کو کہتے: حضرت! سایہ پہنچ گیا، ۱۲ بج گئے، چھٹی کا وقت ہوگیا۔ وہ کہتے: اچھا بھائی! چھٹی کا وقت ہوگیا، چھٹی کرو۔ کبھی آدھا گھنٹہ، کبھی پون گھنٹہ اور کبھی ایک گھنٹہ پہلے لڑکے چھٹی کر کے بھاگ جاتے تھے۔ ایک دفعہ مسجد کے جو نمازی تھے انہوں نے کہا: حضرت! یہ لڑکے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں، آپ کی نظر کمزور ہے، وہ کیل کو نکال کر دوسری جگہ لگا دیتے ہیں اور آپ کو نظر آتا ہے کہ سایہ کیل پر آرہا ہے تو یہ بچے شرارت کرتے ہیں اور آپ غلط چھٹی دے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مسلمان کا بچہ جھوٹ بولتا ہو، یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہوگی، یہ اتنے بچے قرآن پڑھنے والے ہیں، یہ کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وجہ کیا تھی کہ جب انسان خود سچا ہو تو اس کو ہر آدمی سچا نظر آتا ہے۔ وہ یہ کبھی تصور ہی نہیں کر سکتا کہ مسلمان کا بچہ بھی جھوٹ بولے گا۔ مسلمان کے بچے کے زبان پر کبھی جھوٹ آسکتا ہے؟ انہوں نے کہا: میں تو نہیں مانتا۔ اتنے سادے اور عجیب تھے۔...... اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔...... یعنی جیسے آتا ہے "اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ کَرِیْمٌ"[1] مسلمان سادہ طبیعت ہوتا ہے کہ وہ ہر آدمی پر اعتبار کر لیتا ہے، ہر کسی کی بات کو ماننے والا ہوتا ہے، کسی کو جھٹلا نہیں سکتا۔

ایک دفعہ بچوں نے شرارت کی کہ آج استاد سے چھٹی لیں تو ایک بچہ آیا، اس نے کہا: آپ کی آنکھیں سرخ معلوم ہو رہی ہیں، آج خیر تو ہے؟ انہوں نے کہا: کوئی ایسی بات تو نہیں ہے۔ دوسرا لڑکا آیا، اس نے کہا: حضرت! محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کو بخار آرہا ہے۔ اس نے کہا: معلوم تو نہیں ہوتا۔ ایک تیسرا آیا، اس نے کہا: حضرت! محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کی طبیعت خراب ہے، آپ کو بخار ہو رہا ہے۔ جب چار پانچ لڑکوں نے یہ بات کی اور چھٹے نے کہا کہ آپ

[1] [سنن ابی داؤد، حدیث: ۴۷۹۰]

کی نظر تو بالکل جواب دے رہی ہے۔ تو بس آنکھ بند کر کے بیٹھ گئے اور بخار آ گیا اور لکڑی پکڑی ہوئی ہے کہ مجھے شاگردوں نے کہا ہے کہ میں اندھا ہو گیا ہوں، وہ جھوٹ بول نہیں سکتے۔ تو یہ ایمان والے لوگ ہوتے تھے، سیدھے سادھے لوگ ہوتے تھے۔ جس نے جو بات کہہ دی وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔

مفسر فرماتے ہیں: منافق کی مثال اس کشتی کی طرح ہے جدھر کی ہوا چلے اس طرف چل پڑے۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ
ان کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے، پھر اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۝
اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، کیونکہ وہ جھوٹ کہتے تھے۔

سورۃ البقرۃ کی ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

یاد رکھیں!

((كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ.))

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۸۵، باب: مَا قِيلَ فِي أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ]

ہر پیدا ہونے والا بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ آگے پھر نتیجہ ہوتا ہے اگر اس کے والدین یہودی ہیں تو بچے کو یہودی بنا ڈالتے ہیں، نصرانی ہیں تو نصرانی بنا ڈالتے ہیں، مجوسی ہیں تو مجوسی بنا ڈالتے ہیں، مشرک ہیں، دہریہ ہیں تو وہ اس کو مشرک اور دہریہ بنا لیتے ہیں، کیونکہ اس ماحول کا اس پر رنگ چڑھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے نہ کسی کو ایمان کے لیے جبر کیا ہے کہ اس کو زبردستی مومن بنا دیں اور نہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو جبراً کافر بنا دیا ہے کہ وہ مومن بننا بھی چاہے تو اس کو کافر بنا دیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واضح فرما دیا:

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝﴾ [النساء: ۱۴۷]

اللہ نے فرما دیا کہ اے لوگو! تمہیں عذاب دے کر اللہ کو کیا فائدہ ہے؟ اگر تم اللہ کے شکر گزار بن جاؤ، اللہ پر ایمان لانے والے بن جاؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں کیوں عذاب دیں گے؟ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو ہلاک کرنے میں کوئی فائدہ تو نہیں ہے تو اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ ہر انسان کو دینِ فطرت پر پیدا فرماتے ہیں۔

واقعہ:

ایک جنگ کے موقع پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ ایک آدمی...... حالانکہ وہ آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں تھا...... جنگ میں بڑے زور و شور سے لڑ رہا ہے اور کافروں سے مقابلہ کر رہا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انہوں نے اس کی تعریف کی کہ فلاں آدمی نے آج جنگ کے اندر کمال کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ نے دکھلایا ہے کہ اس کے سر پر تو جہنم کی آگ جل رہی ہے۔ تو اب ظاہر دیکھنے والے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ کفر کے خلاف لڑ رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع فرما دی کہ اس کی موت ایمان پر نہیں ہوگی۔ اور چونکہ تمام اختیارات دینے کی طاقت اللہ کے پاس ہے تو انہوں نے ہمیں ایسا شتر بے مہار بھی نہیں بنا دیا کہ ہم اگر اپنی اختیار سے چاہیں تو موت بھی نہ آئے، ہم اپنے اختیار سے چاہیں تو مریں ہی ناں، ہم اپنے اختیار سے چاہیں تو بیماری نہ ہوں، ہم اپنے اختیار سے چاہیں تو ہمیں کبھی کوئی نقصان بھی نہ ہو، بلکہ ہمارے تمام اختیارات اللہ کی قدرت کے تابع ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں کی قلبی حالت کی تبدیلی کی کیفیت:

(حدیث) ایک دن حضرت حنظلہ آرہے تھے اور رو رہے تھے۔ راستے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ملے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت میں سب سے افضل صحابی ہیں، ان سے پوچھا: اے حنظلہ! کیوں رو رہے ہو؟ اس نے کہا: "نَافَقَ حَنْظَلَةُ" اے ابوبکر! حنظلہ تو منافق ہو گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے حنظلہ! کیا کہہ رہے ہو؟ تم تو بڑے سچے مومن ہو، تم کیسے منافق ہو گئے؟ اس نے کہا: دیکھو! منافق وہ ہوتا ہے جس کی حالتیں دو ہوں، یعنی ظاہر میں کچھ ہو اور باطن میں کچھ ہو۔ جب ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھتے ہیں تو ہماری اور کیفیت ہوتی ہے، ہمارے دل کے اندر جو نورِ ایمان موجزن ہوتا ہے، اس سے شعاعیں پھوٹتی ہیں، لیکن جب ہم اپنے گھر میں آتے ہیں تو وہ کیفیت محسوس نہیں ہوتی، ہماری کیفیت بدل جاتی ہے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہماری اور حالت ہو، گھر کے اندر ہماری اور حالت ہو، پھر تو ہم منافق ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی گھبرا گئے۔ آپ نے فرمایا: حنظلہ! تم نے تو بڑی باریک بات کی ہے۔ یہ کیفیت تو میرے ساتھ بھی ہوتی ہے کہ جب ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھتے ہیں، جب ہم آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہیں تو ہماری کیفیت اور ہوتی ہے اور جب ہم اپنے گھروں

میں آجاتے ہیں اور اپنے معاملات میں مشغول ہوجاتے ہیں تو ہماری کیفیت تبدیل ہوجاتی ہے، تو چلو فوراً حضور ﷺ کی خدمت میں چلتے ہیں...... اور یہ تو صحابہ کی شان تھی کہ انہیں جو بھی مشکل پیش آتی، فوراً آقا ﷺ کی خدمت میں پیش ہو گئے......

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے سامنے اپنی کیفیت بتائی تو حضور ﷺ مسکرائے اور فرمایا: اللہ کے بندو! تم مومن ہو...... الحمدللہ...... یہ کیفیت کا تبدیل ہونا...... نعوذ باللہ...... نفاق نہیں ہوتا۔ جب نبی علیہ السلام کی صحبت میں بیٹھے ہو تو اس کی اور کیفیت ہے، ''لَاشَكَّ فِیْ ذٰلِكَ'' صحبت کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اب دیکھیں کہ کوئی آدمی سورج کے زیادہ قریب ہو تو گرمی کا کتنا اثر ہوگا؟ جتنی دور ہوتا چلا جائے گا روشنی تو ہوگی، لیکن سورج کی حدت تو کم ہوتی چلی جائے گی۔ ایک آدمی عین اے، سی کے سامنے بیٹھ جائے تو فوراً آپ کے بدن کو ٹھنڈا کردے گا، تھوڑا دور ہوں گے تو ٹھنڈک کم ہوگی۔...... تو فرمایا: یہ نفاق نہیں ہوتا، میری مجلس میں جیسے تمہاری حالت ہوتی ہے اگر اسی طرح ہر وقت یہی حالت رہے تو آسمان کے فرشتے اتر کر تمہارے قدموں پر پر بچھادیں گے۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۷۵۰، باب: فَضْلِ دَوَامِ الذِّكْرِ وَالْفِكْرِ فِي أُمُورِ الْآخِرَةِ]

یہ تو تبدیلی لازماً ہوگی کہ جب تم شمع نبوت کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوگے، جب تم شارع کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوگے اور جب تم اللہ کے پاک پیغمبر ﷺ کی صحبت میں بیٹھے ہوئے ہوگے تو اب کیفیتوں کا کون مقابلہ کرسکتا ہے؟ تم گھر جاؤ گے تو لازماً اس میں تبدیلیاں آئیں گی، لازماً گھر میں بچوں میں مشغولیت آئے گی، بیوی کے مسائل آئیں گے، گھر کی پریشانیاں آئیں گی، حاجات پیش آئیں گی، تو کیفیت تبدیل ہوگی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ نفاق نہیں ہوتا۔

کفار کے سامنے اسلام نہ لانے کی ایک رکاوٹ:

(واقعہ) رمضان سے پہلے میرا یورپ کے اندر سفر تھا۔ ایک آدمی ملا، اس نے کہا کہ میں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے اور میں اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہوں، اسلام بڑا سچا مذہب ہے، لیکن اس نے کہا کہ جب میں مسلمانوں کو دیکھتا ہوں تو پھر رک جاتا ہوں۔ اس نے کہا: میں نے اسلام قبول کیا ہوا ہے۔ ذہنی طور پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو تمام دنیا کے مسائل کو حل کرسکتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسلام میں آجاؤں، اور میں ایسی جگہ نوکری کررہا ہوں کہ میری پبلک ڈیلنگ ہے، میرے پاس عرب سے بھی مسلمان آتے ہیں، پوری دنیا

سے مسلمان آتے ہیں اور میرے سامنے سے گزرتے ہیں۔ جب میں ان مسلمانوں کے کردار پر نظر ڈالتا ہوں تو میں رک جاتا ہوں کہ بھائی!! اگر یہی مسلمان ہیں تو شراب تو انگریز بھی پیتا ہے، انگریز بھی خنزیر کھاتا ہے اور یہ بھی خنزیر کھاتے ہیں، وہ بھی سوٹ پہنتا ہے اور یہ بھی سوٹ پہنتے ہیں، وہ بھی سودی کاروبار کرتا ہے اور یہ بھی سودی کاروبار کرتے ہیں، وہ بھی جوا کھیلتا ہے اور یہ بھی جوا کھیلتے ہیں، وہ بھی سٹے کا کاروبار کرتا ہے اور یہ بھی سٹے کا کاروبار کرتے ہیں، وہ ریس کورس میں جا کر بازی لگاتا ہے اور یہ بھی گھوڑوں پر جا کر بازی لگاتے ہیں، وہ بھی فلور پر آ کر ڈانس کرتا ہے اور یہ بھی غیر مسلم لڑکیوں کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ڈانس کرتے ہیں اور وہ بھی اپنی لڑکیوں کو منی اسکرٹ پہنا کر بازاروں میں پھراتا ہے اور یہ بھی پھراتے ہیں، تو ان میں اور ان میں فرق کیا ہے؟ اس نے کہا کہ جب میں اس دوعملی کو دیکھتا ہوں تو میرے قدم رک جاتے ہیں۔

تفسیر آیت:

فرمایا: ان کے دلوں کے اندر بیماری ہے اور قاعدہ ہے کہ جب بیماری دل کے اندر پہنچ جائے تو آدمی ختم ہو جاتا ہے، ظاہری بیماری ہو، چاہے باطنی بیماری ہو۔

حدیث شریف میں ہے:

((أَلَا! إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا! وَهِيَ الْقَلْبُ.)) [صحیح البخاری، حدیث: ۵۲، بَابُ فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ]

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ بگڑے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ فرمایا: خبردار! وہ دل ہے۔ یعنی جب دل بگڑا تو سارا کچھ بگڑ گیا اور جب دل ٹھیک ہوا تو سارا کچھ ٹھیک ہو گیا۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ جو منافق ہیں، ان کی بیماری اب جلد میں نہیں ہے، بازو میں نہیں ہے، بلکہ دلوں کے اندر روگ لگ گیا ہے۔ فرمایا:

﴿فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ﴾ [البقرة: ١٠]

''فِي'' ظرفیت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور بیماری دو قسم کی ہوتی ہے:

❁......ایک ظاہری اور جسم کی بیماری ہے، جیسے کوئی چوٹ لگ جانا، بیمار ہونا، خارش وغیرہ ہونا۔

۞......اور دوسری روحانی بیماریاں ہیں: بغض، نفاق، جھوٹ اور شک کی بیماری ہے۔

﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ﴾ [البقرۃ:۱۰]

ہم نے ان کی بیماری کو بڑھا دیا، کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب آدمی اللہ کے راستے میں آتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف صحیح معنوں کے اندر قدم بڑھاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بھی بڑھتی ہیں۔ جب آدمی کفر، انکار، شک اور تذبذب کا شکار ہوتا ہے تو اللہ اسی میں گمراہ کر دیتا ہے کہ اسی میں مرو۔

اگر ساری دنیا نافرمان ہو جائے تو خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی:

اگر ساری دنیا......نعوذ باللہ......کفر پر چلی جائے، ساری دنیا نفاق پر چلی جائے تو اللہ کا کیا نقصان ہوتا ہے......؟ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر ساری دنیا متقی بن جائے، اللہ کا فائدہ کوئی نہیں اور ساری دنیا کافر بن جائے، اللہ کا نقصان کوئی نہیں۔ اگر تم ایمان لاؤ گے تو تمہارا فائدہ ہے اور اگر تم کفر کرو گے تو تمہارا نقصان ہے۔ اللہ تو غنی ہے، اللہ تو بے پرواہ ہے۔ اللہ چاہیں تو آج ساری مخلوق کو ختم کر کے دوسری مخلوق پیدا فرما دیں، اللہ تعالیٰ چاہیں تو پوری کائنات کا نظام تبدیل کر دیں۔

منافقین کے لیے دردناک عذاب ہے:

حضرت ابن عباس اور ابن مسعود اور چند دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ اس مرض سے مراد شک ہے۔

[ابن کثیر:۱/۴۸، الآیۃ: فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ]

یہ سب سے بڑی بیماری ہے کہ شک آیا اور آدمی تباہ ہو گیا۔ اگر یقین ہوتا تو پکا مومن بن جاتا۔ اور یہیں اللہ نے وضاحت بھی فرما دی ہے کہ ہم نے ان کا مرض کیوں بڑھایا؟

﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ:۱۰]

اور ان کے لیے دردناک عذاب کیوں ہے......؟ ﴿بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۝﴾ یہ عذاب اس لیے ہے کہ انہوں نے تکذیب کی۔ اللہ کسی کو ایسے عذاب نہیں دیتے۔ بغیر گناہوں کے، بغیر کفر کے اللہ اس کو جہنم میں ڈالے، ایسی بات نہیں ہے۔ وہ عذاب کیسا ہوگا......؟ جس کو اللہ خود دردناک فرما رہے ہیں اور پھر وہ عذاب اخروی ہے، جہنم ہے اور عذاب آخرت ہے، جس کے اندر کسی قسم کی تخفیف نہیں ہوگی۔

انسانی اعضاء کا دینی حق:

بعض علماء کرام کے نزدیک بیماری کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے جن اعضاء کو جن کاموں کے لیے پیدا فرمایا ہے اس کے خلاف استعمال کرنا بیماری ہے۔ اللہ نے ہمیں آنکھیں دی ہیں، تاکہ ہم اس سے دیکھ کر صراطِ مستقیم پر چلیں، ہم اس سے اللہ کی قدرت پر، اللہ کی آیات پر اور دانائی پر نظر ڈالیں اور اس کی توحید کو سمجھیں۔ اس نے ہمیں پاؤں دیے ہیں کہ اس کے راستے پر چلیں، اطاعت کے راستہ میں چلیں۔ اللہ نے ہمیں کان دیے ہیں کہ ہم ہدایت کی باتیں سنیں۔ تو اس طرح اللہ نے ہمیں جتنے اعضاء دیے ہیں وہ اپنی اطاعت کے لیے عطا فرمائے ہیں۔ جب ہم ان اعضاء کو ان کے حکم کے خلاف استعمال کرتے ہیں تو اس سے بڑی بیماری کیا ہو سکتی ہے؟

عذابِ قبر کی مثال:

آپ ﷺ قبروں سے گزر رہے تھے، فرمایا: ان دو قبر والوں پر اللہ کا عذاب ہو رہا ہے۔ جب حضور ﷺ نے اس عذابِ قبر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور حضور ﷺ نے فرمایا: اگر تم اللہ کے عذاب سے ڈر کر اپنے مردوں کو باہر نہ پھینک دیتے تو اللہ تمہیں بھی دکھلا دیتے۔ لیکن اللہ کی حکمت ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں سے اس بات کو چھپا لیا ہے۔ اب اس کی کیفیت کیسی ہوتی ہے؟ اب دیکھیں کہ دو آدمی ہیں، مثلاً: میاں بیوی ہیں، ایک ہی بستر پر لیٹے ہوئے ہیں۔ ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ میں باغوں میں پھر رہا ہوں اور دوسرا خواب دیکھ رہا ہے کہ مجھے کوڑے مارے جا رہے ہیں۔ اس آدمی کو اس کا پتہ نہیں ہے اور اس کو اس کا پتہ نہیں ہے۔ اگر الگ الگ خواب کے اندر، ایک مقام پر، ایک ہی بستر میں دو کیفیتوں کا اظہار ہو رہا ہے۔ ایک آدمی خوشی محسوس کر رہا ہے اور دوسرا عذاب محسوس کر رہا ہے تو ایک قبر میں اللہ عذاب دینے پر قادر نہیں ہیں......؟ اللہ کے آگے کیا مشکل ہے؟ لہٰذا جو مومن ہے وہ جب سنے گا تو کہے گا: ''اٰمَنَّا بِاللّٰهِ'' ہمارا اللہ پر ایمان ہے۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا:

﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۚ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾

[غافر:۴۶]

''کفار کو جہنم پر صبح اور شام پیش کیا جاتا ہے۔ قیامت والے دن ان کو سخت سے سخت عذاب میں ڈالا جائے گا۔''

اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے عذابِ قبر کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ فرمایا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

معراج کی رات مجھے دکھلایا گیا زانی لوگوں کو کیا عذاب ہو رہا ہے؟ سود خوران کو کیا عذاب ہو رہا ہے؟ میری امت کے جو مولوی حق بات نہیں بیان کرتے ان کو کیا عذاب ہو رہا ہے؟ تو جب عذاب کو دیکھنے والے حضور پاک ﷺ ہیں تو ہمارا ایمان ہے کہ حضور ﷺ کی نظر بھی سچی ہے اور زبان بھی سچی ہے۔ جب مومن بات سنے گا تو کہے گا ''اٰمَنَّا بِاللّٰہِ'' اللہ پر بھی ہمارا ایمان ہے اور حضور ﷺ پر بھی ہمارا ایمان ہے، اس لیے اس کا ایمان بڑھتا چلا جائے گا۔ جب وہ قرآن سنے گا ﴿وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾ [الانفال: ۲] اس کے ایمان میں اللہ پاک اور زیادتی فرمادیں گے۔ جب کافر سنے گا تو اس کا بغض اور عناد بڑھتا چلا جائے گا۔ جوں جوں قرآن نازل ہوگا، جوں جوں انکار کرے گا تو مرض بڑھتا چلا جائے گا۔

مرض کا معنی:

بعض علماء نے فرمایا کہ ''مَرَضٌ'' کا معنی یہ ہے کہ ان کے دلوں میں ریا کی بیماری داخل ہوگئی ہے، یعنی وہ دکھلاوے کے لیے کام کرتے ہیں اور اخلاص سے وہ خارج ہیں۔

حضرت ضحاک ؒ حضرت ابن عباس ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ''مَرَضًا'' کا معنی نفاق ہے۔ نفاق ہی دل کی بیماری ہے۔

حضرت عبدالرحمن بن زید بن اسلم ؒ فرماتے ہیں کہ ان کے دلوں کے اندر بیماری ہے۔ فرمایا: یہ بیماری وہ بیماری نہیں جو بدن کو لگتی ہے۔ بعض بیماریاں ہیں جن کا تعلق بدن سے ہوتا ہے، لیکن نفاق وہ بیماری ہے جس کا تعلق دین کے ساتھ ہے، یعنی ان کے دلوں میں اسلام کے بارے میں شک ہے تو چونکہ ان کے دلوں میں شک ہے تو وہ اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ [ابن کثیر: ۱/ ۴۸، الآیۃ: فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ]

جو لوگ ایمان لاتے ہیں اللہ پاک ان کے ایمان کو بڑھا دیتے ہیں اور ان کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور جو کافر اور منافق ہیں ان کا بغض اور عناد اور بڑھتا چلا جاتا ہے بسبب اس کے انکار کے اور کفر کے۔ چونکہ پہلے شر ہے تو اور شر بڑھ گیا، پہلے گمراہی ہے تو گمراہی اور بڑھ گئی۔

''يُكَذِّبُوْنَ'' میں دو قراءتیں:

اور بعض قراء نے اس کو ''يَكْذِبُوْنَ'' بھی پڑھا ہے اور بعض نے تخفیف کے ساتھ ''يُكَذِّبُوْنَ'' بھی پڑھا ہے،

یعنی اس میں دو قراءتیں ہیں۔ اب مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دونوں قراءتیں درست ہیں کہ منافق لوگ جھوٹے بھی ہیں اور جھٹلانے والے بھی ہیں۔ یہ خود بھی جھوٹ بول رہے ہیں کہ ظاہراً اسلام کو کرتے ہیں اور اندر کفر کو چھپاتے ہیں اور قرآن اور اللہ کے احکامات کو جھٹلانے والے بھی ہیں، لہٰذا دونوں قراءتیں درست ہیں۔

[ابن کثیر: ۱/۴۸، الآیۃ: فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ]

مدینہ کے قبرستان سے منافقین کو نکال دیا جائے گا:

ایک حدیث مبارک میں یہ بھی آتا ہے کہ قیامت کے قریب مدینہ منورہ میں ایک بڑا زلزلہ آئے گا۔ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ وہ اتنا بڑا بھونچال ہوگا، اتنا بڑا زلزلہ ہوگا کہ پورے مدینہ کی زمین لرز جائے گی۔ اور اس زلزلے کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ جتنے منافق لوگ وہاں مرے ہیں، جتنے بدعقیدہ لوگ وہاں مرے ہیں، ان کی قبریں انہیں مدینہ سے اٹھا کر باہر پھینک دیں گی، اللہ تعالیٰ مدینہ کو پاک صاف کر دیں گے۔ تاکہ جب قیامت والے دن میرے آقا ﷺ روضہ مبارک سے اٹھیں گے تو آپ جس جماعت کو ساتھ لے کر میدان حشر میں جائیں گے وہ پکے ایمان والوں کی جماعت ہوگی۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں جب اپنے روضہ مبارک سے اٹھوں گا تو میں جنت البقیع کے قبرستان پر تشریف لے جاؤں گا...... جو مدینہ کا قبرستان ہے...... اور پھر فرمایا کہ میں مکہ والوں کا انتظار کروں گا، مکہ والے بھی مدینہ پہنچ جائیں گے، جب مکہ والے آجائیں گے تو ان کو میں اپنے دائیں ہاتھ پر رکھ لوں گا اور مدینہ والوں کو اپنے بائیں ہاتھ پر رکھوں گا۔...... مکہ والے مہمان ہوں گے، سفر کر کے آئے ہوئے ہوں گے، اس لیے حضور ﷺ ان کی تکریم فرمائیں گے، ان کو اپنے دائیں ہاتھ پر رکھیں گے۔...... اور فرمایا کہ ان سب کو لے کر میں میدانِ حشر کی طرف بڑھوں گا۔ اس لیے مدینہ پاک کی خصوصیت ہے کہ وہاں اگر کوئی منافق مر گیا اور دفن ہو گیا، قربِ قیامت میں وہ وہاں سے نکال دیا جائے گا۔ اب ہمیں تو پتہ نہیں ہے۔

قاضی اپنے علم کے مطابق فیصلہ نہ کرے:

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور قول بھی نقل کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے منافقوں کے عمل کے بارے میں (قتل وغیرہ کا) حکم نہ دیا اور باقی امت کو ایک مسئلہ سمجھا دیا کہ قاضی اپنے علم سے کبھی فیصلہ نہ کرے گا۔ قاضی اگر فیصلہ کرے گا تو گواہوں سے فیصلہ کرے گا۔ قاضی کو ایک قصہ کا علم ہے، اس کے مطابق فیصلہ جاری نہیں

کرے گا، گواہوں کا انتظار کرے گا۔ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو خبر عطا فرما دی، لیکن حضور ﷺ نے حکم جاری نہ فرمایا، تاکہ پوری امت کو یہ مسئلہ سمجھ آجائے کہ قاضی اپنے علم سے فیصلہ نہ کرے۔ اسی طرح قاضی اگر اپنے علم کے مطابق جانتا ہے کہ یہ قاتل ہے تو اگر شہادت نہ ملے تو وہ قتل کا فیصلہ نہیں کرے گا۔

[ابن کثیر: ۱/۴۸، الآیۃ: فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ]

کلمہ نفاق کا گناہ بھی مٹا دیتا ہے:

امام شافعی ؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے منافقوں کو اس لیے قتل نہ کیا کہ منافقین چاہے دل کے اندر کفر رکھتے تھے، لیکن زبان سے کہتے تھے ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' جو آدمی زبان سے کلمہ پڑھے تو پہلے گناہ جو ہیں اور پہلی خطا جو ہے معاف ہو جاتی ہے، لہٰذا جب وہ ظاہر سے اقرار کرتے تھے تو ان کے ظاہر کو مقدم رکھا گیا، اسی لیے اسلام ظاہر پر فیصلہ کرتا ہے۔ ایک آدمی کلمہ پڑھ رہا ہے، ہم کہیں گے کہ مسلمان ہے۔ اس کے دل کے اندر کیا ہے؟ یہ اللہ جانتے ہیں، ہم فیصلہ نہیں کر سکتے، کیونکہ ہم نے جو فیصلہ کرنا ہوتا ہے وہ ظاہر سے کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر میں وہ جب ہم سے کہتے ہیں ''نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ'' [المنافقون: ۱] ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

آدمی کی جان و مال کب محفوظ ہوتا ہے؟

علامہ ابن کثیر ؒ فرماتے ہیں کہ اس قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو صحیحین کے اندر موجود ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَإِذَا قَالُوْا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ))

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۹۹، باب: وُجُوبِ الزَّكَاةِ؛ صحیح مسلم، حدیث: ۳۵، واللفظ لہٗ]

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال اور جہاد کروں اس وقت تک جب تک کہ وہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' نہ کہیں۔ جب وہ کلمہ پڑھ لیں، جب وہ اللہ کی وحدانیت کا اور میری رسالت کا اقرار کر لیں تو میری طرف سے ان کے اموال اور ان کا خون سب محفوظ ہو گئے۔ اب ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے کہ انہوں نے دل سے کلمہ پڑھا ہے

یا ظاہر سے کلمہ پڑھا ہے۔ [ابن کثیر: ۱/۴۹، الآیۃ: فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ]

جو حضور ﷺ کے زمانہ میں ''منافق'' تھا اب اس کا نام ''زندیق'' ہے:

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو حضور ﷺ کے زمانہ میں ''منافق'' کہلاتا تھا وہ آج ''زندیق'' کہلاتا ہے۔ زندیق کے بارے میں کیا حکم ہے کہ اس کو قتل کیا جائے یا اس کو قید کر کے اس سے توبہ لی جائے یا اگر زندیق بار بار تکرار کرے تو اس کو قتل کیا جائے؟ مفسر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب الاحکام کے مسائل ہیں۔ آپ نے اگر اس کی تفاصیل دیکھنی ہے تو ''کتاب الاحکام'' میں دیکھیں۔ بہر حال! انہوں نے فرمایا کہ اس زمانہ میں جو منافق تھے، ظاہراً اسلام کا نام لیتے تھے، لیکن اندر کفر چھپا ہوا تھا، آج بھی وہ لوگ جو ظاہراً اسلام کا نام لیں، لیکن اللہ کے قرآن کا انکار کریں، اللہ کے نبی ﷺ کی سنت کا انکار کریں تو ان پر بھی زنادقہ کا حکم جاری کیا جائے گا۔

[ابن کثیر: ۱/۴۹، الآیۃ: فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ]

منافقوں کی ایک چال:

مفسر ﷺ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ ایک سفر میں تشریف لے جا رہے تھے تو منافقوں نے آپس میں مشورہ کیا، مثلاً ایک چڑھائی تھی اور اس کے بعد ایک بہت بڑا گڑھا تھا۔ منافقوں بدبختوں نے یہ مشورہ کیا کہ جب اس چڑھائی سے حضور ﷺ کی سواری اترے تو قریب جا کر حضور ﷺ کی سواری کو ڈرا دیا جائے، تا کہ سواری دوڑے اور گھاٹی میں گر جائے۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ اس طرح ہم حضور ﷺ کو شہید کر دیں۔ انہوں نے یہ پروگرام بنا لیا کہ اس طرح پتہ بھی کسی کو نہیں چلے گا کہ اونٹنی تھی، بھاگ پڑی، جانور تھا، ڈر گیا۔ اس لحاظ سے ہماری بات بھی رہ جائے گی اور ہم حضور ﷺ کو نقصان بھی پہنچا دیں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کے پاس وحی بھیجی کہ میرے مدنی! فلاں فلاں آپ کے دشمن ہیں، ان لوگوں نے یہ پروگرام بنایا ہے، لہٰذا آپ ان کی شرارت سے محفوظ رہیں۔ حضور ﷺ کو اللہ نے محفوظ فرما لیا تو اس مشورہ کے اندر چودہ منافقوں کے نام، حضور ﷺ نے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو بتلائے۔ [ابن کثیر: ۱/۴۹، الآیۃ: فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ]

منافقین کے قتل کا حکم کیوں نہ دیا؟

مفسر فرماتے ہیں کہ ایک وجہ یوں بھی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے چونکہ حضور ﷺ کی ذاتی مخالفت کی تھی، اس

لیے حضور ﷺ نے ان سے بدلہ نہیں لیا۔ حضور ﷺ کا زندگی میں یہ عمل رہا ہے کہ اپنی ذات کے لیے میرے پاک نبی ﷺ نے کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ حضور ﷺ کو اللہ نے رحمتِ دو جہاں بنا کر بھیجا۔ آپ کو جو بھی تکلیف پہنچی آپ نے معاف فرما دی۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ خیبر میں جب حضور ﷺ کو زہر دیا گیا، زہر کھلایا گیا، لیکن حضور ﷺ نے اپنی ذات کا بدلہ نہیں لیا، ان صحابہ کا بدلہ لیا جو صحابہ اس زہر سے شہید ہو گئے، ان کے بدلے میں حضور ﷺ نے قصاص کا حکم دے دیا۔

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ وجہ بھی ہو کہ اعیانِ منافقین جن کی باقاعدہ تعیین کر دی گئی تھی اور پھر چودہ افراد تھے اور ان کے نام بھی معلوم تھے، اس لیے حضور ﷺ نے ان کے قتل کا حکم نہ دیا۔

[ابن کثیر: ۱/۴۹، الآیۃ: فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ]

منافق کے مقابلے میں مومن کی صفت:

((لَا يَكُونُ الْمُؤْمِنُ لَعَّانًا)) [سنن الترمذی، حدیث: ۲۰۱۹، باب: مَا جَاءَ فِي اللَّعْنِ وَالطَّعْنِ]

مومن ہرگز ایسے نہیں ہوتا کہ لوگوں پر لعنتیں بھیجا کرے کہ فلاں لعنتی، فلاں لعنتی اور فلان لعنتی۔ یہ مومن کی صفت نہیں ہے:

((اَلْمُؤْمِنُ لَايَكُوْنُ فَاحِشًا وَلَا مُتَفَحِّشًا))

مومن ایسے نہیں ہوتا کہ زبان سے فحش بات نکالے، کبھی زبان سے گندی باتیں نکالے، غلیظ باتیں نکالے۔ یہ منافقوں کی علامات ہیں، یہ مومن کی علامت نہیں ہوسکتی۔ بلکہ مومن کی علامت تو یہ ہے:

﴿وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ [الفرقان: ۶۳]

اگر کبھی جاہلوں سے واسطہ پڑ جائے، غلط آدمی سے واسطہ پڑ جائے تو ان سے کنارہ کش ہو جائے، ان کو جواب بھی نہ دے۔

﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ [الفرقان: ۷۲]

اگر کبھی برائی یا برے لوگوں پر گزر ہو تو اپنا دامن بچاتے ہوئے نکل جائے۔ یہ مومن کی صفت ہے، اس لیے کوشش کریں کہ اللہ ہمیں منافقوں کی صفات سے بچائے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں: ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ جان لو وہی فساد پھیلانے والے ہیں، لیکن نہیں سمجھتے۔

وحی کا دروازہ بند ہو گیا:

جب حضور ﷺ کی وفات ہوئی تو سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے رثاء کے بارے میں جو اور الفاظ کہے ہیں، وہاں سیدہ کے یہ الفاظ بھی احادیث میں موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا: "وَا اَبَتَاهُ!" اور ایک روایت میں ہے: "يَا اَبَتَاهُ! اَلْيَوْمُ انْقَطَعَ الْوَحْيُ" ہائے ابا جان! آپ کی جدائی سے اور بھی جدائی ہوگئی کہ وحی بھی ختم ہوگئی، کیونکہ جب آپ ہمارے اندر موجود تھے تو وحی اترتی تھی۔ اب آپ جب ہم سے چلے جا رہے ہیں، آپ کی وفات ہوگئی تو وحی بھی ہم سے منقطع ہوگئی، کیونکہ اب تو وحی نہیں اترے گی۔

منافق کی پہچان ایک دروازہ بند ہو گیا:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے علاوہ دیگر ائمہ کرام فقہاء عظام اور محدثین کرام فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں منافقوں کے معلوم کرنے کے دو طریقے تھے:

ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی علامات اور اپنی عادات سے پہچانے جاتے تھے کہ یہ منافق ہے، دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعہ سے بتا دیتے تھے کہ یہ منافق ہیں اور یہ فلاں سازش کر رہے ہیں۔ جیسا کہ چودہ منافقوں نے مل کر حضور ﷺ کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ پاک نے فوراً جبرئیل علیہ السلام کو بھیج کر اپنے پیغمبر ﷺ کو خبر دے دی۔ اسی طرح عبداللہ بن ابی بن سلول نے کہا تھا:

﴿لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۭ﴾ [المنافقون:۸]

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے آکر حضور ﷺ کو خبر دی۔ عبداللہ بن ابی کو حضور ﷺ نے بلایا، تم نے یہ باتیں کی ہیں؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے خدا کی قسم ہے! میں نے یہ باتیں نہیں کی ہیں۔ اب اللہ پاک نے وحی بھیج کر قرآن پاک میں خبر بھیج دی کہ آپ کے صحابی سچے ہیں، یہ منافق جھوٹے ہیں۔ انہوں نے مشورہ بھی کیا ہے اور

انہوں نے یہ لفظ بھی کہے ہیں کہ ہم مدینہ میں جانے کے بعد جو ہم عزت والے ہیں ذلت والوں کو نکال دیں گے۔تو اس زمانہ میں وحی کا سلسلہ موجود تھا۔

حضور ﷺ کی وفات کے بعد علماء نے فرمایا: یا مسلمان ہیں یا کافر ہیں۔یعنی اب تو آدمی یا تو مسلمان سمجھا جائے گا یا کافر سمجھا جائے گا۔اس کی نفاق کی علامات سے تو ہم اس کو پہچانیں گے،وگرنہ یقینی فتویٰ نہیں ہوگا کہ یہ منافق ہے،البتہ قرآن کی اصطلاح میں ان پر ملحد کے لفظ کا اطلاق ہوگا۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ؕ﴾[حٰمٓ السجدۃ:۴۰]

''جو لوگ ہماری آیتوں کے بارے میں ٹیڑھا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے۔''

اللہ تعالیٰ کے قرآن کی آیات کے اندر ایسی ایسی تاویلاتِ فاسدہ کرتے ہیں کہ اللہ کے قرآن کے معانی ومفہوم و منشاء کو بدل ڈالتے ہیں۔ان پر ملحد کا اطلاق ہوگا اور حدیث کی لغت میں ان پر زندیق کا اطلاق ہوگا۔یعنی وہ بھی منافق ہیں جو اللہ کے دین اور اللہ کے احکام کو بظاہر تو کہیں کہ ہم مسلمان ہیں،ہم قرآن کو مانتے ہیں،لیکن قرآن کی آیات کا مفہوم بدل ڈالیں۔آج کل بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ربوا (سود) علیحدہ چیز ہے اور سود علیحدہ چیز ہے۔ ربوا حضور ﷺ کے زمانہ میں تھا،وہ الگ ہے اور جو ہماری بینکنگ میں رائج ہے الگ ہے،تو یہ اللہ کے قرآن کی تحریف ہے۔اللہ کے قرآن کی آیات کے اندر تاویلات کے ذریعہ قرآن کو بدلنا چاہتے ہیں۔

تاویلات کے ذریعہ حرام کو حلال قرار دینا:

اسی طرح جیسا کہ بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ قرآن پاک میں اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم نے مردہ جانور حرام کر دیا ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ﴾[المائدۃ:۳]

''تم پر حرام کیے گئے ہیں مردار،خون اور خنزیر کا گوشت۔''

وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا: گوشت حرام ہے،ہڈیاں تو حرام نہیں،بال تو حرام نہیں ہیں۔اس لیے انہوں نے خنزیر کے بالوں سے دانتوں کے برش بنائے ہیں اور شیو کے لیے جو برش استعمال کرتے ہیں وہ بنائے ہیں،باقاعدہ لکھا ہے کہ یہ خنزیر کے بالوں کے بنائے ہوئے ہیں اور سب سے مہنگے وہی ہوتے ہیں اور مسلمان وہی استعمال کرتا ہے۔کیونکہ لوگوں نے ایک ذہن بنالیا ہے کہ گوشت ہی حرام ہے،کیونکہ قرآن نے فرمایا کہ اس کا گوشت حرام ہے،

یہ تو فرمایا ہی نہیں کہ اس کی ہڈیاں بھی حرام ہیں، اس کے بال بھی حرام ہیں۔ حالانکہ مفہوم قرآن یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بتلا رہے ہیں کہ یہ چیزیں حرام ہیں اور یہ چیزیں حرام ہیں۔ چونکہ عام طور پر گوشت کھایا جاتا ہے، اس لیے حکم آگیا کہ گائے کا گوشت حلال ہے، بکری کا گوشت حلال ہے، لیکن خنزیر کا حرام ہے، کتے کا حرام ہے اور ہر ذی ناب کا گوشت حرام ہے۔ اب اس کی تفصیلات جو ملیں گی وہ ہمیں حدیثِ رسول ﷺ میں ملیں گی۔

یاد رکھیں! اس قسم کی جو لوگ اللہ کے قرآن میں تحریف کرتے ہیں وہ بھی منافق ہیں، ان کو قرآن کی اصطلاح میں ملحد کہا جائے گا اور احادیث کی اصطلاح میں انہیں زندیق کہا جائے گا کہ وہ اللہ کے قرآن کو بدل رہے ہیں، اللہ کے نبی ﷺ کے فرمان کو بدل رہے ہیں اور اپنی خواہشات کے مطابق اس کو معنی پہنا رہے ہیں۔

دین کے مسائل کا مذاق اڑانے والے:

ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا، بلکہ نماز کا استہزاء کرتا ہے۔ ایک آدمی داڑھی کا استہزاء کرتا ہے، داڑھی سنتِ انبیاء ہے۔ یہ صرف میرے مدنی پاک ﷺ کی سنت نہیں، بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اب اگر کوئی آدمی...... نعوذ باللہ...... داڑھی پر طنز کرے یا اعتراض کرے یا داڑھی والوں کا باعتبار داڑھی کے مذاق اڑائے یا محاورۃً کہہ دے کہ چھوڑو جی! یہ داڑھی والے تو جھوٹے ہوتے ہیں، حالانکہ ایک داڑھی والے کا الزام سارے داڑھی والوں پر تو نہیں لگ سکتا۔ جب وہ کوئی ایسا استہزائی کلمہ زبان سے نکالے اس پر بھی وہی اطلاق ہوگا، جیسے منافق استہزاء کرتے تھے۔ وہ دین کے بارے میں ایسی باتیں کرتے تھے کہ ان کا مقصود استہزاء ہوتا تھا۔ اب اس سے اندازہ ہوگا کہ یہ لاکھ کہتا رہے کہ میں مسلمان ہوں، لیکن منافق ہے۔ اگر یہ مسلمان ہوتا تو کبھی حضور ﷺ کی سنت کو مذاق نہ بناتا، کبھی حضور ﷺ کی سنت کو استہزاء کے طریقہ پر اختیار نہ کرتا۔ اس لیے اب علماء نے فرمایا کہ اب وہ علامات سے پہچانے جائیں گے کہ جو لوگ قرآن میں تحریف کر دیتے ہیں، احادیث رسول اللہ ﷺ میں تحریف کر دیتے ہیں یا ان کے معنوں کو ایسا تبدیل کر دیتے ہیں کہ اللہ کے قرآن کا مفہوم ہی تبدیل ہو جائے تو اس پر ملحد کا اطلاق بھی ہوگا اور زندیق کا اطلاق بھی ہوگا اور منافق کا اطلاق بھی ہوگا۔

فساد کی دو قسمیں:

﴿قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪﴾ [البقرۃ:۱۱]

''وہ کہتے ہیں: بالکل اصلاح کرنے والے ہم ہی ہیں۔''

''اِنَّمَا'' حصر کا کلمہ ہے کہ ہمارے اندر اصلاح ہی اصلاح ہے۔

فساد دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک فساد کو تو سب لوگ سمجھتے ہیں اور مانتے ہیں۔ مثلاً: چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا فساد ہے، قتل کرنا اور خون ریزی کرنا فساد ہے، اس کو تو سب فساد سمجھتے ہیں، سب اس کو برا بھی جانتے ہیں اور سب اس کو روکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اور جو اصل فساد ہے اس کے بارے میں کوئی توجہ ہی نہیں کرتا۔ اصل فساد یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دماغ میں اور عقیدہ میں فساد ڈال دیا جائے۔ اب وہ اللہ کی توحید کی جگہ شرک کرنا شروع کر دے، سنت کی بجائے بدعت پر چلنا شروع کر دے اور اللہ کے احکام کی تعمیل کی بجائے شیطانی احکام کی تعمیل شروع کر دے۔ اصل فساد تو یہ ہے۔ اس فساد سے ہی یہ ظاہری فساد مرتب ہوتے ہیں۔ اگر اس اصل فساد کو ختم کر دیا جائے تو ظاہری فساد خود بخود مٹ جاتے ہیں۔

ملعون عورت:

ایک مسئلہ ہمیشہ یاد رکھ لیں! حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو عورت ایسا تبرّج کرے کہ اس سے سنگھار، حسن اور جمال کا اظہار ہو، اور فرمایا: تعطرات ایسی خوشبو لگائے کہ لوگوں کو خوشبوئیں محسوس ہوں، ایسا زیور پہنے کہ لوگوں کو اس کی آواز آئے، ایسا چست لباس پہنے کہ بدن کا حجم نظر آئے، اتنا باریک لباس پہنے کہ بدن کا رنگ نظر آئے اور ایسا لباس پہنے کہ بال نظر آئیں ایسی عورت پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔

بدعقیدہ صحیح العقیدہ کو فسادی کہتے ہیں:

اور ہم منافقت اس لیے کرتے ہیں کہ ہم دونوں کو ملانا چاہتے ہیں اور آپ کھری بات کر کے دونوں کو لڑانا چاہتے ہیں، یعنی منافق الٹا یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم اصلاح کرنے والے ہیں اور مسلمان فساد کرنے والے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ علماء نے فرمایا کہ آج بھی جتنے حق والے لوگ ہیں، حق کی جماعتیں ہیں، لوگ انہی کو کہتے ہیں کہ یہ فسادی ہیں۔ لوگ انہی کے بارے میں کہیں گے کہ یہ بڑے فسادی ہیں۔ مولوی جب سے آیا ہے، یہ پکا وہابی ہے، اس نے جھگڑا پھیلا دیا ہے، پہلے ہم سارے مزے سے رہتے تھے، ہم سارے قبروں پر جاتے تھے، نذر و نیاز دیتے تھے۔ یہ جب سے آیا ہے، نہ فاتحہ، نہ درود، نہ نذر و نیاز اور نہ اٹا نہ گھٹا، یہ تو مصیبت بن گیا، فسادی ہے۔ یہ جب سے آیا

ہے صحابہ کے نام پر لڑائی شروع کر دی ہے، حالانکہ فساد وہ ہوتا ہے جو اللہ کے حکم کے خلاف کر رہا ہو، وہ اللہ کے حکم کو جاری کرنا چاہتا ہے۔

اللہ جانتا ہے کہ فسادی کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون ہے؟ اسی لیے فرعون نے کہا تھا کہ میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ موسیٰ (علیہ السلام) میرے ملک میں فساد کرنے آیا ہے۔ اللہ کے نبی ہیں، ہارون علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، لیکن ہر فرعون اور ہر فرعون کا پیروکار حق والوں کو ہمیشہ کہے گا کہ وہ فساد کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے ملک میں دیکھا ہوگا کہ جب تبلیغ والے آجائیں تو کہتے ہیں کہ یہ بڑے فسادی ہیں، ان کو مسجد سے نکالو اور مسجد کو دھودو، کیونکہ یہ آدمیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور ان کو اپنے جیسا بنا دیتے ہیں۔ ارے بھائی! اس کوڑا کو بنا دیتے ہیں یا نمازی بنا دیتے ہیں؟ بے دین بنا رہے ہیں یا دیندار بنا رہے ہیں؟ کسی بے داڑھی والے کو داڑھی والا بنا رہے ہیں یا سنت کو مٹا رہے ہیں؟ ہمیشہ یہ قاعدہ ہے کہ باطل حق والے کو کہے گا کہ یہ فسادی ہے، حالانکہ اصل فساد کرنے والا کون ہوتا ہے؟ جو باطل ہو۔ اللہ رحمت فرمائے۔ دعا کریں اللہ پورے عالم اسلام سے فتنہ اور فساد کو ختم کر فرما دے، اللہ تبارک و تعالیٰ پورے عالم اسلام میں امن وامان قائم فرمادے۔

جھگڑا، فساد نہ ماننے سے ہوتا ہے:

اس دفعہ جب میں سفر پر تھا تو مجھے ایک بہت بڑے ذمہ دار افسر نے کہا کہ یہ جو لوگ ہیں بڑے اچھے نوجوان ہیں اور بڑے نمازی بھی ہیں اور...... ماشاء اللہ...... ان کے چہروں پر داڑھیاں بھی ہیں اور سنت کے مطابق کپڑے بھی پہنتے ہیں، لیکن یہ بڑا جھگڑا ہے کہ صحابہ کے نام پر لڑائیاں اور فساد کرتے ہیں، یہ بڑے فسادی لوگ ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ حضرت! مجھے آپ ایک بات بتائیں کہ جھگڑا ماننے سے ہوتا ہے یا نہ ماننے سے ہوتا ہے؟ آپ تو...... ماشاء اللہ...... اتنے بڑے افسر ہیں اور اللہ نے آپ کو اقتدار دیا، ہم تو ملاں لوگ ہیں۔ اس نے کہا کیا مطلب؟ میں نے کہا: آپ مجھے کہتے ہیں کہ میرے اس کمرے سے باہر چلے جاؤ۔ میں نے آپ کی بات مان لی اور باہر چلا گیا۔ اب بتائیں کہ جھگڑا ہوگا؟ اس نے کہا: پھر جھگڑے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ جھگڑا تب ہوگا کہ جب تم مجھے کہو کہ کمرے سے باہر نکل جاؤ اور میں کہوں کہ نہیں نکلتا۔ تم کہتے ہو کہ میں دھکے مار کر نکالوں گا، میں کہتا ہوں نہیں نکلتا۔ تم کہو گے کہ آدمیوں کو بلاؤ اور اس کو باہر نکالو اور میں باہر نہیں نکل رہا، میں چمٹا ہوا ہوں۔ تو اب جھگڑا اور فساد ہوگا۔ تو فساد نہ ماننے سے ہوگا، ماننے سے کبھی نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کہ ہم تو صحابہ رضی اللہ عنہم

کے غلام، اہل بیت رضی اللہ عنہم کے بھی غلام، تو ہم کیسے جھگڑا کریں گے؟ جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دشمن ہو، وہ ہمارا دشمن ہے۔ جس طرح کوئی شانِ صدیق رضی اللہ عنہ میں کوتاہی کرے وہ زندیق اور لعنتی ہے، اسی طرح اگر کوئی شانِ اہل بیت میں کوتاہی کرے وہ بھی زندیق اور لعنتی ہے۔ تو ہم ماننے والے ہیں، قرآن کو ماننے والے ہیں، اہل بیت کو ماننے والے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ماننے والے، بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ماننے والے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ماننے والے، اولادِ نبی کو ماننے والے، ان کے مرتبہ شہادت کو ماننے والے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حیدر کرار ماننے والے ہیں۔ جھگڑا تو وہ کرے گا جو صدیق رضی اللہ عنہ کو نہ مانے، جھگڑا تو وہ کرے گا جو عمر رضی اللہ عنہ کو نہ مانے، جو عثمان رضی اللہ عنہ کو نہ مانے، جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کو نہ مانے۔ اب آپ مجھے سمجھائیں کہ ماننے والا کیسے جھگڑا کر سکتا ہے؟ مجھے سمجھ نہیں آتی، تمہاری عقل کا ماتم کرنا چاہیے، اتنی بڑی کرسی کے بعد اللہ نے تمہیں عقل نہیں دی، باقی سب کچھ عطا فرما دیا ہے۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھو! کبھی ماننے والا جھگڑا ہی نہیں کرتا۔ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مان لیا، کوئی جھگڑا ہے؟ جھگڑا تو وہ کرے گا جو کہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مانتا ہوں، لیکن ختمِ نبوت کو نہیں مانتا۔ اب جھگڑا آ گیا ہے۔ تو جھگڑا ماننے سے شروع ہوا کہ نہ ماننے سے شروع ہوا؟ جس نے مان لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام انبیاء کے سردار ہیں تو جھگڑا ہو سکتا ہے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس نے کہا: یہ تو بات ٹھیک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی بھی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمت بھی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت ختم نہیں ہوئی، بلکہ آپ کے بعد ایک مرزا بھی نبی ہے۔ تو اب جھگڑا ماننے والے نے کیا ہے یا نہ ماننے والے نے کیا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں مانا اس نے جھگڑا کیا ہے۔ ایک آدمی کو آپ کہیں کہ آؤ بھائی جی! نماز پڑھیں تو وہ کہے: ماشاءاللہ چلو چلیں، ہمیں بھی حرم میں نماز مل جائے، تو کوئی جھگڑا ہے؟ اور جب وہ کہے کہ میں نماز نہیں پڑھتا۔ اب ماننے والا جھگڑا کرے گا یا نہ ماننے والا جھگڑا کرے گا؟

کیا منافقین ماننے والے تھے؟ ظاہر میں اسلام ہے اور اندر اسلام نہیں ہے۔ اور مسلمان اندر باہر سے ماننے والے ہوتے ہیں۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ تم فساد نہ کرو۔ اور فساد وہ کرتا ہے جو اللہ کے احکام کو نہ مانتا ہو، مثلاً: چوری

بھی فساد ہے، قتل کرنا، ڈاکہ مارنا بھی فساد ہے، ساری دنیا فنا ہو جائے اللہ کے نزدیک وہ معمولی بات ہے، لیکن ایک انسان کا قتل زیادہ شدید بات ہے۔ دعا کرو کہ اللہ مسلمانوں کو قتل سے، خون ریزیوں سے اور فساد سے محفوظ فرمادے۔ اللہ تعالیٰ تمام عالم اسلام میں امن، امان، استقرار، سکون اور عین امن والی وہ کیفیت پیدا فرمادے جو حضور ﷺ کے زمانہ میں تھی۔

جہاد کے احکام کیوں جاری کیے گئے؟

فساد کا ایک طریقہ علماء نے فرمایا کہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کے عقیدے میں شک ڈالتا پھرے، شبہات پیدا کرتا پھرے، نبی کریم ﷺ کی ذات کے بارے میں یا احکامِ اسلام کی مراد میں شک پیدا کرے۔ سب سے بڑے فسادی منافق ہوتے ہیں اور سب سے بڑا فسادی کافر ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ ۚ﴾ [الانفال:۳۹]

''اور (مسلمانو!) ان کافروں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور دین پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے۔''

کافروں کے خلاف قتال اور جہاد کرو، کیوں جہاد کریں؟ اب دیکھیں کہ اگر ایک انگلی خدا نہ کرے گندی ہو جائے، اس کو کینسر لگ جائے تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ انگلی کاٹ دو، ورنہ ہاتھ پورا گل جائے گا۔ انگلی کاٹنے سے باقی جسم کو بچانا ہوتا ہے۔ اگر کفر کے خلاف جہاد نہ کیا جائے تو پھر پوری دنیا میں کفر پھیل جائے گا۔ تو جیسے جسم کو بچانے کے لیے انگلی کا کاٹنا ضروری ہے، عالم اسلام کو بچانے کے لیے کفر کا کاٹنا ضروری ہے۔ اسی لیے پھر اللہ تعالیٰ نے جہاد کے احکام جاری فرمائے کہ اگر امت جہاد نہیں کرے گی تو کفر پھیلے گا۔ اور اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا: میری امت اس وقت تک عزت سے رہے گی جب تک جہاد پر کاربند رہے گی۔ جس دن میری امت نے جہاد کو چھوڑ دیا اور مال و دولت میں لگ گئی اس دن ذلیل ہو جائے گی۔ آج دیکھ لو! پوری دنیا میں مسلمان اربوں کی تعداد میں ہیں، یعنی اتنی بڑی تعداد ہے کہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن دلوں سے جذبۂ جہاد نکل گیا، جذبۂ ایمان ختم ہو گیا، صرف نام کے ہم مسلمان رہ گئے، انجام یہ ہے کہ آج ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ اصل فساد نفاق ہے، کفر ہے، لیکن یہ بدبخت ایسے ہیں کہ سمجھ ہی نہیں رہے۔

منافقین کے دعویٰ کا رد:

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۲]

قاعدہ ہے کہ انکار جتنا سخت ہوگا جواب بھی اتنا سخت ہوگا۔ انہوں نے جملہ حصر کا بولا تھا کہ ﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۱] اللہ نے اسی تاکید کے ساتھ رد کر دیا، خبردار: ﴿اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۲] اور ان کو شعور بھی نہیں کہ اصل فسادی تو خود ہیں، اصل فساد کرنے والے منافق ہیں۔ اس لیے مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں ''وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ'' سے مراد منافقین ہیں اور ''لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ'' اس فساد سے مراد اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا، اللہ کی نافرمانی کرنا، یہ سب سے بڑا فساد ہے۔ [ابن کثیر: ۱/۴۹، الآیۃ: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ]

سب لوگ مومن بن جائیں، موحد بن جائیں اور اللہ کے فرمانبردار بن جائیں تو سارے کے سارے فساد خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ جس گھر میں ایک لڑکا نافرمان ہو تو فساد ہوتا ہے، لیکن اگر اولاد فرمانبردار ہو، دس لڑکے بھی ہوں تو کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ ایک بیوی نافرمان ہو سارے گھر میں فتنہ ہوتا ہے۔ اگر میاں بیوی صلح پسند ہوں تو کوئی جھگڑا نہیں ہے۔

قرآن کے مقاصد کو سمجھنے کی ضرورت:

یاد رکھیں کہ آج قرآن مقدس کو ہمارے بھائی بہت پڑھا کرتے ہیں، بعض لوگ تو قرآن کو یہ سمجھتے ہیں کہ بس ٹھیک ہے، ایک مقدس کتاب ہے۔ اور بعض ہمارے طالب علم بھائی نحو کے اعتبار سے بڑی بحثیں پڑھیں گے، باعتبار صرف کے بحثیں پڑھیں گے اور باعتبار بلاغت کے بحثیں پڑھیں گے، ایک حرف پر بحثیں ہوتی ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ ہمارے مدارس میں ایک پارہ ایک استاذ پورا سال پورا نہیں کر سکتا، ایک ایک لفظ پر اسے تحقیق کرنی ہوتی ہے اور اپنے انداز سے قرآن کے معانی سمجھانا ہوتے ہیں۔ یہ کوششیں اپنی جگہ حق ہیں، لیکن خدا کے لیے کبھی قرآن کے بارے میں یہ بھی تو غور کریں کہ قرآن صرف اس لیے تو نہیں آیا تھا کہ ہم اسے مقدس کتاب سمجھ کر سینوں سے لگالیں، کبھی اس کو سر پر رکھ کر قسم کھالیں، کبھی ہم اس کو آنکھوں سے لگالیں اور بوسے دے دیں اور کبھی ہم اس کو غلافوں میں لپیٹ کر اونچی جگہ پر رکھ دیں، تاکہ قرآن کا ادب ہو جائے، قرآن کا احترام ہو جائے، قرآن نیچی جگہ پر نہ ہو۔ قرآن ایک دعوت لے کر آیا تھا، قرآن سب سے بڑا انقلاب کا پروگرام لے آیا تھا، قرآن ہماری زندگیوں کو بدلنے کے لیے آیا تھا اور قرآن ہمارے اندر ایک تبدیلی لانے کے لیے آیا تھا۔ آپ جب قرآن پڑھیں تو قرآن کی دعوت کو سمجھیں کہ قرآن کہتا کیا ہے؟

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک تارکِ نماز مسلمان نہیں ہے:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ...... اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔......، اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے، اسی طرح ابن القیم رحمہ اللہ نے اور اسی طرح بہت بڑے ائمہ کرام نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر کوئی آدمی ایک فرض نماز جان بوجھ کر چھوڑ دے تو کافر ہو جاتا ہے۔آج کتنے لوگ ہیں جو عمرہ پر آئے ہیں اور حج کر کے جائیں گے، لیکن نمازیں غائب ہیں۔ایسے لوگوں کو حج پڑھنے کا ڈھیلے کے برابر بھی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ بات نوٹ کر لیں اور یاد کر لیں۔پھر پانچ نمازیں وہ جماعت کے ساتھ نہیں پڑھتا تو کوئی پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ تو بعض ائمہ کے نزدیک مسلمان ہی نہیں رہا اور حج تو مسلمان ادا کرتا ہے۔

اس لیے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک نماز جان بوجھ کر ترک کر دے تو وہ کافر ہو جاتا ہے، اس کا نکاح ختم ہو جاتا ہے۔فرماتے ہیں کہ اگر مر جائے تو اس کا جنازہ نہ پڑھو، اگر مر جائے تو اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن بھی نہ کرو۔کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ.)) [الجامع الصغیر للسیوطی، حدیث:۸۵۸۷]

''جو نماز کو جان بوجھ کر چھوڑ دے وہ کافر ہو گیا۔''

باقی ائمہ اس کو فاسق اور فاجر کہتے ہیں، کافر نہیں کہتے، لیکن بہر حال اتنا بڑا امام!! اس کی تحقیق ایسی نہیں، ظاہر حدیث کے مطابق ہے۔

قیامت کب آئے گی؟

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ اچھے لوگ موجود ہیں۔یعنی جب تک دنیا میں ایک بھی آدمی اللہ اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی کہ اللہ کے ذکر کی وجہ سے دنیا قائم ہے۔[سنن الترمذی، حدیث:۲۲۰۷]

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ قیامت اس وقت قائم ہوگی کہ جب لوگ برے ہو جائیں گے، دنیا میں برائی ہوگی اور جتنے اچھے لوگ ہیں ان کو اللہ اٹھا لیں گے۔زمین میں صرف وہ لوگ باقی ہوں گے جو برائی کرنے والے ہوں گے تو قیامت قائم ہو جائے گی۔

کافر ہی اعتقادی کافر ہے:

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب وہ برائی کا کام کرتے ہیں، جب وہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں تو ان کو کہا جاتا ہے کہ تم یہ نافرمانی نہ کرو، اللہ کی نافرمانی ہی فساد ہے۔ لیکن الٹا کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، ہم تو اچھے کام کرنے والے ہیں۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اس آیت والے لوگ ابھی نہیں آئے۔ یعنی اعتقادی منافق جو تھے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے، اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یا مومن ہوں گے یا کافر ہوں گے۔

بعض مفسرین نے فرمایا کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان کہ وہ زمین میں فساد کرنے والے ابھی نہیں آئے، اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافق نہیں تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کے بعد ایسے لوگ آئیں گے کہ جو ان سے بھی زیادہ دنیا میں فساد برپا کریں گے، عقیدوں میں فساد ڈالیں گے، اعمال میں فساد ڈالیں گے۔ اگرچہ فساد مختلف قسم کے ہیں، لیکن اصل فساد یہ ہے کہ مسلمان کے عقیدے کو خراب کیا جائے، توحید کے بجائے شرک میں ڈالا جائے، ایمان کی بجائے کفر میں ڈالا جائے اور اللہ کی عبادت کی بجائے غیر اللہ کی فرمانبرداری میں ان کو ڈالا جائے۔ [ابن کثیر: ۱/۵۰، الآیۃ: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ]

اہلِ بدعت اور اہلِ ضلال:

جتنے بھی اہلِ ضلال، جتنے بھی گمراہ فرقے ہیں، یا جتنے اہلِ بدعت ہیں، ان سے یہ پوچھا جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں، ہم تو کوئی برائی کر ہی نہیں رہے، حالانکہ وہ بھلائی نہیں ہوتی۔ جو کام اللہ کے فرمان اور اللہ کے رسول کے فرمان کے خلاف ہو اس میں بھلا ہو ہی نہیں سکتا۔

اس لیے یاد رکھیں کہ سلف صالحین نے اور جمیع ائمہ محدثین وفقہاء رحمہم اللہ نے دو باتیں فرمائی ہیں۔ وہ اگر آدمی یاد کر لے تو اس سے دین میں بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ یاد رکھیں کہ اللہ کے ہاں کوئی عمل بڑا عمل ہو یا چھوٹا عمل ہو، جب تک اس کے اندر دو شرطیں نہ پائی جائیں اللہ کے ہاں قبول ہی نہیں ہوتا:

- ……سب سے پہلی شرط یہ ہے: "أَنْ يَكُونَ خَالِصًا" کہ وہ خالص اللہ کے لیے ہو، کسی اور کو اس میں شریک نہ کرے۔ اگر اللہ کے لیے خالص نہ کرے کہ اللہ کے لیے بھی ہو اور فلاں بزرگ کے لیے بھی ہو اور فلاں چیز کے

لیے بھی ہے تو اب شرک آ گیا، عمل خالص نہ رہا۔ اور جب تک عمل خالص نہ ہو اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا۔

......اور دوسری شرط کیا ہے؟ ''أَنْ يَكُوْنَ صَوَابًا'' صواب کا معنی کیا ہوتا ہے؟ ''مُوَافِقًا لِشَرِيْعَةِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ'' کہ وہ عمل جو آپ کر رہے ہیں سنت محمدی ﷺ سے اس کی اصل ملنی چاہیے۔ اس طرح ایک چھوٹے سے عمل سے بھی جنت ملتی ہے۔

امام ابوداؤد رحمہ اللہ کی اتباعِ سنت:

آپ اندازہ فرمائیں کہ امام ابوداؤد رحمہ اللہ جو بہت بڑے محدثِ زمان تھے، ان کی معروف کتاب ہے ''سنن ابی داؤد'' اور صحاح ستہ کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ ایک دفعہ آپ دریا کے کنارے پر کھڑے تھے اور دریا سے ہٹ کر تھوڑا دور بادبانی جہاز کھڑا تھا، لیکن کنارے سے دور تھا، تو اس جہاز میں کھڑے ہوئے ایک آدمی کو چھینک آئی ......تو قاعدہ یہ ہے سنت کے مطابق کہ جس آدمی کو چھینک آئے وہ کہے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' اور سننے والے کے لیے سنت ہے کہ وہ جواب میں کہے ''يَرْحَمُكَ اللّٰهُ'' (اللہ تجھ پر رحم کرے) اور پھر وہ آدمی جواب میں کہے ''يَهْدِيْنَا وَ يَهْدِيْكُمُ اللّٰهُ'' (ہمیں بھی اللہ ہدایت دے اور تمہیں بھی ہدایت دے)۔ اور یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے کہ چھینکنے والا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کہے، کیونکہ دماغ کا تزکیہ ہو رہا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرے کہ اگر یہ تنفس رک جاتا تو پتہ نہیں کیا ہوتا؟ سننے والا اس کو جواب دے ''يَرْحَمُكَ اللّٰهُ'' کہ تو نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے، اللہ تجھ پر رحم کرے۔ اب جب اس نے اس کو دعا دی ہے تو قاعدہ ہے کہ وہ تمہاری دعا کا جواب دے تو وہ بھی کہے ''يَهْدِيْنَا وَ يَهْدِيْكُمُ اللّٰهُ'' (اللہ ہمیں بھی ہدایت دے اور تمہیں بھی ہدایت پر رکھے) تم نے مجھے دعا دی ہے، میں نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے۔ آپ بظاہر دیکھیں تو ایک چھوٹا سا عمل ہے، یعنی ایک آدمی کو چھینک آ گئی اور اس نے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کہہ دیا اور جواب میں ''يَرْحَمُكَ اللّٰهُ'' کہنا بھی سنت ہے کہ اگر وہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' نہ کہے تم اسے ''يَرْحَمُكَ اللّٰهُ'' نہ کہو، کیونکہ جب اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا تو لہٰذا تیری دعا کا وہ مستحق نہیں ہے۔

تو امام ابی داؤد رحمہ اللہ کنارے پر کھڑے تھے تو ایک آدمی کو بڑے زور سے چھینک آتی ہے، اس کے بعد زور سے کہا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' تو امام صاحب نے تو سن لیا۔ اب امام صاحب نے سوچا کہ میں اس کو جواب دوں، ''يَرْحَمُكَ اللّٰهُ'' کہوں تو وہ تو خدا جانے میرا جواب سنے گا یا نہیں سنے گا، تو سنت تو پوری نہیں ہوگی۔ انہوں نے ایک کشتی والے سے کہا کہ اگر تم مجھے اس جہاز تک لے جاؤ تو کتنے پیسے لو گے؟ اس نے کہا: میں تین درہم لوں گا۔ آپ کشتی میں بیٹھے

اور کشتی کو جہاز کے قریب لے گئے۔ جہاز پر سوار ہوئے اور اس آدمی کو جا کر ملے اور کہا ''یَرْحَمُكَ اللّٰهُ''۔ لہٰذا حضور ﷺ کی سنت پوری فرمالی۔ ایک معمولی سی بات ہے تو اس نے بھی دعا کر دی ''یَهْدِیْنَا وَ یَهْدِیْكُمُ اللّٰهُ''۔ فرماتے ہیں کہ اس رات سوئے تو خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کہہ رہا ہے کہ اے ابوداؤد! تم نے تین درہم میں جنت خرید لی۔

حالانکہ آپ دیکھیں کہ کتنا بڑا محدث ہے، اس کے کتنے بڑے کام ہیں، کتنی بڑی خدمات ہیں، لیکن اللہ راضی ہوا تو حضور ﷺ کی ایک چھوٹی سی سنت پر راضی ہو گیا کہ تم نے میرے نبی ﷺ کی سنت کی اتباع کی ہے کہ تین درہم خرچ کیے، وقت خرچ کیا پھر فوراً پہنچے کہ یہ میرا مستحب عمل رہ نہ جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے انہیں خواب میں جنت کی بشارت سنوادی۔

صرف موافقِ سنت عمل قبول ہے:

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ عمل بڑا ہو یا عمل چھوٹا ہو، اگر وہ سنتِ رسول ﷺ کے مطابق ہے، حبیب پاک ﷺ کے طریقے کے مطابق ہے، مدنی سرکار ﷺ کے قول، فعل، عمل اور تقریر کے مطابق ہے تو وہ عمل اللہ کے ہاں مقبول ہوتا ہے اور اس پر بہت بڑا اجر و ثواب ملتا ہے۔ اور اگر عمل کتنا بڑا کیوں نہ ہو، لیکن سنتِ رسول ﷺ کے مطابق نہیں ہے تو وہ ایک ڈھیلے کے برابر نہیں ہوتا، نہ وہ آسمانوں کی طرف جاتا ہے، کیونکہ قاعدہ الٰہی ہے:

﴿اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ ؕ﴾ [فاطر:١٠]

اللہ کی طرف ان اعمال کو اٹھایا جاتا ہے جو اعمال صالحہ ہیں اور یہ کلمات اللہ کو محبوب ہیں، حالانکہ معمولی سی بات ہوتی ہے، لیکن اس کا اجر اتنا بڑا ہوتا ہے۔ وجہ کیا ہوتی ہے کہ وہ سنتِ رسول ﷺ کے مطابق ہوتا ہے۔

مسواک کے فائدے:

اب دیکھیں! مسواک کرنا معمولی سی بات ہے اور مسواک کرنے میں انسان کے اپنے کتنے فائدے ہیں کہ اس کا منہ صاف ہو رہا ہے، اس کے دانت صاف ہو رہے ہیں اور پھر جب غذا کھائے تو غذا صاف معدے کے اندر جائے گی، بیماریوں سے محفوظ رہے گا، کسی سے بات کرے گا تو منہ سے گندی ہوا نہیں آئے گی، ورنہ لوگ اسے اچھا نہیں

سمجھیں گے، لوگ اس سے نفرت کریں گے۔ اپنے ذاتی فائدے کے علاوہ یہ سنتِ رسول پاک ﷺ ہے۔
حضور ﷺ نے فرمایا:

((اَلسِّوَاكُ مِطْهَرَةٌ لِلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ.)) [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۲۸۹، باب: السِّوَاكِ]

''مسواک کرنا یہ اپنے منہ کو صاف کرنے والا ہے اور رب کو راضی کرنے والا ہے۔''

محدثین نے لکھا ہے کہ اس مسواک والی سنت پر جو عمل کرتے ہیں ان کو ستر فائدے ملتے ہیں، ستر قسم کا ثواب ملتا ہے اور مسواک کرنے والے کو سب سے چھوٹا فائدہ یہ ملتا ہے کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے۔ یعنی آپ اندازہ کریں کہ مسواک کرنا کون سا مشکل عمل ہے۔ آدمی وضو سے پہلے مسواک کر لے۔ بعض حضرات تو نماز سے پہلے مسواک کرتے ہیں۔ کیونکہ حدیث میں ہے ''مِسْوَاكٌ عِنْدَ كُلِّ صَلٰوةٍ'' تو انہوں نے اس حدیث مبارک سے لے لیا کہ ہر نماز سے پہلے بھی مسواک ہو۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ معنیٰ مراد لیا کہ نماز سے مراد یہ ہے کہ جب نماز کی تیاری کرے، یعنی جب نماز کا وضو کرے، جب نماز کے لیے چلنا چاہے تو اس سے پہلے مسواک کرے۔ خیر! یہ تو ایک علمی بحث اور ایک علمی تحقیق ہے۔ اصل بات جو کرنی ہے وہ یہ ہے کہ مسواک ایک معمولی کام ہے، حتیٰ کہ اگر مسواک کی لکڑی نہیں ہے، کسی نے برش بھی کر لیا تو مسواک کے قائم مقام ہے۔ اور اگر کسی کے پاس برش بھی نہیں تھا، لکڑی بھی نہیں تھی، حدیث میں آتا ہے کہ انگلی پھیر لے، تاکہ اس کو مسواک کا ثواب مل جائے، سنت رسول پاک ﷺ ادا ہو جائے۔ تو ایک سنت پر عمل کرنے کا کتنا بڑا نتیجہ نکلا کہ خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ اور اس سے بڑی کوئی نیکی ہے......؟ انسان ساری محنت تو اسی لیے کر رہا ہے۔ حج اور عمرہ کیوں کر رہا ہے؟ مکہ اور مدینہ کیوں آیا کہ اللہ راضی ہو جائے اور خاتمہ اچھا ہو جائے، ہماری آخرت کا راستہ آسان ہو جائے اور ہماری اگلی منزل آسان ہو جائے۔ تو اب ایک سنت پر عمل کرنے کے لیے اتنا بڑا اللہ نے اجر عطا فرما دیا۔

اعمال میں اخلاص:

تمام اعمال کے اندر سب سے پہلی شرط یہ ہے ''أَنْ يَكُوْنَ خَالِصًا'' کہ وہ عمل بالکل اللہ کے لیے ہو اور کسی کے لیے نہ ہو، جیسا کہ حضور ﷺ جب بھی کوئی عمل کرتے تو فرماتے:

﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيْفًا﴾ [الانعام: ۷۹]

اور میرے مدنی! اعلان فرما دو:

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝﴾ [الانعام: ۱۶۳]

میری نمازیں اور میری عبادت بدنی اور میری عبادت مالی، میری قربانیاں، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے۔ اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ کہ اس کا کوئی شریک نہیں اور میں عمل خالص اللہ کے لیے کروں۔
اگر خالص نہیں ہوگا تو وہ عمل بھی مردود ہوگا۔ حدیث پاک میں آتا ہے: جس نے کسی عمل کے اندر کسی غیر کو شریک کر لیا، کسی غیر کی شرکت کا اشارہ کر دیا، اللہ فرماتے ہیں "أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ" میرے بندے! مجھے کسی شریک کی ضرورت نہیں ہے اور مجھے نہ تیرے عمل کی ضرورت ہے، لے جاؤ اپنے عمل کو اور اسی شریک کو جا کر دے دو اور اس سے بدلہ لے لو۔

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۴۲۰۲، بَابُ: الرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ]

عمل سنت کے مطابق ہو:

اور عمل میں دوسری شرط یہ ہے "أَنْ يَكُونَ صَوَابًا" کہ عمل سنت رسول کے موافق ہو۔ دیکھو! قرآن عربی میں ہے اور قرآن عرب میں اترا ہے، مکہ میں نازل ہوا ہے۔ مکہ میں رہنے والے لوگ عرب تھے، عربی زبان جاننے والے تھے، لیکن اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے کتاب نازل کر دی ہے، بس پڑھو اور عمل کر لو۔ بلکہ اللہ نے قرآن بھی بھیجا اور قرآن نازل کرنے سے پہلے کہ قرآن میرا ہے، لیکن پڑھ کر اس پر عمل کر کے نمونہ دکھانا وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا کام ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ عرس نہ کرو، چالیسواں نہ کرو، تین دن کے بعد قل خوانی نہ کرو، سات جمعراتیں نہ کرو، بھلا مولویوں کو کیا تکلیف ہے......؟ اُلٹا ان کو روٹی ملتی ہے، وہ کیوں منع کریں؟ منع کرنے کی وجہ کیا ہے؟ تیرا خرچ بھی ہو رہا ہے اور سنت کے مطابق نہیں ہے تو دھیلے کا ثواب بھی نہیں ہے، اس لیے کہ جب تک وہ عمل سنت کے مطابق نہیں ہوگا اس وقت تک اس کا ثواب نہیں ہوگا، اس کا فائدہ نہیں ہوگا اور اس کا نفع نہیں ہوگا۔
اب آپ اللہ کے گھر کا طواف کر رہے ہیں، اس کے سات چکر ہوتے ہیں اور حجرِ اسود سے شروع کرتے ہیں۔ اگر حجر اسود کے بجائے ہم رکنِ یمانی سے شروع کریں تو کیا طواف ہو جائے گا؟ بالکل نہیں، حالانکہ چکر تو بڑھ گیا ہے، چکر تو ہمارا زیادہ ہو گیا، حجرِ اسود چار قدم اور زیادہ ہے، لیکن چونکہ ہم نے اس جگہ سے شروع نہیں کیا جہاں سے محمد رسول

اللہ ﷺ نے شروع کیا تھا۔ فرمایا کہ یہ طواف قبول نہیں ہے۔ اگر کوئی آدمی حجرِ اسود کے اس کونے کی بجائے ایک قدم آگے نکل کر نیت کر لے، طواف بھی نہیں ہوگا۔ اللہ کے دروازے سے چکر کی نیت کرے اور دروازے پر آکر چکر پورا کرے تب بھی طواف نہیں ہوگا۔ اگر طواف بغیر وضو کے کرے گا تب بھی طواف نہیں ہوگا، ناپاکی کی حالت میں کرے گا تب بھی طواف نہیں ہوگا۔ طواف اسی وقت ہوگا جب عین اس وقت کرے گا اور عین اس طریقہ پر کرے جس طرح حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ اب اگر آج کوئی آدمی یہ کہے کہ مجھے اپنے بزرگ نے کہا تھا کہ تم سات کے بجائے آٹھ چکر لگایا کرو تو طواف قبول نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ سنت رسول اللہ ﷺ کے مخالف ہو گیا ہے۔

اسی طرح اذان ہے، اسی طرح نماز ہے، اسی طرح عقیقہ ہے، اسی طرح صدقۂ فطر ہے اور اسی طرح قربانی ہے۔

ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں آیا...... حضور ﷺ کا صحابی ہے، غلام ہے...... اس نے کہا: یا رسول اللہ! آج عید کا دن ہے (قربانی کی عید کا دن تھا)۔ چونکہ عید کے دن لوگوں کو اور گھر والوں کو تمنا ہوتی ہے کہ گوشت آئے گا، بکرے کٹیں گے اور ہم گھر میں گوشت پکائیں گے۔ میں نے جلدی سے اپنا بکرا ذبح کر لیا، تاکہ میں اپنے گھر والوں کو جلدی سے گوشت دے سکوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: وہ گوشت ہے تمہارے گھر والوں کے کھانے کے لیے، لیکن قربانی نہیں ہوگی۔ اس نے کہا: حضور ﷺ قربانی ہے اور آج عید ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تک عید کی نماز نہ ہو جائے اس سے پہلے قربانی کا جانور ذبح نہیں کرنا۔ حالانکہ دن وہی ہے، قربانی کا دن ہے، لیکن چونکہ قربانی کا وقت شروع نہیں ہوا، حضور ﷺ نے فرمایا: وہ تمہارا گوشت ہے، لیکن قربانی تمہاری ادا نہیں ہوگی جب تک کہ عید کے بعد دوبارہ جانور ذبح نہ کرو۔ اس نے کہا: حضور! میرے پاس ایک دنبہ کا بچہ ہے، وہ چھ ماہ کا ہے، ایک سال کا نہیں ہے، لیکن بڑا ہے، موٹا تازہ ہے۔ اگر اس کو بیچوں تو اس کی قیمت بڑے دنبہ سے بھی زیادہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: چلو تم اس کو ذبح کر لو، لیکن آئندہ ایسا نہ کرنا۔ تم جا کر ذبح کر لو، وہ قیمتی چیز ہے۔ اللہ تمہاری قربانی قبول فرمائے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۵۵۶۱، باب: مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ أَعَادَ]

اب دیکھیں کہ فرق صرف اتنا ہو گیا کہ اس نے نماز سے پہلے ذبح کر لیا تو قربانی نہیں ہوئی۔ اگر رمضان کی عید ہے، ایک آدمی عید پڑھنے کے بعد صدقۂ فطر ادا کرے تو وہ سنت طریقہ پر ادا نہیں ہوگا، کیونکہ صدقۂ فطر ادا کرنے کا وقت نمازِ عید سے پہلے ہے کہ نمازِ عید پڑھنے کے لیے جائے تو راستے میں صدقۂ فطر کر دے، تاکہ غریب مسکین فائدہ

اٹھائیں۔کم از کم عید سے ایک دن پہلے کر دے۔اگر اس نے عید کی نماز پڑھ لی، اب یاد آیا کہ میں نے صدقۂ فطر ادا نہیں کیا تو اب حکم ہے کہ عید کی نماز کے بعد صدقۂ فطر کرے، مگر وہ ثواب نہیں ملے گا جو عید کی نماز سے پہلے ادا کرنے سے ملتا تھا۔اسی طرح آپ سارا سال مکہ میں بیٹھے رہیں، مگر آپ نو تاریخ کو عرفات میں نہ پہنچیں تو حج نہیں ہوگا۔

لہٰذا ہر عمل میں ایک قاعدہ یاد رکھ لیں تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے کہ ہر عمل اللہ کے لیے ہو اور خالص اللہ کے لیے ہو۔ ہمارے ہاں رواج ہے نذر و نیاز برائے حسین، پنجتن کی نیاز اور یہ نذر فلاں بزرگ کے نام کی۔ بھائی! جب تم ذبح اللہ کے لیے کر رہے ہو تو تم نیت کرو کہ اے اللہ! اس کا ثواب فلاں کو عطا فرما۔اب اگر تم نے نیت میں نام ہی دوسرے کا لگا دیا ہے تو قبول نہیں ہوگا۔اگر اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوا تو ثواب ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اپنے ہر عمل کو خالص اللہ کے لیے اور سنتِ رسول ﷺ کے مطابق ادا کرے۔ اگر ایک آدمی سارا دن روزہ رکھے اور بھوکا رہے، لیکن سورج غروب ہونے سے دو منٹ پہلے پانی پی لے تو اس کا روزہ ختم ہے۔ایک آدمی بڑی محنت سے اہتمام کرے، لیکن جب طلوع فجر صادق ہوا اس نے پانی پی لیا تو اس کا روزہ نہیں ہوگا، کیونکہ اس نے اس وقت کا اہتمام نہیں کیا۔اب حضور پاک ﷺ نے ہمیں سمجھا دیا کہ اگر تیرے گھر میں بچہ پیدا ہو تو ساتویں دن اس کا عقیقہ کرو، اگر ساتویں دن نہ کر سکو تو پھر چودھویں دن کرو اور اگر چودھویں دن بھی نہ کر سکو تو پھر اکیسویں دن کرو۔اور اگر لڑکا ہے تو وہ دو بکرے یا دو دنبے، جو تمہیں اللہ نصیب کر دے اور اگر لڑکی ہے تو ایک بکرا یا ایک دنبہ ذبح کرو۔اسی طرح حکم دیا ہے کہ ساتویں دن عقیقہ بھی کرے اور بچے کے سر پر جو بال ہیں وہ اتاریں اور ان بالوں کا وزن کر لیں اور اتنی چاندی اللہ کے راستے میں خیرات کر دیں۔ یہ مسنون عمل ہے۔اور یہ سارے اعمال ہمیں مدنی پاک ﷺ نے بتلائے ہیں، بلکہ آپ نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لیے باقاعدہ دنبے منگوا کر ذبح کروائے اور بی بی فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو بھی حکم دیا کہ آپ بھی ساتھ کھڑی ہو جائیں، کیونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس اتنی مالی استطاعت نہیں تھی، وگرنہ عقیقہ کا حکم والد کے لیے ہے۔ بلکہ بعض احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ جن والدین نے اپنے بچوں کا عقیقہ نہیں کیا وہ بچے قیامت میں اپنے ماں باپ کی شفاعت بھی نہیں کریں گے۔اب ایک چیز میرے پاک نبی ﷺ نے ہمیں سمجھا دی ہے تو اگر مثال کے طور پر: یہ قل خوانیاں ہوتیں تو وہ بھی ہمیں حضور ﷺ سمجھا دیتے۔جس نبی علیہ السلام نے پیدا ہونے پر عقیقہ سمجھا دیا ہے، مرنے کے بعد یہ نہ سمجھا دیتے؟ ان کے آگے کون سی ایسی بات تھی جو حضور ﷺ چھوڑ دیتے......؟

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! ہر باطل فرقہ جو بھی کوئی کام کر رہا ہے، وہ یہ نہیں کہتے کہ ہم غلط کر رہے ہیں۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ زانی زنا سے توبہ کر سکتا ہے، شرابی شراب سے توبہ کر سکتا ہے، چور چوری سے توبہ کر سکتا ہے، ڈاکو ڈاکے سے توبہ کر سکتا ہے اور بدکردار بدکرداری سے توبہ کر سکتا ہے، لیکن بدعت میں پڑنے والوں کی توبہ کی امید بھی نہیں ہوتی۔ انہوں نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کرنے والا چور ہی چوری کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ ہے تو برا کام، لیکن مصیبت میں پڑے ہوئے ہیں، بس دعا کریں اللہ ہدایت دے اور اللہ میری بری عادت چھڑوا دے۔ زانی زنا کو اچھا نہیں سمجھتا، شرابی جتنا بھی نشہ میں ہو جب نشہ اترے گا تو کہے گا کہ بس مصیبت ہے، عذاب ہے۔ وہ ان گناہوں کو برا سمجھ رہا ہے تو کبھی نہ کبھی توبہ کی توفیق ہو جائے گی، لیکن بدعت کرنے والا تو بدعت کو نیکی سمجھ رہا ہے، وہ اس سے توبہ کیوں کرے گا؟ وہ تو سمجھ رہا ہے کہ میں اچھا کام کر رہا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ میں امام حسین (رضی اللہ عنہ) کا تعزیہ نکال رہا ہوں، میں امام حسین (رضی اللہ عنہ) کو راضی کر رہا ہوں، تو وہ کیسے توبہ کرے گا؟ ایک آدمی قبر پر پھولوں کی چادریں چڑھا رہا ہے، وہ کہے گا کہ میں تو اللہ والوں کی عزت کر رہا ہوں، تو وہ توبہ کیسے کرے گا؟ ایک آدمی قبر پر جا کر سجدہ کر رہا ہے، وہ کیسے توبہ کرے گا؟ وہ تو اس کام کو سمجھتا ہی اچھا ہے۔ جب کوئی کسی کام کو اچھا سمجھے تو وہ اس سے توبہ کیسے کرتا ہے؟

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ بدعت والے جو لوگ ہیں "لَا يُرْجٰى مِنْهُمُ التَّوْبَةُ" ان سے توبہ کی امید نہیں ہوتی، مگر وہ آدمی جس کو اللہ ہدایت کر دے، اس کے سینے کو کھول دے اور اس کے دل و دماغ میں سنت کی روشنی آ جائے تو وہ توبہ کر لیتا ہے، ورنہ وہ بے چارہ تو اس عمل کو اچھا سمجھ رہا ہے، اس عمل کو وہ خیر سمجھ رہا ہے۔ جیسا کہ قرآن نے فرمایا کہ جب ان کو کہا جاتا ہے ﴿لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ (تم زمین میں فساد مت پھیلاؤ) تو وہ کہتے ہیں ﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ﴾ [البقرة:11] (ہم تو اچھا کام کر رہے ہیں) ہم تو لوگوں کو ملا رہے ہیں۔

کافر کافروں کے دوست ہیں:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی فساد ہے کہ مسلمان کافروں کو اپنا سمجھیں، جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ [الجاثیۃ:19]

کافر آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ اگر تم نے ایسا کیا تو زمین میں فساد اور فتنہ برپا ہو جائے گا،

کیونکہ کافر کافروں کا دوست ہوتا ہے، مومنوں کا دوست نہیں ہوسکتا۔ ایمان والوں کو چاہیے کہ کبھی کافروں کو دوست نہ بنائیں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو زمین میں فساد پیدا ہو جائے گا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ﴿١٤﴾ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٥﴾

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جس طرح سب لوگ ایمان لائے۔ کہتے ہیں: کیا ہم ایمان لائیں جس طرح سے بے وقوف ایمان لائے؟ جان لو! وہی بے وقوف ہیں، لیکن نہیں جانتے۔ اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو ان سے مذاق کرتے ہیں۔ اللہ ان کو مذاق کی سزا دے گا اور ان کو ان کی سرکشی میں مہلت دے گا جس میں وہ سرگرداں رہیں گے۔

انبیاء علیہم السلام کی میراث علم ہے، جائیداد نہیں:

ایک بنیادی بات یاد رکھیں! ہر آدمی کی میراث دولت، دینار، درہم، باغ اور جائیداد ہے اور اللہ کے نبیوں کی میراث دولتِ دنیا نہیں ہوتی۔ اللہ کے نبیوں کا فیصلہ ہے۔ میرے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّا مَعْشَرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُورِثُ، مَا تَرَكْنَاهُ فَهُوَ صَدَقَةٌ.)) [السنن الکبریٰ، حدیث: ٦٣٠٩]

"جتنے ہم اللہ کے نبی گزرے ہیں ہمارا کوئی مال میراث نہیں ہوتی، بلکہ ہم جو چھوڑ دیں وہ خیرات صدقہ کر دیا جاتا ہے (ہماری میراث ہمارا علم ہے)۔"

اس لیے حدیث شریف کے اندر آیا ہے:

((اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ)) [سنن الترمذی، حدیث: ٢٦٨٢، باب: ما جاء في فضل الفقه على العبادة]

"علماء انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔"

اب اس وارث ہونے کا معنی یہ نہیں ہے کہ وہ انبیاء کی جائیداد تقسیم کرتے ہیں، جیسے بعض فرقے والے کہتے ہیں کہ نبی کی میراث تھی اور بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نہ ملی، ...... نعوذ باللہ ...... صحابہ نے چھین لی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چھین لی۔ پہلے تو میراث ثابت کرو، چھینا تو بعد میں جائے گا، پہلے یہ ثابت کریں۔ اگر میں کہوں کہ میری عینک ہے۔ پہلے عینک تو ہو پھر میں دعویٰ کروں کہ کسی نے میری عینک چھین لی ہے۔ اگر عینک ہی ثابت نہ ہو تو چھیننے کے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن میں جو ان کے مقصد کے لفظ ل جاتے ہیں ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ﴾ دیکھو! حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے وارث بنے۔ دیکھو جی! ورثہ ثابت ہو گیا۔ خدا کے بندے! اگر ورثہ ثابت ہو گیا تو داؤد علیہ السلام کے ۱۹ بیٹے تھے، صرف سلیمان علیہ السلام کا ورثہ کیسے ثابت ہو گیا؟ حضرت! یہ تو اُلٹا ہماری دلیل ہے کہ ۱۸ بیٹوں کا قرآن نے ذکر نہیں کیا، صرف سلیمان علیہ السلام کا ذکر کیا ہے، کیونکہ تمام بیٹوں میں سے جو نبوت کی وراثت تھی، علم کی جو وراثت تھی وہ صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملی اور کسی بیٹے کو نہیں ملی۔ اس لیے قرآن نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کا وارث سلیمان علیہ السلام ہے، کیونکہ جیسے داؤد علیہ السلام نبی تھے، سلیمان علیہ السلام نبی تھے۔ جیسے داؤد علیہ السلام کو اللہ نے علم عطا فرمایا تھا جانوروں کی زبانیں سمجھنے کا، لوہے کو ہاتھوں پر نرم فرما دیا، پرندوں کی بولی جان لینے کا، پہاڑوں کی تسبیحات کو سمجھ لینے کا، وہی علم اللہ نے سلیمان علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ اس لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا:

﴿وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝﴾ [النمل:۱۶]

خدا کا ہم پر کتنا بڑا احسان ہے کہ میں بھی اور میرے باپ کو بھی اللہ نے پرندوں کی زبانیں سکھا دیں کہ پرندہ جب بولتا ہے تو ہم سمجھ لیتے ہیں، پرندہ جب بات کرتا ہے تو ہم اس کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں اور جو وہ کہہ رہا ہوتا ہے ہم سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

[الجامع لاحکام القرآن: ۱۳/ ۱۶۴]

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ہدہد کا واقعہ:

واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت سلیمان علیہ السلام گزر رہے تھے۔ ہدہد ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھا ہوا جھوم رہا تھا اور نیچے ایک بچے نے پھنسانے کے لیے جال لگایا ہوا تھا کہ وہاں سے اڑے گا اور میں رسی کھینچوں گا اور اس کو پھنسا لوں گا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام وہاں سے گزرے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ تم تو بڑے چہچہار ہے ہو اور

نیچے تمہارے لیے جال لگا ہوا ہے؟ اس نے کہا: سلیمان! میں جانتا ہوں، مجھے پتہ ہے کہ جال لگا ہوا ہے، میں تو ویسے ہنس رہا ہوں کہ بچہ ہے، وہ مجھے نہیں پکڑ سکتا، میں جانتا ہوں کہ اس نے جال لگایا ہوا ہے۔ اب ہدہد اور حضرت سلیمان علیہ السلام باتیں کر رہے ہیں اور کوئی نہیں سمجھ رہا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے کام کے لیے چلے گئے۔ جب واپس تشریف لائے تو بچے نے ہدہد کو جال میں پکڑا ہوا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: ہدہد! کیا ہو گیا کہ تم تو زمین کے نیچے پانی دیکھ کر بتلا دیتے ہو کہ پانی دور ہے یا قریب ہے؟ میٹھا ہے یا کڑوا ہے؟ مٹی کے نیچے تمہیں پانی نظر آ گیا، لیکن جال نظر نہیں آیا، میں نے تجھے خبردار بھی کیا تھا۔ اس نے کہا: اے سلیمان! ''إِذَا نَزَلَ الْقَضَاءُ عَمِيَ الْبَصَرُ'' (جب اللہ کی تقدیر آ جاتی ہے تو آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں) آنکھیں کام ہی نہیں کرتی ہیں تو میں کیا کرتا اللہ کی تقدیر غالب آ گئی اور اس نے مجھے پکڑ لیا۔ [الجامع لأحکام القرآن: ۱۳/۱۶۵]

جب قضا و قدر کا معاملہ ہوتا ہے تو کوئی چیز کام نہیں کرتی۔ آپ نے دیکھا ہے کہ گاڑیوں کے ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں۔...... اللہ تمام مسلمانوں کو بچائے...... ڈرائیور بے چارے سے پوچھا تو اس نے کہا: خدا جانتا ہے، مجھے تو کچھ نظر ہی نہیں آیا، میں تو گاڑی بالکل ٹھیک چلا رہا تھا، روڈ پر جا رہا تھا، میرے سامنے سڑک بھی خالی تھی، آگے سے گاڑی آئی، مجھے تو نظر ہی نہیں آئی، مجھے تو اس وقت پتہ چلا جب گاڑیاں ٹکرا گئیں۔ کیونکہ جب تقدیر کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو سب تدبیریں وہاں الٹ ہو جاتی ہیں۔ تو نبیوں کی میراث علم ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی میراث نہیں ہوتی:

یہ ہمیشہ یاد رکھو! دولت اور دنیا میراث نہیں ہوتی اور یہ بھی اللہ کے نبیوں کی شان ہے۔ نبیوں کی میراث نہ ہونا یہ نبیوں کی شان ہے۔ اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امت پر احسان ہے۔ یہ مسئلہ یاد رکھ لیں! وجہ یہ ہے کہ اگر دولت انبیاء علیہم السلام کی میراث ہوتی، مثلاً: ایک آدمی بڑا دولت مند ہے، کروڑوں پتی ہے، لیکن اپنی اولاد پر خرچ نہیں کرتا، اولاد دعائیں مانگتی رہتی ہے کہ خدا کرے مرے! سانپ بن کر بیٹھا ہوا۔ رشتہ دار دعائیں مانگتے ہیں کہ خدا کرے! جلدی مرے، مرتا ہی نہیں ہے کہ مرے اور جائیداد تقسیم ہو اور ہمیں ملے۔ اب اگر کوئی کسی نبی کے متعلق یہ کہہ دیتا کہ مرے اور ہمیں جائیداد ملے تو وہ ایمان ہی سے خارج ہو جاتا اور برباد ہو جاتا ہے۔ اس لیے اللہ نے انبیاء علیہم السلام کی امتوں پر احسان فرمایا کہ نبی کی جائیداد ہی نہیں رکھی، تاکہ امتی کے دل میں یہ خیال ہی پیدا نہ ہو سکے، کسی کے

دل میں گھٹیا خیال ہی نہ آ سکے۔ اگر کہیں خیال آ گیا تو بندہ برباد ہو گیا۔ نبی علیہ السلام کے بارے میں جو توہین کرے وہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہو گیا۔ اس لیے خدا نے اپنے نبیوں کو میراث دی ہی نہیں۔ فیصلہ کر دیا:

((إِنَّ الأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا)) [الترمذی، رقم: ۲۶۸۲، باب: ما جاء في فضل الفقه ...]

((مَا تَرَكْنَاهُ فَهُوَ صَدَقَةٌ.)) [مسند احمد بن حنبل، حدیث: ۲۶۲۶۰]

ہم نے کوئی دینار و درہم وراثت میں نہیں چھوڑا۔ اگر ہم نے کوئی چھوڑا بھی ہے تو اللہ کے راستے میں تقسیم کر دو، تاکہ جھگڑے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو۔ لہٰذا اب نبی کی میراث علم بنا، اس لیے انبیاء علیہم السلام کے وارث علماء بنے۔ اس لیے سند چلتی ہے کہ عالم سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ نے یہ حدیث مبارک کس سے پڑھی ہے؟ اس نے کہا: میں نے اپنے والد سے پڑھی، انہوں نے حضرت شیخ خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ سے پڑھا تھا، انہوں نے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ سے پڑھا تھا، انہوں نے فلاں بزرگ سے پڑھا تھا اور یہ سلسلہ چلتے چلتے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ اس کو عربی میں سند کہتے ہیں۔ تو قرآن اللہ نے اتارا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ہے۔

ایمان وہی قبول ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان کی طرح ہو:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل پوری کائنات کے لیے نمونہ ہے۔ اب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے امت کو دکھانے کے لیے اور دعوت دینے کے لیے کچھ نمونے بنائے ہیں۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہر صناع اور ماہرِ فن اپنے فن کا شاہکار پیش کرتا ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرکز علم میں جو عالم بنے ہیں وہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ﴿اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ (البقرۃ: ۱۳) لوگو! میرے ایمان کے ماڈل میرے صحابہ ہیں۔ ایمان لانا ہے تو پھر صحابہ کی طرح لے آؤ، ورنہ کوئی ایمان قبول نہیں ہے۔ ایمان لے آنا ہے تو ﴿اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ (البقرۃ: ۱۳) صحابہ کی طرح ایمان لے آؤ۔ ایک روایت کے اندر نام آئے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور عثمان و علی رضی اللہ عنہما کی طرح ایمان لے آؤ۔ (الدر المنثور للسیوطی: ۱/۶۹)

یہ ایمان کے نمونے ہیں۔ اگر ان کی طرح ایمان نہ لے آؤ، لاکھ کلمہ پڑھتے رہو، لاکھ تم اسلام کے دعوے کرتے رہو، تم منافق کہلاؤ گے، مومن نہیں کہلاؤ گے۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں یہ بتلایا کہ میراثِ علم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے چلے گی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے پڑھا، جبرئیل علیہ السلام نے اللہ سے پڑھا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا۔ اور

حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جامع مانع کامل نبوت عطا کی ہے، جس پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اس لیے کئی مقامات پر نبی کریم ﷺ کی اطاعت کرنے اور آپ کے اسوۂ حسنہ کے اپنانے کا حکم دیا گیا ہے اور آپ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے مزید بات کو واضح فرما دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے جتنی امتیں گزری ہیں وہ بہتر فرقوں میں بٹ گئے۔ فرمایا کہ میری امت سب سے بڑی امت بھی ہے، لیکن آنے والے دور میں میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ اور فرمایا: "كُلُّهُمْ فِي النَّارِ" (تمام کے تمام فرقے جہنم میں ہوں گے) "إِلَّا مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِي" صرف ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور اس فرقے کے لیے یہ کسوٹی ہے کہ وہ میرے راستے پر رہے اور جس پر میرے صحابہ ہیں۔ اب حضور ﷺ نے وضاحت فرما دی کہ میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ اور اس سے مراد بڑے بڑے فرقے ہیں، ورنہ دنیا میں سینکڑوں اور ہزاروں چھوٹے فرقے بن چکے ہیں۔ [سنن الترمذي، حديث: ٢٦٤١، باب: ما جاء في افتراق هذه الأمة]

تہتر فرقے:

اس لیے میرے پاک نبی ﷺ کے فرمان کو یاد رکھیں کہ بعض معاندین اسلام اعتراض کرتے ہیں کہ دنیا میں تو ہزاروں فرقے ہیں اور حضور ﷺ نے تو فرمایا: تہتر فرقے ہوں گے۔ تو اصل معنی یہ ہوتا ہے کہ جیسے قریش ایک قبیلہ اور ایک قوم تھی اور اب آگے اس کی پھر کئی شاخیں تھیں۔ ایک شاخ ہے جو "بنو ہاشم" کہلاتی ہے، جس کے اندر ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے، حالانکہ قریش کی بڑی شاخیں ہیں، بڑے بڑے قبائل تھے، بنو وائل تھے، بنو کاب تھے، بنو ہاشم تھے، کئی شاخیں ہیں، لیکن ہر قوم قریش ہے۔ جیسے آج کل آپ کے ملکوں میں بھی کہ اوپر جا کر ایک ہی قوم ہیں، بلوچ ہیں، آگے جا کر ان کی سینکڑوں لڑیاں ہیں، منتہیٰ ان کا وہی ایک بندہ ہے۔ اسی طرح دنیا کے اندر اور بڑی قومیں ہیں۔ ایک قوم ہوتی ہے، نیچے اس کی کئی لڑیاں پھیل جاتی ہیں۔ جتنے بڑے فرقے ہیں، جب ان کو ہم گنیں گے تو حضور ﷺ کے مطابق تہتر ہی ہوں گے، ہر فرقے کے نیچے چاہے سینکڑوں بن جائیں، کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان مبارک قیامت تک کے لیے سچا ہے، اس میں کسی قسم کی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی۔

تو اس طرح دوسری حدیث مبارک میں اور وضاحت آئی۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا: میری امت میں سے صرف ایک فرقہ ناجیہ ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم حیران ہو گئے! اور انہوں نے سوال کیا:

((وَ مَنْ هِيَ؟ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!))

ایک فرقہ!! وہ کون لوگ ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي.)) [سنن الترمذی، حدیث:۲۶۴۱، بَابُ: مَا جَاءَ فِي افْتِرَاقِ هٰذِهِ...]

''جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم کی عزت وحرمت:

توجہ کریں کہ دشمنانِ دین، دشمنانِ اسلام نے، دشمنانِ قرآن نے اور دشمنانِ دین نبوی ﷺ نے سب سے زیادہ ہدف اور سب سے زیادہ جو تیر اندازی کی ہے وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمائے! بعض فرقے تو اتنے دشمن ہو گئے کہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان کے بھی قائل نہیں ہیں، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ دشمن تو دشمن ہوتا ہے، مخالف تو مخالف ہوتا ہے، افسوس ان لوگوں پر ہے جنہوں نے دوست بن کر اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت کا فرد کہلا کر صحابہ رضی اللہ عنہم کو معاف نہیں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر وہ آدمی مر گئے تو ان کے گناہ معاف فرمائے۔ اگر زندہ ہیں تو ان کو ہدایت عطا فرمائیں کہ ان لوگوں نے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو معاف نہ کیا، انہوں نے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم پر بحثیں لکھ دیں، حالانکہ وہ یہ بھول گئے۔ ایک مثال کی بات یاد رکھیں کہ ہمارے پاس مثلاً: ایک سونے کا ٹکڑا ہو اور میں وہ سنار کے پاس لے جاؤں کہ اس سونے کو ذرا چیک کرو کہ کھرا ہے یا کھوٹا ہے؟ وہ سنار سونے کو لے کر کسوٹی پر پرکھے گا تو اب فیصلہ کسوٹی کرے گی کہ سونا کھرا ہے یا کھوٹا ہے؟ یا سونا فیصلہ کرے گا کہ کسوٹی کھری ہے یا کھوٹی ہے؟ ہمیشہ اصول یاد رکھیں! اب سونا تو فیصلہ نہیں کرے گا، بلکہ سونے کو جس کسوٹی پر پرکھا جائے گا وہ فیصلہ کرے گی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان:

آیت میں ''النَّاسُ'' کا لفظ آیا اور سورۃ البقرۃ مدینہ منورہ میں اتری اور مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کا مقابلہ اہل کتاب سے تھا اور اہل کتاب یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم بڑے عالم ہیں اور ہمارے علماء اور احبار موجود ہیں اور ہم تورات وانجیل کے عامل اور عالم ہیں۔ تو پڑھے لکھے لوگوں کو دعوت دی کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ایمان تب قبول ہوگا جب تم ایمان لے آؤ جیسے لوگ ایمان لے آئے۔

اور جو لوگ سورۃ البقرۃ نازل ہونے کے وقت مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کے ساتھ تھے وہ کون تھے؟ کیا آپ اور ہم تھے؟ اسی لیے ایک روایت کے اندر آ گیا ''اٰمِنُوْا کَمَا اٰمَنَ النَّاسُ، اَیْ: اَبُوْبَکْرٍ وَ عُمَرُ وَ عُثْمَانُ وَ عَلِیٌّ'' [الدر المنثور للسیوطی: ۱/ ۶۹]

اسی طرح ایمان لے آؤ جس طرح ابوبکر، عمر، عثمان، علی اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم ایمان لے آئے ہیں۔ ہم تم ایمان کو ان کے ایمان کی کسوٹی پر پرکھیں گے۔ اگر ان جیسا ایمان ہے تو قبول ہے، ورنہ فضول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اتنا بڑا مرتبہ دیا۔

اور دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ [النساء: ۱۱۵]

''جو میرے رسول کے ساتھ جھگڑا کرے ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد اور ایمان والوں کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستہ پر چلے تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔''

تو اس وقت ایمان لانے والے کون تھے؟ اصحاب رسول ﷺ تھے۔

اور اسی طرح ایک حدیث مبارک میں ہے: حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے صحابہ کی مثال ایسے ہے جیسے آسمان پر تارے، یعنی جس کو بھی پکڑ لو گے ہدایت پا جاؤ گے، جیسے آدمی روشنی دیکھ کر راستہ پا جاتا ہے۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۶۰۰۹، باب: مناقب الصحابۃ]

صحابہ رضی اللہ عنہم کی ضرورت:

خدا کی شان ہے کہ اگر اللہ قرآن نازل فرما دیتے تو ہمیں قرآن سمجھ نہ آتا، مثلاً: قرآن پاک کی آیت آئی، اس کے اندر روزے کے بارے میں ایک حکم آیا۔ اللہ نے حکم دیا: تم کھانا کھاؤ، پانی پیو اور اس وقت تک تم کو کھانے کی اور پینے کی اجازت ہے جب تک سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے علیحدہ نہ ہو جائے۔ ایک صحابی نے دو دھاگے خریدے: ایک سفید اور ایک سیاہ، اور اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔ اور سحری کے لیے جب بیدار ہوئے تو کھانا بھی کھاتے رہے اور پانی بھی پیتے رہے اور ان ڈوروں کو بھی غور کر کے دیکھتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ باہر فجر ہو گئی اور وہ کھا

رہے ہیں۔اب جب باہر نکلے تو وہ حیران ہو گئے کہ نماز کا وقت ہو گیا تھا، صبح صادق کو نکلے ہوئے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور ﷺ سے مسئلہ پوچھا تو حضور ﷺ نے کہا کہ تم تو فجر کے بعد بھی کھاتے رہے ہو، تمہاری شکایت ہو گئی ہے۔اس نے کہا: حضور ﷺ! میں نے تو بالکل قرآن پر عمل کیا ہے۔اللہ نے فرمایا: جب سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے الگ ہو جائے۔میں نے باقاعدہ دو ڈورے خرید کر تکیے کے نیچے رکھے اور باقاعدہ دیکھتا رہا، جب اس سیاہ اور سفید میں مجھے فرق نظر آنے لگے، وگرنہ تو پہلے دونوں سیاہ نظر آتے تھے، کیونکہ اندھیرا تھا تو آہستہ آہستہ سفید نظر آنے لگا تو میں نے کھانا بند کر دیا۔حضور پاک ﷺ مسکرائے اور فرمایا: تمہارا تکیہ تو بڑا لمبا چوڑا ہے، اس کے نیچے سفید ڈورا بھی آ گیا اور کالا ڈورا بھی آ گیا۔دونوں ڈورے تیرے تکیے کے نیچے آ گئے؟ اس نے کہا: حضور ﷺ! بالکل آ گئے، میں نے تکیے کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندے! سفید اور سیاہ ڈورے سے مراد دھاگہ نہیں، بلکہ اس سے اللہ نے سمجھایا ہے کہ ایک صبح کاذب ہوتی ہے اور ایک صبح صادق ہوتی ہے۔پہلے ایک روشنی پھیلتی ہے، لیکن سیدھی چلی جاتی ہے، زمین پر پھیلتی نہیں۔اس کے بعد جب صبح صادق ہوتی ہے تو وہ پھیلنا شروع کرتی ہے۔تو ایک کو اللہ نے سیاہ ڈورے سے تشبیہ دی اور ایک کو اللہ نے سفید ڈورے سے تشبیہ دی۔آگے "مِنْ" بیانیہ لگ گیا ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ اس کا تعلق فجر سے ہے۔ صبح صادق سے اور صبح کاذب سے ہے، تیرے دھاگے سے نہیں ہے۔تو اگر حضور ﷺ مسئلہ نہ سمجھاتے تو صحابی عربی تھا، قرآن عربی تھا، قرآن مبارک کے لفظ عربی تھے، لیکن اس کو مسئلہ سمجھ نہیں آیا جب تک کہ اس کو میرے آقا ﷺ نے مسئلہ سمجھا نہیں دیا۔

[صحيح البخاري، حديث: ٤٥٠٩، باب قوله: وكلوا واشربوا حتى يتبين لكم...]

جنت میں سب سے زیادہ حضور ﷺ کی امت ہوگی:

ایک دن حضور ﷺ نے فرمایا کہ سارے نبیوں کی امت ایک طرف ہو تو جنت میں چوتھا حصہ پوری مخلوق میں سے میری امت ہوگی۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: صرف چوتھا حصہ؟ تو فرمایا: اچھا! اللہ سے دعا کرتا ہوں: أَنْ تَكُوْنَ نِصْفَ أَهْلِ الْجَنَّةِ" کہ تمام نبیوں کی امت کو اکٹھا کریں اور وہ آدھے ہوں گے اور آدھی جنت میں میری امت ہوگی۔صحابہ اور ملتجی ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا! میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ دو تہائی جنت میں میری امت

ہو گی اور ایک تہائی میں ساری امتیں ہوں گی۔تو سب سے زیادہ جنت میں امت، محمد ﷺ کی ہو گی۔

[صحیح البخاری، حدیث:۳۳۴۸، باب: قصۃ یأجوج ومأجوج]

عجیب حکایت!

ایک بادشاہ کے ملک میں بڑے بڑے کاریگر لوگ رہتے تھے، روم کے تھے۔ان رومیوں اور چینیوں میں جھگڑا ہو گیا۔رومی کہیں کہ ہم زیادہ کاریگر ہیں اور چینی کہیں کہ ہم زیادہ کاریگر ہیں۔ان کا جھگڑا چلتا چلتا بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔انہوں نے کہا: آپ کے ملک میں رہتے ہیں، ہم کاریگر ہیں، لیکن رومی جھگڑا کرتے ہیں کہ ہم زیادہ کاریگر ہیں اور چینی کہتے ہیں کہ ہم زیادہ کاریگر ہیں۔ بادشاہ نے کہا: اس کا بڑا آسان حل ہے۔ ہم ان کا امتحان کر لیتے ہیں۔دونوں طرف کے کاریگروں کو بلاؤ۔ان کو بلایا گیا تو اس نے کہا: دیکھو! یہ میرے محل کا ایک بڑا کمرہ ہے، اس کے درمیان میں ایک دیوار دے کر کمرے کو بند کر دو: ایک حصہ میں تم رومی اپنا کمال دکھاؤ اور ایک حصہ میں چینی کاریگر کوئی چیز بنائیں اور اپنا کمال دکھائیں۔تم دونوں جب اپنی چیزیں بنالو گے تو ہم درمیان سے دیوار نکال دیں گے، پھر آ کر فیصلہ کریں گے کہ تمہارا کام اچھا ہے یا ان کا اچھا ہے؟ اور جس کا کام اچھا ہو گا اس کو ہم سرٹیفکیٹ دے دیں گے کہ وہ زیادہ قابل ہے۔انہوں نے کہا کہ ہمیں منظور ہے۔

بادشاہ نے کمرے کو بند کرا دیا اور دروازے دونوں کے علیحدہ علیحدہ بنا دیے۔اور پابندی لگا دی کہ وہ ان کے کام کو نہ دیکھیں اور وہ ان کے کام کو نہ دیکھیں، اپنا اپنا کام کریں۔اب چینیوں نے کمال کیا انہوں نے دیوار پر ایسے ایسے پھول بوٹے بنائے کہ دنیا کے نوادرات میں ایسا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے خوبصورت پھول بھی دیواروں پر بن سکتے ہیں۔اور رومیوں نے کچھ نہیں بنایا، انہوں نے دیوار کو ایسا صاف کیا، صیقل کیا اور اتنا چمکا دیا کہ وہ بالکل شیشہ بن گئی کہ دیوار کے سامنے کھڑے ہوتے تو اپنی تصویر نظر آ جاتی۔انہوں نے کوئی پھول نہیں بنایا، کوئی چیز نہیں بنائی، کوئی رنگ نہیں لگایا، انہوں نے دیوار کی صفائی پر ایسے کام کیے۔اور اس زمانے میں پتھروں کی دیواریں ہوتی تھیں۔آپ نے جیسے حرم کے اندر پتھر لگے ہوئے دیکھے ہوں گے، اللہ تعالیٰ بنانے والوں کی خدمت کو قبول و منظور فرمائیں اور انہیں حرمین کی خدمت کی زیادہ توفیق عطا فرمائیں۔کسی پتھر کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ایسے نظر آتا ہے جیسے شیشہ کے سامنے کھڑے ہوں۔تو انہوں نے ایسی محنت کی کہ دیوار کو چمکا دیا کہ اگر آدمی سامنے کھڑا ہو تو تصویر نظر آئے گی۔

ان دونوں نے جب کام ختم کر لیا تو بادشاہ کو اطلاع دی کہ جناب! ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔ بادشاہ نے کہا: ٹھیک ہے، فلاں دن ہم آئیں گے، اپنے وزیروں کو ساتھ لے کر ملاحظہ کریں گے۔ وقت مقررہ پر بادشاہ آ گیا۔ اس نے کہا: درمیان سے دیوار نکال دو۔ اب جب دیوار درمیان سے نکال دی تو انہوں نے جو اس دیوار پر کام کیا وہ سارے کا سارا اس دیوار پر بھی نظر آ رہا ہے۔ اب بادشاہ سامنے کھڑا ہوا حیران ہو رہا ہے کہ اب فیصلہ کیسے کریں؟ ادھر بھی وہی چیز بنی ہوئی ہے اور ادھر بھی وہی چیز بنی ہوئی ہے۔ جو پھول وہاں بنا ہوا ہے وہ اس دیوار پر بھی نظر آ رہا ہے، حالانکہ انہوں نے بنایا بھی کچھ نہیں ہے۔ دیکھنے کے بعد بادشاہ نے کہا کہ تم سب نے بڑا کمال کیا ہے، لیکن رومی تم سے نمبر لے گئے۔ انہوں نے کہا: وہ کیسے نمبر لے گئے؟ اس نے کہا: تمہارا بنا ہوا انہوں نے اپنی دیوار میں کھینچ لیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو برا کہنے کا طریقہ:

تو اصل بات دیوار کی صفائی کی تھی۔ جب تک ہمارے دل کی صفائی نہ ہو، صحابہ رضی اللہ عنہم ہمیں کیسے صاف نظر آئیں؟ اصل محنت ہم نے اپنے دل کے صاف کرنے پر کرنی تھی، ہم شروع ہو گئے صحابہ رضی اللہ عنہم کو صاف کرنے۔ ہم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی کوئی غلطی پکڑنی شروع کر دی۔ کسی نے جھگڑا شروع کر دیا، کبھی صحابہ رضی اللہ عنہم آپس میں بول پڑے وہ روایت کوئی ڈھونڈ کر لے آیا، کبھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بحیثیت ایک محبوبہ کے کوئی سخت بات کہہ دی کوئی وہ ڈھونڈ کر لے آیا، حالانکہ ہم نے ان کی باتیں نہیں ڈھونڈنی تھیں، بلکہ اپنے دل کو صاف کرنا تھا۔ جب ہمارا دل صیقل ہو جائے گا تو پھر ہمیں تصویر صاف نظر آئے گی، شان رسالت کی بھی، شان صحابہ کی بھی۔ اور اگر ہمارے دل میں کوئی داغ ہو گا تو وہ ہمارے دل میں ہو گا، جیسے شیشہ میں داغ ہوتا ہے تو دیکھنے والے کا اپنا چہرہ بگڑ جاتا ہے۔ شیشہ پر میل جما ہو تو دیکھنے والے کو چہرہ نظر نہیں آتا۔ اور شیشہ پر کوئی سیاہ نقطے لگا دے تو دیکھنے والے کو وہ نقطے نظر آتے ہیں۔ اصل میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا تو یہ مرتبہ ہے۔

ایک بات یاد رکھیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم معیار حق ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم معیار ایمان ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم مجسمۂ ایمان ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم نمونۂ ایمان ہیں۔ جب تک ہم صحابہ رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر نہیں چلیں گے نہ جنت ملے گی اور نہ آخرت میں کامیابی ملے گی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کو پہلی گالی کس نے دی؟

دوسری بات یہ یاد رکھیں کہ سب سے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالی دینے والے کون تھے؟ یہ بات اللہ کے قرآن سے سمجھیں اور یاد رکھیں کہ اس کے بعد آپ آنکھیں بند کر کے ایک عام بچے سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مکے میں اسلام لائے ہیں، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مارنے والا اور ستانے والا امیہ کافر تھا۔ حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ایمان لائے، آپ نے جب آ کر مسجد کعبہ میں خطبہ پڑھا تو ان کو مارنے والا ابوجہل اور اس کی کمپنی تھی اور اسی بی بی سمیہ رضی اللہ عنہا کو شہید کرنے والے کافر تھے۔ تو مکہ کے اندر صحابہ رضی اللہ عنہم کے دشمن کافر تھے تو قرآن میں آتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جنہوں نے سب سے پہلے گالی دی ہے وہ یہودیوں نے دی ہے اور منافقین نے دی ہے۔ یہ قرآن کی بات ہے، کسی تاریخ کی بات نہیں اور نہ ہی عام کتاب کی بات ہے۔ اللہ کے قرآن سے پوچھیں:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ﴾ [البقرة: ١٣]

منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول تھا اور یہ یہودی تھا، باقی اس کی پارٹی تھی۔ جب ان منافقوں کو کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسا کہ صحابہ ایمان لائے ہیں تو ان منافقوں نے کہا: عجیب بات ہے کہ ہم ایمان لے آئیں جیسے یہ بے وقوف ایمان لے آئے ہیں۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو بے وقوفی کی پہلی گالی دینے والے یہودی اور منافق تھے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایمان پر پختگی کی مثال:

ایک صحابی مسلمان ہو گئے۔ ماں باپ کافر ہیں۔ ماں نے کہا: بیٹا! بات سنو! تم نبی کا دامن چھوڑ دو، نہیں تو میں کھانا بند کرتی ہوں، بھوک ہڑتال کر رہی ہوں۔ تم جب تک کفر کا کلمہ نہیں کہو گے میں مر جاؤں گی، لیکن کھانا نہیں کھاؤں گی۔ ایک دن گزر گیا، دو دن گزر گئے، تین دن گزر گئے، ماں کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ لوگوں نے سمجھایا کہ ایسا کرو! ماں کو خوش کرنے کے لیے اوپر سے کلمۂ کفر کہہ دو، تم اندر سے پکے مسلمان رہو۔ بیٹا آیا، اماں! بات سنو! تمہارا حکم میں کبھی نہیں ٹال سکتا۔ تم اگر حکم دو تو میں دریا میں کود سکتا ہوں، آگ میں کود سکتا ہوں اور میں شیروں سے لڑ سکتا ہوں، لیکن جہاں تک دین نبی کا تعلق ہے، میرے سامنے مر جاؤ، میں محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی نہیں کر سکتا۔

ابوجہل کی بہو کا ایمان:

بیوی کافر ہے، خاوند مسلمان ہو گیا۔ خاوند کافر ہے، بیوی مسلمان ہو گئی۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بھی اسلام نہیں لائے

تھے۔ ابوجہل کے بیٹے تھے، ان کی بیوی مسلمان ہوگئی۔ حضور ﷺ کے جوتے مبارک لے کر خاوند کو ڈھونڈنے کے لیے گئی، خاوند مل گیا۔ رات کا وقت تھا، کافی عرصہ سے میاں بیوی جدا تھے۔ خاوند بیوی کے قریب آنے لگا۔ اس نے کہا: عکرمہ! ٹھہرو! اب تیرا میرا کوئی رشتہ نہیں ہے، میں مسلمان ہو چکی ہوں اور تو کافر ہے۔ جب تک حضور ﷺ کا کلمہ نہیں پڑھے گا میں تیری بیوی نہیں ہوں، سابقہ رشتہ کی بنا پر میں تجھے ڈھونڈنے آئی ہوں، میں تمہیں اسلام کی دعوت دینے کے لیے آئی ہوں اور چونکہ تو حضور ﷺ کے سب سے بڑے دشمن کا بیٹا ہے تو حضور ﷺ سے تیرے لیے امان بھی لائی ہوں اور حضور ﷺ کی نشانیاں جوتے مبارک بھی میرے پاس ہیں۔ یہ نشانی ہے کہ تم ڈرو نہیں، امان مل جائے گی، لیکن مجھے ہاتھ مت لگاؤ، ابھی تم نے کلمہ نہیں پڑھا۔ تو اس مقام پر مسلمان پہنچ گئے تھے۔ [السیرۃ النبویۃ لابن ہشام ۳/ ۲۸۳]

صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالی دینے کا جواب سب سے پہلے اللہ نے دیا:

جب یہودیوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالی دی تو سب سے پہلے گالی کا جواب اللہ نے دیا:

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ﴾ [البقرۃ:]

اللہ نے اتنا مؤکد جواب دیا کہ خبردار! صحابہ کو بے وقوف کہنے والے اصل میں خود بے وقوف ہیں، ﴿وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ﴾ یہ جاہل ہیں، یہ سمجھتے نہیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب یہ منافقین مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں دوستی اور اخلاص اور صفائی۔ وہ اس طرح سے مومنین کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں، دکھلاوا کر رہے ہیں، تاکہ مسلمانوں کو اگر عزت اور کامیابی حاصل ہو اور جنگ میں فتح ہو تو ہم بھی غنیمت کے مال میں شریک ہو جائیں، لیکن جب وہ اپنے سرداروں کے پاس جاتے ہیں...... تو ''خَلَوْا'' کا معنی ''اِنْصَرَفُوْا'' کیا گیا ہے، کیونکہ یہ ''اِلٰی'' کے ساتھ متعدی ہے۔ اور بعض نے فرمایا: ''اِلٰی'' ''مَعَ'' کے معنی میں ہے۔ ﴿وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ﴾ (اور جب وہ علیحدہ ہوتے ہیں اپنے سرداروں کے ساتھ) اور پہلا معنی لیا جائے تو معنی ہوگا کہ جب جاتے ہیں اپنے سرداروں کے پاس تو یہی پہلا معنی زیادہ بہتر ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

﴿شَيٰطِيْنِهِمْ﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: کفر کے بڑے بڑے سردار، یہودیوں کے بڑے بڑے پادری اور منافقوں کے سردار جب وہ اپنے ساتھیوں کے پاس جاتے ہیں اور ان کے ساتھ وہی شیاطین بھی۔ شیطانوں سے مراد وہی یہود ہیں جو ان منافقوں کو کہتے تھے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرو۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب یہ اپنے ساتھیوں سے ملتے ہیں، یعنی منافقوں اور مشرکین سے۔

اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شیاطین سے مراد ان کے سردار ہیں۔ اور اسی کے مطابق ابوالعالیہ ربیع بن انس رحمہ اللہ نے تفسیر کی ہے۔

ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا: شیطان کا معنی سرکشی ہے، لہٰذا انسانوں میں سے جو سرکش ہیں وہ بھی شیطان اور جو جنوں میں سے سرکش ہیں وہ بھی شیاطین ہیں۔ جانوروں میں بھی جو سرکش ہو تو اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ کوئی حیوان نہیں، شیطان ہے۔ اور شیطان انسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے کہ اے اللہ! ہمیں شیاطین انس و جن سے پناہ عطا فرما۔

حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! انسانوں میں سے بھی شیطان ہوتے ہیں۔

[ابن کثیر: ۱/۵۱، الآیۃ: وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا]

علماء نے اور مفسرین نے لکھا ہے کہ احادیث میں آتا ہے کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا ہے تو شیاطین کو قید کر دیا جاتا ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۱۰۷۹، باب: فَضْلِ شَهْرِ رَمَضَانَ]

اور اسی طرح آتا ہے کہ جب اذان کی آواز ہو تو شیطان بھاگ جاتا ہے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۶۰۸، باب: فَضْلِ التَّأْذِينِ]

جس گھر میں اللہ کا قرآن پڑھا جاتا ہے، آیۃ الکرسی پڑھی جاتی ہے، سورۃ الملک پڑھی جاتی ہے اور دوسری سورتیں پڑھی جاتی ہیں تو شیطان بھاگ جاتا ہے۔ [سنن الدارمي، حديث: ۳۴۱۸، باب: في فضل سورة البقرة]

شیطان رمضان میں انسان کو کیسے گمراہ کرتے ہیں؟

تو اب علماء فرماتے ہیں کہ اشکال یہ ہوتا ہے کہ شیطان تو رمضان کے مہینے میں باندھ دیے گئے یا شیطان تو بھاگ گیا، لیکن پھر آدمی گناہ کیوں کرتے ہیں؟ پھر غلطیاں کیوں کرتے ہیں؟ اور پھر آدمی برائیوں میں مبتلا کیوں

ہوتے ہیں؟ علماء نے اس کے دو جواب دیے ہیں: یہ پابندی آ گئی، لیکن انسانوں میں سے بھی شیطان موجود ہیں جو آدمیوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں۔

اور بعض علماء نے یہ بھی جواب دیا ہے کہ اگر آپ ایک جگہ آگ جلاتے ہیں۔ آگ بجھ جائے، لیکن داغ تو باقی ہوتا ہے۔ وہ شیطان جو آدمی کو گمراہ کرتا رہتا ہے، گیارہ مہینے کے اثرات بھی تو باقی ہوتے ہیں...... الا ماشاء اللہ......

(اصل جواب یہ ہے کہ سرکش شیطانوں کو باندھا جاتا ہے، چھوٹے چھوٹے شیطان تو کھلے ہوتے ہیں) اللہ جن کو صحیح توبہ نصیب فرمادے اللہ پاک ان شیطان کے فتنوں سے بچا لیتے ہیں۔ اس لیے حضور پاک ﷺ نے ہمیں دعا سکھائی کہ آدمی اللہ کی پناہ مانگے ''نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَيَاطِيْنِ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ''۔

شیطان ابوجہل کے ساتھ جنگِ بدر میں:

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ جنگِ بدر کے موقع پر جب ابی جہل لعنۃ اللہ علیہ اپنی فوجیں لے کر جا رہا تھا تو شیطان نے ایک قبیلہ کے سردار کی شکل میں آ کر ابوجہل سے کہا کہ ویسے آپ کا اور ہمارا بڑا جھگڑا ہے، آپ کے اور ہمارے بڑے اختلافات ہیں، لیکن ہم بھی حضور (ﷺ) کے دشمن ہیں، اس مقابلہ کے اندر میں تمہارے ساتھ ہوں اور بالکل فکر نہ کرو، مسلمانوں کو ایسی شکست دیں گے کہ وہ ہمیشہ کے لیے یاد رکھیں گے۔ تو اب وہ سارے سفر میں ابوجہل کے ساتھ رہا، لیکن اس کو پتہ نہیں تھا کہ یہ کون ہے؟ اس کو سردار سمجھے ہوئے تھا۔ جب مقامِ بدر پر پہنچا تو اب وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ابوجہل نے کہا کہ کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا: میں آ جاؤں گا اور مل جاؤں گا۔ ابوجہل نے کہا: اتنا دور سے تم ہمارے ساتھ آئے ہو، اب میدان میں پہنچ کر کیوں بزدلی دکھا رہے ہو؟ تو اس نے کہا: اصل بات یہ ہے کہ جو میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ وجہ کیا تھی کہ وہ اللہ کے ملائکہ کو دیکھ رہا تھا جو اللہ نے فرشتے اتارے ہوئے تھے، لیکن ابوجہل تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ [سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۶۶۳]

تو انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے، اس لیے قرآن میں آتا ہے:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ [یوسف: ۵]

شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور ایسا خطرناک دشمن ہے کہ بڑے سے بڑے صالح لوگ بھی شیطان سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

ایک کامل ولی کی شیطان سے احتیاط:

ایک بہت بڑے عالم محدث گزرے ہیں، ان کی خدمت میں ایک عورت مسئلہ پوچھنے کے لیے حاضر ہوئی۔ ان بزرگ کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی اور وہ بھی ستر سال کی بڑھیا تھی۔ انہوں نے کہا: حضرت! ایک عورت مسئلہ پوچھنا چاہتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ بھی بیٹھے رہو اور عورت کو بھی بلا لو۔ انہوں نے کہا: پتہ نہیں عورت نے کوئی بات علیحدہ پوچھنی ہو اور شرم کے مارے وہ بے چاری ہمیں دیکھ کر وہ بات نہ پوچھ سکے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اکیلا کسی عورت سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت! آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ فرمایا کہ شیطان تو کسی وقت بھی گمراہ کر سکتا ہے۔

اس لیے شیطان کا فتنہ بڑا خطرناک ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی اللہ کی پناہ میں آجائے ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ'' جیسے ہم جنات کو نہیں دیکھ سکتے اسی طرح کوئی طاقت خدا کو نہیں دیکھ سکتی۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ اور شیطان:

حضرت عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے بارے میں ہے کہ ایک دفعہ آپ اکیلے عبادت میں مشغول تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ جس درخت کے نیچے عبادت کر رہے تھے اس پر ساری روشنی چھا گئی، حیران ہو گئے کہ پتہ نہیں یہ کیا روشنی ہے؟ تھوڑی دیر گزری تو اس روشنی سے آواز آئی: اے عبدالقادر! آج کے بعد میں نے تم پر ساری عبادت معاف کر دی ہے۔ تم نے اتنی میری عبادت کی ہے کہ آج کے بعد تم عبادت کرو یا نہ کرو سب تمہارے لیے معاف ہے۔

......نعوذ باللہ......روشنی ڈال کر خدا بن کر آواز دے رہا ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ تو بہت بڑے عالم تھے، اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں فرمائیں۔ انہوں نے فوراً پڑھا ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ'' وہ سمجھ گئے کہ یہ تو بدبخت شیطان ہے۔ اللہ نے نبی پر عبادت معاف نہیں کی تو میں کون ہوں کہ مجھ پر عبادت معاف ہو گئی؟ اللہ نے تو اپنے نبی کو حکم دیا:

﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ [الحجر:۹۹]

میرے نبی محمد! میری عبادت کرو یہاں تک کہ تمہیں موت آئے۔ اس وقت تک جب اللہ کا نبی پابند ہے تو میں کون ہوں کہ مجھ پر اللہ نے عبادت معاف کر دی؟ تو یہ لازمی شیطان کا جھگڑا ہے، انہوں نے فوراً پڑھا ''اَعُوْذُ

بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ''اب شیطان بول پڑا، اس نے کہا: ہاں عبدالقادر! تم عالم تھے، تمہیں علم نے بچالیا، ورنہ اس انداز میں تو میں نے کتنے پیروں کی گردنیں توڑ ڈالی ہیں؟ کتنے بڑے بڑے لوگوں کو میں نے گمراہ کر ڈالا ہے؟ لیکن تم عالم تھے، تمہیں علم بچا گیا۔ آپ نے فرمایا: ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' اے بدبخت! تو مجھے پھر دھوکہ دے رہا ہے؟ بچانے والا خدا ہے، علم کیسے بچا سکتا ہے؟ علم اگر بچاتا تو سارے عالم بچ جاتے۔ اصل بچانے والا خدا ہے۔ تو مجھے علم کے ذریعہ سے گمراہ کر رہا ہے۔

اس لیے شیطان ایسے ایسے دھوکے دیتا ہے کہ بڑے بڑے مسلمان لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں۔

گمراہ کرنے کے لیے شیطان کی آوازیں:

آپ نے دیکھا ہے کہ بعض لوگ قبروں پر جا کر عبادت کرتے ہیں، ۹ راتیں بیٹھتے ہیں، چلے کاٹ رہے ہیں۔ تو کبھی شیطان دھوکہ دیتا ہے قبر کی آڑ میں اپنے آپ کو چھپا کر کہتا ہے کہ جاؤ! میں نے تمہاری مرادیں پوری کر دیں۔ اب آدمی کا عقیدہ بن گیا کہ میری مراد تو قبر والے نے پوری کی۔ اب اس کو تو پتہ نہیں ہے کہ آواز دینے والا کون ہے؟ وہ تو جنگل میں بیٹھا ہوا ہے۔ اب شیطان نے دھوکہ دے دیا۔ اگر اب اس کو ساری زندگی مولوی سمجھا تا رہے، وہ کہے گا: عجیب بات ہے! میں نے تو وہاں آواز سنی تھی، حضرت صاحب قبر سے باہر آ گئے تھے اور خود ملے تھے اور تم مجھے مسئلے بتا رہے ہو۔ لیکن اگر قرآن و حدیث پر نظر ہو تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر شہادت کا وقت آ گیا تو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم باہر نہیں آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لڑائی ہوئی، دس ہزار صحابہ شہید ہو گئے تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر آ کر فیصلہ نہیں فرمایا تو یہ کون ہے جس کے لیے کوئی باہر آ جائے؟ اللہ تبارک و تعالیٰ کا نظام ہے کہ عالمِ دنیا علیحدہ ہے، عالمِ برزخ علیحدہ ہے اور عالمِ آخرت علیحدہ ہے۔ عالمِ دنیا کا قانون قبر میں نہیں چلے گا اور قبر کا قانون عالم دنیا میں نہیں چلے گا آخرت کا قانون عالم دنیا اور عالم برزخ میں نہیں چلے گا ہر جگہ کا عالم بھی الگ ہے اور اللہ کے احکام بھی الگ ہیں زمینوں پر احکام علیحدہ ہیں آسمانوں پر احکام علیحدہ ہیں اور آخرت میں احکام علیحدہ ہیں۔

دنیا اور آخرت کا نظام الگ الگ ہے:

اب اندازہ فرمائیں کہ دنیا میں اگر ایک آدمی ایک نماز نہ پڑھے تو کافر بن جائے، لیکن جنت میں کوئی نماز نہیں

ہوگی، جنت میں کوئی روزہ نہیں ہوگا اور جنت میں کوئی عبادت نہیں ہوگی، کیونکہ جنت تو آرام کی جگہ ہے۔ وہاں کوئی عبادت کرے گا تو لذت کے لیے کرے گا، ورنہ اس پر پابندی کوئی نہیں ہوگی کہ ضرور عبادت کرو، ضرور نماز پڑھو، کیونکہ اللہ فرمائیں گے: تم دنیا میں پڑھ آئے ہو، اب تمہارے آرام کا وقت ہے:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـئًۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ [الحاقۃ: ۲۴]

تم نے دنیا میں روزے رکھ لیے اور تم نے بھوک برداشت کر لی اب یہاں کوئی روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب آخرت کے احکام بدل گئے، دنیا کے اندر سورج طلوع ہوتا ہے اور شام کو غروب ہوتا ہے، لیکن آخرت میں نہ سورج ہوگا اور نہ چاند ہوگا، نہ اس کا طلوع ہوگا اور نہ غروب ہوگا اور اس کے ایام آدمی خود آرام کے لیے مقرر کرے گا۔ وہاں تو ایسا موسم ہے کہ نہ سورج ہے اور نہ گرمی ہے اور نہ ظلمت ہے۔ اللہ نے قرآن مجید میں فرمادیا۔ آخرت کے احکام علیحدہ ہوتے ہیں، عالمِ برزخ کے احکام علیحدہ ہوتے ہیں اور عالمِ دنیا کے احکام علیحدہ ہوتے ہیں۔ یہ دھوکہ لگتا ہے جب آدمی عالمِ برزخ کو عالمِ دنیا میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، یا عالمِ آخرت کے قانون کو عالمِ دنیا میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

صحیح پیر کی پہچان کا طریقہ:

آسان فارمولا ہے کہ اپنے پیر پر نظر ڈالو۔ اگر اس کا ہر قول، عمل، فعل، صورت، سیرت اور کردار بالکل سنت رسول اللہ ﷺ کی تصویر ہے تو سمجھ لو کہ یہ پیر ہے۔ ہم نے دیکھنا ہے کہ ہمارا مرشد کیسے ہے؟ ہم ان کو قرآن و سنت کی روشنی میں پرکھیں گے، اس کو دیکھیں گے کہ نماز کا وقت آگیا ہے تو اس کی نماز کیسے ہے؟ اس کا وضو کیسے ہے؟ اس کی تہجد کیسے ہے؟ اگر غم کا وقت آگیا تو صبر کیسے ہے؟ خوشی کا وقت آگیا ہے تو خوشی کیسے ہے؟ لباس پہننے کا وقت آگیا تو لباس کیسا ہے؟ غسل کرنے کا وقت آگیا تو غسل کرنے کا انداز کیسے ہے؟ بات کرنے کا وقت آگیا ہے تو بات کرنے کا انداز کیا ہے؟ اگر اس کے ہر عمل میں تمہیں میرے مدنی پاک ﷺ کی سنت کی جھلک نظر آئے تو سمجھ لو کہ یہ ولی اللہ ہے اور اس کے غلام بن جاؤ۔ اور اگر آگ پر چلتا ہو اور دریا کے پانی پر بغیر کشتی چلتا ہو، ہواؤں میں اڑ کر دکھلا دے، لیکن بے نماز ہے تو سمجھو کہ دجال ہے، شیطان ہے، پیر نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ پیر ہوتا تو یہ محمد ﷺ کا غلام ہوتا۔

اب تو انگریزوں نے بھی روبوٹ بنا دیے ہیں، مشین کا بندہ بنا دیا ہے۔ تیرے گھر کا سارا کام کرتا ہے، بٹن دبا دو کہ میری چائے بناؤ تو وہ چائے بنا رہا ہے۔ ایسے انتظام کر دیے ہیں کہ تاریں کوئی نہیں، ہزاروں میل کا فاصلہ ہے، ٹیلی فون اٹھاؤ اور بات کرلو۔ آپ بٹن دباؤ اور تصویریں دیکھ لو۔ تو کیا ہم ان کو پیر مان لیں گے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟ اس لیے کہ ہم نے پیر اس کو ماننا ہے جو محمد مصطفیٰ ﷺ کا غلام بن جائے۔

جیسا کہ بزرگوں نے ایک مثال لکھی ہے: ایک بندہ کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک دن رہنے کے بعد کہا کہ حضرت! مجھے اجازت دیں۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹا! کیسے آئے تھے؟ اس نے کہا: حضرت! میں نے آپ کا نام سنا تھا، بیعت ہونے کے لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ کا مرید بنوں گا، لیکن اب میں نے ارادہ بدل لیا ہے، میں مرید نہیں بنتا۔ آپ مجھے اجازت دے دیں اور میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ بزرگوں نے پوچھا کہ وجہ کیا ہے؟ اس نے کہا: آج آپ جب عصر کی نماز میں آئے تو آپ نے مسجد کے اندر بایاں پاؤں پہلے رکھا اور دایاں پاؤں بعد میں رکھا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ جو اللہ کے گھر میں آنے کا طریقہ نہ جانتا ہو مجھے اللہ کے گھر کیسے پہنچائے گا؟ آدمی اتنی چھوٹی سنت رسول ﷺ بھی نہیں جانتا کہ مسجد میں پہلے دایاں پاؤں رکھا جاتا ہے اور بعد میں بایاں پاؤں رکھا جاتا ہے۔ اور آپ نے پہلے بایاں پاؤں رکھا اور بعد میں دایاں پاؤں رکھا۔ آپ نے چونکہ سنت کی مخالفت کی ہے، لہٰذا میں آپ کی بھی بیعت نہیں ہو سکتا۔

اللہ کی طرف مذاق وغیرہ کی نسبت:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قرآن پاک میں اس طرح کے استہزاء کے جتنے بھی الفاظ ہیں یا "سُخْرِیًّا" کا لفظ آیا ہے یا خداع کا لفظ آتا ہے یا مکر کا لفظ آتا ہے اس کا معاملہ جواب وہی ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایا: "اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ" اللہ نے ان کو توبیخ اور زجر کیا کہ اچھا اگر تم کر رہے ہو تو اللہ بھی تمہارے ساتھ کریں گے۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی آدمی کسی کو دھوکہ دے اور دوسرا اس پر کامیاب ہو جائے تو کہتا ہے: اچھا! میں نے بھی تمہیں دھوکہ دیا ہے۔ حالانکہ دھوکہ نہیں دیا ہوتا، بلکہ کامیابی کے لفظ کو دھوکہ سے تعبیر کر رہا ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس طرح کے جتنے الفاظ اللہ کے بارے میں ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا معنی اور ترجمہ وہی ہو جو اللہ کی شان کے لائق ہو۔ علماء نے فرمایا کہ یہ لفظ جب آئے گا تو مقابلہ

پر آئے گا۔ جب اللہ کی طرف مکر کی نسبت آئے گی تو مقابلہ پر آئے گی۔ اگر بندہ مکر کرے تو اللہ نے مکر اس کے مقابلہ پر کیا ہے تو استعمال جائز ہے۔

﴿وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ﴾ [الانفال:٣٠]

﴿يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ﴾ [النساء:١٤٢]

لیکن اگر مقابلہ پر نہ ہو تو ہم مطلقاً اس لفظ کا استعمال نہیں کریں گے۔

بعض علماء نے یہاں بڑی نفیس تقریر فرمائی ہے! انہوں نے فرمایا: مکر ہے، خداع ہے یا استہزا ہے، اس کے اندر ایک صفت نقصان کی ہوتی ہے اور ایک صفت کمال کی ہوتی ہے۔ جب مقابلہ ہوگا تو اللہ کی صفت کمال ظاہر ہوگی۔ تمام کفار نے مل کر حضور ﷺ کے خلاف مکر کیا، لیکن اللہ نے ان کے مکر کا مقابلہ کیا۔ تو یہ اللہ کے لیے کمال کی صفت بن گئی۔ ساری دنیا کا مکر اکٹھا ہو جائے، لیکن وہاں مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تو سلف کا عقیدہ ہے کہ اللہ کی شان میں جتنے الفاظ حدیث پاک میں ہیں ان سب پر ایمان ہے، لیکن ان کا ترجمہ وہی ہوگا جو اللہ کی صفت و شان کے مطابق ہوگا۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ استہزاء کا معنی یہ ہے کہ اللہ ان کو جزا دیں گے ان کو اس استہزاء اور دھوکہ کرنے کی۔ اللہ نے اپنے بدلہ لینے کو اسی لفظ میں استعمال کیا، وگرنہ دونوں کی حقیقت میں بہت بڑا فرق ہے۔ جیسے ہے ﴿جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ﴾ کہ برائی کا بدلہ برائی۔ حالانکہ برائی کا بدلہ جب اللہ دیں گے تو وہ بھلائی ہوگی۔

کبھی لفظ وہی استعمال کر لیا جاتا ہے اور مراد ہوتا ہے اس پر بدلہ دینا۔

﴿فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ ۚ﴾ [البقرة:١٩٤]

اللہ نے فرمایا: جو تم پر زیادتی کرے تم بھی زیادتی کرو، حالانکہ جو اس نے زیادتی کی وہ ظلم ہے، ہم تو بدلہ لے رہے ہیں، ہم تو مظلوم ہیں، زیادتی نہیں کر رہے ہیں، لیکن لفظ وہی آ گیا ہے اور معنی کے اندر فرق ہے۔ [ابن کثیر: ۱/۵۱، الآیۃ: اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ]

بعض مفسرین نے فرمایا کہ جیسے منافقین ظاہر میں ایمان لا کر دھوکہ دیتے ہیں اللہ نے بھی حکم دیا کہ ان کے ظاہری ایمان کے ساتھ معاملہ کرو۔ ظاہری معاملہ ہو رہا ہے، لیکن آخرت میں جہنم کی سزا ظاہراً تیار ہے۔ تو ان کو مسلمان سمجھا جا رہا ہے، وہ نمازیں بھی پڑھتے ہیں، ان کے جان اور مال بھی محفوظ ہیں، مالِ غنیمت میں سے بھی حصے لے رہے

ہیں، لیکن آخرت میں ان کے ساتھ معاملہ دوسرا کرنا ہے کہ ان کے لیے آگ تیار ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ جیسے منافقین استہزاء کرتے تھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ جیسے اس کی شان کو لائق ہے "سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ" وہ ان کو عذاب دیں گے کہ ظاہر میں ایمان لانے کی وجہ سے بظاہر ان کو معافی ملی ہوئی ہے، لیکن اصل میں ان کے لیے عذاب تیار ہے "يَمُدُّهُمْ" ان کو مہلت دیتے ہیں، ان کو بڑھا دیتے ہیں سرکشی میں، تا کہ وہ اس میں ہمیشہ کے لیے گر جائیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهِ مِنْ مَالٍ وَبَنِينَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ ۚ بَلْ لَا يَشْعُرُونَ ۝﴾

[المومنون:۵۵،۵۶]

جتنا مال بڑھے گا یہ گناہوں میں اتنا اور بڑھیں گے اور زیادہ سرکشی کریں گے اور زیادہ سے زیادہ عذاب کے مستحق ہوں گے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهَٰذَا الْحَدِيثِ ۖ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ۝﴾ [القلم:۴۴]

ہم ان کو سیڑھی سیڑھی چڑھا رہے ہیں ایسے طریقے سے کہ یہ جانتے نہیں ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں ہمارے پاس مال ہے، دولت ہے اور اولاد ہے، بس ہم کامیاب ہیں۔ حالانکہ یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ نے جو کافروں کو مہلت دے رکھی ہے یہ بھی ایک نظام ہے۔ اللہ کی اس میں کروڑوں حکمتیں ہیں کہ جوں جوں وہ گناہ کرتے ہیں اتنا دنیا کے اندر نعمتیں ملتی ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کامیاب ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ نعمت نہیں، بلکہ اللہ کا ایک عذاب ہے۔ انسان جب دولت میں غافل ہو جاتا ہے اور منہمک ہو جاتا ہے تو اللہ کا عذاب آ جاتا ہے۔

﴿فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۖ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝﴾

[الانعام:۴۴،۴۵]

حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کا سب سے راجح معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بطور مہلت ان کو ڈھیل دیتے ہیں، کیونکہ دنیا میں جو طاقتور ہو وہ اپنے مخالف کو ڈھیل دیتا ہے کہ چلو تم اور غلطی کرو اور غلطی کرو۔ اسے پتہ ہوتا ہے کہ جب چاہوں گا اس کی گردن توڑ دوں گا، کمزور تو فوراً گلے پڑ جاتا ہے۔ اور سب سے بڑی طاقت اللہ کے پاس ہے تو

اللہ بھی اپنے دشمنوں کو ڈھیل دیتے ہیں کہ اور زیادہ بڑھیں اور زیادہ بڑھیں، اپنی سرکشی کی انتہا کو پہنچ جائیں۔ جب وہ اپنے کبر اور سرکشی کی انتہاء کو پہنچ جاتے ہیں اور مدت پوری ہو جاتی ہے تو پھر اللہ کے عذاب ان کو پکڑ لیتے ہیں۔

[ابن کثیر: ۱/ ۵۲، الآیۃ: اَللّٰہُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ]

منافقوں کی سرکشی اور اندھاپن:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک ﴿وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ کا معنی ہے کہ وہ اپنے کفر کے اندر اسی طرح پلٹے کھاتے رہیں گے۔ لغت عرب سے اندر ہے "عَمِهَ فُلَانٌ" کہ فلاں گمراہ ہو گیا، اندھا ہو گیا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ معنی کیا ہے کہ وہ اپنی گمراہیوں میں اوندھے ہو گئے ہیں، اپنے کفر کے اندر ایسے پھنس گئے ہیں کہ کفر گویا ان کے اوپر آ گیا ہے، ان کی پلیدی ان کے اوپر چڑھ گئی۔ اسی کفر کے اندر پریشان ہیں، حیران ہیں ان کو راستہ ہی نہیں مل رہا کہ کدھر سے نکلیں؟ کیونکہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر فرما دی۔

اور بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ایک لفظ ہوتا ہے "اَعْمٰی" کہ جو آنکھ سے اندھا ہو جائے اور ایک ہے "عَمِهَ" کہ جو دل کا اندھا ہو جائے۔ اور کبھی کبھی "اَعْمٰی" کا لفظ دل کے اندھے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ نے فرمایا:

﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ [الحج: ۴۶]

کیونکہ آنکھ کا اندھا کسی سے راستہ پوچھ لے گا، کسی کا ہاتھ پکڑ کر بھی چلا جائے گا، لیکن جب آدمی دل کا اندھا ہو جائے تو وہ ہدایت ہی نہیں اختیار کر سکتا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۱۶﴾

یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو مول لیا، پھر ان کی تجارت نے ان کو نفع نہ دیا اور یہ ہدایت پانے والے نہ ہوئے۔

گمراہی خریدنے کا معنی:

"اِشْتِرَاء" کہتے ہیں کسی چیز کا رضامندی کے ساتھ خریدنا۔ سودا جب خریدا جائے اور رضامندی نہ ہو تو تجارت نہیں ہوتی۔ تجارت یعنی سودے کا لین دین رضامندی کے ساتھ ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ [النساء:۲۹]

اگر تم تجارت کرتے ہو اور دونوں فریق راضی ہوں تو وہ جائز ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تجارت کرتے اور ہدایت خریدتے۔ اللہ نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾

[الصف:۱۰]

اللہ پر ایمان لاؤ، اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ اصل تجارت تو وہ تھی، لیکن یہ منافق ایسے بدبخت ہیں، بجائے ہدایت خریدنے کے انہوں نے گمراہی کو خرید لیا ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ﴾ تو ان کی تجارت کامیاب نہیں ہوئی۔ ﴿وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝﴾ اور نہ وہ سیدھے راستے پر ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ نہیں کہ انہوں گمراہی پیسے دے کر خرید لی تھی، بلکہ معنی یہ ہے کہ آدمی جب کسی چیز میں رغبت کرتا ہے تو وہاں پیسہ خرچ کر کے ہی سودا خریدتا ہے اور یہ ایسے بدبخت ہیں کہ انہوں نے اپنی رغبت سے گمراہی کو اختیار کیا اور ہدایت کو چھوڑ دیا۔ یعنی ہدایت حاصل کرنے میں جو رغبت ہونی چاہیے تھی انہوں نے وہ رغبت ضلالت کے حاصل کرنے میں استعمال کی۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ [البقرۃ:۱۶]

اور یہ بھی مسئلہ سمجھ آ گیا کہ ہر آدمی کو جو اللہ عذاب دیتے ہیں اس کے اپنے اختیار کے مطابق دیتے ہیں۔ یعنی ان کو چاہیے تھا کہ وہ ہدایت خریدتے، لیکن انہوں نے ہدایت نہ خریدی، بلکہ گمراہی خرید لی۔ ان کا گمراہی کو اختیار کرنا ان کے اپنے اختیار سے تھا، اسی پر اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دیں گے۔ جو آدمی بھی عمل کرتا ہے وہ اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ یہ لوگوں کا ایک دھوکہ ہوتا ہے کہ اللہ نے لکھا ہے تو جب لکھ دیا ہے تو ہم کیا کریں؟ یہ معنی نہیں ہوتا، کیونکہ تمام عواقب اللہ کے علم میں ہیں، کیا مطلب کہ میری پیدائش کے پہلے سے لے کر جب میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا اللہ کے علم میں تھا کہ میں کب پیدا ہوں گا؟ اور پیدا ہونے کے بعد کیا کروں گا؟ اور میری زندگی کس راستے پر گزرے گی؟ اور میری موت کس راستے پر آئے گی؟ اور میری صحت کہاں آئے گی؟ یہ سب چیزیں میرے اللہ کے علم میں ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے کمال علم کو ظاہر کرنے کے لیے سب کچھ لکھ دیا۔ یہ نہیں کہ اللہ نے جبر کیا ہو کہ تم ضرور کفر کرو، یہ معنی نہیں ہوتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو انبیاء علیہم السلام بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ قرآن اتارنے کی کیا ضرورت تھی؟

بس اللہ لکھ دیتے کہ اتنے بندے مسلمان اور اتنے بندے کافر ہوں گے، اتنے بندے یہودی اور اتنے بندے نصرانی ہوں گے اور اتنے بندے ہندو اور اتنے بندے مجوسی ہوں گے۔ جب ایک فیصلہ ہو جاتا تو نہ کسی کے بھیجنے کی ضرورت، نہ کتابوں کی ضرورت تھی، نہ امتحان دینے کی ضرورت، نہ یہ ہمیں حواسِ خمسہ دینے کی ضرورت اور نہ عقل دینے کی ضرورت۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ہر آدمی کو بتلا دیا کہ یہ سیدھا راستہ ہے۔ اس راستے پر کانٹے ہیں، اس راستے میں دوزخ ہے، آگے آگ جل رہی ہو تو آپ پاؤں کھینچ لیتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا آ رہی ہو تو ادھر آپ محسوس کرتے ہیں کہ آرام مل رہا ہے۔ نفع کی چیز ہو تو آپ خوش ہوتے ہیں اور نقصان کی چیز ہو تو آپ غمگین ہوتے ہیں۔ یہ سارے اللہ نے اپنے بندوں کو اختیار دیا ہے، چونکہ ہمارا یہ اختیار اللہ کا دیا ہوا ہے اور اللہ کے علم میں ہے، لہٰذا اللہ پاک نے اپنے کمالِ علم سے سب کچھ پہلے لکھ دیا کہ مخلوق پیدا ہوگی اور یہ کرے گی اور یہ کرے گی۔ اب جب ملائکہ لوحِ محفوظ پڑھتے ہیں، انہیں اطلاع ملتی ہے یا اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو خبر دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں: سبحان اللہ! یا اللہ! تیرے علم کا کمال ہے کہ سب کچھ پہلے لکھا ہوا ہے۔ جو تیرا لکھا ہوا ہے وہ حق ہے، وہ کبھی بدل نہیں سکتا۔ یہ معنی نہیں ہوتا کہ جو کچھ لکھا ہو ہمیں اللہ پاک نے جبری طور پر اس پر مجبور کر دیا ہے، وگرنہ انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کو بھیجنے کا کیا مطلب؟ جنت اور جہنم بنانے کا کیا مطلب؟ حساب کتاب بنانے کا کیا مطلب؟ اچھے عمل کرنے کا کیا مطلب؟ اور برے عمل کرنے کا کیا مطلب؟

لیکن اسی طرح ایک بات یاد رکھ لیں کہ ہم اتنے با اختیار شترِ بے مہار بھی نہیں ہیں کہ جو چاہیں اپنے منشا سے کریں۔ یہ ہمارا اختیار بھی اللہ کے اختیار کے تابع ہوتا ہے۔ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ چاہیں تو پھر ہمارے اختیار کو ختم فرما دیں، ایک انسان کی کیا طاقت ہے؟

اس کی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی اچھی مثال دی کہ ایک دہریہ ان کی خدمت میں آیا، اس نے کہا: جناب! یہ مسئلہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا، اللہ نے کتنا ہمیں اختیار دیا ہے اور کتنا ہمیں اختیار نہیں دیا؟ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں اختیار دیا ہے اور دوسری طرف آپ کہتے ہیں کہ تمام اختیارات اللہ کے تابع ہیں تو سارے اختیارات اللہ کے تابع ہو گئے تو یہ مسئلہ مجھے سمجھ نہیں آیا؟...... وہ آدمی کھڑا تھا...... حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بات ہے تو تم ایک پاؤں زمین سے اٹھاؤ۔ اس نے ایک پاؤں زمین سے اٹھا لیا اور ایک پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا: اب دوسرا اٹھاؤ۔ اس نے کہا: دوسرا تو میں نہیں اٹھا سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اتنا اختیار ہے اور اتنی بے اختیاری ہے کہ

ایک پاؤں اٹھانے کا تمہیں اختیار ہے اور دوسرا پاؤں اٹھانے کا تمہیں اختیار نہیں ہے۔ اتنا اللہ نے اختیار بھی دیا ہے اور اتنا مجبور بھی رکھا ہے۔ اس لیے جتنا تمہیں اختیار دیا ہے اسی پر جزا و سزا مرتب ہوتی ہے اور جس پر اللہ نے تمہیں مجبور کر دیا اس پر جزا اور سزا مرتب نہیں ہوتی۔

﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [التوبۃ:۹۵]

جو تیرے ہاتھوں نے عمل کر کے آگے بھیجا اسی پر تجھے جزا ملے گی۔

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾

''جس نے اچھا عمل کیا چاہے مرد ہے یا عورت اور ایمان والا ہے......:''

﴿فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [النحل:۹۷]

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال:۷،۸]

باقی لوگ مجبور ہو جاتے ہیں۔ او جی! تقدیر میں پھنس گئے۔ او جی! لکھا ہوا ہے۔ ہمیشہ یاد رکھو! اس کی مثال میں اپنے دوستوں کو سمجھانے کے لیے آسان دیتا ہوں، تا کہ مسئلہ سمجھ آ جائے۔

مسئلہ تقدیر کو سمجھنے کے لیے آسان مثال:

ہمارے گھروں میں مثلاً: ائیر کنڈیشنڈ لگے ہوتے ہیں، گاڑیوں میں اور موٹروں میں ائیر کنڈیشنڈ لگے ہوتے ہیں۔ تو وہاں با قاعدہ نیلا یا سبز نشان ہوتا ہے اور ایک سرخ نشان ہوتا ہے: ایک پر لکھ دیتے ہیں کول اور ایک پر لکھ دیتے ہیں ہارٹ۔ اگر آپ کو ٹھنڈک چاہیے تو اس بٹن کو اس جگہ پر رکھو اور اگر آپ سردی میں جا رہے ہیں تو اس بٹن کو دبا کر اس سرخ نشان پر لے آئیں تو آپ کو گرم ہوا ملے گی۔ اب دونوں چیزیں اس میں لکھی ہوئی ہیں اور دونوں طاقتیں اس کے اندر موجود ہیں: ٹھنڈک کرنے والی طاقت بھی اس کے اندر موجود ہے اور گرم کرنے والی طاقت بھی موجود ہے۔ ٹھنڈک کا نشان بھی لگا ہوا ہے اور گرم کا نشان بھی لگا ہوا ہے اور لکھا ہوا ہے۔ اب ایک آدمی عین گرمی میں جا رہا ہے گرم پر بٹن کھول دے یا ایک آدمی عین سردی کے زمانے میں ہے تو وہ جناب کول بٹن پر رکھ کر اس کو چلا دے۔ اور پھر کہے کہ لکھا ہوا نہ ہوتا تو میں غلطی نہ کرتا، غلطی تو تیری ہے جو تو نے بٹن کو غلط جگہ پر رکھا ہے، اس میں لکھنے والے کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ اس نے تو دونوں نشان لگا دیے ہیں کہ یہاں بٹن رکھو گے تو ٹھنڈی ہوا آئے گی

اور یہاں رکھو گے تو گرم ہوا آئے گی۔ اب اگر وہ غلط موسم میں غلط استعمال کر رہا ہے تو اس کی سزا اس کے استعمال کرنے والے پر ہے، اس لکھنے والے پر تو نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو لکھا ہے وہ قانون مطلق ہے، انہوں نے ہماری استعداد کے مطابق اور جو ہم نے کرنا تھا ان کے علم میں ہے اس لیے انہوں نے اس کو پہلے لکھ دیا، ورنہ ہر آدمی کو اللہ نے اختیار دیا ہے کہ وہ آتا ہے اور انبیاء ﷺ کی باتیں سنتا ہے اور قرآن سنتا ہے اور اسلام لے آتا ہے۔ کتنے بے چارے لوگ ہیں جن کی ساری زندگی بدعت میں گزر جاتی ہے، ساری زندگی غیر اللہ کے پکارنے میں گزر جاتی ہے اور جب اللہ پاک سبب بنا دیتے ہیں، عمرے پر آجاتے ہیں، حج پر آجاتے ہیں، اللہ پاک کعبۃ اللہ کی زیارت نصیب کر دیتے ہیں، اللہ ان کو قرآن کا درس نصیب کر دیتے ہیں تو اللہ توبہ کی توفیق دے دیتے ہیں۔ واپس آجاتے ہیں تو ان کے عقیدے تبدیل ہو جاتے ہیں۔

گمراہی خریدنے کا مطلب:

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایمان لے آئے اور پھر کفر اختیار کیا، یعنی انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی۔

اللہ نے فرمایا کہ ہم نے قومِ ثمود کے لیے ہدایت کا انتظام کر دیا، لیکن ان بدبختوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی۔

تمام مفسرین کے اقوال کا خلاصہ یہ نکلا کہ منافق جتنے ہیں وہ ہدایت سے ہٹ گئے ہیں گمراہی کی طرف۔ گویا کہ ہدایت ایک پیسہ ہے، اس کو دے کر انہوں نے گمراہی کو لے لیا۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کافروں اور منافقوں کے اندر بھی کوئی انواع اور اقسام ہیں: بعض تو ایسے ہیں کہ ایمان لائے اور پھر کافر بن گئے۔ اور بعض ایسے ہیں کہ پہلے کفر کو چھپا لیا اور صرف ایمان کو ظاہر کیا ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝١٦﴾ [البقرۃ:١٦] اللہ نے فرمایا: وہ اپنی اس بیع کے سودے میں گھاٹے میں پڑ گئے۔ ایک گھاٹا ہوتا ہے کہ آدمی نفع حاصل نہ کر سکے اور ایک یہ ہوتا ہے کہ نفع بھی نہ ملا اور اصل بھی برباد ہو گیا۔ تو یہ منافق تو ایسے گھاٹے میں پڑے ہیں نفع بھی برباد ہو گیا اور اصل بھی برباد ہو گیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/ ٥٢، البقرۃ، الآیۃ: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ]

ایک صحابی کا ایمان پر جان دینا:

اور مومن اپنی تجارت میں ایسا کامیاب ہوا جیسے ایک حدیث مبارک میں آتا ہے۔ آپ ﷺ کے ایک صحابی ہیں

جواسلام کے معاملے میں ایمان پر اتنے پکے تھے کہ کافروں نے ان کو سولی پر لٹکایا، پھانسی پر لٹکایا تو اس سے پوچھا: تمہاری کوئی تمنا ہے؟ اس نے کہا: اگر تم چاہتے ہو اور مہلت دے سکتے ہو تو مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت دے دو۔ اس صحابی نے دو رکعت نماز پڑھی اور انہوں نے بہت لمبی نماز نہ پڑھی۔ انہوں نے کہا کہ میرا دل تو چاہتا تھا کہ میں بڑی لمبی نماز پڑھوں، کیونکہ آخری نماز ہے، لیکن میں نے اتنی لمبی نماز نہیں پڑھی، ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ میں قتل سے ڈر گیا ہوں۔ میں تو اللہ کے دین پر اپنی جان دے رہا ہوں، جتنے میرے بال ہیں اتنی دفعہ مجھے قتل کرتے رہو تو میں پھر بھی راضی ہوں، میں تو سودے پر راضی ہو گیا۔ اس لیے کھڑے ہو کر فرمایا: ''فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ!'' خدا کی قسم ہے! مجھے رب کعبہ کی قسم ہے! میں کامیاب ہو گیا ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے ایمان پر موت دی۔

اس لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ محنت تو تھوڑی کرتے ہیں، لیکن سودے میں نفع زیادہ لے جاتے ہیں۔ ہماری دنیا کی تجارت میں بھی بعض لوگ ٹیلی فون پر بیٹھے لاکھوں کما لیتے ہیں، بعض سالہا سال محنت کرتے ہیں، بے چارے دو روپے بھی نہیں کما سکتے تو اسی طرح دین و ایمان کے معاملے ہیں۔

ایک بہادر صحابی کا واقعہ:

ایک دفعہ میرے نبی خاتم الانبیاء سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی کافروں سے جنگ ہو رہی ہے اور بڑے زور کا معرکہ ہے اور فوجیں لڑ رہی ہیں حضور پاک ﷺ بیٹھے ہیں۔ ایک آدمی آیا، وہ کھجوریں کھا رہا تھا، حضور ﷺ کی خدمت میں آیا اور آ کر کہنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ! مجھے ایک تلوار دے دیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کے دشمنوں سے لڑوں اور آپ کی مدد کروں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم کون ہو؟ میں تو تمہیں نہیں جانتا۔ اس نے کہا: میں کافر ہوں، لیکن میرا دل کرتا ہے کہ آپ کی مدد کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''لَا أَسْتَعِينُ بِمُشْرِكٍ'' میں کسی مشرک کی مدد نہیں لیتا، مجھے کسی کافر مشرک کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جا کر کھڑا ہو گیا اور پھر کھجوریں کھانے لگ گیا۔ تھوڑی دیر گزری اور پھر آ گیا، اس نے کہا: حضور ﷺ! مجھے تلوار دیں، میں کافر ہوں یا مشرک ہوں، میں لڑنا تو آپ کے دشمنوں سے چاہتا ہوں، میں تو آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے کسی مشرک کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ پھر ہٹ گیا اور جا کر پھر کھجوریں کھانے لگ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر آ گیا، اس نے کہا کہ حضور ﷺ! کوئی اور راستہ یا طریقہ ہے کہ میں آپ کی مدد کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! بالکل آسان راستہ ہے، تم کلمہ پڑھ لو۔ اس نے کہا ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ'' میں نے کلمہ

پڑھ لیا ہے، اب مجھے تلوار دیں۔ تو تلوار لی اور میدان میں گھس گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ اس شخص کی بہادری اور بے جگری پر حیران رہ گئے کہ کون نوجوان بہادر ہماری صفوں کے اندر آ گیا ہے کہ دشمن کی صفیں الٹ ڈالیں اور شہید ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب پتہ لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((عَمِلَ قَلِيلًا وَأُجِرَ كَثِيرًا))

اس آدمی نے عمل تھوڑا کیا کہ ابھی کلمہ پڑھا اور ابھی لڑا اور شہید ہو گیا، نہ نماز، نہ حج، نہ روزے، نہ زکوۃ اور نہ محنتیں اور مجاہدے اور نہ سفر اور تکلیفیں، کچھ بھی نہیں، بس ایک گھنٹہ لڑا اور اللہ کو منظور تھا، کافروں کو مارا اور خود بھی شہید ہو گیا۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۲۸۰۸، باب: عَمَلٌ صَالِحٌ قَبْلَ القِتَالِ]

اور اس مرتبہ پر چلا گیا کہ ان کو مردہ بھی نہ کہو، وہ تو شہید ہو گیا اور اس مقام پر پہنچ گیا، اللہ نے فرمایا کہ میرے راستے میں جو گردن کٹائے تم انہیں مردہ نہ کہا کرو، وہ تو زندہ ہیں۔ تو اتنا بڑا مرتبہ ملا اور شہادت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ساتھ۔ ایک تو وہ بھی شہید ہے جو کشمیر میں شہید ہو جائے، بوسنیاں والے سربیوں کے خلاف لڑیں تو شہید ہیں، لیکن اس شہید کا کیا مرتبہ ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پرچم کے نیچے جنگ لڑی ہو! اس کا کون مقابلہ کر سکتا ہے! اور پھر اس شہید کا کیا مرتبہ ہو گا جس کا خود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ پڑھایا ہو گا۔

اس امت کا عظیم ثواب:

اسی طرح ایک حدیث مبارک میں آتا ہے کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دے کر سمجھایا کہ ایک آدمی ہے، اس کو اپنے مکان بنانے کے لیے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ اس نے کہا کہ تم صبح کی نماز کے بعد سے لے کر ظہر تک کام کرو، میں تمہیں فی مزدور دس روپے دوں گا۔ انہوں نے قبول کر لیا اور فجر کی نماز سے لے کر ظہر تک کام کیا۔ اس نے دس دس روپے دے دیے۔ پھر وہ دوسرے مزدوروں کو لے آیا، انہیں کہا کہ تم ظہر سے لے کر عصر تک کام کرو تو میں تمہیں دس دس روپے دوں گا۔ اور مزدور آ گئے تو ان سے عصر تک کام کرایا اور دس دس روپے دے دیے، وہ بھی کام کر گئے۔ اس نے اور مزدوروں کو بلایا، مزدوری میں ان کو بیس روپے ملے اور ان مزدوروں کا ڈیڑھ گھنٹا بنا۔ پہلی اور دوسری قسم کے مزدوروں نے اعتراض کیا کہ ہمارے زیادہ گھنٹے بنتے ہیں، ہمیں تو ملے دس روپے۔ انہوں نے ظہر سے عصر تک کام کیا اور ان کے تین گھنٹے بنتے ہیں، ان کو بھی دس روپے ملے اور انہوں نے ڈیڑھ گھنٹہ کام کیا اور ان کو بیس روپے ملے۔

اس نے کہا: بات سنو کہ جب میں نے تم سے اتفاق کیا تھا کہ تم صبح کی نماز سے ظہر تک کام کرو تو میں دس روپے مزدوری دوں گا، تم نے قبول کیا تھا؟ انہوں نے کہا: ہاں! ہم نے قبول کیا تھا۔ کہا: میں نے تمہیں کوئی پونے دس روپے دیے یا پورے دس روپے دیے؟ انہوں نے کہا کہ پورے دس دیے۔ تو کہا: پھر تمہیں اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ تم نے خود مزدوری قبول کی، ٹائم تمہارے سامنے تھا، میں نے تمہیں پوری پوری مزدوری دے دی۔ انہوں نے ظہر سے عصر تک کیا، میں نے بھی پوری مزدوری دے دی اور اب ان کو اگر میں نے اپنی مرضی سے بیس روپے دے دیے اور کام ڈیڑھ گھنٹہ لیا ہے تو میں نے تمہارا کوئی حق نہیں کھایا۔ انہوں نے کہا کہ واقعی! حق تو نہیں کھایا۔ تو فرمایا کہ میری مرضی کسی کو زیادہ دے دوں اور کسی کو تھوڑا دے دوں۔

اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جتنی امتیں گزری ہیں ان سب سے بڑے فائدے میں میری امت رہی کہ کام تھوڑا کرے گی، لیکن ثواب زیادہ لے جائے گی کہ سب سے آخر میں آنے والی امت محمد مصطفیٰ ﷺ ہے اور پہلے زمانہ میں کسی کی عمر ہزار سال ہوتی تھی، کسی کی عمر نو سو سال ہوتی تھی، کسی کی عمر چار سو سال ہوتی تھی، کسی کی عمر دو سو سال ہوتی تھی اور حضور ﷺ کی امت کی عمر ساٹھ اور ستر کے درمیان ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں جو اسی پر پہنچ گئے یا نوے پر پہنچ گئے یا سو پر پہنچ گئے۔ تو اس نے فرمایا کہ سب سے تھوڑی عمر بھی میری امت کی ہے، لیکن سب سے زیادہ اجر بھی میری امت کو ملے گا اور سب سے پہلے جنت میں میری امت داخل ہو گی۔

[صحیح البخاری، حدیث:۲۲۶۸، باب: الإِجَارَةِ إِلَى نِصْفِ النَّهَارِ]

حضور ﷺ کی امت جنت میں پہلے داخل ہو گی:

اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

((نَحْنُ الآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.)) [صحیح البخاری، حدیث:۸۷۶، باب: فَرْضِ الْجُمُعَةِ]

ہم سب سے اوّل بھی ہیں اور سب سے آخر بھی ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ حضور! اوّل کیسے ہیں؟ فرمایا: باعتبار جنت میں داخل ہونے کے میری امت سب سے پہلے ہو گی اور دنیا میں سب سے آخر میں آنے والی میری امت ہو گی۔

تو یہ تجارت کی کامیابی ہے کہ مومن کامیاب ہو گیا کہ تھوڑی محنت کی اور اجر زیادہ لے گیا اور منافق برباد ہو گیا۔

کہ اس نے ہدایت کے بجائے گمراہی کو خرید لیا اور ہمیشہ کے لیے برباد ہو گیا اور ﴿إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ﴾ [النساء:۱۴۵] اور گھاٹا بھی ایسا ہوا کہ نفع بھی برباد ہو گیا اور اصل بھی برباد ہو گیا۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾﴾ [البقرۃ:۱۶]

حرمین میں انسان کے عقائد و اعمال کی اصلاح:

اس لیے علماء نے فرمایا کہ اگر اللہ حج یا عمرہ نصیب فرما دے، کعبۃ اللہ کی حاضری نصیب فرما دے، اللہ مدینہ منورہ کی حاضری نصیب فرما دے، اللہ منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کی حاضری نصیب فرما دے اور ان مقامات کو اللہ آنکھوں سے دکھا دے جہاں قرآن اترا، جہاں میرے محمد مدنی مصطفیٰ ﷺ پیدا ہوئے، جہاں میرے مدنی ﷺ نے توحید کا نعرہ بلند فرمایا، جہاں میرے مدنی ﷺ نے ہجرت فرمائی، جہاں میرے مدنی ﷺ کا روضہ مبارک بنا، جہاں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دفن ہوئے، جہاں حضور پاک ﷺ حج پر آئے، پھر بھی عقیدہ صحیح نہ ہو تو سمجھے کہ میں تجارت میں گھاٹے میں چلا گیا کہ تمام چیزیں اللہ نے دکھلا دیں، پھر آدمی مشرک کا مشرک رہے، پھر بھی آدمی قبر پرست رہے اور پھر بھی غلط عقائد رکھے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جائے کہ دائیں سوئے ہوئے ہیں، بائیں سوئے ہوئے ہیں، قدموں میں لیٹے ہوئے ہیں، عمر رضی اللہ عنہ کا ایمان سمجھ میں نہ آئے تو وہ سمجھے کہ میرا آنا گھاٹے میں ہو گیا، وقت بھی برباد، دولت بھی برباد، محنت بھی لگی، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ فائدہ تب ہوتا ہے کہ جب ان چیزوں کی برکات حاصل ہوں اور آدمی کا عقیدہ اور ایمان صحیح ہو جائے۔ دعا کریں! اللہ سب کے عقیدے صحیح فرما دے۔

منافقین کا انجام:

حضرت ابوقتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ خدا کی قسم! آپ نے ان کو دیکھا کہ ہدایت سے نکل کر گمراہی میں چلے گئے، جماعت سے نکل کر علیحدہ ہو گئے، اسلام کی امن کی زندگی کی بجائے خوف میں آ گئے اور حضور ﷺ کے طریقوں کو چھوڑ کر گمراہی کے طریقوں پر چلے گئے۔ اس لیے فرمایا کہ اگر آدمی ایمان کی بجائے کفر میں چلا گیا تو گھاٹے میں آ گیا، اگر وہ ہدایت کی بجائے غلط راستے پر گیا تو وہ گھاٹے میں گیا، اگر حضور ﷺ کی سنت کی بجائے بدعت میں گیا تب بھی گھاٹے میں گیا اور اگر آدمی جماعتِ حقہ کو چھوڑ کر علیحدہ ہوا تب بھی آدمی گھاٹے میں گیا۔ اصل فائدہ وہ ہے جن کو اللہ نے ایمان بھی نصیب کیا اور اتباعِ محمد رسول اللہ ﷺ بھی نصیب

فرمائی۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ﴿۱۷﴾

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب آگ نے اس کے آس پاس کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی کو زائل کر دیا اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے۔ بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں۔ اب وہ نہیں لوٹیں گے۔

اس آیت میں مثال میں منافقین کو آگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آیت مبارکہ میں فرمایا:

﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ﴾ [العنکبوت: ۴۳]

مثال کے ذریعے بات بڑی آسانی سے سمجھ آجاتی ہے۔ اپنے کلام پاک میں بہت سے مقاموں پر مثالوں کا ذکر فرمایا ہے، تاکہ لوگوں پر بات واضح ہو جائے اور پورے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کی مثال دی نور کے ساتھ کہ ایمان نور ہے اور کفر و شرک کی مثال ہمیشہ ظلمت کے ساتھ دی ہے۔

مسئلۂ نور و بشر کی توضیح:

اسی طرح دوسری مثال یاد رکھیں کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے مومن کا ذکر کیا ہے اس کو زندہ کے ساتھ مثال دی ہے اور جہاں کفر کا ذکر آیا ہے اس کو مثال دی ہے مردہ کے ساتھ۔ تو اللہ تعالیٰ نے جو مثالیں قرآن پاک میں دی ہیں ان کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بعض اوقات ہمارے بعض حضرات...... خدا بہتر جانتا ہے کہ...... وہ اللہ کے قرآن کو سمجھے نہیں یا انہوں نے سمجھا ہے، لیکن بلا وجہ اپنی طرف اللہ کے قرآن میں تاویلات کر ڈالی ہیں۔ جہاں کہیں "نور" کا لفظ آ گیا انہوں نے نور کو اپنے معنوں میں لے لیا، جیسے آج تک دنیا کو اسی جھگڑے میں مبتلا کر دیا گیا کہ انبیاء علیہم نور ہوتے ہیں یا بشر ہوتے ہیں؟ حالانکہ اللہ کے قرآن میں جب ان چیزوں کی وضاحت موجود ہے اور ان چیزوں کے بارے میں نصوصِ قطعیہ موجود ہیں تو جھگڑے میں پڑنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی اور اختلاف میں الجھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اختلاف تو وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی مسئلہ بیان نہ کیا گیا ہو، لیکن جب ایک مسئلے کو اللہ قرآن میں کھول کر بیان فرما دے تو پھر اس سے اختلاف کون کر سکتا ہے؟

نورِ ایمان کیا ہے؟

اب دیکھیں! جہاں اللہ نے ایمان کو نور سے تشبیہ دی ہے تو اب یہ معنی تو نہیں ہوتا کہ ایمان کا معنی نور ہے، یا ایمان کو تشبیہ دیں کہ اس کو نور سے پیدا کیا گیا ہے، بلکہ ایمان کا معنی نور ایک مثال ہے۔

جیسے اب دیکھیں کہ پورے حرم میں روشنی ہے، نور ہے تو اس نور کی وجہ سے ہمیں کعبہ شریف بھی نظر آرہا ہے، ہمیں میزابِ رحمت بھی نظر آرہا ہے اور ہم بڑی آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ رکنِ شامی کہاں ہے، رکنِ یمانی کہاں ہے، حجرِ اسود کہاں ہے، صفا مروہ کس جانب سے ہے، مقامِ ابراہیم کس جانب ہے، بئر زمزم کس جانب سے ہے، باب العمرہ کس جانب سے ہے، باب السلام کس جانب سے ہے، کیونکہ نور ہے، روشنی ہے، ہر بات ہمیں نظر آرہی ہے۔ اور اگر ہم اسی نور کو بجھا دیں اور اندھیرا چھا جائے تو جو آدمی مکہ میں رہنے والا ہے وہ بے چارہ اس میں داخل ہونے کے بعد فیصلہ نہیں کر سکے گا کہ خدا جانے میں کس جانب سے آگیا ہوں؟ اللہ جانے صفا مروہ ادھر ہے یا ادھر ہے؟ مقامِ ابراہیم اس جانب ہے یا اس جانب ہے؟ جیسے ایک آدمی اپنے گھر کے اندر موجود ہو اور بجلی چلی جائے، اندھیرا ہو جائے تو وہ گھبرا جاتا ہے، اس کو نظر نہیں آتا۔ وہ اٹھے گا تو بڑے آرام سے کہ کہیں میرا پاؤں غلط نہ پڑ جائے، میں اپنا پاؤں کہیں برتنوں میں نہ ڈال دوں، میں دروازے کی بجائے دیوار سے نہ ٹکرا جاؤں اور اگر فوراً لائٹ آجائے تو اسے ہر چیز نظر آتی ہے کہ یہ دروازہ ہے، یہ میرا بستر ہے، یہ دیوار ہے، ادھر جانے کا راستہ ہے اور ادھر جانے کا راستہ نہیں ہے۔

اصل میں یہ مثال دی گئی کہ ایمان نور ہے۔ جب آدمی کو اللہ ایمان نصیب فرما دیتے ہیں تو اس کو سمجھ آجاتا ہے کہ اللہ کی توحید کا کیا معنی ہے؟ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا کیا معنی ہے؟ اللہ کے رسولوں کی رسالت کا کیا معنی ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم کا کیا مرتبہ ہے؟ اہل بیت کا کیا احترام ہے؟ اولیاء اللہ کا کیا مرتبہ ہے؟ عبادت کس کو کہتے ہیں؟ عبادات بدنیہ کیا ہوتی ہیں؟ عبادات مالیہ کیا ہوتی ہے؟ اللہ کے فرائض کیا ہیں؟ کن چیزوں کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے اور کن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے؟ تو گویا وہ روشنی میں آجاتا ہے۔ اور جب اس سے ایمان کی دولت چھین لی جاتی ہے یا اس کو ایمان نصیب نہیں ہوتا تو وہ اندھیروں میں بھٹک رہا ہے، کبھی چاند کو چمکتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کو خدا بنا بیٹھتا ہے، کبھی سورج کی روشنی کو سجدہ شروع کر دیتا ہے، کبھی دریاؤں کی موجیں اٹھتے ہوئے دیکھتا ہے تو گنگا اور جمنا کو اپنا خدا بنا لیتا ہے، کبھی سانپ میں اس کے زہر کی طاقت کو دیکھتا ہے تو اس کے آگے سجدے میں گر جاتا ہے، کبھی

درختوں کے آگے جھک جاتا ہے، کبھی پرندوں کے آگے جھک جاتا ہے، کبھی مردوں کے آگے جھک جاتا ہے، کبھی قبروں کے آگے جھک جاتا ہے، کسی بزرگ کی کوئی بات سنی کہ فلاں بزرگ بڑے صاحب کرامات تھے، اب ان کی قبروں پر سجدے میں پڑا ہوا ہے اور وہی عبادتیں سرانجام دے رہا ہے جو اللہ کے لیے تھیں۔ جس طرح اندھیرے میں بھٹکنے والا انسان صحیح راستے کا تعین نہیں کر سکتا، اسی طرح کفر و شرک کے اندھیروں میں بھٹکنے والا انسان بھی صحیح راستہ صراطِ مستقیم کا تعین نہیں کر سکتا۔ اس لیے مثال دی جاتی ہے کہ ایمان نور ہے اور کفر ظلمات ہے۔

اللہ نے فرمایا:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

[البقرۃ:۲۵۷]

اللہ مومنوں کا دوست ہے، اللہ مومنوں کا مددگار ہے اور ان کو کفر و ظلمات کے اندھیروں سے نکال کر نورِ ایمان کی طرف لاتا ہے۔ اور کافروں کا دوست شیطان ہے اور وہ ان کو نورِ ایمان کے اجالے سے لے کر کفر اور ظلمات کے اندھیروں میں لے جاتا ہے۔

قرآن کے نور ہونے کا معنی:

تو اب دیکھیں کہ ایمان کو نور کہا گیا تو اسی طرح کفر کو ظلمات کہا گیا۔ میرے اللہ نے فرمایا: ہم نے حضرت محمد مدنی ﷺ پر جو قرآن اتارا ہے ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾ [النساء:۱۷۴] میرے مدنی! ہم نے آپ کی طرف کھلا ہوا نور بھیجا ہے۔ اب یہ معنی نہیں ہے کہ قرآن جنسِ نور سے پیدا ہوا ہے، کیونکہ کتاب کی جنس اور ہوتی ہے اور قرآن کی جنس اور ہے، تورات کی کوئی اور جنس تھی اور قرآن کی کوئی اور جنس ہے، تورات بھی اللہ کی کتاب ہے اور قرآن بھی اللہ کی کتاب ہے، لیکن اللہ نے فرمایا کہ میرا قرآن نور ہے، یعنی جو قرآن کو پڑھے گا اور حلال و حرام کو سمجھے گا، کفر اور ایمان کو سمجھے گا اور منافقین کے احوال کو سمجھے گا تو نور میں آجائے گا۔ اس لیے اللہ نے قرآن کو بھی نور فرمایا ہے۔ اسی لیے حکم دیا گیا ہے:

﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ﴾ [الاعراف:۱۵۷]

''اے لوگو! میری مدنی پاک کی اتباع کرو اور اس کے ساتھ جو ہم نے نور بھیجا ہے اس کی اتباع کرو (یعنی اللہ کا قرآن پاک)۔''

لیکن ہمارے بعض حضرات...... اللہ پاک رحم فرمائے...... ایک لفظ بھی مل جائے تو لوگوں کے عقیدوں کو برباد کر ڈالتے ہیں۔ قرآن پاک میں جو ایک جگہ آیت آگئی:

﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴾ [المائدۃ:۱۵]

''تحقیق اللہ نے تمہاری طرف نور بھیجا اور کتاب کھلی ہوئی بھیجی ہے۔''

حضور ﷺ کے نور ہونے کا معنی:

بعض مفسرین نے فرمادیا کہ نور سے مراد حضور پاک ﷺ کی ذات ہے تو اس لیے انہوں نے کہا کہ نبی تو نور سے پیدا ہوتے ہیں، بشر تو ہوتے ہی نہیں۔ تو بھائی! پھر قرآن بھی نور سے پیدا ہوتا ہے اور ایمان بھی نور سے پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اگر آپ کو سمجھ عطا فرمائے اصل میں اکثر مفسرین نے سمجھا یا نور سے مراد بھی قران ہے اور کتاب مبین سے مراد بھی قرآن ہے۔ اگر ایک منٹ کے لیے مان لیا جائے بعض مفسرین کے قول کو کہ حضور پاک ﷺ کی ذات بھی نور ہے، تو کیا معنی ہے کہ جیسے قرآن نے روشنی پھیلائی ویسے میرے محمد مدنی ﷺ نے دنیا میں روشنی پھیلائی، لوگوں کو بتلا دیا کہ یہ ایمان ہے اور یہ کفر ہے، یہ حلال اور یہ حرام ہے اور یہ جائز ہے اور یہ ناجائز ہے، بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراط مستقیم پر کھڑا کر دیا ہے۔ اس سے مراد نبوت کی روشنی ہے، اس سے مراد اس علم کی روشنی ہے اور اس سے مراد ایمان کی روشنی ہے، وگرنہ یہاں اللہ نے بحث ہی نہیں کی ہے کہ میں نے نبی نور سے پیدا کیے ہیں یا میں نے انبیاء علیہم السلام کو خاک سے پیدا کیا ہے۔ یہ بحث جہاں جہاں بھی ذکر کی گئی وہاں اللہ نے واضح کر دیا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا﴾ [یوسف:۹۰]

''اے میرے پاک نبی! ہم نے آپ سے پہلے نہیں بھیجے، مگر مرد نبی بھیجے ہیں۔''

یعنی بھیجا بھی انسان ہے اور انسانوں میں سے مرد کو نبی بنایا ہے، کسی عورت کو نبی نہیں بنایا۔ اور اس طرح فرمادیا کہ ہم نے جتنے نبی بھیجے ہیں وہ اولادِ آدم سے بھیجے ہیں۔ اسی طرح فرمادیا کہ آپ دنیا پر واضح کر دیجیے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ [الکھف:۱۱۰]

میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں، محمد بن عبداللہ ہوں، میرا باپ عبداللہ ہے اور میری ماں آمنہ ہے۔ میں بھی اپنے ماں کے بطن مبارک سے پیدا ہوا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی سے سرفراز فرمایا ہے۔

تو اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! جہاں جہاں مثالیں دی گئی ہیں وہاں ہمیں سمجھانا مقصود ہے۔ جیسے اللہ نے فرمایا: مومن زندہ ہے اور کافر مردہ ہے۔ تو کیا معنی ہے کہ آدمی مرنے کے بعد کوئی عمل نہیں کرسکتا، مرنے کے بعد وہ کہے گا کہ میں کلمہ پڑھتا ہوں۔ تو اس کا کیا فائدہ ہے؟ مرنے کے بعد کہے کہ میں نمازیں پڑھوں گا تو کیا فائدہ ہے؟ اب تو مر گیا، بات ختم ہوگئی۔ اگر زندہ ہے تو وہ توبہ بھی کرسکتا ہے، کفر و شرک سے بھی نکل سکتا ہے اور اللہ کو راضی بھی کرسکتا ہے۔ تو اللہ نے فرمایا کہ مومن کی مثال ایسے ہے جیسے زندہ ہو۔ زندہ آدمی تو پھر بھی کوئی نہ کوئی نفع حاصل کرسکتا ہے اور کافر کی مثال ایسے ہے جیسے مردہ ہو۔ جیسے مرنے کے بعد آدمی کو کوئی عمل نفع نہیں پہنچا سکتا، اسی طرح جب آدمی مر گیا تو اس کے عمل ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کو والدین اور اولاد سے فائدہ پہنچتا ہے، اس کے لیے کوئی آدمی نفل پڑھے گا یا حج کرے گا تو اس کو فائدہ پہنچے گا، لیکن اب وہ خود بے چارہ نہ حج کرسکتا ہے، نہ نفل پڑھ سکتا ہے اور نہ وہ طواف کرسکتا ہے۔ تو اس لیے اللہ تعالیٰ نے مثالیں عطا فرمائیں۔

اسی طرح جیسے فرمایا کہ کافروں کی مثال ایسے ہے جیسے ایک مردہ زمین ہو اور مسلمانوں کی مثال ایسے ہے جیسے ایک تروتازہ زمین ہو کہ اس میں جب پانی برستا ہے تو اس میں کھیتیاں اگتی ہیں، اس کے اندر سبزہ لگتا ہے، اس سے باغات نکلتے ہیں اور ایک بنجر شور زدہ زمین ہے، جب پانی گرتا ہے اس میں تو اور زیادہ کیچڑ کا باعث بنتا ہے، ہلاکت کا باعث بنتا ہے، کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ تو کیا معنی ہے کہ مومن کے ساتھ دلوں پر جب ہم قرآن کی بارش کرتے ہیں تو ان کے ایمان کو اور تازگی ملتی ہے، اس کا ایمان اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور کافر قرآن کا جوں جوں انکار کرتا ہے وہ جہنم کا زیادہ حقدار ہوتا چلا جاتا ہے۔

تو یہ تمام مثالیں دی گئیں کہ اللہ کے قرآن کو سمجھیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کے دین و ایمان کو سمجھیں۔ جیسے کوئی محبت میں کہہ دے کہ سبحان اللہ کعبہ شریف نور ہے۔ اب اس کا معنی یہ تو نہیں کہ کعبہ نور سے بنا ہوا ہے۔ کعبہ تو پتھر سے بنا ہوا ہے، کعبہ اسی ایک کوٹھے مبارک کا نام ہے، اس کی تعمیر پہلے فرشتوں نے کی اور پھر حضرت آدم علیہ السلام نے کی اور اسی طرح پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی۔ اب کعبۃ اللہ پتھروں کا بنا ہوا ایک گھر ہے اور اس گھر میں یہ بھی نہیں...... نعوذ باللہ...... کہ اللہ تعالیٰ رہتے ہیں یا اس گھر کے اندر خدا کی رہائش ہے، بلکہ یہ محض ایک گھر ہے، اللہ نے نسبت

فرما دی کہ یہ میرا گھر ہے۔ کسی بندے کو اللہ فرما دیں کہ یہ میرا بندہ ہے تو اس کی شان اونچی ہو جاتی ہے، کسی گھر کو اللہ فرما دیں کہ یہ میرا گھر ہے تو اس کی شان اونچی ہو جاتی ہے، ورنہ تو تمام کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کا ہے۔

اللہ تعالیٰ ساری زمینوں کا مالک ہے، سارے آسمانوں کا مالک ہے، مکہ کا بھی مالک میرا اللہ ہے اور مدینہ کا مالک بھی میرا اللہ ہے، عرب کا مالک بھی اللہ ہے اور عجم کا مالک بھی اللہ ہے، لیکن اس مقام کو شرف مل گیا جس کی اللہ نے نسبت کر دی کہ میرا گھر ہے۔ تو اب اس میں برکتیں بھی آ گئیں، رحمتیں بھی آ گئیں، اس کا دیکھنا بھی عبادت کا ذریعہ بن گیا۔ اس لیے حدیث میں آتا ہے کہ روزانہ ۱۲۰ رحمتیں نازل ہوتی ہیں: ساٹھ رحمتیں تو ان کو ملتی ہیں جو اللہ کے کعبہ کے طواف کے اندر مصروف ہوتے ہیں۔ اور فرمایا: ۴۰ رحمتیں ان کو ملتی ہیں جو نفل پڑھنے میں مصروف ہوتے ہیں یا نماز پڑھنے میں مصروف ہوتے ہیں اور ۲۰ رحمتیں صرف ان کو ملتی ہیں جو طواف بھی نہیں کر سکتے اور نفل بھی نہیں پڑھ سکتے، فرمایا: صرف میرے گھر کو دیکھتے رہیں ان پر بھی ۲۰ رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

[جامع الاحادیث للسیوطی، حدیث: ۲۷۱۰۸]

تو اب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک شرف بخش دیا ہے تو اس لیے آدمی محبت میں آ کر کہتا ہے: سبحان اللہ! کعبہ شریف تو نور ہے۔ سبحان اللہ! مدینہ شرف تو ہماری آنکھوں کا نور ہے۔ یا جیسے آدمی اپنے باپ کو لکھ دیتا ہے: حضور پر نور! سبحان اللہ میرے والد میری آنکھوں کا نور ہیں۔ سبحان اللہ میری اولاد میری آنکھوں کے تارے ہیں۔ تو اب اولاد تارے نہیں بن جاتی، والد نور سے پیدا نہیں ہو جاتا، یہ نہیں ہو جاتا کہ کوئی مقام یا بزرگ نور بن جائے گا، بلکہ ایک تشبیہ ہے کہ جیسے نور ایک روشن ہونے والی چیز ہے۔ نور کا معنی ہوتا ہے خود بھی روشن ہو اور دوسروں کو بھی روشن کرنے والا ہو، یعنی روشنی پھیلے اور ہر چیز کو روشن کر دے اس کو نور کہتے ہیں۔ اب جب اللہ کے نبی آئے تو نور ایمان پھیل گیا، نور نبوت کی روشنی آئی تو ظلمت مٹ گئے، اندھیرے چھٹ گئے، کفر اور شرک کو ختم کر دیا گیا، لات، ہبل اور منات کے جو پجاری تھے وہ اللہ کے دیوانے بن گئے، جو لوگ بتوں کے پروانے تھے وہ کعبہ کے پروانے بن گئے، جو لوگ حرام کھانے والے تھے وہ حلال کے عادی بن گئے، جو لوگ گناہ کرنے والے تھے وہ نیکیوں کے رسیا بن گئے، ان کی زندگیوں میں انقلاب آ گیا، بھٹکے ہوؤں کو راستہ مل گیا۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ یہ روشنیاں ہیں۔

اللہ کے قرآن کو سمجھیں کہ بعض اوقات آدمی محبت میں آ کر ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ حدودِ ایمان سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو حدودِ ایمان میں رکھے۔ (آمین)

نور اور ضیاء میں فرق:

اللہ نے مثال بیان فرمائی کہ ان منافقوں کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص آگ جلائے۔آگ کے اندر دو چیزیں ہوتی ہیں: ایک نور ہوتا ہے، یعنی جو خود بھی روشن ہو اور دوسروں کو بھی روشن کرنے والا ہو۔

اور ایک لفظ ضیاء ہے۔ضیاء کا معنی ہوتا ہے ایسی روشنی جس میں حرارت ہو اور نور کہتے ہیں ایسی روشنی جو رحمت ہو۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ⑤﴾ [یونس:۵]

سورج ضیاء ہے، اس کی روشنی تیز ہے، اس کے اندر حدت ہے، زیادہ پھیلنے والی روشنی ہے، لیکن چاند کی روشنی میں رحمت ہے، اس کی روشنی میں وہ تیزی نہیں ہے۔آپ چاندنی میں بیٹھیں گے تو لطف اندوز ہوں گے، کیونکہ چاندنی حدت پیدا نہیں کرتی ہے۔جوں جوں سورج چڑھتا آئے گا اس طرح گرمی بڑھتی چلی جاتی ہے، اس لیے سورج کی روشنی کو ضیاء کہا گیا اور چاند کی روشنی کو نور کہا گیا۔

اور اسی لیے علماء نے فرمایا کہ نور اصل ہے، ضیاء اس سے پیدا ہوتی ہے۔یعنی نور ہوگا تو اس سے روشنی آگے پھیلے گی، اگر نور ہی نہیں ہوگا تو ضیاء کہاں پھیلے گی؟ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے فرمایا:

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْۗءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ㉟﴾

[النور:۳۵]

''اللہ تمام آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال کچھ یوں ہے جیسے ایک طاق ہو جس میں چراغ رکھا ہو چراغ ایک شیشے میں ہو، شیشہ ایسا ہو جیسے ایک ستارا، موتی کی طرح چمکتا ہوا، وہ چراغ ایسے برکت والے درخت یعنی زیتون سے روشن کیا جائے جو نہ (صرف) مشرقی ہو نہ (صرف) مغربی ایسا لگتا ہو کہ اس کا تیل خود ہی روشنی دیدے گا۔چاہے اسے آگ بھی نہ لگے، نور بالائے نور، اللہ اپنے نور تک جسے چاہتا ہے، پہنچا دیتا ہے، اور اللہ لوگوں کے

فائدے کے لیے تمثیلیں بیان کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

اپنی ذات کے ساتھ ضیاء کا لفظ استعمال نہیں فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں ہیں، بلکہ ساری کائنات اس کی محتاج ہے، اسی سے روشنی مانگنے والی ہے اور اسی سے ہدایت مانگنے والی ہے۔

منافقین کی مثال آگ کی روشنی سے کیوں دی؟

تو اب نار کے اندر دو چیزیں آگئیں:

1 ......ایک اس کے اندر روشنی ہوتی ہے۔ آگ جلائیں تو آگ سے بھی روشنی پیدا ہوتی ہے۔

2 ......دوسرا آگ کے اندر صفتِ احراق ہوتی ہے، یعنی ایک تو روشن کرنے والی صفت ہوتی ہے اور ایک جلانے والی صفت ہوتی ہے۔

اللہ نے فرمایا: ان منافقوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی آگ کو روشن کرے اور جب آگ روشن ہو جائے اور جو اس کے اردگرد چیزیں ہیں ان کو روشن کرے تو اس روشنی میں وہ دیکھتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ نے اس روشنی کو بجھا دیا۔ جب روشنی کو بجھا دیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ﴿وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَٰتٍ لَّا يُبْصِرُونَ﴾ [البقرۃ: ۱۷]

قرآن مجید جہاں کفر کے لیے ظلمت کا لفظ آئے گا تو وہاں ظلمات جمع کا صیغہ آئے گا، کیونکہ کفر ایک قسم کا نہیں ہوتا، بلکہ کفر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں: کوئی بتوں کا پجاری ہے، کوئی سورج کا پجاری ہے، کوئی تاروں کا پجاری ہے، کوئی قبروں کا پجاری ہے اور کوئی درختوں کا پجاری ہے، اس لیے فرمایا: ''ظُلُمٰتٌ''۔ اندھیرے بھی اتنے کہ تہہ در تہہ ہیں۔ ان کو ایسے اندھیروں میں چھوڑا کہ وہ نہیں دیکھ سکتے۔

ایک آدمی اگر پہلے ہی اندھیرے میں ہو تو پھر بھی کچھ نہ کچھ نظر آنے کی امید ہوتی ہے، لیکن روشنی کے بعد اندھیرا ہو جائے تو پھر کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کی چاندکی روشنی میں تصنیف:

امام بخاری رحمہ اللہ......جن کی کتاب ''صحیح البخاری'' پوری دنیا میں ایک عظیم کتاب ہے اور جس کو اللہ نے ایسا درجہ بخشا کہ قرآن کے بعد صحیح احادیث کا مجموعہ بخاری شریف ہے۔ انہوں نے بخاری شریف میں احادیث جمع کی ہیں......اور انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں ایک کتاب چاند کی روشنی میں لکھی، کیونکہ اور کوئی لائٹ میسر نہیں تھی۔

منافقین کے لیے اس مثال کا مطلب:

اس مثال کا مطلب یہ ہے کہ جب منافقوں نے ظاہری طور پر حضور ﷺ کے پاس کلمہ پڑھا: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" اور کہنے لگے: "نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ" [المنافقون:۱] کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ تو گویا ایک روشنی میں وہ آگئے، ان کو کلمہ پڑھنے کی روشنی ملی۔ لیکن چونکہ اندر کفر تھا، جب اللہ نے وہ نور ایمان کی روشنی بجھادی تو وہ اسی طرح اندھیروں میں بھٹکتے رہے۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ مثال ان کے لیے نہیں ہے، کیونکہ وہ پہلے سے کافر تھے، وہ تو صرف دھوکہ دینے کے لیے آئے تھے، بلکہ یہ مثال ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے اور پھر مرتد ہو گئے، ان کے بارے میں قرآن مجید میں ہے:

﴿ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ [المنافقون:۳]

جب ایمان لائے تو انہیں ایمان کی روشنی ملی۔ پھر کفر کرنے کے بعد ایمان کی روشنی بجھ گئی، وہ اندھیروں کے اندر ہمیشہ کے لیے گمراہ بن گئے، لیکن اکثر مفسرین کرام کے نزدیک ان آیات کا تعلق منافقین کے ساتھ ہے۔ انہوں نے اگرچہ دھوکہ دینے کے لیے کلمہ پڑھا تھا، لیکن کلمہ کی روشنی تو ہے۔ تو اسی روشنی کی وجہ سے ان کی جانیں اور مال بچ گئے، وہ مال غنیمت میں شریک ہوتے رہے، مسلمانوں سے فائدہ اٹھاتے رہے، لیکن جب ان کا کفر کھل گیا تو ان کی مثال ایسے ہوگئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ﴿وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۷] وہ ایک ایسے اندھیرے میں آگئے کہ بالکل دیکھ ہی نہیں سکتے۔ [ابن کثیر:۱/ ۵۳، الآیۃ: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا]

اللہ نے قرآن میں مثال دی ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ [البقرۃ:۱۷] ان کی مثال ایسے ہے جیسے کسی نے آگ جلائی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ منافقوں کا انجام آگ تھی، اس لیے مثال بھی آگ کے ساتھ دی گئی۔ اور پھر آگے اللہ نے فرمایا: ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ [البقرۃ:۱۷] یعنی اس آگ کی وجہ سے جو روشنی ہوئی تھی اللہ نے چھین لی۔ لیکن آگ کی دو صفتیں تھیں: ایک روشنی والی صفت تھی اور ایک جلانے والی صفت تھی۔ روشنی والی صفت تو اللہ نے چھین لی، لیکن جلانے والی صفت اللہ نے باقی رکھی کہ منافقوں کو وہی آگ جلائے گی۔

ابولہب کے نام کی مناسبت:

جیسا کہ میرے نبی سرکار ﷺ کے دشمن کی کنیت ابی لہب تھی، حالانکہ حضور ﷺ کا چچا ہے، حضور ﷺ کا قریبی عزیز ہے، لیکن اس کی اپنی برادری کے لوگ بھی اس کو ابولہب کہتے تھے۔ لہب کا معنی ہوتا ہے شعلہ، یعنی وہ اتنا خوبصورت تھا، اس کا رنگ اتنا گورا اور سرخ تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ شعلہ چمک رہا ہے، لیکن اس کو ابوالنور نہیں کہا گیا، ابوضیاء نہیں کہا گیا اور اس کی کنیت کو ابوالقمر نہیں کہا گیا۔ قدرت خدا کی ہے کہ کنیت وہ آئی جو اس کو انجام نصیب ہونا تھا۔ کنیت ابولہب تھی اور قیامت میں بھی لہب (آگ کا شعلہ) ملے گا۔

﴿تَبَّتْ يَدَآ أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝١ مَآ أَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝٢ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝٣ وَّامْرَأَتُهٗ ۚ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝٤ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝٥﴾ [سورۃ اللہب]

اللہ نے فرمایا: جیسے کنیت ابولہب ہے تو نار بھی ذات لہب ہے۔ ہم نے اس کے لیے جہنم کی آگ بھڑکنے والی اور شعلوں والی تیار کر رکھی ہے۔ تو اس لیے کافروں کی تشبیہ نار کے ساتھ دی گئی۔

(حدیث) جیسے ایک روایت میں آتا ہے:

((اَلصَّلٰوةُ نُوْرٌ وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ.)) [صحیح مسلم، حدیث: ۲۲۳، باب: فضل الوضوء]

حضور ﷺ نے فرمایا: نماز نور ہے۔ تو نماز کو نور کیوں کہا گیا؟ کہ جیسے نور ہوگا، روشنی ہوگی تو منزل پر پہنچیں گے۔ جب آپ صحیح نمازی بنتے ہیں تو آپ اللہ کی طرف پہنچتے ہیں، کیونکہ نماز معراجِ مومن ہے۔

معراج کے لیے اسے راستہ چاہیے اور وہ راستہ اللہ کی عبادت اور نماز ہے۔ اس لیے فرمایا: ''اَلصَّبْرُ ضِيَاءٌ'' جو صبر کرنے والا ہے روشنی اس کے لیے اور زیادہ پھیلنے والی ہے۔ اب صبر کی تشبیہ ضیاء کے ساتھ دی گئی کہ صبر یا تو مصیبت کے وقت ہے تو جب مصیبت کا وقت ہوگا آدمی کو تکلیف تو ہوگی۔ جیسے ضیاء روشنی تو ہوتی ہے، لیکن حدت بھی ہوتی ہے۔ اس لیے صبر تو تب ہوگا جب کوئی تکلیف ہوگی، کوئی حدت اور گرمی ہوگی۔ اور نماز کو نور کے ساتھ تشبیہ دی ہے ''اَلصَّلٰوةُ نُوْرٌ وَالصَّبْرُ ضِيَاءٌ'' اسی طریقے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کئی مقامات پر فرمایا۔ اب دیکھیں کہ آگے فرمایا:

﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝١٨﴾ [البقرۃ:۱۸]

اندھے، گونگے اور بہرے کی مثال کیوں دی گئی؟

مطلب یہ ہے کہ اندھیرا ہے اور اندھا ہے وہ تو آواز سن لے گا کہ بھائی! ادھر نہ جانا، آگے کنواں ہے۔ تو وہ کنویں میں گرنے سے بچ جائے گا، وہیں بیٹھ جائے گا۔ لیکن اگر اندھا بھی ہو اور بہرہ بھی ہو تو وہ کیا سنے گا؟ اگر کوئی آدمی اندھا بھی ہے، بہرہ بھی ہے، لیکن بول سکتا ہے۔ وہ اگر اندھیرے میں آجائے، پکارے گا تو کوئی ہاتھ پکڑنے والا بھی آجائے گا لیکن اندھا بھی ہو، بہرہ بھی ہو اور گونگا بھی ہو، یعنی بول بھی نہ سکتا ہو اور پھر ہو بھی اندھیروں کے اندر تو اس کی ہلاکت میں کیا شبہ رہ جاتا ہے......؟ حالانکہ کافر سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے اور بولتا بھی ہے، بلکہ بعض کافر تو مسلمانوں سے بھی بولنے میں تیز ہیں، سننے میں زیادہ تیز ہیں اور دیکھنے میں بھی زیادہ تیز ہیں، لیکن اللہ نے مثال دی کہ وہ اندھے، بہرے اور گونگے ہیں۔ قرآن نے دوسرے مقام پر اس کی وضاحت کردی۔ اللہ نے فرمایا:

﴿وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ [الاعراف:۱۷۹]

ان کی آنکھیں تو ہیں، لیکن یہ ہدایت والا راستہ نہیں دیکھ رہے۔ چاند پر پہنچ رہے ہیں، لیکن چاند کے خالق اور مالک کو نہیں پہچان رہے۔ یہ زمین کے طبقات میں تو بحثیں کر رہے ہیں، لیکن زمین کے خالق اور مالک کا انکار کر رہے ہیں۔

﴿وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ [الاعراف:۱۷۹] ان کے کان بھی ہیں، لیکن یہ سنتے نہیں۔ یعنی بڑی دور کی باتیں سن لیتے ہیں، لیکن اللہ کا قرآن اور حق کی باتیں نہیں سن سکتے۔

اس لیے ایک بزرگ نے مثال دی کہ ''خرِ عیسیٰ اگر مکہ ے رفت ہنوز خر باشد'' فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب گدھے پر مکہ تشریف لائے تو مکہ میں آنے کے بعد وہ گدھا کوئی ترقی تو نہیں کر گیا، وہ گدھا ہی رہا۔ جیسے وہ کتنے بدبخت ہیں جو مکہ میں آنے کے بعد بھی بے نماز ہیں، اللہ کے کعبے سے محروم ہیں، طواف کی دولت سے محروم ہیں، قرآن پڑھنے سے محروم ہیں، صحیح عقیدے سے محروم ہیں، اللہ کی توحید سے محروم ہیں، کتنے لوگ ہیں جو اللہ کے گھر میں آنے کے بعد اب بھی نماز نہیں پڑھتے، اللہ کے گھر میں آکر جماعت میں شرکت نہیں کرتے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے گھر میں آکر رہنا ان کو ایسے لگتا ہے جیسے کسی مصیبت میں پھنسے ہوئے ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ معاف

فرمائے! کتنے لوگ ہیں جو مدینہ منورہ کے گنبدِ خضراء کے سامنے کھڑے ہو کر کپڑا بیچ رہے ہیں اور نماز سے محروم ہیں، سگریٹ ہاتھ میں جلائی ہوئی ہے اور گالیاں بک رہے ہیں، اللہ کے نبی کے شہر میں اور مسجد نبوی میں رہتے ہوئے عبادت سے محروم ہیں، کتنے لوگ ہیں جو مکہ اور مدینہ کے دیکھنے کے باوجود واپس جانے کے بعد اسی طرح قبر کے سجدوں میں مشغول ہیں، اسی طرح قبر کے طواف میں مشغول ہیں، اسی طرح قبر پر نذر و نیاز اور چڑھاوے چڑھانے میں مصروف ہیں۔

سیدنا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا روضہ دیکھنے کے باوجود ان کے دشمن ہیں، سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا مرتبہ دیکھنے کے باوجود بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے گستاخ ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے! آنکھیں ان کی بھی ہیں، کان ان کے بھی ہیں اور دل و دماغ ان کے بھی ہیں، لیکن جب حق راستہ نہ ملے تو وہ گویا دیکھنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ اس لیے اللہ نے فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ﴾ ان کی مثال ایسے ہے جیسے جانور، بلکہ فرمایا ﴿بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾ [الاعراف: ۱۷۹] غیر اللہ کو پوجنے والا، غیر اللہ کی عبادت کرنے والا وہ تو جانور سے بھی گیا گزرا ہے، کیونکہ جانور تو پھر بھی کبھی راستہ پر آجاتا ہے۔ آپ گھوڑی پر سوار ہو جائیں اور آپ اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیں تو گھوڑی خود بخود تمہیں راستے پر لے جائے گی۔ اگر آپ منزل بھول جائیں اور آپ گھوڑی پر سوار ہیں، لگام چھوڑ دیں تو گھوڑی منزل پر پہنچا دے گی اگر اس نے منزل دیکھی ہو۔ تو اسی طرح سب سے خسیس جانور کتا ہے۔ اس کتے کو لے کر آپ بیس میل دور جنگل میں چھوڑ آئیں، وہ دوسرے دن ان کے دروازے پر بیٹھا ہوگا۔ اسی طرح کتا اگر پاگل بھی ہو جائے تو اپنے مالک کو نہیں کاٹتا۔ اللہ نے فرمایا: جو مجھے چھوڑ کر غیروں کو سجدہ کرتے ہیں ان کی مثال کتے سے بھی بدتر ہے کہ کتا بھی اپنے مالک کو پہچانتا ہے، لیکن یہ خدا کو نہیں پہچانتے کہ کبھی مجھے رکوع کرتے ہیں اور کبھی غیروں کو رکوع کرتے ہیں کبھی مجھے سجدہ کرتے ہیں اور کبھی غیروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ میرے آگے بھی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور بندوں کے آگے بھی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھ سے بھی آکر ''یا اللہ! یا اللہ!'' کہہ کر مانگتے ہیں اور ''یا دستگیر!'' کے نعرے بھی لگاتے ہیں۔ فرمایا: یہ تو اپنے مالک کو بھی نہیں پہچان رہے، ان سے تو وہ خسیس جانور بہتر ہے جو اپنے مالک کو پہچانتا ہے۔

منافقوں کی نظر صرف دنیا پر ہے:

چاند اور سورج طلوع ہوں تو پوری دنیا میں روشنی ہوتی ہے، لیکن آپ اگر آگ جلائیں گے تو اس کی روشنی صرف

اس کے اردگرد ہوگی۔ اس لیے فرمایا ﴿فَلَمَّآ اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهٗ﴾ [البقرۃ: ۱۷] یعنی جب اس نے اپنے اردگرد کو روشن کرلیا تو منافقوں کی نظر بھی صرف اردگرد پر ہے، پورے عالم پر نہیں ہے۔ ان کی نظر بڑی محدود ہے، وقتی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ ہم کلمہ پڑھ کر مسلمانوں کو دھوکہ دے دیں کہ مسلمانوں کو پتہ نہیں چلے گا، حالانکہ اگر ان کو پتہ چل جاتا کہ مسلمانوں کے نبی سے اللہ کی وحی کا تعلق ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں ہمارے نفاق کے بارے میں باخبر کر دے گا تو وہ کبھی ایسی حرکت نہ کرتے۔ اس میں یہ بھی اشارہ کیا گیا کہ وقتی طور پر ان کی اردگرد پر نظر ہے، لیکن جب ہم نے وہ روشنی چھین لی ﴿وَتَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ﴾ [البقرۃ: ۱۷] اور پھر ہم نے ان کو چھوڑا ایسے ظلمات میں کہ وہ دیکھ نہیں سکتے۔ ﴿صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ﴾ [البقرۃ: ۱۸] وہ ایسے ہیں کہ صرف آنکھوں کے اندھے نہیں ہیں ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ وَلٰـكِنۡ تَعۡمَى الۡقُلُوۡبُ الَّتِىۡ فِى الصُّدُوۡرِ﴾ [الحج: ۴۶] بلکہ کافر ایسے اندھے ہیں کہ دلوں کے اندھے ہوگئے۔

حجاج اور ایک نجومی:

اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ حجاج بن یوسف کے سامنے ایک نجومی لایا گیا۔ حجاج بن یوسف نے اس کا امتحان لینا چاہا اور کچھ کنکریاں منگوائیں اور ان کو گن کے اپنے ہاتھ میں بند کرلیا اور نجومی کو کہا کہ بتاؤ میرے ہاتھ میں کتنی کنکریاں ہیں؟ نجومی نے ضرب تقسیم کی اور اس کے بعد اس نے کہا کہ آپ کے ہاتھ میں بیس کنکریاں ہیں۔ اب حجاج بن یوسف نے کھولا اس نے بالکل صحیح بتلادیا۔ حجاج بڑا پریشان ہوا کہ یہ نجومی تو بڑا عجیب ہے!! اس نے تو بتلادیا کہ میرے ہاتھ میں بیس کنکریاں ہیں۔ حجاج نے اسے کہا کہ باہر جاؤ۔ جب وہ باہر چلا گیا تو حجاج نے کنکریوں کی ایک مٹھی بھرلی اور کہا کہ اس کو بلاؤ اور کہا کہ اب حساب کر کے بتلاؤ میرے ہاتھ میں کتنی کنکریاں ہیں؟ اس نے حساب کیا اور کہا کہ پچیس ہیں۔ حجاج نے کہا غلط ہے۔ اس نے پھر حساب کیا اور کہا بیس ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ بھی غلط ہیں تو اس نے پھر حساب کیا، کہا: اٹھارہ ہیں۔ حجاج نے کہا غلط ہے۔ نجومی نے کہا کہ اچھا حجاج! ایک بات بتاؤ کہ جو تمہارے ہاتھ میں ہیں، تمہیں بھی پتہ ہے کہ وہ کتنی ہیں؟ حجاج نے کہا کہ مجھے پتہ نہیں ہے۔ تو اس نے کہا کہ بس یہی بات ہے۔ پہلے جو تیرے ہاتھ میں تھیں وہ تم نے گن کر رکھی تھیں، میرے حساب میں وہ بات آگئی۔ ان کا تمہیں پتہ نہیں، یہ تو علم غیب ہے تو میں علم غیب کو کیسے بتلاسکتا ہوں؟ اس عدد کا چونکہ تمہیں علم تھا تو میں نے حساب سے وہ عدد

نکال لیا، لیکن اس کا تمہیں بھی علم نہیں ہے، اس کو اللہ کے سوا کوئی جان بھی نہیں سکتا ہے۔

اس لیے کبھی کسی عدد کا بتلا دینا وہ حساب سے بھی ہو سکتا ہے، کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہوتی۔ لوگوں نے آج کل اس کو کرامت سمجھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نے پھونک ماری تو آنکھ نکل آئی۔ یہ تو جادوگر بھی کر سکتا ہے۔ اس نے کہا: ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ایسے عاشق ہیں کہ آگ پر چلتے ہیں۔ تو آگ پر چلنا کوئی ولایت ہے یا یہ جہنمیوں کی علامت ہے؟ آگ میں جہنمی جلیں گے یا مومن جلیں گے؟ اللہ تعالیٰ آگ سے مسلمانوں کو بچالے، اللہ تعالیٰ جہنم کے انگاروں سے مسلمانوں کو بچالے۔ وہ تو اللہ نے دنیا میں دکھلا دیا کہ اگر صحابہ کی دشمنی کرو گے تو دنیا میں بھی یہی ہے اور آخرت میں بھی یہی ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے ایک فیصلہ فرما دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں جو جادوگر آئے تھے انہوں نے رسیوں کے سانپ بنا دیے تھے تو کیا وہ سارے بزرگ تھے؟ اصل جب بزرگی کا امتحان کرنا ہو تو اس کو سنت کی عینک سے دیکھو کہ وہ غلامِ مصطفیٰ ہے؟ اگر وہ سنت کا متوالا ہے تو ہمارا مرشد ہے، ہمارا پیر ہے، ہمارا بزرگ ہے اور ہمارا سردار اور ہمارے سروں کا تاج ہے۔ اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا مخالف ہے تو دجال تو ہو سکتا ہے، وہ گمراہ تو ہو سکتا ہے، مرشد نہیں ہو سکتا۔ مرشد کا معنی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں چلنے والا، سر سے لے کر پیروں تک کا نقشہ اتباع محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا متوالا ہو اور اسی کا راستہ بتاتا ہو۔

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ [البقرۃ:۱۷]

یہ مثال ان منافقوں کی ہے جنہوں نے گمراہی کو محبوب رکھا ہدایت کو چھوڑ کر، یعنی اندھیرے کو محبوب رکھا روشنی کو چھوڑ کر اور سیدھے راستہ کو چھوڑ کر گمراہی کو محبوب رکھا۔ اس مثال میں یہ بات دلالت کرتی ہے کہ وہ ایمان لے آئے اور اس کے بعد کفر کیا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کو امام رازی رحمہ اللہ نے حضرت سدی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے اور فرمایا کہ یہ تشبیہ بہت زبردست مناسب ہے، کیونکہ انہوں نے ایمان کے ساتھ نور کی روشنی حاصل کی، لیکن اپنے نفاق کی وجہ سے پھر اندھیرے میں آ گئے۔ اب وہ ایک زبردست حیرت اور پریشانی میں ہیں۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا: فرق یہ ہوا کہ وہ ایمان تو لائے، کلمہ بھی پڑھا، لیکن نفاق اختیار کیا تو کلمہ کی وجہ سے جو روشنی ملی تھی وہ ختم ہو گئی۔ لیکن ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انہوں نے تو کلمہ پڑھا ہی نہیں، وہ تو ایمان لائے ہی نہیں، کیونکہ قرآن مقدس میں یہ موجود ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ [البقرۃ:۸]

تو اللہ تعالیٰ نے یہ مثال بیان کی ہے ان کے کفر اور نفاق کے عالم میں۔ پہلے گزر چکا ہے کہ اس بات میں دونوں قول جمع ہو جاتے ہیں۔ [ابن کثیر:۱/ ۵۳، الآیۃ: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا]

منافقین کو قیامت کے دن نور کی تلاش:

حدیث مبارک میں آیا ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ بعض لوگوں کا نورِ ایمان قیامت والے دن ایسے ہوگا کہ زمین سے لے کر آسمان تک نور کی شعائیں ہوں گی، بعض لوگوں کا نور ایسے اونچا ہوگا جیسے مسجد کے مینار اونچے ہیں، بعض لوگوں کا نورِ ایمان ایسے ہوگا جیسے کھجور کا درخت ہوتا ہے اور بعض لوگوں کا نورِ ایمان ان کے قد و قامت کے برابر ہوگا۔ اور ادنیٰ مومن جو کم درجے کا ایمان والا ہوگا اس کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے کے آگے روشنی ہوگی۔ یعنی وہ بھی آہستہ آہستہ راستہ پکڑے گا۔ اور اسی روشنی میں آ کر وہ پل صراط سے گزریں گے، اور منافقین کو بھی وہاں نور ملے گا، لیکن وہ نور ایسے ہوگا کہ وہ مسلمانوں کی روشنی میں آنا چاہیں گے۔ وہ کہیں گے: ٹھہرو بھائی ٹھہرو!

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾

[الحدید:۱۳]

ہم تمہاری روشنی سے کچھ لینا چاہتے ہیں تو ان کو حکم ہوگا کہ تم پیچھے لوٹ جاؤ اور تم وہاں سے جا کر نور لے آؤ۔
مفسرین نے فرمایا کہ پیچھے لوٹنے کا معنی ہے کہ جو جگہ معین تھی، جہاں سے سب کو نور ملنا شروع ہوا تم بھی وہاں سے جا کر لے آؤ۔

اب مفسر فرماتے ہیں کہ کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ جماعت کا ذکر کر کے ان کو واحد سے تشبیہ دی جاتی ہے، جیسے فرمایا:

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ﴾ [البقرۃ:۱۷]

ان کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص نے آگ جلائی۔ لہٰذا کبھی جماعت کو تشبیہ ایک سے بھی دے دی جاتی ہے۔
اور دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ⑲﴾ [الاحزاب:۱۹]

منافق آپ کی طرف ایسے دیکھتے ہیں یعنی آنکھیں پھیرتے ہیں جیسے ایک مرنے والے کی آنکھیں پھری ہوئی ہیں کہ منافقوں کو ہر وقت خوف تھا کہ ابھی ہمارا راز کھل جائے گا...... ابھی ہمارا راز کھل جائے گا۔

اس آیت میں بھی ﴿يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ﴾ جمع کا صیغہ آیا، لیکن تشبیہ ایک سے ہے ﴿كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ﴾

بعض علماء نے فرمایا ''مَثَلُهُمْ'' کا معنی ہے کہ ان کا قصہ ایسے ہے جیسے اس آگ والے کا قصہ اور آگ جلانے والا تو ایک ہوتا ہے۔

بعض نے فرمایا کہ آگ جلانے والا ایک ہوتا ہے، لیکن وہ ساری جماعت کے کام آتی ہے، اس لیے ایک سے تشبیہ دی گئی۔ بعض نے فرمایا کہ یہاں ''اَلَّذِیْ'' ''اَلَّذِیْنَ'' کے معنی میں ہے، کیونکہ پہلے ''مَثَلُهُمْ'' ہے اور وہ جمع ہے، اس لیے آگے ''اَلَّذِیْ'' ''اَلَّذِیْنَ'' کے معنی میں ہے۔

ان آیات میں پہلے جمع کا صیغہ ہے پھر مفرد کا صیغہ ہے اور آگے پھر جمع کا صیغہ ہے: ﴿فَلَمَّآ اَضَاۗءَتْ مَا حَوْلَهٗ﴾ مفرد ہے۔ ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ﴾ ﴿فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ⑰﴾ جمع کا صیغہ ہے۔ [ابن کثیر:۱/ ۵۳، الآیۃ: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا]

منافق کون سے اندھیروں میں ہیں؟

﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ⑱﴾ [البقرۃ:۱۸] جمع ہے۔ یہ کلام کی بلاغت اور فصاحت ہے۔ ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ﴾ [البقرۃ:۱۷] اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ گیا اور وہ اندھیرے: کفر، نفاق اور شک کے اندھیرے ہیں۔ ﴿لَّا يُبْصِرُوْنَ ⑰﴾ [البقرۃ:۱۷] یعنی وہ خیر کے راستے کی طرف ہدایت نہیں پا سکتے۔ اور اس کے بعد حالت یہ ہے ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ⑱﴾ [البقرۃ:۱۸] حضرت سدی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ قول نقل کیا ہے ﴿فَلَمَّآ اَضَاۗءَتْ مَا حَوْلَهٗ﴾ سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا کہ جب

حضور ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہود کے کچھ لوگ اسلام میں داخل ہو گئے، پھر انہوں نے منافقت اختیار کی۔ان کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی آدمی اندھیرے میں ہو ﴿اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ آگ روشن کرے ﴿فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ﴾ پھر اس آگ کی روشنی کے اندر اس کو واضح ہو جائے کہ یہاں کانٹا ہے، یہاں گندگی ہے۔اب اس نے جب دیکھ لیا اور پہلے وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کن چیزوں سے بچنا ہے اور کیسے جانا ہے کہ وہ آگ بجھ گئی۔تو اب اندھا ہو کر بیٹھ گیا کہ کیسے گزروں اور کس راستہ سے گزروں؟ تو یہ اس منافق کی مثال ہے جو پہلے شرک میں مبتلا تھا، پھر اسلام لے آیا، پھر اس نے پہچان لیا کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے؟ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ ﴿ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ﴾ نور سے مراد ان کا ایمان ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایمان نور ہے۔

[ابن کثیر: ۱ / ۵۳، الآیۃ: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ...]

ایمان کے نور سے کیا نظر آتا ہے؟

نور کا معنی تھا کہ خود بھی روشن ہو اور ارد گرد کو بھی روشن کر دے۔تو جن لوگوں کو اللہ نے نورِ ایمان سے منور کیا ہے ان کو پتہ ہے کہ ہم نے اللہ کی عبادت کرنی ہے، اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنا ہے، اولیاء اللہ کی کرامت اور ولایت کا اقرار کرنا ہے اور یہ چیزیں ہمارے لیے حلال ہیں اور یہ چیزیں ہمارے لیے حرام ہیں۔ان کے لیے اب روشنی ہو گئی۔

دیکھیں کہ انسان اپنی عقل سے تو کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا، کیونکہ عقل ناقص ہے۔اگر کوئی آدمی عقل سے فیصلہ کرتا تو اس کے لیے بھی بہن حلال ہوتی اور دوسرے کی لڑکی حرام ہوتی، کیونکہ وہ اس کا اپنا خون ہے، اپنے گھر میں پیدا ہوئی ہے، اپنے گھر میں جوان ہوئی ہے، اس کی شرافت کا اور اس کی پاکی کا اس کو پتہ ہے۔لیکن اسلام نے بہن سے نکاح کو حرام کیا اور دوسری عورت کو حلال کیا۔اب یہ چیزیں اس کو اسلام میں ہی سمجھ آ سکتی ہیں، یہ اس کو اپنی عقل اور فکر سے سمجھ نہیں آ سکتیں۔یہی ہوتی ہے کہ جب آدمی کو نورِ ایمان نصیب ہو جاتا ہے تو آدمی گمراہیوں سے اور اندھیروں سے بچ جاتا ہے۔جب نورِ ایمان چھن جاتا ہے تو اب وہ اندھیرے میں دھکے کھا رہا ہے، کبھی کچھ کر رہا ہے اور کبھی کچھ کر رہا ہے۔

دیکھیں! ایک آدمی عمرہ کرنے کے لیے آتا ہے۔اگر اس کو عمرہ کے مسائل کا پتہ ہو تو گویا وہ روشنی میں ہے۔

منافق کی حالت:

عطاء الخراسانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ منافق کی مثال ایسے ہے کہ جیسے ایک آدمی دیکھتا ہے اور پھر رک جاتا ہے، پھر

دیکھتا ہے اور پھر رک جاتا ہے۔ منافق کو بھی کبھی نظر آتا ہے کہ اسلام تو سچا ہے، ان کی بات تو ٹھیک ہے، اللہ کا نبی سچا ہے، لیکن پھر اس پر دل کا اندھا پن غالب آجاتا ہے تو جیسے آگ والے روشنی نظر آئی اور کبھی نظر نہ آئی۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نور سے مراد یہ ہے کہ جب انہوں نے کلمہ پڑھا "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" تو اب مسلمانوں کے ساتھ تمام معاملات میں شریک ہو گئے، لیکن جب مرے تو کفر پر مرے۔

حضرت سعید رحمہ اللہ نے ابو قتادہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اس طرح سے اس کا خون بھی بچ گیا اور مال بھی بچ گیا۔ مسلمانوں نے سمجھا کہ ہمارا مسلمان ہے۔ جب موت کا وقت آیا تو نور ایمان چھن گیا، کیونکہ ان کے دلوں میں کوئی ایمان کی حقیقت نہیں تھی۔ اندھیرے کا معنی ہے کہ اللہ نے ان کو عذاب میں ڈالا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے حق کو دیکھا تو ظلمت اور کفر سے نکل آئے اور کلمہ پڑھ لیا، لیکن اپنے نفاق کی وجہ سے انہی کفر کے اندھیروں میں آگئے اور ان کو ہدایت و حق کا راستہ نظر نہیں آتا۔

حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اندھیرے سے مراد ان کا نفاق ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٰتٍ﴾ کا معنی یہ ہے کہ منافق جب مرتا ہے تو اس کے اعمال کا اندھیرا اور اس کے کفر و نفاق کا اندھیرا ہوتا ہے، کیونکہ اس کا کوئی اچھا عمل تو ہے ہی نہیں جو اس کے کام آسکے، یا اس کے کلمہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کی تصدیق کر سکے۔ تو فرمایا ﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۸] وہ اسلام کی طرف لوٹ نہیں سکتے۔

اور حضرت ابو قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ کہ اب نہ تو وہ توبہ کریں گے اور نہ اسلام کی طرف لوٹیں گے، بلکہ وہ کفر کے اندھیروں میں مرجائیں گے۔

[ابن کثیر: ۱/ ۵۴، الآیۃ: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا]



أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ أَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۗ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ⑲ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۗ كُلَّمَآ أَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيهِ ۙ وَإِذَآ أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۗ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑳

یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے بادل سے زور سے مینہ پڑ رہا ہو، اس میں اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی ہے۔ یہ کڑک کے مارے زور سے موت کے ڈر سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دیتے ہیں۔ اور اللہ کافروں کو گھیرنے والا ہے۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں اچک لے۔ جب وہ ان پر چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں بھی چھین لے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

منافقین کے لیے دوسری مثال:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات مبارکہ میں بھی ایک مثال ذکر فرمائی ہے جو منافقین کے احوال کے متعلق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں منافقین کے لیے دو مثالیں ذکر فرمائیں ...... کیونکہ مثال کے ذریعہ بات کا سمجھنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔...... ایک مثال کا تعلق نار سے ہے اور ایک مثال کا تعلق پانی سے ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک مثال کا تعلق زمین سے ہے اور ایک مثال کا تعلق آسمان سے ہے۔ پہلی مثال گزر چکی ہے، اب اللہ تعالیٰ دوسری مثال بیان فرما رہے ہیں ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ﴾۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یا مثال اس بارش کی یا پانی کی جو آسمان سے ہے۔ "صَيِّبٍ" مطر کو، بارش کے پانی کو کہتے ہیں۔ اور "مِنَ السَّمَآءِ" جو آسمان سے اترے۔ ﴿فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ﴾ اور پھر اس بارش میں اندھیرے بھی ہیں، اس بارش میں کڑک بھی ہے اور اس بارش میں بجلی کی چمک بھی ہے۔ ﴿يَجْعَلُوْنَ أَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ﴾ انگلیوں کو کانوں میں ڈالتے ہیں اس کڑک کی وجہ سے، موت کے ڈر سے۔ ﴿وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ⑲﴾ اور اللہ تعالیٰ احاطہ فرمانے والے ہیں کافروں کا۔

اب اللہ تعالیٰ نے یہاں جو مثال دی ہے اس کا تعلق پانی کے ساتھ ہے۔ فرمایا ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ﴾ "أَوْ" کا استعمال شک کے لیے ہوتا ہے۔ تو یہاں کیا شک ہے کہ جس کی وجہ سے یہاں "أَوْ" کا استعمال کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے

کہ ''أوْ'' کا استعمال ہمیشہ شک کے لیے نہیں ہوتا، کبھی کبھی ''أوْ'' بمعنی ''و'' ہوتا ہے۔ جیسا قرآن پاک میں آیا ہے ﴿مِنْ بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ﴾ [النور: ٦١] تو مطلب یہ ہے کہ اپنے گھر سے یا باپ کے گھر سے تو وہاں بھی ''أوْ'' بمعنی ''و'' ہے، جیسے فرمایا ﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ [البقرۃ: ٧٤]۔ اور کبھی برابری کے لیے ہوتا ہے، جیسا کہ محاوراتِ عرب میں کہتے ہیں ''جَالِسِ الْحَسَنَ أَوِ ابْنَ سِيْرِيْنَ'' مطلب یہ ہے کہ حضرت حسن رحمہ اللہ کے درس میں بیٹھو یا ابن سیرین رحمہ اللہ کے درس میں بیٹھو، علم کا فائدہ برابر ملے گا۔ تو یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ﴾ یعنی چاہے پہلی مثال سے منافقوں کو تشبیہ دو یا اس مثال سے منافقوں کو تشبیہ دو، دونوں مثالوں میں سے جو چاہو منطبق کرلو۔

اور تشبیہ کبھی تشبیہ بالمفرد ہوتی ہے اور کبھی تشبیہ بالمرکب ہوتی ہے، یعنی کبھی تو آپ تشبیہ دیں گے ایک کے ساتھ، جیسے محاورات میں کہتے ہیں ''زَيْدٌ كَالْأَسَدِ'' (زید شیر کی طرح ہے) تو اب صرف شیر کی بہادری میں تشبیہ دی ہے کہ زید بہادر ہے، یہ معنی نہیں ہے کہ اس کو شیر سے تشبیہ دی ہے تو اس تشبیہ سے یہ سمجھا جائے کہ وہ حیوان ہے، اس کی چار ٹانگیں ہیں اور یہ بھی لوگوں کو کھا جاتا ہے۔ تو یہ تشبیہ اس کی تمام صفات سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کی کسی ایک چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/٥٦، الآیۃ: أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ]

مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ کا واقعہ:

جیسے حضرت ہزاروی صاحب رحمہ اللہ ...... اللہ ان کی قبر پر رحمت فرمائے! پرانی بات ہے...... ایک جلسہ میں تشریف لے آئے...... ہمارے علاقوں میں پہلے تعارف کرانے کا رواج ہوتا ہے کہ کون صاحب تقریر کریں گے؟...... جس آدمی نے تعارف کرایا تو اس نے کہا کہ...... ماشاء اللہ...... اب آپ حضرات کے سامنے مجاہدِ ملت اور شیرِ سرحد ہزاروی صاحب تقریر فرمائیں گے۔ چنانچہ جب وہ سٹیج پر تقریر کے لیے تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ عجیب بات ہے کہ اس نے تعارف کرایا کہ مجاہدِ ملت۔ ملت کا مجاہد اور میں نے تو کبھی مکھی بھی نہیں ماری تو میں کیسے مجاہد بن گیا؟ مجاہد تو وہ ہوتا ہے جس نے کبھی جہاد کیا ہو۔ تو ایسے تشبیہ دینا اور بلاوجہ مجاہد بنا دینا، حالانکہ میں نے کبھی جہاد ہی نہیں کیا۔ ہاں! جہاد باللسان تو علیحدہ بات ہے۔ اور انہوں نے کہا کہ اس نے میری دوسری تعریف کی ہے کہ میں سرحد کا شیر ہوں۔ اللہ نے مجھے انسان بنایا ہے اور اس شریف آدمی نے مجھے حیوان بنا دیا، حالانکہ ایک حیوان کا

انسان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝﴾ [التین: ۴]

اللہ نے سب سے احسن طریق پر جس کو پیدا فرمایا وہ انسان کو پیدا کیا ہے اور پھر انسان ایک ایسی چیز ہے جو اشرف المخلوقات ہے اور اس سے نکال کر آدمی کسی کو جنگل کا شیر بنا دے تو مجھے سمجھ نہیں آیا کہ انہوں نے میری تعریف کی ہے یا انہوں نے میری شکایت کی ہے؟

بڑوں کی شان اور بڑوں کے لیے طرزِ تخاطب:

اس لیے ہمیشہ ایک حد ہونی چاہیے کہ جو حدود ہیں اور جو صفات ان میں منطبق ہوتی ہیں اتنی صفات کا اظہار کیا جائے۔ آپ سارے قرآن کو پڑھ لیں اور آپ ساری احادیث مبارکہ کا مطالعہ کر لیں، آپ حیران ہوں گے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پیغمبروں سے خطاب فرمایا، حضور ﷺ نے اپنے صحابہ سے خطاب فرمایا، صحابہ ؓ اپنے پاک پیغمبر، خاتم الانبیاء، حبیب کبریا ﷺ سے مخاطب ہوئے، حالانکہ تمام کائنات میں حضور ﷺ سے زیادہ شان والا نہ پیدا ہوا اور نہ پیدا ہوگا اور صحابہ آئے اور سلام کیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! فلاں حکم ہمیں بتلا دیں۔ اور نام کے ساتھ ندا کر رہے ہیں۔ اور اسی طرح صحابہ ؓ ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں "مَاذَا رَأْيُكَ؟ يَا عُمَرُ!" (اے عمر! تمہاری اس بات میں کیا رائے ہے؟) عبداللہ! تمہاری اس بات میں کیا رائے ہے؟ "مَاذَا قَالَ عَبْدُاللهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ؟" (عبداللہ بن مسعود کی اس بات میں کیا رائے ہے؟) حالانکہ وہ اتنے بڑے شان والے لوگ ہیں کہ ساری دنیا کے اولیاء ایک پلڑے میں رکھ دیں اور میری مدنی کا کوئی ایک صحابی ایک پلڑے میں رکھ دیں تو ایک صحابی بھاری ہو جائے گا، ساری دنیا کے اولیاء مل کر بھی ایک صحابی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعود ؓ ایک کھجور پر چڑھنے لگے۔ میرے آقا سرکارِ مدینہ ﷺ بھی موجود تھے، صحابہ ؓ بھی موجود تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کی پنڈلیاں مبارک بڑی پتلی تھیں۔ ایک صحابی نے جب دیکھا، اس کو پنڈلیاں نظر آئیں تو وہ ذرا مسکرا دیئے۔ حضور پاک ﷺ نے اس صحابی کو دیکھ کر فرمایا:

((تَعْجَبُوْنَ مِنْ دِقَّةِ سَاقَيْهِ!؟))

''اچھا! عبداللہ بن مسعود کی پتلی پنڈلیاں دیکھ کر ہنس رہے ہو!!''
تمہیں پتہ ہے کہ یہ پنڈلی اگر قیامت والے دن ایک پلڑے میں رکھی جائے تو ساری دنیا سے بھاری ہو جائے۔

[دلائل النبوۃ: ۲/۲۹۹]

اتنا بڑی شان ہے اور اتنی بڑی عظمت ہے، لیکن القاب کی ایک حد ہے۔ یہی مصیبت اور مشکل ہے جب ہم لوگ حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے عقیدے برباد ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے! اب دیکھیں کہ نعرے آ گئے، پہلے صرف اللہ کی عظمت کا نعرہ تھا، پھر حضور ﷺ کا نعرہ آ گیا، اس کے بعد لوگوں نے پیر کا بھی نعرہ بنا لیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی نعرہ بن گیا۔ اگر وہی عظمت جو اللہ کی ہے اس کو غیر اللہ میں ثابت کیا جائے تو شرک ہے۔ اور شرک کا معنیٰ یہی ہوتا ہے کہ جو صفات میرے اللہ کی ہیں اگر ان صفتوں کو کسی دوسرے میں عقیدہ کے طور پر رکھیں تو مشرک بن گیا۔ مثال کے طور پر: ہم اللہ اکبر سے، نعرہ تکبیر سے اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں تو اس کے مقابلہ پر کوئی دوسرا نعرہ لے کر آئے، چاہے جبرئیل علیہ السلام کا لگا لیں، یا میکائیل علیہ السلام کا لگا لیں، چاہے اللہ کے رسول ﷺ کا لگا لیں، چاہے دستگیر کا لگا لیں، چاہے حضرت علی حیدر کرار رضی اللہ عنہ کا لگا لیں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ قوم شرک میں مبتلا ہو جائے گی۔ اور ایک کافر جب یہ نعرے سنے گا تو وہ سمجھے گا کہ ان کے چار پانچ خدا ضرور ہیں، ایک ہوتا تو صرف اسی کا نام بلند کرتے۔ اب ایک کا نام بلند کیا، پھر دوسرے کا کیا، پھر تیسرے کا کیا، پھر چوتھے کا کیا ہے اور پھر پانچویں کا کیا ہے۔ اس کافر کو تو پتہ نہیں کہ یہ تو نعرے ہیں، وہ تو یہی سمجھے گا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ ''اَوْ'' بمعنیٰ ''بَلْ'' ہوتا ہے۔ اور ''بَلْ'' کا استعمال اضراب انتقالی کے لیے ہوتا ہے کہ ایک مضمون سے آدمی دوسرے مضمون کی طرف منتقل ہو تو وہاں ''بَلْ'' کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ [البقرۃ: ۱۷]

﴿أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ﴾ [البقرۃ: ۱۹]

''یا ان کی مثال جیسے بارش برسے آسمان سے۔''

[تفسیر الرازی: ۲/۷۱، الآیۃ: أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ]

علمی نکتہ:

بارش تو ہوتی ہی آسمانوں سے ہے تو اس لیے ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ﴾ کافی تھا یہاں ﴿مِّنَ السَّمَاءِ﴾ کا لفظ کیوں بڑھایا

گیا؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو علماء نے جواب دیا ہے کہ اگر لفظ ہوتا ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ﴾ تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی ایک جانب سے بارش ہو اور دوسری جانب سے بارش نہ ہو تو جب آسمان کی قید ساتھ لگا دی گئی تو گویا ایسی بارش ہے جس نے پورے افق کو چھپا لیا ہے، پورا آسمان چھلنی ہو کر برس رہا ہو۔ اب ایسی شدید بارش ہو تو اس کا کیا عالم ہوگا......؟ اور دوسری بات یہ ہے کہ بارش کی بھی انواع واقسام ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ چاہتیں ہیں تو کبھی آسمانوں سے سیدھی بارش برساتے ہیں۔ اور جب پانی سیدھا آسمانوں سے برسے تو وہ کیسے شدید ہوگا؟ اس لیے فرمایا:

﴿أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ﴾ [البقرۃ:۱۹]

جب وہ پانی برستا ہے تو اس میں اندھیرے ہوتے ہیں۔ ایک تو کبھی رات کو بارش برسے تو رات کا بھی اندھیرا۔ "ظُلُمَاتٌ" جمع ہے۔

اصلاحِ عقیدہ:

جیسے اللہ نے حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ أَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا أَنتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ [الانبیاء:۸۷]

حضرت یونس علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ اس نے مجھے اندھیروں میں پکارا۔ تو اس نے کس کو پکارا؟ نبی کس کو پکارتے ہیں؟...... یا علی مشکل کشا! یا حیدر کرار! یا پیر دستگیر! یا آدم! یا نوح! نہیں پکارا، کیونکہ تم سے مسئلہ نہیں سیکھا ہوگا۔ تمہارے علاقے میں آتے تو تم سمجھا دیتے کہ پکارنا تو ان کو ہوتا ہے، آپ خوامخواہ اللہ کو پکار رہے ہیں...... نعوذ باللہ...... اللہ تو چھٹی پر ہیں، سارے اختیارات ان قلندروں کے پاس ہیں، سارے اختیارات ان پیروں کے پاس ہیں، سارے اختیارات ان بزرگوں کے پاس ہیں اور کچھ زندوں کے پاس ہیں اور کچھ مردوں کے پاس ہیں...... إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ...... اور پھر کلمہ بھی پڑھتے ہیں، آیت کریمہ کے لکھ پڑھواتے ہیں کہ جی! آج ہم نے آیت کریمہ کا لاکھ پڑھوانا ہے۔ تم لاکھ پڑھاؤ، کروڑ پڑھاؤ، قبر پر سجدہ کر رہے ہو تو پڑھنے کا فائدہ کیا ہے؟ جب تم غیر اللہ کو پکار رہے ہو تو پھر آیت کریمہ کے ورد کا کیا فائدہ ہے؟ آیت کریمہ کا ورد کرتے تو تمہیں سبق ملتا کہ مدد کرنے کے قابل صرف اللہ ہے، پکارنے کے قابل صرف اللہ ہے، ندا صرف اللہ کو کی جاتی ہے، صرف اللہ سے مانگا جاتا ہے اور مصیبتوں سے نکالنے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔ پھر تیرا آیت کریمہ

پڑھنے کا کوئی فائدہ بھی ہوتا کہ ﴿لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ بھی پڑھتے رہو اور یا پیر دستگیر! مشکل کشا! یا جیلانی! مدد فرما! بھی پڑھتے رہو تو آپ کا کریہ پڑھنے کا فائدہ کیا ہے؟ پھر وہی عالم ہوگا جیسے منافق کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اللہ مسلمانوں کو صحیح عقیدے نصیب فرمادے، اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمادے۔

قرآن کو پڑھنے کا فائدہ یہ نہیں ہوتا کہ قرآن منتر ہے، یا اشلوک ہے پڑھ لیا، قرآن کو پڑھ لیا تو کوئی تعویذ کے کام آ گیا، قرآن کو لے لیا تو قسم اٹھانے کے کام آ گیا، یا قرآن کو لے کر مرد کے اوپر پھیر کر چار کپڑے دے کر جنت نصیب ہونے کا ذریعہ بن گیا، قرآن اس لیے تو نہیں آیا، قرآن تم نے اس لیے بنا رکھا ہے کہ بس اس کو غلافوں میں لپیٹ کر اوپر رکھ دو۔ قرآن کے ایک ایک حروف میں دعوت ہے، قرآن کے ایک ایک حرف میں موعظت ہے، قرآن کے ایک ایک حرف میں پکار ہے اور قرآن کے ایک ایک حرف میں تمہیں نجات دینے کے راستے ہیں، لیکن اللہ کے قرآن کو سمجھو اور سمجھ کر پڑھو کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ میری بات کو چھوڑو، میری بات غلط ہو سکتی ہے اور مولوی کی بات غلط ہو سکتی ہے، لیکن کلام اللہ یا فرمانِ محمد مصطفیٰ ﷺ تو کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔

تو اب دیکھیں کہ اللہ کا نبی ہے، کس کو پکار رہا ہے؟ ﴿فَنَادٰى فِی الظُّلُمٰتِ﴾ یعنی اس نے ندا کی اور اندھیروں میں اللہ تعالیٰ کو پکارا۔

بارش کی ہولناکیاں:

پھر جب برسات لگا تار شروع ہو جائے تو کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اس کا اپنا بھی ایک اندھیرا ہے، رعد بھی ہے (اور رعد بمعنی کڑک ہے) اور برق: بجلی کوندنے والی، چمکنے والی، جو اتنی تیزی سے چمکتی ہے کہ دنیا کی کوئی بجلی اس کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے؟ اب اس کے اندر: ایک اندھیرے ہوئے، دوسری چیز کڑک اور تیسری چیز بجلی کی چمک ہو گئی۔

معراج کی سواری کا نام براق کیوں؟

اور براق کو برق اسی وجہ سے کہا گیا ہے، جس پر میرے پاک نبی ﷺ اسراء پر تشریف لے گئے تھے۔ تو اس براق کو براق اس لیے کہا گیا کہ جیسے آپ بارش میں بجلی کو دیکھتے ہیں کہ کڑکتی ہے، کیسے چمک آئی اور کیسے روشنی آئی اور کوندی اور لپکی اور گزر گئی۔ اور یہ پتہ ہی نہیں کہ کہاں گئی؟ اس لیے آج نئی تحقیق یہ ہے کہ سب سے تیز رفتار روشنی

ہے، جو اسی ہزار میل ایک سیکنڈ میں طے کر لیتی ہے۔ تو اس براق کو بھی براق کہا گیا، اس کی بھی جہاں نظر پڑتی تھی وہیں قدم رکھتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اتنی سریع رفتار میرے آقا ﷺ کو سواری عطا فرما دی کہ مہینوں کا سفر پل بھر میں طے ہو گیا۔ اور پھر سواری کو بھی میرے پروردگار عالم نے ایسا بنا دیا کہ اگر آگے کوئی اونچائی آ جائے تو اس کی ٹانگیں اس کے مطابق چھوٹی ہو جائیں۔ اگر اسی طرح کوئی چڑھائی پیچھے آ جائے اس کی ٹانگیں اس کے مطابق منقبض ہو جائیں، تا کہ میری مدنی کے توازن میں اور آرام میں کوئی فرق نہ آئے۔ اس لیے اس کو اسی لفظ سے تشبیہ دی گئی۔

تفسیر:

﴿يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ﴾ [البقرۃ:١٩] اور یہ ڈر کے مارے اس کڑک کے خوف سے اپنی انگلیوں کو کانوں میں دے ڈالتے ہیں "حَذَرَ الْمَوْتِ" موت سے بچنے کے لیے کہ کہیں ہم مر نہ جائیں۔ اس آواز سے اصل میں آدمی کانوں میں انگلی کا اگلا حصہ دیتا ہے، ساری انگلی تو نہیں دیتا، لیکن اللہ نے فرمایا: ایسے ڈرے ہوئے ہیں کہ اگلا حصہ نہیں، بلکہ پوری انگلیاں ڈر کے مارے ٹھونس رہے ہیں، لیکن اللہ نے فرمایا کہ یہ اتنے بڑے جاہل ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم کانوں کے اندر انگلیاں دیں گے تو موت سے بچ جائیں گے، حالانکہ ﴿وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ﴾ [البقرۃ:١٩] اللہ نے کافروں کا مکمل احاطہ کیا ہوا ہے کہ وہ جس وقت چاہیں، جب چاہیں عذاب دیں۔ یہ تو صرف اس کڑک سے بچ رہے ہیں، ان کو پتہ نہیں کہ اللہ نے ان کو ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے۔

تو اس آیت مبارکہ میں اللہ نے پانی سے تشبیہ دی ہے اور اسی سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ بارش کے بہت فائدے ہیں، لیکن جہاں فائدے ہیں وہاں اس میں اندھیرے بھی ہیں، وہاں اس میں کڑک بھی ہے، بجلی بھی ہے اور کبھی وہ بجلیاں گر بھی جاتی ہیں۔

تو اللہ نے فرمایا کہ ایمان و قرآن تو بارش ہے، لیکن اس میں کبھی کبھی تکلیفیں بھی آتی ہیں، لیکن مومن ان تکلیفوں پر صبر کرتا ہے اور کافر انہی تکلیفوں کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے اور پھر نفاق اختیار کر لیتا ہے۔ تو ان کو جیسے کلمہ پڑھنے سے ظاہری فائدے تو مل گئے کہ جان اور مال بچ گئے، مال غنیمت میں بھی شریک ہو گئے، جیسا کہ بارش میں فوائد اور منافع بھی ہیں، لیکن ان کے اندر مخاطر اور مہالک بھی ہیں۔ یہ کافر منافق جب ان کو بارش کی طرح ایمان کا فائدہ ہوتا ہے، مال غنیمت ملتا ہے تو کہتے ہیں: ہم مسلمان ہیں اور جب نماز کی پابندی آئے، روزے کی پابندی آئے اور جب جہاد کا حکم آئے تو اب مصیبت پڑتی ہے۔ اسلام کا فائدہ اٹھانے کے لیے یہ سب سے آگے ہیں، لیکن اسلام

میں جو احکامات ہیں کہ نماز روزے کی پابندی، حلال کی پابندی، حرام اور گناہوں سے بچنا، وہ ان کو مصیبت لگتا ہے۔ اس لیے یہ اسلام کو چھوڑ کر نفاق کی طرف بھاگتے ہیں اور ظاہری اسباب کی بنا پر سمجھتے ہیں ﴿يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ﴾ [البقرۃ:۱۹] جیسے کوئی کان میں انگلیاں دے کر اس کڑک اور بجلی سے نہیں بچ سکتا اسی یہ بھی نفاق کر کے اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ ﴿وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ﴾ [البقرۃ:۱۹]

﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ [البقرۃ:۲۰]

فرمایا: وہ بجلی اتنی سخت ہے اور اس کی چمک اتنی زیادہ ہے کہ ان کی آنکھوں کو اچک لے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی سختی اور شدت کو بیان کیا اور پھر منافقین کی کیفیت کو بیان کیا کہ ادھر چمک اتنی سخت ہے اور ادھر ان کا یہ حال ہے ﴿كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ﴾ کہ جب وہ چمک آتی ہے، روشنی ہوتی ہے تو چل پڑتے ہیں، کیونکہ راستہ نظر آنے لگ جاتا ہے اور اس کے بعد جب اندھیرا ہو جاتا ہے تو رک جاتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ ان کی قوتِ باصرہ اور قوتِ سامعہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں اور ان کے دلوں پر مہر کر دیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں، لیکن وہ ان کو ایک اور موقع دیتے ہیں۔ جب چلتے چلتے ان کا نفاق کھلے گا تو عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت بھی آجائے گا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ پہلی مثال اس سے زیادہ سخت تھی، یعنی وہ ان منافقین کے بارے میں تھی جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ﴾ [البقرۃ:۱۷] نور ختم ہو گیا۔ اور یہاں فرمایا ﴿وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ﴾ [البقرۃ:۲۰] لیکن ابھی ختم نہیں کیا اور پہلی مثال میں تھا کہ اللہ نے ان کا نور بالکل زائل کر دیا۔ تو منافقین میں کئی گروہ تھے: بعض منافقین شدید، بعض ان سے اشد تھے، بعض کی حقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے فوراً کھول دی اور اسی وقت دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا اور بعض کو کچھ عرصہ کے لیے مہلت مل گئی اور کچھ عرصہ انہوں نے زندگی گزاری اور انجام کار ان کی دنیا اور آخرت میں رسوائی آئی۔

بعض علاماتِ قیامت کا بیان:

❁......حدیث مبارک میں آتا ہے کہ قیامت سے پہلے ایسا وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ ایک جانور کو نکالیں گے اور

اکثر روایات یہی ہیں کہ یہ اس زمانہ میں ہوگا جب عیسیٰ علیہ السلام ظاہر ہو چکے ہوں گے، چونکہ علامات قیامت بہت ہیں، لیکن کچھ علامات ان میں سے بڑی بڑی ہیں، جنہیں علاماتِ کبریٰ کہا جاتا ہے۔

- ان نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکلے گا۔ اب روزانہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے، لیکن قیامت کے قریب اللہ اس کو حکم دیں گے کہ تم مغرب سے طلوع ہو جاؤ۔
- ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا کہ وہ ایک دیوار کے پیچھے بند ہیں، بالکل نکل آئیں گے۔
- اسی طرح دجال ظاہر ہوگا۔
- اور اسی طرح دخان یعنی ایک دھواں ہوگا۔
- اسی طرح تین مقام پر خسف آئے گا، یعنی ایسا زلزلہ ہوگا کہ پورے کے پورے شہر زمینوں میں دھنس جائیں گے: ایک جانب مشرق میں، ایک مغرب میں اور ایک جزیرۃ العرب میں۔ تو یہ بھی قیامت کی بڑی بڑی علامات سے ہے۔
- اور اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں سے نزول ہوگا۔
- اور اسی طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک جانور نکلے گا اور وہ جانور باتیں کرے گا، یعنی وہ جانور باقاعدہ کلام کرے گا [تفسیر ابن أبی حاتم، حدیث: ۱۵۵۲۷] اور بعض روایات میں آتا ہے کہ اس جانور کے پاس ایک چیز بھی ہوگی کہ وہ آکر مومن کی پیشانی پر لگائے گا تو اس کا چہرہ روشن ہو جائے گا اور کافر کی پیشانی پر نقطہ لگائے گا تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جائے گا۔ اس وقت واضح ہو جائے گا کہ یہ مومن ہیں اور یہ کافر ہیں۔
- اسی طرح حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آگ عدن سے نکلے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر وہ لوگوں کو ہانک کر یعنی چلا چلا کر میدانِ محشر کی طرف لے جائے گی۔ جہاں رات ہوگی، وہ آگ بھی رک جائے گی اور دن ہوگا وہ آگ پھر چلائے گی، حتیٰ کہ میدانِ محشر میں سب کو جمع کر دے گی۔ تو اس وقت تو ایک کیفیت آجائے گی کہ یہ مومن ہے اور یہ کافر ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۹۰۱، باب: فِي الْآيَاتِ الَّتِي تَكُونُ قَبْلَ السَّاعَةِ]

دجال کا فتنہ:

جیسا کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دجال ظاہر ہوگا۔ تو دجال کا بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے دعا سکھلائی کہ آدمی ہمیشہ دعا کرتا رہے نماز میں بھی سلام سے پہلے اور خارج نماز میں بھی:

((اللَّهُمَّ! إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَفِتْنَةِ الْمَمَاتِ.)) [صحیح البخاری، حدیث: ۸۳۲، باب الدعاء قبل السلام]

اور بعض روایات میں اور کچھ الفاظ مبارک زیادہ ہیں:

((اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ.)) [صحیح البخاری، حدیث: ۸۳۲، باب الدعاء قبل السلام]

اور ایک روایت میں آتا ہے:

((وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّيْنِ وَ قَهْرِ الرِّجَالِ)) [سنن أبی داود، حدیث: ۱۵۵۵، باب فی الاستعاذۃ]

بہر حال حضور ﷺ نے فرمایا: دجال کے فتنہ سے پناہ مانگا کرو، کیونکہ وہ اتنا بڑا فتنہ ہوگا کہ لاکھوں لوگ گمراہی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ لاکھوں لوگ دجال کی استدراجی قوتوں کو دیکھ کر گمراہ ہو جائیں گے، کیونکہ اس کو اللہ نے ایسی قوتیں دی ہوں گی کہ وہ زمینوں کو حکم دے گا کہ خزانے باہر نکالو تو وہ سونا چاندی باہر نکال دے گی، وہ شہروں کو حکم دے گا کہ چل پڑو تو وہ چل پڑیں گی اور وہ مردے کو حکم دے گا تو وہ کھڑا ہو جائے گا۔ لوگ جب ایسی چیزیں دیکھتے ہیں تو ایمان والے لوگ قابو رہتے ہیں، ورنہ ہر آدمی ایسے شعبدہ بازوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ دجال تو سب سے بڑا فتنہ ہے، جس سے ہمیں حضور ﷺ نے پناہ مانگنا سکھایا اور باقی تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی۔

حضور ﷺ نے فرمایا: اس دجال کی پیشانی پر اس کی دو آنکھیں کے درمیان ک، ف، ر لکھا ہوا ہوگا۔ یعنی کافر لکھا ہوا ہوگا، لیکن اس کو نہیں پڑھ سکے گا، مگر وہ جو ایمان والا ہے۔ جو ایمان والا ہے وہ خود دیکھ لے گا کہ یہ کافر ہے، ہم اس کی کیا باتیں مانیں؟ یہ تو خود دجال ہے۔ دجالی فتنہ سے بچنے کے لیے مومن تو پڑھ سکے گا، لیکن ہر آدمی نہیں پڑھ سکے گا۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۹۳۳، باب: ذکر الدجال وصفته]

علامات سے چیزوں کی پہچان:

تو اس لیے علماء نے فرمایا کہ اب ہم ہر چیز کو علامات سے پہچانیں گے۔ جیسے مسجد کا مینار دور سے نظر آئے تو ہم پہچان لیتے ہیں کہ یہ مسجد ہے اور اگر کسی مسجد پر مثال کے طور پر چار مینار بنے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ بھی ایک علامت ہوتی ہے کہ یہ اہل سنت والجماعت اور چار یاروں کو ماننے والے لوگ ہیں، کبھی کبھی مساجد پر ایک مینار کی علامت

ہوتی ہے کہ یہ موحد لوگ ہیں، اللہ کی توحید کے قائل ہیں۔ اسی طریقہ سے کسی جگہ محراب دیکھتے ہیں تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ عام کوٹھا نہیں، بلکہ یہ اللہ کا گھر ہے، مسجد ہے، ہم نے یہاں نماز پڑھنی ہے اور قبلہ کا رخ اسی طرف ہے۔

جیسا کہ کوئی آدمی تارہ دیکھ کر اندازہ لگا لیتا ہے کہ فجر کاذب ہے یا صبح صادق ہے۔ یا جیسے کوئی آدمی تارا دیکھ کر قطب کا فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں اس وقت شمال میں ہوں یا جنوب میں ہوں۔ اسی طرح ہم لوگوں کے اقوال کو، افعال کو اور کردار کو سامنے رکھ کر ایک اندازہ لگا سکیں گے کہ اس آدمی کے اعمال ایمان والوں کی طرح ہیں، اس آدمی کے اعمال کفر والوں کی طرح ہیں، اس آدمی کے اعمال منافقوں جیسے ہیں، اس آدمی کے اعمال زندیقوں جیسے ہیں اور اس آدمی کے اعمال ملحدوں جیسے ہیں۔ تو وہ اپنی اپنی نشانیوں سے اور علامات سے پہچانا جائے گا۔

دنیا میں کوئی ایسا آدمی ہے جو حضور ﷺ سے محبت کا دعویٰ نہ کرے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اچھا حضور ﷺ کے نام کو چومنا ہو تو چوم لے گا، اسی چومنے والے سے کہو کہ حضور مبارک ﷺ نے داڑھی مبارک بھی رکھی ہے تو وہ کہے گا: دعا کریں! بھائی! روٹی کے لیے کبھی تم نے دعا کرائی ہے کہ میں روٹی کھالوں اور پانی پی لوں۔ تو جب حضور ﷺ کا نام چوم رہے ہو تو حضور ﷺ کی سنت مبارک پر استرہ پھیر کر گندی نالیوں میں بہار ہے ہو، تمہیں اللہ کا خوف نہیں آتا کہ اگر قیامت کے دن حضور ﷺ نے پوچھا: او میرے عشق کا دعویٰ کرنے والو! تم نے میری سنت کو گندی نالیوں میں بہایا، کس منہ سے میرے پاس شفاعت کے لیے آئے ہو؟ دفعہ ہو جاؤ مجھ سے۔ تو اس وقت ہمارے پاس کوئی جواب ہوگا؟ یعنی ایک سنتِ رسول رکھنی ہے تو بیوی ناراض ہوتی ہے، داڑھی رکھنی ہے تو لوگ سمجھیں گے کہ ملا بن گیا، داڑی رکھ لوں گا تو لوگ سمجھیں گے کہ ساٹھ سال کا بوڑھا نظر آتا ہے اور اگر استرہ پھراؤں گا تو میں جوان نظر آؤں گا۔

یعنی آپ اندازہ فرمائیں کہ نفاق کس کو کہتے ہیں؟ آدمی دعویٰ تو کرے کہ...... سبحان اللہ...... جی اللہ نے اپنا گھر دکھا دیا اور جب نماز کے بعد جنازہ آتا ہے تو چھپ جاتا ہے کہ لوگ تو مر رہے ہیں، تمہیں اللہ نے گھر دکھا دیا ہے، تمہیں اللہ مکہ میں موت دے دے...... الحمد للہ...... ہمیں یہاں موت دے دے اور کیا چاہیے؟ دنیا میں ہم نے آخر ایک دن مرنا تو ہے۔ اگر ہم ایسی جگہ مر گئے جہاں غلط عقیدہ والے نے ہمارا جنازہ پڑھایا تو کیا فائدہ ہوگا؟ یہ کتنا ہمارا نصیب ہوگا کہ کعبہ کے سامنے ہمارا جنازہ رکھا ہو اور موحد نماز پڑھا رہا ہو، جس کا اللہ کی توحید کے ساتھ تعلق ہو، اللہ کی نبی ﷺ کی سنت کے ساتھ تعلق ہو، بدعت کے قریب جانے والا نہ ہو اور لاکھوں آدمی پیچھے کھڑے ہوں

((اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَ مَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا)) تو کیا اللہ ان سب مانگنے والوں کو ٹھکرا دیں گے؟ اتنے ہاتھ پھیلائے ہوئے جو رو رہے ہوں گے، کیا ان سب کو اللہ کہیں گے کہ بھاگ جاؤ؟

اسلام بطورِ دین و مذہب:

علماء نے کہا کہ آج وہی عالم ہو گیا ہے، یعنی آپ اسلام کے بڑے بڑے ملکوں میں چلے جائیں، اسلام کے ٹھیکیدار کے پاس چلے جائیں، وہ اسلام کو مذہب ماننے کے لیے تیار ہیں، لیکن دین ماننے کے لیے تیار نہیں۔

ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں! وہ اسلام کو مذہب مانتے ہیں کہ آپ نماز پڑھیں، آپ روزہ رکھیں، آپ مسجدیں بنوائیں، آپ تراویح پڑھیں، آپ عیدیں پڑھیں، آپ جمعہ پڑھیں اور آپ قرآن کے مدارس کھولیں اسی کا نام اسلام ہے۔ ہر ملک یہ کہے گا کہ اس سے بڑا اسلام اور کیا ہوتا ہے؟ ہم حاجیوں کو چڑھا رہے ہیں، نمازیں پڑھی جا رہی ہیں، مسجدیں آباد ہیں، یعنی اسلام کو مذہب تسلیم کیا ہے، لیکن دین ماننے کے لیے تیار نہیں۔ خدا کے بندے! مسجدیں تو کافروں کے ملک میں بھی ہیں، مسجدیں تو عیسائیوں کے ملک میں بھی ہیں اور مسجدیں تو یہودیوں کے ملک میں بھی ہیں، نمازیں تو وہاں بھی پڑھی جاتی ہیں، روزے تو وہاں بھی رکھے جاتے ہیں، عید کی نمازیں تو وہاں بھی پڑھی جاتی ہیں۔ اسلام کا معنی تو یہ ہے کہ تم قرآن وسنت کے قانون کو لاگو کر دو، اللہ کی حدود کو نافذ کر دو۔ اللہ نے جس چیز کو حلال فرمایا ہے حلال کہو اور جس کو حرام کہا ہے حرام کہہ دو، نفع نقصان کو بالکل نہ سوچو، وہ اللہ پر چھوڑ دو کہ اگر آج ہم نے سود نہ لیا تو اربوں ڈالر تباہ ہو جائیں گے، قرضے کہاں سے ادا کریں گے؟ اللہ نے فرمایا: یاد رکھو!

﴿وَلَوْاَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓي اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [الاعراف:٩٦]

اے بستی والو! ایمان لا کر میرے قانون کو چلاؤ، میں آسمان وزمین کے خزانے تم پر کھول دوں گا۔

دینے والا تو خدا ہے، بندے ہمیں کیسے دے سکتے ہیں؟ کیا بندے ہماری محنت مشقت پوری کر سکتے ہیں؟ اللہ کا وعدہ ہے کہ اگر بستی والے ایمان لائیں، اللہ سے ڈر کر اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہوں تو ہم آسمان اور زمین کے دروازے کھول دیں گے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت:

آپ نے دیکھا نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک ایک کھجور پر چوبیس چوبیس گھنٹے زندگی گزارنے والے، اصحاب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہ بوریا نشین جن کے پاس پہننے کے لیے کپڑا نہیں تھا، بوریوں کے جبّوں نے لباس بنائے ہوئے تھے، وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جن کے پاس بچھانے کے لیے بستر نہیں تھا، جن کے پاس چلنے کے لیے کاریں نہیں تھیں، مدینہ منورہ سے نکلے اور کسریٰ وقیصر کی دیواروں کو ہلا ڈالا اور چین اور اندلس تک اور دنیا کے کونے کونے تک اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے۔

مسلمانوں کی بے بسی:

آج ہم اتنی قوتوں کے بعد اتنے ذلیل ہو گئے ہیں کہ ہندو بھی مسلمانوں کی عصمتوں سے کھیلتا ہے اور ہماری غیرت کو کچھ بھی نہیں ہوتا، ہماری غیرتیں جاگتیں نہیں، بیداری نہیں ہوتیں۔ اس سے بڑی منافقت کیا ہوتی ہے کہ نام تو ہم اسلام کا لیں، دعویٰ تو ہم ایمان کا کریں، کم از کم اس بات کو تو یاد کرو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تو بہت مقدس زمانہ ہے، حجاج جیسے ظالم کا زمانہ ہو "ظَالِمُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ" جو امت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں بڑا ظالم گزرا ہے، اس کی غیرت بھی اتنی زندہ تھی کہ سندھ سے چند لڑکیوں نے تاجر کے ذریعے حجاج کو ایک خط بھیجا: ہم مسلمان لڑکیاں ہیں اور راجہ دہر کے لڑکوں نے پکڑ کر ہماری بے عزتی کی ہے اور ہم ان کی قید میں ہیں۔ کیا مسلمان مر گیا ہے جو ہمیں ان کی قید سے چھڑائے؟ تو محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ اٹھا اور پورے ملک پر اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا۔ تو حجاج کے زمانہ میں بھی اتنی بات تھی اور ہم سب کچھ دیکھنے کے بعد بے حس ہیں اور بے ضمیر ہو چکے ہیں، غیرتیں ہماری ختم ہو چکی ہیں۔

ع غیرت ہے نام جس کا گئی تیمور کے گھر سے

اس سے بڑی بے حمیتی کیا ہو سکتی ہے کہ ذرا روشنی آئی تو ہم چل پڑے، ذرا اسلام کا شو کرنا ہو تو ہم اسلام کے بڑے ٹھیکیدار ہیں، اتنے بڑے اسلام کے نام پر جلوس بھی نکال لیں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد کے ہم بڑے بڑے جلوس بھی نکال لیں گے، بڑے بڑے بورڈ بھی لگا دیں گے، لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر کٹ مرنے کا نام آئے گا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر لاکھوں میں کوئی ایک نکلے گا جو اتباع سنت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کرنے والا ہوگا۔

منافق کی تین علامات:

اسی لیے میرے آقا ﷺ نے فرمایا:

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ:))

منافق کی تین نشانیاں ہوتی ہیں۔تم اگر دیکھو تو ان نشانیوں سے پہچان لو۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ نشانیاں کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَ إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا أُتُمِنَ خَانَ)) [صحيح البخاري، حديث: ٣٣، باب: علامة المنافق]

اب پہلی نشانی پر غور کریں کہ''إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ'' جب بات کرے گا تو جھوٹ بولے گا۔یہ منافق کی علامت ہے۔کیونکہ مسلمان کی زبان سے کبھی جھوٹ نہیں نکل سکتا، مسلمان کلمہ پڑھنے والا کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔

''وَ إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ'' اور دوسری نشانی یہ ہے کہ جب وعدہ کرے تو خلاف کرے، وعدہ پورا نہ کرے۔یہ منافق کی نشانی ہے۔

اور فرمایا:''وَإِذَا أُتُمِنَ خَانَ'' اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔فرمایا: یہ بھی منافق کی نشانی ہے۔

اور اسی طرح حضور پاک ﷺ نے اور حدیث میں فرمایا:

((إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ))

''جب وہ کسی سے جھگڑا کرے تو گالی دے اور فحش کلام کرے۔''

تو فرمایا یہ بھی منافق کی علامت ہے۔اب اسی باب میں ذرا ہم غور کریں کہ یہ ساری نشانیاں کہیں ہمارے اندر موجود تو نہیں؟

منافقوں کی اقسام:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ دو مثالیں بیان فرمائیں۔چونکہ منافقوں کی کئی قسمیں تھیں، پہلی مثال ان منافقوں کی تھی جو نفاق پر بالکل پکے تھے، ظاہری کلمہ پڑھ رہے تھے، لیکن اندر کلمہ تھا ہی نہیں۔اور یہ مثال ان لوگوں کی ہے کہ کبھی تو سوچتے ہیں کہ دین اسلام سچا ہے اور کبھی شک میں پڑ جاتے ہیں، یعنی کبھی دماغ میں سمجھتے ہیں

کہ یہ سچ ہے، لیکن پھر شکوک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو یہ منافقوں کی دوسری قسم ہے۔

[ابن کثیر: ۱/۵٦، الآیۃ: أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمٰتٌ]

کفار کی تہذیب اور حضور ﷺ کی سنت:

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ میرے مدنی پاک ﷺ کے رازدار صحابی ہیں۔ جب کسریٰ کا علاقہ فتح ہو گیا، اللہ نے اسلام کو عزت دے دی، بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے کہ ایک لقمہ زمین پر گر گیا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے وہ لقمہ مٹی سے اٹھایا، اس کو صاف کیا اور کھا لیا۔ وہاں فارس کا ایک غلام جو قیدی تھا وہ موجود تھا، اس نے کہا کہ حضرت! میں ایک بات عرض کرتا ہوں اگر آپ ناراض نہ ہو جائیں! آپ نے فرمایا: بتاؤ! کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ یہ فارس کا علاقہ ہے، یہاں کی تہذیب کا تقاضہ ہے، اس کے اندر یہ بہت بڑی بات سمجھی جاتی ہے کہ ایک لقمہ مٹی پر گر گیا تو آدمی اٹھا کر کھالے۔ گر گیا ہے تو گر گیا، پھینک دے، یہ بات بڑی بری سمجھی جاتی ہے، تو مہربانی کر کے آپ آئندہ ایسی بات نہ کریں۔ یہاں کے لوگ آپ کے بارے میں برا خیال کریں گے کہ یہ جنگلی لوگ ہیں، یہ دیہاتی لوگ ہیں، ان کو تو کھانے کا پتہ ہی نہیں کہ ایک لقمہ گر گیا تو کیا ہو گیا؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، آپ نے فرمایا کہ میں اپنے محمد پاک ﷺ کی سنت چھوڑ دوں ان احمقوں کے لیے؟ میرے مدنی کا حکم ہے: لقمہ گر جائے تو اٹھا لو۔ میں اپنے نبی کی بات مانوں یا ان لوگوں کی تہذیب کو خوش کروں؟

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ دوسرے منافقوں کی مثال ہے۔

"صَيِّب" کا معنیٰ:

"صَيِّب" بارش کو کہتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث مبارک میں الفاظ ہیں، حضور ﷺ نے دعا مانگی: "اَللّٰهُمَّ! صَيِّبًا نَافِعًا" یا اللہ! ہمیں ایسی بارش عطا فرما جو نفع دینے والی اور رحمت فرمانے والی ہو، ایسی بارش نہ دینا جو باعثِ عذاب اور باعثِ ہلاکت ہو۔ اس لیے جب حضور پاک ﷺ دعا مانگتے تھے تو فرماتے تھے: "اَللّٰهُمَّ! صَيِّبًا نَافِعًا" اللہ ہمیں ایسے رحمت کا پانی عطا فرما اور عذاب والی بارش سے بچا لے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ۱۰۳۲، باب: ما يُقَالُ إِذَا مَطَرَتْ]

منافق ہر وقت خوف میں رہتا ہے:

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مشہور قول یہ ہے کہ "صَيِّب" بارش کو کہتے ہیں، بادل کو نہیں کہتے۔ اللہ نے بارش

اتاری اس عالم میں کہ اس میں اندھیرے ہیں۔ یہ دلوں کے اندر شک، کفر اور نفاق کا پڑ جانا سب سے بڑا اندھیرا ہے۔ اور کڑک سے مراد وہ چیز جو دلوں کو ڈرانے والی ہے۔ منافقین کی ہر وقت یہ حالت ہوتی کہ وہ خوف میں ہوتے ہیں اور ہر وقت گھبراہٹ میں ہوتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری بات کھل جائے اور ہم پکڑے جائیں۔ منافقوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کوئی بھی آواز آئے تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے خلاف ہے۔

بجلی کا آنکھوں کو اچکنے کا معنی:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ مثال اللہ نے دی ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو اچک لے، اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ قرآن نازل کر کے ان منافقوں کے رازوں اور پردوں کو کھول دیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ نے جو مثال دی ہے کہ جب روشنی ہوتی ہے تو یہ چل پڑتے ہیں اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو یہ رک جاتے ہیں، اس روشنی سے مراد یہ ہے کہ جب اسلام کو غلبہ ملتا ہے اور اسلام کو عزت ملتی ہے تو یہ فوراً آجاتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اور اگر مسلمانوں پر کوئی مصیبت ٹوٹ گئی یا انہیں کوئی شکست ہو گئی یا کوئی نقصان ہو گیا تو کہتے ہیں کہ ہم کفر میں چلے جائیں تو بہتر ہے۔ جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝﴾ [الحج:11]

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک قول یہ فرمایا کہ روشنی دیکھ کر چلنے کا معنی یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ حق کیا ہے؟ وہ جانتے ہیں کہ اللہ کے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق پر ہیں اور آپ کا دین اسلام حق ہے، لیکن جب کفر کی طرف جاتے ہیں تو اب متحیر پریشان ہیں۔ [ابن کثیر: 1/55، الآیۃ: أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ]

اخلاص اور ریا میں فرق:

مثلاً: ایک آدمی نے طواف کیا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ اے اللہ! تو اس کا ثواب فلاں کو عطا فرما دے۔ طواف تو اس نے اللہ کے لیے کیا ہے۔ اور ایک ہے کہ اس عمل میں کسی دوسرے کو شریک بھی کر رہا ہے، کسی دوسرے کا حصہ بھی ڈال رہا ہے تو اب وہ عمل خالص نہیں رہا۔ مثلاً: ایک آدمی خیرات کرتا ہے، ایک بکرا لیا، ذبح کیا اور اللہ کے لیے تقسیم کر دیا اور دل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ثواب فلاں کو عطا فرما دے، لیکن ذبح کرنے کے وقت میں

نیت ہے یہ بکرا تو نذر ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی۔ اب اللہ کا نام بھی درمیان میں نہیں آرہا، نہ وہ اللہ کے لیے نیت کر رہا ہے۔

پیر کے نام ایصالِ ثواب:

یا اس کو یوں سمجھیں کہ مثال کے طور پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ بکرا ہم نے اپنے پیر کے نام پر وقف کر دیا ہے۔ اب اللہ کا نام نہ رہا، پیر کے نام پر آ گیا۔ مثال کے طور پر: بات کو سمجھیں! اس کو کہو کہ یہ بکرا کیا کرو گے؟ تو وہ کہے گا کہ میں اپنے پیر کی قبر پر جا کر ذبح کروں گا۔ اب اس سے پوچھو تو کہتا ہے: مقصد ہمارا یہ ہے کہ ہم پیر کو ثواب پہنچائیں۔ تو بھائی اگر ثواب پہنچانا ہے تو ایک عقل کی بات ہے، اللہ نے عقل دی ہے کہ ثواب دینے والا کون ہے؟ اللہ ہے۔ مثلاً: ہم نے ایک بکرا ذبح کیا، ہم اپنے بزرگ کو ثواب پہنچانا چاہتے ہیں تو ثواب کون پہنچائے گا؟ تو کیا اللہ نے کہیں حکم دیا ہے کہ قبر پر کرو گے تو ثواب پہنچاؤں گا؟ گھر میں کرو گے تو ثواب نہیں پہنچاؤں گا؟ یا تو اللہ نے کہیں یہ فیصلہ کیا ہو کہ اگر تم نے دنبہ قبر پر آ کر ذبح کیا تو پھر تو میں ثواب پہنچاؤں گا؟ کیونکہ وہاں قبر کے بزرگ قریب ہیں، گھر گیا تو بزرگ دور ہے تو ثواب پہنچانے میں تکلیف ہوگی۔ کوئی عقل کی بات کرو۔ تو صاف بات ہے کہ جب وہ قبر کی ضد کر رہا ہے تو وہ ثواب نہیں پہنچانا چاہتا، بلکہ وہ پیر کے نام پر ذبح کر رہا ہے اور جب اس کے نام پر ذبح کر رہا ہے تو ﴿وَمَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ: ۱۷۳] جو چیز اللہ کے سوا کسی غیر کے نام پر ذبح کی جائے تو وہ حرام ہو جاتی ہے۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ یہ چھوٹے مسئلے ہوتے ہیں اور آدمی شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بھائی! تم نے خیرات کرنی ہے تو کسی جگہ بھی کر دو، اپنے ملک میں کر دو، عرب میں کر دو، عجم میں کر دو، مکہ میں کر دو اور مدینہ میں کر دو۔ اللہ پاک جانتے ہیں، اللہ سے دعا کر دو، اللہ پاک کی قدرت ہے، اپنی قدرت اور رضامندی سے ثواب عطا فرما دیں گے۔ اور پھر ہمیں اس ثواب کا بھی پتہ نہیں ہے کہ مقبول ہوگا؟ اجر ملے گا؟ تو اللہ ثواب دیں گے۔ خدا جانے وہ ہماری قربانی قبول ہی نہ ہو۔ تو جب قبول ہی نہ ہو تو اس کا ثواب بنا ہی نہیں تو بندے کو کیسے ملے گا؟ ثواب تو تب ملے گا کہ پہلے وہ اللہ کے دربار میں قبول ہو جائے، لیکن یہ ضد کرنا اور شرط کرنا کہ میں اس کو اسی پیر کے مزار پر ذبح کروں گا اور میں دو دیگیں خیرات کروں گا، لیکن قبر پر جا کر خیرات کروں گا، اب یہ غیر اللہ کی شرکت آ رہی ہے۔ اس جگہ جا کر خیرات کرنے کا تمہارا کیا مقصد ہے؟ یعنی اگر دور خیرات کرو تو نہیں پہنچے گی اور اگر تم وہاں جا کر کرو گے تو تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم نے خود جا کر خیرات کا ثواب پہنچانا ہے، وہ تو اللہ نے پہنچانا ہے اور وہ قادر ہے۔ اور

جو ہم عمل کرتے ہیں فرشتے لے جا کر اللہ کی بارگاہ میں پہنچا دیتے ہیں۔ اگر عمل مقبول ہوتا ہے تو ثواب مرتب ہو جاتا ہے اور اگر عمل مقبول نہیں ہوتا تو ثواب مرتب نہیں ہوتا۔

اصل میں بعض لوگوں کے دماغ میں ایسے مسائل بیٹھے ہوئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ گزارش یہ ہے کہ یہ وہاں جو لوگ ہیں ان کو تو پیروں فقیروں کا قدر ہی نہیں ہے، ہم وہاں جا کر جو خیرات کرتے ہیں اس سے مقصد تو غیر والے کی عزت ہوتا ہے، وگرنہ ہم خیرات تو اللہ کے لیے کرتے ہیں۔ بھائی! حضور ﷺ کی مزار سے زیادہ عزت کسی اور مزار کی ہو سکتی ہے؟ تو یہ مسئلہ اڑھائی لاکھ صحابہ کو سمجھ نہیں آیا، چودہ سو سال بعد تمہیں سمجھ آیا ہے۔ اگر یہ بات کوئی تکریم والی تھی، کوئی ثواب والی تھی تو صحابہ رضی اللہ عنہم آ کر حضور ﷺ کے مزار مبارک پر دنبے ذبح کرتے اور اونٹ ذبح کرتے۔

یاد رکھیں کہ جب تک حضرت علی رضی اللہ عنہ زندہ رہے ہر عید پر حضور ﷺ کی طرف سے قربانی کرتے تھے۔ فرمایا کہ مجھے میرے نبی ﷺ نے حکم دیا کہ جب تم قربانی کرو تو میری طرف سے بھی کر دیا کرنا تو میں اپنے حبیب ﷺ کی سنت پر عمل کر رہا ہوں۔ تو ساری زندگی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی قربانی نہیں چھوڑی۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۱۴۹۵، باب: مَا جَاءَ فِي الأُضْحِيَةِ عَنِ الْمَيِّتِ]

اگر قبر مبارک پر ذبح کرنا کوئی تکریم کا باعث ہوتا تو کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ چھوڑ دیتے؟ ان کو محبت وعظمت وتکریم کا پتہ نہیں چلا؟ اور بارہ سو سال کے بعد تمہیں پتہ چل گیا ہے؟ یہ وجہ کیا ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمائے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو صراطِ مستقیم نصیب فرما دے۔ اس لیے شیطان نے کہا تھا کہ اللہ! میں تیرے بندوں کو دائیں بھی گمراہ کروں گا، بائیں بھی گمراہ کروں گا، آگے بھی گمراہ کروں گا اور پیچھے بھی گمراہ کروں گا۔ اور آپ دیکھیں گے کہ تیرے بندے تیرے ماننے والے نہیں بنیں گے، بلکہ تیرے ساتھ شرک کرنے والے بنیں گے۔

رسوم اور بدعات کی حقیقت:

تو اب اللہ نے حکم دیا تھا کہ قربانی کا جانور حرم میں ذبح ہوگا اور کسی جگہ ذبح نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ کے ذمہ بکری ہے تو حرم میں ذبح ہوگی، اپنے ملک میں ایک لاکھ بکری ذبح کرو تو ادا نہیں ہوگی۔ اگر آپ پر دم پڑ گیا تو حدودِ حرم میں ذبح ہوگا، اگر حدودِ حرم سے باہر ذبح کرے گا تو وہ قبول نہیں ہوگا۔ تو شیطان نے قربانی میں شرک کرایا کہ اے اللہ! اگر تیری بکری تیرے گھر کے بغیر قبول نہیں ہوتی تو پیر کی بکری بھی قبر کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔ میں وہاں ذبح کراؤں، تو نے یہاں حکم دیا ہے۔ میں مقابلہ کراؤں گا۔ تو اپنے گھر کا طواف کروائے گا، میں قبروں کا طواف

کرواؤں گا۔ تو اپنا نعرہ لگوائے گا، میں غیر اللہ کا نعرہ لگواؤں گا۔ تو اپنا نعرہ لگوائے گا، میں اپنا نعرہ لگواؤں گا۔ تو کہے گا: میرے آگے سجدہ کرو، میں انہیں قبروں پر جھکوادوں گا۔ تو کہے گا: میرے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو، میں ان کو بندوں کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا کروں گا۔ مسلمان بے چارہ محبت میں مبتلا ہے۔ جہاں مرضی آئے اس کو لے جاؤ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت بیان کرو تو رونا شروع کر دے گا اور یزید کی شجاعت بیان کرو تو "سبحان اللہ" کہنا شروع کر دے گا۔ اس قوم کا کیا علاج ہے ماسوائے اس کے کہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہدایت عطا فرمادے، اللہ تعالیٰ سینہ کھول دے اور ایمان کی سمجھ عطا فرمادے۔

ایک اصولی سی بات ہے: یہ دو کھلے ہوئے راستے ہیں، جس راستے پر کوئی چلنا ہے چلے: ایک راستہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور ایک راستہ سنت الانبیاء والمرسلین کا ہے جس پر میرے پاک محمد مدنی صلی اللہ علیہ وسلم نے چل کر دکھایا۔ یعنی جب بچہ پیدا ہوا تو اذان سے لے کر جنازہ تک تمام مسئلے میرے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا دیے۔ ایمان سے بتلائیں! حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے وہ مکمل تھا یا ناقص تھا؟ اگر دین مکمل ہے تو اب ہم کیا جوڑ لگا رہے ہیں؟ کیا دین پنکچر ہے؟ کوئی دین کے اندر شگوق پڑ گئے ہیں کہ ہم کبھی قلوں کا، کبھی جمعراتوں کا، کبھی تیجے کا اور کبھی گیارہویں کا جوڑ لگا رہے ہیں؟ بھائی! حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بچہ پیدا ہونے کے بعد کان میں اذان دینے سے لے کر جنازہ تک کا مسئلہ بتا دیا، عقیقہ بتا دیا، اذان کا مسئلہ سمجھا دیا، سر کے بال منڈانے کا مسئلہ سمجھا دیا، بچہ کے ختنہ کرنے کا مسئلہ سمجھا دیا، بچے کے بالغ ہونے کے احکام سمجھا دیے، بچہ کے غسل کے مسئلے سمجھا دیے، بچہ دس سال کا ہو جائے تو مسئلہ سمجھا دیا، بالغ ہو گیا تو احکام سمجھا دیے، بڑھاپے کے مسئلے سمجھا دیے، موت آگئی تو غسل کے مسئلے سمجھا دیے، کفن کے کپڑے کے مسئلے سمجھا دیے، قبر کا طریقہ سمجھا دیا اور جنازہ پڑھنا سمجھا دیا۔ اب اس کے بعد ساری باتیں: تیجہ شریف، قل شریف، سات جمعراتیں شریف، چالیسواں شریف اگر دین ہوتا تو میرے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ سمجھا دیتے......؟؟

اور عمل کرنے کی دوسری شرط کیا ہے؟ صَوَابًا یعنی کہ وہ عمل سنت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو۔ بھائی! اگر ایک مرغی ہے، اس کو ذبح کرو تو ہم کہتے ہیں کہ حلال ہے، گردن گھونٹ کر مار دو تو ہم کہتے ہیں حرام ہے، کوئی ڈنڈا مار کر مار دے تو ہم کہتے ہیں حرام ہے، وہ خود مر جائے تو ہم کہتے کہ حرام ہے، اس کو کرنٹ مار کر مار دیں تو ہم کہتے ہیں کہ حرام ہے، اس کو کسی مشین میں بٹھا کر کوئی ایسا ذریعہ بنائیں کہ خود سانس بند ہو جائے تو ہم کہتے ہیں کہ حرام ہے اور

گیس کرے میں چھوڑ دیں اور اس سے مرجائے تو ہم کہتے ہیں حرام ہے، کیونکہ میرے مدنی ﷺ نے جو طریقہ بتایا ہے اسی طریقہ پر عمل نہیں ہوا۔ ہم اتنی چھوٹی سی مرغی کو بھی حضور ﷺ کے طریقہ کے بغیر کھانے کو حرام سمجھتے ہیں، تو کوئی ہمیں انڈے گھٹنے کھلائے تو ہم کیسے کھالیں؟ اور پھر کہتے ہیں کہ وہابی ہے۔ جو مرضی آئے کہتے رہو۔ ہم تو اتنی چھوٹی سی مرغی بھی ہضم نہیں کر سکتے جب تک سنت پر عمل نہ ہو، جب تک حضور ﷺ کا طریقہ نافذ نہ ہو۔ اور کوئی آدمی ہمیں کہے کہ دیکھیں! یہ تو شیرینی نہیں کھاتے، گیارہویں شریف نہیں کھاتے، یہ بڑے سخت وہابی لوگ ہیں، کسی کی ستائش شریف نہیں کھاتے اور یہ معراج شریف نہیں کھاتے۔ ہم تو اسی ''شریف'' میں رہ جائیں گے۔

بزرگوں کے ایام اور عرس منانا:

لاکھ سے زائد انبیاء علیہم السلام ہیں۔ جب حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے ان کا کیا قصور ہے کہ اس دن کا کیوں نہ احترام کریں؟ جو سارے نبیوں کا ابا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام جس نے کعبہ بنایا، تم حج پڑھنے آئے ہوئے ہو، ان کی ولادت کا دن کوئی شان والا نہیں ہے؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام جنہوں نے اتنی بڑی قربانی دی، جن کی قربانی کی یاد اللہ نے قیامت تک زندہ رکھ دی ہے، جن کی تم قربانیاں کر رہے ہو، جن کا تم زمزم پی رہے ہو، اس کی شان نہیں ہے کہ ہم اس کا یومِ ولادت منائیں؟ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی شان والے، حضور پاک ﷺ کے اڑھائی لاکھ صحابہ شان والے۔ اللہ نے فرمایا کہ تم دنوں کے چکر میں نہ پڑو، تم کعبہ کا طواف کرتے رہو، میرے ابراہیم کو ثواب مل رہا ہے، تم مقامِ ابراہیم پر نفل پڑھتے رہو، میرے ابراہیم کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ تم زمزم پیتے ہو، اسماعیل کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ تم صفا دوڑتے ہو تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اماں کا طریقہ یاد ہو رہا ہے۔

دن منانے کے لیے نہیں آئے۔ یہ ڈے منانا تو عیسائیوں کا کام ہے، مسلمانوں کا تو اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ مسلمان تو اس عمل کو زندہ رکھتا ہے جو عمل قیامت تک زندہ رہے۔ آدمی پانچ وقت نماز پڑھتا ہے، وہ معراج والے نبی کی معراج کا قائل ہے اور جو بے نماز ہے وہ معراج محمد مصطفیٰ ﷺ کا منکر ہے، کیونکہ حضور ﷺ کو پانچ وقت کی نمازیں معراج میں ملی تھیں۔ تو جو پانچ وقت نماز پڑھ رہا ہے وہ حضور ﷺ کی معراج کو زندہ رکھ رہا ہے اور جو کبھی نماز نہ پڑھے وہ کیسے معراج کو ماننے والا ہے؟ صرف معراج والے دن جھنڈی باندھ لی تو معراج منانے والے بن گئے...... إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... جو آدمی پانچ وقت کی نماز پڑھ کر حضور ﷺ کی معراج کو زندہ رکھے ہو تو وہابی ہے، وہ تو حضور ﷺ کا منکر ہے اور جو کبھی نماز نہ پڑھے اور کبھی مسجد کے قریب ہی نہ گیا ہو۔

پوچھیں: حضرت پیر صاحب نماز بھی پڑھی ہو تو وہ کہتا ہے کہ تم کمال کرتے ہو تم نماز پڑھو تو تم گناہگار ہو، لیکن پیر تو پہنچا ہوا ہے۔ پتہ نہیں کہاں پہنچا ہوا ہے؟ ہمیں تو آج تک سمجھ نہیں آیا کہ حضرت پہنچے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں پہنچے ہوئے ہیں؟ روٹی ہمارے پاس کھاتے ہیں، پہنچے ہوئے کہیں اور ہیں...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ......

دو باتیں یاد رکھنا کہ عمل تب قبول ہوگا کہ خالص بھی ہو اور سنت کے موافق بھی۔ اب ایک آدمی رات کو سونے کے لیے تو برش کرے، لیکن نماز سے پہلے اگر مسواک نہ کرے تو یہ سنت پر عمل نہیں ہے، کیونکہ رات کو برش تو اپنے دانتوں کو بچانے کے لیے کر رہا ہے۔

محنت کی کمائی والے کھانے میں برکت:

حضرت قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے ایک واقعہ لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک فقیر آدمی تھے اور روازنہ گھاس کاٹ کر جنگل سے لاتے تھے اور اس کو بازار میں بیچتے تھے۔ اس زمانہ میں تین پیسے کا گھاس بکتا تھا اور وہ اتنی لے آتے تھے کہ تین پیسہ میں وہ بک جائے تو ایک پیسہ گھر والوں کو دیتے تھے اور ایک پیسہ اپنی ضرورت پر خرچ کرتے اور ایک پیسہ رکھ دیتے، اکٹھا ہوتا رہا۔ جب چار پانچ چھ روپے بن جاتے تھے تو جتنے دیو بند کے بڑے عالم تھے، ان سب کو دعوت دیتے تھے کہ ہمارے پاس آج کھانا کھالیں۔ لکھا ہے کہ یقین فرمائیں! اس بزرگ کی اس دعوت کے لیے تمام بزرگ انتظار میں ہوتے تھے کہ کب ہماری دعوت کرتے ہیں؟ ہم ان کی دعوت کو کھانے کے لیے جائیں۔ ایک رات جو کھانا کھاتے تھے تو تین ماہ تک ہمیں اپنے ایمان میں تازگی محسوس ہوتی تھی، ہمیں عبادت میں لذت ملتی تھی اور ہم اس کھانے کی انتظار میں رہتے۔ اور اس کے گھاس کے خریدنے کے لیے لائن کھڑی رہتی تھی کہ کب موقع ملے تو گھاس خرید لیں؟ اور ان کی بھی عادت مبارک تھی کہ جو پہلے آجاتا اس کو گھاس دے دیتے تھے کہ بھائی! پہلے تم نے ہاتھ لگایا ہے تو پہلے تمہارا حق ہو گیا ہے۔ ساری زندگی اس طرح گزری۔ وجہ کیا تھی کہ محنت کر کے پیسہ کماتے تھے، ان کے پیسے میں برکت تھی۔ حلال پیسے میں نور تھا، حلال کے پیسے میں اخلاص تھا، حلال کے پیسہ میں تڑپ تھی اور حرام کے لاکھوں کھانے پکالیں نتیجہ یہ نکلے گا کہ نماز ختم۔

حرام کھانے کی نحوست:

آپ یقین فرمائیں کہ آپ کے ملک میں کبھی جائیں تو بڑا افسر یا زمیندار دعوت کر دے تو اس دن تہجد تو گئی۔ نہ کھاؤ

تو کہیں گے: مولوی بڑے متکبر ہیں۔ ہم تو ویسے بدنام ہیں کہ بلوچ آدمی سے اس کا دماغ خراب ہے۔ تو اگر کھالیں تو نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ کی رحمت سے جو دو نفلیں نصیب ہوتی ہیں وہ ختم۔ کبھی کبھی تو یہ بھی ڈر ہوتا ہے کہ فرض بھی نصیب ہوگا یا نہیں ہوگا!! وجہ کیا ہے کہ جب مال مشتبہ اندر چلا گیا تو عبادت کی توفیق گئی۔ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: حرام مال سے اگر حج کرو گے تو آواز آتی ہے:

((لَا لَبَّيْكَ وَلَا سَعْدَيْكَ، وَحَجُّكَ مَرْدُوْدٌ عَلَيْكَ)) [جمع الجوامع، حدیث: ۲۷۹۴]

جاؤ تیری کوئی حاضری نہیں، ہم نے تیرا حج رد کر کے پھینک دیا ہے۔ دوڑ جاؤ! تم نے محنت کی ہے اور بے فائدہ کی ہے۔

کافروں کی جہالت اندھیرا ہی اندھیرا ہے:

اور بعض کافر ایسے ہیں کہ ان کا جہل بالکل ایسے ہے کہ خالص جہل ہے، اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ان کی مثال اللہ نے دی:

﴿أَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۚ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۚ إِذَآ أَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۚ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ [النور: ۴۰]

ان کافروں کی مثال ایسے ہے کہ اندھیرے اور اندھیرے بھی ایسے دریا میں اور دریا میں موج کے اوپر موج ہو۔ ایک رات کا اندھیرا، ایک موج کا اندھیرا اور پھر اوپر سے بادلوں کا اندھیرا۔ اتنا اندھیرا کہ اپنے ہاتھ کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تو کافروں کی مثال ایسے ہے۔ وہ تو کفر کے اندھیروں میں اتنے غرق ہو چکے ہیں کہ ان کو تو کوئی ذرے کے برابر بھی روشنی نہیں آسکتی۔

اور فرمایا کہ جن کے دلوں میں اللہ ایمان کا نور نہ پیدا کریں ان کو کہاں سے روشنی حاصل ہو سکتی ہے؟ اصل نور ایمان ہے۔ نورِ ایمان کی روشنی نہ ہو تو پھر اندھیرے ہی اندھیرے ہیں۔ مرضی آئی تو بتوں کے آگے جھک گئے، کبھی مرضی آئی تو جانوروں کے آگے جھک گئے، کبھی ایک پتھر خوبصورت نظر آیا تو پہلا خدا پھینک دیا اور دوسرے کو پوجنا شروع کر دیا اور بعض بعض کافر تو ایسے گزرے ہیں...... اللہ معاف فرمائے...... کہ وہ طعام یعنی کھانے اور مٹھائیوں کے بھی خدا بناتے تھے کہ مٹھائی کا بت بنا کر رکھ دیا، اس کی پوجا کرتے رہے اور جب پوجا سے فارغ ہوئے تو اس

خدا کو کھا گئے۔ اس سے بڑا اندھیرا اور ظلمات اور کیا ہو سکتی ہیں ؟ تو جب آدمی کفر اور شرک کے اندر جتلا ہو جاتا ہے تو پھر اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔

خالص منافق کی علامات:

صحیحین میں روایت ہے: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ....))

جس کے اندر یہ چار خلاتیں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے...... یعنی عملی منافق ہے، کیونکہ اعتقادی منافق تو کافر ہے، اس کے کفر میں تو کوئی شبہ نہیں ہے...... اگر ایک علامت پائی جائے تو چوتھائی حصہ، اگر دو پائی جائیں تو آدھا منافق ہے، اگر تین پائی جائیں تو تین حصہ اور چار علامتیں پائی جائیں تو پورے کا پورا منافق ہو گیا۔ اور وہ علامتیں یہ ہیں:

1 ...... "إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ" اور جب امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

2 ...... "وَ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ" جب بات کرے تو جھوٹی کرے۔

3 ...... "وَ إِذَا عَاهَدَ غَدَرَ" اور جب عہد کرے تو دھوکہ دے۔

4 ...... "وَ إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ" اور جب لڑائی کرے تو گالیاں دے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۳۴، باب: عَلَامَةُ الْمُنَافِقِ صحیح مسلم، حدیث: ۱۵۸]

چار قسم کے دل:

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں: حضور پاک ﷺ نے فرمایا: دل کی چار قسمیں ہیں:

1 ...... ایک دل اجرد ہے کہ جس کے اندر دیا روشن ہوتا ہے۔

2 ...... دوسرا قلب ایسا ہے جس پر غلاف بندھا ہوا ہے۔

3 ...... تیسرا قلب الٹا ہے۔

4 ...... اور چوتھا قلب مصفح ہے کہ اس کے اندر ایمان بھی ہے اور نفاق بھی ہے۔

اور ان کی تفسیر بھی فرمادی کہ:

❀......قلب اجرد مومن کا دل ہے اور اس کے اندر اللہ نے نور ایمان رکھا ہے۔

❀......دوسری قسم وہ دل جس پر غلاف ہے وہ کافر کا دل ہے، جو بند ہے۔

❀......جو دل الٹا ہے اس کے اندر کوئی چیز جائے گی ہی نہیں، مثلاً: ایک گلاس کو اوندھا کر دیں تو اس کے اندر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں جائے گا اور اگر ہم سیدھا کر دیں تو ایک منٹ میں بھر جائے گا۔ تو منافق کا دل ایسے ہے جیسے اس کے اندر کوئی چیز داخل نہیں ہوتی ہے تو یہ اس منافق کا قلب ہے جو بالکل پکا منافق ہے۔

❀......اور قلب مصفّٰی کی مثال ایسے ہے کہ ایمان کی نشانیاں بھی ہیں اور نفاق کی نشانیاں بھی ہیں۔

[مسند أحمد بن حنبل، حدیث:۱۱۱۲۹]

اور میرے مدنی ﷺ نے فرمایا: مومن کے دل کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی سبزی کا بیج آپ ڈالیں، زمین بھی اچھی ہو، پانی بھی اچھا ہو تو شاخیں نکلیں گی۔ اور کافر کی مثال ایسے ہے جیسے زخم ہو، اس کے اندر پیپ ہوگی یا خون ہوگا۔ اگر ایمان والا مادہ غالب آ گیا تو نفاق کو ختم کر دے گا اور اگر خدانخواستہ نفاق والا مادہ غالب آ گیا تو ایمان کو ختم کر دے گا تو خالص منافق بن جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نفاق سے بچائیں۔ (آمین) [مسند أحمد بن حنبل، حدیث:۱۱۱۲۹]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد:

قرآن نے واضح فیصلہ فرما دیا:

﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيْمَ لِأَبِيْهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ إِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ أَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرٰهِيْمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿١١٤﴾﴾ [التوبۃ:۱۱۴]

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے استغفار مانگا، لیکن ایک وقت مقرر تک کہ جب تک وہ زندہ تھا۔ جب اس کی موت کفر پر آ گئی، پکی بات ہو گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو ابراہیم علیہ السلام بری ہو گئے کہ اب بخشش مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہمارے بعض لوگ لوگوں کے عقیدوں کو خراب کرتے ہیں۔

قرآن کی اتنی آیات کے اندر تیرا باپ...... تیرا باپ کا لفظ ہے۔ تو چچا کا لفظ بھی آ سکتا تھا، قرآن کو بلاوجہ بدل ڈالنا یہ قرآن کی معنوی تحریف ہے۔ جب اللہ نے فرما دیا کہ آذر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کا

اپنے باپ سے مناظرہ ہوا اور باپ نے کہا کہ میں آپ کو ماروں گا۔ انہوں نے کہا: اچھا میں چلا جاتا ہوں، لیکن میں آپ کے لیے بخشش مانگا کروں گا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بخشش مانگتے رہے، اللہ نے ان کو منع فرما دیا تو اس لیے اللہ کے قرآن کے اندر باپ کا لفظ آیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ چچا کو باپ کہا جاتا ہے۔ چچا کو تو باپ کہا جاتا ہے، لیکن باپ کو چچا کبھی نہیں کہا جاتا۔

ایک بات ہمیشہ یاد رکھو! اگر کسی آدمی کا چچا ہے۔ چچا گویا کہ وہ باپ کے مرتبہ میں ہے، لیکن کوئی دنیا میں ایسا بے وقوف نہیں جو باپ کو چچا کہے۔ تو اللہ نے جب قرآن میں باپ کہہ دیا تو ہم اس کو چچا کیسے بنا سکتے ہیں؟ ہاں! یہ علیحدہ بات ہے کہ لفظ چچا کا استعمال ہوتا تو پھر ہم کہتے کہ چچا تھا، وہ بھی باپ کے برابر ہوتا ہے، لیکن جب قرآن کہے کہ باپ ہے، لیکن اس کی شرک پر موت ہوگئی تو اللہ نے معاف نہ کیا۔ اس لیے اصل کوشش یہ کیا کریں کہ شرک میں مبتلا نہ ہوں۔

اللہ کا شریک بنانا:

اور لوگوں نے ایک یہ سمجھ رکھا ہے کہ مشرک وہ ہوتا ہے جو بتوں کی پوجا کریں۔ یہ غلط فہمی ہے۔ بت کی پوجا کرے تو مشرک ہے، جبرئیل علیہ السلام کی پوجا کرے تو تب بھی مشرک ہے، اسرافیل کی پوجا کرے تب بھی مشرک ہے، ملائکہ کی پوجا کرے تب بھی مشرک ہے، انبیاء علیہم السلام کی پوجا کرے تب بھی مشرک ہے، انسانوں کی پوجا کرے تب بھی مشرک ہے اور اللہ کے سوا کسی غیر کی عبادت کرے، کسی غیر کو مشکل کشا سمجھے وہ بھی مشرک ہے۔

ایک بات یاد رکھیں! اس لیے یہ نہیں ہوتا کہ بتوں کو شریک کرے تو مشرک ہے اور زندوں کو خدا کا شریک کرے یا مردوں کو خدا کا شریک کرے تو مشرک نہیں ہے، انسان کو شریک کرے گا تو مشرک ہے، ملائکہ کو شریک کرے گا تو مشرک ہے، جنات کو شریک کرے گا تو مشرک ہے، مردے کو شریک کرے گا تو مشرک ہے اور زندوں کو شریک کرے گا تو مشرک ہے، کیونکہ اس کی شان ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ① اَللّٰهُ الصَّمَدُ ② لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ③ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ④﴾ [سورۃ الاخلاص]

اس لیے فرمایا:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ⑪﴾ [الکہف: ۱۱۰]

اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے، ''اَحَدًا'' کوئی بھی ہو۔ اور شریک کرنے کا معنی ہے مثلاً: دعا مانگ رہا ہے کہ یا اللہ! مہربانی فرما، میری مشکلات دور فرما دے۔ اور ساتھ ہی کہہ رہا ہے: یا علی! تو بھی مشکل کشائی فرما دے۔ تو اب دعا میں شریک کر رہا ہے۔ اسی کا نام شرک ہوتا ہے۔ لوگوں نے سمجھا یا کہ کافر ہندو مشرک ہوتا ہے، ہم تو جو مرضی آئے کرتے رہیں، ہم تو کلمہ پڑھتے ہیں۔ کلمہ پڑھنے کے بعد ہی بندہ مشرک بنتا ہے۔ جو آدمی خدا کو مانے ہی ناں! وہ کیا مشرک بنے گا؟ وہ تو دہریہ ہے، خدا کا منکر ہے، وہ تو خدا کو مانتا ہی نہیں۔ مشرک کا معنی یہ ہوتا ہے کہ خدا کو بھی مانے اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک بھی کرے، اسی کو تو مشرک کہتے ہیں۔ اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا کیا کریں اور احتیاط کیا کریں کہ ہماری عبادت میں، ہماری دعا میں، ہماری نذر و نیاز میں، خیرات میں اور پکار میں شرک نہ آئے، کیونکہ مشرک کی بخشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، باقی آدمی کتنا بڑا گناہگار ہے وہ بھی تو بخشا جائے گا، اس کی بخشش کی امید ہو سکتی ہے، لیکن مشرک اور کافر کی بخشش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

منافقین کو تنبیہ:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمادیا کہ اللہ پاک تو قادر ہیں۔ اس سے منافقین کو تنبیہ کی گئی کہ منافق اللہ کے غضب اور اللہ کی پکڑ سے ڈریں، اللہ پاک نے ان کا احاطہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی قوتِ باصرہ اور قوتِ سامعہ کو ختم کرنے پر قادر ہیں۔ کبھی فعیل فاعل کے معنی میں آتا ہے، جیسے قدیر بمعنی قادر اور علیم بمعنی عالم ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ مثال باعتبار جنس منافقین کے ہے، وگرنہ منافقین کے احوال مختلف ہوتے ہیں اور ان کی صفات بھی مختلف ہوتی ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جیسے سورۃ البراءۃ کے اندر مثالیں بیان فرمائیں، فرمایا ''مِنْهُمْ'' ان میں سے بعض ایسے ہیں، کیونکہ ایک تو ہے مطلق منافق اور ایک ہے منافقین کے احوال اور ان کی صفات۔ ان کے احوال بڑے مختلف ہیں تو سورۂ براءت میں کئی چیزیں بیان کی گئیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو مثالیں ذکر فرما دیں، کیونکہ منافقوں کے احوال مختلف ہیں: بعض منافقوں کی حالت پر پہلی مثال منطبق ہوگی اور بعض منافقین کے احوال پر دوسری مثال مطابق ہوگی۔ [ابن کثیر: ۱/۵۶، الآیۃ: اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ]



يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا، پھر اس سے قسم قسم کے پھل نکالے تمہارے کھانے کے لیے۔ پس تم کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ اور تم جانتے ہو۔

سورۃ البقرۃ کی ان آیات مبارکہ میں مسئلہ توحید اور اس کے دلائل کا ذکر ہے۔

ان دونوں آیات کا تعلق سابقہ آیات سے ہے، پہلے ۲۰ آیات ختم ہوگئیں تو اب اکیسویں اور بائیسویں آیت شروع ہو رہی ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾﴾ [البقرۃ: ۲۱]

سب سے پہلا حکم دیا ہے: اے لوگو!...... یہ خطاب ان سب کو ہے جن کی قسمیں پیچھے گزر چکی ہیں: مومنوں، کافروں، منافقوں، متقین، فاسق اور فاجر سب کو خطاب ہے۔ یہ لفظ عام ہے۔ اس آیت میں قرآن کا پہلا پہلا حکم آرہا ہے اور پہلی پہلی نہی آرہی ہے۔ پہلا امر ہے ﴿اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ اور پہلی نہی ہے ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾

اللہ نے فرمایا: اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی۔ اگر مومنوں کی طرف خطاب متوجہ ہوگا تو معنی ہوگا کہ اے ایمان والو! جیسے تم ایمان کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کر رہے ہو اسی پر جمے رہو اور اسی پر قائم دائم رہو۔

گناہگار کی طرف متوجہ ہوگا تو معنی ہوگا ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ اے گناہگارو! گناہوں کو چھوڑ دو، نافرمانیوں کو چھوڑ دو اور اپنے رب کی عبادت کرو۔

کافروں کی طرف متوجہ ہو تو ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ کا معنی ہوگا: اے کافرو! غیر اللہ کی عبادت چھوڑ کر تم اپنے رب کی عبادت کرو۔

منافقوں کی طرف متوجہ ہوگا تو معنی ہوگا: اے منافقو! تم جو اندر کفر چھپائے ہوئے ہو اس کو نکال کر باہر پھینکو اور

تم اپنے رب کی سچی عبادت کرو۔

انتہا درجہ کی تعظیم، انتہا درجہ کی محبت اور انتہا درجہ کا تذلل اس کا نام عبادت ہے۔

[تفسیر روح البیان: ۱/ ۷۱، الآیۃ: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ]

نکات:

قرآن نے اور کئی مقام پر بیان فرمایا کہ سب سے بڑی محبت بھی اللہ کے ساتھ ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ [البقرۃ: ۱۶۵] ایمان والے سب سے زیادہ محبت اللہ کے ساتھ کرتے ہیں اور اس کے بعد سب سے زیادہ تعظیم اللہ کی کرتے ہیں اور سب سے زیادہ عاجزی اور بندگی اللہ کے آگے ہو۔ اور ایک ہی بندے کو مطلق محبت ہے، یعنی باپ کو بیٹے سے بھی محبت ہے، بھائی سے بھی محبت ہے، دوستوں سے بھی محبت ہے، اپنے ہمسائے سے اور قبیلے سے بھی محبت ہے اور قوم برادری سے بھی محبت ہے۔ یہ مطلق محبت علیحدہ چیز ہے اور ایک غایت درجہ کی محبت ہے جس کی محبت کے مقابلہ پر اور کوئی محبت نہ آسکے، یعنی اگر ایک طرف اللہ کی محبت آجائے اور دوسری طرف قبیلہ ہے، بیٹا ہے، بیٹی ہے، بہن ہے، نفع ہے، تذلل ہے، عاجزی ہے اور بندگی ہے، وہ بھی صرف اللہ کے آگے ہوگی۔ اب دیکھیں کہ آدمی ہاتھ باندھ کر اپنے آپ کو عاجز بنا کر دربار میں کھڑا ہے، اب کھڑے کھڑے رکوع میں آگیا اور رکوع سے سیدھا کھڑا ہو گیا ''رَبَّنَا! وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا كَمَا يُحِبُّنَا وَ يَرْضٰى'' کھڑا ہے اور پڑھ رہا ہے۔ اور اس کے بعد پھر اللہ اکبر کی بڑائی کا اقرار کرتے ہوئے، اب بالکل ذلت کی انتہا پر چلا گیا۔ جو اس کو اللہ نے چہرہ دیا تھا، جو اس کو بدن کا اعلیٰ حصہ دیا تھا اس کو مٹی میں ڈالے ہوئے ہے اور کہہ رہا ہے ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى'' اے اللہ! تیری بلندی اور تیرے علو کی کوئی حد نہیں ہے اور میری ذلت اور عاجزی کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں تیرے آگے بالکل گر گیا ہوں اور میں نے اپنے چہرے کو مٹی میں ڈال دیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے عجز و بندگی کا اظہار کر رہا ہے۔

عبادت صرف اللہ کے لیے:

اب جناب! اسی سے اندازہ کرلیں کہ رکوع عبادت ہے، سجدہ عبادت ہے، نماز عبادت ہے، طواف عبادت ہے، حج عبادت ہے، قربانی عبادت ہے، خیرات کرنا عبادت ہے، اسی طریقہ سے حجر اسود کو بوسہ دینا عبادت ہے،

مقامِ ابراہیم پر دو رکعت پڑھنا عبادت ہے، خیرات کرنا عبادت ہے اور دعا مانگنا عبادت ہے۔ عبادت ہم نے اللہ کی کرنی ہے۔ اچھا اب اگر کوئی آدمی رکوع کسی دوسرے کے آگے کرے، دوسرے کے آگے جھک کر کھڑا ہے، سردار کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہے، سردار کے پاؤں پر پڑا ہوا ہے، مرشد کے پاؤں پر سر رکھ کر گردن پر کپڑا ڈال کر پڑا ہوا ہے، قبر پر گردن پر کپڑا ڈال کر پہلے چوکھٹ پر سجدہ، پھر قبر پر سجدہ، پھر غلاف پر سجدہ اور پھر تعویذ پر سجدہ۔ عبادت کر رہا ہے اور اس کے بعد کھڑا ہو کر کہتا ہے: یا داتا! ہر مشکل کشا، حاجت روا۔ اے داتا! مہربانی فرما، اے قلندر! مہربانی فرما، اے علی ہجویری! مہربانی فرما، مشکل میں پھنس گیا ہوں، میری مشکلیں حل کر دے۔ یا معین الدین چشتی! مہربانی فرما، قلندر! مہربانی فرما۔ یہ کہہ رہا ہے۔ ایمان سے بتلائیں! کیا یہ اللہ کی عبادت کر رہا ہے؟ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے جو سمجھنے والا ہے۔ اگر سمجھ میں آ گیا تو سمجھیں کہ سارا دین سمجھ میں آ گیا۔ جب یہ سمجھ نہیں آیا تو سمجھو کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ ایک موٹی سی بات یاد رکھ لیں! اگر عقیدۂ توحید اللہ نے دماغ میں اتار دیا اور ذرا غور کرو تو سمجھ آ سکتا ہے۔ جیسے اقبال نے کیا پیاری بات کی ہے کہتا ہے:

؎ سمجھ میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے؟

نکتہ توحید سمجھ تو آ سکتا ہے، لیکن اگر تو نے اپنے دماغ کو ہی بت خانہ قرار دے دیا ہے۔ کسی آدمی کو اپنے وطن سے اتنی محبت ہے اس کو کہو کہ حج فرض ہے، کعبہ میں چلو تو کہتا ہے کہ میں وطن نہیں چھوڑ سکتا۔ جہاد فرض ہو گیا ہے، جہاد کے لیے نکلو تو کہتا ہے کہ میں اپنے وطن کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اب وطن کی محبت اللہ کی محبت سے بڑھ رہی ہے، اب وطن کی محبت اللہ کے فرائض کی محبت سے بڑھ رہی ہے، یہ بھی شرک ہو رہا ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ شرک صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک بت آگے کھڑا کر دو اور اس کو پوجو تو مشرک ہے۔ یہ لوگوں کو بڑی غلط فہمی ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ کافر وہ ہوتا ہے جو بتوں کا پجاری ہے، جو سورج کا پجاری ہے۔ کیا وہ مسلمان ہے؟ حالانکہ سورج کوئی بت ہوتا ہے؟ اچھا! آگ کا جو پجاری ہے وہ مسلمان ہے؟ آگ کس بت کا نام ہے آگ بھی تو کسی بت کا نام نہیں ہے۔ یہ بتائیں کہ کوئی گنگا کی پوجا کرے وہ مسلمان ہے، اگر گائے کی پوجا کرے تو وہ مسلمان ہے مسلمان نہیں ہے۔

اچھا جناب ایک آدمی جانوروں کی بھی پوجا نہیں کرتا، پانی کی بھی پوجا نہیں کرتا، چاند کی پوجا بھی نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرنے والا کافر ہے، جو عیسیٰ علیہ السلام سے مشکلات کا حل مانگے وہ کافر ہے، عیسیٰ علیہ السلام کو

مشکل کشا سمجھے وہ کافر ہے، عیسیٰ علیہ السلام کو حاجت روا سمجھے وہ کافر ہے، عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھے تو کافر ہے اور محمد مصطفیٰ ﷺ کو حاجت روا سمجھے تو مسلمان ہے؟ بھائی! عیسیٰ علیہ السلام بھی تو اللہ کا نبی ہے اور محمد مدنی مصطفیٰ ﷺ بھی اللہ کا نبی ہے۔ جب اللہ نے حکم دیا کہ میری عبادت کرو تو میرے مدنی پاک ﷺ نے اپنے رب کی عبادت کی، صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے رب کی عبادت کی، آدم سے لے کر ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں نے اللہ کی عبادت کی ہے۔ ان تمام انبیاء علیہم السلام نے اللہ کی عبادت کی ہے۔

عبادت اور سجدہ صرف اللہ کے لیے:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت! گزارش یہ ہے کہ ہم جو پیر کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ہم جو قبر پر سجدہ کرتے ہیں، یہ وہابی سمجھتے نہیں ہیں۔ عبادت والا سجدہ اللہ کے سوا غیر کو کرنا کفر ہے، ہم تو تعظیم وار سجدہ کرتے ہیں عبادت کے لیے نہیں ہے اور مثال یہ لے آتے ہیں کہ اگر ہر سجدہ کفر ہوتا تو پھر آدم کو بھی سجدہ جائز نہ ہوتا۔ جب سب سے پہلی اللہ کی نوری مخلوق ہے تو جب نور والے فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تو ہم بھی آدم علیہ السلام کی اولاد کو سجدہ کر رہے ہیں، ہم بھی تو آدم علیہ السلام کے بیٹے کو سجدہ کر رہے ہیں؟ وہ لوگوں کے دماغ کے اندر اس بات کو ڈالتے ہیں۔ حالانکہ وہ سجدہ اور ہے اور یہ سجدہ اور ہے۔ اس لیے کہ دیکھیں کہ یہ کس نے حکم دیا ہے کہ اپنے رب کی عبادت کرو؟ اللہ کا حکم ہے۔ تو جب آدم علیہ السلام کو ملائکہ نے سجدہ کیا تھا، اپنی عقل سے کیا تھا یا اللہ کے حکم سے کیا تھا؟ بات کو سمجھیں! بات کو یاد رکھیں! تمام ملائکہ نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا ہے، ہمارا ایمان ہے، قرآن میں موجود ہے، لیکن اپنی عقل سے کیا ہے؟ اپنی محبت سے کیا ہے؟ یا اللہ کے حکم سے کیا ہے؟ اللہ کے حکم سے کیا ہے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ [البقرۃ:۳۴]

''ہم نے حکم دیا ملائکہ کو کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔''

تو اللہ کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اگر آدم علیہ السلام کی تعظیم کے لیے اللہ کا حکم چاہیے تو قبر کی تعظیم کے لیے بھی اللہ کا حکم چاہیے۔ اگر کسی جگہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ میرے پیاروں کی قبروں کو اور روضوں کو سجدہ کیا کرو۔ تو ہم بھی حاضر ہیں، ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر اللہ کا حکم نہیں ہے تو پھر سجدہ نہیں ہو سکتا۔ وہاں تو اللہ کا حکم ہے۔

﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ﴾ [الحجر:۳۰]

اللہ کے حکم پر ملائکہ نے سجدہ کیا۔ اسی اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تم کسی غیر کو سجدہ نہ کرو۔

اگر سجدہ غیر اللہ کو جائز ہوتا......؟

ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابی نے میرے آقا ﷺ کے سامنے آکر سوال کیا اور ایک روایت میں ہے کہ سوال نہیں کیا، بلکہ حضور ﷺ کے سامنے سجدہ کیا تو حضور پاک ﷺ نے بلایا اور فرمایا: اللہ کے بندے! تم نے میرے سامنے یہ سجدہ کیوں کیا ہے؟ اس نے کہا: حضور! قیصر اور کسریٰ کے جو بادشاہ ہیں، جو روم کے بادشاہ ہیں اور جو فارس کے بادشاہ ہیں لوگ جب ان بادشاہوں کے دربار میں جاتے ہیں پہلے ہاتھ باندھ کر جھکتے ہیں، پھر بادشاہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، پھر اپنے بادشاہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اگر دنیا کے بادشاہ کو سجدہ کرنا وہ تعظیم سمجھتے ہیں تو آپ تو ہمارے دین کے بھی بادشاہ ہیں اور دنیا کے بھی بادشاہ ہیں آپ تو اللہ کے سب سے افضل رسول ہیں، لہٰذا ہم آپ کو سجدہ کیوں نہ کریں؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: خبردار! اللہ کی ذات کے سوا کسی غیر کو سجدہ جائز نہیں۔ اگر سجدے کی اجازت ہوتی تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، لیکن اللہ کے سوا کسی غیر کا سجدہ جائز نہیں۔ [سنن أبي داود، حديث: ٢١٤٠ باب: في حق الزوج على المرأة، سنن الدارمي، حديث: ١٥١٥]

اب آپ ایمان سے بتلائیں کہ صحابی نے تعظیم کے سجدے کا پوچھا تھا یا عبادت کے سجدے کا پوچھا تھا؟ لوگ بادشاہ کو جو سجدہ کرتے ہیں تعظیم کے لیے کرتے ہیں یا عبادت کے لیے کرتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر سجدہ جائز ہوتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ خاوند کو سجدہ کرتی، اس کی تعظیم کرتی یا عبادت کرتی، لیکن تعظیمی سجدے کی بھی اجازت نہیں، کیونکہ اعلان ہوگیا:

﴿لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ﴾

[حٰم السجدة: ٣٧]

اللہ نے فرمایا: نہ سورج کا سجدہ اور نہ چاند کا سجدہ۔ کیا معنیٰ کہ جو چیزیں دن کو نظر آئیں ان کو بھی سجدہ نہیں اور جو چیزیں تمہیں رات کو نظر آئیں ان کا بھی سجدہ نہیں۔ جو چیزیں روشنی پھیلانے والی ہیں ان کا بھی سجدہ نہیں، جو چیزیں نور پھیلانے والی ہیں ان کا بھی سجدہ نہیں، جو چیزیں اونچی ہوں بلندی میں یا مرتبہ میں ان کا بھی سجدہ نہیں ہے۔ سجدہ ہے تو صرف اللہ کا اگر تم اس کی عبادت کرنے والے ہو۔

اور عبادت اللہ کے سوا کسی غیر کے لیے نہیں ہے، نہ کسی فرشتے کے لیے جائز ہے اور نہ کسی پیغمبر کے لیے جائز ہے، نہ کسی ولی کے لیے جائز ہے۔ ہم اولیاء کی تعظیم کریں گے، مگر جو شریعت کی حدود کے اندر ہے۔ ہم انبیاء ﷺ کی تعظیم کریں گے، مگر جو شریعت کی حدود کے اندر ہے اور ہم اپنے بزرگوں کی تعظیم کریں گے جو شریعت کی حدود کے اندر ہے اور جو چیز حدودِ شریعت سے باہر ہے وہ اسلام سے باہر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پہلی جو صفت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے:

﴿الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ﴾ [البقرۃ:۲۱]

''جس نے تجھے پیدا کیا اور تجھ سے پہلے والوں کو بھی پیدا کیا۔''

یعنی تیرے آباؤ اجداد، حتیٰ کہ جس نے آدم سے لے کر ساری مخلوق کو پیدا کیا۔

حضور ﷺ کی ختمِ نبوت:

یہاں فرمایا: جو تم سے پہلے گزرے ان کو بھی پیدا کیا، قرآن نے یہاں ''مِنْ بَعْدِکُمْ'' نہیں فرمایا، حالانکہ جو ہمارے بعد آئیں گے ان کو بھی اللہ پیدا کریں گے تو یہ اشارہ کر دیا کہ امت محمد مصطفیٰ ﷺ تم آخری امت ہو، تمہارے بعد اور کوئی امت نہیں اور تمہارے نبی کے بعد کوئی نبی نہیں۔

سورۂ بقرہ کی ابتداء میں ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ﴾ [البقرۃ:۴]

وہاں بھی یہ نہیں فرمایا کہ آپ کے بعد، کیونکہ آپ کے بعد کوئی کتاب اور دین نہیں، آپ کے بعد نبوت اور شریعت بند اور اب کوئی کتاب بھی نہیں آئے گی۔

﴿الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ [البقرۃ:۲۱]

تم ڈرنے والے بن جاؤ پرہیزگار بن جاؤ۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مستحق صرف وہی ہے جو پیدا کرنے والا ہے، کیونکہ عبادت کے حکم کے بعد رب کی پہلی صفت ﴿اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ﴾ بیان کی گئی ہے۔ تو جو پیدا کرنے کے قابل نہیں، بلکہ خود مخلوق ہے وہ عبادت کے قابل نہیں ہو سکتا، وہ تو خود پیدا کیا ہوا ہے۔

غیر اللہ کو پکارنا:

تو جب یہ عبادت ہے تو کس کی عبادت ہوگی؟ اللہ کی ہوگی۔ اب کوئی غیر سے مانگ رہا ہے یا نذر مان رہا ہے: یا حسین! یا پنجتن پاک! یا فلاں! تو عطا کر دے، یا شیخ عبد القادر جیلانی! مہربانی فرما، یا فلاں! میرے حال پر رحم فرما۔ اب یہ کیا کہہ رہا ہے؟ عبادت تو اللہ کی ہوتی ہے۔ جب یہ غیر کی کر رہا ہے تو یہ شرک کر رہا ہے۔ کہتے ہیں: ''یا محمد'' لکھو تو وہابیوں کو آگ لگ جاتی ہے۔ ارے! اگر ان کو محمد (ﷺ) کے نام سے آگ لگتی ہے تو ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' بھی نہ پڑھتے، اگر ان کو محمد مدنی ﷺ سے آگ لگتی تو اذان میں ''أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' نہ کہتے۔ تو تکبیر میں بھی نہ کہتے۔ اگر ان کو نبی ﷺ کے نام سے جلن تھی تو نماز میں ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهٗ'' نہ کہتے۔ اگر نبی ﷺ کے نام سے جلن تھی تو نماز والا درود بھی نہ پڑھتے۔ تو معلوم ہوا کہ ان کو جلن نبی ﷺ کے نام سے نہیں، بلکہ عقیدہ کی غلطی سے ہے۔ اللہ کے ساتھ بھی یا حرف نداء ہے اور نبی ﷺ کے ساتھ بھی ''یا محمد'' ہے، ''یا رسول اللہ'' ہے، یا علی! یا دستگیر! جب تو نے حرف ندا لگایا تو اللہ کو پکارنا تھا تو انہوں نے کہا کہ یہ پکارنے والا حرف ندا نہ لکھو، کہیں اللہ کی عبادت میں شرک نہ ہو جائے، کیونکہ دعا مانگنا پکارنا عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ کے لیے ہے، کسی غیر اللہ کے لیے نہیں ہے۔ اگر کسی کو حضور ﷺ کے نام سے دشمنی ہے تو کیا وہ مسلمان ہے؟ وہ تو مسلمان ہی نہیں ہو سکتا، وہ تو کافر ہے۔ حضور ﷺ کا نام تو بڑی چیز ہے، اگر مدینہ سے بھی محبت نہیں ہے تو مسلمان نہیں ہے، حضور ﷺ کے شہر سے محبت نہیں ہے تو مسلمان نہیں ہے، حضور ﷺ کی ذات سے پیار، حضور ﷺ کے صحابہ اہل بیت سے پیار وہ تو ہمارا ایمان ہے، لیکن عبادت اللہ کی ہوگی اور پکارنا عبادت ہے اور ''یا'' کا حرف پکارنے کے لیے ہے۔

آپ دیکھیں! مثلاً: لوٹا لٹکا ہوا ہے یا کہیں پرندے اڑ رہے ہیں تو آپ کہیں گے کہ یہاں پانی ہوگا، کہیں آپ کو بجلی کی لائٹ نظر آئے تو آپ کہیں گے کہ کوئی بستی ہوگی، زیادہ اونچے مینار پر لائٹ نظر آئے تو آپ کہیں گے کہ مسجد ہوگی۔ تو حرف ندا بھی پکارنے کے لیے ہوتا ہے، جب وہ اللہ کے سوا کسی غیر کے ساتھ جڑے اب چاہے کہنے والا ممکن ہے عقیدہ نہ بھی ہو، لیکن ڈر پیدا ہو گیا کہ یہاں سے شرک کا راستہ نہ کھل جائے، اس لیے علماء نے کہا کہ اگر یا غیر اللہ کے ساتھ بھی لکھو تو کہیں شرک پیدا نہ ہو جائے۔ اگر لکھنا ہے تو لکھو ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' اگر لکھنا ہے تو جیسے قرآن میں ہے ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' [الفتح: ۲۹] صرف اتنا لکھو، مجال ہے کہ کوئی اعتراض کرے۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

اللہ کے مستحق عبادت ہونے کی دوسری دلیل:

اور دوسری صفت آئی:

﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً﴾ [البقرۃ:۲۲]

زمین کو بچھونا بنایا، سخت نہیں بنایا پتھر کی طرح کہ تم رہ نہ سکو اور پانی کی طرح نرم نہیں بنایا کہ تم دھنس نہ جاؤ اور آسمانوں کو چھت بنایا۔ اونچی چیز، اوپر چھت کی مثال میں ہے۔ زمین کو بچھانے والا اور آسمانوں کو بنانے والا اللہ ہے تو عبادت کے لائق بھی صرف وہ ہے، جس نے زمینوں اور آسمانوں کو بنایا۔

اگر کوئی یہ سمجھے کہ پھل تو میں نے خود پیدا کیے ہیں، کیونکہ ساری محنت میں نے خود کی ہے تو اللہ نے دوسری جگہ فرمایا:

﴿ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾ [الواقعہ:۶۴]

اور جو تم پانی لگا رہے ہو وہ پانی بھی اللہ نے پیدا کیا ہے اور زراعت کے تمام صلاحیتیں اور اسباب اللہ کے پیدا کردہ ہیں، لہٰذا اصل پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں:

﴿وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾
[البقرۃ:۲۲]

جب یہ سب کرنے والا اللہ ہے، یہ پہلی نہی ہے کہ سب کچھ پیدا کرنے والا بھی اللہ ہے، تم جانتے ہو کہ روزی دینے والا بھی تیرا رب ہے تو پھر ان کو میرا مقابل کیسے بنا رہے ہو جس نے ایک مکھی بھی پیدا نہیں کی؟

محتاج مستحقِ عبادت نہیں ہوسکتا:

تم کعبہ شریف میں ہو، اللہ کے گھر میں ہو، وضو کے ساتھ کھڑے ہو، قیامت میں یوں نہ کہنا کہ ہمیں مسئلہ سمجھ نہیں آیا تھا۔ مانو تو تمہاری مرضی، نہ مانو تو تمہاری مرضی۔ پھر یہ نہ کہنا کہ اللہ کی توحید ہمیں سمجھ نہیں آئی تھی۔ مثلاً: میں مر گیا، میری قبر پر آ کر تم عینک رکھ دو تو کیا میں آ کر ہٹا دوں گا؟ تو اگر میں اتنا تھوڑا سا بوجھ اٹھانے پر قادر نہیں تو تمہاری مشکلیں ہٹانے پر کیسے قادر ہوں؟ تیری مصیبتوں کے دفع کرنے پر کیسے قادر ہوں؟ اسی لیے اللہ نے فرمایا:

﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾

اللہ کے مقابل نہ بناؤ۔

﴿وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۲]

اللہ نے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ جو مر گئے اور جن کو تم کندھا دے کر دفنا آئے ہو، اب وہ کیسے حاجت روا بن گئے؟ وہ تمہارے مشکل کشا کیسے بن گئے؟ اس کو غسل تو نے دیا، اس کے جنازے کو کندھا تو نے دیا، جن کے لیے تو نے قبریں کھودیں، جن کو تو نے دفن کیا ان کے اوپر کمرے، محراب اور روضے تو نے بنا ڈالے ہیں، وہ کیسے مشکل کشا اور حاجت روا بن گئے؟ ان کے لیے سایہ بنانے والا تو ہے، ان کی قبریں کھودنے والا تو ہے، ان کو غسل دینے والا تو ہے اور ان کو دفن کرنے والا تو ہے، کیا اس کے بعد وہ حاجت روا بن جاتے ہیں؟ اس لیے اللہ نے فرمایا: تم جانتے ہو یہ بات یا نہیں جانتے، تمہیں پتہ نہیں ہے کہ تمہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ تیرے باپ کو کس نے پیدا کیا؟ اور تمہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ آسمان کس نے بنایا؟ یہ زمین کس نے بنائی ہے؟

اس لیے قرآن نے بار بار دعوت دی۔ اللہ پاک نے فرمایا:

﴿اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ [النحل:۱۷]

وہ خدا جو پیدا کرنے والا ہے اور وہ جو کچھ پیدا نہیں کر سکتا کیا وہ برابر ہو سکتے ہیں؟

ایک پیدا کرنے والا ہے اور ایک کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتا، ایک پیدا کرنے والا خالق ہے اور ایک پیدا ہونے والا مخلوق ہے، ایک روزی کھانے والا مرزوق اور ایک روزی دینے والا رازق ہے اور قبر کا محتاج بندہ ہے اور غنی خدا ہے۔ اس لیے فرمایا: میرے بندے! تم سب جانتے ہو، پھر بھی تم میرے سامنے شرک کرتے ہو؟ اس لیے فرمایا:

﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۲۲]

توحید کے دلائل کی اقسام:

قرآن پاک میں جہاں توحید کا مسئلہ ذکر کیا گیا ہے وہاں توحید کے دلائل بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ ان میں غور کرو! سوچو! اور اس کے بعد ظاہر و باطن سے اللہ کی توحید کے عقیدے کو قبول کرو۔ اور وہ دلائل مختلف ہوتے ہیں، کبھی ان دلائل کا تعلق آسمانوں سے ہوتا ہے، کبھی ان دلائل کا تعلق زمینوں سے ہوتا ہے، کبھی ان دلائل کا تعلق نفس سے ہوتا

ہے اور کبھی ان دلائل کا تعلق آفاق اور کون سے ہوتا ہے۔

قرآن پاک کتابِ ہدایت وموعظت اور عبرت ہے کہ اس سے ہم ہدایت حاصل کریں۔ قرآن پاک نے ایسی بحثوں کی طرف توجہ ہی نہیں فرمائی کہ چاند کہاں ہے؟ آسمان کے اوپر ہے یا آسمان کے نیچے ہے؟ شمس کہاں ہے؟ نیچے ہے یا کہ اوپر ہے؟ کواکب اور نجوم مُعَلَّقَةٌ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ہیں یا آسمانوں کے اوپر ہیں۔

قرآن پاک میں غور کا طرز:

اللہ تعالیٰ تو ایک جامع اور مانع لفظ استعمال فرمادیتے ہیں، جیسے:

﴿الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً﴾ [البقرة:۲۲]

وہ ذات پاک جس نے زمین کو تمہارے لیے بچھونا بنادیا، وہ ذات پاک جس نے زمین کو تمہارے لیے جھولا بنا دیا، جس پر تم آرام کرتے ہو۔

بعض لوگوں نے اس سے بحثیں نکالی ہیں: جھولے کی حرکت یوں ہوتی ہے اور بعض نے کہا کہ جھولے کی حرکت یوں مستطیل ہوتی ہے یا ابحاث ایسی ہیں کہ ان سے کبھی کسی قوم کو ہدایت نہیں ملی اور نہ فائدہ ہوا ہے۔ اس لیے قرآن مقدس ایسی ایسی چیزوں کی طرف نظر ہی نہیں کرتا اور اسی طرح زمین اگر گول ہو تو اس کی سطح بھی ویسے پھیلتی جاتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کو میخیں بنادیا ﴿وَّالْجِبَالَ أَوْتَادًا﴾ [النباء:۷] تو اب میخ اگر دروازے میں لگائیں گے تو وہ چھوٹی ہوگی۔ اتنی بڑی زمین میں جب میخ گاڑی ہے تو وہ بھی تو اتنی بڑی ہوگی۔ پہاڑوں کی سطح اتنی ہوتی ہے کہ اس پر ہزاروں اور لاکھوں لوگ رہائش رکھ لیتے ہیں۔ تو اس لیے اگر زمین گول ہو تب بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اگر زمین پھیلی ہوئی ہے اور اس کا پھیلاؤ کس طرف ہے؟ ان ابحاث میں پڑنا قرآن کے موضوع سے خارج ہے۔ اگر ہدایت حاصل کرنی ہے تو مٹی کے ذرّے سے بھی حاصل کرسکتے ہیں اور اگر ہم نے ہدایت سے محروم ہونا ہے تو اتنی بڑی بحثیں کرنے والے آج تک اللہ کی توحید کا اقرار نہیں کرسکے۔ اس لیے قرآن مقدس میں اسی انداز میں غور کرنا چاہیے جیسا کہ قرآن اتارا گیا ہے۔ قرآن کیوں اتارا گیا ہے؟

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ [البقرة:۲]

﴿إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝ يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ﴾ [الجن:۱،۲]

قرآن پاک ہماری ہدایت و موعظت کے لیے آیا ہے، قرآن پاک ہماری ظاہری و باطنی اصلاح اور تزکیہ کے لیے آیا ہے۔ قرآن مقدس کا یہ اسلوب ہی نہیں کہ وہ تاریخ کے قصے بیان کرے، قرآن پاک کا یہ اسلوب ہی نہیں ہے کہ جہاں ستاروں کا ذکر آجائے وہ فلکیات کی بحثوں میں الجھ جائے، قرآن پاک کا یہ موضوع ہی نہیں ہے کہ جہاں زمین کا ذکر آئے زمین کی ابحاث میں پڑ جائے۔

فقاہتِ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا عجیب واقعہ!

اسی لیے ایک بڑا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور حضرف سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ...... اللہ پاک ان دونوں پر اور تمام ائمہ پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے...... کہ ایک آدمی نے حضرت سفیان رحمہ اللہ سے مسئلہ پوچھا، اس نے کہا: میں نے قسم کھائی ہے "وَاللّٰہِ! لَا اٰکُلُ اللَّحْمَ" (مجھے اللہ کی قسم! میں گوشت نہیں کھاؤں گا) میں نے قسم کھالی، لیکن انسان ہوں، آج میں نے مچھلی کھالی ہے تو اب میری قسم باقی ہے یا میری قسم ٹوٹ گئی؟ حضرت سفیان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تمہاری قسم ٹوٹ گئی ہے، تم کفارہ ادا کرو۔ اور قسم کا کفارہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا لگا تار تین روزے رکھے۔ اتفاق سے اس آدمی نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی رجوع کر لیا اور ان سے یہ مسئلہ پوچھا کہ میری قسم کا کیا بنے گا؟ انہوں نے فرمایا: تمہاری قسم نہیں ٹوٹی ہے، کفارہ بھی نہیں ہے۔ اب وہ غریب پریشانی میں مبتلا ہو گیا کہ ایک عالم کہتا ہے: تمہاری قسم ٹوٹ گئی ہے اور کفارہ ادا کرو اور ایک عالم فرماتے ہیں: تمہاری قسم نہیں ٹوٹی۔ میں کدھر جاؤں؟

وہ پھر حضرت سفیان رحمہ اللہ کی خدمت میں آگیا اور ان سے کہا: حضرت! عجیب بات ہے! آپ فرماتے ہیں کہ قسم ٹوٹ گئی اور کفارہ ادا کرو اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ قسم نہیں ٹوٹی۔ تو حضرت سفیان رحمہ اللہ غصہ میں آگئے، انہوں نے فرمایا: یہ عجیب بات ہے! یہ اپنی عقل سے ایک فتویٰ دے دیتے ہیں اور اللہ کے قرآن کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ قرآن نے نہیں فرمایا: "لَحْمًا طَرِیًّا" (النحل: ۱۴) کہ مچھلی کو اللہ کا قرآن کہتا ہے "تر و تازہ گوشت"۔ جب قرآن میں مچھلی پر "لَحْمًا" کا اطلاق آگیا ہے تو تم نے بھی قسم کھائی تھی کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا تو قسم ٹوٹ گئی، قرآن کے مطابق یہ لفظ موجود ہے اور امام ابوحنیفہ نے اللہ کے قرآن کے خلاف کیسے فتویٰ دے دیا؟

وہ آدمی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس آگیا اور کہا: آپ نے کہا کہ قسم نہیں ٹوٹی ہے اور حضرت سفیان نے فرمایا کہ قسم ٹوٹ گئی۔ اور میں پھر دوبارہ آگیا تو وہ ناراض بھی ہوگئے کہ امام ابوحنیفہ قرآن کی مخالفت کر رہا ہے۔ امام

صاحب نے پوچھا: میں نے قرآن کی مخالفت کیسے کردی؟ انہوں نے کہا کہ قرآن پاک نے کہا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا﴾ [النحل:۱۴]

امام صاحب نے فرمایا: ایسا کرو کہ ابھی حضرت غصہ میں ہیں، ابھی تم کچھ نہ کہو۔ دو چار روز کے بعد تم واپس آجانا، پھر مسئلے کا حل کریں گے۔

دو چار روز کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھیج دیا کہ حضرت سفیان سے پوچھو: میں نے قسم کھائی ہے کہ میں بستر پر نہیں سوؤں گا اور میں مٹی پر سو گیا تو میری قسم ٹوٹ گئی یا نہیں ٹوٹی؟ تو امام صاحب لازماً کہیں گے کہ نہیں ٹوٹی کہ تم نے تو قسم کھائی تھی بستر پر سونے کی اور تم تو مٹی پر سوئے ہو اور جب وہ کہیں کہ قسم نہیں ٹوٹی تو تم کہنا کہ تم قرآن کی مخالفت کرتے ہو، کیونکہ قرآن میں تو ہے:

﴿الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً﴾ [البقرۃ:۲۲]

زمین کو ہم نے تمہارے لیے بستر بنا دیا ہے۔

جب قرآن نے زمین کو بستر کہا ہے تو میری قسم کیسے نہیں ٹوٹی؟ تو وہ آدمی آیا اور امام صاحب سے آکر مسئلہ پوچھا: میں نے قسم کھائی تھی کہ میں بستر پر نہیں سوؤں گا، لیکن آخر انسان ہوں، تھک گیا تو مٹی پر سو گیا، تو میری قسم ٹوٹ گئی یا نہیں ٹوٹی؟ انہوں نے فرمایا: تمہاری قسم نہیں ٹوٹی۔ بستر علیحدی چیز ہے اور مٹی علیحدہ چیز ہے۔ اس نے کہا کہ قرآن نے تو مٹی کو بھی بستر کہا ہے:

﴿الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً﴾ [البقرۃ:۲۲]

تو پھر میری قسم ٹوٹنی چاہیے؟ تو فوراً امام صاحب کا خیال آیا اور فرمایا: ''رَحِمَ اللّٰهُ أَبَا حَنِيفَةَ'' (اللہ ابوحنیفہ پر رحمت کرے) تو انہوں نے فرمایا کہ یہ تمہاری عقل نہیں ہے، یہ انہوں نے تمہیں مسئلہ سمجھایا ہے اور انہوں نے مجھے سمجھانے کے لیے تمہیں بھیجا ہے۔ اللہ ان پر رحمت کرے، ان کی بات ٹھیک ہے۔ تمہاری قسم نہیں ٹوٹی، کیونکہ قسم کو دیکھنا پڑے گا کہ لوگوں میں کیا رواج ہے؟ لوگ چونکہ مچھلی اور گوشت میں فرق کرتے ہیں۔ نوکر کو پیسے دیں گے کہ مچھلی لے آؤ تو وہ گوشت لے کر آئے تو ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں گے کہ میں نے تو مچھلی کہا تھا، گوشت تو نہیں کہا تھا۔ اور کہے کہ گوشت لے آؤ اور وہ مچھلی لے آئے تب بھی جھگڑا کریں گے۔ لوگوں میں اور عرف عام کے اندر مچھلی

علیحدہ چیز سمجھی جاتی ہے اور گوشت علیحدہ سمجھا جاتا ہے۔ بستر علیحدہ سمجھا جاتا ہے اور مٹی علیحدہ سمجھی جاتی ہے۔ تو قسم کا معاملہ ہمیں عرف پر دیکھنا پڑے گا یہ نہیں کہ لفظوں کی بحث میں ہم پڑ جائیں۔

اکابر کا اختلاف علم کی بنیاد پر تھا:

لغت کے اعتبار پر لفظ کا اعتبار ہو سکتا ہے، لیکن پہلے زمانے میں اختلاف بھی اللہ کے لیے ہوتا تھا اور فیصلہ بھی اللہ کے لیے ہوتا تھا۔ اس لیے بڑے بڑے علماء میں اختلاف ہو گئے، لیکن کبھی کسی نے کسی کو گالی نہیں دی، کبھی کسی نے کسی کو برا نہیں کہا، کبھی کسی نے کسی کا حسب اور نسب نہیں جانچا اور کبھی کسی نے کسی کو طعنہ نہیں دیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا کہ وہ غلط کہتے ہیں، دلائل کا تقاضا یہ ہے۔ جب ان کو دلائل میں جواب مل گیا تو انہوں نے کہا کہ تحقیق ہو گئی، میں بھولا ہوا تھا۔ اللہ کی مہربانی ہوئی، مجھے دلائل مل گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان پر رحمت کرے کہ مجھے ایک سچی بات سمجھا دی۔ اب جو جھگڑے ہوتے ہیں دراصل جھگڑا ہمارا ذاتی ہوتا ہے اور ہم اس کو مذہب کے نام پر استعمال کرتے ہیں۔ اصل میں ہمارا ایک تعصب ہوتا ہے، کسی کی عزت کو دیکھ کر ہم جلیں گے، کسی کی عظمت کو دیکھ کر ہمیں حسد پیدا ہوتا ہے۔ اب ہم اگر اس کا ظاہری جھگڑا کریں گے کہ مجھے اس سے بڑی جلن ہے تو اس سے وہ خود بدنام ہوتا ہے تو وہ مذہب کو ڈھونڈے گا کہ فلاں غلط مسئلہ ڈھونڈتا ہے، فلاں معاملہ میں وہ قرآن کا مخالف ہے، فلاں معاملہ میں وہ حدیث کا مخالف ہے، اپنی ذاتی جھگڑوں کو ہم دین کا لبادہ اوڑھا دیتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ جھگڑے آج تک چلے آرہے ہیں۔ دین کا تو جھگڑا ہی نہیں ہے۔ دین کا اگر جھگڑا ہو تو دو عالم اکٹھے بیٹھ جائیں، فیصلہ کر لیں، لڑنے کی کوئی بات ہی نہیں ہے اگر کسی مسئلہ میں اختلاف واقع ہو بھی جائے۔

اب آپ دیکھیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں مسائل میں اختلاف ہو جاتے تھے، کتنے بڑے مسائل ہیں جن میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپس میں بڑا اختلاف ہے، لیکن اللہ ان سب پر کروڑوں رحمتیں فرمائے ان کا اسلوب ایسا تھا کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کبھی ایک دوسرے کی شان میں کوئی کمی کی ہو، کبھی ایک دوسرے کی شان میں کوئی کوتاہی کی ہو۔ ان کو مسئلہ پہنچا تو کہا کہ ہو سکتا ہے کہ مجھے حدیث مبارک نہ ملی ہو، چلو میں ان سے جا کر رجوع کر لیتا ہوں، پوچھ لیتا ہوں کہ بھائی! آپ نے جو فتویٰ دیا ہے تو یہ کس دلیل کی بنیاد پر دیا ہے؟ تمہارے پاس اس مسئلے کہ دلیل کیا ہے؟ کتنے مسئلے ہیں کہ جن میں بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپس میں اختلاف ہے؟ کتنے مسائل ہیں کہ ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا آپس میں اختلاف ہے؟ کتنے بڑے مسائل ہیں

کہ جن میں اختلاف ہو گئے؟ آپ نے دیکھا نہیں کہ صحابہ ؓ کی آپس میں جنگیں ہو گئیں؟ سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ اور حضرت علی ؓ کا آپس میں قتال ہو گیا، آپس میں جھگڑا ہو گیا اور نوبت اس مقام تک پہنچی کہ ہزاروں صحابہ ؓ اور تابعین ؒ شہید ہو گئے۔ یعنی سامنے جنگ ہو رہی ہے اور اب سیدہ عائشہ ؓ کے اونٹ کو تیر لگا اور اونٹ زخمی ہوا اور بی بی عائشہ ؓ کا ہودج اونٹ سے گرا تو سب سے پہلے دوڑ کر پردے ڈالنے والے بھی حضرت علی ؓ تھے اور کہا کہ اماں جان! آپ نے مجھے بھی برباد کر دیا اور آپ بھی پریشان ہوئیں۔...... کیونکہ ماں ہے اور ماں بیٹے میں ایک بات ہو گئی۔ وہ ماں کے درجہ میں ہے اور وہ بیٹے کے درجہ میں ہے۔

اور دونوں کا یہ عالم تھا کہ ایک آدمی بی بی عائشہ ؓ کے قریب سے گزرا تو اس نے کہا: اے اماں عائشہ! تمہیں یاد ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ حجرے سے باہر نہ جانا؟ آج گھر سے باہر جانے کا نتیجہ مل گیا ہے اور دوسرا آدمی حضرت علی ؓ کے پاس سے گزرا اور کہا: اے علی! قیامت کے دن حضور ﷺ نے پوچھ لیا کہ میری بیوی کا مقابلہ کیا تھا؟ تم نے اپنی ماں سے لڑائی لڑی تھی؟ تو کیا جواب دو گے؟ حضرت علی ؓ نے فوراً اپنی مہار موڑ لی دونوں رو رہے ہیں اور دشمنوں نے درمیان میں لڑائی کرا دی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب کے گناہ لڑائی کے بعد بھی معاف فرما دیے، ان کے دلوں میں کوئی کھوٹ نہیں تھا، ان کے دلوں میں کوئی کھوٹ ہو......!؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت معاویہ ؓ اور حضرت حسین ؓ کے باہمی تعلقات:

اب دیکھیں! سیدنا معاویہ ؓ اور سیدنا حسن ؓ نے صلح فرما لی۔ سیدنا معاویہ ؓ نے کئی دفعہ ان کی طرف ہدیے بھیجے۔ ایک دفعہ اس زمانہ میں حضرت حسن ؓ کو تیس ہزار درہم کا ہدیہ بھیجا۔ حضرت حسن ؓ نے اسی دن خیرات کر دیا۔ حضرت امیر معاویہ ؓ کو اطلاع ملی کہ جو ہدیہ بھیجا تھا وہ ختم ہو گیا تو حضرت نے ان کو خط لکھا کہ تم اللہ کے نبی کے نواسے ہو، محمد عربی ﷺ کے بیٹے ہو، تمہاری اتنی بڑی شان ہے اور میرے دل میں عظمت ہے، مہربانی کیا کرو ''لَا خَيْرَ فِي الْإِسْرَافِ'' اپنے مال کو ایسے لٹا دینے میں بھلائی نہیں ہوتی۔ اگر اللہ مال عطا فرمائے تو اس کو کچھ اپنے لیے اور نظم کے لیے بھی تو کچھ رکھو۔ یہ نہیں کہ جتنا آئے اس کو ایک دن میں لٹا دو اور دوسرے دن کے لیے بیٹھے رہو ''لَا خَيْرَ فِي الْإِسْرَافِ'' اسراف کرنا، مال کو بے تحاشا لٹا دینا اچھا نہیں ہوتا۔ حضرت حسن ؓ کو خط ملا، آپ نے خط پڑھا تو اسی خط میں نیچے لکھا: ''مِنَ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ إِلَى مُعَاوِيَةَ'' اور ایک لفظ لکھا،

انہوں نے لکھا تھا "لَا خَیْرَ فِی الْاِسْرَافِ" تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے لکھا "وَلَا اِسْرَافَ فِی الْخَیْرِ وَالسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ" (بھلائی میں اسراف ہوتا ہی نہیں) اسراف تو تب ہوتا ہے جب میں پیسے کو ناجائز لٹا دیتا۔ اگر پیسے کو میں نے خیر میں لٹایا ہے تو اس میں کوئی اسراف نہیں ہوتا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو جب خط ملا تو آپ مسکرا اٹھے اور فرمایا کہ سید کے ہاتھ کون روکے گا؟ اور درہم ان کی خدمت میں بھیجو۔

ان کی آپس میں اتنی محبتیں ہیں، اتنا اتحاد ہے اور اتنا پیار ہے اور کیوں نہ پیار ہو!! حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے بیٹے ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا سگا بھائی ہے اور کاتب وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ان میں جو جھگڑے ہیں وہ دراصل سبائیت نے پیدا کیے، یہودیت کے ذہن نے پیدا کیے۔ انہوں نے در پردہ اپنے کچھ لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملا دیا اور کچھ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملا دیا، کچھ کو حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ ملایا اور کچھ کو کوفہ والوں کے ساتھ ملا دیا، کچھ نے خطوط لکھ کر بلوایا، ان کو آپس میں لڑوا کر شہید کر دیا، کچھ شہادت کے علمبردار بن گئے اور کچھ مخالفوں کے ساتھ مل گئے۔ اصل میں وہ یہودی تھا جو اس زمانے سے لے کر آج تک اسلام کے خلاف عمل پیرا ہے۔ آج تک دشمنی پھیلا رہا ہے، لیکن مسلمان سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

مسلمانوں کے باہمی جھگڑے:

ورنہ دنیا میں کون سے جھگڑے ہیں؟ دیکھیں! آج اگر آپ بحث کریں تو پوری دنیا میں کوئی آدمی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانتا ہو؟ یہ بتائیں کہ جو آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانے وہ مسلمان ہے؟ تو پھر یہ کیا جھگڑا ہے کہ کبھی صلوۃ وسلام پر جھگڑا، کبھی اذان پر جھگڑا اور کبھی "یا رسول اللہ" کے بورڈ لگانے پر جھگڑا۔ جب ہم سارے نبی علیہ السلام کو مانتے ہیں، کلمہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھتے ہیں، کہلاتے بھی اہل سنت والجماعت ہیں، سب کی فقہ بھی ایک ہے، کتاب اللہ بھی ایک ہے، ہر کسی کے مدرسہ میں صحاح ستہ بھی پڑھایا جاتا ہے اور ہر مدرسہ کا مولوی جب فتویٰ لکھے گا تو فتویٰ کی کتابیں بھی ایک ہیں، پھر جھگڑا کس بات کا ہے؟

چار عالم بٹھا دو، کیا حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان سے پہلے صلوۃ وسلام پڑھے ہیں؟ تو اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا، اگر نہیں پڑھے تو تم چھوڑ دو، لڑنے کی بات ہی کوئی نہیں ہے۔ اگر یہ دین ہوتا تو سب سے پہلے حضرت بلال رضی اللہ عنہ عمل کرتے،

کیونکہ حضور ﷺ کا مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہے۔اوراذان ایک مرتبہ نہیں، بلکہ دن میں پانچ مرتبہ ہوتی ہے اور حضور ﷺ کی نبوت کے بعد کی زندگی پچیس سال ہے۔پچیس سالوں میں ابتدائی دس سال مکہ کے انتہائی سخت حال تھے، بعد کے جو چودہ پندرہ سال ہیں اسلام کی عزت کے سال ہیں۔ان پندرہ سالوں میں کتنی اذانیں ہوئی ہوں گی؟ دن میں اگر پانچ اذانیں ہوں تو مہینہ میں ڈیڑھ سو اذانیں ہوئیں اور سال میں اٹھارہ سو اذانیں ہوگئیں اور پندرہ سال میں گن لیں کہ کتنی اذانیں ہوئیں؟ تو اتنے سال جو حضور ﷺ کے زمانے میں اذانیں ہوئیں ہیں، اگر صلوۃ وسلام پڑھا گیا اور بعد میں صلوۃ وسلام پڑھا گیا ہر اذان سے پہلے:

﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَٰئِكَتَهُۥ يُصَلُّونَ عَلَى ٱلنَّبِيِّ ۚ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ صَلُّوا۟ عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا۟ تَسْلِيمًا ﴿٥٦﴾﴾ [الاحزاب:۵۶]

یہ آیت پڑھی گئی۔حضرت بلال، حضرت ابی محذورہ اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہم تین آدمی ہیں، جو حضور ﷺ کے زمانے میں موذن تھے۔اگر انہوں نے پڑھا ہے تو اٰمَنَّا وَ صَدَّقْنَا اور اگر انہوں نے نہیں پڑھا ہے تو بدعت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اسلام میں جھگڑے ڈالنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

اور اسی طریقہ پر ''یارسول اللہ'' کے لفظ پر جھگڑا ہے۔اگر سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں ''یارسول اللہ'' کے بورڈ لگوائے ہیں تو تم بھی لگوالو، اگر انہوں نے نہیں لگوائے تو تم ان سے زیادہ عاشق نہیں ہو۔سب سے زیادہ محبت کا دعویٰ تم کرو تو یہ جھوٹا دعویٰ ہوسکتا ہے، سچا دعویٰ ہو ہی نہیں سکتا، ان کے مقابلہ میں ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔اور ہمارا ایمان ہے کہ ساری دنیا کے اولیاء بھی اکٹھے کرو تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے قدم کے برابر بھی نہیں ہوسکتے، ہمارا ایمان ہے کہ ساری دنیا کے پیر اور بزرگ اکٹھا کریں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک پاؤں کے برابر بھی نہیں ہوسکتے اور ہمارا ایمان ہے کہ ساری دنیا کی محبت ایک طرف رکھیں اور صحابہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کی محبت ایک ترازو میں رکھیں، ان کی محبت کا پلڑا بھاری ہوجائے گا وران کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔تو یہ کہنا کہ قرآن میں تو نہیں ہے، حدیث میں تو نہیں ہے، ہم محبت کے لیے کرتے ہیں تو کیا محبت ان میں نہیں تھی......؟ کیا وہ اس محبت سے محروم تھے......؟ کیا ان کو محبت کا طریقہ نہیں آتا تھا......؟

خوارج کا اہل بیت رضی اللہ عنہم سے تعصب:

دین کے نام پر کوئی بات ہو تو ایک منٹ میں طے ہوجاتی ہے، کیونکہ اللہ کا قرآن موجود ہے، احادیث رسول

پاک ﷺ موجود ہیں۔ اب آپ اندازہ کریں کہ خارجی فتنہ جو سب سے بڑا فتنہ ہے اور سب سے گمراہ فرقہ نواصب کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے شر سے بچائے۔...... اللہ معاف فرمائے...... وہ اتنے بڑے ظالم تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اتنے بڑے دشمن تھے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مسلمان ماننے کے لیے بھی تیار نہیں اور ان لوگوں کی اس زمانہ میں دشمنی کا یہ عالم تھا کہ خوارج کی اگر کوئی خوبصورت لڑکی ہوتی اور لوگ رشتہ مانگنے کے لیے آتے کہ میں تیری لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا ہوں تو وہ لڑکی یہ کہتی کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کا سر کاٹ کر لے آؤ، تب میں تیرے ساتھ شادی کروں گی۔ یعنی ان کی دشمنی کا یہ عالم تھا!!۔ بعض کا یہ عالم تھا آپس میں جنگیں لڑتے لڑتے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مجبور کر دیا، انہوں نے مدینہ شریف چھوڑ دیا۔ یہ سب خوارج کا فتنہ تھا۔

ایک آدمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ جن خوارج سے ہم لڑ رہے ہیں وہ کافر ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ کفر سے تو بھاگے ہوئے لوگ ہیں، ہم ان کو کافر کیسے کہیں؟ اس نے کہا کہ حضرت! یہ منافق ہیں؟ فرمایا: منافق بھی نہیں ہیں۔ منافقین کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

﴿وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ [النساء:۱۴۲]

''وہ اللہ کا ذکر تھوڑا کرتے ہیں۔''

اور یہ تو رات دن بد بخت قرآن پڑھتے ہیں، ان کو منافق ہم کیسے کہیں؟ تو اس نے کہا: حضرت! یہ کافر بھی نہیں ہیں، منافق بھی نہیں ہیں، پھر لڑائی کس بات کی ہے؟ آپ نے فرمایا: بھائی ہیں اور یہ ہمارے خلاف لڑ رہے ہیں، ہم بھی ان کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ بات اتنی ہے کہ جو باغی ہوگا ہم اس سے لڑیں گے، جو اللہ کے اسلام کے اندر نقصان ڈالے گا ہم اس سے لڑیں گے۔ تو اس حکم کے مطابق ہم لڑ رہے ہیں، اپنے قاتل ہیں، لڑنے والے ہیں۔ لیکن احتیاط اتنی ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ کافر ہو گئے، یہ نہیں فرمایا کہ منافق بن گئے، کہتے ہیں کہ ٹھیک ہیں، بھائی ہیں، کلمہ جو پڑھتے ہیں، باقی اس لیے لڑ رہے ہیں کہ ہر باغی سے لڑا جاتا ہے۔ اللہ کے قرآن کا حکم ہے:

﴿فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ﴾ [الحجرات:۹]

اگر مسلمان امن سے رہ رہے ہیں اور کوئی آدمی فتنہ بغاوت اٹھاتا ہے تو اس کے ساتھ قتال کرنا ہوگا، اس نے ہمارے امن کو چھیڑا ہے اور ہم مجبور ہو گئے ہیں ان سے لڑنے کے لیے۔

مذہبی تعصب:

آج ہمارا تو یہ عالم ہے کہ جو آدمی انگوٹھے نہ چومے اس کو مسجد سے نکال دو، یہ تو اہل سنت بھی نہیں ہے۔ اب مصیبت یہ بن گئی کہ ہر پارٹی کی پگڑی بھی الگ ہے۔ اگر ان کی پگڑی نہ پہنو تو ایمان سے خارج ہے...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... پھر اگر بات کرو تو کہتے ہیں کہ یہ تو جنت کا رنگ ہے، سبز رنگ تو جنتی رنگ ہے۔ سبز رنگ کا کیا صحابہ ﷺ کو پتہ نہیں تھا؟ تمہیں پتہ چلا ہے کہ یہ جنتی رنگ ہے؟ حضور ﷺ نے اپنی کوئی جماعت بنائی سبز پگڑیاں پہننے والی یا سیاہ پگڑیاں پہننے والی؟ کبھی حضور ﷺ نے خود سیاہ پگڑی پہنی یا سفید پگڑی پہننے والی جماعت بنائی؟ جب مکہ فتح کرنے کے لیے میرے مدنی ﷺ آئے تو آپ کے سر مبارک پر سیاہ پگڑی تھی، لیکن جب کسی ایک رنگ کو ہم پارٹی کا رنگ بنائیں گے تو وہ اسلام کے خلاف ایک فتنہ بن جائے گا۔ آپ سبز پہنیں یا سیاہ پہنیں یا سفید پہنیں، جو مرضی آئے پہنیں، تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کر دیا ہے، لیکن جب میں کہوں کہ میری پارٹی کا وہ رنگ ہے، جب وہ کرتہ ایسا پہنے، وگرنہ وہ میری پارٹی کا بھی نہیں۔ جب ہم مسائل پیدا کریں گے تو پھر دنیا میں جھگڑے پیدا ہوں گے، پھر دنیا میں تنافر پیدا ہوگا اور پھر دنیا کے اندر فرقہ بندی پیدا ہوگی۔ ہر فرقہ کا لباس اپنا، وردی اپنی، ہر فرقہ کا جھنڈا اپنا، پیڈ اپنا اور مونوگرام اپنا۔ کیا کر رہے ہو......؟ اسلام کو ٹکڑوں میں تقسیم کر رہے ہو؟...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ......

دعا کریں کہ اللہ سب کو ہدایت عطا فرما دے۔ اللہ کے کعبہ میں ہو، دعا کیا کرو کہ یا اللہ! سب کے سینے اپنے قرآن کے لیے کھول دے، سب کو توحید و سنت سمجھنے کی توفیق عطا فرما، سب لوگوں کو بدعات کے جنگلوں سے نکال دے اور سب لوگوں کو جھگڑوں اور فتنوں سے نکال دے۔

نفاذِ اسلام میں ایک رکاوٹ یہ ہے:

دیانتداری سے اللہ کے کعبہ میں بیٹھ کر کہتا ہوں کہ کئی دفعہ مجھ سے لوگوں نے پوچھا ہے کہ اسلام کا قانون نہیں بناتے؟ یہ بڑے ظالم لوگ ہیں، فلاں نے وعدہ کیا، لیکن نہیں بنایا۔ تو میں کہتا ہوں کہ اسلام کا قانون تب تک نہیں بن سکتا جب تک تم اسلام کا نام لینے والے مولوی، اسلام کے نام پر روٹی کھانے والا مولوی، اسلام کے نام پر زکوٰتیں وصول کرنے والا مولوی، اسلام کے نام پر چندے مانگنے والا مولوی، اسلام کے نام پر مدرسے گزران

العلوم بنانے والا مولوی جب تک تم اکٹھے نہیں ہو گے، اسلام نہیں آئے گا۔ اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تم ہو۔ اسلام کے راستے میں جب تم اکٹھے ہوئے اور اجتماعی طاقت بنالی تو ایک ایسا آدمی جس کو ختم نبوت کے معنی بھی نہیں آتے تھے اس کو فیصلہ لکھنا پڑا کہ ختم نبوت حق ہے اور قادیانی غیر مسلم ہیں۔ تم نے اپنی طاقتوں کو متحد کیا تو قرار دادِ مقاصد پاس ہوگئی اور تم نے اپنے معاملات کو اکٹھا کیا تو گستاخ رسول کی سزا موت قرار دی گی۔ جب تم لڑو گے تو اسلام کے آگے سب سے بڑی رکاوٹ تم مولوی ہو۔ ہر مولوی اپنا ڈیڑھ اینٹ کا فتنہ بنانا چاہتا ہے۔ ایک آدمی کہتا ہے: نظام مصطفیٰ ﷺ ہو، ہر ایک کہتا ہے: نفاذِ شریعت ہو، ہر ایک کہتا ہے: آئین شریعت ہو، مگر باہمی اتحاد نہیں ہوتا...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ......

قیامت کا دن ہوگا، اللہ کا دربار ہوگا، تم حضور ﷺ کے سامنے ہو گے۔ پھر پتہ چلے گا جب جواب دو گے کہ اسلام کے نام پر روٹیاں کھائیں، مسلمانوں کو لڑاتے رہے، مسجدوں کی چھتوں پر اسپیکر باندھ کر ایک دوسرے کو گالیاں دیتے رہے، بلاوجہ سر پھاڑتے رہے، اللہ کے کعبہ سے چھڑوا کر لوگوں کو قبروں کے طواف کراتے رہے اور خدا کے سجدے سے ہٹا کر غیروں کے دروازے پر گزارتے رہے۔ تم لوگوں نے یہ سب کچھ کیا ہے، ہمارے پاس تو دعاؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔

یاد رکھو کہ جب غرناطہ اور اسپین میں مسلمانوں کی عصمتوں کو لوٹا جا رہا تھا تو تم اس مسئلے میں مبتلا تھے کہ کوا حلال ہے یا حرام ہے؟ تم اپنی تاریخ اٹھا کر دیکھو کہ اسپین سے اسلام کو کس نے در بدر کیا ہے؟ جب تم اسلام کے نام پر ایک قوت بنو گے، کیا جھگڑا ہے تمہارا؟ کیا ہر پارٹی کا قرآن علیحدہ ہے؟ جھگڑا کیا ہے؟ تفرقہ کیا ہے؟ اندازہ فرمائیں کہ چودہ سو سال گزر گئے آج بھی اگر کوئی آدمی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو گالیاں دیتا ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کو گالی دیتا ہے، امام مالک رحمہ اللہ کو گالی دیتا ہے، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو گالی دیتا ہے اور فقہائے امت کو گالی دیتا ہے تو وہ اپنی عاقبت کو خراب کر رہا ہے، ورنہ دنیا کے اندر کروڑوں لوگ ہیں جو کہتے ہوں گے ''رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ'' اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

اسلام میں رواداری:

اس لیے اسلام ہمیں حکم دیتا ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران: ۱۰۳]

اسلام سلامتی کا مذہب ہے، ایمان امن کا مذہب ہے، اسلام ہمیں جوڑنے کے لیے آیا ہے، توڑنے کے لیے نہیں آیا، اسلام اوس اور خزرج کو ملانے کے لیے آیا ہے، جدا کرنے کے لیے نہیں آیا اور اسلام نے ہمیں وہ سبق دیا ہے کہ تم اپنے اوپر دوسرے کو ترجیح دے دو:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر:۹]

خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلانے کا سبق اسلام نے دیا ہے، کسی کے منہ سے نوالہ چھیننے کا حکم نہیں دیا ہے۔ اسلام نے تو ہمیں اتنی رواداری بخشی ہے! میرے پاک نبی ﷺ کے سامنے ایک بدو نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم مارنے کے لیے اٹھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھہر جاؤ! کچھ نہ کہو! اس کو پیشاب کرنے دو۔ مسجد دھل سکتی ہے، لیکن یہ بیمار نہ ہو جائے۔ اگر اس آدمی کا پیشاب راستے سے کٹ گیا تو یہ بیمار ہو سکتا ہے۔ اگر مارو گے تو وہ بھاگتا رہے گا اور پیشاب کرتا رہے گا۔ [صحيح البخاري، حديث: ٦٠٢٥، باب: الرِّفْقِ فِي الأَمْرِ كُلِّهِ]

وہ اللہ کے پیغمبر ﷺ جنہوں نے دشمنوں کو سینے سے لگایا، تم کلمہ تو ان کا پڑھتے ہو اور فتنے کھڑے کرتے ہو، کلمہ تم ان کا پڑھتے ہو اور مسجدوں میں سر پھٹول کرواتے ہو۔ شرم آنی چاہیے کہ جب کفار کے ملکوں میں تمہارے جھگڑوں کی وجہ سے انہیں مسجدوں میں کتے چھوڑنے پڑے تو آدمی کو ڈوب مرنا چاہیے۔ مسلمان کو چاہیے اتحاد، امن، سلامتی، رواداری، وسعتِ قلب، ایک دوسرے کی بات کو محبت اور تحمل سے برداشت کرنا اور دعوت دینا۔ اسلام نے تشدد کا حکم نہیں دیا۔ جو لوگ دین کے نام پر ایسی باتیں کرتے ہیں ان کے لیے بھی اللہ سے ہدایت کا سبق مانگیں، اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں بھی ہدایت عطا فرمائے اور اللہ ان تمام کو اتحاد، اتفاق اور محبت نصیب فرمائے۔

سب سے بڑا گناہ:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

((أَيُّ الذَّنْبِ أَعْظَمُ عِنْدَ اللهِ؟ قَالَ: أَنْ تَجْعَلَ لِلَّهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ))

''اے اللہ کے رسول ﷺ! سب سے بڑا گناہ اللہ کے نزدیک کیا ہے؟ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کا شریک بناؤ، جس نے تمہیں پیدا کیا، تم اس کا مقابل بناؤ۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۴۴۷۷، باب قَوْلِهِ تَعَالَى: فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا]

جیسے تم اللہ کی تعظیم کرتے ہو، ویسے اس کے غیر کی تعظیم کرو اور جیسے تم اللہ کی عبادت کرتے ہو، غیر کی بھی تم عبادت کرو۔ یہ شریک بنانے کا معنی ہے۔ بعض لوگ شریک بنانے کا معنی سمجھتے ہیں کہ اگر دو خدا بنا لے تو وہ شریک ہے، حالانکہ شریک دو خدا بنانے کا نام نہیں ہے، بلکہ شریک کا معنی یہ ہوتا ہے کہ رزق دینے والا اللہ ہے۔ اب اگر کوئی کسی اور سے رزق مانگے تو اللہ کا شریک بنا لیا۔ خالق اللہ ہے، مالک اللہ ہے، بچے دینے والا اللہ ہے اور نفع ونقصان کا مالک اللہ ہے، اگر کوئی کسی غیر کو بھی نفع ونقصان کا مالک سمجھے تو گویا اللہ کے مقابلے میں شریک بنا لیا۔ اس لیے فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ جس نے اس کو پیدا کیا یہ مخلوق ہو کر اللہ کا شریک بنا رہا ہے۔

اسی طرح حضرت معاذ ؓ کی مشہور حدیث ہے، فرمایا:

((أَتَدْرِیْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلٰی عِبَادِهٖ؟))

''اے معاذ! تم جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟''

اس صحابی نے عرض کیا: حضور ﷺ ارشاد فرمائیں! تو فرمایا:

((أَنْ یَّعْبُدُوْهُ وَلَا یُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْئًا)) [صحیح البخاری، حدیث:۶۵۰۰، باب: مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِي طَاعَةِ...]

''اسی کی خالص عبادت کریں اور اس میں کسی کو شریک نہ کرو (اللہ نے تمہیں پیدا ہی اس لیے کیا ہے)۔''

اور دوسری حدیث پاک میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: مجھے یہ نہ کہا کرو کہ جیسے اللہ چاہے اور آپ چاہیں، کیونکہ اللہ کے ساتھ تم مجھے ملا رہے ہو، بلکہ اصل مشیت تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے کہ جو اللہ چاہیں گے وہی ہوگا۔ اور اس کے بعد آپ فرمائیں کہ آپ کی کیا خواہش ہے؟ اس لیے فرمایا کہ اتنا لفظ بھی نہ کہو۔

جیسا کہ حدیث مبارک میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے اتنا کہہ دیا: اللہ جو چاہے اور جو آپ چاہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((أَجَعَلْتَنِيْ لِلّٰهِ عَدْلًا؟)) [مسند أحمد بن حنبل، حدیث:۲۵۶۱]

''کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا؟ (میں تو اللہ کا نبی ہوں)۔''

فرمایا: ایسا لفظ نہ کہا کرو، کیونکہ واؤ جمع کے لیے ہوتی ہے۔ جب تم واؤ کے ساتھ کہہ رہے ہو تو گویا اللہ کا شریک بنا رہے ہو، اس لیے حضور ﷺ نے منع فرمایا کہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بھی احتیاط کرو۔ تو اتنا شرک سے بچنا چاہیے۔

اسی لیے علماء ''یا محمد!''، ''یا رسول اللہ'' اور ''یا شیخ عبد القادر'' کہنے سے منع فرماتے ہیں۔ کیونکہ حرف ندا اللہ کی

ذت کے لیے ہے اور استغاثہ کی حقدار صرف اللہ کی ذات ہے۔ اب اگر وہی حرف تم نبی علیہ السلام کے ساتھ لگاؤ گے تو شرک کی ہوا آئے گی، جیسے حضور ﷺ نے واؤ لگانے سے منع کیا کہ واؤ لگانے میں شرک کا اندیشہ ہے۔

اسی لیے علماء نے حروف ندا لگانے سے منع کیا کہ وہاں بھی شرک کا اندیشہ ہے۔ اللہ تبارو تعالیٰ ہمیں اپنی ذات کی توحید کے مسئلے کی سمجھ عطا فرمائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی کا خواب:

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت طفیل بن سنجرہ رضی اللہ عنہ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ماں کی طرف سے بھائی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک قوم پر گزرا، میں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم یہودی ہیں۔ میں نے ان کو کہا کہ یہودیو! تم بڑی اعلیٰ قوم تھے، اللہ نے تمہیں بڑی عزت بخشی، اللہ نے تمہیں اپنے زمانے میں سب سے افضل بنایا اور تمہارے اندر اللہ نے نبی بھیجے، لیکن افسوس ہے کہ تم نے حضرت عزیز علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنالیا۔ تم اگر عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا کر شرک نہ کرتے تو تم بڑی اعلیٰ قوم تھے۔ ان یہودیوں نے مجھے کہا کہ یہ بات ہے۔ قوم تو تمہاری بھی بڑی اعلیٰ ہے، لیکن تم لوگ بھی تو کہتے ہو ''مَا شَاءَ اللّٰہُ وَمَا شَاءَ مُحَمَّدٌ'' (جو اللہ چاہے اور جو نبی چاہے) اگر ہم نے عزیر علیہ السلام کو بیٹا بنالیا ہے تم بھی تو اپنے نبی کو اللہ کا شریک بنارہے ہو۔ تو کہتے ہیں کہ میں چپ ہو گیا اور پھر میں آگے آیا اور میں نے ایک قوم کو دیکھا اور ان سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم نصرانی ہیں۔ میں نے کہا: تم بھی بڑی اونچی قوم ہو۔ کتنا اللہ نے تمہیں شرف بخشا ہے، لیکن افسوس ہے کہ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ تم مسلمان بھی تو بڑی اچھی قوم ہو، تم بھی تو ''مَا شَاءَ اللّٰہُ وَمَا شَاءَ مُحَمَّدٌ'' کہتے ہو۔ اگر ہم نے نبی کو خدا کا بیٹا بنایا ہے تو تم نے بھی تو نبی کو خدا کا شریک بنادیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ خواب میں نے دیکھا اور اس خواب کو میں نے بعد میں دوستوں سے ذکر کیا۔ پھر اس کے بعد میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: تم نے اس خواب کو میری بجائے اور لوگوں کو بھی بتلایا تھا؟ میں نے کہا: ہاں! یا رسول اللہ! میں نے اور لوگوں کو بھی بتلایا ہے۔ آپ ﷺ نے خطبہ پڑھا، لوگوں کو جمع کیا، اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ طفیل نے ایک خواب دیکھا ہے اور میں بھی چاہتا تھا کہ تمہیں منع کروں۔ خبردار! آئندہ کوئی آدمی ایسا نہ کہے کہ ''جو اللہ چاہے اور جو نبی چاہے۔'' صرف یہ کہا کرو کہ جو اللہ چاہے۔

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ [التکویر: ۲۹]

''تمہارا چاہنا کیا ہے؟ وہ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔''

توصرف اللہ کی ذات جو چاہے گی۔ اور آج اللہ معاف کرے! ہم تو اتنی تباہیوں کے غار میں پڑ چکے ہیں کہ ان لوگوں نے تو خدا کا بیٹا بنایا تھا، ہم نے تو نبی کو خدا کا بیٹا بنا دیا ہے کہ ہم نے اللہ کے نبی علیہ السلام کو کہہ دیا کہ یہ تو صرف بشریت کا ایک لباس ہے، ورنہ تو اندر سے آپ خدا ہیں...... اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ...... یعنی اللہ معاف کرے کہ ایسے غلط عقیدے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہود ونصاریٰ سے بھی ہم گر گئے، یعنی انہوں نے خدا تو مانا، لیکن خدا کا بیٹا بنا لیا اور ہم نے تو خدا کی بجائے نبی علیہ السلام کو خدا بنا لیا اور اس کو برملا تقریروں میں کہتے ہیں، کتابوں میں لکھتے ہیں اور اشعار میں لکھتے ہیں۔ [مسند أحمد بن حنبل، حدیث: ۲۹۴]

افسوسناک واقعہ!

اور واقعہ لکھا ہے کہ معراج پر جب گئے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب میں آخری منزل پر پہنچا تو میں رک گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اوپر چلے گئے۔ پھر جب میں نے دیکھا تو اوپر بھی آپ تھے اور نیچے بھی آپ تھے۔ قوم بیٹھی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا سچا عاشق ہے......!! آگے سننے والے جاہل بیٹھے ہوتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ خود بھی ایمان سے نکل گیا ہے اور ہمیں بھی ایمان سے نکال رہا ہے۔ بھائی! اگر اوپر بھی آپ ہیں اور نیچے بھی آپ ہیں تو معراج تو ایک افسانہ اور ڈرامہ ہو گیا، معراج تو نہ ہوا۔ معراج تو تب بنے گا کہ جب خدا خدا ہو اور نبی نبی ہو۔ اگر نبی خود خدا ہے تو معراج کا کیا معنی؟ براق کا کیا معنی؟ جبرئیل علیہ السلام کے آنے کا کیا معنی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کا کیا معنی؟ تو اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے۔ ہمارے لوگ بھی دعویٰ تو محبت کا کرتے ہیں، لیکن انجام شرک تک پہنچاتے ہیں۔ دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی محبت ہے۔ محبت کا معنی یہ نہیں ہے کہ آدمی ولی کو نبی بنا دے۔ کیا محبت کا معنی یہ ہوتا ہے کہ آدمی نبی کو خدا بنا دے؟ محبت کا معنی یہ ہوتا ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے تمام اختیارات چھین کر پیغمبروں کو دے۔ یہ نہیں ہوتا کہ انسان بیوی کو ماں کہہ دے، یہ کوئی محبت نہیں ہوتی۔ فرشتہ فرشتہ ہوگا، ولی ولی ہوگا، نبی نبی ہوگا، رسول رسول ہوگا اور خدا خدا ہوگا۔ اس کی الوہیت ہے اور اس کی ربوبیت ہے۔ جب تک یہ عقیدہ نہیں ہوگا نہ حج کا کوئی فائدہ ہے، نہ عمرے کا کوئی فائدہ ہے اور نہ نماز کا کوئی فائدہ ہے۔

ہدایت حاصل کرنے کا ایک طریقہ:

پس اللہ تعالیٰ سے سب سے پہلے مکہ میں آنے کے بعد دو رکعت صلوۃ الحاجۃ پڑھ کر دعا کیا کریں کہ یا اللہ! یہ گھر مرکزِ ہدایت ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں جبرئیل علیہ السلام سب سے پہلے وحی لے کر آئے اور یہ وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے حضور ﷺ نے دینِ اسلام کا اعلان فرمایا۔ اگر تو نے کرم فرما کر گناہ گاروں کو یہاں آنے کا موقع دیا ہے تو مہربانی فرما اور ہمیں صحیح عقیدہ بھی اپنی رحمت سے نصیب فرما دے۔ جب تم دعا کرو گے تو اللہ سینے کھول دے گا اور سمجھ آ جائے گی۔ اگر تمہاری نیت ہی نہ ہو سمجھنے کی، تو چاہے لاکھ تقریریں کرتے رہیں، لاکھ قرآن پڑھتے رہیں۔ کتنے لوگ ہوتے ہیں، میت پر بیٹھے ہوتے ہیں اور جنازے نہیں پڑھتے۔ کتنے لوگ ہیں کہ مسجد کے ساتھ ان کا گھر ہے، لیکن مسجد میں قدم بھی نہیں رکھتے۔ کتنے لوگ ہوتے ہیں جو الف سے لے کر یا تک سارا قرآن پڑھ جاتے ہیں، لیکن ایک آیت پر بھی غور نہیں کرتے۔ کتنے لوگ ہوتے ہیں جو روزانہ درس سنتے ہیں، شام کو ویسے کے ویسے ہوتے ہیں۔ تو ان چیزوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے آدمی نیت کرے، اس کے بعد اللہ سے دعا مانگے اور اس کے بعد توجہ سے اللہ کے قرآن اور نبی ﷺ کی حدیث کو سمجھے۔ پھر دیکھیں کہ سینے کھل جائیں گے، اندھیرا چھٹ جائے گا، نورِ توحید داخل ہو جائے گا اور صحیح عقیدہ نصیب ہو جائے گا۔ تو حضور ﷺ نے منع فرمایا کہ آئندہ یہ نہ کہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ کی خدمت میں اتنا کہہ دیا:

((مَا شَاءَ اللّٰهُ وَ شِئْتَ))

''جو اللہ چاہیں اور جو آپ چاہیں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا:

((أَجَعَلْتَ لِلّٰهِ نِدًّا؟))

''کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا؟''

خبردار! ایسا کبھی نہ کہنا، بلکہ تم یوں کہا کرو:

((مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ)) [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۷، مسند أحمد بن حنبل، حدیث: ۲۵۶۱]

''جو صرف اللہ چاہے۔''

بس یہ سارے حکم حضور ﷺ نے اس لیے دیے، تا کہ اللہ کی وحدانیت اور الوہیت کی حفاظت ہو اور اللہ کی

توحید کے معاملہ میں کسی قسم کی لچک پیدا نہ ہو جائے...... وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ......

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کا شریک نہ بناؤ۔ اور فرمایا کہ شرک ایسی خفیہ بلا ہے، جیسا کہ اندھیرے کے اندر ایک پتھر کے اوپر سیاہ چیونٹی چل رہی ہو تو نظر نہیں آئے گی، اسی طرح بندہ شرک کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور بندے کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۷، الآیۃ: الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا]

لوگوں کی قسم کھانا:

جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''مجھے اللہ کی قسم!''...... ''تیری زندگی کی قسم!'' تو اللہ کے ساتھ شریک کر کر رہا ہے۔ ادھر اللہ کی بھی قسم اٹھا رہا ہے اور ادھر تیری بھی قسم اٹھا رہا ہے۔ جیسے دیکھیں کہ ہمارے ہاں عام رواج ہے کہ اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں کہ مجھے بیٹے کی قسم ہے۔ قسم تو اللہ کی ہوتی ہے اور بیٹے کو اس میں شریک بنا رہے ہیں۔ بعض لوگ بیٹھے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اپنے پیر صاحب کے آستان کی قسم کھاتا ہوں، پیر کے پنڈے کی قسم کھاتا ہوں، یعنی پیر کا پنڈا خدا کے برابر بنا رہے ہیں، اس سے بڑا اور کوئی شرک ہو سکتا ہے؟ بعض آدمی کہہ دیتے ہیں کہ اللہ اور فلاں آدمی نہ ہوتا تو میں مر گیا ہوتا، یہ بھی شرک ہے، کیونکہ فلاں نے تمہیں تھوڑا بچایا ہے، اللہ نے تمہیں بچایا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ اگر آج کتے نہ بھونکتے تو چور ہمیں ڈھونڈ لیتے۔ تو کتوں نے تمہیں بچایا ہے، خدا نے نہیں بچایا۔ خدا کے بندے! یہ تو اسباب کی حد تک چیزیں ہیں، ان کو اتنی اہمیت نہ دو اور ایسے الفاظ ادا نہ کرو کہ شرک کا ذریعہ بن جائے۔ اسی طرح بعض آدمی کسی کو کہتے ہیں کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں برباد ہو گیا تھا، گویا نفع و نقصان کا مالک تمہیں بنا رہا ہے۔

سب کام خدا کی طرف سے ہوتے ہیں:

اور اسی طرح کہتا ہے: ''مَا شَاءَ اللّٰهُ وَ شِئْتَ'' (جو اللہ چاہے اور جو تو چاہے) اور اسی طرح کہے کہ میرے گھر میں بطخیں نہ ہوتیں اور شور نہ کرتیں تو چور ہمیں لوٹ لیتے۔ خدا کے بندے! مجھے بچانے والا بھی اللہ ہے اور تجھے پیدا کرنے والا بھی اللہ ہے۔ یعنی یہ چھوٹے چھوٹے کلمے ہیں، حالانکہ اس میں بندے کا مقصد بطخ کی عبادت کرنا نہیں ہوتا، لیکن چونکہ معمولی سا شرک کا شبہ ہو جاتا ہے اور ایمان جانے کا خطرہ ہوتا ہے تو ان سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ایسا کلمہ زبان پر بھی نہ لے آؤ جو شرک کے شک کا ذریعہ بن جائے، ورنہ کون ہے جو بطخ کو خدا کے برابر سمجھتا ہو؟ وگرنہ

دنیا میں کونسا ایسا آدمی ہے جو کسی بندے کو خدا سمجھتا ہو، لیکن شبہ جو پڑ رہا ہے، اس سے بھی میرے مدنی ﷺ نے روک دیا کہ خبردار! خیال کرو۔ وہاں یہ کہہ سکتے ہو کہ جیسے پانی پیا، پیاس بجھ گئی تو ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہو کہ اللہ نے پیاس بجھائی ہے، پانی کا شکر یہ نہیں۔ وہ اللہ جس نے پانی پیدا کیا اس کا شکر ادا کیا۔ تم نے کھانا کھایا اور بھوک مٹ گئی تو کیا کہتے ہو کہ روٹی تیرا شکریہ......؟ روٹی کو اٹھا کر چومنا شروع کر دو اور روٹی کو سر پر رکھ لو اور سجدہ شروع کر دو کہ روٹی نے ہماری بھوک ختم کر دی ہے۔ نہیں، بلکہ حکم ہے کہ کہو:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ جَعَلَنَا مُسْلِمِیْنَ.))

''اس ذات کا شکر ہے جس نے روٹی پیدا کی، ہمیں کھلایا، ہمیں پلایا، جس نے ہمیں کھانے کی توفیق دی، جس نے ہمیں مسلمان بنایا۔'' [سنن الترمذی، حدیث: ۳۴۵۷، باب: مَا یَقُوْلُ إِذَا فَرَغَ مِنَ الطَّعَامِ]

اس لیے حکم ہے کہ جب کھانا شروع کرو تو ''بِسْمِ اللّٰہِ'' پڑھو کہ اے اللہ! تیرے نام کے ساتھ میں شروع کرتا ہوں، وگرنہ میری کیا طاقت ہے؟ میرے ہاتھ بھی قابل نہ رہیں تو میں کیا کروں گا؟ میں منہ تک گلاس لے جاؤں اور اندر داخل بھی نہ ہو تو میں کیا کرلوں گا؟ پانی اندر داخل ہو جائے، بیماری لگ جائے اور پیاس نہ بجھے تو میں کیا کروں گا؟ اس لیے میں تیرے نام سے شروع کر رہا ہوں اور تیرے شکر پر ختم کر رہا ہوں، حتیٰ کہ حکم ہے کہ آدمی اگر بیت الخلاء میں جاتا ہے، جب باہر آئے تو کہے:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَذْهَبَ عَنِّی الْأَذٰی وَ عَافَانِیْ.))

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۳۰۱، باب: مَا یَقُوْلُ إِذَا خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ]

اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ میرے پیٹ سے گندی چیز دور کر دی۔ اگر یہ دور نہ ہوتی تو میں اسی میں مرجاتا۔ میں کیا طاقت رکھتا ہوں؟ یہ تو تیری ذات کا شکر ہے کہ تو نے بری چیز کو میرے پیٹ سے خارج کر دیا ہے۔ ''غُفْرَانَكَ'' مجھے معاف بھی کر دینا، جتنی دیر میں گندگی کے معاملے میں رہا، میں تیری عبادت نہیں کر سکا اور تیرا ذکر نہیں کر سکا۔

اس لیے ہمیں ہر جگہ یہ حکم دیا گیا، تاکہ کوئی بندہ شرک کے قریب ہی نہ جائے اور اس سے بچنے کی کوشش کرتے رہو، اللہ کے عدیل نہ بناؤ، اللہ کے شبیہ نہ بناؤ، اللہ کے شریک نہ بناؤ اور اللہ کی مثال نہ بناؤ۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اے یہود اور نصاریٰ! تم جانتے ہو کہ تورات میں لکھا ہے اور انجیل میں بھی لکھا

ہے کہ وہی الٰہ ہے "وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ" ہے۔ تم اس کے باوجود بھی اللہ کی توحید کا اقرار نہیں کرتے ہو۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۸، الآیۃ: اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا]

حضرت یحییٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والے پانچ احکام:

حضرت حارث الاشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ اَمَرَ يَحْيَى بْنَ زَكَرِيَّا علیہ السلام بِخَمْسِ كَلِمَاتٍ:))

اللہ پاک نے حضرت یحییٰ علیہ السلام...... جو حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ ان...... کو فرمایا کہ پانچ چیزوں کا میں حکم دیتا ہوں، ان پر خود بھی عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی حکم دو کہ ان پانچ چیزوں پر عمل کریں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو تبلیغ کرنے میں کچھ دیر ہوگئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے یحییٰ! اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے پانچ کلمات پر عمل کرنے کا اور بنی اسرئیل کو پہنچانے کا۔ اگر تم نہیں پہنچاتے ہو تو میں پہنچا دوں؟ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے عرض کیا: آپ مہربانی کریں، آپ نہ پہنچائیں، مجھ سے تاخیر ہوگئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ کا عذاب مجھ پر آجائے کہ دیر کیوں کردی؟ آپ نے پہنچایا اور میں نے نہ پہنچایا تو گویا کہ میں نے اللہ کے حکم کی تعمیل نہ کی۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ مجھے زمین میں دھنسا دے، تو میں ابھی پہنچاتا ہوں۔

بنی اسرئیل کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل بیت المقدس میں جمع ہوں۔ سب جمع ہوگئے، آپ اونچی جگہ پر بیٹھے، اللہ کی تعریف بیان کی، یعنی خطبہ پڑھا اور فرمایا کہ اللہ نے مجھے پانچ چیزوں کا حکم دیا ہے کہ میں خود بھی ان پر عمل کروں اور تمہیں بھی حکم دوں۔ ان پانچ چیزوں کو یاد کرلیں۔ فرمایا:

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ "وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا" [النساء: ۳۶] عبادت خالص اللہ کی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کی مثال سمجھو! ایک آدمی سونے اور چاندی خرچ کر کے غلام خریدے کہ میرے لیے کمائے گا۔ غلام کمائے اور جو آمدنی ہو وہ شام کو دوسرے آدمی کو جا کر دے دے، ایسا غلام کیا تم رکھو گے؟ پیسے تم بھرو، نوکر تمہارا ہو اور کمائی شام کو کسی دوسرے کو دے دے، کتنے دن ایسے نوکر کو رکھو گے؟ تو انہوں نے کہا کہ ایسے نوکر کو کوئی نہیں رکھے گا۔ اسی طرح پیدا تم کو اللہ نے کیا اور عبادت غیروں کی کرو تو پھر اللہ ایسے بندوں کو کب تک رکھیں گے؟ اللہ بھی پھر ایسے بندوں کو عذاب دیں گے۔

اور اس کے بعد فرمایا کہ دوسری بات یاد رکھو ''اَمَرَ اللّٰہُ بِالصَّلٰوۃِ'' کہ اللہ نے نماز کا حکم دیا ہے۔
تیسرا حکم فرمایا کہ روزے جو اللہ کی طرف سے ہیں ان کو صحیح معنوں میں ادا کریں۔
چوتھا حکم فرمایا کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔
اور پانچویں چیز کا حکم فرمایا کہ اللہ کا ذکر کریں۔

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۸۶۳، باب: ما جاء في مثل الصلاة...]

امت جماعت اور اتحاد کا حکم:

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں بھی اپنی امت کو پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں، جن کا اللہ نے مجھے حکم فرمایا ہے۔

1 ......سب سے پہلی چیز جو میرے آقا ﷺ نے فرمائی: ''اَلْجَمَاعَۃُ'' کہ جماعت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو، یعنی مسلمانوں کی جو جماعت ہے جماعت کو مضبوطی کے ساتھ تھامے اور ان سے باہر نکلنے کا تصور بھی نہ کرے۔ کیونکہ اللہ کی رحمت جماعت پر ہوتی ہے۔

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دن میں پانچ دفعہ مسجد میں اکٹھا ہونے کا حکم دیا ہے کہ ہم پانچ دفعہ روزانہ صبح میں، ظہر میں، عصر میں، مغرب میں اور عشا میں ایک امام صاحب کے پیچھے حاضر ہوں، تاکہ جماعت کا تصور قائم رہے، کیونکہ جب تک جماعت قائم ہے اللہ کی رحمت قائم ہے۔ جو لوگ مختلف مسائل پیدا کر کے اور فتنے پیدا کر کے ......اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے...... جماعت کو توڑنا چاہتے ہیں تو وہ اصل میں دین اسلام کو توڑنا چاہتے ہیں۔

2، 3 ......اور میرے آقا ﷺ نے فرمایا:

((اَلسَّمْعُ وَ الطَّاعَۃُ))

تمہارے لیے پابندی ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم اور اسی طرح اللہ اور رسول ﷺ کے بعد ان کے خلفاء اور جو مسلمان کا امیر بنائے، جس پر مسلمان اتفاق کر لیں ان کے حکم کو سنو اور اطاعت کرو۔

ہاں! یہ بات یاد رکھیں کہ دوسری حدیثوں میں آتا ہے کہ اگر کوئی امر اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی شریعت کے خلاف کرے تو اس کی اطاعت نہیں ہوگی [صحیح البخاری، حدیث: ۲۹۵۵] اس کی اطاعت ہم ہر اس حکم میں کریں گے جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق ہو، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کے خلاف بغاوت نہ ہو۔ یعنی ایک آدمی اگر مسلمانوں کا امیر بن جائے اور کہے کہ......نعوذ باللہ......نماز چھوڑ دو تو ہم اس کی اطاعت

نہیں کریں گے۔ کیونکہ اس کی اطاعت دراصل اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کے تابع ہے کہ جب تک وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان کی پابندی کرے گا ہم اس کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ اگر مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا ہوجائے کہ ہمیں پانچ وقت میں ایک امام کے پیچھے کھڑا کیا گیا تو اس کی کیا وجہ تھی؟ وگرنہ یہ بھی حکم ہوسکتا تھا کہ ہر آدمی اپنے اپنے گھر میں نماز پڑھ لے، ہر آدمی کو جہاں موقع ملے نماز پڑھ لے، لیکن حکم دیا گیا کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھو۔ اور جب جماعت کرو گے تو لازمی بات ہے کہ امام ہوگا۔ پھر امام کے لیے اللہ کے نبی ﷺ نے صاف اوصاف بتا دیے کہ تمہارا امام وہ بنے جو عالم ہو، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کا عالم ہو، وہ بنے جو قرآن کا قاری ہو، تاکہ اللہ کے قرآن کو صحیح معنوں میں ادا کرسکے۔ اسی طرح حضور پاک ﷺ نے فرمایا: مثلاً: اگر دو عالم ہیں، دونوں قاری ہیں تو اب کس کو امام بنائیں؟ فرمایا: جوان دو میں بڑی عمر کا ہو اس کو امام بناؤ، کیونکہ اس کی عمر زیادہ ہے، وہ زیادہ اکرام اور عزت کا مستحق ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۶۷۳]

تو اب ہمیں نماز میں کیا تعلیم ملے گی کہ جب امام کہے گا "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" تو ہم بھی کہیں "اَللّٰهُ اَكْبَرُ"۔ اب جب وہ رکوع میں جائے تو ہم سب رکوع میں جائیں گے، جب وہ سجدے میں جائے گا تو ہم سب سجدے میں جائیں گے اور جب وہ سلام پھیرے گا تو ہم سب سلام پھیریں گے، تاکہ مسلمانوں کو اتحاد اور اتفاق کی پانچ دفعہ ٹریننگ دی جائے، تاکہ وہ یہ تصور بھی نہ کرسکیں کہ ہم نے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف بھی کوئی کام کرنا ہے۔

اس لیے سب سے بڑی پابندی ہوتی ہے "اَلسَّمْعُ وَ الطَّاعَةُ" کہ اپنا امیر مسلمانوں کا بادشاہ ہے، مسلمانوں کا حاکم ہے۔ یا تم سفر میں جارہے ہو، تم نے اپنا ایک امیر بنالیا کہ حضور ﷺ کی سنت ہے۔ اگر تم سفر میں نکلو، دو آدمی ہوں، یا چار آدمی ہوں، یا دس آدمی ہوں تم میں سے جو تمہارا سمجھدار آدمی ہو اس کو امیر بنالو اور پھر تم اس کے حکم پر چلو۔ ...... ان شاء اللہ ...... سفر بھی آسان ہوگا، پریشانیاں بھی نہیں ہوں گی اور مصیبت بھی نہیں ہوگی۔ اگر ہر آدمی اپنی بات کرنی شروع کردے تو اس سے اختلاف پیدا ہوگا، ہر آدمی اپنی رائے دینی شروع کردے تو اس سے جھگڑے پیدا ہوں گے اور اس سے پریشانیاں پیدا ہوں گی، حتیٰ کہ میرے آقا ﷺ نے فرمایا کہ اگر بفرض محال ایک سیاہ فام غلام اور چھوٹے سر والا، یعنی کوئی بڑے دماغ والا بندہ بھی نہیں، لیکن اتفاق سے تمہارا امیر بن گیا اور تمہارا حاکم بن گیا تو اس کی سنو اور اطاعت کرو،[1] کیونکہ جب بغاوت کے جراثیم بڑھتے ہیں تو انجام تباہی اور

[1] [سنن أبی داود، حدیث: ۴۶۰۷]

ہلاکت ہوتا ہے اور اسلام پوری دنیا کو جوڑنے کے لیے آیا ہے، توڑنے کے لیے نہیں آیا۔

اس لیے آپ دیکھیں کہ حج مبارک ہے۔ اللہ نے ہر صاحبِ نصاب پر زندگی میں ایک دفعہ فرض کیا ہے۔ اب حج کا کیا مقصد ہے؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ پورے عالمِ اسلام کے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہوں۔ جب وہ آئیں تو ان کا ترانہ (لَبَّیْکَ) بھی ایک ہو، ان کا احرام بھی ایک ہو، ان کا کعبہ بھی ایک ہو، ان کا طواف بھی ایک ہو، ان کی سعی بین الصفا والمروۃ بھی ایک ہو، ان کی منیٰ میں حاضری بھی ایک ہو اور ان کی عرفات کے دن میں حاضری بھی ایک ہو، تاکہ ان کو اجتماعیت کا اور آپس میں اتحاد و اتفاق کا ایک عظیم سبق ملے، جس کو وہ سارا سال یاد رکھ سکیں، ورنہ اللہ کو کیا ضرورت تھی کہ لوگ بے چارے آئیں اور تکلیفیں برداشت کریں۔ ایک آدمی آتا ہے، زبان نہیں سمجھتا اور مسافر ہوتا ہے، راستے نہیں سمجھتا کہ میں نے کہاں جانا ہے؟ حرم شریف کے کس دروازے سے نکلنا ہے؟ تو ان تکلیفوں کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے لیے وہ جذبہ ہے کہ ہمارا خدا بھی ایک ہے، ہمارا نبی بھی ایک ہے، قرآن بھی ایک ہے اور ہمارا قبلہ بھی ایک ہے تو تم ایک بن جاؤ۔

اور پھر یہ سمجھایا جائے کہ اللہ کے دین میں کسی گورے اور کالے کا فرق نہیں ہوتا، اللہ کے دین میں کسی عربی یا عجمی کا فرق نہیں ہوتا، اللہ کے دین میں کسی سید اور غیر سید کا فرق نہیں ہوتا اور اللہ کے دین میں کسی امیر اور غریب کا فرق نہیں ہوتا۔ اللہ کے کعبہ میں آگئے تو ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ ایک ہی صف میں بادشاہ بھی کھڑا ہے اور غلام بھی کھڑا ہے، غریب بھی کھڑا ہے اور امیر بھی کھڑا ہے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ ہمیں ایسے اتحاد کی توفیق نصیب فرمادے کہ مسلمانوں میں اتحاد کا جذبہ بیدار ہو۔

ے ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا ، نہ کوئی بندہ نواز

اور یہ چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل ...... یاد رکھیں!...... ان پر جو مولوی آپس میں ایک دوسرے کو لڑاتے ہیں، یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ دعا کریں اللہ انہیں بھی، ہمیں بھی اور سب کو ہدایت عطا فرمائے۔ ہمیشہ یاد رکھیں کہ جو اہلِ حق ہیں ان کے اندر بنیادی مسائل میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ دنیا کے اندر کوئی امام یا مولوی نہیں کہے گا کہ فجر کی دو رکعتوں کی بجائے آپ تین رکعتیں پڑھیں، مغرب کی تین رکعتوں کی بجائے چار رکعتیں پڑھیں، کوئی یہ نہیں کہے گا کہ عشا کی چار رکعتوں کی بجائے چھ رکعتیں پڑھ لو۔ باقی جو چھوٹے مسائل ہیں وہ فروعی مسائل ہیں۔ اور ہمیشہ یاد

رکھو! فروعی مسائل کے اندر جو اختلاف ہوتا ہے وہ اعلیٰ وادنیٰ، افضل وغیر افضل کا ہوتا ہے۔ ایک امام کی تحقیق میں زور سے آمین کہنے میں زیادہ اجر ہے اور ایک امام کی تحقیق میں آہستہ آواز میں آمین کہنے میں زیادہ اجر ہے، حالانکہ دونوں کی تحقیق صرف افضل اور غیر افضل کی ہے۔ کوئی یہ نہیں کہے گا کہ جو زور سے کہے گا اس کی نماز نہیں ہوگی اور جو آہستہ کہے گا اس کی نماز نہیں ہوگی۔

ان کے پاس حدیث ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں آمین کہنے سے مسجد گونج جاتی تھی۔ [ابن ماجہ، حدیث: ۸۵۳] اور جو فرماتے ہیں کہ آہستہ کہو ان کے ہاں قرآن کی آیت ہے کہ اللہ فرماتے ہیں: دعا آہستہ مانگا کرو۔ آمین دعا ہے، ہمیں اس کو آہستہ کہنا چاہیے۔ تو یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ جس میں آدمی سر پھٹوک کرے، لڑائیاں کرے، جھگڑے کرے، فساد کرے، ایک دوسرے کے ساتھ انتشار پھیلائے اور ایک دوسرے کو اسلام سے باہر نکالے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ مسلمانوں کو ایک ہی راستے پر متحد فرمادے۔

ذرا تصور کریں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے اسی کعبۃ اللہ میں جب میرے آقا ﷺ بیٹھے ہوتے تھے تو کبھی نظر ڈالیں کہ دائیں بائیں ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم بیٹھے ہیں، ادھر نظر ڈالو تو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں، پیچھے نظر ڈالو تو بلال حبشی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں اور ادھر نظر ڈالو تو صہیب رومی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں۔ کوئی کہیں سے آیا، سب کو محمد مدنی ﷺ نے اپنے دامن میں لپیٹ لیا، اسلام تو ہمیں یہ سبق پڑھاتا ہے اور اسلام ہمیں مواساۃ کا حکم دیتا ہے۔ اسی طرح آپ حج پر آئے ہوئے ہیں، اپنے ایک آدمی کو بڑا بنالیں اور اس کی بات کو مانیں گے تو کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور کوئی جھگڑا اور پریشانی نہیں ہوگی۔ اگر ہر آدمی اپنی اپنی بات کرے گا تو لازمی بات ہے کہ جھگڑا ہوگا۔ اگر ایک آدمی بڑا ہوگا اور اس کو دین کے مسئلے آتے ہوں گے تو تم سب کے دین کا معاملہ اللہ آسان فرمادیں گے۔

اسلام میں ہجرت کا حکم:

اور اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ہے کہ اپنے امیر کی بات سنو، اس کی اطاعت کرو اور امیر کے حکم کے خلاف کبھی کوئی بات دماغ میں بھی نہ لاؤ۔

۔۔۔۔۔۔اور اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا:

((وَالْهِجْرَةُ وَالْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ))

ہجرت کا معنی ہوتا ہے کہ اگر ہم ایک ایسے ملک میں ہوں جس میں ہم دینِ اسلام کے حکموں پر عمل نہیں کر سکتے، جیسے مکہ والوں نے صحابہ کرام ﷢ کو مجبور کر دیا تھا کہ کھلی نماز نہیں پڑھی جا سکتی، اللہ کا قرآن نہیں پڑھا جا سکتا اور اللہ کی توحید کی تبلیغ نہیں کی جا سکتی تو پھر میرے آقا ﷺ کو حکم ملا کہ آپ مدینہ منورہ کے لیے ہجرت فرمائیں۔ آج بھی وہ حکم باقی ہے، یعنی آج بھی اگر کوئی مسلمان ایسے ملک میں ہے جہاں اللہ کے فرائض ادا نہیں کر سکتا تو اس کے لیے حکم ہے کہ وہ اس ملک کو چھوڑ کر ہجرت کرے۔ اللہ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ [النساء:۱۰۰]

جو آدمی اللہ کے راستے میں ہجرت کرے گا اللہ اس کے لیے اور آسانیاں پیدا فرما دیں گے۔ اس لیے ایک ہجرت حضور ﷺ کے زمانہ میں تھی تو وہ ہجرت فرض تھی، یعنی اگر کوئی ......نعوذ باللہ...... ہجرت نہ کرتا، اس کے رشتے ناطے ختم کرنے کا حکم تھا۔ اب ہجرت ہمارے اوپر فرض نہیں ہے، لیکن اگر کوئی مسلمان ایسے حالات میں مبتلا ہو جن حالات میں حضور ﷺ کے صحابہ کرام مبتلا تھے تو ان کے لیے پھر ہجرت کرنا ضروری ہو جائے گا۔

اور اسی طرح ہجرت کا لغوی معنی یہ ہوتا ہے: بدعات اور شرک کو چھوڑ دینا۔ ہجرت کا معنی ہوتا ہے چھوڑنا۔

اسلام میں جہاد کا حکم:

5 ......اور فرمایا "وَالْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" (اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنا)۔ اور جہاد بھی کب ہوگا؟ جب مسلمانوں کا بادشاہ حکم کرے گا کہ اللہ کے راستے میں نکلو۔

جب تک مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ زندہ رہا اسلام عزت سے رہا اور جس دن سے مسلمانوں نے جہاد کے جذبے کو چھوڑ دیا اسی دن سے عالم اسلام ذلت کا شکار ہو گیا، لیکن یاد رکھو کہ جہاد کا معنی فساد نہیں ہوتا کہ تم اقتدار کے لیے چڑھائی کرو۔ یہ فساد ہے، جہاد نہیں ہوگا۔ تم مال و دولت چھیننے کے لیے لڑو تو یہ فساد ہے، جہاد نہیں۔ جہاد کا معنی ہوتا ہے اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اور اللہ کا دین پھیلانے کے لیے آدمی اللہ کے راستے میں نکلے۔ اور تب نکلے جب اس کا باقاعدہ امیر مقرر ہو، باقاعدہ خلیفۃ المسلمین اور امیر المؤمنین حکم کرے۔ اور اس کے لیے بھی پھر احکامات ہیں: اگر تم نے کسی کافر سے جہاد کرنا ہے تو پہلے ان کو اسلام کی دعوت دو کہ اے کافرو! اسلام قبول کر لو تو ہمارے بھائی بن جاؤ، اگر اسلام قبول نہیں کرتے ہو تو پھر اپنے آپ کو ہمارے تابع کر دو اور باقاعدہ جزیہ ادا کرو،

تا کہ تم ذلت کا شکار رہو، تم اپنے آپ کو اونچا نہ سمجھ سکو اور تم ہمارے ٹیکس گزار بن کر اپنی زندگی گزارو۔ اس کے بدلے میں ہم تمہاری جان، مال اور عزت کا تحفظ کریں گے اور اگر تمہیں یہ بات بھی قبول نہیں تو پھر میدان میں نکل کر ہم سے لڑو۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۳۱۵۹، بَابُ: الْجِزْيَةِ...... سنن الترمذی، حدیث: ۱۵۴۸]

یعنی ان کو بھی دعوت دینے کا حکم ہے، حتیٰ کہ جب میرے آقا ﷺ جہاد پر اپنی فوجوں کو روانہ کرتے تو آپ ان کو حکم فرماتے کہ کسی بستی پر رات کو حملہ نہ کر دینا، انتظار کرنا صبح کی۔ اگر اذان کی آواز آ جائے تو پھر حملہ نہ کرنا، سمجھ لینا کہ وہاں مسلمان رہتے ہیں اور اگر اذان کی آواز نہ آئے تو ان کو مسلمان کہلانے کا بھی حق نہیں ہے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۲۹۴۳، بَابُ: دُعَاءِ النَّبِيِّ ﷺ النَّاسَ إِلَى الإِسْلَامِ، سنن الترمذی، حدیث: ۱۵۴۹]

اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر جنگ چھڑ جائے تو کسی عورت پر حملہ نہ کرو، کسی بچہ پر حملہ نہ کرو، کسی بوڑھے پر حملہ نہ کرو اور کسی مذہب کے پادری پنڈت پر حملہ نہ کرو۔ وہاں اگر تلوار لے کر لڑ رہا ہو یا لڑا رہا ہو تو اس پر تم حملہ کر سکتے ہو۔ [سنن أبی داود، حدیث: ۲۶۱۴، بَابُ: فِي دُعَاءِ الْمُشْرِكِينَ]

حضور ﷺ نے ہماری رہبری کے لیے ایک ایسی روشن اور چمکتی ہوئی شریعت دی ہے کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو اس کے اندر موجود نہ ہو۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ ہم مسئلہ کو سمجھنا چاہیں۔ اگر سمجھنے کی نیت نہ ہو اور صرف شور کرنے کی نیت ہو تو مسئلہ سمجھ نہیں سکتے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ ہمیں دین کی سمجھ عطا فرما دے، اللہ تبارک وتعالیٰ پھر ہمارے دلوں میں اسلام کی عظمت پیدا فرما دے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں ان پانچ چیزوں کا اپنی امت کو حکم دیتا ہوں۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۸۶۳، بَابُ: مَا جَاءَ فِي مَثَلِ الصَّلَاةِ...]

اہل سنت والجماعت کے عقائد کی پابندی:

اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر کوئی آدمی بالشت کے برابر بھی جماعت سے نکل گیا...... جماعت سے مراد مسلمانوں کی جماعت ہے۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۲۸۶۳، بَابُ: مَا جَاءَ فِي مَثَلِ الصَّلَاةِ...]

اب یہ نہ ہو کہ ہر آدمی اپنی اپنی پارٹی بنا لے کہ میری پارٹی سے نکل گیا تو اسلام سے نکل گیا، بلکہ جماعت سے مراد اہل سنۃ والجماعۃ ہے۔ ہر مسلمان کلمہ پڑھنے والا جو ہے وہ اہل سنت والجماعت ہے۔ اہل سنت کا معنی ہے کہ وہ طریق محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرنے والا ہے۔ ''والجماعۃ'' سے مراد صحابہ رضی اللہ عنہم کا دامن پکڑنے والا ہے۔

اگر اس کے عمل میں سنت نہیں ہے تو وہ ''اہلِ سنت'' کہلانے کا حقدار نہیں ہے، اگر اس کا صحابہ رضی اللہ عنہم پر ایمان نہیں ہے تو جماعت سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو تمام کلمہ پڑھنے والے جو قرآن اور سنت رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ماننے والے اور اتباع کرنے والے ہیں وہ اہل سنت والجماعۃ ہیں۔ ساری دنیا کا مسلمان ایک جماعت ہے۔ مسلمان کہیں کلمہ پڑھتا ہے تو ایک جماعت ہے، چاہے وہ مشرق میں ہے، مغرب میں ہے، شمال میں ہے یا جنوب میں ہے، چاہے وہ کوئی زبان بولتا ہے، اگر وہ کلمہ پڑھ لیتا ہے ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ [الحجرات:١٠] اللہ نے فرمایا: مومن آپس میں بھائی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''كَالْجَسَدِ الْوَاحِدِ'' مومن ایسے ہے جیسے ایک جسم ہو۔ اگر بندے کے پاؤں میں تکلیف ہو تو سارے بدن میں تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو کہیں تکلیف ہو تو عالم اسلام کو تکلیف محسوس ہونی چاہیے اور اگر مسلمان کو کہیں خوشی ملے تو عالم اسلام کو خوشی ملنی چاہیے، کیونکہ مسلمان ایک ہے۔

اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مثال دی کہ ایک بالشت کے برابر بھی جماعت سے نکلا تو گویا...... نعوذ باللہ...... اسلام سے نکل گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنی سخت بات ارشاد فرمائی۔

اور اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی شخص کلمہ پڑھنے کے بعد جاہلیت کے نعرے بلند کرے...... جیسے جاہلیت میں لوگ قوم کے لیے لڑتے تھے کہ ہر قبیلہ اپنے قبیلہ کی مدد کرتا تھا، چاہے وہ قبیلہ ظالم کیوں نہ ہو۔ جیسے آج کل رواج ہے کہ بلوچ ہے تو بلوچوں کی مدد کرے گا، چاہے وہ ناحق کیوں نہ ہوں، یہ جاہلیت ہے۔ اسی طرح کوئی سندھی ہے تو سندھی کی مدد کرے گا، پنجابی ہے تو پنجابی کی مدد کرے گا اور پختون ہے تو پختونوں کی مدد کرے گا۔ تو یہ کفر کی علامات ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ جو حق پر ہو اس کی مدد کرو، چاہے وہ آدمی تمہاری قوم کا ہو یا برادری کا یا برادری کے مخالف کا ہو، لیکن اگر وہ حق کی بات کہہ رہا ہے تو اس کی تائید کرنی چاہیے...... حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی شخص نے دعویٰ جاہلیت کیا...... جیسا کہ پہلے عرب کے زمانے میں اوس اور خزرج کے قبیلے کا جھگڑا تھا۔ جو بھی اوسی ہے وہ خزرجی کا دشمن ہے اور جو خزرجی ہے وہ اوسی کا دشمن ہے۔ جب جھگڑا ہوتا تو ہر آدمی اپنے قبیلہ کو بلاتا کہ مقابلہ کے لیے نکلو، ہم نے لڑائی لڑنی ہے...... حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ سب دعوے جاہلیت کے ہیں۔ ...... کوئی اگر قومیت کے لیے لڑتا ہے تو کفر کا دعویٰ ہے، کوئی نسب کا دعویٰ کرے تو یہ بھی کفر کا دعویٰ ہے اور کوئی وطن کا جھگڑا کرے تو یہ بھی کفر کا نعرہ ہے۔ اصل جھگڑا اسلام اور کفر ہے۔

مسلمان بنو یا کافر بنو اور ان کے درمیان کوئی راستہ نہیں......

اس لیے فرمایا کہ جس نے ایسے کیا اس نے اپنے آپ کو جہنم کا ایندھن بنایا۔ صحابہ ﷡ نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! ایسا آدمی چاہے نماز بھی پڑھے اور روزہ بھی رکھے تب بھی اسلام سے نکل گیا؟...... روزہ رکھنا اور نماز پڑھنا کیا ہے؟ جب وہ اسلام کی بنیاد پر عمل نہ کرے تو اس کو روزہ کیا فائدہ دے گا؟ ایک آدمی مثلاً کلمہ بھی پڑھے اور شرک بھی کرے، ایک آدمی اللہ کے کعبہ کا طواف بھی کرے اور قبروں کا طواف بھی کرے، ایک آدمی خدا کے کعبے کے سامنے آکر سجدہ بھی کرے اور غیر اللہ کا سجدہ بھی کرے اور ایک آدمی ملتزم پکڑ کر یا اللہ! یا رب العالمین! بھی کہے اور پھر یا دستگیر! کے نعرے بھی مارے تو ایسا آدمی لاکھ نمازیں پڑھتا ہے تو کیا فائدہ ہے؟ جب بنیاد ہی ختم ہوئی تو اس کے باقی اعمال تو کوئی فائدہ ہی نہیں پہنچاتے۔

[سنن الترمذیہم، حدیث: ۲۸۶۳، باب: مَا جَاءَ فِي مَثَلِ الصَّلَاةِ...]

دنیا اور آخرت میں دیدارِ خداوندی کا مسئلہ:

مفسر فرماتے ہیں: یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ دنیا میں انسان اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی زیارت کر سکے، کیونکہ اگر دنیا میں زیارت ممکن ہوتی تو اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کو یہ نہ فرماتے ﴿لَنْ تَرٰىنِیْ﴾ لیکن دنیا میں دلائلِ قدرت اور صفاتِ باری کے ذریعے اللہ کو پہچانا جا سکتا ہے۔ اس لیے اسی آیت میں عبادت کا حکم دے کر قدرت کے دلائل ذکر کیے گئے ہیں۔ ﴿وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ۚ﴾ [الاعراف: ۱۴۳] اللہ پاک نے جب اس پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ ﴿فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ [الاعراف: ۱۴۳] اس کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام کو ہوش آیا تو کہا: یا اللہ! میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔ میں نے جو سوال کیا میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا، میری قوتِ برداشت نہیں ہے کہ میں آپ کی رؤیت برداشت کر سکوں۔ بس میں آپ پر ایمان لایا اور میں جو سوال کر بیٹھا مناسب نہیں تھا، جس کے میں لائق اور قابل نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے میں توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے آپ کی ذات پر ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس تجلی کا تحمل نہ کر سکے۔

ہاں البتہ ایک بات یاد رکھیں اور سمجھ لیں کہ دنیا میں کوئی انسان اللہ کی رؤیت کا متحمل نہیں ہو سکتا، لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ مومنین کو اپنی زیارت نصیب فرمائیں گے۔ دعا کریں کہ اللہ ہمیں بھی نصیب فرمائیں، اللہ پاک کسی کو

بھی محروم نہ فرمائیں۔ دنیا میں تو کوئی انسان رؤیت باری تعالیٰ کا متحمل نہیں ہوسکتا لیکن آخرت میں اللہ نے ایمان لانے والے بندوں کو جن کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہوگا اپنی رحمت سے اپنا دیدار کرائیں گے۔

صحیح حدیث مبارک ہے کہ ہمارے نبی ﷺ تشریف فرما تھے اور چودھویں کا چاند کھلا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ سے پوچھا: چودھویں کا چاند دیکھنے میں تمہیں کوئی شک وشبہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا: حضور ﷺ! چودھویں کا چاند میں کسی کو شبہ ہوسکتا ہے کہ ہمیں دھوکہ لگا ہو چاند کے مشابہ ہمیں کوئی اور چیز چمکتی ہوئی نظر آ گئی ہو؟ چودھویں کا چاند تو اتنا واضح ہے کہ بوڑھا اور ضعیف نظر والا بھی دیکھ سکتا ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کی رحمت سے قیامت والے دن تم اپنے رب کا دیدار بھی کرو گے اور کوئی شک نہیں ہوگا، بالکل صحیح دیدار نصیب ہوگا، جیسا کہ تم آج شک نہیں کر رہے ہو۔ [صحيح البخاري، حديث: ٧٤٣٤، باب: قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالَى: وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ...]

یعنی اللہ ایسا کھلا دیدار نصیب فرمائیں گے، وگرنہ چاند کیا ہے؟ اللہ کی تو مثال ہی نہیں ہے۔ اللہ تو ہر مثال سے پاک ہے۔ یعنی ہمارے اِفہام کے لیے سمجھایا کہ جیسے اب چودھویں کا چاند دیکھنے میں کوئی شبہ نہیں، یعنی ہم واقعتاً چاند دیکھ رہے ہیں، اسی طرح قیامت میں اپنے رب کے دیدار میں کوئی شبہ نہیں ہوگا، بلکہ حقیقتاً اپنے رب کی زیارت نصیب ہوگی۔ حضور ﷺ نے بطور مثال سمجھایا۔

اور اسی طرح روایات مبارکہ میں یہ بھی آتا ہے کہ بعض خوش نصیب لوگ ایسے ہوں گے...... ان کے مدارج ہوں گے...... جن کو مہینہ میں ایک مرتبہ زیارت ہوگی، بعض لوگوں کو اللہ کا دیدار ہر ہفتے نصیب ہوگا، بعض لوگوں کو اللہ کا دیدار روزانہ نصیب ہوگا اور بعض لوگ ایسے ہوں گے جن کو ہر گھڑی اللہ کی رؤیت کی اجازت ہوگی۔ تو قیامت کے اندر تو یہ مراتب ہیں، لیکن دنیا کے اندر کوئی آنکھ اللہ کو نہیں دیکھ سکتی۔

معراجِ نبوی ﷺ میں غلو:

اس میں بھی اختلاف ہے کہ ہمارے نبی ﷺ نے بھی اللہ کی زیارت کی ہے یا نہیں کی؟ تو اس مسئلہ کے اندر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندر بھی اختلاف ہے۔ ہمارے ہاں تو...... اللہ معاف فرمائے...... بعض لوگ ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں اللہ ان کو اور ہمیں بھی ہدایت نصیب فرمائے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب حضور ﷺ معراج پر گئے تو اللہ نے فرمایا اور قریب آ جاؤ اور قریب آ جاؤ اور فرمایا کہ تم جوتوں کے ساتھ میرے عرش پر آ جاؤ۔ پھر اپنے عرش پر اپنے قریب بٹھایا، اللہ اور نبی مل گئے، جیسے بھنویں مل جاتی ہیں...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... اللہ ہدایت نصیب

فرمادے۔ یاد رکھو کہ مخلوق مخلوق ہوتی ہے اور خالق خالق ہوتا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ کی بہت بڑی شان ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل، تمام رسولوں سے افضل اور تمام کائنات کے بندوں سے افضل ہیں، لیکن خدا خدا ہوتا ہے اور نبی نبی ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ...... نعوذ باللہ...... گلے مل جاؤ اور جوتوں کے ساتھ عرش پر آ جاؤ۔ یہ کون سی عظمت کی نشانی بیان ہو رہی ہے......!!؟

کیا معراج میں حضور ﷺ نے اللہ کی زیارت کی تھی؟

اس میں اختلاف ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اللہ کی زیات کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول اسی طرف ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے پروردگار کی زیارت کی تھی۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے پرودگار کی زیارت نہیں کی۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی یہ مسئلہ اختلافی ہے، لہٰذا یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں! جس مسئلہ میں صحابہ کا اختلاف ہو تو کسی آدمی پر ملامت نہیں کی جائے گی، یعنی جو رؤیت کے قائل ہیں تو اللہ قادر ہے کہ اپنے نبی کو زیارت نصیب فرمادی ہو اور جو لوگ رؤیت کے قائل نہیں ہیں ان کی شان میں بھی ہم کوئی گستاخی نہیں کریں گے، ان کی شان میں بھی ہم کوئی ایسا لفظ نہیں کہیں گے جن سے ان کی شان میں کوئی کمی آئے کہ وہ بھی صحابہ ہیں حضور ﷺ کے۔

اور بعض علماء محققین نے اس کو یوں جمع کیا ہے، انہوں نے کہا: جو صحابہ رضی اللہ عنہم قائل ہیں کہ حضور ﷺ کو زیارت نہیں ہوئی، ان کا مطلب یہ بھی ہے کہ دنیا میں زیارت نہیں ہو سکتی اور جو قائل ہیں کہ زیارت ہوئی وہ بھی تو اس عالم میں نہیں ہوئی۔ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو معراج پر آسمانوں پر بلالیا۔ تو دنیا میں تو زیارت کسی کو نہیں ہو سکتی، اگر وہاں رؤیت ہوئی ہے تو وہ دنیا تو نہیں تھی، نہ آپ زمین پر تھے اور نہ زمین کے احکامات آپ پر نافذ تھے۔ اللہ پاک نے معراج کے لیے اپنے حبیب ﷺ کو آسمانوں پر بلایا، حضور ﷺ کو خصوصی طور پر معراج کرایا گیا۔ آپ آسمانوں پر تشریف لے گئے، حضرت جبرئیل علیہ السلام کی بھی رؤیت ہوئی۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اگر رؤیت ہوئی بھی ہے تو دنیا والی بات اپنی جگہ پر بجی ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تھے، زمین پر کھڑے تھے، اس لیے ان کو رؤیت نہ ہو سکی، لیکن جب اللہ پاک اپنے نبی ﷺ کو آسمانوں پر بلالے تو وہاں معاملہ ہی علیحدہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں ہر مومن کو رؤیت نصیب فرمائیں گے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف کے موقع پر ہمارا فریضہ:

بہرحال ہمیشہ یاد رکھا کریں کہ جس مسئلہ کے اندر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اختلاف آجائے تو ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم دونوں کا احترام کریں گے، کیونکہ ہمیں پتہ ہے کہ ان کا اختلاف کسی ذاتی غرض کی بنیاد پر نہیں تھا، ان کا اختلاف مسئلہ کے فہم میں تھا۔ اگر کوئی خطا بھی ہوئی ہے تو وہ اجتہادی خطا تھی۔ انہوں نے اپنی طرف سے محنت کی کہ ہم حق پر پہنچ سکیں۔ مجتہد اگر خطا بھی کر دے تو اللہ اس کو ثواب عطا فرماتے ہیں۔ اسی لیے جو اہل علم ہیں، جن کو اللہ نے قرآن وسنت کے علم سے نوازا ہے وہ ایسے مسائل میں جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندر اختلاف پایا جائے، کسی جانب کو برا بھلا نہ کہیں۔ ادھر بھی روایات موجود ہیں اور ادھر بھی روایات موجود ہیں۔ تو جن کو اللہ نے علم سے نوازا ہے تو وہ کہیں گے کہ اللہ سب پر رحمت فرمائے، لیکن ہم نے اپنے جن علماء سے پڑھا ہے اور جو روایت ہمیں ملی ہے ہم اس پر عمل کر رہے ہیں۔ جو عمل کر رہا ہے اس کے پاس بھی روایت موجود ہے۔

مسئلہ سماعِ موتیٰ:

اب دیکھیں کہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بڑی عالمہ، امہات المؤمنین، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے میدان میں کفار جب مار ڈالے، ان کو ایک کنویں کے اندر پھینک دیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کنویں پر تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: او مکہ کے کافرو!

((هَلْ وَجَدْتُّمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا؟))

''کیا رب کا وعدہ آج پورا ہوا کہ نہیں پورا ہوا؟ (تم ذلیل ہو کر مارے گئے اور اللہ نے اپنے نبی کی مدد فرمائی)۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا آدمی بول پڑا کہ حضور! آپ کن کو سنا رہے ہیں؟ وہ تو مر گئے، ٹکڑے ہو گئے، ریزہ ریزہ ہو گئے، کنویں میں پھینک دیے گئے، آج تین دن گزر گئے وہ تو گل سڑ گئے ہوں گے، آپ ان کو سنا رہے ہیں؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ تم سے بھی زیادہ سن رہے ہیں۔ [صحيح البخاري، حديث: ۳۹۷۶، باب: قَتْلِ أَبِي جَهْلٍ]

جب بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے یہ بات آئی تو انہوں نے کہا کہ میں یہ نہیں مانتی۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کا قرآن کہتا ہے: مردوں کو آپ سنا نہیں سکتے، تو وہاں کیسے سنا دیا؟ (دراصل اس مسئلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا رجوع ثابت ہے۔ تفصیل کے لیے مولانا سرفراز خان صاحب صفدری رحمہ اللہ کی کتابیں ''تسکین الصدور'' اور ''سماعِ موتیٰ''

ملاحظہ فرمائیں۔امداد اللہ انور)

لہٰذا بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نہ سننے کی قائل ہیں، باقی جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم سننے کے قائل ہیں۔ جو صحابہ رضی اللہ عنہم سننے کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم تو خود بدر میں موجود تھے اور بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا تو مدینہ منورہ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے انہیں مخاطب کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بول پڑے، پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سن رہے ہیں، لہٰذا ہم سننے کی بات کو کیوں نہ مانیں؟

تو ہمیشہ یاد رکھیں کہ ایسے مسائل میں ایک مسئلہ وہ ہوتا ہے کہ جس میں نص قطعی آ گئی ہے، جو قطعی الدلالت اور قطعی الثبوت ہے۔ اللہ کا قرآن ہے یا حدیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، متواتر اور مشہور ہے اور بالکل کھلی ہوئی ہے تو اس میں کبھی جھگڑا ہو ہی نہیں سکتا اور نہ ہی ان مسئلوں میں کبھی جھگڑا ہوتا ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ دو حدیثیں آ گئیں: ان دو حدیثوں کو سمجھنے کے لیے ایک صحابی نے یوں سمجھا اور ایک صحابی نے یوں سمجھایا۔ ایک صحابی نے اس حدیث کو لے لیا اور دوسرے صحابی نے اس حدیث کو لے لیا۔ تو ہم کہیں گے کہ اللہ سب کی قبروں پر رحمت کرے، سب ہدایت پر ہیں۔

دیہاتی زبان میں اس کی مثال یوں ہے کہ اگر میرے اندر ادب ہے اور میرے اندر علم ہے تو میں تیرے باپ کی توہین نہیں کروں گا، لیکن اپنے باپ کا جو حق ادا کروں گا اور عزت کروں گا اتنا مرتبہ تو میں تیرے باپ کو نہیں دے سکتا، لیکن مجھے یہ بھی حق نہیں پہنچتا کہ تیرے باپ کی شان میں کوتاہی کروں۔ اس لیے ہم لوگوں نے جن سے علم پڑھا ہے، ہم ان ائمہ کی بات کو زیادہ وزن دیں گے، لیکن دوسرے ائمہ کی شان میں گستاخی نہیں کریں گے، ان کی شان میں کوئی کمی اور بے ادبی نہیں کریں گے، بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ وہ بھی ائمہ ہیں اور سب نے دین کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں فرمائے۔ اس لیے آپ دیکھیں کہ ائمہ کے آپس میں اختلاف ہوئے، لیکن ادب نہیں چھوٹا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں آپس میں اختلاف ہوا، لیکن جب ان کا ذکر آیا تو کہا ''رحمہ اللہ'' اللہ رحمت فرمائے۔ بھائی اس نے یوں سمجھا ہے اور ہم نے یوں سمجھا ہے۔ آپس میں کبھی انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف سخت الفاظ استعمال نہیں فرمائے۔

مسئلۂ رؤیتِ باری تعالیٰ:

مسئلہ چل رہا تھا رؤیت باری تعالیٰ کا کہ بعض لوگ قائل نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے زیارت کرائی ہے اور

بعض لوگ اس کے قائل ہیں کہ زیارت نصیب ہوئی۔ تو دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ دلائل رکھتی ہیں، لیکن آخرت میں رؤیت کے اندر کسی کا جھگڑا نہیں ہے۔ آخرت میں سب کو اللہ کی رحمت سے رؤیت نصیب ہوگی۔ اور اس کی وجہ یہ بھی سمجھیں کہ یہ دنیا بھی فانی ہے اور انسان بھی فانی ہے، ہماری آنکھیں بھی فانی ہیں، ہماری قوتِ سامعہ، باصرہ اور عاقلہ سب فانی ہیں، صرف اللہ کی ذات باقی ہے۔ تو گویا فانی باقی کو نہیں دیکھ سکتا، لیکن جب ہماری دوسری زندگی عالمِ آخرت کی ہوگی تو وہ ایسی زندگی ہوگی کہ اس کے بعد فنا کوئی نہیں، یعنی جب اللہ ہمیں دوبارہ قبروں سے اٹھائیں گے تو ہم ہمیشہ زندہ رہیں گے، مومن جنت میں ہمیشہ رہے گا اور کافر جہنم میں ہمیشہ رہے گا، کبھی ان پر موت نہیں آئے گی۔ تو وہ جب تخلیق کی جائے گی تو ہمیں بھی ہمیشہ کے لیے زندہ کیا جائے گا۔ جب ہمیں ہمیشہ رہنے کے لیے پیدا کیا جائے گا تو آنکھیں بھی ہمیشہ رہنے والی دی جائیں گی اور عقل بھی ہمیشہ رہنے والی دی جائے گی تو اس ذات کو جو ہمیشہ رہنے والی ہے، دیکھنے کے لیے کامل بنا دیا جائے گا۔ تو سمجھیں کہ ہم آخرت میں تو اللہ کی زیارت کر سکیں گے، لیکن دنیا میں اللہ کی رؤیت نہیں ہو سکتی۔

واقعاتِ امام مالک رحمہ اللہ:

مفسر لکھتے ہیں کہ امام رازی رحمہ اللہ نے جو قرآن مقدس کی تفسیر لکھی ہے اس میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ہارون الرشید بادشاہ گزرا ہے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا: اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کو آپ نے کیسے پہچانا؟ حضرت امام مالک رحمہ اللہ امام دار الہجرۃ ہیں، ان کی ساری زندگی مدینہ منورہ میں گزر گئی، بہت بڑے امام اور بہت بڑے عاشقِ رسول ہیں۔ ساری زندگی میں ایک دفعہ امام صاحب نے حج کے لیے سفر کیا۔ حج ختم ہوتے ہی فوراً مدینہ تشریف چلے گئے۔ لوگوں نے عرض کیا: حضرت! کچھ دن ٹھہر جائیں۔ فرمایا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو طاقت رکھتا ہو کہ مدینہ منورہ میں مرے تو کوشش کرے کہ اس کی موت مدینہ میں آئے۔ تو میں ڈرتا ہوں کہ میں کہیں مدینہ کے باہر نہ مر جاؤں، اس لیے میں اپنا وقت باہر نہیں لگانا چاہتا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا زیادہ وقت مدینہ میں گزرے، تاکہ مدینہ منورہ کے اندر مجھے موت آئے۔ اتنے بڑے عاشقِ رسول تھے۔ اللہ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے لوگوں کی اتباع کی توفیق نصیب فرمائے۔

تو ہارون الرشید نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا: آپ نے اپنے رب کو کیسے پہچانا؟ حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اِخْتِلَافُ اللُّغَاتِ وَالْأَصْوَاتِ وَالنَّغْمَاتِ '' میں غور کرتا ہوں کہ ہر بندے کی آواز علیحدہ ہے، زبان بھی علیحدہ ہے، لغت بھی علیحدہ ہے، پرندوں کی آواز بھی علیحدہ ہیں، اتنا اختلاف ہے کہ عرب کی آواز علیحدہ ہے، عجم کی آواز علیحدہ ہے، ہر بارہ میل کے بعد ویسے زبان میں تبدیلی آجاتی ہے تو اتنی بڑی زبانیں اور اتنی بولیاں اور پھر پرندوں کی اپنی اپنی بولیاں ہیں، کوئی کچھ بول رہا ہے اور کوئی کچھ بول رہا ہے، لیکن پرندے بھی بول رہے ہیں، ہمیں پتہ نہیں لگتا، لیکن وہ بول رہے ہوتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۸، تفسیر الرازی: ۲/ ۱۷۶]

جیسے واقعہ لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تشریف لے جا رہے تھے۔ دیکھا تو ہد ہد پرندہ ایک درخت پر بیٹھا ہے۔ ایک لڑکے نے اس کو پکڑنے کے لیے نیچے ایک جالی لگائی ہوئی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جب وہاں سے گزرے تو فرمایا کہ ہد ہد! تو بڑے آرام سے اوپر بیٹھا ہے اور تمہارے نیچے بچے نے جال لگایا ہوا ہے۔ ہد ہد نے کہا کہ اللہ کے پیغمبر! مجھے پتہ ہے کہ بچے نے جال لگایا ہوا ہے۔ میں تو ویسے اس کو چھیڑ رہا ہوں، یہ بچہ مجھے نہیں پکڑ سکتا، میں نے دیکھا ہے کہ جال لگایا ہوا ہے۔ خیر حضرت سلیمان علیہ السلام چلے گئے۔ جب واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ ہد ہد لڑکے کی قید میں ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام مسکرائے اور فرمایا: ہد ہد! تمہیں کیا ہوگیا؟ زمین کے نیچے تو پانی دیکھ لیتے ہو اور تم کہتے تھے کہ میں جال بھی دیکھ چکا ہوں تو تم جال میں کیسے پھنس گئے؟ ہد ہد نے کہا: جب اللہ تعالیٰ کی تقدیر نازل ہوتی ہے تو آنکھیں آندھی ہو جاتی ہیں۔ جب تقدیر آگئی تو آنکھیں کام نہیں کرتیں۔ تو وہ پرندہ ایسی حکمت کی باتیں بتا رہا ہے، اللہ کی تقدیر بتلا رہا ہے:

''إِذَا نَزَلَ الْقَضَاءُ عَمِيَ الْبَصَرُ '' [الجامع لاحکام القرآن: ۱۳/ ۱۶۵]

''جب اللہ کی تقدیر نازل ہوتی ہے تو آنکھیں آندھی ہو جاتی ہیں۔''

علماء نے باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بولیاں سمجھی ہیں کہ پرندہ کیا کہہ رہا ہے؟ کوا کیا کہہ رہا ہے؟ شاہین کیا کہہ رہا ہے؟ اور علماء نے یہ ساری چیزیں باقاعدہ کتابوں میں نقل کی ہیں اور بڑی مفصل کتابیں ہیں اور ان کے اندر بڑی مفصل ابحاث ہیں۔ اور اسی طرح ہمارے لوگوں نے بھی بنایا ہوا ہے کہ تیتر یہ کہتا ہے اور مرغ یہ کہتا ہے، مرغ اذان کہہ رہا ہے، تیتر سبحان اللہ! تیری قدرت کہہ رہا ہے۔ پتہ نہیں یہ بھی سلیمان بن رہے

ہیں۔ انہوں نے بھی تو زبانیں سمجھ لی ہیں، حالانکہ یہ علم اللہ نے اپنے نبی کو دیا تھا اور کسی نے کہا: یہ قمری حق باھو کہہ رہی ہے، پیر کا نعرہ لگا رہی ہے، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ جب اللہ والے لوگ فوت ہوجاتے ہیں تو ان کے مزار شرک کے گڑھ بن جاتے ہیں، حالانکہ وہ تو توحید کا اتنا بڑا علمبردار ہے، توحید کے مسئلے میں اتنا اونچا کلام ہے سنت کے مسئلہ میں، اتباع رسول ﷺ کے مسئلہ میں۔ اللہ ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل کرے۔ اللہ والوں کا تو کوئی قصور نہیں ہے، اولیاء اللہ کا کیا قصور ہے؟ انہوں نے تو ساری زندگی اللہ کی توحید پھیلانے کے لیے جہاد کیا، دین پھیلانے کے لیے جہاد کیا، لیکن بدقسمتی سے یہ کیا ہے کہ:

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

کہ اللہ والوں کی مسندوں پر جاہل آگئے، ان مقامات پر وہ لوگ آگئے جنہیں نماز کا پتہ نہیں، حلال وحرام کا پتہ نہیں، ان مراکز علم کو یعنی وہ مرکز علم ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کوٹ مٹھن ہمارے قریب ہے، بزرگوں کا مقام ہے۔ میرے والد صاحب فرماتے تھے کہ جب میں چھوٹا تھا تو وہاں بہت بڑا مدرسہ تھا اور میں نے وہاں تعلیم حاصل کی۔ وہاں پانچ سو، ہزار ہزار اور دو دو ہزار آدمی بیٹھ کر قرآن اور بخاری پڑھتا تھا، آج وہاں میلے ہیں، یا سرکسیں ہیں یا قوالیاں ہیں، جو بھی متولی حضرات ہیں اللہ ان کو ہدایت دے، وہ حق کو پہچانیں اور باطل سے بچنے کی کوشش کریں۔

بہرحال! حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے بڑا پیارا جواب دیا! انہوں نے فرمایا کہ بادشاہ سلامت! اتنی لغتیں جب مختلف ہیں تو ان لغتوں کا کوئی خالق تو ہے۔ تمام بندے جو اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں، اپنے اپنے رنگ بول رہے ہیں اور ہر پرندے کی آواز علیحدہ علیحدہ ہے۔ ایک ہی جنگل میں رہنے والے جانور ہیں، ان کی بولیاں آپس میں نہیں ملتیں۔ ایک ہی خطہ کے رہنے والے لوگ ہیں، ان کی بولیاں نہیں ملتیں۔

آپ لوگ دیکھیں کہ اللہ نے آپ کو کعبہ نصیب کیا...... الحمد للہ...... آپ طواف میں ملتزم پر کھڑے ہوکر ذرا غور کرو۔ بنگالی اپنی زبان میں لگا ہوا ہے، برمی اپنی زبان میں لگا ہوا ہے، حبشہ والا اپنی زبان میں لگا ہوا ہے اور سندھی، پنجابی، پختون، عربی اور عجمی سب اپنی اپنی زبانوں میں لگے ہوئے ہیں۔ تو ان سب بولیوں کو سمجھنے کے لیے کوئی ذات ہے جو ان سب کی بولیاں سمجھ رہی ہے، ان سب کی دعائیں سن رہا ہے اور جو ان سب کی پکار کو جاننے والا

ہے۔ تو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تو اپنے رب کو اسی طرح پہچانا۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عجیب حکایت!

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ زندیق قسم کے لوگ آئے، جو خدا کے منکر تھے۔ وہ امام صاحب سے مسئلہ وجود باری تعالیٰ پر بحث کرنے آئے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے چھوڑ دو، میں تو ایک بڑے مسئلے میں بڑا متفکر ہوں۔ تم میرے ساتھ کسی اور وقت میں بات کرنا۔ ایک عجیب مسئلہ پیش آ گیا! مجھے ایک آدمی نے خبر دی ہے کہ دریا کے اندر ایک کشتی سامان کی بھری ہوئی ہے اور اس میں ہر قسم کا سامانِ تجارت موجود ہے اور کشتی کا ملاح بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ خود کنارے پر آتی ہے اور سامان اتارتی ہے اور مال لادتی ہے اور پھر دوسرے کنارے پر چلی جاتی ہے۔ اتنا قیمتی سامان اس میں بھرا ہوا ہے۔ تو انہوں نے کہا: ابو حنیفہ! کیا کہہ رہے ہو؟ تم جو کہہ رہے ہو وہ عقل کی بات ہے کہ کشتی ادھر سے ادھر چلی جاتی ہے اور اس کو چلانے والا کوئی نہیں ہے۔ ادھر آتی ہے، سامان لے جاتی ہے اور ادھر سے سامان لے آتی ہے اور اس کشتی کو چلانے والا کوئی نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بے وقوفو! جب ایک چھوٹی سی کشتی بغیر چلانے والے کے نہیں چل سکتی تو اتنا بڑا دنیا کا کارخانہ کیسے چل رہا ہے؟ تم عجیب جاہل آدمی ہو!! تو انہوں نے فوراً کہا کہ ہمیں کلمہ پڑھا دیں، ہم اسلام لاتے ہیں، ہمیں بات سمجھ آ گئی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۵۸/۱، الآیۃ: الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا]

ائمہ اسلام کے مختلف کارنامے:

جو ائمہ کبار گزرے ہیں، چونکہ ائمہ کے مختلف میدان ہیں۔ بعض ائمہ نے اجتہادی کام کیے تو "مجتہدین" کہلائے، بعض ائمہ کرام نے حدیث پاک کی خدمت کی تو ان کو "محدثین" کہا گیا، اسی طرح بعض ائمہ نے قراءت کی خدمت کی تو ان کو "قراء" کہا گیا، اسی طرح جن حضرات نے فقہ کے اندر خدمت کی کہ قرآن وحدیث سے ان مسائل کو مستنبط کیا اور پھر ان مسائل کو مدوّن کر کے امت رسول پاک ﷺ کے لیے قیامت تک کے لیے ذخیرہ چھوڑا تو ان کو "فقہاء" کہا جاتا ہے۔ اور ان میں چار امام ایسے ہیں جن کو اللہ نے شرفِ قبولیت سے نوازا ہے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے مقامِ رفیع عطا فرمایا ہے کہ انہی پر ہی مدار ہو گیا، حالانکہ بڑے بڑے علماء اور ائمہ بعد میں پیدا ہوئے، لیکن فقہ میں سب ان کے حاشیہ نشین ہو گئے: امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد

بن حنبل ﷫۔ اللہ تعالیٰ ان ائمہ اربعہ اور جمیع ائمہ پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ ان تمام لوگوں نے اللہ کے دین، اللہ کا قرآن اور سنت محمد مصطفیٰ ﷺ کے اندر جو مسائل تھے، ان کے اندر جو احکام تھے ان کو علیحدہ علیحدہ مدوّن کر کے، جمع کر کے امت کی آسانی کے لیے قیامت تک کے لیے ایک ذخیرہ چھوڑ دیا۔

آپ اسی سے اندازا فرمائیں کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ﷫ اتنا بڑا عظیم عالم اور علم کے اتنے بحر اور سمندر تھے، لیکن فقہی مسائل میں انہوں نے امام احمد بن حنبل ﷫ سے مسائل لیے ہیں۔

اصل میں یہ تھا کہ جہاں جہاں ان ائمہ کو کام کرنے کا موقع ملا، وہاں ان کی فقہ نے زیادہ رواج پکڑا۔ مثلاً: بعض علاقوں میں امام شافعی ﷫ کا دور رہا، لوگوں نے فقہ شافعی کو لیا، اسی سے انہوں نے مسائل کو سیکھا۔ اور بعض علاقے مثلاً: مدینہ منورہ، تو امام مالک ﷫ کی ساری زندگی مدینہ منورہ کے اندر گزری اور جنہوں نے سب سے پہلی کتاب حدیث کے اندر ''مؤطا امام مالک'' لکھی جو فن حدیث کے اندر ایک عظیم کتاب ہے تو ان لوگوں نے ان کی فقہ سے استفادہ کیا۔ اور اسی طرح جہاں جہاں امام اعظم ﷫ اور ان کے شاگرد امام ابو یوسف ﷤ اور امام محمد ﷫ پہنچے تھے، ان لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ اور بعض علاقوں کے اندر امام احمد بن حنبل ﷫ کی فقہ سے استفادہ کیا۔

اس لیے اپنے ذہن کے اندر یہ بات رکھا کریں کہ جتنے ائمہ ہیں یہ سب علی الحق والھدیٰ ہیں، ہدایت پر ہیں اور رشد پر ہیں۔ اللہ ان کی تمام محنتوں کو قبول فرمائیں اور اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آدمی چاہے فقہی مسائل میں جزئیات میں کسی امام کے قول لیتا ہو، لیکن کسی دوسرے کی شان میں گستاخی نہیں کرنی چاہیے، نہ بے ادبی کرنی چاہیے اور نہ ان کی شان میں کوئی ایسا جملہ کہیں۔

ہمیشہ یاد رکھیں کہ ان ائمہ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی وہ کرتے ہیں جن کو اللہ نے علم سے محروم کیا ہے، جن کے سینے علم سے خالی ہیں اور جن کے دل بغض وحسد سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کے ذمہ یہ ہو جاتا ہے کہ اللہ کے اولیاء کا گلہ کریں۔ جب اللہ کسی پر ناراض ہو جاتا ہے تو اپنے دوستوں کا اسے دشمن بنا دیتا ہے اور وہ ہر وقت ان کی تنقیص اور ان کی شان میں گستاخی کرتے رہتے ہیں، حالانکہ وہ سب کے سب برحق ہیں۔ آدمی مخالفت کرے تو ان فرقوں کی کرے جو گمراہ ہیں، جو قرآن وحدیث سے ہٹ گئے، جن فرقوں نے اللہ کے قرآن وحدیث کا انکار کیا اور جن فرقوں نے اللہ کے قرآن میں ایسی تاویلات کر ڈالیں جن سے دین کا مزاج بدل گیا وہ گمراہ فرقے ہیں۔ اور پھر دیکھیں کہ خدا کی قدرت ہے کہ ان ائمہ کا بھی آپس میں بڑا ربط ہے، جیسے امام شافعی ﷫ بڑے شان والے امام

ہیں، لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں کہ انہوں نے حضرت محمد بن الحسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا ہے۔ اور اسی طرح حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا مقام ہے، لیکن انہوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے لیا ہے۔ اب اسی سے اندازہ فرمائیں کہ ان لوگوں کا آپس میں کتنا اعتقاد و محبت و احترام تھا۔ اگر کوئی اختلافی مسئلہ ہے تو انہوں نے خلوصِ نیت کے ساتھ اختلاف کیا ہے، دین کو سمجھنے کے لیے اختلاف کیا ہے اور ہم نے دین کو مٹانے کے لیے اختلاف کیا ہے۔ تو ان کے اختلاف میں اور ہمارے اختلاف میں بڑا فرق ہے۔ ان میں اگر کوئی اختلاف ہوا تو فہم کا اختلاف ہے، یعنی ایک بات کو سمجھنے کا اختلاف ہے اور وہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی ہوتا تھا۔

جیسا کہ ایک دفعہ میرے آقا خاتم الانبیاء حبیب کبریا...... صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا كَثِيرًا...... جنگ احزاب سے فارغ ہوئے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے جنگ کے ہتھیار اتار دیے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور عرض کیا: آپ نے تو ہتھیار اتار دیے، جبکہ ہم نے تو ابھی نہیں اتارے، بنو قریظہ کی طرف چلیے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ خبردار! سب لوگ عصر کی نماز بنو قریظہ یہودیوں کے قبیلہ میں جا کر پڑھیں۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے خلاف جنگ کے لیے چل پڑے۔ عصر کی نماز کا وقت جانے لگا تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے راستہ میں نماز پڑھ لی اور بعض نے کہا کہ چونکہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے اس لیے ہم تو بنو قریظہ میں جا کر ہی پڑھیں گے۔ چنانچہ جب یہ سب فریق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس حاضر ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عرض کیا: ہمارا تو آپس میں اختلاف ہوگیا۔ کچھ لوگوں نے نماز راستہ میں پڑھ لی اور انہوں نے کہا کہ نماز کا وقت مقرر ہے اور کچھ لوگوں نے آپ کے ظاہر حکم کو دیکھ کر نماز بنی قریظہ میں ادا کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم دونوں حق اور ہدایت پر ہو، مقصد تم دونوں کا میری تعمیل تھی، لہٰذا دونوں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

[مجمع الزوائد، حدیث: ۱۰۱۶۴، صحیح البخاری، حدیث: ۴۱۱۹، بَابُ مَرْجِعِ النَّبِيِّ ﷺ مِنَ...]

اس لیے دیکھیں کہ ہمارے ملکوں میں نماز آخر وقت میں پڑھی جاتی ہے اور اللہ کے حرمین نماز اوّل قت میں پڑھی جاتی ہے۔ نماز کے دو وقت ہیں: ایک اوّل وقت اور ایک آخر وقت ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی رائے مبارک یہ ہے کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو اوّل وقت میں ادا کرو، کیونکہ نہ جانے ہم بعد میں زندہ بھی ہوں گے کہ نہیں ہوں گے، ایک سانس نکلنے کی بھی ہمیں خبر نہیں ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردوں نے کہا کہ نماز آخر وقت میں پڑھے۔ لوگ دنیا کے معاملات میں الجھ گئے ہیں، اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تو رہا نہیں کہ دین کی تڑپ

ہو۔ اگر ہم اوّل وقت میں پڑھیں گے تو کچھ لوگ جماعت سے رہ جائیں گے۔ اگر ہم کچھ دیر کریں گے تو کچھ نہ پڑھنے والے بھی جماعت میں مل جائیں گے۔ اور یہ دونوں وقت حدیث پاک میں موجود ہیں کہ اللہ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا۔ اسی کعبہ مکرمہ میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے امام حضرت جبرئیل علیہ السلام بنے۔ پانچ نمازیں اوّل وقت میں پڑھائیں اور پانچ نمازیں آخر وقت میں پڑھائیں۔ تو اب جو اوّل وقت میں پڑھتے ہیں وہ بھی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں اور جو حضرات آخر وقت میں پڑھتے ہیں وہ بھی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع ہیں۔

[سنن أبي داود، حديث: ۳۹۳، باب: فِي الْمَوَاقِيتِ]

جیسے ہمارے بعض لوگ اس وقت عصر پڑھتے ہیں جب سورج پیلا ہو جاتا ہے، سورج ڈوبنے کے قریب آ جاتا ہے۔ انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ کوئی آدمی بیٹھا رہے اتنی دیر کہ سورج پیلا ہو جائے، ڈوبنے لگے تو نماز پڑھے۔ فرمایا: یہ منافق کی نماز ہے کہ جب وقت نکلنے لگا تو گلے سے بوجھ اتار کر پھینک کر فارغ ہو گئے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۶۲۲، بَابُ اسْتِحْبَابِ التَّبْكِيرِ بِالْعَصْرِ]

عصر کا سلام پھیرا اور مغرب کی شروع ہو گئی، یا ظہر کے وقت میں بیٹھا رہے اور بیٹھا رہے اور تقریریں کرتا رہے اور خطبہ کو اور جمعہ کو اتنا لمبا کر دے کہ عصر کا اوّل وقت شروع ہو جائے اور وہ خطبہ پڑھ رہا ہو تو یہ آدمی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نکل گیا۔ اور جس نے اوّل وقت میں نماز پڑھی یا جس نے آخر وقت میں نماز پڑھی، جیسا کہ احادیث میں آیا ہے تو دونوں کو ہم کہیں گے کہ وہ متبع سنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہمیں تمام ائمہ محدثین، تمام ائمہ مجتہدین، تمام ائمہ فقہاء اور تمام علماء حقہ کی اتباع اور ان کا ادب کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تفسیر ابن کثیر کی اہمیت:

اب دیکھیں کہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کتنا بڑا آدمی ہے، کتنا بڑا محقق عالم ہے، کتنا بڑا مفسرِ زمان گزرا ہے اور جس کی تفسیر کو اللہ نے یہ رنگ بخشا ہے کہ ہر مدرسہ میں پڑھی جاتی ہے۔ یعنی حنفی مدارس میں تفسیر ابن کثیر پڑھی جائے گی۔ شافعی مدارس ہیں تو خیر پڑھیں گے، کیونکہ آپ کا میلان بھی امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف ہوتا ہے، یعنی ہر فقہ والے اس تفسیر کو پڑھتے ہیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے پہلے اس آیت پر امام مالک رحمہ اللہ کی دلیل بیان کی، کیونکہ وہ باعتبار سن کے بڑے ہیں اور

باعتبار امام دار الہجرت ہونے کے اور ان کے بعد اقرب زمان ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے، پھر ان کی دلیل نقل کی کہ انہوں نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ امام صاحب کے پاس جب زنادقہ آئے تو ان کو ایک کشتی کی مثال دے کر اللہ کی توحید کو سمجھایا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اللہ کے وجود کی دلیل:

امام شافعی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ اللہ کی توحید اور وحدانیت، اللہ کی الوہیت اور ربوبیت کو آپ نے کیسے پہچانا؟ آپ نے فرمایا کہ دیکھو! یہ توت کا ایک پتہ ہے۔ جب یہی پتہ ہرن کھاتا ہے تو اس سے کستوری بنتی ہے، بکری کھاتی ہے تو مینگنیاں کرتی ہے اور اگر یہی پتہ شہد کی مکھی کھاتی ہے تو شہد بنتا ہے تو یہ دلالت کرتا ہے کہ اس کو بنانے والی کوئی ذات ہے، جس نے ایک غذا سے اتنی مختلف چیزیں نکال دی ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۹، الآیۃ: اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا]

انسان کے تکبر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تعجب!

حضرت علی نے ایک دن فرمایا کہ یہ دنیا والے سرمایہ دار جاگیر دار جو ہیں، مجھے تو ان پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کس بات پر ناز اور نخرہ کرتے ہیں اور تکبر کرتے ہیں؟ سب سے اعلیٰ کپڑا جو دنیا کے اندر سمجھا جاتا ہے وہ ریشم کا ہے۔ فرمایا: ریشم پر غور کرو تو ایک کیڑے کی گندگی سے بنتا ہے۔ تو ایک کیڑے کی گندگی سے نکلا ہوا کپڑا تم پہن کر فخر کرتے ہو، تم اس کی اصلیت پر تو غور کرو کہ اس کی اصلیت کیا ہے؟ اور فرمایا: سب سے اعلیٰ غذا شہد ہے اور اس پر بھی غور کرو تو وہ بھی ایک کیڑے سے نکلتا ہے، اس کو ''عسل'' کہا جاتا ہے کہ جو شہد کی مکھیوں سے نکلتا ہے۔ تو جو مکھیوں کا فضلہ ہے وہ تیری اعلیٰ غذا ہے اور جو ایک کیڑے مکوڑوں کا فضلہ ہے وہ تیرا اعلیٰ لباس ہے تو تم فخر کس بات پر کر رہے ہو؟ اور فرمایا کہ مرنے کے بعد تم خود کیڑے مکوڑوں کی غذا ہو تو تکبر کس بات پر کر رہے ہو؟ اکڑ کس بات پر کر رہے ہو؟ کبھی تم فرعون بن جاتے ہو، کبھی تم قارون بن جاتے ہو، کبھی تم نمرود بن جاتے ہو، غریبوں کی عصمتیں لوٹنے والے بن جاتے ہو اور غریبوں پر مظالم کرتے ہو۔ غور تو کرو! تمہاری حیثیت کیا ہے؟ اور فرمایا کہ آدمی اگر تھوڑا سا غور کرے کہ اللہ نے اپنا کیسا نظام بنا دیا کہ بڑے سے بڑا آدمی بادشاہ سے لے کر گدا تک، گدا سے لے کر شاہ تک، ہر آدمی کو چوبیس گھنٹے میں کم از کم ایک دفعہ اپنی گندگی پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ فرمایا: جو آدمی اپنی گندگی پر بیٹھنے والا ہو، جو آدمی اپنے ہاتھوں سے اپنی گندگی کو دھونے والا ہو، وہ خدائی کا دعویٰ کرے کہ میں بھی نفع ونقصان کا مالک ہوں، وہ

لوگوں سے کہے کہ میرے سجدے کرو، وہ لوگوں سے کہے کہ میرے پاؤں پڑو اور وہ لوگوں سے کہے کہ اپنے سر میرے پاؤں پر رکھو۔ اپنی گندگی پر بیٹھ کر اور ابھی اٹھ کر آ رہا ہے تو جس کی یہ حیثیت ہو اس کو تو چاہیے کہ اپنی عاجزی کو پہچانے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رب کو کیسے پہچانا؟

تو اس انداز میں جس طرح حضرت علی رحمہ اللہ نے پہچانا۔ ایک آدمی نے سوال کیا کہ اے علی! تم نے اپنے رب کی تقدیر کو کیسے پہچانا؟ حضرت علی نے جواب دیا:

"عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ"

فرمایا کہ میں نے اپنے رب کو پہچانا کہ جب میرے ارادے ٹوٹ جاتے ہیں، میں ارادے کرتا ہوں اور پروگرام بناتا ہوں، لیکن کوئی ایسی چیز آتی ہے جو ان کو توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ کوئی رب ہے جو ہماری ان تمام چیزوں پر قادر ہے، اسی کے فیصلے چلتے ہیں، ہماری تدبیریں کچھ نہیں کر سکتیں۔ تو اس لیے فرمایا کہ میں نے اپنے اللہ کو اپنے ارادے ٹوٹنے سے پہچان لیا، ورنہ اگر یہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ارادے کیوں ٹوٹتے؟

امام احمد رحمہ اللہ کی دلیل وحدانیتِ خداوندی:

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک بہت عجیب قلعہ ہے، جس کا دروازہ بھی کوئی نہیں، کھڑکی بھی کوئی نہیں، ہر طرف سے بالکل بند ہے۔ باہر سے چاندی کی طرح چمکتا ہے اور اندر دیکھو تو ایسا رنگ ہے جیسے خالص سونے کا رنگ چڑھایا ہوا ہے۔ اسی حالت میں اس بند مکان کی ایک دیوار گرتی ہے تو ایک ایسی مخلوق نکل آئی جو دیکھنے والی تھی، سننے والی تھی، بڑی پیاری تھی۔ حیران ہو کر لوگوں نے پوچھا: حضرت! ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مرغی کے انڈے پر غور کرو! باہر سے چاندی کی طرح چمکنے والا ہے، اندر سے سونے کی طرح چمکنے والا ہے، نہ دروازہ ہے، نہ کھڑکی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اندر بچہ پیدا کر دیتے ہیں۔ فرمایا: اس پر غور کرو تو تمہیں سمجھ آ جائے گا کہ کوئی ذات تو ہے جو یہ کام کر رہی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۹، الآیۃ: الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا]

عام علماء کی طرف سے مثال:

اور بعض علماء نے عجیب مثال دی ہے کہ مرغی کا بچہ پیدا ہونے کے بعد انسان کے بچے سے بھی زیادہ عقل والا

ہوتا ہے، حالانکہ انسان سب سے زیادہ عقل والا ہے، لیکن اس کو آہستہ آہستہ عقل آتی ہے۔ جیسا کہ چھوٹا بچہ اگر انسان کا ہو، اس کو آگ کے پاس چھوڑ دیں تو ہاتھ ڈال دے گا۔ اسے پتہ نہیں کہ میں نے آگ میں ہاتھ ڈالنا ہے یا نہیں؟ سامنے پانی بہہ رہا ہو، چلتے چلتے خود اس پانی میں گر جائے گا۔ اور مرغی کا ایک دن کا یا دو دن کا بچہ کیوں نہ ہو، بلی کو آتا ہوا دیکھے تو سیدھا ماں کے پروں میں بھاگے گا۔ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے یہاں حفاظت کا مقام ملے گا اور کسی جگہ نہیں ملے گا۔ انہوں نے فرمایا کہ اندازہ کریں! فوراً پیدا ہونے کے بعد ایک چھوٹا سا بچہ جو چوں چوں کر رہا ہے، دو دن کا تین دن کا پاؤں رکھنا مشکل ہے، لیکن جیسے بلی کو دیکھا دشمن کو پہچان گیا اور فوراً ماں کے پروں میں جا کر چھپ گیا۔ وہ جانتا ہے کہ بلی دشمن ہے، حالانکہ انسان کا بچہ بلی سے کھیل رہا ہوتا ہے اور سانپ سے بھی کھیل رہا ہوتا ہے۔ ایسے ہزاروں واقعات ہیں کہ وہ سانپوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے پائے گئے کہ سانپ بھی ان کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اللہ حفاظت فرما دیتے ہیں۔ اور سانپ عام طور پر ڈستا نہیں ہے، کیونکہ جب تک اسے چھیڑا نہ جائے تو وہ نہیں چھیڑتا۔ لیکن مرغی کے بچے میں اتنی عقل پیدا کر دی، دیواریں بھی بند ہیں، خدا کی قدرت دیکھو کہ اس کو مرغی کے نیچے رکھو یا ایک معین درجہ کی ہیٹ پہنچاؤ تو بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور اسے اپنے پیٹ کے نیچے نہ رکھو تو بچہ پیدا نہیں ہوگا یا اسے ویسے توڑ کر پکا کر کھا لو تو تمہاری مرضی ہے۔ انتظار کر لو گے تو اور مرغیاں نکل آئیں گی اور پھر مرغی کے بطن سے ایک بند انڈے کو پیدا فرما دینا۔

سورۂ کوثر کا اعجاز:

ایک دن ایک عرب مسلمان کو خیال آیا کہ عرب کے بڑے بڑے شاعر قصیدے لکھ کر اللہ کے کعبہ پر لٹکا دیتے ہیں، چلو میں بھی اللہ کے قرآن کی ایک سورت لکھ کر لٹکا دیتا ہوں۔ اس نے قرآن کی سب سے چھوٹی سورت ﴿إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ① فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ② إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ③﴾ [سورۃ الکوثر] لکھ کر اللہ کے کعبہ پر لٹکا دی۔ اب بڑے بڑے شاعر آئے اور وہ دیکھ رہے ہیں۔ آخر تمام شاعروں کا جو بڑا شاعر تھا اس نے آ کر جب پڑھا اور وہ مسلمان بھی نہیں تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تین آیات کے اندر اتنے بڑے دریا کو جمع فرما دیا ہے کہ ایک آیت مبارک میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی عظمت بیان فرما رہے ہیں کہ ہم نے تمہیں کوثر عطا فرمایا اور دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو حکم دے رہے ہیں کہ جب ہم نے اتنی بڑی شان والی اور عظمت والی کوثر عطا فرمائی ہے تو

عبودیت کا تقاضا ہے ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲﴾ کہ تم بھی اپنے رب کے لیے عبادت کرو، نماز پڑھو اور اللہ کے نام پر قربانی کرو۔ باقی جب تم عبادت بھی کرو گے، نمازیں بھی پڑھو گے، اللہ کی توحید اور اللہ کے نام پر قربانیاں بھی کرو گے تو لازماً تیرے دشمن بھی ہوں گے، جو تیری مخالفت بھی کریں گے۔ اللہ نے فرمایا: فکر نہ کرو ﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝۳﴾ تیرا دشمن جو ہے، اس کو ہم ختم کر دیں گے اور اس کا ذکر دنیا میں باقی نہیں رہے گا۔ تو اب تین آیات کے اندر اتنے بڑے مضامین کو جمع کر دینا اس شاعر نے جب پڑھا تو اس نے نیچے لکھا: ''وَاللهِ! لَيْسَ هٰذَا مِنْ كَلَامِ الْبَشَرِ'' خدا کی قسم کھا کر میں کہتا ہوں کہ یہ کسی بندے کا کلام نہیں ہو سکتا کہ ایک آیت میں عظمت کی چوٹیوں پر بٹھا رہے ہیں، شانِ کوثر عطا فرما رہے ہیں، دوسری آیت کے اندر حکم دے کر اپنی بندگی اور عبودیت کو بڑھا رہے ہیں اور تیسری آیت کے اندر اپنے نبی کی حفاظت کا مژدہ سنا رہے ہیں کہ تمہارے دشمن کا ذکر ہم ختم کر دیں گے، لیکن تیرا ذکر قیامت تک باقی ہو گا۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۳ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝۲۴

اور اگر تم شک میں ہو اس کلام کے متعلق جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو اس جیسی ایک سورت لاؤ اور اللہ کے سوا جو تمہارا مددگار ہو اس کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔ اگر ایسا نہ کر سکو اور کبھی کر بھی نہ سکو گے تو پھر اس آگ سے بچو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو کافروں کے لیے تیار کی ہوئی ہے۔

قرآن کے تین اہم مسائل:

اللہ نے اس رکوع میں سب سے پہلے توحید کا مسئلہ بیان فرمایا۔ اور قرآن مقدس میں سب سے اہم مسائل تین ہیں:

- ......ان میں سب سے پہلا توحید کا مسئلہ ہے۔
- ......دوسرا نبوت و رسالت کا مسئلہ ہے۔
- ......اور تیسرا مسئلہ قیامت کا ہے۔

سارے قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو آپ کو یہ تین مسئلے واضح نظر آئیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ان تین مسئلوں پر

آدمی کو اپنے ایمان اور عقیدے کو صحیح کرنا چاہیے، کیونکہ اگر ان میں خدانخواستہ ذرا سی بھی غلطی ہو جائے تو آدمی ایمان سے نکل کر کفر میں چلا جاتا ہے۔ توحید کا مسئلہ تو گزشتہ آیات میں دلائل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔

حضور ﷺ کو نبی اور خاتم الانبیاء ماننا ایمان کے لیے شرط ہے:

نبوت و رسالت کے لیے حضور ﷺ نے ایک بڑی واضح مثال ارشاد فرمائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جیسے ایک انسان ایک عمارت بناتا ہے اور اس میں ایک اینٹ کی جگہ باقی ہوتی ہے۔ جب وہ اینٹ لگ جائے تو وہ عمارت مکمل ہو گئی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبوت و رسالت کی اس عظیم عمارت میں جو آخری جگہ باقی تھی اس میں اللہ نے اپنے آخری نبی محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۲۸۶، باب ذکر کونہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین]

اور اسی طرح ہمارا ایمان ہے کہ حضور ﷺ کے آنے کے بعد اب اللہ نے نہ کوئی نیا نبی بھیجنا ہے، نہ ہی کوئی رسول بھیجنا ہے، نہ ہی کوئی نئی شریعت بھیجنی ہے اور نہ ہی کوئی نئی کتاب بھیجنی ہے۔ اب میرے مدنی پاک ﷺ کی نبوت بھی قیامت تک، رسالت بھی قیامت تک اور شریعت بھی قیامت تک ہے۔

اور اسی طرح یاد رکھیں کہ عام مغالطہ لگتا ہے تقابلِ ادیان کے بارے میں کہ جو آدمی اللہ پر ایمان رکھے، کسی نبی کو مانتا ہو اور آخرت کا مانتا ہو، چونکہ وہ جب اہل کتاب کے بارے میں قرآن مقدس میں ایسی باتیں پڑھتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ چلا جاتا ہے کہ چلو اللہ کو تو مانتے ہیں، اسی طرح وہ قیامت پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اسی طرح وہ ایک پیغمبر کو بھی مانتے ہیں، لیکن میرے پاک نبی ﷺ نے یہ مسئلہ بھی واضح فرما دیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری بعثت کے بعد اور میری نبوت و رسالت کے بعد جس آدمی کو بھی میری نبوت و رسالت کا پیغام پہنچا ہے، چاہے وہ بالواسطہ پہنچا ہو یا بلاواسطہ پہنچا ہو "ثُمَّ لَا يُؤْمِنُ بِي" اس کے بعد اگر وہ مجھ پر ایمان نہیں لے آیا تو وہ مسلمان نہیں ہوگا۔ [السنن الکبریٰ، حدیث: ۸۹۹۵]

یعنی آج اگر کوئی آدمی صحیح معنوں کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے، انہیں اللہ کا نبی اور اللہ کا رسول مانے، اللہ کی توحید کو بھی صحیح طریقہ سے مانے اور قیامت و آخرت کو بھی صحیح طریقہ سے مانے، لیکن حضور ﷺ پر ایمان نہ لائے تو وہ مسلمان نہیں ہوگا، کیونکہ جب حضور ﷺ تشریف لے آئے تو سابقہ تمام شریعتیں منسوخ ہو گئیں، تمام کتابیں منسوخ ہو گئیں اور تمام احکامات معطل ہو گئے۔ اگر صرف قیامت تک جاری رہے گی تو شریعت

محمد مصطفیٰ ﷺ۔ اور اسی کو ذا گہرے پہلو سے بھی دیکھا جائے کہ اگر آج کوئی آدمی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور میرے آقا ﷺ پر ایمان نہ لائے تو وہ دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان نہیں لے آیا، اس لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو باقاعدہ اعلان کیا تھا:

﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ [الصف:٦]

میرے بعد ایک نبی آئیں گے جن کا نام احمد (محمد مصطفیٰ ہوگا اور محمد مجتبیٰ) ہوگا تو تم لوگ ان پر ایمان لے آنا۔

جب حضور ﷺ پر ایمان نہ لایا تو گویا عیسیٰ علیہ السلام کا بھی وہ منکر ہے۔

اسی طرح یہ بھی عقیدے کی بات سمجھ لیں کہ جو آدمی اللہ کے ایک نبی پر ایمان لے آئے تو اس کو سارے انبیاء پر ایمان لازم ہوتا ہے۔ اگر ایک پیغمبر کا انکار کرے تو گویا اس نے سارے انبیاء علیہم السلام کا انکار کر دیا۔ تو گویا اس نے اللہ کے مسئلۂ نبوت اور رسالت کا انکار کر دیا۔

بعض وہ مسائل جو عقل سے سمجھ نہیں آسکتے:

اور اسی طرح یہ بات بھی اپنے دماغوں میں رکھ لیں کہ اللہ نے ہمیں علم عطا فرمایا اور اللہ نے ہمیں عقل عطا فرمائی ہے، لیکن ہر عالم کے احوال علیحدہ ہوتے ہیں۔ جب تک آدمی اس بات کو پہلے نہ سمجھ لے تو ٹھوکریں کھاتا ہے۔ مثال کے طور پر: عالمِ ارواح ایک عالم ہے، جو گزر چکا ہے۔ اب عالمِ ارواح کے بارے میں ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا اللہ کے قرآن نے ہمیں سمجھا دیا ہے، کیونکہ اس عالم کا مشاہدہ کرنا، اس کو دیکھنا اور اس عالم کو سمجھنا تو صرف ان کے لیے ممکن تھا جن کو اللہ تعالیٰ نے دکھلا دیا اور جن کو اللہ نے سمجھا دیا۔ جیسے کہ بعض روایات مبارکہ میں آتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو بتلایا گیا کہ یہ روح مبارک فلاں پیغمبر کی ہے اور یہ روح مبارک فلاں پیغمبر کی ہے۔ اور اسی طرح عالمِ ارواح میں اللہ نے تمام ارواح سے ایک عہد لیا:

﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝﴾ [الاعراف:۱۷۲]

کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا کہ آپ ہمارے رب ہیں، ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ ہی ہمارے رب ہیں، آپ ہی ہمارے مربی ہیں، آپ ہی ہمارے رازق ہیں اور آپ ہی ہمارے خالق ہیں۔ اس لفظ ''رب''

میں تمام صفات کا ذکر ضمناً آجاتا ہے، لیکن ہر آدمی کے لیے عالمِ ارواح کا مشاہدہ کرنا مشکل ہے۔

جیسے ہمارے اندر ایک روح ہے، لیکن ہم مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ کوئی کہے کہ ہمیں روح دکھلا دو، روح کیسے نکل جاتی ہے؟ بلکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس پر ہم ایمان لائیں گے اور مشاہدہ نہیں کر سکتے اور بعینہٖ اسی طرح جیسے ہوا ہمیں لگ رہی ہے، لیکن ہوا کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ اور اسی طرح ہم خواب دیکھتے ہیں اور خواب میں بڑے بڑے عجیب واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں، لیکن ہمیں اگر صبح اٹھنے کے بعد کوئی کہے کہ ان واقعات کو ہمارے سامنے حاضر کر دو تو ہمارے بس میں نہیں ہوتا۔

اسی طرح ہمیشہ یاد رکھیں کہ عالمِ ارواح کے اپنے واقعات ہوتے ہیں اور عالمِ دنیا کے علیحدہ اپنے واقعات ہوتے ہیں اور اس کے بعد عالمِ برزخ ہے اور عالمِ برزخ کے بعد عالمِ آخرت ہے۔ تو اگر کوئی آدمی کہے کہ ہمیں تو عذابِ قبر سمجھ نہیں آتا تو ایک طرف مسلمان کی قبر ہے تو ایک طرف کافر کی قبر ہے اور مسلمان کی قبر کے بارے میں آتا ہے کہ اللہ اسے کھول دیتے ہیں اور اللہ اس کو ۷۰ ہاتھ کے برابر وسیع فرما دیتے ہیں۔ تو اگر مسلمان کی قبر ۷۰ ہاتھ بڑھا دی جائے تو پھر وہ کافر کی قبر میں گھس جائے گا۔

تو اس طرح کے اس قسم کے اشکالات اس لیے کیے جاتے ہیں کہ اس عالم کو ہم نے دیکھا نہیں ہے۔ جب وہ عالم ہم دیکھ نہیں سکتے، وہ عالم ہم سے غیب میں ہے تو ان پر ہمیں ایمان بھی بالغیب لانا ہوگا۔ اس کی تحقیق میں ہم نہیں پڑ سکتے، کیونکہ ہم اس عالم میں گئے ہی نہیں۔

اس کی مثال جیسے بزرگوں نے دی ہے کہ ایک مینڈک جو ایک کنویں میں چار دیواری کے اندر رہتا ہے، لیکن ایک مینڈک دریاؤں کے کناروں پر ہوتا ہے اور ندیوں کے کنارے پر ہوتا ہے۔ اگر اس مینڈک کی آپس میں ملاقات کرا دیں اور وہ کنویں والے مینڈک کو کہے کہ میں جہاں رہتا ہوں، وہاں میلوں کے اندر پانی پھیلا ہوا ہے۔ وہاں میں چلتا رہتا ہوں، سیر کرتا رہتا ہوں۔ تو جو کنویں کا مینڈک ہے وہ یہ بات سمجھ ہی نہیں سکتا، وہ کہے گا: سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، اتنا بڑا پانی کیسے ہو سکتا ہے؟ بس پانی تو اتنا ہے جس کے اندر میں رہ رہا ہوں، اس کے علاوہ بڑے دریا تو دنیا میں ہو نہیں سکتے۔ تو یہ اس لیے کہ اس نے وہ بڑا دریا دیکھا نہیں ہے۔

جیسا کہ اس کے بارے میں علماء نے فرمایا کہ ایک بچہ نو مہینے تک اپنی ماں کے بطن میں رہتا ہے، رحم کے پردوں میں رہتا ہے اور ان اندھیروں میں رہتا ہے۔ اگر اس کو کوئی فرشتہ اندر سمجھائے کہ باہر آؤ گے تو بڑی دنیا ہے،

کروڑوں میل لمبی ہے، جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو ہزاروں میل جہازوں پر سفر کرو گے، تو وہ کہے گا کہ دنیا تو یہی ہے جس کے اندر میں رہتا ہوں، اس سے بڑی دنیا کیسے ہو سکتی ہے؟ اتنی ہی دنیا ہو گی جس کے اندر اس وقت میں موجود ہوں، اس سے زیادہ بڑی دنیا کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب وہ بچہ باہر آتا ہے، اس کے بعد آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے۔ جب وہ جوان ہوتا ہے، عالمِ دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ دنیا تو بہت بڑی ہے۔ اس لیے جو باتیں ہمیں سمجھ نہیں آتی ہیں تو مرنے کے بعد جب عالمِ برزخ میں ہمارا گزارا ہو گا پھر ہمیں عالمِ برزخ سمجھ آئے گا، کیونکہ وہ عالم ہم نے دیکھا ہی نہیں ہے۔ یہ ساری دنیا مشرق سے لے کر مغرب تک جب بھی نماز پڑھتی ہے تو ان کے دل کے اندر یہ نیت ہوتی ہے کہ اللہ کے کعبہ کی طرف ہمارا رخ ہے، لیکن انہوں نے کعبہ دیکھا نہیں، انہیں آپ جتنا سمجھاتے رہیں کہ کعبہ شریف کی ایسی عمارت ہے اور کعبہ شریف سرزمین مکہ کے اندر واقع ہے اور کعبہ شریف ایسے پہاڑوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور ایک وادی مبارک ہے، گویا کہ ایک پیالہ رکھا ہوا ہو، کیونکہ تمام زمین میں سب سے نیچی زمین یہ ہے۔ اندازہ فرمائیں کہ مکہ کی زمینوں کا بھی اگر مطالعہ کیا جائے تو تمام اطراف اونچے ہیں اور کعبہ سب سے نیچی جگہ پر ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو جگہ سب سے نیچی تھی وہاں اپنا گھر بنا کر اس کو آسمانوں سے بھی اونچا کر دیا۔ جو جگہ سارے جہاں سے نیچی تھی اس کو اتنی عزت بخشی کہ ساری کائنات سے اس کو اونچا کر دیا۔ تو اس میں اشارہ کیا کہ آپ کی اونچائی اور نیچائی جگہ کے اوپر نیچے ہونے میں نہیں ہے، یا کسی کا قد بڑا ہو تو وہ بڑا آدمی بن جائے اور کسی کا قد چھوٹا ہو تو وہ چھوٹا آدمی کہلائے یہ نہیں ہوتا، بلکہ اللہ جسے عزت عطا فرما دیں۔ بعض اوقات چھوٹے قد کے لوگ ہوتے ہیں، لیکن ان کو اتنا اونچا نام دے دیتے ہیں اور اتنی اونچی شان دے دیتے ہیں کہ پوری دنیا میں ان کا نام ہوتا ہے اور بعض بڑے قد کے ہوتے ہیں، لوگ انہیں بے وقوف اور احمق کہتے ہیں، دیکھو! اتنا لمبا اونٹ کے برابر قد ہو گیا، ابھی پیشاب کرنا بھی نہیں سیکھا۔ لوگ اس کی بے وقوفی کے لیے ایک ضرب المثل بنا دیتے ہیں تو اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ کعبہ جب تک کسی حاجی نے اپنی آنکھ سے نہ دیکھا ہو۔

اب بھی اندازہ کر لیں! ہمارے اپنے بھائی اور طالب علم اور ہماری مولوی برادری کتابوں کے اندر کعبہ کے بارے میں پڑھتے بھی رہتے ہیں اور پڑھاتے بھی رہتے ہیں کہ طواف کے سات چکر ہیں اور حجرِ اسود سے طواف شروع ہوتا ہے اور حجرِ اسود پر آ کر ہی ایک چکر پورا ہوتا ہے اور رکن یمانی پر ہاتھ لگایا جاتا ہے، رکن عراقی اور رکن شامی پر ہاتھ نہیں لگایا جاتا ہے اور پھر وہ پڑھتے ہیں کہ دو رکعت مقامِ ابراہیم پر پڑھی جاتی ہیں اور ملتزم پر دعا مانگی

جاتی ہے، لیکن کتابوں میں پڑھنے کے بعد جب وہ خود کعبہ میں آ جائیں تو انہیں سمجھ نہیں آتی، کیونکہ کتابوں کا پڑھنا علیحدہ بات ہے۔

اب بھی ہمارے حاجی حضرات جو رمضان المبارک میں آئے یا شوال میں آئے وہ کتنے خوش نصیب ہیں جنہیں صحیح طواف کرنا آتا ہے۔ اور ایسے بھی ہیں جو ابھی تک طواف نہیں سیکھ سکے۔ کئی لوگ آجاتے ہیں کہ طواف الوداع ہم نے کرنا ہے۔ وہ کیسے ہوتا ہے؟ اللہ کے بندے! جیسے طواف ہے ویسے طواف الوداع ہے، اس کے اندر کوئی فرق نہیں ہے۔ اب بھی ہمارے کئی حاجی یہ سمجھتے ہیں کہ طواف کے بعد زمزم نہ پیا تو طواف نہیں ہوگا۔ طواف کے بعد وہ دوڑتے ہیں اور زمزم پی رہے ہوتے ہیں کہ ہر طواف کے بعد زمزم پینا لازم ہے۔ اسی طریقہ سے اب بھی کتنے لوگ ہیں جنہیں یہ سمجھ نہیں ہے کہ ملتزم کس کو کہتے ہیں؟ اور مقامِ ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھنے کا کیا مطلب ہے؟ پیچھے کھڑے ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس سے ٹکرا کر کھڑے ہو جائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ مقامِ ابراہیم کے آپ پیچھے ہوں، مقامِ ابراہیم آپ کے آگے ہو، پیچھے جہاں بھی آدمی کو جگہ ملے وہ بھی گویا کہ مقامِ ابراہیم کے پیچھے ہے۔ اور اسی طرح آپ آج عشا کے بعد طواف میں دیکھ لیں کہ اگر طواف کرتے ہوئے کوئی واقف مل جائے تو اس کو کہتے ہیں: ادھر آؤ! بات سنو! اس سے بات شروع کر دیں گے تو کعبہ سے رخ بھی بدل گیا، کعبہ سے سینے بھی بدل گیا، کعبہ کی طرف پیٹھ دے کر کھڑے باتیں کر رہے ہیں اور پھر اس کے بعد طواف میں چل پڑے۔ اس لیے ان کو یہاں آنے کے باوجود بھی سمجھ نہیں آئی، حالانکہ حج میں دو مہینے گزر گئے۔ اور آئے ہوئے کسی کو ڈیڑھ مہینہ گزر گیا، کسی کو مہینہ سے اوپر ہو گئے اور انہوں نے ...... ماشاء اللہ! ...... کئی طواف کر لیے، عمرہ کا طواف کر لیا، حج کے طواف کر لیے اور پھر کئی نفلی طواف کر لیے، لیکن اس کے باوجود بھی وہ بے چارے بات کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ تو اس لیے جو عالَم ہم نے دیکھا نہیں ہے تو اس کے بارے میں سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ جو لوگ فوت ہو گئے وہ واپس نہیں آئیں گے کہ ہمیں بتا سکیں اور جو لوگ فوت ہو گئے ہم ان کو جا کر قبروں میں مل نہیں سکتے کہ ان سے کوئی بات پوچھ سکیں کہ ہمیں بتلائیں کہ قبر کیا چیز ہے؟

تو اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ وہ عالمِ برزخ ہے اور عالمِ برزخ کے بعد عالمِ آخرت ہے۔ کوئی آدمی یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ یہ تارے ختم ہو جائیں گے، چاند بے نور ہو جائے گا، سورج بے نور ہو جائے گا، زمین بدل ڈالی جائے گی اور پہاڑ اڑا دیے جائیں گے تو ایک آدمی کی عقل حیران ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک پہاڑ میں اگر حاجیوں

کے لیے راستہ بنانا ہو تو کروڑوں ریال خرچ ہو جاتے ہیں اور اتنے بڑے پہاڑوں کو روئی کی طرح اڑا دیا جائے گا، یہ بالکل ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اڑ جائیں گے، یہ کیسے ہوگا؟ یہ اس لیے سوچ رہا ہے کہ اس کے سامنے وہ عالم نہیں ہے کہ جب اس نے وہ عالم دیکھا نہیں ہے تو اس کے لیے اس کو سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آدمی کا ایمان بالغیب ہو۔ جب آدمی کا ایمان پکا ہو جائے گا جو ہمارے اللہ نے قرآن میں لکھا ہے وہ برحق ہے اور جو ہمارے آقا محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ بالکل حق ہے، ہمارے پاک نبی ﷺ کی زبان مبارک سے غلط بات نکل ہی نہیں سکتی، اللہ کے نبی ﷺ کوئی غلط بار فرما ہی نہیں سکتے، تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمیں مسائل کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ اب ہمارے آقا ﷺ نے فرمادیا کہ قیامت برحق ہے تو ہمارا اس پر ایمان ہے۔ ہمارے آقا ﷺ نے فرمادیا کہ عذابِ قبر برحق ہے تو ہمارا دین ہے، ہمارے آقا ﷺ نے فرمادیا کہ ہم قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو ہمارا ایمان ہے، ہمارے آقا ﷺ نے فرمادیا کہ ہم میدانِ حشر میں اللہ کے ہاں پیش ہوں گے، اعمال تقسیم ہوں گے، سزا اور جزا کے فیصلے ہوں گے اور ہم کو پل صراط سے گزارا جائے گا، جب اللہ کے نبی ﷺ نے فرمادیا تو ہمارا یہ ایمان ہے کہ حضور ﷺ کی زبان پاک ہے، اللہ کا نبی بھی پاک ہے، تو آپ کی زبان مبارک سے کبھی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی۔

مسئلۂ رسالت:

دوسرا اہم مسئلہ رسالت کا ہے۔ ان آیات میں اللہ نے اثبات کا مسئلہ بیان فرمایا۔ اور اثباتِ نبوت کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے وحی ثابت ہو، جو اللہ نے اتاری، اللہ نے اپنا کلام بھیجا ہے۔ اور حضور ﷺ کی صداقت اور حقانیت کی سب سے بڑی دلیل اللہ کا قرآن ہے کہ اللہ کا قرآن سچا ہے تو حضور ﷺ بھی سچے ہیں۔ جب قرآن کی صداقت اور حقانیت ثابت ہو جائے گی تو خود بخود حضور ﷺ کی نبوت اور رسالت ثابت ہو جائے گی۔ اللہ نے جو قرآن اتارا ہے اس کی سچائی کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ تمام دنیا کے مخالفین، منکرین، معارضین اور یہود ونصاریٰ کو اللہ نے قرآن میں تحدی اور چیلنج کیا کہ اگر تم قرآن کو نہیں مانتے اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ کسی انسان کا کلام ہے تو تم بھی تو عرب ہو، اس کے مقابلہ پر ایک سورت بنا کر لے آؤ۔ اور چودہ سو سال گزر گئے...... الحمد للہ ثم الحمد للہ...... نہ آج تک کوئی دشمن اسلام اللہ کے قرآن کے مقابلہ پر کتاب بنانے کی جرات نہ کر سکا۔

مسئلہ تحریف:

جیسا کہ بعض لوگوں نے اللہ کے قرآن کے اندر اس قسم کا ردّ و بدل کیا ہے، جیسے انہوں نے کہا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ [المائدة: ٦٧]

انہوں نے اس کے اندر ایک جملہ بڑھا دیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ... اَیْ فِیْ اِمَامَةِ عَلِیٍّ... وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾

اللہ نے حکم دیا تھا کہ میرے پاک نبی! امامتِ علی کا اعلان کر دو اور ساری دنیا کو سمجھا دو۔ اگر آپ نے یہ بات نہ پہنچائی تو گویا آپ نے رسالت کا فریضہ ہی سرانجام نہیں دیا۔

انہوں نے ایک جملہ بڑھا دیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ ساری دنیا نے کہا کہ تم غلط کہہ رہے ہو، کیونکہ قرآن پاک تو نبی ﷺ کی زبان مبارک سے لے کر آج تک محفوظ ہے اور اتنا بڑا حکم کہ جس کو ادا نہ کرنے پر حضور ﷺ کی رسالت بھی خطرہ میں پڑ جائے حضور ﷺ نے وہ مسئلہ امت کو کیوں نہ سمجھایا؟ حضور ﷺ نے پوری قوم کے سامنے وہ مسئلہ کیوں نہ رکھا؟ جس پاک نبی ﷺ نے ہمیں وضو کرنا سکھلا دیا، جس نے ہمیں سر پر مسح کرنا سکھلا دیا، جس پاک نبی نے ہمیں غسل کرنا سکھلا دیا، جس پاک نبی نے ہمیں انگلیوں کے اندر خلال کرنا سکھلا دیا اور جس پاک نبی نے ہمیں اتنا مسئلہ بھی بتا دیا کہ اگر عورت کے ہاتھ پر آٹا لگ جائے اور وہ سوکھ جائے اور وہ وضو کرے تو اگر اس کے اندر پانی داخل نہ ہو تو وضو نہیں ہوگا، اتنے مسائل بھی حضور ﷺ نے سمجھا دیے کہ اگر بال گندھے ہوئے ہیں اور عورت نے غسل کرنا ہے تو اگر بالوں کی جڑوں تک پانی نہیں پہنچے گا تو غسل نہیں ہوگا۔ حضور ﷺ نے جب ہمیں اتنے چھوٹے سے چھوٹے اور اتنے باریک مسئلے بھی سکھلا دیے تو اتنا بڑا مسئلہ کہ جس کا معاملہ اللہ کے نبی کی رسالت کے متعلق تھا وہ اللہ کے نبی ﷺ کیسے چھپا سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے۔

اور پھر ان کو جھٹلانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خود اپنی زندگی بھی تو موجود ہے۔ حضور ﷺ کے بارے میں اعلان فرما دیتے کہ...... نعوذ باللہ...... نبی نے یہ مسئلہ چھپایا تھا اور یہ مسئلہ قرآن میں موجود ہے۔ انہوں نے بھی کوئی ایسی بات نہ فرمائی۔ اگر کوئی کہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ڈر گئے تھے، اس لیے انہوں نے یہ مسئلہ بیان نہیں کیا۔ تو جو آدمی خود ڈرنے والا ہو وہ مشکل کشا کیسے بن سکتا

ہے؟ پھر اس کے نعرے کیسے لگائے جا سکتے ہیں؟ اور پھر اگر وہ ڈرتے رہے تو اس دور تک جب تک حضرت عثمان زندہ تھے، پھر جب خود بادشاہ بن گئے، خلافت کے تخت پر متمکن ہو گئے اور پھر خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے ساتھ جنگیں لڑیں تو اس زمانے میں تو اعلان فرما دیتے کہ قرآن میں میری امامت کا مسئلہ تو کھلا ہوا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کو جھٹلا دیا۔

اور خدا کی شان! قرآن کا معجزہ ہے کہ چودہ سو سال گزر گئے ہیں اور صنعاء کے علاقے میں قرآن پاک کا ایک بہت پرانا نسخہ ملا ہے، انہوں نے اس کو ٹھیک کر کے اپنے عجائب گھر میں رکھ دیا ہے اور وہ قرآن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ یعنی وہ مصحف جس کو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے خود لکھا تھا۔ آپ اندازہ فرمائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کتابت کرنے والے لوگ بہت کم تھے، ان میں ایک کاتب سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کاتب وحی تھے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی کاتب وحی تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی کاتب وحی تھے اور اسی طرح زید بن ثابت بھی کاتب وحی تھے۔ تو اب وہ نسخہ......الحمدللہ......ملا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے قلم مبارک سے لکھا ہوا ہے۔ اور اللہ تبارک تعالیٰ کی رحمت ہے کہ جب اس نسخے کو قرآن پاک سے ملایا گیا تو ایک زبر زیر میں بھی فرق نہیں ہے، یعنی ایک حرف میں بھی فرق نہیں ہے۔ تو اب تو خود یہ بات ثابت ہو گئی کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی یہی قرآن تھا جو......الحمدللہ......ہم پڑھ رہے ہیں، ان کے پاس بھی یہی مصحف تھا جو ہمارے مطالعہ میں ہے۔ اگر وہاں کوئی لفظ ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کم از کم اپنے قرآن میں تو لکھ دیتے۔

بہر حال ایسی چیزیں دشمنانِ اسلام نے کی ہیں جو دراصل یہودیوں کی سازش ہیں، دراصل یہ یہودیت کا ایک فتنہ تھا۔ اور یہودیت کا ایک پروگرام تھا کہ اللہ کے قرآن میں شکوک وشبہات ڈالنے کے لیے کہ بعض حروف کو آگے کر دیا جائے اور بعض حروف کو پیچھے کر دیا جائے، کسی جگہ ''فِیْ'' بڑھا دیا جائے اور کسی جگہ ''عَلٰی'' بڑھا دیا جائے اور کسی ''اِلٰی'' بڑھا دیا جائے، تاکہ قرآن میں شک ڈالنے کے لیے ہم یہ حربے استعمال کر سکیں۔ یہ ان کے سب سے بڑے رہبر ہیں، ان کو انہوں نے استعمال کیا۔ اور اسی طرح انہوں نے احادیث رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر بھی ایسے جملے ڈالے، اسی طرح انہوں نے تفسیروں کے اندر بھی ایسی تحریف کی ہے، کلام اللہ کو معنوی طور پر بھی بدلنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق واقعہ:

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب ملکہ بلقیس کا تخت منگوایا تھا سبا کے ملک سے...... یہ بڑا لمبا واقعہ ہے......اور جب بلقیس آ گئی تو لکھا ہے کہ انہوں نے چاہا کہ ہم بلقیس کا امتحان کریں، کیونکہ بعض لوگوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ بتلایا تھا کہ ملکہ بلقیس کی ماں جنی عورت تھی، یعنی وہ انسانوں میں سے نہیں تھی۔ اس کا باپ تو انسان تھا، لیکن اس کی ماں ایک جن عورت تھی، اس سے یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ تو اس کے اندر بھی وہ جنوں والی خصوصیات ہیں اور اس کے بدن پر بڑے بڑے بال ہیں جیسے جنوں پر ہوتے ہیں۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام چونکہ یہ ارادہ فرما چکے تھے کہ میں شادی کروں گا۔ انہوں نے لکھا کہ جیسے قرآن پاک میں آیا ہے کہ محل کے سامنے ایک بہت بڑا حوض تیار کیا گیا اور حوض کے اندر جو رنگ کیا گیا وہ پانی کے ساتھ ملتا ہوا تھا اور اس حوض کے اوپر جو شیشہ بچھایا گیا تو اس کا انداز بھی ایسا تھا کہ وہ پانی کے ساتھ مل جائے اور اوپر سے یہ معلوم ہو کہ کوئی چھت نہیں ہے، بلکہ پانی ہے۔ تو اتنا بڑا اہتمام کیا گیا اور اس کے بعد یہ بھی انہوں نے لکھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے محل کے سامنے ایک کرسی پر متمکن ہو گئے کہ چاہے مرد ہو یا عورت اگر پانی سامنے آئے تو فوراً اپنے کپڑے کو اونچا کرتا ہے کہ مجھے پانی نہ لگ جائے۔ حضرت سلیمان نے یہ سارا اس لیے کیا کہ اس سے ہمیں پتہ لگ جائے کہ وہ جنی ہے یا اس کا بدن صاف ہے؟ تو یہ ساری باتیں روایت کے اندر لکھی گئیں جو کہ سب یہودیوں کا ایک فتنہ ہے۔ اللہ کے قرآن کے اندر تحریف کرنے اور انبیاء علیہم السلام کی شان میں ایسے ایسے رکیک حملے کرنے کا منصوبہ ہے کہ اللہ کے پیغمبروں کی شان کے اندر کمی آ جائے کہ اللہ کا نبی ایک عورت کی پنڈلیاں دیکھنے کے لیے اتنا خرچ کر سکتا ہے۔ تو پھر آج کل کے خاکوں پر کیوں اعتراض کیا جائے؟ اللہ کے نبی پاک ہونے کے باوجود اور پھر وہ نبی جس کے جن تابع ہوں، وہ کسی جن سے کہہ کر پتہ نہیں کرا سکتے تھے کہ پتہ کراؤ کہ یہ عورت جنی ہے یا انسان ہے؟ ان کو کیا ضرورت ہو گئی کہ وہ اتنا بڑا حوض بنواتے اور حوض کے اوپر شیشہ بچھواتے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ بچھوایا گیا، قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس پیغمبر نے یہ انتظام فرما دیا کہ جب وہ آئے گی:

﴿قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۖ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ عَن سَاقَيْهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّن قَوَارِيرَ ۗ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٤﴾﴾ [النمل: ۴۴]

جب اس کو کہا گیا کہ چلو آگے داخل ہو جاؤ۔ اس نے سمجھا کہ یہ پانی ہے، کہیں میں پانی میں گر نہ جاؤں تو اس نے

اپنی پنڈلیوں کو کھولا۔ اس کو خبردار کیا گیا کہ اے ملکہ! یہ تو شیشہ ہے، پانی نہیں ہے کہ آپ ڈوب جائیں گی، آپ اس کے اوپر چل سکتی ہیں۔

یہ سارا قصہ قرآن میں موجود ہے، لیکن اس کو یہ رنگ دینا کہ یہ اللہ کے نبی نے اس لیے کیا تھا کہ بلقیس کی صرف پنڈلیاں دیکھ لے۔ یہ جو آگے جوڑ لگایا گیا یہ یہودی ذہن تھا کہ جنہوں نے اللہ کے پیغمبر کی شان کو گھٹانے کے لیے اور اللہ کے نبیوں پر بہتان باندھنے کے لیے ایسے ایسے واقعات کو ملا دیا۔ اس کو تحریفِ معنوی کہتے ہیں۔ ورنہ حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا پیغمبر، جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [النمل:۱۵]

جن کو ہم نے خاص علم عطا فرمائے تھے، جن کو ایک پرندہ ہدہد رپورٹ لے کر دیتا تھا، اس پیغمبر کے لیے یہ مشکل تھا کہ اس ملکہ بلقیس کے بارے میں یہ تحقیق کر لیتے کہ یہ انسان کی بیٹی ہے یا جن کی بیٹی ہے؟ یا اس کے بدن پر بال ہیں یا اس کے بدن پر بال نہیں ہیں؟ اور پھر یہ قرآن پاک میں یا کسی صحیح روایت میں ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے شادی بھی کی ہو۔ تو یہ سارا قصہ دراصل کیوں بنایا گیا؟

اور اب سمجھیں کہ قرآن میں یہ واقعہ موجود کیوں ہے؟ قرآن تو کہتا ہے کہ ایسا بنایا گیا، شیشے کی چھت بھی ڈالی گئی اور یہ بھی قرآن کہتا ہے کہ اس نے پنڈلیوں سے کپڑے کو ہٹایا۔ تو یاد رکھیں! اس کی وجہ یہ تھی کہ ملکہ بلقیس سورج کی پوجاری تھی، یعنی وہ سورج کو خدا سمجھتی تھی، جیسا کہ قرآن میں موجود ہے۔ جب ہدہد نے رپورٹ کی تھی تو بتلایا:

﴿وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴾ [النمل:۲۴]

ہم نے دیکھا ہے اس کی ملکہ کو بھی اور اس کی قوم کو بھی کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر سورج کی پوجا کرتے ہیں۔

دراصل اللہ کے نبی نے ملکہ کو توحید کا سبق سکھانا تھا۔ اللہ کے پیغمبر نے ایسا انتظام کر دیا۔ اللہ کے نبی نے نیچے ایک بہت بڑا خوبصورت حوض بنوایا...... اور ایسے حوض بھی آج کل دنیا میں موجود ہوتے ہیں...... اور اس کے اوپر بڑا شیشہ بچھا دیا گیا۔ وجہ کیا تھی کہ اللہ کے پیغمبر ان کو توحید کا سبق دینا چاہتے تھے۔ یہ نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سامنے بیٹھے تھے اور وہ پنڈلیاں دیکھ رہے تھے۔ یہ بالکل جھوٹی بات ہے۔ اس کے ساتھ تو اس کو لے آنے والے

آپ کے وزراء اور جو تابع لوگ تھے وہ لا رہے تھے اور جب وہ وہاں آئی تو اس نے وہاں اس شیشہ کو نہ دیکھا اور اس کو پانی سمجھا تو اللہ کے نبی نے تنبیہ کی کہ تم نے جیسے سورج کو دیکھ کر اس کو خدا سمجھ لیا ہے، سورج خدا نہیں ہے، مظہرِ نورِ خدا تو ہے، یہ سورج دیکھ کر تم اس کے خالق کو پہچانو، یہ نہیں کہ سورج کی چمک میں دھوکہ کھا جاؤ۔ دیکھو! جیسے تم نے یہاں پانی کا دھوکہ کھالیا، حالانکہ شیشہ مظہر تو تھا کہ پانی کو دکھانے والا تو تھا، لیکن خود پانی نہیں تھا، تو جیسے تم نے یہاں دھوکہ کھایا ہے ویسے تم نے سورج کو خدا سمجھ کر دھوکہ کھایا ہے۔ سورج خدا نہیں ہے، بلکہ سورج کا خالق خدا ہے، خدا تو اس کو بنانے والا ہے۔ اب وہ بادشاہ تھی، ملکہ تھی، اس کو بھی چوٹ لگی تو اس کو مسئلہ سمجھ آیا تو اس نے فوراً کہا:

﴿قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَٰنَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَٰلَمِينَ ۝﴾ [النمل: ۴۴]

یا رب! میں اقرار کرتی ہوں کہ میں نے سورج کو خدا بنا کر اپنے اوپر ظلم کیا، واقعی میں بھٹک گئی تھی، واقعی میں تجھے نہ پہچان سکی کہ میں تیری صفتوں میں الجھنے کے بعد اسی کو خدا بنا بیٹھی۔ اب میں اسلام قبول کرتی ہوں اور میں تیری توحید کا اقرار کرتی ہوں اور سلیمان علیہ السلام کی نبوت کا اقرار کرتی ہوں۔

وہ فوراً اسلام لے آئی، ورنہ اگر اس کی پنڈلیاں دیکھنے کے لیے انتظام کیا جاتا تو وہ متنفر ہو جاتی، چہ جائیکہ وہ اسلام لے آتی۔ وہ کہتی کہ اچھے پیغمبر ہیں، اچھے بادشاہ ہیں، جس نے میری پنڈلیاں کھلوانے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچوایا ہے...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... تو وہ فوراً اسلام کیوں لے آئی؟ اس کو سمجھ آ گئی، کیونکہ بادشاہ تو اشاروں کی بات کو سمجھ جاتے ہیں، ان کے لیے اشارات کافی ہوتے ہیں۔ تو اس کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک ایسا انتظام فرما دیا کہ اس کا دماغ ہل گیا کہ جیسے میں نے یہاں ٹھوکر کھائی ہے، میں نے عقیدے میں بھی ٹھوکر کھائی ہے۔

بعض یہودیوں نے اللہ کے قرآن کی تفاسیر میں بھی اسی طرح کی تحریف کی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ:

اب دیکھیں! جیسا کہ مشہور قصہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے بدن میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ آپ نے بھی سنا ہوگا اور کیڑے جب گرتے تو آپ چن چن کر بدن پر رکھتے تھے اور اس کے بعد وہ کیڑے زبان تک پہنچ گئے، حالانکہ یہ ساری چیزیں اللہ کے قرآن میں تحریف کے برابر ہیں۔ قرآن مقدس نے تو صرف اتنا کہا ہے:

﴿وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾[الانبیاء:۸۳]

میرے اللہ! مجھے تکلیف ہے۔

اب وہ تکلیف کیا ہے؟ وہ میرے اللہ نے بتلائی ہی نہیں۔ اس کا معنی خود کیڑے بنالینا تو اس کی وجہ کیا تھی کہ پیغمبر کی شان میں اتنی کمی کردی جائے کہ اللہ کے نبیوں کو بھی......نعوذ باللہ......دنیا میں کیڑے پڑ جائیں تو بات کیا رہ گئی؟ اللہ اپنے انبیاء علیہم السلام کو ایسی کوئی تکلیف نہیں دیتے جس سے ان کی شان اور عظمت کے اندر فرق آجائے، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کے بدن کو بھی محفوظ رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کی شان کو بھی محفوظ رکھتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کے مقام کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔

مسیلمہ کذاب کا دعوائے نبوت:

اسی طرح عرب کے اندر ایک آدمی مسیلمہ کذاب گزرا ہے، اسی طرح ایک اسود عنسی گزرا ہے، یمن کے علاقہ میں رہنے والا تھا۔ اس نے میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ شان پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نصیب فرمائی کہ انہوں نے اپنی خلافت کے زمانے میں اس جھوٹے نبی کو قتل کردیا، اس سے جنگ لڑی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو فتح نصیب فرمائی۔ تو وہ مسیلمہ کذاب اس کو بھی خیال آیا کہ میں بھی تو کوئی کام کروں تو اس نے ایک دن اپنے سارے ساتھیوں کو بلوایا اور کہا کہ کیا بات ہے کہ اگر اللہ کے نبی حضرت محمد رسول اللہ پر جبرئیل علیہ السلام اترتا ہے تو میرے اوپر بھی فرشتہ اترتا ہے، میرے اوپر بھی وحی آتی ہے اور میرے اوپر بھی قرآن نازل ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، تم ہمیں اپنا قرآن سناؤ۔ تو اس زمانہ میں یہ آیت مبارک اتر چکی تھی

﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ۝ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۝ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝﴾[سورۃ الفیل]

اب اس نے تحریف کی اور ایک نیا قرآن بنایا کہ:

''اَلْفِيْلُ وَمَا الْفِيْلُ؟ وَمَا اَدْرَاكَ مَالْفِيْلُ؟ ذَنَبُهُ قَصِيْرٌ، وَخُرْطُوْمُهُ طَوِيْلٌ''

انہوں نے جب یہ سنا تو اس کو کہا کہ بات سنو! ہم تو تجھے مانتے ہیں، لیکن اگر تو نے باہر یہ سنایا تو لوگ تجھے جوتے

ماریں گے۔ یہ اللہ کا قرآن ہے؟ یہ اگر کوئی سنے گا تو کہے گا کہ پاگل ہو گیا ہے؟ وہ تو تمہیں پاگل قرار دے دیں گے۔ بس تم اپنی اس وحی کو اپنی حد تک رکھو، آگے نہ بتانا۔

[اشارات الاعجاز فی مظان الایجاز: ۱/ ۱۹۷]

واقعہ مرزا قادیانی:

اسی طرح جیسے تمہارے ہاں مرزا غلام احمد قادیانی علیہ اللعنۃ پیدا ہوا تو اس نے بھی بتایا کہ میرے اوپر بھی ایک فرشتہ اترتا ہے، اس کا نام ہے ''ٹیچی'' کیونکہ نبی انگریزی تو فرشتہ بھی انگریز اترے گا، فرشتہ ہندوستانی تو اتر نہیں سکتا، کیونکہ نبی بھی اس کو انگریزوں نے بنایا تھا اور فرشتہ بھی انہوں نے ہی بھیجا ہوگا کہ اس کا نام بھی ٹیچی ٹیچی ہے۔ اور یہ بات ہم اعتراض میں نہیں کہتے، بلکہ اس نے خود اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ میں نے انگریز سرکار کی حفاظت کے لیے اور انگریز سرکار کی اعانت کے لیے اتنی کتابیں لکھی ہیں کہ جس سے سینکڑوں الماریاں بھر سکتی ہیں۔

تو اس نے بھی ایک دفعہ اعلان کیا کہ میں ایک کتاب لکھوں گا جس کی پچاس جلدیں ہوں گی۔ میرے پاس وحی آئی ہے اور میرے پاس فرشتہ خبر لے کر آیا ہے کہ میں ایک کتاب لکھوں گا جس کی پچاس جلدیں ہوں گی اور وہ کتاب میری نبوت کی سچائی اور صداقت کی بڑی دلیل ہوگی۔ اب ایسا ہوا کہ اس بدبخت کو لکھنے کا موقع نہ ملا تو اس نے بڑی مشکل سے اور ادھر ادھر محنت کر کے اور لوگوں کو بٹھا کر پانچ جلدیں لکھ دیں۔ اور اب لوگوں نے ہر طرف سے مطالبہ شروع کیا کہ نبی تو جھوٹا ہوتا نہیں، یہ بدبخت جب کہتا ہے کہ وحی اتری ہے، میں پچاس جلدیں لکھوں گا اور اس نے ابھی تک پانچ جلدیں لکھی ہیں، اور بھی جلدیں لکھے۔ اب اس نے پانچ بڑی مشکل سے پوری کی تھیں تو اس نے کہا: ہاں! آج فرشتہ پھر اترا ہے اور اس نے کہا کہ تم اپنی امت کو بتلا دو کہ ظاہر میں تو یہ پانچ ہیں، لیکن ان کو پچاس سمجھیں۔ جیسے اللہ نے نبی کو پچاس نمازیں دی تھیں اور امت پانچ پڑھتی ہے، لیکن لکھی پچاس جاتی ہیں۔ تو گویا میں نے لکھی یہ پانچ جلدیں ہیں، لیکن اس کو پچاس سمجھ کر ایک صفر خود لگا دیا۔ جیسا کہ:

﴿مَن جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُۥ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ [الانعام: ۱۶۰]

تو اس طرح اس نے بھی اللہ کے قرآن میں تحریف کی۔

اور جیسے اعلیٰ حضرت نے بھی ترجمہ قرآن لکھا تو جہاں جہاں لفظ ''نبی'' آتا تو وہاں لکھ دیا: ''اے غیب کی خبر دینے والے!''۔ حالانکہ نبی کا معنی ہوتا ہے ''خبر دینے والا'' نبا خبر کو کہتے ہیں:

﴿عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ① عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ ②﴾ [النبا:۱،۲]

اسی طرح:

﴿قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيمٌ ﴿٦٧﴾﴾ [ص:۶۷]

اسی طرح:

﴿ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ﴾ [آل عمران:۴۴]

یہ انباءِ غیب ہیں۔ تو نبا کا معنی ہوتا ہے خبر دینے والا، لیکن وہ لکھتا کہ ''اے غیب کی خبر دینے والے''۔ تو غیب کا لفظ بڑھا کر معنوی تحریف کی، کیونکہ ہر آدمی پڑھنے والا وہ اس کو یہ سمجھے گا کہ ہر نبی عالم الغیب ہوتا ہے، لہٰذا قیامت تک ان کے عقیدے میں یہ بات بیٹھتی چلی جائے گی۔ یہ ایک تحریف ہوتی ہے۔ اسی طرح کعبۃ اللہ کے بارے میں فرمایا:

﴿رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ﴾ [ابراہیم:۳۷]

اللہ کے نبی حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام نے کہا کہ اے پروردگارِ عالم! میں نے اپنے بچوں کو ایک وادی میں جہاں زراعت نہیں ہوتی، جہاں آبادی نہیں اور جہاں باغات نہیں ہوتے وہاں تیرے حکم سے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

تو اس نے ترجمہ کیا کہ یا اللہ! میں اپنے بچوں کو ایک نالہ میں بٹھا کر جا رہا ہوں۔ وادی کا معنی نالہ بنا دیا، حالانکہ وادی کو آپ پہاڑوں کا دامن کہہ سکتے ہیں۔ جب قرآن میں کسی جگہ اللہ نے وادی کا ترجمہ نالا کے ساتھ نہیں کیا ہے تو ایسے تراجم کرنے سے مقصد کیا ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ دماغوں کے اندر غلط باتیں بیٹھ جائیں، لیکن بہر حال میرے ان سب مثالوں کے دینے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ ان تمام دشمنیوں کے باوجود آج بھی چودہ سو سال کے بعد اللہ کا قرآن اسی طرح تر و تازہ ہے، اسی طرح سرسبز ہے، اسی طرح شاداب ہے اور اسی طرح کامل و مکمل ہے جیسے میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا۔ اللہ کے کروڑوں صلوۃ وسلام ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت و عبدیت:

نبی کی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے اللہ نے یہاں کافروں کو خطاب کیا ہے کہ اے کافرینِ مکہ! اے کفارِ عالم! اگر تم لوگوں کو شبہ ہے اس کتاب میں جو ہم نے اپنے عبد پر اتاری ہے۔ جیسے اللہ کی صفت عبودیت ہے تو سب سے

بڑی صفت عبد ہوتا ہے۔ یہاں تمام کفار کو چیلنج کیا جا رہا تھا، لیکن اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے جو اتارا اپنے نور پر ''مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى حَبِيْبِنَا...... یا...... مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى نُوْرِنَا، مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى نَبِيِّنَا' حالانکہ یہ ساری بات ٹھیک تھی، لیکن فرمایا ﴿مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا﴾ تاکہ لوگوں پر بھی یہ واضح ہو جائے کہ میرے نبی ﷺ میرے عبد (بندے) ہیں۔

اس لیے اللہ نے ہمیں ہر نماز میں یہ سبق پڑھایا کہ جب ہم فرض پڑھیں گے، سنتیں پڑھیں گے، وتر پڑھیں گے، تہجد پڑھیں گے اور نفل پڑھیں گے تو ہر نماز میں ہم اقرار کریں گے ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ'' اس میں بھی عبد کو مقدم کیا اور رسول کو موخر کیا، حالانکہ اللہ یوں بھی فرما سکتے تھے کہ نماز میں یوں پڑھا کرو'' وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُهٗ وَ عَبْدُهٗ '' فرمایا کہ جو میرے مدنی کو عبد نہیں مانتا تو وہ ان کو رسول بھی نہیں مانتا۔ اس کو پہلے عبدیت کا اقرار کرنا پڑے گا کہ اللہ کا نبی عبد ہے۔ عبد بنے گا تو رسالت ملے گی، عبد بنے گا تو نبوت ملے گی، عبد بنے گا تو معراج ہوگا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ①﴾ [الاسراء: ۱]

تو جب اللہ کا نبی عبد ہے تو ساری کائنات اللہ کے آگے عبد ہے۔ اس لیے فرمایا:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ [الفرقان: ۶۳]

تو یہ عبد ہے اور وہ معبود ہے۔ عبد اور معبود میں اگر کوئی فرق نہ کر سکے تو اس سے بڑا جاہل دنیا میں کون ہو سکتا ہے؟ عبد عبد ہوتا ہے اور معبود معبود ہوتا ہے، مخلوق مخلوق ہوتی ہے اور خالق خالق ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ نے یہاں بھی ایک لفظ ذکر فرما کر واضح کر دیا کہ میرے نبی کی نبوت کو ماننا، لیکن خبردار! کہیں یہ نہ ہو کہ انہیں خدا بنا بیٹھو اور مقامِ بشریت وعبودیت سے باہر نکال بیٹھو۔

مخاطب اوّل اس کے کفارِ مکہ ہیں، کیونکہ قرآن جب نازل ہوا تو سامنے کفارِ مکہ تھے، اس لیے ان کو خطاب کیا جاتا تھا، ورنہ یہ خطاب قیامت تک عام ہے، لیکن...... الحمد للہ...... نہ حضور ﷺ کے زمانہ میں کوئی قرآن بنا سکا، نہ حضور ﷺ کے بعد کوئی بنا سکا، نہ آج تک کوئی قرآن کا مقابلہ کر سکا اور نہ قیامت تک کوئی قرآن کا مقابلہ کر سکے گا۔ تو جب قرآن کی صداقت واضح ہوگئی تو حضور ﷺ کی نبوت ورسالت واضح ہوگئی۔ تو اس آیت میں اللہ تبارک

وتعالیٰ اصل میں اثباتِ وحی فرما رہے ہیں، لیکن اس کے ضمن میں اثباتِ نبوت خود بخود ہو رہا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی فضیلت:

صحابہ کی مجلس قائم تھی، حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ﴾ [النصر:۱] کی تفسیر بیان کریں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تفسیر بیان کی کہ اللہ کی مدد آ گئی اور اللہ نے اسلام کو فتوحاتِ عظیم سے سرشار فرمایا، حتیٰ کہ مکہ بھی فتح ہو گیا تو اللہ نے اسلام کو اتنی قوت اور طاقت دے دی ﴿وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا﴾ [النصر:۲] کہ اب تو فوجوں کی فوجیں اور جماعتوں کی جماعتیں اسلام میں داخل ہونے لگیں۔ پہلے تو ڈر ڈر کر کوئی ایک مسلمان ہوتا تھا، دو مسلمان ہوتے تھے یا چار آدمی مسلمان ہوتے تھے، لیکن جب اللہ نے اسلام کو غلبہ عطا فرما دیا اسلام کو، اللہ نے قوت عطا فرما دی تو فوجوں کی فوجیں اور جماعتوں کی جماعتیں اسلام میں داخل ہو رہی ہیں۔

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا:...... آپ ان کو فرمایا کرتے تھے "یا غَوَّاصَ الْقُرْآنِ" (اللہ کے قرآن میں غوطہ لگا کر ڈوب جانے والا اور موتیوں کو نکالنے والا) "غَوَّاص" عربی میں ان کو کہتے ہیں جو سمندر میں غوطہ خور ہوتے ہیں، یا بڑے بڑے کنووں کے اندر غوطہ خوری کرتے ہیں اور نیچے سے قیمتی چیزیں نکال کر لے آتے ہیں...... تو انہوں نے پوچھا کہ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا: امیر المؤمنین! ایک اس کی ظاہری تفسیر ہے، جو صحابہ رضی اللہ عنہم نے بیان فرما دی ہے، لیکن اس کے اندر اشارہ ہے قریب وفاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اس سورت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے پوچھا: وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا تھا اپنے دین اسلام کے لیے اور یہ بھی وعدہ فرمایا تھا کہ آپ کے دین کو باقی ادیان پر غالب کر دیں گے:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾

[التوبۃ:۳۳]

اور اب اللہ کے نبی کا دین غالب آ گیا اور عرب کے اہم مراکز مکہ اور مدینہ اسلام کے آگے سرنگوں ہو چکے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جب دین کا کام پورا ہو گیا تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کے دن قریب آ گئے۔ اس وجہ سے اس سورت مبارک میں یہ اشارہ ملا ہے۔ حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: دیکھو! جس بات پر حضرت

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا دماغ پہنچا ہے اور کسی کا نہیں پہنچا۔ ان کے علم کی وجہ سے میں ان کی تکریم کرتا ہوں۔
[صحيح البخاري، حديث: ۴۲۹۴]

اسی لیے محدثین نے فرمایا ہے:
''رِوَايَةُ الْأَكَابِرِ مِنَ الْأَصَاغِرِ''

محدثین نے باقاعدہ اس پر بحث فرمائی ہے کہ ایسا بھی کبھی ہوتا ہے کہ ایک بڑی عمر والا آدمی ایک چھوٹی عمر والے سے علم حاصل کرتا ہے۔ یعنی کبھی بڑوں کو چھوٹوں کی شاگردی کرنی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں علم کے ساتھ عزت عطا فرما دیتے ہیں۔ تو یہ بہت بڑے مرتبہ والے صحابی ہیں۔

اور خصوصی طور پر قرآن پاک میں جہاں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول مل جائے طالب العلم یہ یاد رکھا کریں کہ بہت ساری تفسیروں میں کہہ دیا جاتا ہے ''قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ'' کہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے، حالانکہ وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نہیں ہوتا۔ اصل بات یہ ہوتی ہے کہ اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور سند کے ساتھ یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ قول واقعی ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے، ان کے قول کی بہت بڑی عظمت ہے اور ان کا بہت بڑا مقام ہے۔ ایک تو انہوں نے علم تفسیر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پڑھا اور دوسرا انہوں نے وہ علم بچپن سے ہی حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور بچپن کی عمر میں بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کو آقا نامدار سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا ملی ہے۔ تو جن کے لیے میرے مدنی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا فرما دیں تو ان کے علم کا پھر کون مقابلہ کر سکتا ہے......!؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی کثرت روایت حدیث:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رات دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رہتا تھا اور آپ کی حدیثوں کو یاد کرتا تھا، کیونکہ اور تو میرا کام نہیں تھا، نہ میرے پاس تجارت تھی، نہ دکان تھی اور نہ کاروبار تھا۔ میں نے اپنے پورے اوقات حفظ حدیث کے لیے لگا دیے...... لیکن جب اتنی بڑی حدیثوں کا ذخیرہ آ جائے تو ان کو یاد رکھنا بھی تو مشکل ہے...... اس لیے فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے میری چادر پڑی ہوئی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے لیے دعا فرمائی اور فرمایا: اس چادر کو لپیٹ کر اپنے ساتھ لگا لو۔ میں نے لپیٹ کر اپنے ساتھ لگا لی تو اس دعا کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر جو بھی حدیث میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی وہ کبھی نہیں بھولی، پھر زندگی میں مجھے

حضور ﷺ کی حدیث فراموش نہیں ہوئی، ہمیشہ مجھے حدیث یادرہی اور حضور ﷺ کی دعا لگ گئی۔

[صحیح البخاری، حدیث ۱۱۹، باب: حِفظِ العِلمِ]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حافظہ:

اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا بھی واقعہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ نے علم تو عطا فرمایا تھا، لیکن میں یاد نہیں رکھ سکتا تھا، میرا حافظہ نہیں تھا اور میں اس کو جلدی بھول جاتا تھا۔ حضور ﷺ سے میں نے عرض کیا تو آپ ﷺ نے مجھے ایک دعا سکھلائی۔ اور وہ دعا ترمذی اور مشکوۃ شریف کے اندر حدیث شریف میں موجود ہے۔ اور بعض لوگوں نے فضائلِ قرآن پر جو کتابیں لکھی ہیں اس کے اندر بھی اس دعا کا ذکر کر دیا ہے۔ اگر کوئی طالب علم یا کوئی آدمی اس دعا سے فائدہ حاصل کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ اس سے ضرور فائدہ حاصل کرے۔ فرماتے ہیں کہ مجھے حضور ﷺ نے ایک دعا سکھلا دی کہ جمعرات کو اس طریقے سے پڑھنا ہے۔ اس میں نماز پڑھنی ہوتی ہے، اس کے اندر قرآن پاک کی کچھ سورتیں ہیں، اس کے بعد بڑی لمبی دعا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے دو جمعراتیں پڑھی تھیں، اس کے بعد مجھے اللہ نے ایسا حافظہ عطا فرما دیا کہ پھر میں کوئی بات زندگی میں بھولا ہی نہیں۔ یعنی جو بات بھی میں نے ایک دفعہ پڑھ لی یا ایک دفعہ میں نے دیکھ لیا اور سن لیا تو وہ مجھے ہمیشہ زندگی میں یادرہی۔ (یہ دعا احقر امداد اللہ انور نے اپنی کتاب فضائل حفظ القرآن میں تفصیل سے درج کر دی ہے۔)

[سنن الترمذی، حدیث: ۳۵۷۰، باب: فِي دُعَاءِ الحِفظِ]

تدوین حدیث کی تاخیر پر اعتراض و جواب:

یہی وہ وجوہات ہیں جو آج مستشرقین اور اعدائے اسلام کو سمجھ نہیں آتیں۔ آج کل لوگ اپنے دماغ پر غور کرتے ہیں کہ جیسے ہمیں ایک بات دو مہینے، چار مہینے، دس دن، دو دن یا سال کے بعد بھول جاتی ہے۔ اس وجہ سے بعض دشمنانِ اسلام نے لوگوں کے دماغوں میں یہ بات اٹھانی شروع کر دی کہ بھائی! حضور ﷺ نے حدیث مبارک میں جو فرمایا تھا، وہ اڑھائی سو سال کے بعد تدوین حدیث کا کام شروع ہوا ہے، یعنی اڑھائی سو سال گزرنے کے بعد کتابوں میں احادیث جمع کی گئیں۔ تو یہ کہتے ہیں کہ دیکھو! اڑھائی سو سال تک ایک بات کیسے یادرہے گی؟ ایک بات کیسے محفوظ رہے گی؟ لہٰذا...... نعوذ باللہ...... احادیث کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی عقل پر اس بات کو پرکھتے ہیں، کیونکہ ان کی زندگی شرابوں میں گزری ہے، معاصی اور گناہوں میں گزرتی ہے، ان کی زندگی

نافرمانیوں میں گزرتی ہے اور ان کی زندگی لہو ولعب میں گزرتی ہے، اس لیے وہ ان پاک نفوس کی باتوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ جنہوں نے زندگی میں کبھی گناہ نہ کیا ہو، کبھی نافرمانی کا کوئی عمل نہ کیا ہو اور کبھی حرام کا لقمہ اپنے جسم میں داخل ہی نہ کیا ہو تو ان کا مقابلہ کون کرسکتا ہے؟

اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ چار رکعت نفل پڑھنا یا تہجد کی آٹھ رکعت نفل پڑھنا مشکل نظر آتا ہے، لیکن کتنے لوگ ہیں جن کے بارے میں کتابوں میں یہ بات موجود ہے کہ ساری ساری رات ان کی مصلے پر گزر گئی، چالیس چالیس سال تک ان کو رات کا سونا نصیب نہیں ہوا۔ ایسے کتنے لوگ ہیں!! امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۶ سال کی عمر میں لاکھوں احادیث حفظ تھیں، یہ تو بہت بعد کے آدمی ہیں۔ اور اسی طرح سے اور بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں۔ اصل وجہ یہ تھی کہ اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے جو صحابہ تیار فرمائے تھے انہوں نے دین کو پورے عالم میں پہنچانا تھا، اس لیے اللہ نے ان کو میرے پاک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے چن لیا تھا۔ کسی کو اللہ نے حدیث کے علم کے لیے چن لیا، کسی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے علم کے لیے چن لیا، کسی کو فقہ اور قضا کے مسئلوں کے لیے چن لیا اور کسی کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کے معاملات کے لیے چن لیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے لوگ تھے، اللہ تعالیٰ کی ان پر رضا تھی۔

اور آج بھی یہ بات مشاہدے میں ہے، میں مثال کے طور پر ایک بات عرض کروں، تاکہ بات سمجھ آسکے، مثلاً: ایک آدمی نے پیدا ہونے کے بعد ساری زندگی زنا بھی نہیں کیا، ......نعوذ باللہ......لواطت بھی نہیں کی، اور گناہ بھی نہیں کیا، اپنی جوانی کو غلط استعمال بھی نہیں کیا اور کسی قسم کی ناجائز حرکت نہیں کی تو بوڑھے ہونے تک اس کی قوت بحال ہوتی ہے۔ آخر ایک مرد کے لیے اللہ نے چار بیویاں حلال کی ہیں تو کیا اللہ بنانے والا نہیں جانتا کہ بندہ چار بیویوں کا حق ادا کرسکتا ہے یا نہیں کرسکتا؟ لیکن اگر ایک آدمی دس سال کی عمر سے ہی گناہ شروع کردے تو بیس سال کو ختم ہو جائے گا۔ تو وہ اپنی زندگی کو خود تباہ کر چکا ہے، ورنہ اس کی مشینری کا تو کوئی نقصان نہیں ہے جو اللہ نے بنائی ہے۔ تین آدمی اکٹھے گاڑیاں لیتے ہیں: ایک آدمی سال گاڑی چلاتا ہے اور گاڑی بالکل ٹھیک ہے۔ ایک آدمی چھ مہینے میں انجن وغیرہ توڑ پھوڑ کر ہلا دیتا ہے تو اب اس میں گاڑی کا تو کوئی قصور نہیں ہے، اس چلانے والے کا قصور ہے۔ اسی لیے جب ہم نے اپنے دماغوں کو شیطان کا گھر بنا لیا تو اس میں قرآن وحدیث سما ہی نہیں سکتا، قرآن و حدیث داخل ہی نہیں ہوسکتا، قرآن وحدیث ہمیں یاد ہی نہیں رہ سکتا اور ہمیں سمجھ ہی نہیں آسکتا اور پھر ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ پر اعتراض کریں یا حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ پر یا اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یا ائمہ مجتہدین پر یا ائمہ محدثین

پر۔ اللہ ہمیں ہدایت عطا فرمائیں۔ ایسے ہی مثلاً: حج پر دیکھیں کہ کتنے لوگ آئے ہوئے ہیں کہ جن کو چوبیس گھنٹے میں ایک طواف بھی نصیب نہیں ہوتا اور ایسے بھی ...... ماشاء اللہ...... آئے ہوئے ہیں جن کو ایک دن کے اندر بیس بیس طواف پچاس پچاس طواف نصیب ہوتا ہے۔ تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتیں ہوتی ہیں۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اور دیگر مفسرین کرام اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کو پہلے نقل فرماتے ہیں۔ پھر ان کی عادت مبارکہ ہے کہ قولِ سدی نقل فرمائیں گے، قولِ مجاہد نقل فرمائیں گے، قولِ قتادہ نقل فرمائیں گے اور قولِ ضحاک نقل فرمائیں گے۔ یہ سب بہت بڑے بڑے مفسر گزرے ہیں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

شہداء کا معنی مددگار:

﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ﴾ [البقرۃ:۲۳]

تو شہداء شہید کی جمع ہے اور یہ لفظ گواہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ آیت میں شہداء سے کیا مراد ہے؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا معنی ''أعْوَانُكُمْ'' ہے کہ تم اپنے مددگاروں کو بلاؤ، کیونکہ آدمی کے لیے جو گواہی دینے آتا ہے وہ اس کی مدد کر رہا ہے۔ مددگار نہ ہو تو گواہی دینے کے لیے کیسے آئے گا؟ اور ان کے ساتھ مل کر قرآن کا مقابلہ کرو۔ اور حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''شُهَدَاءَكُمْ'' کا معنی ہے کہ جو تمہارے شرکاء ہوں، یعنی قرآن کے اس انکار اور مقابلہ میں جو شریک ہوں، ان کو بلا کر سب مل کر اللہ کے قرآن کے مقابلہ پر زور لگاؤ۔

ایک قول انہوں نے یہ بھی ذکر فرمایا کہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ:۲۳]

اللہ کے سوا جو تمہارے أعوان ہیں اور جو تمہارے شرکاء ہیں، ان سب کی مدد پکڑو اور اللہ کے قرآن کا مقابلہ کرو۔ یعنی جن کو تم نے خدا بنایا ہوا ہے، جن کو تم نے اپنا معبود، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہو اور جن کی تم نذر و نیاز چڑھاتے ہو، منتیں دیتے ہو، لات، عزیٰ، منات اور جو تین سو ساٹھ بت تم نے خدا کے گھر میں رکھے ہوئے ہیں، ان کو جو تم نے خدا بنایا ہوا ہے ان کی مدد لو اور ان سے بھی کہو کہ تمہاری مدد کریں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۹، الآیۃ: وَإِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا]

اب ایک اصولی بات یاد رکھیں کہ ایک لکڑی کا بت ہے یا پتھر کا بت ہے تو کیا وہ مدد کر سکتا ہے؟ اور بعض جن کے

پاس پیسے زیادہ ہوئے تو سونے کے بت بن گئے، چاندی کے بن گئے، پیتل کے بن گئے اور اسی طرح اور کسی دھات کے بن گئے، اور زیادہ پیسے آگئے زمرد اور یاقوت کے بت بنا دیے، ان کی آنکھوں میں ہیرے وغیرہ لگا دیے، بہر حال جو مرضی آئے کریں۔ بت پتھر کا ہو، لکڑی کا ہو، یا سونے چاندی کا ہو، یا کسی چیز کا ہو، تمہیں اللہ کے قرآن کے مقابلہ پر کوئی مدد دے سکتا ہے تو پھر یہ معنی تھا کہ تم اپنے ان خداؤں سے کہو کہ تمہاری مدد کریں تو وہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ بت ہے، ان کے اندر کوئی حس نہیں ہے، دیکھ نہیں سکتے، سن نہیں سکتے، بول نہیں سکتے، اگر ان کو دھوپ میں کھڑا کر دو تو سائے میں نہیں آسکتے اور سائے میں کھڑا کر دو تو دھوپ میں نہیں آسکتے اور کوئی مکھی اڑتی ہوئی ان کے خدا پر بیٹھ جائے تو وہ مکھی بھی نہیں اڑا سکتے ہیں۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ نہیں اڑا سکتے تو پھر کیا معنی ہے کہ تم ان سے مدد مانگو؟ اور اگر یہ سارے مجنون تھے اور پاگل تھے تو پھر اللہ نے ان کے پاس نبی کیوں بھیجا.....؟

گمراہی کا اصل سبب:

اس لیے مسئلہ سمجھیں! آج تک دنیا میں جتنی بت پرست قومیں پیدا ہوئی ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر اس دور کے ہندو تک جو بھی بتوں کی پوجا کرتا ہے یا سورج کی پوجا کرتا ہے یا آگ کی پوجا کرتا ہے یا سانپ کی پوجا کرتا ہے یا جانوروں کی پوجا کرتا ہے اس کو پتہ ہے کہ یہ خود کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ بات یاد رکھیں! وہ پاگل نہیں ہوتے۔ اب ایک آدمی اپنے ہاتھ سے ایک مورتی بناتا ہے، اپنے ہاتھ سے اسے گھڑتا ہے اور اس کو آکر مندر میں رکھ دیتا ہے تو پھر سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہتا ہے، وہ پاگل نہیں ہے کہ اس کو خود ہی بنایا ہے۔ اب بھی محرم الحرام کے مہینے میں یہ لوگ تعزیہ نکالتے ہیں، ان کو پتہ ہے کہ فلاں کاریگر نے یہ تعزیہ بنایا ہے اور اس پر ہم نے اتنے تار لگائے ہیں۔ جب ہاتھوں سے بنایا ہے تو پھر اس کے سامنے نذر و نیاز چڑھانا، اس پر مٹھائیاں ڈالنا، پیسے ڈالنا، پھر ان کو کندھوں پر اٹھانا، جلوسوں کی شکل میں لے جانا، سڑکوں پر رکھنا، ماتم کرنا، اس کے ارد گرد کھڑے ہو کر رونا، پھر جناب اس کو قبرستان پہنچانا اور اس کو دفن کرنا۔ وہ پاگل تو نہیں ہو گئے؟ کیا لاکھوں آدمی جلوس پاگل ہو گئے ہیں کہ اپنے ہاتھ سے ہم نے بنایا ہے، یہ کیا نفع و نقصان دے سکتا ہے؟ اصل بات یاد رکھو کہ ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا روضہ مبارک ہے۔ یاد رکھیں اور اس مسئلے کو سمجھیں کہ ان کے عقیدے میں یہ ہوتا ہے کہ یہ ہم نے بنایا ہے، بالکل سچی بات ہے، لیکن کہتے ہیں کہ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا روضہ شریف ہے اور یہ جو ہم گھوڑا لے

آئے ہیں دلدل شریف ہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسے گھوڑے پر سوار تھے اس قسم کا ایک منظر بنایا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا گھوڑا جا رہا ہے، پانی لا رہا ہے، سبیل لا رہے ہیں، خون بہہ رہا ہے اور پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہو رہے ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا روضہ بن گیا ہے۔ جب ہم اس روضے کی، اس گھوڑے کی اور زری کی پوجا کریں گے، اس پر نذریں چڑھائیں گے، اس کے ارد گرد کھڑے ہو کر روئیں گے تو دراصل حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس عمل کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کے عقیدے میں یہ نہیں ہوتا کہ یہ تعزیہ ہمیں کوئی نفع دے گا یا یہ گھوڑا ہمیں کچھ دے رہا ہے۔ وہ تو سمجھتے ہیں کہ یہ گھوڑا سارا سال تانگے میں رہا اور آج ادھر لے آئے، اب وہ بچے کیسے دینے لگ گیا؟ اصل میں عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ وہ نقشہ ہے، یہ وہ کربلا کا منظر تازہ ہوگا۔ تو ہم روئیں گے، فریاد کریں گے، ہمیں وہ دکھ یاد آئے گا، وہ مصائب یاد آئیں گے اور وہ آلام پڑھیں گے۔ اور پھر ایسے آدمی ان کو مہیا کیے جاتے ہیں کہ جن کو سوز خوان کہا جاتا ہے، یعنی دردناک آواز کے ساتھ وہ مرثیے پڑھتے ہیں، تاکہ ہمیں وہ منظر یاد آئے اور ہم فریاد کریں۔ اور جب ہم ٹمیاں ڈالیں گے، رو رہے ہوں گے، مار رہے ہوں گے اور زخمی ہو رہے ہوں گے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ دیکھ رہے ہیں۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب ہماری اس قربانی کو دیکھیں گے کہ یہ تو میرے بڑے پکے عاشق ہیں، یہ تو بڑے محب ہیں، چودہ سو سال گزر گئے اور آج تک انہوں نے مجھے یاد رکھا ہوا ہے اور میرے لیے اپنے بدن زخمی کروا رہے ہیں اور خون نکل رہا ہے اور راکھ ڈال رہے ہیں اور لوہے کے کڑے پہنے ہوئے، اپنے آپ کو قیدی بنایا ہوا ہے، جیسے آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم قید ہوئی تھی اور ان کو گرفتار کر کے لے جا رہے تھے، اسی طرح انہوں نے کڑے پہنے ہوئے ہیں، زنجیر گلے میں ڈالے ہوئے ہیں تو جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ دیکھیں گے تو وہ راضی ہو جائیں گے۔ وہ جب راضی ہو جائیں گے تو وہ نانے کو سفارش کریں گے، پھر نانا راضی ہو جائے گا۔ پھر جب نانا سائیں راضی ہو جائے گا تو وہ اللہ سے کہہ دیں گے تو ہمارا بیڑا پار ہو گیا۔ یاد رکھیں!! ان کا اصل عقیدہ یہ ہوتا ہے۔

اسی طرح بت پرستوں کا عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ بت شکل ہے اس انسان کی جو اللہ کا بڑا پیارا تھا اور یہ بت شکل ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی اور یہ بت حضرت میکائیل علیہ السلام کی شکل ہے اور یہ بت ملک الموت کی شکل ہے اور یہ بت اس بارش والے فرشتے کی شکل ہے اور یہ بت برج کی شکل ہے۔ جب ہم اس بت کے سامنے منتیں کریں گے، بجن کریں گے اور ان کے آگے فریاد پیش کریں گے تو یہ تو کچھ نہیں ہے، اصل میں تو یہ جس کی شکل ہے وہ خوش ہو رہا ہے۔ جب جبرئیل علیہ السلام خوش ہو جائے گا تو اللہ میاں سے ہماری سفارش کر دے گا تو ہمارا بیڑا پار ہو جائے گا۔ اصل

بات یہ ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمارا مسلمان اسی گردش میں ہے اور ہمارا نظریہ اسی طرح چلتا آرہا ہے۔

اب مثال کے طور پر دیکھیں کہ جب ایک آدمی نے بت کے سامنے کھڑے ہو کر عبادت کی، لات کے سامنے کھڑے ہو کر عبادت کی۔ اب ''لات'' ایک بت کا نام تھا۔ اصل میں وہ ایک انسان تھا "کَانَ رَجُلًا صَالِحًا يَلُتُّ السَّوِيقَ لِلْحُجَّاجِ" ایک بڑا اچھا صالح بندہ تھا اور حاجیوں کو وہ ستو گھول گھول کر پلایا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں غربت تھی اور تو کوئی چیز ملتی نہیں تھی۔ جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اس کی قبر پر عبادت شروع کر دی، اس کے نام کا بت بنا کر کھڑا کر دیا۔ اسی طرح یغوث ہے، یعوق ہے اور نسر ہے، یہ سارے نیک آدمی تھے۔ اب اللہ کے کعبہ میں آپ بیٹھے ہیں...... اللہ پاک ہمارا بیٹھنا، پڑھنا اور سننا قبول فرمالے...... اسی سے آپ اندازہ لگائیں کہ جس آدمی نے ایک بت بنایا ہے، مثال کے طور پر: حضرت جبرئیل علیہ السلام کی شکل اور وہ اس کی عبادت کر رہا ہے تو اس کا عقیدہ یہ ہے کہ میری اس عبادت کا علم جبرئیل علیہ السلام کو یا اس کے بزرگ کو ہے۔ اب اللہ کے سوا اس کو علم الغیب ہو گیا تو جب ہم نے اس کو عالم الغیب مانا تو اللہ کے علم غیب والی صفت میں ان کو شریک کر لیا۔ اسی طرح اگر ہندو شرک کر رہا ہے اور جو مسلمان غیر اللہ کی نذر نیاز چڑھا رہا ہے اس کا بھی تو عقیدہ ہے کہ میری نمازِ حسین...... جو دس محرم کو ہوگی...... حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو پتہ لگے گا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ عالم الغیب ہوں گے تو پتہ چلے گا۔ اگر عالم الغیب نہ ہوں تو ان کو کیا پتہ کہ ہم اپنے ملک میں رو رہے ہیں؟

واقعہ:

جیسا کہ بڑا مشہور واقعہ ہے کہ انگریزوں کا ایک وائسرائے پنجاب میں آیا، وہ پنجاب کے علاقہ میں گورنر بن کر آیا۔ اتفاق کی بات تھی کہ جس دن وہ ائیرپورٹ پر اترا دس محرم کا دن تھا۔ اب انگریزوں کو تو محرم کا کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ دس محرم کیا ہے؟ وہ دس محرم کا دن تھا اور لوگ سیاہ کپڑے پہنے ہوئے اور سیاہ جھنڈے اٹھائے ہوئے رو رہے ہیں اور مار رہے ہیں اور ٹمیاں ڈال رہے ہیں اور ہر طرف رونے کی آواز ہے۔ وہ جب اترا اس نے فوراً اپنے اے ڈی سی سے کہا کہ کیا وجہ ہے؟ کیا یہ لوگ میرے آنے کی وجہ سے ناراض ہیں؟ میں یہاں نہ آؤں؟...... اس کو کیا پتہ کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کے ہاں کیا رواج ہے؟...... تو کسی نے کہا کہ جناب! آپ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، آپ کا کوئی جھگڑا نہیں ہے، یہ محرم الحرام کی دس تاریخ ہے اور ان کے بہت بڑے ہیرو گزرے ہیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ، ان

کی شہادت کے بارے میں یہ ماتم کر رہے ہیں۔ تو اس نے کہا: حضرت حسین (ﷺ) جوان کے بڑے ہیرو تھے وہ کب شہید ہوئے ہیں؟ اس نے کہا کہ ان کو تقریباً بارہ سو سال گزر گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کہاں شہید ہوئے ہیں؟ تو کہا کہ کربلا میں شہید ہوئے ہیں۔ اس نے کہا کہ پنجاب والوں کو ان کی آج اطلاع پہنچی ہے؟ اس نے کہا کہ ان کو اطلاع آج نہیں پہنچی، بلکہ یہ ہر سال ایسا کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اس قوم کا خدا حافظ ہے، یہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ بارہ سو سال کے بعد پاگل ہیں یا مجنون ہو گئے ابھی تک اپنے ہیرو کو رو رہے ہیں جو قوم بارہ سو سال تک سیاہ کپڑے پہن کر اپنے ہیرو کا فخر کرنے کی بجائے ماتم کر رہی ہے، وہ قوم کبھی بھی اونچی نہیں ہو سکتی۔ اس نے کہا: ان کو میں ٹھیک کر لوں گا۔ اس قوم کو سمجھنے کے لیے پھر میں ہی کافی ہوں۔ یہ کوئی قوم ہے؟ اس ہیرو نے تو اچھا کام کیا، اس پر تو فخر کرو، خوشی مناؤ کہ وہ تو اللہ کے راستہ میں قربانی دے کر شہید ہو گئے۔

اور اللہ نے ہمیشہ کے لیے ان کے نام کو اونچا کر دیا، قیامت تک ان کا نام زندہ رہے گا، چہ جائیکہ تم آج ماتم کرو اور مٹیاں ڈالو۔ تمہارے اس ماتم ڈالنے سے نہ حضرت حسین ﷺ کو خلافت مل جائے گی، نہ حضرت حسین ﷺ دوبارہ تشریف لے آئیں گے اور نہ تمہارے اس رونے سے یزید کو پریشانی ہو رہی ہے۔ تو ایسے ماتم کرنے کا کیا فائدہ جس کا کوئی فائدہ نہ ہو؟ جس سے تمہارے ہیرو کو نفع اور نہ تمہارے مخالف کو کوئی نقصان ہو۔

تو اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! اصل وجہ یہ ہے کہ وہ شرک والا عقیدہ کہ میں ''یا علی!'' کا نعرہ ماروں گا، حضرت علی ﷺ نعرہ سنیں گے تو سننے کے بعد میری مدد کریں گے۔ یہ وہ بنیادی مسئلہ ہے۔ سنیں گے......؟ وہ تو السمیع العلیم اللہ کی صفت ہے۔ اور میری مدد کریں گے......؟ اور مدد کرنے والا کون ہے؟ اور اگر وہ مدد کرنے پر قادر ہیں تو ﴿إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾﴾ [البقرة: ٢٠] کون ہے؟ تو یہ صرف نعرہ نہ رہا، بلکہ ہم نے اللہ کی توحید کا مسئلہ بھی ختم کر دیا اور ہم مشرکین کی اس صف میں جا کر کھڑے ہو گئے جو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

اس لیے اس عقیدہ کو ہمیشہ سمجھا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان پر رحمت فرمائے۔ جب ہم ''یا پیر!'' اور ''یا دستگیر!'' کا نعرہ ماریں گے تو اس کا کیا معنی ہے؟ اس لیے علماء نے کہا کہ ''یا رسول اللہ!'' کا نعرہ نہ لگاؤ، کیونکہ حرف ندا پکار کے لیے ہوتا ہے اور پکار وہ سنتا ہے جو اَلْحَيُّ ہے، اَلدَّائِمُ ہے، اَلْبَاقِيْ ہے، عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ہے، اس کے سوا کوئی پکار نہیں سن سکتا، اور کوئی ہماری پکار کو نہیں سمجھ سکتا۔ اللہ ہر مسلمان کو غلط عقیدوں سے محفوظ فرمائیں اور صحیح عقیدہ نصیب فرمائیں۔ کسی کی شان بڑھانے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اللہ کے ولی کو نبی کی کرسی پر بٹھا دیا جائے اور نبی کو خدا کے

عرش پر بٹھا دیا جائے۔ یہ شان نہیں ہوتی، بلکہ یہ تو کفر ہو جاتا ہے۔ شان تو یہ ہے کہ اللہ کی الوہیت کا قائل ہو، محمد مدنی ﷺ کی نبوت کا اور رسالت کا قائل ہو، اولیاء اللہ کی ولایت اور کرامت کا قائل ہو اور یہ عقیدہ رکھے کہ سب سننے والا ثور (پکار) کو سننے والا، صفت منوتی (منت) کے لائق، قسم اٹھانے کے قابل، ہماری حاجات کو بر لانے والا اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا صرف اللہ ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ تم اپنے عقیدے میں سمجھتے ہو کہ یہ تمہارے خدا تمہارے مددگار ہیں تو تم ان کی مدد لو۔

واقعہ:

اور آپ حیران ہوں گے کہ جس وقت میرے مدنی پاک ﷺ آئے تو یہ بت اس وقت بھی موجود تھے۔ ایک کا نام ایساف تھا اور ایک کا نام نائلہ تھا۔ یہ دو کافروں کے بت تھے۔ اب آپ اندازہ کریں کہ ایساف اور نائلہ ایک مرد اور ایک عورت تھی۔ ان لوگوں نے کیا کیا؟ ......نعوذ باللہ...... کعبۃ اللہ کے اندر داخل ہونے کا موقع ملا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے پرانے طلبگار تھے، ان کو اور کوئی جگہ میسر نہ آئی تو ان بدبختوں نے اللہ کے کعبہ میں زنا کیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ اللہ کا غضب آیا اور وہ دونوں اس وقت پتھر کے بت بن گئے۔ اللہ کو جلال آیا کہ اللہ کے کعبہ کی بے حرمتی ہوئی ہے تو اللہ نے انہیں پتھر کا بنا دیا۔ اور کافروں نے ان دونوں پتھروں کو اٹھایا، کعبہ سے نکالا اور کعبہ کے دروازے کے قریب رکھ دیا کہ تمام لوگ جو اللہ کے کعبہ کا طواف کے لیے آئیں وہ ان کو دیکھیں اور عبرت پکڑیں، تا کہ اللہ کے کعبہ میں آئندہ کوئی آدمی گناہ نہ کرے۔ وہ ان کو دیکھ کر عبرت پکڑتے رہے۔ پھر لوگوں کو تکلیف ہونے لگی کہ آگے دو بت رکھے ہوئے ہیں، پتھر پڑے ہوئے ہیں تو طواف میں رکاوٹ بنتی تھی۔ انہوں نے وہاں سے ہٹایا اور جہاں زمزم کا کنواں ہے اس جگہ پر ان کو رکھ دیا۔ پھر کچھ عرصہ گزر گیا تو لوگوں نے کہا: چھوڑو! یہاں کیا رکھنا؟ مقصد تو عبرت دلانا ہے کہ ان کو دیکھیں اور عبرت پکڑیں۔ ایک کو انہوں نے صفا پر رکھ دیا اور ایک کو انہوں نے مروہ پر رکھ دیا کہ بھائی! جو آدمی عمرہ کرنے کے لیے آئے گا، طواف کرے گا تو صفا مروہ بھی تو دوڑے گا۔ جب صفا مروہ دوڑے گا تو ان پتھروں کو دیکھ لے گا اور لوگوں سے پوچھے گا کہ یہ کیا پتھر ہیں؟ تو لوگ بتائیں گے کہ یہ وہ بدبخت ہیں جنہوں نے اللہ کے کعبہ میں زنا کیا تھا، اللہ نے ان کو پتھر بنا دیا۔

اب جناب! ایک صدی جب گزر گئی، وہ لوگ جب فوت ہوئے، ساٹھ ستر سال کا عرصہ بیت گیا۔ ایک نئی نسل پیدا ہوئی، شیطان نے دماغ میں ڈال دیا، اس نے کہا کہ یہ تو تمہارے خدا ہیں۔ ایک صفا پر ہے اور ایک مروہ پر

ہے۔اب صفا مروہ پر دوڑنا شروع کر دو تو پہلے ان کو چوما چاٹا کرو، پھر دوڑا کرو۔اس کے بعد ان کی عبادت شروع ہوگئی اور وہ خدا بن گئے۔ حالانکہ صفا مروہ دوڑنا ثواب کا کام ہے، سنتِ امِ اسماعیل ہے، صفا و مروہ دوڑنا سنتِ انبیاء والمرسلین ہے، سنتِ محمد مصطفیٰ ﷺ ہے اور حتیٰ کہ تمام ائمہ کے نزدیک واجب ہے۔اگر کوئی چھوڑ دے تو اس کو دم دینا پڑتا ہے۔

پھر اللہ نے کیوں فرمایا:

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ﴾[البقرة:۱۵۸]

یعنی دوڑنے والے پر گناہ نہیں ہوگا، وہ تو نیکی کا کام کر رہا ہے۔گناہ نہ ہونے کا کیا معنی ہے؟ چاہیے تو یہ تھا کہ یوں کہتے کہ جو صفا مروہ دوڑے گا اللہ اس کو ثواب دیں گے، یہ اجر دیں گے اور یہ مرتبہ دیں گے، لیکن قرآن کہتا ہے:

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ﴾[البقرة:۱۵۸]

وجہ یہ تھی کہ جب اسلام آیا تو حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ صفا مروہ دوڑیں۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم......الحمد للہ......توحید پر آ گئے، شرک کو مٹا دیا اور بتوں کو ختم کر دیا۔یہ صفا مروہ پر تو اساف اور نائلہ بت تھے، یہاں کافر دوڑا کرتے تھے۔کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم دوڑیں تو ہم کسی بھی گناہ میں نہ پڑ جائیں۔اللہ نے فرمایا کہ میرا مدنی! ان ظالموں نے بت رکھے تھے، ان کا ان بتوں سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو میرے شعائر میں سے ہے، ان کے دوڑنے پر کوئی گناہ نہیں ہے۔تمہارے صحابہ تو میرے حکم پر دوڑ رہے ہیں۔اس لیے اس ڈر کو ختم کیا گیا ہے، کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم ڈر گئے کہ یہاں تو کافر بھی دوڑتے تھے، اگر ہم دوڑیں گے تو کہیں گناہ کا کام نہ ہو جائے، کہیں غلطی نہ ہو جائے۔تو اللہ نے ان کی پریشانیوں کو ختم کیا کہ:

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ﴾[البقرة:۱۵۸]

یاد رکھیں! اس طرح بت پرستی پھیلتی ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمائے۔کوئی ایک آدمی غلط راستہ نکال دیتا ہے اور پھر وہ پھیلتے پھیلتے جب صدیاں گزر جاتی ہیں تو وہاں ایک بات ایسی رواج پکڑ لیتی ہے کہ پھر اس کا ختم کرنا کسی کے بس میں نہیں رہتا۔ایسے آپ کے ملک میں بھی اور ہندوستان میں بھی اور دیگر ممالک میں بھی ہے۔آپ حیران ہوں گے کہ لاکھوں مزاریں بنی ہوئی ہیں، جہاں کسی کی قبر نہیں ہے۔یعنی جہاں کوئی اللہ والا دفن ہی نہیں ہے، بس کسی آدمی کے دماغ میں سمایا، اس نے آ کر ایک جگہ ڈیرہ لگایا، ایک قبر بنالی اور اس پر ایک غلاف ڈال دیا اور خود

وہاں مجاور بن کر بیٹھ گیا، ایک پانی کا مٹکا رکھ دیا۔ آخر وہاں سے کوئی نہ کوئی آدمی کبھی تو گزرے گا۔ ایک گزرا، دو گزرے۔ انہوں نے پوچھا: کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ یہاں اللہ کا ولی دفن ہے۔ اللہ کے بندے! یہاں دھوپ کے اندر تم اکیلے بیٹھے ہو؟ تو اس نے کہا: مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ یہاں ایک بزرگ دفن ہیں، بس اس کا خیال کرنا ہے۔ اب جناب! ایک سال گزرا، دو سال گزرے، چار سال گزرے۔ اب ضعیف الاعتقاد ہزاروں قسم کے لوگ ہوتے ہیں، کوئی گزرا، اس نے کہا کہ میرا بیٹا ہو جائے۔ اگر پیدا ہو گیا تو اس نے کہا کہ مجھے تو اس پیر نے بیٹا دیا۔ اب کسی نے دیکھا کہ یہ لوگ کیوں جا رہے ہیں؟ مرد ہیں، عورتیں ہیں تو انہوں نے کہا کہ فلاں آدمی کا بیٹا نہیں ہوتا تھا، اس نے اس مزار پر منت مانگی اس کو بیٹا ملا ہے، اس کی منت ادا کر رہے ہیں۔ تو اس نے کہا: اچھا میرے بھی بیٹا پیدا نہیں ہو رہا، میں بھی منت مانگتا ہوں۔ تو اس طرح وہ شرک کا اڈا بن جاتا ہے اور شرک کا گڑھ بن جاتا ہے اور بات بڑھتی رہتی ہے۔

کہتے ہیں کہ فلاں آدمی نے تعویذ دیا، تم خود تعویذ دینا کر دو، پھر دیکھو کہ دو سال بعد تمہارا اڈا بنتا ہے کہ نہیں بنتا؟ میں ایک مثال دیتا ہوں، مثلاً: آپ حج پڑھ کر جا رہے ہیں۔ آپ جا کر بس اعلان کر دیں کہ میں مکہ مدینہ گیا، مجھے وہاں سے حکم ہوا ہے کہ تعویذ لکھا کرو اور اخبار اکٹھے کر کے رکھ دو اور پھاڑ کر دیتے جاؤ۔ جب سو آدمی کو تم تعویذ دو گے تو کسی کو تو اللہ نے بیٹا دینا ہی دینا ہے۔ جس کا بیٹا پیدا ہو جائے وہ تیرا مرید اور جس کا نہ ہو وہ کہیں گے کہ یہ پیر بے ایمان ہے۔

عجیب واقعہ!

میرا اپنا دوست تھا، وہ فوت ہو گیا ہے، بہت بڑا پیر تھا۔ میں اس غریب کا نام نہیں لیتا، وہ فوت ہو گیا، فوت ہونے کے بعد مغفرت کی دعا کریں، اللہ ان کی قبر آسان کرے اور جب ہماری موت آ جائے تو اللہ ہماری قبر آسان کرے۔ کوئی فوت ہو جائے تو اس کی شان میں کبھی برا نہ کہو۔ تو وہ بہت بڑے پیر تھے اور میرے دوست تھے اور بہت بڑی گدی کے وہ جانشین تھے۔ اب اس دفعہ ان کا لڑکا بھی مجھے ملنے کے لیے آیا۔ بہر حال خاندانی روایات انہوں نے قائم رکھی ہوئی ہیں۔ میرا جلسہ تھا تو کسی نے کہا کہ فلاں مولوی صاحب کا بیٹا آیا ہوا ہے تو میں نے کہا کہ میرا جلسہ سننے کے لیے آیا ہے۔ میری تقریر سننے سے اس کو کیا فائدہ ہوگا؟ تو انہوں نے کہا کہ آپ کے پاس تو میرے باپ آئے تھے، اس لیے میں آیا ہوں۔ اور کسی نے مجھے یہ بھی کہا ہے کہ ان کے لڑکوں کے عقیدے بڑے

ٹھیک ہیں۔ بہر حال واللہ اعلم مجھے پہلی دفعہ ملے، تھوڑی دیر بات ہوئی۔ تقریر کر کے دوسری جگہ چلے گئے، اس سے زیادہ دیر نہ مل سکے۔

بہر حال میں ان کو ملنے کے لیے گیا تو سکول کا پچاس ساٹھ لڑکا بیٹھا تعویذ لکھ رہا ہے۔ میں نے پوچھا: پیر صاحب! یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے؟ لوگوں کو تعویذ دیتے ہو؟ اس نے کہا: مکی صاحب! روزانہ ہزار آدمی کو خود تعویذ لکھ کر دیں تو ہماری انگلیاں ٹوٹ جائیں گی۔ اتنے تعویذ لکھنے کا میرے پاس وقت نہیں ہے، میں مڈل سکول سے لڑکے بلا لیتا ہوں، دس روپے فی لڑکا دیتا ہوں۔ چھٹی کے دن یہ آجاتے ہیں، سارا دن یہ تعویذ لکھتے رہتے ہیں۔ تو ہزاروں لوگوں کے تعویذ بن جاتے ہیں۔ ان کو ہم محفوظ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ جو آدمی آیا وہ تعویذ امرت دھارا ہے، بیمار کا وہی تعویذ ہے، بچہ نہ ہو تو وہی تعویذ ہے، طلاق ہونی ہے تو وہی تعویذ ہے، اور لڑائی کرانی ہے تو وہی تعویذ ہے۔ میں نے کہا: خدا کے بندے! تم خدا کو کیا جواب دو گے؟ ایک تعویذ سارے کاموں کے لیے ہے۔ اس نے کہا: مکی صاحب! کام تو خدا کرتا ہے۔ یہ تو ہمارے رزق کا بہانہ ہے۔ اتنے لوگ ہم سے لے جاتے ہیں، کسی نہ کسی کا کام تو خدا نے کرنا ہوتا ہے۔ جن کا کام ہو جاتا ہے تو وہ اگلے سال نذر لے آتا ہے، کوئی بکری لے آتا ہے، کوئی گائے لے آتا ہے، کوئی گھوڑی لے آتا ہے، کوئی پیسے لے آتا ہے اور کوئی حلوہ بنا کر لے آتا ہے۔ کوئی آ کر کہتا ہے کہ میرا کام نہیں ہوا تو اس کو کہتے ہیں کہ تیرا دماغ خراب ہوگا تو اپنا عقیدہ ٹھیک کر۔ اس نے کہا: ہمارا کیا بگڑتا ہے؟ ہمارا تو کام چل رہا ہے۔

اس لے ہمیشہ یاد رکھیں کہ اس طرح یہ سارے کاروبار پھیلے ہیں، ورنہ کوئی نفع و نقصان دینے والا نہیں، مگر اللہ ہے۔ اولیاء اللہ پر خود موت آگئی، جبکہ اللہ کے ولی ایسے گزرے ہیں کہ ان کا اپنا ایک بھی بیٹا نہیں ہے۔ جب وہ اپنے لیے اولاد خدا سے نہیں لے سکے تو ہمیں کہاں سے لے دیں گے؟ اس لیے ہمیشہ اپنے عقیدوں کا خیال رکھا کریں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کے عقیدے کے درست کرے۔ اس لیے اولیاء اللہ کی قبروں پر جائیں تو ان کی قبروں پر جا کر دعا کریں کہ یا اللہ! یہ تیرا ولی تھا، تیرا عبد صالح تھا، اس کی قبر کو باغ جنت بنا۔ جب ہم اس کے لیے دعا کرتے ہیں تو مولا کی رحمت جوش میں آجاتی ہے کہ یہ ایک گناہگار بندہ ہو کر میرے بندے پر رحم کر رہا ہے تو میں ارحم الرحمین ہوں تو میں اس پر رحم کیوں نہ کروں؟ یہ نہیں ہوتا کہ اس قبر والے کی سفارش ہوگئی۔ قبر والے کی سفارش نہیں ہوتی، وہ کوئی نفع و نقصان نہیں پہنچاتا۔ اصل وجہ یہ ہوتی ہے ''مَنْ رَحِمَ رُحِمَ'' اللہ نے فرمایا: تم کسی پر رحم کرو، میں تم پر رحم کروں گا۔ فرمایا: تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔ جب ہم قبرستان سے گزرتے

ہیں تو کہتے ہیں:

''السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُورِ، يَغْفِرُ اللهُ لَنَا وَلَكُمْ، أَنْتُمْ سَلَفُنَا، وَنَحْنُ بِالْأَثَرِ''

[سنن الترمذی حدیث: ۱۰۵۳، باب: مَا يَقُولُ الرَّجُلُ إِذَا دَخَلَ الْمَقَابِرَ]

''اے قبر والو! تم پر اللہ کی سلامتی ہو۔ اللہ ہماری بھی مغفرت کرے اور تمہاری بھی مغفرت کرے۔ تم ہم سے پہلے چلے گئے، ہم تم سے پیچھے آنے والے ہیں۔''

اور پھر ہم کہتے ہیں: اے اللہ! ان قبرستان والوں پر رحم فرمادے، اے اللہ! ان کی مغفرت فرمادے، یا اللہ! ان کی قبروں کو باغ جنت بنادے، یا اللہ! اگر عذاب ہو رہا ہے تو رفع فرمادے اور اگر رحمتیں نازل ہو رہی ہیں تو اور زیادہ رحمتیں نازل فرمادے۔ تو اللہ کی رحمت جوش میں آتی ہے کہ یہ ضعیف گناہگار بندہ ان بندوں سے جو قبروں میں چلے گئے ان سے اس کو کوئی لالچ بھی نہیں، کوئی نفع بھی نہیں، کوئی نقصان بھی نہیں، کوئی رشتہ داری بھی نہیں، کوئی قرابت داری بھی نہیں، یہ ان کے لے مجھ سے دعائیں کر رہا ہے تو میں اس پر رحم کر دیتا ہوں۔ اپنے عقیدوں کو سمجھو! اللہ تبارک وتعالیٰ مسلمانوں پر رحم فرمائیں۔

قرآن جیسی کتاب بنانے کا چیلنج:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللهِ﴾ ''أَيِ اسْتَعِينُوا بِآلِهَتِكُمْ'' تم اپنے خداؤں سے بھی مدد پکڑو۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شہداء کا معنی گواہ ہے، جیسے گواہ فیصلہ کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ﴿وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللهِ﴾ [البقرة: ۲۳] کہ تم بھی مکہ اور عرب کے بڑے بڑے فصیح اور ادیب لوگ فیصلہ کے لیے بلا لو، ان کو لوگوں کے اشعار سناؤ اور اللہ کا کلام بھی سناؤ، ان کو کہو کہ وہ فیصلہ کریں کہ یہ بندے کا کلام ہے یا اللہ کا کلام ہے؟ اور صرف اسی جگہ چیلنج نہیں کیا، بلکہ قرآن کی متعدد آیات میں یہ چیلنج کیا گیا ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جو یہ چیلنج دیا گیا ہے یہ صرف مکی زندگی میں نہیں دیا گیا، بلکہ مدنی زندگی میں بھی چیلنج اتارا، کیونکہ اگر صرف مکہ میں کیا جاتا تو مکہ میں رہنے والے لوگ شاعر ہونے کے باوجود، کوئی پڑھے لکھے اور صاحبِ کتاب لوگ نہیں تھے اور ان کا لقب بھی امی تھا۔ اور جب حضور ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں اہل کتاب مدینہ منورہ میں پہلے سے موجود تھے۔ ان کے پاس بڑے بڑے احبار تھے، رہبان

تھے، پادری اور علماء تھے۔ تو اللہ پاک نے مدنی سورت میں بھی آپ ﷺ کو چیلنج کا حکم دیا کہ اگر تمہیں شک وشبہ ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے یہ خود بنایا ہے تو تم بھی تو پڑھے لکھے ہو، تم بھی تو اہلِ کتاب ہو، تمہارے پاس بھی تو بڑے بڑے عالم اور رہبان موجود ہیں، ان کو کہو کہ اس کے مقابلہ پر ایک سورت یا ایک آیت بنا کر لے آئیں، تو اب جا کر تحدی کامل ہوئی۔ اگر صرف مکی زندگی میں چیلنج کیا جاتا تو دشمن یہ کہہ سکتا تھا کہ آپ نے تو چیلنج وہاں کیا جہاں اہلِ کتاب، احبار اور رہبان بھی نہیں تھے۔ وہ تو جاہلیت کی زندگی گزارنے والے لوگ تھے، ان کے پاس کوئی کتاب کا علم نہیں تھا، لیکن جب اللہ نے مکہ میں بھی چیلنج فرمادیا اور مدینہ میں بھی چیلنج فرمادیا تو اب قرآن کا اعجاز مکمل ہوگیا۔ نہ مکہ والے کوئی مقابلہ کرسکے اور نہ مدینے والے کوئی مقابلہ کرسکے۔ اور اسی طرح قیامت تک کوئی اللہ کے قرآن کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ چودہ سو سال کے اندر دشمنوں نے اسلام کو مٹانے کے لیے کتنا ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔ اگر ان کی جرات اور طاقت ہوتی تو وہ اللہ کے قرآن کے مقابلہ پر کوئی کتاب نہ پیش کردیتے؟

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۹، الآیۃ: وَإِنْ كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا]

ایک مسلمان کا دنیا کے بڑے عیسائی پادری سے مناظرہ:

چند سالوں کی بات ہے کہ یورپ کے اندر عیسائی پادری کے ساتھ ہمارے دوست کا مناظرہ ہوا تو انہوں نے صرف ایک بات کی کہ باقی بحثیں آپ چھوڑ دیں! اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ بائبل اللہ کا کلام ہے اور انبیاء پر اتارا گیا ہے تو میں بائبل کا ایک صفحہ کھولتا ہوں اور اس پر آپ کو بتاتا ہوں کہ فلاں صفحہ پر آپ پڑھ کر لوگوں کو سنادیں۔ جب اللہ کی کتاب ہے اور تمہارے نبی کی کتاب ہے تو تم پڑھ کر سنانے میں کیا شرم ہوسکتی ہے؟ تم صرف ایک صفحہ اپنی قوم کو پڑھ کر سنا دو تو میں مان لوں گا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اب جناب اس نے بڑی کوشش کی، لیکن عیسائی پادری نے کہا کہ میں زہر تو پی لوں گا، لیکن کتاب نہیں پڑھوں گا۔ کیونکہ اس کو پتہ تھا کہ اتنا بے ہودہ کلام جب لوگ سنیں گے تو مجھے جوتے ماریں گے۔ یہ اللہ کا کلام ہے!! یہ اللہ کا کلام کیسے ہوسکتا ہے!؟ جو اتنا بے ہودہ کلام ہے۔ اس کے اندر اتنی غلط باتیں لکھی ہوئی ہیں کہ کوک شاستر پڑھتے ہوئے اتنی شرم نہ آئے جتنا اس کو پڑھتے ہوئے شرم آئے۔ اس دوست نے بڑا زور لگایا اور کہا کہ دیکھو! میرے نبی ﷺ پر اللہ نے کلام اتارا۔ تم جہاں سے کہو میں اس کو پڑھنے کے لیے تیار ہوں۔ تو آپ بھی کم از کم اپنی کتاب کو لوگوں کے سامنے پڑھو تو سہی۔ باقی بحث تو بعد میں کریں گے کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے؟ پہلے کم از کم قوم کے سامنے تو اپنا دعویٰ تو پڑھو، لیکن اس نے پڑھنے کی جرات نہیں کی۔

جمع وحفاظتِ قرآن:

ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں! ایک ہے الزام لگانا۔ الزام لگا دینا تو بڑا آسان ہوتا ہے، یعنی اب بھی اگر ایک پاگل کھڑا ہو جائے اور کہے کہ یہ رات تو نہیں ہے، رات میں تو اندھیرا ہوتا ہے اور یہاں تو روشنی ہو رہی ہے۔ اس کو عقل والے سمجھائیں کہ بے وقوف آدمی! رات تو ہو چکی ہے اور یہ روشنی تو بلب کی ہے۔ اور وہ کہے کہ جناب! رات میں اندھیرا ہوتا ہے۔ جب اندھیرا نہیں تو رات بھی نہیں۔ تو اس کا تو کوئی علاج نہیں۔ اس طرح دنیا کے اندر کوئی آدمی اگر الزام لگاتا رہے، جیسا کہ بعض جہلاء نے اپنی کتابوں میں الزام لگائے کہ...... نعوذ باللہ...... یہ قرآن مکمل نہیں ہے، بلکہ...... نعوذ باللہ...... ناقص ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی جب وہ سامنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وہ کتابیں جھوٹی ہیں اور قرآن سچا ہے۔ قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے، سامنے آنے کے بعد ان کو جرات نہیں ہوتی۔

اور جب انہوں نے قرآن مقدس کی تصدیق نہ کی تو جو لوگ قرآن کو جمع کرنے والے تھے، یعنی سیدنا ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ...... تو سب سے پہلے قرآن جمع کرنے کا کام سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے شروع ہوا۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ یہ مشورہ دینے والے کون تھے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا: یا امیر المومنین! اللہ کے نبی کے بڑے بڑے قاری شہید ہو رہے ہیں، صرف ایک جنگِ یمامہ میں ۷۰ قاری شہید ہو گئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ صحابہ رضی اللہ عنہم اسی طرح شہید ہوتے رہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آیت یا کوئی سورت کسی کے سینے میں رہ جائے اور وہ کتاب میں نہ آ سکے، لہٰذا آپ ایک کمیٹی بنا دیں، اللہ کے قرآن کو مابین الدفتین میں جمع کر دیں۔ حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے عمر! بات تو تمہاری ٹھیک ہے، لیکن اس کے اندر مجھے دو باتوں کا خطرہ ہے:

❁...... ایک بات تو یہ ہے کہ جب اللہ نے قرآن کی حفاظت کا کہا ہے تو مجھے یقین ہے کہ قرآن محفوظ رہے گا، چاہے ہم قرآن کو جمع کریں یا نہ کریں، قرآن دنیا سے مٹ نہیں سکتا، کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے اپنے ذمہ لے لی ہے، ہمارے ذمہ تو حفاظت نہیں ہے۔

❁...... اور دوسری بات یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوتا رہا، ۲۳ سال کی مدت میں اللہ کا قرآن اترا ہے، یعنی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو قرآن نازل ہونا شروع ہوا اور ۶۳ سال کی عمر میں میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو تقریباً ۲۳ سال تک اللہ کا قرآن نازل ہوتا رہا اور متفرق مقامات پر نازل ہوا اور متفرق جگہوں اور موقعوں میں نازل ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں حکم نہیں دیا کہ قرآن کو اکٹھا کر دو۔ جب

اللہ کے نبی ﷺ نے یہ کام نہیں کیا تو میں کیسے کروں؟ اس لیے مجھے تمہاری یہ بات سمجھ نہیں آتی ، میں اس بات پر غور کروں گا۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ میرا قدم حضور ﷺ کی سنت کے خلاف اٹھ جائے۔

حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے بار بار کہتے رہے اور میں بار بار ٹالتا رہا اور میں اللہ سے دعا کرتا رہا کہ یا اللہ! جو راستہ سیدھا ہو تو اس پر مجھے چلا دے۔ فرماتے ہیں:

''حَتّٰى شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِي لِلَّذِي شَرَحَ لَهُ صَدْرَ عُمَرَ''

''اللہ پاک نے میرا سینہ بھی کھول دیا جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ کا سینہ کھولا تھا۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۱۹۱، باب: يُسْتَحَبُّ لِلْكَاتِبِ أَنْ يَكُونَ أَمِينًا عَاقِلًا]

میں اس بات پر راضی ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات ٹھیک ہے۔ اللہ نے قرآن کو محفوظ رکھنا ہے، لیکن محفوظ رکھنے کے لیے دنیا میں اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو زندہ رکھنا ہے، زندہ رکھنے والا تو اللہ ہے، لیکن ہماری زندگی کے لیے پانی ضروری ہو گیا، روٹی ضروری ہو گئی، کھانا پینا، رہنا سہنا اور علاج یہ سارے اسباب ضروری ہو گئے۔ اس لیے اب اگر کہیں کہ اللہ نے ہمیں زندہ رکھنا ہے تو کھانا چھوڑ دیں اور پینا چھوڑ دیں کہ اللہ نے ہمیں زندہ رکھنا ہے اور ایک ائیر ٹائٹ روم کے اندر جا کر بند کر دیں اپنے آپ کو اور کہیں کہ بس اللہ نے ہمیں زندہ رکھنا ہے۔ تو یہ بھی شریعت کے خلاف ہے، کیونکہ جو اسباب اللہ نے پیدا فرمائے ان اسباب پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس لیے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے دماغ میں بھی یہ بات آ گئی اور اللہ کو بھی یہی منظور تھا کہ میں نے قرآن کو محفوظ رکھنا ہے۔ قرآن کی حفاظت کا کام میں نے اصحابِ رسول سے لینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے قرآن کا محافظ بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو بنایا، قرآن کا جامع بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کو بنایا، قرآن کا سب سے اوّل مخاطب صحابہ رضی اللہ عنہم کو بنایا اور اپنے قرآن کا سب سے اوّل عامل صحابہ رضی اللہ عنہم کو بنایا۔ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور اسی طرح چار آدمیوں کی کمیٹی بنا دی کہ تمام سورتیں جن کے پاس لکھی ہوئی ہیں وہ بھی جمع کرو اور جن کے پاس قرآن سینوں میں محفوظ ہے وہ بھی جمع شروع کیا گیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں آ کر کام شروع ہوا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مکمل طور پر اپنے انتہائے عروج پر پہنچا، وگرنہ قرآن تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمع ہو گیا تھا، لیکن قراءت کا اختلاف باقی رہا کہ سات قرائتیں ہیں اور سات قراءتوں میں قرآن پڑھا جاتا ہے، جیسے آپ بھی پڑھتے ہیں ﴿وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا

وَمُرْسٰهَا﴾[ھود:۴۱] تو یہ قراءت ہوتی ہے۔﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ﴾[الروم:۵۴] اور بعض پڑھیں گے﴿مِنْ ضَعْفٍ﴾ تو یہ قراءت کا فرق ہوتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ اشکال پیدا ہونے لگا۔ لوگ پھر گھبرا گئے کہ کہیں اختلافِ قراءت کی وجہ سے دشمن فائدہ نہ اٹھالے۔ انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو عرض کیا، انہوں نے کہا کہ ہر آدمی مختلف قراءت میں پڑھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا، مثلاً: اگر پاکستان میں پہنچا تو ایک قراءت میں، عرب میں پہنچا تو دوسری قراءت میں، افریقہ میں پہنچا تو تیسری قراءت میں، مغرب میں پہنچا تو چوتھی قراءت میں، یمن میں پہنچا تو پانچویں قراءت میں، شام میں پہنچا تو چھٹی قراءت میں اور کسی ملک میں پہنچا تو ساتویں قراءت میں۔ تو کل کو اس میں بھی جھگڑے ہو سکتے ہیں کہ کوئی یہ کہے کہ میری قراءت والا قرآن زیادہ صحیح ہے اور کوئی یہ کہے کہ میری قراءت والا قرآن زیادہ صحیح ہے۔ دشمنوں کو اس قراءت کے اختلاف کا موقع نہ ملے، لہٰذا آپ مہربانی کریں اور قرآن کو ایک قراءت (ایسی شکل میں تحریر کر دیں کہ حروف ایک سے ہوں، مگر تمام صحیح قراءتیں اس کی صورتِ خطی سے معلوم ہو رہی ہوں) میں جمع کر دیں۔

لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی میٹنگ بلائی اور مشورہ ہوا کہ قرآن کو کسی ایک قراءت پر جمع کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ وہ قراءت جس پر اللہ نے قرآن کو اتارا اور جس قراءت میں خود اپنی زبان پاک سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا...... شاید آپ کے علم نہ ہو، یہ شرف بھی ملا تو کس کو ملا؟ قرآن پاک تو جمع ہو گئے تھے تو یہ قرآن کس کے پاس ملا؟ بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس ملا۔ اور بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا کون ہیں؟ یہ بنتِ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں اور زوجہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور امہات المؤمنین ہیں...... ان کے پاس جو قرآن تھا وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منگوایا۔ یہ اسی قراءت پر تھا جس پر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا تھا۔ اسی قرآن کو سامنے رکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نسخے تیار کروائے۔ سات نسخے بنوائے گئے اور ان پر انہوں نے اپنی مہر لگائی۔

[البرہان فی علوم القرآن:۱/۲۳۶۔۲۴۰]

وہ مہر کون سی تھی؟ مہر وہ تھی جو ان کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی تھی، یعنی وہ مہر جو چلی آ رہی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ کے پاس، ان کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بعد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں وہ مہر انگوٹھی میں بنی ہوئی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ مدینہ مبارک میں (مسجد قباء کے پاس) ایک کنویں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ کنویں میں گر گئی۔ کنویں میں گرنے کے بعد حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ نے بے انتہاء کوشش کی اس کو تلاش کرانے کی، لیکن وہ نہ ملی اور اسی دن سے یہ اشارہ تھا کہ اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے امتحان کا دور شروع ہو گیا، لیکن ...... الحمد للہ ثم الحمد للہ...... وہ مصحفِ عثمان رضی اللہ عنہ جو اصل میں مصحفِ حفصہ رضی اللہ عنہا ہے۔ [سنن أبي داود، حدیث: ۴۲۱۵، باب ما جاء في اتخاذ الخاتم]

اس سے بھی آپ اندازہ فرمائیں کہ جو آدمی کسی اچھے کام کی ابتداء کرے، بادشاہ خادم الحرمین نے یہ قالین بچھایا ہے۔ اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ خادم الحرمین نے یہ حرم بنایا ہے۔ اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ یا یہ حرم بنایا یا نیا حرم بنایا تو جتنے لوگ قیامت تک نماز پڑھتے چلے جائیں گے ان کو ثواب ملتا رہے گا۔ تو اسی طرح قیامت تک جو قرآن پڑھے گا جہاں ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو ثواب جائے گا وہاں خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے لیے بھی لکھا جائے گا کہ انہی کے مصحف کو نقل بنایا گیا، اس پر ترتیب رکھی گئی تھی۔ تو اب قیامت تک جتنے بھی قرآن پڑھیں گے اللہ کی شان ہے کہ اس کا اجر اور اس کا ثواب اصحابِ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو لکھا جائے گا اور اس کے بعد سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو لکھا جائے گا۔ تو اس مہر کے ساتھ وہ قرآن پوری دنیا میں تقسیم کر دیا گیا اور آج بھی وہ اپنی اسی اصلی حالت کے اندر موجود ہے اور پھر اللہ جس سے کام لے۔

شاہ فہد کی خدماتِ قرآن:

اللہ تعالیٰ خادم الحرمین کو جزائے خیر عطا فرمائیں کہ انہوں نے ''مجمع الملک الفہد'' مدینہ منورہ میں دنیا کا ایک بہت بڑا پریس قائم کیا۔ میں ہمیشہ بیٹھ کر سوچا کرتا ہوں کہ میرے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِدًا بَنَى اللّٰهُ لَهُ مِثْلَهُ فِي الْجَنَّةِ))

''جو آدمی دنیا میں اللہ کا گھر بناتا ہے اللہ اس کو جنت میں گھر دیتا ہے۔''

[سنن الترمذي، حدیث: ۳۱۸، باب: ما جاء في فضل بنيان المسجد]

میں کئی دفعہ سوچتا ہوں کہ یا اللہ! یہ تیری شان ہے! اگر موجودہ بادشاہ کو تو نے قیامت کے دن اتنے بڑے حرم اور مدینہ جتنا گھر دے دیا تو یہ وہاں بھی بادشاہ ہوں گے، کیونکہ جتنا گھر بنائیں گے اتنا دیں گے، بلکہ اللہ تو اس سے بڑا دیں گے، لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ اتنا بھی دے دیں تو یہ کوئی جنت میں چھوٹا گھر ہوگا!؟ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کی ایک ہنٹر کی جگہ اگر ساری دنیا کی قیمت لگائی جائے تو اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔

اور اسی طریقہ سے اللہ نے خادم الحرمین سے جو دوسرا کام لیا ہے، وہ یہ ہے کہ سات لاکھ قرآن ایک دن میں

چھاپ سکتے ہیں۔ یعنی پوری دنیا میں اس کے مقابلہ پر کوئی پریس نہیں ہے جو مدینہ منورہ کے اندر قائم ہوا اور اس میں انہوں نے پوری دنیا کے قراء کو بٹھایا، تمام دنیا کے علماء کو بٹھایا اور کہا کہ بعینہٖ اسی طریقہ پر جو مصحفِ عثمان رضی اللہ عنہ تھا اور جس طرح اور جس قراءت پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمع کیا تھا، اسی طرز پر قرآن چھاپا جائے، تاکہ قیامت تک محفوظ ہوجائے۔ اب...... الحمدللہ...... وہ قرآن حرمین میں ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا میں موجود ہے۔ اور اللہ کی شان ہے کہ حرم میں جو قرآن آپ دیکھتے ہیں اس میں جو کاغذ استعمال کیا ہوا ہے، یہ کاغذ پوری دنیا میں نہیں خرید سکتے، کیونکہ یہ خاص طور پر قرآن کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کاغذ کی صفت یہ ہے کہ ایک سو سال تک اس کی آب وتاب میں فرق نہیں آئے گا۔ اور پھر قرآن کے اوپر جو جلد بنائی گئی ہے اس کے لیے مور کا چمڑا استعمال ہوا ہے، جو دنیا میں نایاب چیز ہے۔ اور پھر اس قرآن کی جو جلد بندی کی گئی ہے اس کو جب جلد کرتے ہیں تو آٹھ ٹن وزن اس پر دیتے ہیں۔ الحمدللہ! اللہ نے مجھے یہ شرف بخشا کہ وہ مجھے لے گئے اور ایک ایک چیز مجھے سمجھائی اور بتلائی کہ یہ کیا مشین ہے اور یہ کیا مشین ہے؟ اور یہاں کیا کام ہوتا ہے؟ کتنی تصحیح ہوتی ہے؟ کتابت ہوتی ہے، کتنی طباعت ہوتی ہے؟ یعنی آپ اندازہ کریں کہ اس قرآن کو درمیان سے کھول دیں اور پوری طرح الٹ دیں تو کوئی کاغذ باہر نہیں نکلے گا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی بدبخت پھاڑ ڈالے۔ یہ تو بدبختی ہوئی، یوں تو لوہا بھی توڑا جا سکتا ہے، لیکن اس انداز میں اللہ کے قرآن کی خدمت کی اللہ ان کی محنت اور خدمت کو قبول فرمالیں اور اللہ ہمیں بھی قرآن پاک کی خدمت کرنے کی توفیق دیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم پر تبرا کرنے والا حفظِ قرآن سے محروم:

اب چودہ سو سال گزر گئے۔ اس کے باوجود بعض لوگ یہ باتیں اپنی کتابوں میں بغض باطن کی بنا پر تو لکھ دیں، لیکن سامنے آنے کے بعد جرات ان کو بھی نہ ہوئی، لیکن اللہ کے قرآن کے انکار کرنے پر اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے بغض کرنے پر اللہ نے ان کو ایک سزا دی کہ پوری دنیا میں دیکھ لیں کہ جو آدمی صحابہ رضی اللہ عنہم پر تبرا کرنے والا ہو، یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کو...... نعوذ باللہ...... برا بھلا کہنے والا ہو، ان میں ایک بھی حافظِ قرآن آپ کو نہیں ملے گا۔ اللہ نے ان کو سزا دی کہ ایک بھی حافظِ قرآن نہیں۔ پوری دنیا میں آپ سنیوں کی بستی میں چلے جائیں، جہاں بالکل میری طرح کے جاہل رہتے ہوں، وہاں بھی کوئی نہ کوئی اندھا کانا حافظ مصلی پڑھ رہا ہوگا اور ان کے امام بارے میں دیکھ لیں۔ کبھی قرآن کا ختم ثابت کر دیں تو جو مرضی آئے مجھے سزا دیں کہ رمضان المبارک میں یا غیر رمضان المبارک میں کبھی

انہوں نے اپنے امام بارگاہوں میں قرآن کا ختم کیا ہو۔ وجہ کیا ہے کہ جب قرآن کے جمع کرنے والوں کا انکار کیا تو اللہ نے ان کے سینوں سے قرآن کو نکال دیا، اللہ نے وہ نعمت پھر ان کے سینوں میں رہنے ہی نہیں دی۔ اللہ نے فرمایا کہ تم اس قابل ہی نہیں ہو۔ قرآن تو اس کے سینے میں جمع ہوگا جو جمع کرنے والوں کا عاشق ہوگا اور جو جمع کرنے والوں کو ماننے والا ہوگا۔ تم تو جامعینِ قرآن کے منکر ہو تو تمہارے سینوں میں کیسے قرآن جمع ہو سکتا ہے؟ آپ دیکھ لیں کہ ان کا کوئی آدمی قرآن پڑھ رہا ہو۔ تو "اِنَّا اَنْزَلْنَا... وَالْعَصْرِ... قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ" ان کے علاوہ عموماً کوئی چوتھی سورت ان کو نہیں آتی۔ اور وہ بھی ایسے پڑھ رہا ہوتا ہے کہ اللہ معاف کرے جیسے پتھر مار رہا ہو۔ آپ کبھی ان کے ساتھ کھڑے ہو کر دیکھ لیں اور سن لیں۔ پانچ چھ نمازیں ان کی ایک منٹ میں ادا ہو جاتی ہیں، یعنی ان کو وقت کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نماز کے تابع نہیں، بلکہ نماز ان کے تابع ہے۔ تم تو نماز کے تابع ہو کہ عشا کا وقت ہوگا تو ہم عشاء پڑھیں گے اور فجر کا وقت آئے گا تو ہم فجر پڑھیں گے اور یہ ایسا کرتے ہیں کہ سارا دن کام کرنے کے بعد عشا کے وقت پانچوں نمازیں اکٹھی ادا کریں گے۔ اور اس کے بعد جب وہ نماز پڑھیں گے تو آپ دیکھ لیں۔ اگر ان سورتوں کے علاوہ کوئی سورت ان کو آتی ہو اور جس انداز میں وہ پڑھتے ہیں۔

ایک قاری صاحب کا واقعہ:

جیسے مثال مشہور ہے کہ ایک قاری کو مقابلہ کرنے کا شوق ہو گیا۔ اس نے کہا کہ مصر کے بڑے قاری ہیں تو میں قاریوں میں نہیں ہوں؟ میں بھی ان کا مقابلہ کروں گا...... حالانکہ اللہ کی شان ہے کہ اللہ نے مصر والوں کو قرآن پڑھنے کی نعمت سے نوازا ہے تو مقابلہ کا کیا معنی ہے؟ اب کوئی آدمی عربی سے کہے کہ میں مقابلہ کروں گا تو بھائی! اس کی تو زبان عربی ہے، ہم کیا مقابلہ کر سکتیں ہیں؟ ہم کتنے بڑے عالم بن جائیں ہمیں تو زبان ہی نہیں آتی۔ تو اول لغت ہی نہیں آتی جو یہاں ایک بچے کو آتی ہے۔ ہم تو ۲۰ سال پڑھتے پڑھتے اتنی بولی بھی نہیں سیکھ سکتے جو ان کا پانچ سال کا بچہ بولتا ہے، وہ اس کی مادری زبان ہے۔ جیسے ہم اردو بولتے ہیں، یہ نہیں بول سکتے، چاہے یہ ۲۰ سال بھی سیکھتے رہیں، نہیں بول سکتے۔ ہم سرائیکی بولیں گے، پنجابی بولیں گے، یہ نہیں بول سکتے، کیونکہ ان کے وطن کی زبان میں نہیں ہے...... بہر حال وہ قاری ایک مصری کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ میں فلاں ملک سے آیا ہوں اور میں نے آپ کو قرآن سنانا بھی ہے اور سننا بھی ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو کسی ضروری کام سے جا رہا ہوں تو آپ میرے گھر میں مہمان رہیں۔ واپس آنے کے بعد آپ کا قرآن بھی سنوں گا اور آپ کو قرآن بھی سناؤں گا۔ اللہ نے جو ہمیں

قرآن دیا ہے اسی لیے تو دیا ہے۔

اس کی ایک سات آٹھ سال کی بہن تھی اور اسے کہا کہ میں باہر جا رہا ہوں۔ آپ قاری صاحب کو ناشتہ بھی کروائیں، کھانا بھی کھلائیں اور اگر یہ چاہیں تو ان کا قرآن بھی سن لینا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ تو قاری صاحب نے سورۂ یوسف پڑھی۔ جب وہ مصری قاری آئے تو انہوں نے اپنی بہن کو بلایا تو اس نے کہا کہ مہمان تو چلا گیا اس کو میں نے ناشتہ کرا دیا۔ پوچھا کہ اس نے قرآن سنایا تھا؟ اس نے کہا: ہاں! سنایا تھا، سورۂ یوسف سنائی تھی۔ پوچھا کہ کیسے پڑھتا تھا؟ اس نے کہا کہ حضرت یوسف کو اتنا ان کے بھائیوں نے نہیں ستایا ہوگا جتنا اس حافظ نے ستایا ہے، اس کے بھائیوں نے اتنی تکلیف نہیں پہنچائی جتنی اس حضرت نے تکلیف پہنچائی۔

''مِنْ مِّثْلِهٖ'' کی تفسیر:

''مِنْ مِّثْلِهٖ'' سے کیا مراد ہے؟ اس میں دو قول ہیں:

1 ...... بعض علماء نے فرمایا ﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ﴾ یعنی ''مِثْلِ الْقُرْآنِ'' قرآن کے مثل کوئی آدمی مقابلہ کر کے ایک آیت بھی نہیں بنا سکتا۔

2 ...... اور بعض علماء نے دوسرا ترجمہ فرمایا ﴿مِن مِّثْلِهِ﴾ یعنی ''مِثْلِ مُحَمَّدٍ'' مطلب یہ کہ جیسے حضور ﷺ مکہ میں پیدا ہوئے اور آپ کا لقب ''النبی الامی'' ہے، یعنی مکہ میں پیدا ہوئے، جہاں مدرسہ اور یونیورسٹی کوئی نہیں، کسی استاذ کے پاس پڑھا نہیں، تو ایسا نبی امی جو قرآن پیش کر رہا ہے اس کے مقابلہ پر کوئی اور امی پیش کرے۔

لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس کی تشبیہ کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ تحدی قرآن کی ہو رہی ہے جو اللہ کا کلام ہے، کوئی اس کے مقابلہ پر اللہ کا قرآن بنا کر نہیں لا سکتا۔

اللہ نے انبیاء علیہم السلام کو جو بھی معجزہ دیا اس زمانے کے حال کے مطابق دیا: موسیٰ علیہ السلام کو عصا عطا فرمایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں حکمت اور طب کا بڑا زور تھا تو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو معجزے بھی ایسے ایسے عطا فرمائے کہ بڑے سے بڑا طبیب ان سے عاجز ہے، جیسے پیدائشی نابینا کو تندرست کر دینا اور حضور ﷺ کے زمانہ میں لوگ فصاحت میں بڑے مشہور تھے تو اللہ نے اپنے نبی کو معجزہ قرآن پاک دیا کہ تمام دنیا کے بلغاء اور ادباء حیران ہو گئے! آخر سب کو اقرار کرنا پڑا کہ یہ بندے کا کلام نہیں، بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ نے ان کو چیلنج کیا اور بار بار چیلنج

کیا، مکہ میں بھی اور مدینہ میں بھی۔ اور وہ حضور ﷺ سے بغض رکھنے کے باوجود سب کے سب عاجز آ گئے اور سب کے سب اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس لیے فرمایا:

﴿فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۴]

جیسے قرآن معجزہ ہے اسی طرح خبر دینا اور معجزہ ہے کہ اللہ پاک قرآن میں ایک ایسی پکی خبر دے رہے ہیں اور اللہ کا نبی بغیر کسی ڈر کے اور بغیر کسی خوف کے چیلنج کر رہا ہے کہ تم اب بھی مقابلہ کر سکتے ہو اور قیامت تک بھی مقابلہ نہیں کر سکتے ہو۔ دیکھو! صدیاں گزر گئیں، لیکن اللہ کے قرآن کا مقابلہ نہ ہو سکا۔ اس بات سے ثابت ہو گیا کہ قرآن پاک کا یہ دوسرا معجزہ ہے۔

قرآن کی سچی خبریں:

﴿فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ۝﴾ [البقرۃ:۲۴]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے قرآن مقدس کی اس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ قرآن ہر لحاظ سے معجزہ ہے، اعجاز ہی اعجاز ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے الفاظ بھی محکم ہے اور اس کے معانی بھی محکم ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کلام پاک اتارا ہے وہ باعتبار الفاظ کے بھی محکم ہے اور باعتبار معانی کے بھی کہ اس کے معانی مفصل ہیں کہ اللہ نے خود کھول کر بیان فرما دیے اور قرآن پاک کے اندر خود اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی تفسیر فرما دی۔ مفسر فرماتے ہیں کہ الفاظ متصل ہیں اور معنی محکم ہیں یا اس کا عکس کہو یا جیسے بھی کہو تو خلاصہ یہ نکلے گا کہ اس کے الفاظ ہوں یا معنی ہوں وہ اتنے فصیح اور بلیغ ہیں کہ کوئی ان کا مماثل نہیں ہو سکتا، جس کا کوئی محاذی نہیں بن سکتا اور جس کا کوئی مقابل نہیں بن سکتا۔

اور پھر کلام مقدس میں قرآن پاک کا کتنا بڑا اعجاز ہے کہ اللہ نے قرآن پاک میں ایسے ماضی کے واقعات کے بارے میں خبر دی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا، حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا اور سابقہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان فرمائے، تو جتنی اللہ کے قرآن نے غیب کی خبریں دی ہیں وہ سب کی سب سچی اور حقیقت کے مطابق ہیں، دنیا کی کوئی طاقت ان کو نہیں جھٹلا سکی۔ اس لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے قرآن کے اندر تقریباً دس ہزار مغیبات کا ذکر فرمایا، یعنی دس ہزار ایسی خبریں دی ہیں جو غیب کی خبریں ہیں

اور ایک ایک خبر عین حق پر واقع ہوئی ہے۔ یعنی آج تک دنیا میں کوئی انسان پیدا نہیں ہوا جو اللہ کے قرآن کی دی ہوئی خبر کو جھٹلا سکے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا تو آج تک دنیا کو یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کو جھٹلا سکے کہ یہ بات غلط ہے اور یہ بات صحیح ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں خبر دی، اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں خبر دی۔ اور چلو وہ تو دور آسمانوں کی باتیں تھیں، اللہ پاک نے جو قومِ لوط کے بارے میں خبر دی، قومِ عاد کے بارے میں خبر دی، قومِ ثمود کے بارے میں خبر دی اور قومِ شعیب کے بارے میں خبر دی تو یہ وہ علاقے تھے جن پر عرب رات دن گزرتے تھے۔ اگر خدانخواستہ قرآن کی خبر کے اندر کوئی ذرا سی بات بھی غلط ہوتی تو دنیا میں شور اٹھا دیتے۔ اس لیے قرآن اس طرح بھی معجزہ ہے کہ اس میں جو خبر دی ہے وہ بالکل سچی ہے۔

اور اللہ نے قرآن کے اندر ہر بھلائی کا حکم دیا اور ہر برائی سے اللہ نے روکا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ﴾ [الانعام:۱۱۵]

اللہ تعالیٰ نے جو خبر دی ہے وہ سچی ہے اور جو اللہ نے حکم جاری فرمایا وہ بالکل عین عدل پر ہے۔

قرآن کی صداقت:

آج دیکھیں کہ چودہ سو سال گزر گئے قرآن پاک نے جو بھی حکم دیا ہے، مثلاً: شراب حرام ہے۔ ساری دنیا میں جتنی قومیں شراب کی عادی ہیں اور جن کے نزدیک ٹھیک ہے، اب چودہ سو سال بعد وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ شراب واقعی بری چیز ہے۔ قرآن نے خبر دی کہ خنزیر حرام ہے۔ جو لوگ خنزیر کو حرام نہیں سمجھتے تھے تو جدید تحقق نے ثابت کر دیا ہے اور وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ خنزیر کا گوشت نہ کھاؤ، اس سے کینسر پیدا ہوتا ہے اور اس سے فلاں بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ تو جو اللہ نے حکم دیا ہے وہ عدل پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زنا کو حرام کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے کسی مرد سے بدفعلی اور لواطت کو حرام کر دیا۔ اسی طرح خاوند کا اپنی بیوی سے غلط راستہ استعمال کرنا حرام کر دیا۔ جو کافر لوگ قرآن کو نہیں مانتے تھے چودہ سو سال بعد اب وہ ایڈز کی بیماریوں میں پڑے ہیں۔ تو اب کہا کہ واقعی یہ بیماریاں اسی لیے پھیلی ہیں کہ میں نے غیر فطری طور پر معاملات کو سرانجام دیا ہے۔ اب مرد، مردوں کے ساتھ اور عورتوں جانوروں کے ساتھ، کتوں کے ساتھ اور بندروں کے ساتھ بدفعلی کرتے ہیں اور وہ جراثیم منتقل ہوتے ہیں۔ اب ایڈز اتنا خطرناک ہوگیا ہے کہ اتنا ایٹم بم بھی خطرناک نہیں۔ اب دنیا کہتی ہے کہ یہ بات ٹھیک ہے، اس کو تو بند

ہونا چاہیے۔

اس لیے آپ اندازہ فرمائیں کہ اسلام نے پردہ کا حکم دیا ہے، اسلام نے نکاح اور طلاق کا حکم دیا۔ تو جو معاشرے قرآن کو نہیں مانتے، یعنی کافر ہیں، یہودی ہیں، نصرانی ہیں، عیسائی ہیں اور مجوسی ہیں، اب وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جب تک نکاح کا عادلانہ قانون نافذ نہ کیا جائے اس وقت تک اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ بڑے بڑے قانون بنائے، لیکن سب فیل ہو گئے۔ کبھی انہوں نے طلاق عورت کے ہاتھ میں دے دی، کچھ ہفتہ بعد وہ قانون فیل ہو گیا تو انہوں نے طلاق دوبارہ مرد کے ہاتھ میں دے دی۔ لیکن وہ خرچہ بھرتا رہا، اب پھر ان کی پارلیمنٹ قانون بنا رہی ہے کہ بڑی مصیبت ہے کہ ایک عورت کو طلاق ہو گئی، وہ دوسرے کی بیوی بن گئی، لیکن خرچہ پہلا خاوند بھرتا ہے تو اس کا کیا تعلق ہے؟ تو اس لیے قرآن پاک نے جو حکم دیا ہے اور جو خبر دی ہے وہ عین حق ہے، صدق ہے اور عدل ہے، جس کو آج تک دنیا چیلنج نہیں کر سکی اور نہ قیامت تک کوئی چیلنج کر سکتا ہے۔

قرآن کی صداقت اور جامعیت:

اس لیے مفسر فرماتے ہیں کہ اللہ کا کلام تمام سچا ہے، وہ عدل ہے اور ہدایت ہے۔ اللہ کے قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ بلا وجہ بڑھ چڑھ کر کسی کے بارے میں ناجائز بات یا جھوٹی بات کی جائے یا افترا باندھا جائے۔ جیسا کہ عرب میں بڑے بڑے فصیح لوگ گزرے ہیں، بڑے شعراء گزرے ہیں، ان کے کلام میں لازمی بات ہے، جب کسی کی تعریف کرنے پر آئے تو ایسی بے جا تعریف کر دی کہ جس کو کوئی عقل بھی تسلیم نہ کرے اور کسی کو اگر بدنام کرنے پر آگئے اور کسی کو ذلیل کرنے پر آگئے تو اس کی ایسی ہجو کر ڈالی کہ عقل بھی گوارا نہ کرے۔ اس لیے محاورات عرب میں ہے:

''إِنَّ أَعْذَبَ الشِّعْرِ أَكْذَبُهُ.'' [البلاغۃ العربیۃ:۱/۴۰]

''شعر تو سب سے میٹھا وہی ہوتا ہے جو جھوٹا ہو۔''

مثال مشہور ہے کہ جھوٹا قصہ بڑا میٹھا ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ بنایا جاتا ہے کہ بڑے بڑے شعراء جیسے متنبی اپنے ممدوح کی تعریف کر رہے تھے کہ میرا ممدوح جب میدانِ جنگ میں گھوڑا دوڑاتا ہے تو جب گھوڑا دوڑتا ہے اور گھوڑے کے دوڑنے سے جو مٹی اڑتی ہے تو اس کے اوپر ایک ایسے سڑک بن جاتی ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اس پر گھوڑا دوڑا سکتا ہے۔ بھلا یہ کوئی عقل کی بات ہے......!؟ اندازہ فرمائیں! اتنی مدح کر دینا کہ ایک بدصورت ہو تو

اس کے بارے میں کہا کہ چاند اس کا چہرہ دیکھ کر شرما جاتا ہے۔ شعری کلام کے اندر کذب ہوتا ہے، افتراء ہوتا ہے. جھوٹ ہوتا ہے، ناجائز مبالغہ ہوتا ہے، ناجائز اس کے اندر مدح ہوتی ہے اور ناجائز ہجو ہوتی ہے...... اللہ تبارک و تعالیٰ رحم فرمائے...... لیکن اللہ کے کلام کے اندر نہ کسی قسم کا غلو ہے اور نہ کسی قسم کا افتراء ہے، بلکہ عین حق، صدق، ھدیٰ، عدل اور رحمت ہے، کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے۔

مفسر فرماتے ہیں کہ تم ایک لمبا چوڑا قصیدہ پڑھو تو اس کے اندر یا تو عورتوں کی تعریف ہوگی یا شراب کی تعریف ہوگی یا ایک شخص معین کی مدح ہوگی یا کسی گھوڑے کی یا اونٹنی کی یا جنگ کا واقعہ جو اچانک پیش آ گیا یا کوئی ایسی ڈراونی چیز ہوگی یا جنگلی جانور بھیڑیا وغیرہ کی تعریف ہوگی یا شاعر نے کسی چیز کا مشاہدہ کیا یا کسی خاص واقعہ کا مشاہدہ کیا تو اس کے بارے میں کوئی کلام لکھ دیا، جس سے کوئی فائدہ نہیں۔ عورتوں کے حسن کے بارے میں تعریف لکھ ڈالے گا، کبھی اس کے رخسار کی تعریف، کبھی اس کی زلفوں کی تعریف، کبھی اس کے قدوقامت کی تعریف اور کبھی کیا اور کبھی کیا ہے۔ جس سے یہ تو پتہ لگتا ہے کہ شاعر کلام پر قدرت رکھتا ہے، اس کے علاوہ تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یا کبھی کوئی چیز خفی ہوگی، باریک ہوگی تو اس کو ذکر کر دے گا۔ پھر اس کے قصیدے کے اندر دو چار بیت ایسے بھی ہوں گے جن کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ لیکن جب تم قرآن کا مطالعہ کرو گے تو قرآن پورے کا پورا فصاحت و بلاغت کی انتہاء پر پہنچا ہوا ہے۔ جو لوگ عربی کو سمجھنے والے ہیں اور جو سمجھتے ہیں کہ کلام کی تعبیر کیسے کی جاتی ہے۔

اگر تم اللہ کے قرآن میں جو اخبار ہیں ان کو دیکھو گے کہ کیا بہترین حلاوت ہے! اور دیکھو گے کہ بعض خبریں کتنی مختصر ہیں، بعض خبریں کتنی فصیح و بلیغ ہیں اور بعض خبریں بار بار مکرر ہیں۔ ویسے دنیا کے کلام کے اندر ایک ایک چیز کو بار بار کہا جائے تو اس کی عزت ختم ہو جاتی ہے، لیکن قرآن پاک نے ایک ہی قصہ کو کئی سورتوں کے اندر بیان کیا ہے، لیکن جس سورت میں پڑھو گے پہلے سے زیادہ حلاوت اور لذت محسوس ہوگی۔ یہ اللہ کے قرآن کا کمال ہے کہ جتنا پڑھو گے کبھی بوسیدہ نہیں ہوگا اور جو علم والے ہیں ان کا کبھی قرآن سے پیٹ بھر نہیں سکتا۔ اور قرآن پاک میں جب تم وعید کی آیات کو پڑھو گے، جس کے اندر اللہ نے اپنے بندوں کو ڈرایا ہے تو وعید کا ایسا انداز ہے کہ بندے کے بال کھڑے ہو جائیں، پہاڑ بھی ہل جائیں اور جب وہ پہاڑوں کو ہلا ڈالے تو پھر تمہارا کیا گمان ہے ان دلوں کی طرف جو قرآن کو سمجھنے والے ہیں۔ اس لیے آپ قرآن پاک کی تاریخ اٹھا کر پڑھیں! لاکھوں لوگوں نے اللہ کا قرآن سنا، ایک آیت یا دو آیتوں پر پہنچے تو فوراً ایمان لے آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن کی چند آیات سنیں تو

رونے لگ گئے۔ اسی طریقے سے بہت سے لوگ ہیں ڈاکہ ڈالنے جارہے ہیں اور کانوں میں آواز پڑی:

﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ﴾ [الحدید:١٦]

فوراً توبہ کرلی۔ یہ اللہ کے قرآن کا کمال ہے۔ اخبار میں دیکھو تو صداقت ہے اور وعید میں دیکھو تو اللہ پہاڑوں کو بھی ہلا ڈالے، چہ جائیکہ دلوں کا مسئلہ کیا ہے؟ اور اللہ نے قرآن میں جو وعدے بیان فرمائیں ہیں اور اپنے مومن بندوں کو جو خوشخبریاں دی ہیں اگر ان پر تم غور کرو کہ اللہ پاک نے جنت کا کیسے وعدہ فرمایا؟ جنت کا کیسے شوق دلایا؟ دارالسلام کا اللہ نے کیسے منظر بیان فرمایا؟ کہ کوئی نفس جانتا نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے لیے کیا کیا نعمتیں چھپا رکھی ہیں، جو ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنیں گی۔ وہ ایسی نعمتیں ہیں۔ چونکہ ان کو بدلہ دیا جائے گا کہ جو انہوں نے دنیا کے اندر عمل کیا تھا تو فرمایا:

﴿يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِنْ ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ ۖ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۖ وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٧١﴾﴾ [الزخرف:٧١]

مسلمانو! جنت کے اندر ایسی نعمتیں ہوں گی جو تیرے دل کی خواہش ہوں گی اور آنکھوں کو لذت ملے گی اور اس میں ہمیشہ رہو گے۔ کبھی اللہ قرآن میں ترہیب کرتے، یعنی ڈراتے ہیں کہ اے لوگو! تم کیا بے غم ہو گئے ہو کہ اللہ کا عذاب آئے اور تم زمین میں دھنس جاؤ اور کبھی فرماتے ہیں:

﴿أَأَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ ﴿١٦﴾﴾ [الملک:١٦]

''کیا تم بے غم ہو گئے اللہ اس عذاب سے کہ اگر وہ چاہے تو تمہیں زمین کے اندر دھنسا دے؟''

﴿أَمْ أَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ ﴿١٧﴾﴾ [الملک:١٧]

''یا تم بے غم ہو گئے ہو اس بات سے کہ اللہ تم پر کوئی سخت عذاب نازل فرمادے اور اس کے بعد تم جانو گے کہ اللہ کا ڈرانا کیسا ہے؟''

اور کبھی زجر آیا تو فرمایا: اگر ہم نے کسی کو پکڑا ہے تو اس کے گناہ کی وجہ سے پکڑا ہے۔ اور کہیں اللہ کا قرآن وعظ و نصیحت فرمارہا ہے:

﴿أَفَرَأَيْتَ إِنْ مَتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ ﴿٢٠٥﴾ ثُمَّ جَاءَهُمْ مَا كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿٢٠٦﴾ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ﴿٢٠٧﴾﴾

[الشعراء:۲۰۵تا۲۰۷]

''(اللہ نے فرمایا کہ) تمہیں پتہ ہے کہ ان کو چاہے دنیا کے اندر جتنی مدت گزارنے کے لیے مل جائے، لیکن انجام یہ ہے کہ انہوں نے اس کی طرف لوٹ آنا ہے، جو ہم نے ان کے لیے تیار کر رکھا ہے اور جو دنیا میں انہوں نے فائدہ اٹھایا تھا وہ انہیں کیا فائدہ پہنچائیں گے؟''

فصاحت و بلاغت اور حلاوت کے جتنے عنوان ہیں، یعنی اللہ کے قرآن میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی ہے، ترغیب بھی ہے اور ترہیب بھی ہے، تنذیر بھی ہے اور تبشیر بھی ہے، اوامر بھی ہیں اور نواہی بھی ہیں اور زجر بھی ہے اور بشارات بھی ہیں۔ جس انداز میں ترغیب پر نظر ڈالو، ترہیب پر نظر ڈالو، انذار پر نظر ڈالو، تبشیر پر نظر ڈالو، مواعظ پر نظر ڈالو اور اوامر پر نظر ڈالو، جس حیثیت میں بھی اللہ کے قرآن پر نظر ڈالو گے یہ ماننا پڑے گا ''كُلُّهُمْ صِدْقٌ وَّ عَدْلٌ وَّ حَقٌّ وَّ هُدًى'' قرآن سب کا سب سچا ہے، سراپا عدل ہے، سراپا ہدایت ہے، سراپا نور ہے اور سراپا رحمت ہے۔ اب دنیا کا کوئی کلام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور جب تم قرآن کے اوامر پر نظر ڈالو گے کہ اللہ نے حکم دیا: نماز پڑھو، روزہ رکھو، حلال کھاؤ اور طیبات استعمال کرو تو تم دیکھو گے کہ اللہ کے ہر حکم کے اندر نفع ہی نفع ہے اور خیر ہی خیر ہے۔ اللہ پاک نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے وہ چیز بری ہے، اس کے اندر ذلت ہے اور دناءت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب قرآن میں آیا ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾، جب مومنوں کو خطاب آئے تو اپنے کانوں کو پورا متوجہ کر کہ اب آگے جو امر آ رہا ہے، اگر امر ہوگا تو سراپا خیر ہوگی اور اگر نہی ہوگی تو تمہیں کسی برائی سے روکا جا رہا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خطاب فرماتے ہیں۔ اسی اللہ نے فرمایا، قرآن میں تمہیں حکم دیتے ہیں ''يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ'' بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے تمہیں منع کرتے ہیں، پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتے ہیں اور خبیث چیزوں کو حرام کرتے ہیں اور جو تمہارا بوجھ ہے اس کو ہٹاتے ہیں۔ یعنی اللہ کے قرآن نے کہیں حکم دیا ہے تو وہ خیر ہے، معروف ہے اور جس چیز سے بھی منع کیا ہے تو لازمی طور پر وہ چیز تمہارے لیے ظاہر میں بھی نقصان والی ہے اور باطن میں بھی نقصان والی ہے۔ اس لحاظ وہ دنیا و آخرت میں نقصان والی چیزیں ہیں۔ اب سارے احکام دنیا میں واضح ہیں۔

اب عقل سلیم ہو کہ سارا قرآن پڑھ جاؤ، کوئی حکم بھی ایسا نہیں ہے کہ اللہ نے حکم دیا ہو اور وہ ہماری بہتری اور بھلائی کے لیے نہ ہو۔ اللہ نے جس چیز سے ہمیں روکا ہو مثلاً: اللہ نے حکم دیا کہ جانور ذبح کر کے کھاؤ، بغیر ذبح کے نہ

کھاؤ۔ حالانکہ کافر لوگوں کا اس پر کوئی ایمان نہیں، کرنٹ بجلی سے، مختلف چیزوں سے جانور کو مار دیتے ہیں۔ جانور آیا، اس کو بجلی کا کرنٹ لگا اور مر گیا۔ اب جو بڑے بڑے دنیا کے ڈاکٹر ہیں ان کی تحقیق کے بعد وہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مسلمانوں کا جو ذبح کا طریقہ ہے وہ بہتر ہے، اس لیے کہ جو اللہ نے دم مسفوح رکھا ہے، ذبح کرنے میں جو گندہ خون نکلتا ہے تو اب اس کے اندر مضرت نہیں رہتی اور اگر کرنٹ سے مار دیا جائے، ڈنڈے سے مار دیا جائے اور اوپر سے گرا دیا جائے تو خون اندر منجمد ہو جاتا ہے، جو بعد میں انسان کے لیے تباہی کا باعث بنتا ہے۔ چودہ سو سال پہلے میرے آقا خاتم الانبیاء حبیب کبریا محمد رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اگر برتن خراب ہے تو اسے تین دفعہ دھو ڈالو اور فرمایا: اگر کتا کسی برتن میں منہ مارے تو اس کو سات دفعہ دھوؤ، ایک دفعہ مٹی ڈال کر دھوؤ۔ آج چودہ سو سال کے بعد جدید علم نے اس تحقیق پر فیصلہ کیا ہے کہ کتے کے منہ کے اندر جو جرثومہ پایا جاتا ہے وہ دنیا کی کسی دوا سے نہیں مر سکتے، آگ میں ڈالو تو نہیں جل سکتے، ان کی موت صرف مٹی سے ہو سکتی ہے اور کسی چیز سے نہیں ہو سکتی، یعنی چودہ سو سال کے بعد سائنس اس مقام پر پہنچی جو آمنہ کے لال نے چودہ سو سال پہلے خبر دی تھی۔ میرے آقا ﷺ نے فرمایا تھا: اپنے ہاتھوں سے کھانا کھایا کرو اور کھانے کے بعد اپنی انگلیوں کو چاٹ لیا کرو اور صاف کر لیا کرو۔ اب انگریزوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مسلمان ہاتھ گندے کر لیتے ہیں، ہم چمچ سے کھاتے ہیں۔ ہاتھ کتنا صاف ہوتا ہے اور یہ انگلیوں سے اپنے ہاتھ خراب کر رہے ہیں، جراثیم منہ کے اندر جا رہے ہوں گے اور پتہ نہیں کیا کہا۔ اب چودہ سو سال کے بعد ان کے جتنے بڑے بورڈ ہیں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اللہ نے ان تین انگلیوں میں ایسے ایگزائم رکھے ہیں کہ اگر ان کو چوس لیا جائے تو انسان کا نظام ہضم خراب نہیں ہوتا۔ اب دنیا اس بات پر آ گئی۔

اور جو چمچ سے یا چھری سے یا کانٹے سے کھاتے ہیں اب ان کو عقل آ گئی۔ ایک واقعہ لکھا ہے شاید حضرت تھانوی کا ہے یا کسی اور کا ہے کہ ایک دفعہ وہ ٹرین پر سفر کر رہے تھے۔ اسی ڈبہ میں ایک بڑا پڑھا لکھا جدید تعلیم یافتہ آدمی بھی سوار تھا۔ اتفاق سے کھانے کا ٹائم ہو گیا۔ انہوں نے بھی کھانا کھولا اور انہوں نے بھی کھانا کھولا۔ اس آدمی نے چھری کانٹے سے کھانا شروع کیا، مولوی آدمی نے اپنے ہاتھ سے کھانا شروع کیا تو اس نے بڑے گھٹیا اور طنز کے انداز میں کہا کہ دیکھو! کیوں بلاوجہ ہاتھ ڈال کر کھا رہے ہو؟ ایک چمچ لے لو۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے تو میرے محبوب ﷺ کا حکم یہی ہے، تمہیں تمہارے آقا کا حکم ہے، تم اس کی تعمیل کرو، ہم اپنے آقا ﷺ کی تعمیل کرتے ہیں۔ تمہیں اگر اپنے آقا کی سنت پیاری ہے تو ہمیں بھی اپنے آقا ﷺ کی سنت پیاری ہے، ہم تو نہیں چھوڑ سکتے۔ خیر!

وہ باتوں کے خیال میں ایسا کھویا کہ کانٹے سے کوئی چیز منہ میں ڈالنے کے لیے اٹھائی تو گاڑی نے ایک بریک ماری تو سیدھا حلق میں کانٹا لگا اور خون کا فوارہ پھوٹا۔ اللہ نے اسی وقت عذاب نازل کر دیا۔ اب وہ کہتا ہے کہ آپ نے بددعا کر دی۔ انہوں نے فرمایا: میں نے بددعا نہیں کی، تم نے محمد مدنی ﷺ کی سنت پر اعتراض کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کی سزا دی ہے۔ میں کسی کے لیے کیوں بددعا کروں؟

اسی طرح آپ اندازہ فرمائیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ عورت اگر حیض کی حالت میں ہو تو میاں بیوی آپس میں نہ ملیں:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ؁﴾ [البقرة:۲۲۲]

حالتِ حیض میں اپنی بیویوں کے قریب نہ جاؤ، جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں۔ لیکن کافروں نے، انگریزوں نے ان باتوں کا کوئی خیال نہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس کو گولی کھلا دو، خون بند ہو جائے گا۔ آج انجام کیا پہنچا کہ وہ عورتیں جو اسلام پر عمل کرتی ہیں ان کو...... الحمد للہ...... کبھی کینسر نہیں ہوا اور جو ان چیزوں کا خیال نہیں کرتیں تو ان میں سے ۷۰ فیصد عورتیں کینسر میں مبتلا ہیں۔

اسلام نے حکم دیا:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ﴾ [البقرة:۲۳۳]

تمام مائیں اپنے بچوں کو خود دودھ پلائیں۔ عورت کے لیے ضروری ہے کہ اپنے بچے کو دو سال تک دودھ پلائے، لیکن انگریزوں نے مخالفت کی اور ماں کے دودھ کو روک کر بچوں کو ڈبے کے دودھ پر لگا دیا۔ آج پھر چودہ سو سال بعد اخبارات اور رسائل چیخ رہے ہیں کہ عورتیں اپنا دودھ پلائیں، بچے کے لیے سب سے بہتر ماں کا دودھ ہے اور جو عورتیں دودھ نہیں پلاتیں ان کے پستانوں میں کینسر ہو جاتا ہے۔ پھر یہ ایسی بیماری ہے کہ اس کا علاج بھی نہیں، یعنی اسلام نے یہ حکم ہمیں چودہ سو سال پہلے عطا فرمایا تھا۔

اسی طرح آپ دیکھ لیں کہ اسلام نے حکم دیا کہ اگر خاوند مر گیا تو عورت چار مہینے دس دن انتظار کرے۔ اب انگریزوں کو یہ باتیں کہاں سے سمجھ آسکتی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ ایک آدمی مر گیا، بس ختم ہو گیا اور سیٹ خالی ہو گئی تو

دوسرا آدمی کرسی پر بیٹھ جائے۔ یہ کیا ضرورت ہے کہ خوامخواہ ایک عورت چار مہینے اور دس دن انتظار کرتی رہے، لیکن اس بات کو نہ سمجھ سکے کہ چار مہینے اور دس دن کا اسلام نے اس لیے حکم دیا تھا کہ خاوند مر گیا، ہوسکتا ہے کہ عورت کے پیٹ میں بچہ ہو تو چار مہینے دس دن کے بعد اس میں روح پھونک دی جاتی ہے، یعنی اگر حمل ہو تو پہلے مہینے میں حمل واضح نہیں ہوگا، دوسرے میں اور تیسرے میں بھی نہیں، لیکن جب چار مہینے گزر جائیں گے تو اب بچے کی حرکت شروع ہو جائے گی اور واضح ہو جائے گا کہ پیٹ میں بچہ ہے یا نہیں ہے۔ اگر پیٹ میں بچہ موجود ہے تو میرے نبی ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ))

جس کو اللہ اور آخرت پر یقین ہے، وہ ایسا ہرگز نہ کرے کہ کسی دوسرے کے پودے کو پانی ڈالتا رہے۔

[سنن الترمذی، حدیث:۱۱۳۱، باب: مَا جَاءَ فِي الرَّجُلِ يَشْتَرِي الْجَارِيَةَ ...]

پودا تو کسی کا ہے اور یہ بلا وجہ پانی ڈالنے کی حرکت کیوں کرے؟ جب تک کہ عورت حمل سے فارغ نہ ہو جائے۔ جب حمل سے فارغ ہو جائے تو اب وہ دوسری جگہ نکاح کرے، کیونکہ پہلے حمل کا فیصلہ بھی ختم ہو گیا۔ اگر حمل ہوگا تو وضع حمل ہو جائے گا اور اگر حمل نہیں ہوگا تو چار مہینے دس دن گزر جانے سے عورت مکمل طور پر مطمئن ہو جائے گی کسی قسم کا کوئی اختلاف اور کسی قسم کا کوئی فساد دنیا میں پیش نہیں آئے گا۔

اسی طرح اسلام کا کوئی بھی حکم دیکھ لیں اسلام نے نکاح کا حکم دیا، تا کہ مرد اور عورت ایک عقد میں بندھ جائیں اور پھر فرمایا کہ تم یہ نکاح لذت نکالنے کے لیے نہ کرو، یہ نکاح اس لیے نہ کرو کہ چلو نکاح کروں گا۔ نکاح کا مقصد یہ ہے کہ اس میں توالد ہو، تناسل ہو، اس میں خطبہ پڑھنے والا خطبہ پڑھے، گواہ ہوں اور اعلان ہو، تا کہ کسی کی عزت پر کوئی آدمی غلط تہمت نہ لگا سکے۔

اور پھر حکم دیا کہ کبھی اپنی زبان سے طلاق کا لفظ نہ نکالو۔ اگر طلاق کا لفظ نکالو گے تو عورت حرام ہو جائے گی اور اس پر بھی کتنی رعایت کی کہ انسان ہے، اگر غصہ میں آکر اس نے ایک دفعہ طلاق دی تو اس کو اسلام نے حق دیا ہے کہ تم رجوع کر سکتے ہو، دو آدمیوں کے سامنے کہہ دو کہ میں نے اپنی بیوی سے رجوع کر لیا تو بات ختم ہو گئی۔ اگر دو دفعہ طلاق دے بیٹھے پھر بھی اسلام نے اجازت دی کہ اگر مدت ختم ہو گئی تو تم دوسرا نکاح کر لو۔ اور اگر تین دفعہ طلاق دے تو عورت مغلظہ ہو گئی۔ حکم دیا کہ جب ایک دفعہ طلاق سے بیوی علیحدہ ہو سکتی تھی اور دو طلاقوں سے بیوی علیحدہ

ہو سکتی تھی تو تم نے بلا وجہ تین طلاقیں دی ہیں، اب اس خاوند کے پاس اس عورت کو کبھی نہیں آنا چاہیے جب تک کہ وہ عورت دوسری شادی نہ کرے، کیونکہ جس خاوند نے اس کی عزت نہیں کی، طلاقیں دے کر اس کو ذلیل کیا ہے، اس کے گھر میں واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پھر یہ بھی حکم دیا کہ اگر بیوی کو طلاق دینے کی نوبت بھی آجائے اور عورت حیض میں ہو تو طلاق نہ دو، عورت حاملہ ہو تو طلاق نہ دو۔ اگر طلاق دینی ہے تو حیض گزر جائے، عورت پاک ہو جائے اور میاں بیوی آپس میں لیٹ گئے تو اسلام کہتا ہے کہ پھر بھی طلاق نہ دو۔ پھر اگلے حیض میں ہو تو میاں بیوی آپس میں ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں۔ دور ہوتے ہیں تو نفرت بڑھتی رہے گی، لیکن جب عورت پاک ہو گئی تو ہو سکتا ہے کہ مل جائیں اور زیادہ مسئلہ نہ بڑھے۔ اس طرح اسلام نے کہا کہ اگر تم مل گئے ہو تو پتہ نہیں تیرا حمل ٹھہر گیا ہو تو تم طلاق نہ دو، بلکہ اگلے حیض کا انتظار کرو، حیض کے اندر بھی طلاق نہ دو، پھر پاک ہونے کا انتظار کرو۔ منشاء اسلام یہ ہے کہ صلح ہو جائے۔

اور ہمارے عقل والوں نے کیا قانون بنایا؟ جیسے تمہارے ملک کے اندر بھی ایک قانون ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمائے۔ دعا کرو کہ اللہ وہاں قرآن وسنت کا قانون نافذ کرے اور یہ بھی اللہ کے کعبہ میں سن لو اور پلے باندھ لو کہ جب تک تیرے ملک میں قرآن وسنت کا قانون نہیں بنایا جائے گا نہ تیرا ملک بچ سکتا ہے اور نہ امن ہو سکتا ہے۔ ایک بات پلے باندھ لو۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ اس بات کو جلدی سمجھ لو یا...... نعوذ باللہ...... اپنا ملک لٹوانے کے بعد سمجھو۔ عقل والا آدمی پہلے سمجھ لیتا ہے اور بے وقوف آدمی گھر جلانے کے بعد سمجھتا ہے۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی بنیاد نکال دو تو وہ کیا بچے گی؟ اگر دیوار کی بنیاد نکال دو تو کیا دیوار رہ سکتی ہے؟ اگر ایک مکان کی نیچے سے بنیادیں کھود لو تو کیا دیوار رہے گی؟ ہمارے ملک کی بنیاد "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" تھی، اگر وہ بنیاد رکھو گے تو ملک رہے گا اور اگر "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" والی بنیاد نکال دو گے تو پوری دنیا کے قانون بناؤ تو بھی وہ توڑ دے گا اور کبھی وہ توڑ دے گا۔ اسی طرح نتیجہ یہ نکلے گا اللہ وقت نہ دکھائے اور اللہ وہ وقت قیامت تک نہ لائے کہ پہلے آدھے سے محروم ہو چکے ہو، کہیں باقی بھی ختم نہ ہو جائے۔ اس لیے ہمیشہ یاد رکھو! امن ہوگا، سلامتی ہوگی، برکتیں ہوں گی اور رحمتیں ہوں گی جب اللہ کے قرآن اور سنت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مانو گے، جب اس کو نافذ کرو گے اور تسلیم کرو گے اور بہانے نہیں بناؤ گے کہ اگر اس طرح کریں گے تو یوں ہو جائے گا۔ اگر سود نہیں لیں گے تو قرضے کیسے ادا کریں گے؟ اور بینک کیسے چلیں گے؟ یہ اگر مگر نہیں۔ اسلام ہے کہ اللہ فرماتے ہیں کہ تم بیس پرسنٹ پر بیٹھے ہو اور میں زمین کے خزانے

کھول دوں گا، تم میرے قانون کو مانو تو سہی، تم عمل تو کرو، تم بیس پرسنٹ کے جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہو۔ اللہ فرماتے ہیں: میں تو قادر ہوں کہ پہاڑوں کو حکم دوں گا: سونا بن جاؤ، زمینوں کو حکم دوں گا: خزانے نکال دو، برسات کو حکم دوں گا: اب میرے بندوں نے کاشت کرنی ہے، برسنا شروع کردو۔ اب کپاس نکل آئی ہے، اب نہ برسو، کپاس تیار ہوجائے۔ فرمایا: یہ نظام تو میرے ہاتھ میں ہے، تمہارے ہاتھ میں تو نہیں ہے۔

عرضی نویسوں کا خاوندوں پر ظلم:

ہمارے ملک میں جو پڑھے لکھے عرضی نویس ہوتے ہیں، چاہے کوئی ایک طلاق دے وہ بدبخت تین لکھیں گے۔ اس کے پاس جب کوئی طلاق نامہ لکھوانے جائے گا تو وہ کہے گا کہ میں نے طلاق دے دی ہے، طلاق دے دی ہے، طلاق دے دی ہے۔ پھر آگے لکھے گا: اپنے نفس پر حرام کیا، اپنے نفس پر حرام کیا۔ بالکل پکا کام کرے گا، کیونکہ کہتا ہے کہ میں جو لکھنے کے بیس روپے لے رہا ہوں، اس کا کام تو پکا کروں۔ وہ کام کیا پکا کرے گا؟ وہ تو دونوں کو برباد کر رہا ہے۔ تو اب یہ آپ کا قانون کہتا ہے کہ طلاق دینے کے بعد وہ ایک نوٹس چیئرمین یونین کونسل کو جاری کرے گا کہ میں نے اپنی بیوی مسماۃ فلاں کو طلاق دے دی ہے۔ طلاق نامہ لف ہذا ہے۔ مہربانی فرما کر اس پر قانونی کارروائی کی جائے۔ اب چیئرمین فریقین کو نوٹس جاری کریں گے: خاوند کو بھی نوٹس جاری کرے گا اور بیوی کو بھی نوٹس جاری کرے گا کہ تم فلاں دن میری کورٹ میں آ کر پیش ہو اور اپنے ثالث مقرر کرو۔ دو ثالث مرد والے مقرر کریں اور دو ثالث عورت والے مقرر کریں۔ چار ثالث اب دونوں کی صلح کرائیں، کوشش کریں اور آپس میں جھگڑا ختم ہوجائے۔ اگر انہوں نے جھگڑا ختم کرلیا اور صلح ہوگئی تو وہ ثالث رپورٹ بھیجیں گے کہ جناب! زوج اور زوجہ میں مصالحت کرا دی ہے، لہٰذا طلاق کو غیر مؤثر قرار دیا جائے۔ وہاں سے ایک سرٹیفکیٹ جاری ہوجائے گا کہ طلاق غیر مؤثر ہے، ان کی صلح ہوگئی ہے۔ اور اگر وہ رپورٹ دیں گے کہ صلح ہونا ممکن نہیں ہے، بڑی کوشش کی ہے، لیکن ہماری کوشش ناکام ہوگئی ہے۔ اس کے بعد چیئرمین صاحب نوٹس جاری کریں گے کہ طلاق پکی ہوگئی، مؤثر ہوگئی اور اب ان کی صلح کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یعنی آپ سب سے پہلے اس قانون پر غور کریں کہ جو شخص طلاق دے رہا ہے، اس اور اس کی بیوی کے درمیان چیئرمین کا کیا تعلق ہے؟ یہ تو میاں اور بیوی کا مسئلہ ہے۔ چیئرمین کی نہ بیٹی ہے اور نہ بیٹا ہے، اس کا کیا تعلق ہے؟ دوسری بات یہ سوچیں کہ طلاق پہلے ہوگئی اور صلح بعد میں ہوگئی، یعنی

پوری دنیا میں کوئی ایسا بے وقوف آدمی ہے کہ قانون تو نہ ہوا، بلکہ نشئی کا لوٹا ہو گیا۔
مثال مشہور ہے کہ ایک نشئی پیشاب کرنے کے لیے جائے اور لوٹا لے کر جائے تو اس لوٹے میں سوراخ تھے......
نشئی لوگ ان کا پیشاب بھی لمبا ہوتا ہے...... تو جب تک پیشاب کرتا رہے، پانی بہہ جائے۔ اب وہ دیکھے کہ لوٹے میں کچھ نہیں، وہ دوبارہ جائے اور لوٹا بھر کر آئے اور پیشاب کرے، اتنے میں لوٹا ختم ہو جائے۔ تیسری مرتبہ جب وہ تنگ آیا تو اس نے لوٹے کو کہا کہ تم نے بڑا تنگ کیا ہے، تمہارا سوراخ تو میں بند نہیں کر سکتا، ہم پہلے استنجا کریں گے اور بعد میں پیشاب کریں گے، تم بہتے ہو تو بہتے رہو۔ یہ دنیا کا بے وقوف آدمی تھا۔ آپ نے دیکھا ہے کہ طلاق پہلے ہو جائے اور صلح بعد میں ہو۔ اصول یہ تھا کہ اگر آپ نے قانون بنانا بھی تھا اور اللہ کے قرآن کی بغاوت کرنی بھی تھی تو عقل کرتے کہ خاوند نوٹس دیتا کہ میں بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔ یہ نہیں کہ میں نے طلاق دے دی ہے، بلکہ میں طلاق دینا چاہتا ہوں۔ اب چیئرمین ان کو روکتا کہ ان کو روکو، پہلے ان کی صلح کرائے۔ اب صلح نہ ہوتی تو ان کا طلاق کے ساتھ اور چیئرمین کا نافذ کر دینا ہوتا۔ یہ تو نہیں کہ میں نے طلاق دے دی ہے، نافذ کرو۔ اس کا طلاق کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اس لیے جتنے قانون اللہ کے قانون کے خلاف بنائے گئے، نہ وہ عقل کے مطابق ہیں۔ اور دو سال کے بعد یا چار سال کے بعد پارلیمنٹ کہتی ہے کہ یوں ترمیم کرو اور یہ ترمیم غلط ہو گئی، اس میں یوں ترمیم کرو۔
قرآن کا قانون ہے، چودہ سو سال گزر گئے، کوئی مائی کا لال ایک بھی کمزوری نہیں بیان کر سکتا۔ اس کے اندر لچک کی ضرورت نہیں، تبدیلی کی ضرورت نہیں، کسی اضافہ کی ضرورت نہیں اور کسی تنقیص کی ضرورت نہیں۔

قرآن کی خوبیاں:

اس لیے مفسر نے فرمایا کہ قرآن کو جس نظر سے بھی پڑھو گے فصاحت اور بلاغت ہی بلاغت ہے۔ اگر تم آخرت کی باتیں پڑھو گے اور وہاں کے جو حالات ہیں اور دوزخ کی باتیں پڑھو گے، اللہ نے جو وہاں دوستوں کے لیے نعمتوں کا ذکر کیا ہے، دشمنوں کے لیے جہنم کی انواع کا ذکر کیا ہے۔ اس کے اندر بشارت بھی ہے اور تنذیر بھی ہے، اچھے کام کی طرف وہ دعوت دیں گی اور برائی سے روکنے والی ہوں گی، دنیا سے بے رغبتی پیدا کریں گی اور آخرت کی رغبت پیدا کریں گی اور ایک ایسے طریقے پر تمہیں چلائیں گی اور وہ نعمتیں اور انذار اور ابشار تمہیں شریعت محمدی پر چلنے کا ذریعہ بنیں گی اور تمہارے دلوں سے شیطان مردود کی پلیدی ختم کریں گی۔
اس طرح صحیحین کے اندر روایت ہے کہ حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

پہلے جتنے انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں، اللہ پاک نے ان کو بھی نشانیاں اور معجزے دیے ہیں، جن پر اس وقت کے انسان ایمان لائے، لیکن جو مجھے اللہ نے وحی دی ہے، یہ ایک ایسا معجزہ ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ قیامت میں سب سے زیادہ میری امت ہوگی اور مجھے ماننے والے ہوں گے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۲۷۴، باب: قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الْكَلِمِ، صحیح مسلم، حدیث: ۲۳۹]

اس سے اشارہ ملتا ہے کہ اللہ نے جو کلام اللہ کا معجزہ دیا، اس سے پہلے پیغمبروں کو جتنے معجزے ملے ان کو یہ مقام نصیب نہیں ہوا، جتنا قرآن کو نصیب ہوا ہے۔ اسی طرح میرے آقا نامدار ﷺ کو اللہ نے آپ کی نبوت پر اور آپ کی صداقت پر ایسی نشانیاں دی ہیں اور وہ اتنی ہیں کہ اگر ان کو گنا جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو نہیں گن سکتی۔ متکلمین نے بہت بڑے بڑے کلام اور بہت بڑے بڑے دلائل دیے ہیں۔ بعض دلائل اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق ہیں اور بعض دلائل معتزلہ کے عقائد کے مطابق ہیں۔ مفسر فرماتے ہیں کہ معتزلہ یا ان غیروں کے طریقوں کو پکڑ کر ہمیں دفاع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر ہم بات ماننے کے طور پر اس طرح کریں اور مقصود اللہ کے قرآن کا اثبات ہو اور اللہ کے قرآن کا اعجاز ہو تو دنیا کا کوئی بشر اس کے مقابلہ کی طاقت ہی نہیں رکھتا۔

بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ بندے طاقت رکھتے تو تھے، لیکن کر نہیں سکے۔ انہیں کہیں گے کہ چلو تمہاری بات بھی مان لیں کہ طاقت رکھنے کے بعد بھی قرآن کا مقابلہ نہ کر سکنا یہ بھی تو قرآن کا معجزہ ہے، ورنہ اصول تو یہی ہے جو عقیدہ اہل والجماعت کا ہے: کوئی بندہ قرآن کے مطابق کلام بنانے کی طاقت ہی نہیں رکھتا، کیونکہ قرآن فی نفسہٖ معجز ہے۔ اگر بر سبیلِ تنزل کہ ہم نیچے اتر آئیں اور تمہاری بات مان لیں کہ طاقت رکھتا ہے، لیکن دشمنی کے باوجود اور طاقت رکھنے کے باوجود مقابلہ نہ کر سکنا، پھر یہ بھی تو قرآن کا اعجاز ہے۔ مفسر فرماتا ہے کہ اگر ہم اس انداز میں بھی ہم دیکھیں گے اللہ کا قرآن سراپا معجز ہے۔ قیامت تک محفوظ ہے اور کوئی دنیا کی طاقت آج تک نہ مقابلہ کر سکی ہے اور نہ قیامت تک نہ کر سکے گی۔

اسی طرح فیضی نے، حریری نے...... یہ بھی اپنے اپنے دور میں فائق کلام تھے......اس طرح روم اور یونان میں بڑے بڑے خطیب گزرے ہیں، جو کلام میں بڑے مایہ ناز لوگ سمجھے جاتے تھے، لیکن اگر کوئی عقل والا اور انصاف والا غور کرے تو صاف بات سمجھ آجائے گی کہ ان لوگوں نے تو سالہا سال استاذوں سے پڑھا، سالہا سال

تک تعلیم و تعلم کے مراحل طے کیے، علوم حاصل کیے، کتابیں پڑھتے پڑھتے ان کی زندگیاں گزر گئیں اور اس کے بعد اگر انہوں نے کوئی بات کہی ہے تو اپنے دور کے لوگوں نے اس کو اچھا سمجھا ہے۔ یہ تو کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا اس کلام سے جو ایسے ماحول میں اتارا گیا کہ نہ ماحول علمی ہے، نہ آگے لوگ علمی ہیں اور جس ذات پاک پر اتارا گیا نہ اس نے کبھی ایک دن مدرسہ میں پڑھا ہے۔

معجزہ کا معنی یہ ہوتا ہے کہ بغیر اسباب کے چیز ظاہر ہو۔ اگر اسباب کے ساتھ چیز کو ظاہر کیا جائے تو وہ معجزہ نہیں کہلاتا۔ مثال: آج اگر آپ یورپ کے کسی ملک کی آواز ریڈیو، ٹی وی کے ذریعے سن لیتے ہیں تو یہ کوئی معجزہ ہے؟ یہ تو اسباب ہیں کہ باقاعدہ اسٹیشن قائم کیے گئے ہیں، سیارات سے مدد لی گئی اور سیٹ بنائے گئے۔ یہ اسباب ہیں اور معجزہ تب ہوگا کہ جب یہ سارے ذرائع موجود نہیں تھے اور آمنہ کے لال ﷺ منیٰ میں خطبہ پڑھا رہے ہیں، ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے، ہر آدمی اپنے اپنے خیمے میں کپڑے ڈال کر جگہ بنا کر بیٹھا ہے اور فرماتے ہیں کہ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ حضور ﷺ ہمارے خیمے میں تقریر فرما رہے ہیں۔ معجزہ تو تب ہوگا جب وسائل اور اسباب نہ ہوں۔ اسباب کے ذریعے اور اسباب کے تحت اگر کوئی چیز معرضِ وجود میں آجائے تو اس کو معجزہ نہیں کہا جائے گا۔ آج اگر ہوائی جہاز آدمیوں کو لے کر اڑتے ہیں، آج ایسے بھی طیارے دنیا میں آگئے ہیں جو آواز سے بھی تیز رفتار ہیں یا آرہے ہیں تو یہ کوئی معجزہ نہ ہوا۔ مشینیں ہیں، اسباب ہیں اور اس پر ارب ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں۔ معجزہ تو تب ہے کہ ایک تخت رکھا ہے، اللہ کے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا کو حکم دیتے ہیں کہ اس تخت کو اڑاؤ۔ تو ہمیشہ یاد رکھیں کہ معجزہ اس کو کہا جاتا ہے کہ بغیر اسباب ظاہری کے اللہ کی قدرت سے کسی نبی کے ہاتھ سے ایک چیز سامنے آئے اور وہ ایسی چیز ہو کہ دنیا اس کا توڑ نہ کر سکے اور نہ لا سکے ویسی چیز۔

اور اسی طرح کرامت ہوتی ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ ولی کے ہاتھ پر ایک امرِ خارق عادت ظاہر فرما دیں، بغیر ظاہری اسباب کے اللہ پیدا فرما دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر رسول پر کھڑے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم نہاوند میں جہاد میں کھڑے ہیں، مدینہ سے سینکڑوں میل دور لڑ رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں سے ایک آرڈر جاری کرتے ہیں اور ہوا اسے پہنچا دیتی ہے تو یہ کرامت ہوگی۔ اگر آپ نے وائرلس کے ذریعے، ٹیلی فون کے ذریعے اور فائبر لائنوں کے ذریعے کوئی پیغام پہنچا دیا تو یہ کرامت نہیں، یہ تو اسباب ہیں۔ اس لیے بعض لوگ اس دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ فیضی نے کہا۔ تو فیضی نے تو ایک کلام لکھا اور ایک کتاب بغیر نقطوں کے لکھ دی تو کون سا بڑا پہاڑ ہے؟ سعدی نے

فارسی میں کلام لکھا یا کالی داس نے سنسکرت میں یا ہومر نے یونانی میں لکھا اور اسی طرح اردو میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے، اپنے دور میں ابوالکلام پیدا ہوئے اور بہادر یار پیدا ہوئے، عطاء اللہ شاہ بخاری پیدا ہوئے، جو خطابت کے شہسوار تھے، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ کوئی کرامت تھی، کرامت تو تب ہوتی جب اسباب بھی نہ ہوتے۔ یہ معجزہ ہے کہ ماحول بھی موافق نہیں اور قوم بھی امی ہے اور میرے مدنی پاک ﷺ کا لقب بھی النبی الامی ہے کہ حضور ﷺ ابھی پیدا نہیں ہوئے، والد فوت ہو گئے۔ سات سال کی عمر ہے اور والدہ فوت ہو گئیں۔ کفالت آپ کے دادا نے کی، پھر ابی طالب نے کی۔ ایک دن بھی حضور ﷺ نے جا کر مدرسہ میں نہیں پڑھا، حضور ﷺ دور دراز کے کسی علمی ملکوں میں نہیں گئے اور جس شہر مکہ میں، بطحا میں، ام القریٰ میں آپ کا قیام ہے وہاں کوئی علم والا آدمی نہیں، کوئی احبار نہیں، کوئی رہبان نہیں اور کوئی اہل کتاب نہیں اور چالیس سال کی زندگی گزرنے کے بعد اللہ کا نبی غارِ حرا سے اور جبلِ نور کی چوٹی سے اترتے ہیں، ایک ایسا کلام پڑھ رہے ہیں کہ دنیا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تو معجزہ تو اس کو کہا جائے گا۔

اور دوسرا اندازہ لگائیں کہ اس کلام میں اتنا اثر ہے کہ جب حج کا زمانہ قریب آنے لگا تو کفار مکہ کے سارے سردار پریشان ہو گئے کہ اب جو لوگ حج کرنے کے لیے آئیں گے لازماً محمد عربی ﷺ کو ملیں گے اور حضور ﷺ کا کلام جب سنیں گے تو وہ مسلمان ہو جائیں گے تو ہم اس کا کیا توڑ کریں؟ سارے اکٹھے ہو کر بیٹھ گئے۔ کسی نے کہا کہ ہم کہیں گے کہ یہ شاعر ہیں، جیسے شاعر لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن کا کلام بڑا عجیب ہوتا ہے! کسی نے کہا کہ ہم یہ کہہ دیں گے کہ کاہن ہیں کہ وہ بھی غیب کی خبریں دیتے ہیں، تیسرے نے کہا: نہیں نہیں! ہم یہ کہہ دیں گے کہ مجنون ہیں، ولید بن المغیرہ جو ان سب سے عمر رسیدہ تھا اور سب سے زیادہ سمجھدار تھا، وہ کھڑا ہو گیا، اس نے کہا: خبردار! کیا کہہ رہے ہو؟ تم جتنے بیٹھے ہو تم سب سے زیادہ شعر و شاعری کو میں سمجھنے والا ہوں، لیکن خدا کی قسم! محمد عربی ﷺ جو کلام پڑھتا ہے وہ اشعار نہیں ہیں۔ حالانکہ ولید بن مغیرہ دشمن ہے، کافر ہے، اس نے کہا: تم کہتے ہو کہ کاہن ہے، میں نے کاہنوں کو دیکھا ہوا ہے، ان کی اگر ایک خبر سچی ہوتی ہے تو دس جھوٹی ہوتی ہیں اور محمد عربی ﷺ کی ایک خبر بھی غلط نہیں ہے۔ اور تم کہتے ہو کہ مجنون ہے۔ دیوانہ بھی بھلا ایسی باتیں کرتا ہے کہ مکہ میں بیٹھ کر خبر دے کہ روم اور فارس کے درمیان لڑائیاں ہوں گی، پہلے روم کو شکست ہوگی اور فارس غالب آئے گا، پھر روم غالب آئے گا۔ ان کی تو ہر بات حرف بحرف سچی ہوتی ہے۔ ایسے آدمی کو...... نعوذ باللہ...... مجنون کہہ سکتے ہیں؟ اور اس

کے بعد اس نے کہا کہ یاد رکھو! میں نے قرآن خود اللہ کے نبی ﷺ کی زبان سے سنا ہے اور اس کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ "وَاللهِ إِنَّ لِقَوْلِهِ لَحَلَاوَةً" خدا کی قسم! قرآن میں ایک ایسی مٹھاس ہے جو دلوں کو کھینچ لیتی ہے "وَإِنَّ فِيهِ تَرَاوَةً" اس کے اوپر ایک تروتازگی ہے کہ جب قرآن سنو تو تازہ ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ پھر ہم لوگوں کو کیا کہیں؟ اس نے کہا کہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ جادوگر ہے، کیونکہ جادو کرنے والا جتنے لوگوں کو اپنے زیر اثر کر لیتا ہے، جادو کر کے غلام بنا لیتا ہے اور لوگوں کو ہپناٹائزم کر دیتا ہے، تم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ ساحر ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات ہماری نہیں چل سکتی۔ حالانکہ دشمن تھے تو اسی سے آپ اندازہ لگائیں۔

[سیرۃ ابن ہشام: ۱/۲۶۹، خَبَرُ الْوَلِيدِ بْنِ الْمُغِيرَةِ فِيمَا يَصِفُ بِهِ الْقُرْآنَ]

واقعہ:

حضرت ابی ذر رضی اللہ عنہ ان کے بھائی انیس رضی اللہ عنہ بہت بڑے شاعر تھے، انہوں نے مکہ کے اندر قرآن سنا تو بھائی یعنی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم نے کیا سنا ہے؟ انہوں نے کہا: خدا کی قسم! میں خود شاعر ہوں، ہر کلام کو سمجھنے والا ہوں، لیکن محمد عربی ﷺ جو کلام پڑھ رہے ہیں وہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۴۷۳، باب: مِنْ فَضَائِلِ أَبِي ذَرٍّ رضی اللہ عنہ]

اندازہ کریں کہ اتنی دشمنی کے باوجود کتابوں میں موجود ہے کہ ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریک، یہ تین آدمی رات کو چھپ چھپ کر جاتے تھے کہ محمد عربی ﷺ قرآن پڑھیں تو ہم سنیں۔ ابوجہل اور اخنس بن شریک جیسا دشمن اور ابوسفیان جنہوں نے کفر کے زمانے میں سب سے بڑی دشمنیاں کیں، یہ تینوں مختلف راستوں سے چھپ کر آتے کہ جب حضور ﷺ رات کو اٹھیں گے اور تہجد میں کھڑے ہو کر اللہ کا قرآن پڑھیں گے تو ہم سنیں گے۔ اور ایسے ایسے راستے سے آئے کہ کوئی ہمیں دیکھ بھی نہ لے۔ خدا کی شان یہ ہے کہ آئے تو اپنے اپنے راستے سے جب صبح قریب آئی لوٹنے لگے تو تینوں مل گئے۔ اس نے کہا: تم کدھر گئے تھے؟ اور اس نے کہا: تم کدھر گئے تھے؟ آخر ان کو ماننا پڑا کہ میں تو اللہ کے نبی کا قرآن سننے کے لیے گیا تھا۔ انہوں نے کہا: اس بات کو ظاہر نہ کرو۔ اگر مکہ والوں کو پتہ چل گیا تو ایک ہی رات میں سارے مسلمان ہو جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ یہ سردار تو خود رات کو جا کر قرآن سنتے ہیں اور ہمیں قرآن سننے سے روکتے ہیں۔ لیکن صبر نہ ہو سکا، دوسری رات چھپ کر آئے اور صبح کو پھر تینوں مل گئے اور انہوں نے کہا کہ ہم نے رات کو یہ فیصلہ کیا تھا، لیکن کلام ایسا ہے کہ دل کرتا ہے کہ سنتے رہیں۔ یعنی اندازہ کریں

کہ ابوجہل جیسا دشمن ہے۔ [السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۳۳، بقصّۃ استماع قریش إلی قراءۃ النبي صلی اللہ علیہ وسلم]

نضر بن الحارث نے کلام سنا تو اس نے قرآن سننے کے بعد فوراً یہ کہا:

''وَاللّٰہِ! لَیْسَ ھٰذَا مِنْ کَلَامِ الْبَشَرِ''

''یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔''

اس انداز میں بھی قرآن کا معجزہ ہے کہ دشمنوں نے باوجود دشمنی کے اور اور باوجود اپنی فصاحت و بلاغت کے اقرار کیا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، کسی بندے کا کلام نہیں ہوسکتا۔

اور تاثیرِ کلام کا یہ عالم ہے کہ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ابھی کفر کے زمانہ میں تھا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھاتے ہوئے دیکھا اور نماز میں آپ سورۂ طور کی تلاوت فرما رہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سورۂ طور کی تلاوت کو ختم کیا تو کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! میرے دل میں قرآن اور اسلام داخل ہو چکا تھا۔

اس طرح تاثیر کا یہ عالم دیکھیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن سنا اور چند آیتیں سنیں تو فوراً پوچھا ''أَیْنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ؟'' اللہ کے نبی اب کہاں ہوں گے؟ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور فوراً اسلام میں داخل ہوگئے۔ [سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۳۴۳، إسلام عمر بن الخطاب رضي اللہ عنہ]

اس طرح اللہ کے قرآن میں یہ بات موجود ہے اور آج بھی تم پڑھ سکتے ہو کہ سورۃ الجن پوری اتاری گئی۔ جب قرآن کو جنات نے سنا تو انہوں نے بھی کہا:

﴿إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝١ يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ﴾ [الجن: ۱،۲]

''ہم نے قرآن سنا ہے، بڑا عجیب کلام ہے! جو رشد اور ہدایت کی طرف بلانے والا ہے، اس لیے جب ہم نے قرآن سنا تو ایمان لے آئے۔''

دوسری جگہ بھی اللہ نے جنات کے بارے میں قرآن میں فرمایا کہ جب انہوں نے قرآن سنا تو کہنے لگے:

''أَنْصِتُوْا... أَنْصِتُوْا'' چپ کرو، چپ کرو، سنیں کیا پڑھ رہا ہے!؟

﴿فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَى قَوْمِهِمْ مُنْذِرِينَ ۝٢٩ قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَى طَرِيقٍ مُسْتَقِيمٍ ۝٣٠﴾ [الاحقاف: ۲۹،۳۰]

جن واپس گئے اور کہا کہ اے قوم! ہم نے ایک ایسا کلام سنا ہے جو موسیٰ کی کتاب کی طرح ہے۔

اس لیے یہ اللہ کا قرآن معجزہ ہے کہ اس جیسا اثر کوئی کتاب آج تک پیدا نہ کر سکی۔

اور اسی طرح علماء نے لکھا کہ باعتبار اِخبار بھی قرآن معجزہ ہے، یعنی اللہ کے قرآن نے جتنی خبریں عطا فرمائی ہیں: حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ آیا، نوح علیہ السلام کا قصہ آیا، قومِ عاد قوم، ثمود اور قومِ سبا کا قصہ آیا، جتنے بھی واقعات کے بارے میں اللہ کے قرآن نے خبر دی آج چودہ سو سال گزر گئے دنیا کی کوئی طاقت اس کو جھٹلا نہ سکی۔

اسی طرح آپ اندازہ فرمائیں کہ اللہ کے قرآن خبر دی کہ چاند دو ٹکڑے ہوا۔ چلو مکہ والوں نے تو آنکھوں سے دیکھا۔ اب دشمنوں نے بڑے اعتراض کیے، لیکن اگر غور کیا جائے تو اللہ کے قرآن نے خبر دی: چاند دو ٹکڑے ہوگا تو لازمی بات ہے کہ چاند رات کو دو ٹکڑے ہوگا اور جب مکہ میں آدھی رات ہوگئی۔ یہ ضروری نہیں کہ پوری دنیا میں آدھی رات ہو، کہیں صبح ہو چکی ہوگی تو وہاں چاند نظر نہیں آ سکتا، کہیں ابھی رات شروع بھی نہیں ہوگی تو وہاں بھی چاند نظر نہیں آ سکتا اور کہیں اگر آدھی رات ہو چکی ہو تو کچھ لوگ سو چکے ہوں گے، کیونکہ ساری دنیا سرزمین عرب کی عادات تو نہیں رکھتی، جیسے آپ کے ملک ہیں کہ لوگ مغرب سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں اور عشا کے بعد سو جاتے ہیں، لیکن ان چیزوں کے باوجود دشمنوں نے شہادت دی، "تاریخ فرشتہ" جو ہند کی بڑی پرانی تاریخ ہے، اس کے اندر بھی موجود ہے کہ گوالیار ریاست کا ایک راجہ کہتا ہے کہ رات کو میں اپنے محل کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا، میں نے بھی چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا مشاہدہ کیا۔

اللہ کے قرآن نے جتنی بھی خبریں دی، حقیقت تھیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر دی، اصحاب الفیل کا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پہلے گزر چکا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ ہاتھیوں والا واقعہ دیکھا ہی نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اسی سال پیدا ہوئے ہیں، لیکن قرآن نے جو خبر دی اس کا ایک ایک لفظ سچا ثابت ہوا کہ آج تک اسے نہ جھٹلایا جا سکا۔ تو قرآن اس اعتبار سے بھی معجزہ ہے۔

اور اسی طرح اللہ کا قرآن پڑھنے سے بوسیدہ یا پرانا نہیں ہوتا۔ دنیا کی کوئی کتاب ہے آپ اس کو کتنی دفعہ پڑھیں، پانچ دفعہ یا دس دفعہ اس کو پڑھ لیں گے، اس کے بعد آپ اکتا جائیں گے، اس کے بعد اس کو دیکھیں گے بھی نہیں، لیکن چودہ سو سال گزر گئے، رات اور دن اللہ کا قرآن پڑھا جاتا ہے اور ایسے بھی لوگ ہیں جو دو پارے، پانچ پارے، دس پارے روزانہ اور ایسے بھی لوگ ہیں جو سارا سارا قرآن ایک دن میں ختم کرتے ہیں، لیکن بار بار

پڑھ رہے ہیں، کبھی دل نہیں بھرتا۔

اور اسی طرح علماء نے فرمایا کہ قرآن باعتبار اس کے بھی معجزہ ہے کہ آج تک پوری دنیا کے لوگ ایک کتاب پیش نہیں کر سکے جس کتاب کو اتنے لوگوں نے سینوں میں محفوظ رکھا ہوا ور حفظ کیا ہو۔ اللہ کے قرآن کے علاوہ پوری دنیا کو آپ چیلنج کریں کوئی آدمی ایسا پیش کریں جس نے قرآن کے علاوہ کوئی کتاب یاد کی ہو۔ چلو ہندوؤں کا اپنا ایک مذہب ہے، وہ اپنے مذہب کے کسی وید کا کوئی حافظ دکھائیں۔ عیسائیوں کا بھی اپنا ایک مذہب ہے، وہ اپنی انجیل کا کوئی حافظ دنیا میں پیش کریں۔ یہودیت کا بھی اپنا ایک مذہب ہے، وہ اپنا ایک تورات کا حافظ پیش کریں۔ اسی طریقے سے بڑے بڑے زرتشت ہیں، مسیحی ہیں، یہودی ہیں، مجوسی ہیں، آتش پرست ہیں، بڑی بڑی قومیں ہیں اور دنیا میں موجود ہیں ان کے پاس وسائل بھی ہیں، دولت بھی ہے، علم بھی ہے اور بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے پی ایچ ڈی کرنے والے ان کے پاس لوگ ہیں، اپنی کتاب جس کو وہ مانتے ہیں اس کا ایک حافظ تو دنیا میں پیش کریں۔ تو قرآن باعتبار اس کے بھی معجزہ ہے کہ یہ قرآن اللہ کی واحد کتاب ہے، اللہ کا کلام ہے کہ جو ایک نہیں، ہزار نہیں، لاکھوں سینوں میں محفوظ ہے کہ جس ملک میں آپ چلے جائیں، جس علاقے میں آپ چلے جائیں، کوئی نہ کوئی اللہ کے قرآن کا حافظ آپ کو مل جائے گا۔

آپ حیران ہوں گے کہ کمیونزم نے ستر سال تک ظلم کر کے پوری رشیا (روس) کی زمین میں اذانیں بند کر دیں، مساجد کو تالے لگا دیے، قرآن مجید کا نسخہ اس ملک میں رکھنا اور گھروں میں پایا جانا ایک جرم تھا اور جس پر باقاعدہ سزا تھی۔ کوئی اذان نہیں کہہ سکتا تھا، کوئی نماز نہیں پڑھ سکتا تھا اور کوئی قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا، یعنی جب باہر کے لوگ روس کے اندر جاتے تھے تو جیسے ایک دفعہ علماء کا ایک وفد گیا۔ ایئر پورٹ پر نماز کا وقت ہو گیا تو ہمارے بھائی مولانا عبدالقادر آزاد صاحب ہیں، انہوں نے ان لوگوں سے کہا کہ ہماری تو نماز کا وقت ہو گیا ہے تو وہاں کا جو عالم استقبال کے لیے آیا ہوا تھا، بظاہر کپڑے بھی ہیں، لباس بھی ہے، داڑھی بھی ہے، اس نے علیحدہ آکر کہا کہ آپ تو چلے جائیں گے، لیکن ہمارے لیے عذاب آجائے گا، اس لیے مہربانی کریں، نماز کا اول وقت بھی ہے اور آخر وقت بھی ہے، آپ اپنے ہوٹل کے اندر لاک کر کے چپ کر کے پڑھ لیجیے گا، وگرنہ یہاں نماز پڑھنا مسئلہ ہے۔ ہم بظاہر مہمان سمجھتے ہوئے آپ کو انتظام کر دیں گے، لیکن پھر ہم پر عذاب مسلط ہو جائے گا کہ ہم لوگوں نے ایسے حالات پیدا کیے کہ آپ نے ایئر پورٹ پر نماز پڑھی۔ اذان بند، مساجد بند، اللہ کے قرآن کا کسی کے گھر کے اندر موجود

ہونے پر پابندی، لیکن ستر سال کے بعد جب کیمونزم کا سحر ٹوٹا، باطل کا جادو ٹوٹ گیا تو میرے اپنے ساتھی اور میرے والد صاحب کے شاگرد ہیں...... اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے...... وہ اس وقت وہاں اڑھائی سو مساجد کی بنیاد رکھ چکے ہیں۔ اللہ کی مہربانی سے وہ فرماتے ہیں کہ جب میں وہاں گیا تو لوگوں نے کہا کہ الحمد للہ ہمارے ہاں اب بھی قرآن کے حافظ موجود ہیں، یعنی اتنا اس کے مٹانے پر زور لگایا گیا، لیکن قرآن موجود ہو۔ جن کے پاس حکومت ہو، طاقت ہو، شوکت ہو، عیسائیت ہو، یہودیت اس وقت پورے عالم پر دندنا رہے ہیں، لیکن ایک تورات کا حافظ پیش نہیں کر سکتے، ایک انجیل کا حافظ پیش نہیں کر سکتے۔ ہندو کے پاس بے انتہا وقت اور دولت ہے، ایک وید کا حافظ پیش نہیں کر سکتے۔ اپنی کتابوں کا ایک حافظ پیش نہیں کر سکتے، کسی کو کچھ اشلوک یاد ہوں گے، کسی کو کچھ منتر یاد ہوں گے بس۔

اعجاز قرآنی کی طرف قرآنی اشارات:

اسی طرح اعجاز کلام پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے کئی مقامات پر فرمایا ''عَرَبِيًّا'' اور کہیں فرمایا ''عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ'' کہ صرف عربی میں بھی نہیں، بلکہ عربی کھلی ہوئی۔ اور اسی طرح علماء نے فرمایا کہ قرآن بایں اعتبار بھی معجزہ ہے کہ باطل کو مٹانے والا ہے اور حق کو اٹھانے والا ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا کہ قواعد کی نظر سے دیکھو تو قرآن معجزہ ہے، بلاغت کی نظر سے دیکھو تو قرآن معجزہ ہے، فصاحت کی نظر سے دیکھو تو قرآن معجزہ ہے، صداقت کی نظر سے دیکھو تو قرآن معجزہ ہے، حق و باطل کے درمیان تفریق کی نظر سے دیکھو تو قرآن معجزہ ہے اور علوم کی جامعیت کے بارے میں دیکھو تو قرآن معجزہ ہے۔ اور پھر اللہ نے قرآن میں جس مسئلہ کا جو حل پیش کیا ہے چودہ سو سال گزر گئے آج تک اس کی تکذیب نہیں ہو سکی، اس کے مقابلہ پر کوئی حل پیش نہیں ہو سکا۔ اسی سے اندازہ فرمائیں کہ میں نے خود اپنی نظر سے دیکھا کہ لوگ اتنی محنتیں کرنے کے بعد یہاں تک پہنچے کہ لوگوں نے ایٹم تلاش کیا، ایک ایٹم تباہی کا ذریعہ بن جائے...... اللہ ہر اسلام ملک کو محفوظ رکھے...... لیکن قرآن پاک نے اس کے بارے میں پہلے اشارہ کر دیا:

﴿وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝﴾

[الفیل: ۳ تا ۵]

ایک ذرے کے برابر پتھر اٹھایا ہوا ہے اور وہ اس پرندے کی چونچ میں ہے، ایک اس پنجہ میں ہے اور ایک اس پنجہ میں ہے۔ اور وہ ہاتھی کے اوپر اور سار بان کے سر پر ڈالتا ہے، جو ہاتھ کے اندر سے نکل کر زمین میں دھنس

جاتا ہے اور اس ہاتھی ختم کر دیتا ہے۔ اسی طرح آج دنیا سائنس میں ترقی کے بعد ایک نتیجے پر پہنچی ہے کہ یہ جتنے نباتات ہیں، پھل پیدا ہوتے ہیں، سبزیاں پیدا ہوتی ہیں اور انگور پیدا ہوتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کے دانے کیسے جڑے ہوئے ہیں؟ کبھی انار کو کھول کر دیکھیں کہ انار کے دانوں کی ترتیب کیسے ہے؟ اسی طرح مکئی کے دانوں کو دیکھ لیں اور کسی چیز کو دیکھ لیں تو انہوں نے آج چودہ سو سال گزر جانے کے بعد اور علم کی اتنی ترقی کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نباتات میں ایک مادہ ہوتا ہے جسے کلوروفل کہا جاتا ہے۔ وہ سبز رنگ کا ایک مادہ ہے، جو پھولوں کے اندر جو دانے ہوتے ہیں ان کو بنانے کا اور جوڑنے کا سبب ہوتا ہے۔ اور قرآن پاک نے پہلے بتا دیا:

﴿وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ﴾ [الانعام:۹۹]

وہ ایک سبز مادہ جو ہم نے پیدا کیا ہے وہ دانوں کو جوڑتا ہے۔ تو قرآن پاک نے تو اس کی پہلی خبر دے دی۔ یہ تو چودہ سو سال کی تحقیقات کے بعد وہاں جا کر پہنچے ہیں۔ آج دنیا بڑا زور لگا رہی ہے کہ ہم چاند پر پہنچ گئے اور اللہ نے قرآن میں پہلے فرما دیا:

﴿وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

[الاعراف:۵۴]

جیسے زمین کو ہم نے تمہارے لیے تابع کر دیا ہے، ایسے تارے بھی ہم نے تمہارے لیے مسخر کر دیے۔ اللہ کے قرآن نے اس کے بارے میں پہلے خبر عطا فرما دی تو کسی بھی نظر سے جب دیکھا جائے تو لازماً ہمیں اس نتیجے پر پہنچنا ہوگا اور اقرار کرنا ہوگا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، کسی بندے کا کلام نہیں، کسی بشر کا کلام نہیں، بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے اور کلام برحق ہے۔

اور علماء نے فرمایا کہ قرآن کا یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ آج تک محفوظ ہے، قیامت تک بھی محفوظ رہے گا اور اس کی حفاظت کا ذمہ دار اللہ ہے۔

قرآن کا کفار کو چیلنج:

حضور ﷺ کے زمانہ میں مسیلمۃ الکذاب نے اور اسود عنسی اور ''ثَلَاثُوْنَ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ'' نے قرآن کو

مٹانے کی کوشش کی، روافض کا فتنہ پیدا ہوا اور خوارج کا فتنہ پیدا ہوا۔ انہوں نے قرآن میں تحریف اور تبدیلی کی کوششیں کی، لیکن تمام کوششیں ناکام ہو گئیں، ان کو رسوا کر گئیں اور اللہ کا قرآن جیسے اترا تھا اور جیسے اس دن محفوظ تھا اسی طرح آج بھی محفوظ ہے اور اسی طرح قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اس لیے میرے اللہ نے ان آیات میں ارشاد فرمایا کہ میرے مدنی! آپ ان کفار کو تحدی کریں اور چیلنج کریں، قرآن نے مکہ میں بھی چیلنج کیا اور قرآن نے مدینہ میں بھی چیلنج کیا۔ قرآن نے پہلے یہ چیلنج کیا کہ تم پورا قرآن نہیں بنا سکتے ہو تو چلو دس سورتیں بنا کر لے آؤ، پھر قرآن نے یہ چیلنج کیا کہ اگر تم دس سورتیں بھی نہیں بنا سکتے تو ایک سورت بنا کر لے آؤ، پھر قرآن نے انہیں یہ چیلنج کیا کہ اگر ایک سورت بھی نہیں بنا سکتے ہو تو ایک آیت بنا کر لے آؤ۔ قرآن نے ایک جگہ چیلنج نہیں دیا اور تمام چیلنج کرنے کے بعد اللہ نے ایک فیصلہ فرما دیا کہ میرے مدنی! آپ اعلان فرما دیں:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ [الاسراء:۸۸]

میرے اللہ نے فرمایا کہ اگر سارے بندے اور سارے جن جمع ہو جائیں کہ قرآن کے مقابلہ پر بنا کر لے آئیں تو ہرگز مقابلہ کر کے نہیں آ سکتے، چاہے سب ایک دوسرے کی مدد کیوں نہ کریں، معاونت کیوں نہ کریں، لیکن اللہ کے قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

وقود کا معنیٰ:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر ہیں جو کافروں کے لیے تیار کر دی گئی ہے۔ "وَقُوْدُ" واؤ کے زبر کے ساتھ، مَايُلْقٰى فِي النَّارِ کہ جو آگ میں ڈالا جاتا ہے آگ کو بھڑکانے کے لیے، جیسے آگ میں لکڑیاں وغیرہ ڈالی جاتی ہیں، تا کہ آگ بھڑک جائے، اس کو "وَقُوْدُ" کہتے ہیں۔ اور جہنم کا "وَقُوْدُ" انسان اور پتھر ہوں گے، جیسے اللہ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ [الجن:۱۵]

جو لوگ ظلم کرنے والے ہیں وہ جہنم کے لیے ایسے ہوں گے جیسے جہنم کی لکڑیاں۔

اور جیسے اللہ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ [الانبیاء: ۹۸،۹۹]

فرق:

اور اسی سے ایک مسئلہ یہ بھی سمجھ لیں کہ جنت اور جہنم دونوں مخلوق ہیں اور دونوں اللہ پیدا فرما چکے ہیں، یعنی اس وقت جنت بھی موجود ہے اور جہنم بھی موجود ہے۔ اور اسی طرح عقیدہ اہل سنت والجماعت میں ہے کہ جنت آسمانوں میں بنائی گئی ہے، جیسے حدیث پاک میں اس کی تائید ہوتی ہے۔ میرے آقا ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْأَلُوهُ الْفِرْدَوْسَ)) [مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۳۷۸۷، کتاب الجہاد]

جب تم اللہ سے جنت کا سوال کرو اور جب اللہ سے جنت مانگو تو فردوس اعلیٰ مانگا کرو، کیونکہ وہ سب سے بڑی جنت ہے اور سب سے اعلیٰ جنت ہے، ورنہ اللہ کے ہاں تو کئی جنتیں ہیں: جنت النعیم ہے، جنت عدن ہے، جنت الخلد ہیں اور جنت الفردوس ہے وغیرہ وغیرہ۔

جنت الفردوس کے بارے میں علماء نے فرمایا ہے کہ ساتوں آسمان گویا کہ اس کی زمین ہے اور اللہ کا عرش معلّٰی گویا کہ اس کی سب سے نیچے ہے۔ اور بعض روایات میں یہ بھی اشارات ملتے ہیں کہ جہنم تو موجود ہے، لیکن اس میں مزید اضافات، یہ جو سمندر ہے، قیامت جب آئے گی تو اللہ شمس و قمر کو بھی اور نجوم سیارات سب کو آگ کی صورت میں بھڑکا دیں گے۔ پھر یہ پانی گرم ہو کر آگ بن جائے گا اور پھر نیچے جو جہنم موجود ہے اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے، لہٰذا سب کا سب جہنم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں اور ہر مسلمان کو پناہ دیں۔

فرقہ معتزلہ کا نظریہ:

لیکن فرقہ معتزلہ فرقہ ضالہ ہیں۔ ان کے عقیدے میں یہ ہے کہ بعض فرقہ معتزلہ کہتے ہیں: جہنم موجود نہیں ہے اور جنت موجود نہیں ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ قیامت میں پیدا فرمائیں گے۔ یعنی بعض معتزلہ کی جماعتوں کا یہ عقیدہ ہے اور بعض فرق معتزلہ کا بالکل ہی یہ عقیدہ ہے کہ جنت اور جہنم کا وجود ہی نہیں ہے۔ اسی لیے پھر وہ عذاب قبر کے منکر ہیں۔ کہتے ہیں کہ عذاب قبر نہیں ہوتا۔ بس انسان مر جاتا ہے اور مرنے کے بعد وہ مٹی میں مل جاتا ہے اور بات ختم ہوگئی۔ اگر وہ مومنین سے ہے تو اس کی روح اعلیٰ علیین میں چلی جاتی ہے اور کافر کی روح ہے تو وہ سجین میں چلا جاتی ہے۔

اس قبر کے اندر جب کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے تو عذاب کس کو ہوتا ہے؟ تو وہ عذاب قبر کے بھی منکر ہیں، لیکن عقیدہ اہل سنت والجماعت یاد رکھیں کہ عذابِ قبر ہوتا ہے، مگر نظر نہیں آتا، اس لیے کہ اس کا تعلق عالم الغیب سے ہے۔ اور دنیا میں جتنی سزائیں مرتب ہوتی ہیں وہ بدن پر ہوتی ہیں۔ ہمیں نظر نہیں آتا، روح متاثر ہوتی ہے، یعنی اگر چور کا ہاتھ کاٹا جائے، کسی ڈاکو کی ٹانگ کاٹی جائے، کسی قاتل کی گردن کو کاٹ دیا جائے تو اب ظاہراً تلوار ہاتھ پر لگی، تلوار تو ٹانگ پر ماریں گے، تلوار گردن پر ماریں گے اور روح متاثر ہو رہی ہے اور روح ہمیں نظر نہیں آ رہی، اسی طرح عذابِ قبر کا حکم جسم کے ساتھ روح پر بھی مرتب ہوتا ہے، چاہے ہمیں جسم نظر آئے یا نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر ذرہ اپنی جگہ پر موجود ہوتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک دفعہ میت ہمارے سامنے رکھ دی جائے اس کو عذاب بھی ہو رہا ہو، لیکن ہمیں پتہ نہ ہو تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے آگے یہ بھی مشکل نہیں ہے۔

جیسا کہ خواب کی کیفیات میں اللہ نے ہمیں دکھلایا ہے کہ بعض اوقات دو آدمی ایک کمرے میں سو رہے ہیں: ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ مجھے عذاب ہو رہا ہے اور ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ باغوں میں مزے کر رہا ہوں۔ مگر ہمیں تو کچھ بھی نظر نہیں آتا، نہ باغ نظر آتا ہے اور نہ عذاب نظر آتا ہے، حالانکہ جب وہ اٹھتا ہے تو اس خواب سے گھبرایا ہوا ہوتا ہے یا خوش ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ بھی ہوا ہے کہ خواب سے جب بیدار ہوئے تو زخم کے نشان بھی ان پر پائے گئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں نمونہ دکھلایا ہے کہ اگر زندگی میں تم جیتے جاگتے ایک کمرے میں سوئے ہوئے پتہ نہیں کر سکتے تو تم مردے کے عذاب کا کیسے پتہ کر سکتے ہو؟ میں اپنی قدرت سے عذاب دیتا ہوں، جیسے میری مرضی آئے۔ میرے علم کے اندر ہر چیز ہے، جنت اور جہنم ہر چیز تیار ہو چکی ہے۔

اسی طرح عقیدہ اہل والجماعت میں یہ ہے کہ جنت بھی موجود ہے اور جہنم بھی موجود ہے۔ جہنم کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

﴿أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۴]

''کافروں کے لیے تیار کر دی گئی ہے۔''

اور جنت کے لیے کہہ دیا گیا:

﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۳]

''متقین کے لیے تیار کر دی گئی ہے۔''

اور پھر سب سے بڑی شہادت ہمارے آقا سرکار مدینہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے کہ اللہ پاک نے مجھے معراج والی رات جنت کی سیر کرائی ہے اور میں نے جنت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا گھر دیکھا، میں نے حضرت امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا گھر دیکھا اور میں نے جنت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے چلنے کی آوازیں سنیں۔اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے جہنم میں ان لوگوں کو جو زنا کرتے ہیں عذاب ہوتا ہوا دکھلایا گیا،ان لوگوں کو جو سود کھاتے ہیں عذاب ہوتا ہوا دکھلایا گیا،ان لوگوں کو جو چغل خور ہوتے ہیں عذاب ہوتا ہوا دکھلایا گیا، ان لوگوں کو جو مولوی ہو کر حق نہیں کہتے عذاب ہوتا دکھلایا گیا۔جب میرے آقا ﷺ خود بچشم ذات ملاحظہ فرما کر گواہی دے رہے ہیں، پھر اگر کوئی نہ مانے تو گویا اس کا نبوت پر ایمان نہ رہا۔اور اسی طرح میرے آقا ﷺ نے یہ بھی گواہی فرمائی: ایک دفعہ حضور ﷺ گزر رہے تھے کہ راستے میں دو قبریں تھیں۔حضور ﷺ رک گئے اور فرمایا:

((إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ))

ان دو قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے اور عذاب بھی ان کو ایسے گناہ میں ہو رہا ہے جن کو یہ بڑا نہیں سمجھتے تھے،یعنی یہ خیال کرتے تھے کہ یہ معمولی گناہ ہے،اس میں اللہ نے ان کو پکڑ لیا۔اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنے ایک صحابی کو حکم دیا کہ سامنے ایک کھجور کا درخت تھا کہ وہاں سے جا کر کھجور کی چھڑیاں لے کر آؤ۔وہ کھجور کی چھڑیاں لے آئے، ہر ایک کو حضور ﷺ نے دو ٹکڑے کیا اور ایک اس قبر پر لگا دی اور ایک دوسری قبر پر لگا دی۔اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنے اللہ سے امید کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان چھڑیوں کے ذکر اللہ کرنے کی وجہ سے ان کے عذاب میں تخفیف فرما دیں گے۔[صحيح البخاري، حديث:٢١٨، باب:ما جاء في غسل البول]

حضور ﷺ نے جب اپنی آنکھوں سے عذاب ہوتا ہوا دیکھ لیا اور اس لیے میرے پاک نبی ﷺ نے فرمایا: جب عذابِ قبر ہو رہا ہوتا ہے تو اس عذاب کو ہر چیز سنتی ہے،مگر انسان اور جن نہیں سنتے۔یعنی جانور بھی سنتے ہیں، چرند اور پرند بھی سنتے ہیں،لیکن صرف اللہ نے انسانوں کو اور جنوں کو سننے سے بچا لیا ہے۔
[صحیح البخاری، حدیث:١٣٧٤،باب:ما جاء في عذاب القبر]

فرمایا: وجہ یہ تھی کہ اگر انسان بھی عذاب کو سن لیتے تو کون اپنے باپ کو بھائی کو قبر میں جا کر دفن کرتا؟ اللہ تعالیٰ نے ایک راز رکھ لیا کہ انسانوں کو پتہ نہ لگے۔اب آگے اگر عذاب ہے تب بھی ہمیں کوئی پتہ نہیں یا وہ جنت میں ہے تب

بھی ہمیں کوئی پتہ نہیں، لیکن کبھی کبھی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کو نمونے بھی دکھا دیتے ہیں، کبھی کبھی رحمت کے نمونے بھی دکھا دیتے ہیں۔ [سنن النسائي، حديث: ٢٠٥٨، عَذَابُ الْقَبْرِ]

بعض قبروں سے خوشبو:

جیسے امام بخاری رحمہ اللہ کے دفن کے بعد ان کی قبر سے کئی دن تک خوشبوئیں آتی رہیں اور اسی طرح حضرت احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کی قبر سے بھی سنا ہے، میں نے تو نہیں دیکھا، لیکن سینکڑوں آدمیوں نے یہ بات بتائی ہے اور ایسے لوگوں نے بتائی جن سے جھوٹ کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ ان کی قبر سے بھی خوشبو آتی رہی۔ اور اسی طرح کے ایسے واقعات سینکڑوں ہو چکے ہیں کہ مدتوں کے بعد قبر کو کھولا گیا، لاش اندر بالکل صحیح سالم تھی، اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں آئی تھی اور باقاعدہ اس کو سینکڑوں ہزاروں آدمیوں نے دیکھا، یہ نہیں کہ ایک دو تین چار، بلکہ ہزاروں آدمیوں نے دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نمونے دکھلا دیتے ہیں کہ کوئی جاہل آدمی اعتراض نہ کر سکے۔

قبروں پر چھڑیاں اور پھول وغیرہ ڈالنا، لیکن یہ بھی یاد رکھیں کہ بعض ہمارے بھائیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کھجور کی ٹہنی کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے قبر پر لگانے سے ایک مسئلہ نکالا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس لیے ہم محرم میں جاتے ہیں، وہاں قبروں پر مٹی نئی ڈال دیتے ہیں اور لیپا پوچا بھی کر دیتے ہیں۔ کوئی وہاں کھجور کے پتے ڈال دیتا ہے اور کوئی دال، کوئی وہاں پھول ڈال دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالا تھا تو یہ سنت ہو گئی ہے، اسی لیے ہم وہاں پھول چڑھاتے ہیں اور کھجور کی ٹہنیاں کاٹ ڈالتے ہیں تو وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے ان قبروں پر ٹہنیاں لگائی ہیں تو پھر ہم کھجور کی ٹہنیاں کیوں نہ ڈالیں؟ تو یہ بالکل جہالت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے حال پر رحم فرمائیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ ٹہنیاں کیوں لگائیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے دکھلایا ہے کہ ان قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے تو کیا تم اس لیے ڈالتے ہو کہ تمہیں بھی عذابِ قبر دکھلایا گیا ہے کہ ان کو عذابِ قبر ہو رہا ہے؟ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تو اللہ نے ایک بات کو کھول دیا اور اس عذاب کی تخفیف کے لیے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عمل فرمایا، ہمیں کیا پتہ ہے......نعوذ باللہ...... کہ عذاب ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا؟ اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ جو برکت میرے مدنی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں ہو سکتی ہے وہ کسی بندے کے ہاتھ میں ہو سکتی ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک میں ہے۔

اس سے ایسے استدلال کر کے لوگوں نے ایک رواج بنالیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ آج پھولوں کی چادریں چڑھائی جاتی ہیں اور لاکھوں روپے کے پھول مزاروں پر بکتے ہیں، یعنی اب اگر روزانہ پھولوں کا حساب کریں تو اتنی رقم غریبوں میں خرچ کر دیں تو اس محلہ میں کوئی غریب بھی نہ رہے۔ اب تو ایک رواج بن گیا ہے۔ جتنے بڑے آدمی کی قبر ہوگی اتنی چادر بھی بڑی۔ اور پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ چادر چڑھانے والا مسلمان ہو، انگریز آئے تو وہ بھی آ کر قبر پر چادر چڑھائے گا اور مسلمان جائے تو وہ بھی کافروں سادھیوں کی قبر پر جا کر چادر چڑھائے گا...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... یہ تو بالکل ہندوؤں کی رسم تھی جس سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جس پر راضی ہوتے ہیں اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے تو چاہے تم اس کی قبر پر پھول چڑھاؤ یا نہ چڑھاؤ، وہ جنت کا ٹکڑا ہے اور جس پر اللہ ناراض ہوتے ہیں چاہے تم اس کی قبر پر لاکھوں پھول چڑھاؤ وہ جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہوتا ہے۔ اس لیے حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ مرنے کے بعد دو کیفیتیں ہوتی ہیں:

((إِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ.))

''یا تو اللہ تعالیٰ قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دیتے ہیں یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا بنا دیتے ہیں۔''

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۴۶۰]

اصل مدار یہ ہے کہ عقیدہ توحید صالح اور توحید خالص پر موت آئے۔ اگر موت آئی ''مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کی موت کلمہ شہادت پر آ گئی تو ''دَخَلَ الْجَنَّةَ'' اللہ کی رحمت سے گویا وہ جنت میں داخل ہوگیا، یعنی پہلی منزل آسان ہوگئی تو آگے آسانی ہے کہ جب پہلے معافی دے دی تو اس کے بعد نہیں پکڑیں گے، لہٰذا یہ علامت ہے کہ آگے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر رحمت فرما دیں گے۔

[سنن أبي داود، حديث: ۳۱۱۶، باب: في التَّلْقِيْن]

اور اسی حدیث مبارک سے یہ بھی سمجھیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ نے ان پتھروں کو اس دن سے پیدا کیا جب اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور ان پتھروں کو آسمان دنیا پر رکھا گیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۱، البقرة، الآیة: فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا]

اور اسی سے اس آیت کو بھی سمجھیں کہ جب حضرت لوط علیہ السلام کی بستیوں پر عذاب آیا اللہ نے فرمایا:

﴿فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِنْ سِجِّيلٍ مَنْضُودٍ﴾ [ھود: ۸۲]

حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم ملا کہ ان بستیوں کو اٹھا کر آسمانوں کی طرف لے آؤ۔ وہ جب آسمانوں پر لے گئے تو حکم ملا کہ ان کو اوندھا کر کے گرا دو۔

﴿وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ﴾

اور حکم دیا گیا کہ ان پر آگ میں پکے ہوئے پتھر اوپر سے برسائے جائیں، کیونکہ وہ جہنم کے پتھر آسمان دنیا پر رکھے ہوئے ہیں، لہٰذا ان پر بھی انہی میں سے برسائے گئے اور اسی سے علماء کرام نے استدلال فرمالیا، اس لیے یہ روایت صحیح ہے اور علی شرط الشیخین ہے، یعنی امام بخاری اور امام مسلم کی شرط کے مطابق ان کی سند ہے۔

جہنم کے عذاب والے پتھر:

حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور ایک جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ جہنم کے اندر وہ پتھر سیاہ رنگ کے ہوں گے جن سے جہنم والوں کو عذاب دیا جائے گا۔ وہ پتھر کبریت یعنی گندھک کے ہوں گے اور بدبو ایسی ہوگی جیسے کسی مردار جانور کی بدبو ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس دن آسمان وزمین کو پیدا کیا تھا اسی دن ان پتھروں کو بھی پیدا کیا تھا۔ یہ پتھر آسمان دنیا پر ہیں اور جہنم کے وہ پتھر اس دنیا کے پتھروں سے بڑے ہوں گے اور سخت بھی ہوں گے۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ جن پتھروں کی دنیا میں آج کافر عبادت کر رہے ہیں ان پتھروں کو اللہ جہنم میں ڈالیں گے، تاکہ کافروں کو زیادہ تکلیف ہو اور کافروں کے ساتھ ان کو عذاب دیا جائے گا۔ اور یہ دونوں روایتیں صحیح ہیں، یعنی ایک تو خاص اللہ نے جہنم کے لیے پتھر بنایا، جیسے بعض بھٹیاں کوئلے سے چلتی ہیں، بعض بھٹیاں گیس سے اور بعض بھٹیاں الیکٹرک سے چلتی ہیں۔ تو جہنم کی بھٹی کا اصل ایندھن انسان اور پتھر ہیں جو اللہ نے تیار کیے ہیں اور یہ پتھر جن کو کفار نے خدا بنایا ہوا ہے اللہ ان کو اسی میں ڈال دیں گے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ اور علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، پتھروں سے تو دنیا میں بھی آگ حاصل کی جاتی ہے۔

مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں کہ صرف یہ کہنا کہ جن پتھروں کی عبادت کی گئی صرف انہی کو ڈالا جائے گا، یہ بات صحیح نہیں، بلکہ اللہ نے وہ خاص پتھر تیار کیا ہے جس کو بھڑکایا بھی حجارہ کبریت (شاید گندھک کا پتھر مراد ہے) کے

ساتھ جائے گا۔ تو جو آگ اس پتھر سے بھڑکائی جائے وہ کتنی شدید ہوگی اور اس کی ڈگری کے اندر کتنی قوت بڑھ جائے گی!! پھر دنیا کے اندر بھی پتھروں سے آگ حاصل کرنا مشاہدہ ہے، جیسے جس یہ بھی پتھر ہوتا ہے، پھر اس کو آگ میں گرم کر کے بنایا جاتا ہے۔

اور اسی طرح کئی کافروں کے لیے وعید بیان کی ہے کہ ایسی جہنم ہے جس کا ایندھن پتھر اور انسان ہوں گے۔ تو جب اس آگ کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے تو اس کی لپیٹیں اور شعلے کیسے سخت ہوں گے!!! جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا﴾ [الاسراء: ۹۷]

''جب بھی وہ آگ کچھ کمزور ہوگی تو اور بڑھادی جائے گی۔''

اور اسی کو قرطبی رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے کہ اس کے شعلے زیادہ شدید ہوں، تا کہ وہ جہنم والوں کے لیے زیادہ سے زیادہ عذاب کا ذریعہ بنے۔

ایک حدیث پاک یہ بھی نقل کی گئی ہے:

((كُلُّ مُؤْذِيْ فِي النَّارِ)) [الجامع الصغیر للسیوطی، حدیث: ۶۳۴۴]

''ہر ایذاء دینے والی چیز جہنم میں موجود ہوگی۔''

لیکن یہ حدیث صحیح نہیں ہے اور اس کی سند کا بھی کوئی حصہ موصول نہیں ہوسکا ہے۔

مفسرین نے فرمایا: اس کے دو ترجمے ہیں:

- ......ایک ترجمہ تو یہ ہوگا کہ جو ایذاء پہنچائے وہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔
- ......اور دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ ہر ایذاء دینے والی چیز جہنم میں ہوگی، تا کہ وہ اور زیادہ سے زیادہ عذاب کا سبب بنے۔

﴿أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۴]

''اُعِدَّتْ'' کی ضمیر کے بارے میں بعض علماء نے فرمایا کہ یہ ضمیر جہنم کی طرف راجع ہے، یعنی وہ جہنم تیار کردی گئی ہے۔

اور بعض نے فرمایا کہ ضمیر ''حِجَارَةُ'' کی طرف راجع ہے کہ وہ پتھر کافروں کے عذاب کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔

مفسر ابن کثیر ﷫ نے فرمایا کہ ان دونوں قولوں کے اندر کوئی منافات نہیں ہے کہ جہنم بھی تیار ہے اور اس کا ایندھن بھی تیار ہے اور وہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو کافر ہیں اور جن کی موت کفر پر آئے گی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ٦١، البقرة، آلایة: فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا]

حضور اکرم ﷺ کو معلم اور مجنون کہنے کی وجہ:

جن مخالفین نے، کفار ومشرکین نے اور یہود ونصاریٰ نے مختلف الزام لگائے ان الزام کا خلاصہ یہ تھا کہ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے، بلکہ......نعوذ باللہ...... اساطیر الاولین، پرانے قصے کہانیاں ہیں۔ اور بعض لوگوں نے کہا:......نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ کہ حضور ﷺ کسی دوسرے سے سیکھتے ہیں اور ان سے سیکھنے کے بعد وہ لوگوں کو سنا دیتے ہیں اور ساتھ یہ بھی ہے کہ یہ دیوانہ اور مجنون بھی ہے۔

یعنی یہ دو الزام لگے اور اس الزام کا پس منظر بھی آپ یاد رکھیں۔ اصل وجہ یہ تھی کہ باہر کے دو نوجوان لڑکے تھے، اللہ نے ان کو ہدایت نصیب فرما دی اور وہ اسلام لے آئے اور وہ دور دراز کے کسی دوسرے ملکوں کے رہنے والے تھے اور دوسری زبانوں کے جاننے والے تھے اور بالکل نوجوان تھے اور دونوں بھائی تھے اور دونوں کو اللہ نے اسلام کی دولت سے مالا مال فرما دیا۔ تو حضور ﷺ ان سے زیادہ شفقت فرماتے تھے اور ان کی دلجوئی فرماتے کہ ایک تو پردیسی ہیں اور مسافر ہیں، دوسرے ملک کے رہنے والے ہیں، پھر اسلام بھی لے آئے تو اس وجہ سے کافروں نے ایک کہانی گھڑی کہ دراصل......نعوذ باللہ...... حضور ﷺ ان سے سیکھ کر ہمیں سنا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کا قرآن ہے۔

اور دوسرا الزام یہ لگایا کہ......نعوذ باللہ...... مجنون ہیں کہ اللہ کا نبی دیوانہ ہے۔ دیوانہ سے یہ مراد نہیں تھی جیسے کہتے ہیں کہ جس کی عقل نہ ہو، لیکن وہ مجنون اس معنی میں نہیں لیتے تھے، کیونکہ حضور ﷺ کو تو اللہ نے کمال عقل عطا فرمائی تھی، حضور ﷺ باعتبار صورت کے، باعتبار سیرت کے اور باعتبار جمال کے، صداقت کے، امانت کے اور دیانت کے دشمنوں کے سامنے بھی مسلم تھے، یعنی حضور ﷺ کی امانت اور دیانت کے مکہ کے کافر بھی قائل تھے۔ تو مجنون کہنے کا معنی یہ تھا کہ جب وہ اللہ کے قرآن کی خبر سنتے کہ حضور ﷺ نے تلاوت کی ﴿الٓمٓ ۝١ غُلِبَتِ الرُّومُ ۝٢﴾ [الروم: ۱، ۲] تو جب وہ یہ خبریں سنتے کہ حضور ﷺ مکہ میں بیٹھ کر روم کی شکست کے بارے میں، فارس

کی فتح کے بارے میں اور پھر روم کی فتح کے بارے میں خبر عطا فرما رہے ہیں اور اسی طرح جب حضور ﷺ ان کو خبر دیتے کہ ایک ایسا وقت آئے گا کہ دین اسلام تمام ادیان پر غالب آجائے گا، تمام ادیان مٹ جائیں گے اور دین اسلام کو غلبہ نصیب ہوجائے گا اور اسی طرح جب وہ سنتے کہ آپ اپنے صحابہ سے فرماتے کہ صبر کرو اور قوت برداشت پیدا کرو، ایک ایسا وقت آئے گا کہ سرزمینِ حجاز سے لے کر صنعاء (یمن کے علاقہ تک) کوئی عورت اکیلے سفر کرے گی، ماسوائے اللہ کے خوف کے اس کو کسی دوسری چیز کا ڈر نہیں ہوگا، اسلام کی وجہ سے اتنا علاقائی امن پیدا ہوجائے گا۔ اسی طرح جب وہ کافر سنتے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سراقہ! میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں کہ ایک وقت آئے گا کہ کسریٰ بادشاہ کے ہاتھ کے کنگن تم پہنو گے۔ جب کافر یہ باتیں سنتے تو کہتے کہ یہ تو مجنون ہے کہ ان کے ساتھ چالیس پینتالیس آدمی مسلمان ہیں اور ان کا یہ بھی عالم ہے کہ وہ گھروں سے باہر نہیں نکل سکتے، ان کا بھی یہ عالم ہے کہ اکثر غلام ہیں اور کافروں کے ہاتھ میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان کو ایک وقت کا کھانا بھی نہیں ملتا اور ادھر کبھی کسریٰ کی خبر دیتے ہیں اور کبھی فارس کی اور کبھی روم کی خبر دیتے ہیں، ......نعوذ باللہ...... یہ دیوانگی ہے۔ جیسے کوئی مجذوب آدمی بیٹھ کر ایسی باتیں کہتا رہتا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تو ان کفار کا مجنون کہنے کا مقصد یہ تھا، وگرنہ وہ سارے کے سارے بے قوف تو نہیں تھے کہ اللہ کے نبی کو جو اتنی عقل والا ہے، مجنون کہہ دیں؟ کیونکہ یہ باتیں ان کو سمجھ میں نہیں آتی تھیں کہ ایک یتیم مکہ میں اکیلا ہے اور چند افراد اس کے ساتھ ہیں اور وہ افراد بھی کوئی دولت والے نہیں ہیں، طاقت والے نہیں ہیں اور پھر حضور ﷺ خبر دے رہے ہیں کہ کہ پوری دنیا پر اسلام غالب آجائے گا۔ وہ تو ابھی مکہ میں غالب نہیں آیا تو پوری دنیا پر کیسے غالب آجائے گا؟ اس لیے وہ اس بہانے سے کہتے تھے کہ......نعوذ باللہ......مجنون ہیں۔

اور تیسرا الزام وہ حضور ﷺ پر یہ لگاتے تھے کہ جیسے کاہن لوگ ہوتے ہیں، غاروں میں پڑے ہوتے ہیں اور وہ بیٹھ کر کوئی خبر دیتے ہیں، اسی طرح حضور پاک ﷺ بھی خبر دیتے ہیں۔ یہ بھی کہانت ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی تصدیق کے لیے فرشتے کیوں نہیں اترتے......؟

بہر حال ان اعتراضات پر اگر دلائل عقل سے اور دلائل نقل سے کام لیا جاتا تو یہ کافر نہ مانتے، کیونکہ اگر اللہ فرشتے بھی اتار کر بھیج دیتا، وہ آکر کہتے کہ ان کو مانو، یہ سچا نبی ہے، تب بھی یہ نہ مانتے۔ کہتے کہ ہمیں کیا پتہ یہ فرشتہ بھی ہے یا نہیں؟ ہمیں کیا پتہ کہ یہ جن ہے یا فرشتہ ہے؟ اگر نہ ماننا ہو تو ہزار بہانے ہیں۔ اب اگر یہ فرشتہ اترتا ہے تو

لازمی بات ہے یا تو انسان کی شکل میں آتا یا وہ اپنی شکل میں آتا۔ اگر اپنی شکل میں آتا تو کوئی دیکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتا اور اگر انسان کی شکل میں آجاتا تو کہتے کہ ہمیں کیا پتہ یہ بھی تو بشری لباس پہن کر آگیا ہے، ہمیں تو پتہ نہیں کہ کون ہے؟ ہم اس کو جانتے نہیں ہیں تو اس کی بات کو کیسے مان لیں؟ تو میرے اللہ نے ایک ایسا انتظام فرمادیا کہ تحدی فرمادی کہ چلو تمہارے سارے الزام اپنی جگہ پر۔ ایسا کرو جب تمہارے کہنے کے مطابق یہ بھی ایک انسان کا کلام ہے تو تم بھی تو انسان ہو تو اس کے مقابلہ پر ایک سورت لے آؤ۔ یہ ایک ایسا جواب تھا کہ جس کا دشمنوں کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ کھلی بات ہے کہ دو اور دو چار ہیں اور دو اور دو پانچ کبھی نہیں ہو سکتے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا:

﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ﴾

اس میں ''بِسُورَةٍ'' نکرہ ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ قرآن کی سورتیں تین حیثیت ہیں: بعض طوال، بعض اوساط اور بعض قصار۔ یعنی بالکل چھوٹی سورتیں۔ جیسے ﴿إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ①﴾ [الکوثر:۱] ﴿وَالْعَصْرِ ① إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ②﴾ [العصر:۱،۲] بالکل چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں۔ تو مفسر فرماتے ہیں: یہ چیلنج صرف کسی بڑی سورت کے لیے نہیں تھا، بلکہ تمام قسم کی سورتوں کو شامل ہے۔ تمام دنیا زور لگانے کے باوجود ایک چھوٹی سی سورت کا بھی مقابلہ نہ کر سکے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۱، البقرة، آلایة: فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا]

جیسا کہ تواریخ میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے سورۃ الکوثر لکھ کر اللہ کے کعبہ میں لٹکا دی...... پرانے دور میں یہ رواج تھا کہ بڑے بڑے شعراء اپنے اشعار اور قصائد لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیتے تھے۔ یہ چیلنج ہوتا تھا دوسرے شاعروں کے لیے کہ تم بھی اس جیسی کوئی بات لکھو...... تو ایک آدمی نے یہ سورت وہاں لٹکا دی اور چیلنج کیا شاعروں کو کہ تم بھی اس جیسی بات لکھو۔ اب بڑے بڑے شاعر آرہے ہیں، دیکھ رہے ہیں، غور کر رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں، لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے اعتراف کیا:

''وَاللهِ لَيْسَ هٰذَا مِنْ كَلَامِ الْبَشَرِ''

خدا کی قسم! یہ کلام کسی بندے کا نہیں ہوسکتا کہ ایک آیت میں خبر ہے، دوسری آیت میں امر ہے، تیسری آیت میں نہی ہے، چوتھی آیت کے اندر وعد ہے اور پانچویں آیت کے اندر وعید ہے۔ یہ تو اللہ کا کلام ہے جو حکم جاری کر رہا ہے۔

قرآن کریم کے اوصاف:

یعنی ایک آیت مبارکہ کا آپ مطالعہ کریں گے تو وہاں اللہ نے مومنوں کے لیے جنت کے وعدے فرمائے ہیں، جنت کی بشارات دی ہیں۔ اس کے بعد پھر کفار کے لیے وعید ہے تو اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے سابقہ امم کے واقعات اور قصص ہیں۔ اس کے بعد جب آگے پڑھیں گے تو امر ہے، نہی ہے، حکم دیا جا رہا ہے کہ یہ کام کرو اور حکم دیا جا رہا ہے کہ یہ کام نہ کرو۔ یہ شاعر کا کام تھوڑا ہے کہ وہ کسی کو حکم دیتا ہے کہ یوں کرو اور یوں نہ کرو، بلکہ شاعر تو توصیف اور مدح باندھتا ہے، لیکن جس کے اندر امر بھی ہو، نہی بھی ہو، وعد بھی ہو، احکام بھی ہوں، بیان بھی ہوں، قصص بھی ہوں، مسائل مہمہ بھی ہوں، توحید بھی ہو، نبوت بھی ہو اور قیامت بھی ہو تو اللہ کا کلام ہی یہ حکم دے سکتا ہے۔ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی پیدا ہو جائے کیا وہ کہہ سکتا ہے ﴿وَقِيلَ يَٰٓأَرۡضُ ٱبۡلَعِي مَآءَكِ﴾ [ھود: ۴۴] زمین! اپنا پانی پی لو۔ بھلا کوئی شاعر زمین کو حکم جاری کر سکتا ہے کہ پانی اپنا واپس کر لو۔ اب یہ کوئی طاقت حکم دے رہی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ حکم دے دو، لیکن اگر آگے اس حکم کو ماننے والا نہ ہو تو حکم دینے کا کیا فائدہ؟ میں ایک بات کہوں اور آپ اس کو نہ مانیں تو میرے حکم کا کیا فائدہ؟ لیکن جب وہ اللہ حکم دیتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ تعمیل بھی ہو رہی ہے۔

آپ اندازہ فرمائیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا جا رہا ہے، اوپر سے حکم جاری ہوتا ہے:

﴿قُلۡنَا يَٰنَارُ كُونِي بَرۡدٗا وَسَلَٰمًا عَلَىٰٓ إِبۡرَٰهِيمَ ۝٦٩﴾ [الانبیاء: ۶۹]

آگ کو آخر جو حکم دے رہا ہے وہ آگ کا مالک ہی دے سکتا ہے، ورنہ آگ کسی کا حکم مانتی ہے؟ آپ آگ کے سامنے ہاتھ باندھ کر اور منت کر کے دیکھ لیں، شاید آگ آپ کا کہنا مان لے کہ آج تو مہربانی کر اور ہمارے ہاتھ نہ جلا۔ اور پھر ہاتھ داخل کریں اور دیکھیں کہ ہاتھ جلتا ہے یا نہیں جلتا؟ تو یہ آخر کیا بات ہے کہ اتنی میلوں میں آگ ہے، ڈالنے والے بھی دشمن ہیں اور ایک آدمی بھی مدد کرنے والا نہیں ہے؟



وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اوران لوگوں کوخوشخبری سنادیجیے جوایمان لائے اوراچھے کام کیے کہ ان کے لیے جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جب ان کو وہاں کا پھل کھانے کے لیے ملے گا تو کہیں گے: یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے ملاتھا۔اوران کو ملتے جلتے پھل دیے جائیں گے اوران کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیات مبارکہ میں مؤمنین کے لیے بشارت کا ذکر فرمایا ہے۔ان آیات کا سابقہ آیات سے ربط بڑا واضح ہے۔گزشتہ آیات میں کفار کا ذکر تھا کہ ان کو قرآن کے مثل لانے کا چیلنج کیا گیا، پھران کو جہنم کی وعید سنائی تھی اور اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کا ذکر کیا ہے، کیونکہ ''تُعْرَفُ الْأَشْيَاءُ بِأَضْدَادِهَا'' جب ضدین کا ذکر کیاجائے تو بات واضح ہوجاتی ہے۔اس لیے پورے قرآن میں جہاں کفار، مشرکین اور اہل جہنم کا ذکر آئے گا وہاں مؤمنین، متقین اوراہل جنت کا ذکر آئے گا۔قرآن مجید میں جہاں بھی ایمان کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اعمالِ صالحہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ اسی آیت میں بھی ایسے ہے۔اس سے اشارہ ہے کہ ایمان کے ساتھ نیک اعمال کرنا بھی بہت ضروری ہیں۔

ایک انگریز مؤرخ کے نزدیک حضور اکرم ﷺ کی شخصیت:

آپ اندازہ کریں کہ ابھی ایک انگریز نے کتاب لکھی ہے، بڑی بڑی شخصیات عالم کا اس نے ذکر کیا ہے۔ حالانکہ وہ عیسائی ہے، لیکن وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہلے نمبر پرنہیں لے آیا، بلکہ سب سے پہلے نمبر پراس نے حضرت محمد ﷺ کا ذکر کیا ہے۔اس نے لکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بڑی شان ہے الیکن دنیا میں وہ کامیاب نہ ہوسکے، کوئی انقلاب نہ لاسکے، بلکہ وہ تو خود اتنے مجبور ہوگئے کہ ان کو قتل کرنے کے لیے یہودیت نے گھیرا تنگ کیا تو اللہ نے آسمانوں میں اٹھا کران کی حفاظت کی۔تو وہ دنیا میں اپنے مشن کو کامیاب نہ کرسکے۔اوراس نے لکھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کتنی بڑی شان والے نبی کیوں نہ ہوں!! وہ تو بنی اسرائیل کے لیے بھیجے گئے، ان کی دعوت کوئی عالمی دعوت نہیں تھی

کہ پوری دنیا کو دعوت دیں، بلکہ وہ تو ایک محدود قوم کے لیے تھی۔ اسی طرح اس نے کہا کہ یہودیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان کا بڑا دعویٰ کرتی ہے، لیکن وہ بھی تو صرف بنی اسرائیل میں محدود تھے۔ اسی طرح زبور کے ماننے والے اپنی ایک نسل میں محدود ہیں۔ آج بھی یہودی اپنی نسل کے علاوہ کسی دوسرے کو اصلی یہودی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تو اس نے لکھا کہ جب ہم اس انداز پر نظر ڈالتے ہیں کہ جس کی دعوت بھی عالمی، جس کا دین بھی عالمی اور عالم انسان کی نجات کا پروگرام رکھتی ہے۔ اور اس نے کہا کہ میں جب نظر ڈالتا ہوں دنیا میں بڑے انقلاب آئے، لیکن کہیں معاشی انقلاب آیا، کسی جگہ زیادہ سے زیادہ نظریاتی انقلاب آیا تو سب سے بڑی انقلابی ذات پاک حضرت محمد ﷺ کی ہے، جس نے صرف معاشی نقطے پر انقلاب برپا نہیں کیا، بلکہ جس نے عقیدے میں انقلاب برپا کیا، سیرت میں انقلاب برپا کیا، صورت میں انقلاب برپا کیا اور جس نے پورے عالم امن کے لیے ایک چارٹر حجۃ الوداع کے خطبہ کے اندر موجود ہے دیا۔ اور جس نے عربی اور عجمی دونوں کو برابر مخاطب کیا اور جس کے ہاں یہ مقام تھا کہ ادھر بلال حبشی ہے اور ادھر حضرت عبدالرحمن بن عوف القرشی کی لڑکی ہے، اس سے شادی ہو رہی ہے۔ جس نے غلاموں کو اتنا اونچا کیا، جس نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کا رشتہ بی بی زینب رضی اللہ عنہا سے کیا، یعنی حضرت زید رضی اللہ عنہ غلام اور بی بی زینب رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی پھوپی زاد لڑکی، حضور ﷺ کی اتنی قریبی قرشی النسل، حضرت زید رضی اللہ عنہ کی حضور ﷺ نے اپنے قریبی رشتہ داروں میں شادی کی۔ اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں، ان کا رشتہ بھی حضور ﷺ نے قریشی النسل خاتون کے ساتھ کیا۔ اور اسی طرح حضور ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر بنا کر غلاموں کو اس طرح اونچا کیا۔ اور اسی طرح لونڈیوں کو جو قید ہو کر آئیں تو بی بی صفیہ رضی اللہ عنہا کو اپنی بیوی بنا کر امہات المؤمنین بنا دیا، پوری دنیا کی ماں بن گئی۔ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی بیوی بن گئی۔ تو عیسائی مؤرخ اور انگریز مؤرخ نے کہا کہ میں نے جس پہلو پر نظر ڈالی اور جس انداز میں نظر ڈالی ہے مجھے پورے عالم میں تاریخ انسانیت میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی شخصیت نظر نہیں آئی۔ (لیکن کتاب کو لکھنے کے بعد وہ مسلمان ہو گیا یا نہیں معلوم نہیں ہوا۔)

مختصر تفسیر:

﴿أَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ۖ﴾ [البقرۃ:۲۵]

اللہ نے فرمایا: ان کو بشارت دے دیں کہ ان کے لیے ایسے باغ ہیں کہ جن کے دامن میں نہریں بہتی ہیں۔ ''تَحۡتِ'' کا معنی نیچے ہوتا ہے۔ تو مفسرین کرام نے فرمایا کہ یہ معنی نہیں کہ مکان کے بالکل نیچے نہر ہو، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ جیسے لوگ دریاؤں کے کنارے پر محل بناتے ہیں، اسی طرح ان کے دامن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ حقیقتاً نیچے نہریں ہوں گی اور اوپر محل ہوں گے۔ یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ آج اگر دنیا میں انسان نے سمندروں کے اندر ہوٹل اور گھر بنا لیے ہیں تو اللہ کے لیے کیا مشکل ہے کہ نیچے دریا بھی بہہ رہے ہوں اور اوپر محل بھی موجود ہوں؟ اس لیے فرمایا:

﴿اَنَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ﴾ [البقرۃ:۲۵]

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۲، البقرۃ: الآیۃ: وَبَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ]

اور علماء نے فرمایا: یہاں ''اَنَّ لَهُمۡ'' میں لام ہے کہ تحقیق ان ہی کے لیے ہے جو مؤمن عمل صالح کرنے والے ہیں۔ لام کبھی ملک اور تملیک کا اشارہ کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا: گویا ہم ان جنتوں کا مؤمنوں کو مالک بنا دیں گے۔ اور فرمایا:

﴿كُلَّمَا رُزِقُوۡا مِنۡهَا مِنۡ ثَمَرَةٍ رِّزۡقًا ۙ﴾ [البقرۃ:۲۵]

اللہ نے فرمایا کہ جب کبھی ان کو رزق دیا جائے گا، پھلوں سے رزق دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے باغوں کا ذکر فرمایا، باغ کے بعد ثمرات کا ذکر فرمایا اور جہاں جہاں قرآن میں جنت کا ذکر آیا ہے زیادہ تر پھلوں کا ذکر آیا ہے۔ جنت میں تو بھوک پیاس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہاں تو لذت ہی لذت ہے، اس لیے پھلوں کا ذکر آیا ہے۔

﴿قَالُوۡا هٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ ۙ وَاُتُوۡا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ﴾ [البقرۃ:۲۵]

جب ان کو پھل ملیں گے تو وہ کہیں گے کہ یہ تو ہم نے پہلے بھی کھایا ہے۔ اور ان کو پھل ایسے ملیں گے جو ایک دوسرے کے ہم شکل ہوں گے۔ اس میں دو قول ہیں:

1 ......ایک قول تو یہ ہے کہ مثلاً: آج ہمیں پھل ملے، پھر دوسرے دن ہمیں پھل ملے تو شکل ایک ہوگی، اس لیے وہ فرشتوں سے کہیں گے یہ تو ہم نے کل بھی کھایا تھا اور آج پھر وہی لے آئے ہو؟

2 ......اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہاں جب پھل ملیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو ہم دنیا میں کھا چکے ہیں، کیونکہ ان پھلوں

کی شکل دنیا کے پھلوں کی طرح ہوگی تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے: میرے بندو! یہ تمہارے مزید لطف وسرور کے لیے ہے، کیونکہ یہ بھی لطف وسرور ہے کہ چیز تو مشابہ ہو، لیکن لطف میں زمین وآسمان کا فرق ہو۔
[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۲، ۶۳، البقرۃ: الآیۃ: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَ لَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَ لَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ.)) [صحیح البخاری، حدیث: ۳۲۴۴، باب: مَا فِيْ صِفَةِ الْجَنَّةِ]

''اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لیے ایسی نعمتیں رکھی ہیں کہ کسی آنکھ نے نہیں دیکھیں، کسی کان نے نہیں سنیں اور کسی کے دل میں ان کا خیال تک بھی نہیں گزرا۔''

تکبر کا علاج:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنے خطبوں میں فرمایا کرتے تھے کہ تعجب کی بات ہے کہ انسان کس بات پر اکڑتا ہے؟ اور کس بات پر غرور کرتا ہے؟ فرمایا کہ تیرا سب سے بہتر کپڑا ایک کیڑے کا فضلہ ہے...... سب سے قیمتی کپڑا ریشم ہے اور وہ ایک کیڑے کا گند ہے...... اور تیرا پینے کا بہتر شراب ہے...... اور وہ بھی ایک کیڑے کی گندگی ہے، وہ ایک مکھی سے نکل رہا ہے...... اور فرمایا: تیری اپنی حالت یہ ہے کہ ایک دفعہ یا دو دفعہ اللہ نے مجبور کر دیا کہ بڑے ہو یا چھوٹے، اپنی گندگی پر جا کر بیٹھو گے، اپنے ہاتھوں سے گندگی کو صاف کرو گے...... چلو اب آپ مشین بھی لگا لو، کچھ بھی کر لو، لیکن اس گندگی پر جا کر بیٹھو گے تو سہی۔ تیرے اندر سے ہی گندگی نکلے گی، کسی اور کے اندر سے تو نہیں نکلے گی...... تو فرمایا کہ پتہ نہیں کس بات پر اکڑتا ہے؟ اور فرمایا نتیجہ تیرا یہ ہے کہ مرنے کے بعد تو اتنی بدبودار چیز ہے کہ کوئی گھر میں رکھنے پر تیار نہیں...... ایمان سے بتائیں کہ جب آدمی مر جائے تو اس کو کتنے دن گھر میں رکھو گے؟ کوئی کہتا ہے کہ سنت بھی یہ ہی ہے کہ جلدی اس کو دفن کرو، اس کو رکھنے کا کیا فائدہ ہے؟ اب بھی دفن کرنا اور رات کو بھی دفن کرنا، جلدی کرو۔ اگر دو چار دن رکھ لو تو انجام کیا ہوگا کہ وہاں بیٹھ بھی نہیں سکتے۔ آپ نے دیکھا نہیں! بعض اوقات آدمی قتل ہو جاتے ہیں، پتہ بھی نہیں چلتا، لیکن اندر مکان سے اتنی بدبو اٹھتی ہے کہ کوئی گزر ہی نہیں سکتا...... تو فرمایا کہ تیرا انجام تو یہ ہے کہ زندگی میں تو نے گندگی اپنے پیٹ میں بھری ہوئی ہے اور لباس تیرا یہ ہے اور ماکولات ومشروبات

تیرے یہ ہیں اور تو تکبر کرتا ہے اور میں اور میں کہتا ہے۔

﴿وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ ۙ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ [البقرة:۲۵]

اور مؤمن بندے جنہوں نے عمل صالح کیے ہیں ان کے لیے ہم نے بیویاں رکھی ہیں جو پاک ہیں، یعنی حیض و نفاس سے اور ہر گندگی سے پاک اور معنوی طور پر چغل خوری، بے وفائی، بے حیائی اور ہر برے عمل سے پاک ہوں گی۔

﴿وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ [البقرة:۲۵]

ہم جنت دے کر پھر نکال دیں، یہ شان کریمی کے خلاف ہے۔ کریم کسی کو نعمت دینے کے بعد چھین نہیں لیا کرتا۔ تو تم اس میں ہمیشہ رہو گے، لیکن یہ نعمتیں ان کو ملیں گی جو ایمان والے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/ ۶۳، البقرة: الآیۃ: وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ]

قرآن کی صفت ''مَثَانِي'':

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کو ''مَثَانِي'' کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن نے جب بھی ذکر کیا ہے تو دو چیزوں کا مقابل ذکر کیا ہے، یعنی اگر مومنین کا ذکر کیا ہے تو پھر کافروں کا بھی ذکر کیا ہے، جنت کا ذکر کیا ہے تو پھر جہنم کا بھی ذکر کیا ہے اور اشقیاء کا ذکر کیا تو پھر سعداء کا بھی ذکر آیا۔ تو جب دو چیزیں کا مقابل پر ذکر کیا جائے تو اس کا نام ''مَثَانِي'' ہے۔

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سعداء وہ مؤمنین ہیں ''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَصَدَّقُوْا اِيْمَانَهُمْ بِالْاَعْمَالِ الصَّالِحَةِ'' کہ اعمال صالحہ ان کے ایمان کی تصدیق اور تائید بھی کر رہے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کے اندر انسان نہروں کا تابع ہے، مثلاً: اگر ایک نہر بنانی ہو تو کروڑوں ڈالر وہاں خرچ ہوتے ہیں۔ نہروں سے آگے اس کی تقسیم کے انتظامات کرو، پلیں بناؤ، گیٹ لگاؤ، پانی نکالو، مگر وہاں جو نہریں ہیں مسلمان کے حکم کے تابع ہوں گی۔ مسلمان اشارہ کرے گا کہ اس باغ میں نہر ہو تو وہ ادھر آجائے گی، مسلمان اگر کسی اونچی جگہ پر ہے اور وہ پانی کو کہے تو وہ اوپر آجائے گا:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ﴾ [فصلت:۳۱]

جو تمہاری طبیعت چاہے گی، جو انسان کے دل میں تمنا پیدا ہو گی اور جو تم اللہ سے جنت میں مانگو گے وہ اللہ تمہیں عطا فرما دے گا اور بغیر کسی مشقت کے، بغیر کسی تعب کے، بغیر کسی نصب کے اور بغیر کسی محنت کے حاصل ہو گا۔

اس لیے ایک صحیح حدیث مبارک میں آتا ہے کہ اہل جنت جب جنت میں ہوں گے، مؤمن جنت کے باغوں میں بیٹھے ہوں گے تو ایک خوبصورت پرندہ اس باغ کے اوپر سے پرواز کر کے اڑ رہا ہے۔ اس کی نظر اچانک پڑے گی کہ...... ماشاء اللہ...... بڑا خوبصورت پرندہ ہے! اور اس کا گوشت بھی...... ماشاء اللہ...... بہت اعلیٰ ہو گا۔ وہ کہے گا: اللہ میاں! اس پرندے کے کباب آنے چاہئیں۔ تو کباب فوراً تیار ہو کر آ جائیں گے۔ وہاں تو مانگنے کی یا ارادہ کرنے کی دیر ہے۔ تم نے اللہ کے حکم پر حج کی تکلیفیں اٹھائی ہیں، اب تو تمہارے انعام کا زمانہ ہے تو وہاں جنت کے معاملات ہی نرالے ہوں گے۔ اس لیے میرے آقا ﷺ نے ایک لفظ فرمادیا:

((وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۳۲۴۴، باب: مَا فِي صِفَةِ الْجَنَّةِ]

کسی بشر کے دل و دماغ میں یہ تصور بھی نہیں آسکتا کہ جنت کی نعمتیں کیسی ہوں گی؟ یعنی وہ تو ایسی ایسی چیزیں ہوں گی کہ ہمارے فکر میں بھی نہیں آسکتیں۔

ایک بدو جنگل کے رہنے والے تھے، انہوں نے حضور ﷺ کو کہا: یا رسول اللہ! قیامت والے دن اونٹنیاں بھی ہوں گی؟...... جنگل والے لوگوں کو اونٹوں سے پیار ہوتا ہے...... آپ ﷺ نے فرمایا: بالکل تم اونٹیوں کی تمنا کرو گے تو اونٹنیاں بھی ملیں گی۔ اس نے کہا: وہاں اونٹنیاں گابھن بھی ہوں گی؟ بچے بھی پیدا ہوں گے؟...... کیونکہ جب اونٹنی گابھن ہو اور بچہ پیدا ہونے والا ہو تو بدو بڑا خوش ہوتا ہے کہ ابھی دودھ آئے گا، بچہ آئے گا اور اللہ پاک مجھے اونٹ دے دیں گے...... حضور ﷺ نے فرمایا: تم تمنا کرو گے تو اونٹنی اسی وقت گابھن ہو جائے، اسی وقت بچہ دے گی اور اسی وقت دودھ شروع ہو جائے گا۔

حضرت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((أَنْهَارُ الْجَنَّةِ تَخْرُجُ مِنْ تَحْتِ تِلَالٍ أَوْ مِنْ تَحْتِ جِبَالِ الْمِسْكِ))

[صحیح ابن حبان، حدیث: ۷۴۰۸، باب: وَصْفُ الْجَنَّةِ وَأَهْلِهَا]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لفظ ''تِلَال'' فرمایا، یا لفظ ''جِبَال'' فرمایا۔ ''تِلَال'' ٹیلوں کو کہا جاتا ہے اور ''جِبَال'' پہاڑوں کو کہا جاتا ہے۔ فرمایا کہ وہ مشک کے پہاڑ ہوں گے جن کے نیچے سے اللہ تعالیٰ کی جنت کی

نہریں جاری ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ کی جنت میں کوئی ایک نہر تو نہیں ہوں گی، وہاں تو بڑی نہریں ہوں گی، جیسے نہر کوثر کا ذکر آیا، سلسبیل کا ذکر آیا، نہر حیوان کا ذکر آیا اور بڑی بڑی انہار کا ذکر آتا ہے۔

اور اسی طرح بعض روایات میں یہ بھی ذکر آیا ہے کہ دنیا کی چار نہروں کا اصل بھی جنت ہے، جیسے: سیحون، جیحون، نیل اور فرات۔ کہتے ہیں کہ ان کو جنت کے پانی سے جاری کیا گیا اور یا ان کا اصل سلسلہ اللہ کے علم میں ہے، وگرنہ جنت تو اعلیٰ ہے اور یہ زمین پر ہیں۔ تو بہرحال ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ یہ چار نہریں جنت سے ہیں۔

[مسند البزار، حدیث: ۸۱۹۹]

جنت کے پھل:

حضرت یحییٰ بن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جیسے تم دنیا کے اندر گراسی گراؤنڈ بناتے ہو تو جنت کے اندر وہ زعفران کا ہوگا اور ان کے ٹیلے مشک کے بنے ہوئے ہوں گے اور جنت کے اندر نوجوان پھلوں کو اٹھا کر پھر رہے ہوں گے۔ جب جنتی ان کو بلائیں گے اور ان کو کہیں گے کہ یہ تو تم ابھی لائے تھے، اب وہ لڑکے کہیں گے کہ آپ کھائیں، ان کا رنگ ایک ہے، لیکن ذائقے مختلف ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ جنت کے اندر چیزیں شکل اور رنگ کے اندر ایک جیسی ہوں گی، لیکن ذائقے کے اندر مختلف ہوں گی۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جنت کے پھل دنیا کے پھلوں جیسے ہوں گے، لیکن دنیا کے پھلوں کا جنت کے پھلوں سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یوں سمجھ لو کہ دنیا کی کوئی چیز جنت کے مشابہ نہیں ہو سکتی، صرف نام کی مشابہت ہوگی کہ یہاں بھی، یہاں بھی انہار اور وہاں بھی انہار، یہاں بھی انگور وہاں بھی انگور وغیرہ۔

مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جنت میں مومنوں کی ایسی بیویاں عطا کریں گے جو حیض، بول و براز اور اولاد منی وغیرہ سے بھی پاک ہوں گی، کیونکہ ولادت بھی تکلیف ہے اور جنت کے اندر کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر تکلیف دینے والی چیز اور گناہوں سے بھی پاک ہوں گی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۳، البقرۃ: الآیۃ: وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ]

پاک بیویاں:

حضرت عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ پاک ہوں گی، ان کو حیض بھی نہیں آئے گا۔ فرمایا کہ حضرت حواء کو بھی اس طرح بنایا گیا۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ﴿وَلَهُمْ فِيهَآ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَهُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ۝٢٥﴾ [البقرۃ:۲۵] ''مُّطَهَّرَةٌ'' سے مراد حیض سے بھی پاک، بول و براز سے بھی پاک، اسی طرح ناک کی رینٹھ اور گلے کے بلغم سے بھی پاک ہوگی۔ اور یہ روایت غریب ہے کہ ایک محدث نے فرمایا کہ یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے، لیکن ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان کا یہ دعویٰ محلِ نظر ہے، یعنی یہ روایت اتنی نہیں ہے کہ اس کو شیخین کی شرط پر صحیح کہا جائے، کیونکہ عبدالرزاق بن عمر البزیلعی کے بارے میں حضرت ابن حبان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ اس قابل نہیں کہ اس سے حجت پکڑی جائے۔ تو جب اس روایت کی سند میں ایسا راوی موجود ہے تو علیٰ شرط الشیخین یہ روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ مفسر فرماتے ہیں کہ بلکہ یہ حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہو سکتا ہے۔

ہر شخص کی دنیا کی بیوی کو جب اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائیں گے تو اس کو پاک کر دیں گے، اس کے اندر بھی یہ حیض، نفاس، گندی عادتیں اور گندی چیزیں نہیں ہوں گی، ورنہ یاد رکھو! اگر کسی آدمی پر ابتلاء ہے، یعنی اس کی بیوی بدخلق ہے، بس فاحشہ نہ ہو، بے حیاء نہ ہو، اللہ بچائے تو اس پر بھی آدمی صبر کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۳، البقرۃ: الآیۃ: وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ]

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمہ اللہ کی بیوی:

جیسے حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمہ اللہ بڑے اللہ کے ولی گزرے ہیں اور بے حد نفیس الطبع انسان تھے، یعنی طبیعت اتنی نفیس تھی، مثلاً: اگر کسی شاگرد نے گلاس کو ٹیڑھا کر کے رکھ دیا تو حضرت کی طبیعت خراب ہو جاتی کہ اس کو سیدھا کیوں نہیں رکھا؟ اس کو ٹیڑھا کیوں رکھا؟ طبیعت میں اتنی نفاست تھی، لیکن بیوی اتنی تیز زبان تھی۔ ایک پٹھان شاگرد تھا، حضرت نے اس کو فرمایا کہ میرے گھر سے جا کر فلاں چیز لے آؤ۔ وہ گلی میں گیا تو اس نے آواز دی۔ اندر بیوی چیخی: کون ہے؟ کیا چیختا ہے؟ اس نے کہا: حضرت نے بھیجا ہے، فلاں چیز مانگی ہے۔ اس نے کہا: تیرا حضرت ایسا اور تو ایسا۔ اتنی گالیاں دیں۔ اب جب وہ واپس آیا تو اس کے گال سرخ تھے۔ حضرت نے فرمایا:

کیا بات ہے؟ اس نے کہا: حضرت! آپ ہمارا پیر بھی ہے، مرشد بھی ہے، استاذ بھی ہے اور شیخ بھی ہے، لیکن گھر میں کیا مصیبت ہے؟ یہ تمہارا بیوی ہے؟ ہم کو اجازت دو ہم اس کا گردن ابھی اڑائے گا، یہ ہمارے شیخ کا گستاخی کرتا ہے؟ تو حضرت مسکرائے اور فرمایا: تم دیکھ رہے کہ جو مجھے اللہ نے مرتبہ دیا ہے وہ اسی وجہ سے تو دیا ہے۔ اس نے کہا: کیا مطلب ہے؟ فرمایا: وہ بدخلقی کرتی ہے، میں صبر کرتا ہوں اور اللہ پاک مجھے اس کا بدلہ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے اس کا انعام دے رہے ہیں کہ میری شان اتنی اونچی کر دی ہے۔ اسی امتحان کی وجہ سے تو اللہ نے مجھے کو عزت دی ہے۔ تم وہ عزت ختم کرنا چاہتے ہو؟ فرمایا: اللہ کے بندے! تم پانچ منٹ کے لیے گئے اور برداشت نہیں کر سکے اور میں نے تو ساری زندگی اس کے ساتھ گزار دی ہے تو اسی صبر پر مجھے اللہ پاک یہ بدلے مجھے دے رہے ہیں۔

[ارواح ثلثہ، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کی حکایات، ص: ۲۴، ۲۵]

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾

بے شک اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ کوئی مثال مچھر کی یا اس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے بیان کرے۔ پس جو مومن ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ مثال ٹھیک ہے، جو ان کے رب کی طرف سے اتری ہے۔ اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں: اللہ کا اس مثال سے کیا مطلب ہے؟ اللہ اس مثال سے بہت ساروں کو گمراہ کرتا اور اس سے بہت ساروں کو ہدایت دیتا ہے۔ اور اس مثال سے گمراہ نہیں کرتا، مگر نافرمانوں کو، جو اللہ کے معاہدے کو اس کے پختہ ہو جانے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اس چیز کو جس کو اللہ نے ملانے کا فرمایا ہے قطع کرتے ہیں اور ملک میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ نقصان پانے والے ہیں۔

ربطِ آیات:

ربطِ آیات کی طرف بعض علماء نے خصوصی توجہ فرمائی ہے، جیسا کہ علامہ بکائی رحمہ اللہ نے۔ ان کی ایک تفسیر ہے ''نَظْمُ الدُّرَرِ فِيْ رَبْطِ الْاٰيَاتِ وَ الْاَحْكَامِ السُّوَرِ'' یہ وہ بڑی نایاب کتاب تھی، بڑی مہربانی ہوئی کہ اسے

دوبارہ چھاپ دیا گیا ہے، اب بہر حال وہ مشکل ہے، لیکن مل جاتی ہے اور اس کا مخطوطہ یہاں حرم کا مکتبہ ہے وہاں موجود ہے اور مدینہ منورہ میں بھی اس کا مخطوطہ موجود ہے۔

ان سے پہلے اشقیاء کا ذکر آیا تھا، پھر سعداء کا ضمناً ذکر آیا تھا کہ جس نے انکار کیا اس کے لیے جہنم ہے اور جس نے اقرار کیا اس کے لیے جنت ہے۔ اب بات پھر اصل مضمون کی طرف لوٹ آئے کہ جو لوگ کافر تھے قرآن کا مقابلہ تو نہ کر سکے، اللہ کے قرآن پاک کے مقابلہ میں کوئی ایک سورت یا آیت بھی نہ بنا سکے تو قرآن مجید پر اعتراضات اور الزام لگانے شروع کر دیے کہ اگر قرآن اللہ کا کلام ہے تو اس میں کہیں مکھی کا ذکر ہے، کہیں مچھر کا ذکر ہے اور کہیں مکڑی کا ذکر ہے، تو یہ کیسے اللہ کا کلام ہوسکتا ہے؟ جس میں ......نعوذ باللہ...... ایسی حقیر چیزیں ذکر کی گئی ہوں۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے ان شبہات کا بھی ذکر فرمایا اور ان کا رد فرمایا۔

استاذ کے ادب کا عجیب واقعہ!

ایک مثل مشہور ہے کہ ایک بادشاہ کے بیٹے کو ایک استاذ پڑھاتے تھے تو اتفاقاً ایک دن بادشاہ نے اس استاذ گرامی سے کہا کہ ...... ماشاء اللہ...... آپ استاذ ہیں، پڑھا رہے ہیں، علم بڑی عظیم نعمت ہے، لیکن اس کے لیے ظرف اور برتن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر نعمت قیمتی ہو تو برتن بھی اچھا ہونا چاہیے۔ یہ تو نہیں ہے کہ آپ اعلیٰ قسم کی نعمتیں بنائیں اور گندے برتن میں ڈال دیں اور کمزور برتن میں ڈال دیں۔ اٹھائیں تو ساری نعمت ختم ہوگئی۔ آپ عام آدمیوں کو جو پڑھا رہے ہو ذرا خیال کرو! اللہ نے بندے بھی ہر قسم کے پیدا فرمائے ہیں، اعلیٰ بھی ہیں، ادنیٰ بھی ہیں اور متوسط بھی ہیں۔ یہ ذرا چھوٹے قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور حقیر پیشوں کے اندر جو لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں، اگرچہ اللہ کی نظروں میں متقی کی قیمت ہے، لیکن دنیاوی اعتبار سے حسب ونسب میں تو فرق ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں کیا کروں؟ میں ایک معمولی آدمی ہوں، دین سکھاتا ہے، چاہے اچھا آدمی آگیا یا برا آگیا۔ انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، ویسے آپ کی مرضی ہے، میں نے نصیحت کر دی ہے۔

خیر مدت گزر گئی اور استاذ بھی بات بھول گیا، لیکن بادشاہ تو بادشاہ ہوتے ہیں۔ اللہ جن کو کرسی عطا فرماتے ہیں کوئی رحمت تو فرماتے ہیں عقل، کوئی چیز تو دیتے ہیں، ورنہ ہر کسی کو کیوں نہ مل جائے؟ تو ایک دن ایسا ہوا کہ ان کے سامنے حجام یا کسی اور قوم کا لڑکا پڑھتا تھا۔ اس کو بھی بادشاہ نے بلا لیا اور بادشاہ بڑے غصہ میں ہے اور استاذ

بے چارہ سامنے بیٹھا تھر تھر کانپ رہا ہے۔ اور اس نے اس کو بلا کر کہا: تمہارے استاذ نے آج ایسی حرکت کی ہے، ایسا گندا کام کیا ہے، مجھے اس کی رپورٹ ملی ہے۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کے شاگرد اس کو دس دس جوتے ماریں۔ جوتا لے آؤ اور استاذ کو دس جوتے مارو۔ وہ جوتا لینے کے لیے بھاگا۔ جوتا لے کر آنے لگا تو بادشاہ کا تو پہلے سے ایک پروگرام بنایا ہوا تھا تو جلدی سے وزیر نے کہا کہ عالم ہیں، مہربانی کریں، اس کو شاگردوں سے تو نہ مروائیں۔ اگر مارنا بھی ہے تو استاذ کے لیے خود سزا دیں۔ یہ تو بڑی ذلت ہے کہ ایک شاگرد اس کو مارنا شروع کر دے۔ بادشاہ نے کہا: ٹھیک ہے، اور کہا: رک جاؤ۔ اس لڑکے کو علیحدہ بھیج دیا، تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ میرے بیٹے کو بھی پتہ نہیں، جب آ کر منظر دیکھا تو حیران ہوا کہ استاذ کانپ رہا ہے اور سارے دربار میں سناٹا چھایا ہوا ہے، ڈر کے مارے کوئی سانس نہیں لے رہا اور بادشاہ کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے اور غیض وغضب میں ہے۔ بادشاہ نے بیٹے کو کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے استاذ نے کیا حرکت کی ہے؟ اس نے کہا: مجھے تو پتہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس نے ایسا ایک ذلیل کام کیا ہے کہ میں نے حکم دے دیا ہے کہ ہر شاگرد اپنے استاذ کو دس جوتے مارے۔ شاگرد نمبر وار آ رہے ہیں اور جوتے مار رہے ہیں، تم بھی جوتا لے کر آؤ اور اپنے استاذ کو مارو۔ بادشاہ کا بیٹا کھڑا ہو گیا، اس نے کہا: اے بادشاہ! ایک تو آپ بادشاہ ہیں، آپ کے حکم کی تعمیل کرنا بڑا ضروری ہے۔ اور دوسرا آپ میرے باپ بھی ہیں، اپنے والد کے حکم کی تعمیل کرنا بھی بڑا ضروری ہے۔ اور سامنے بھی میرا استاذ ہے، میرا باپ ہے، جس نے مجھے دین پڑھایا ہے، میں آپ کا ہر حکم مان سکتا ہوں، لیکن جو چیز اللہ اور اس کے رسول کے حکم خلاف ہے تو میں مجبور ہوں، میں استاذ کی توہین نہیں کر سکتا۔ بادشاہ نے کہا جانتے ہو پھر اس کی سزا کیا ہے اگر آج تم نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی تو میں تجھے سزائے موت دے دوں گا اس نے کہا مجھے قبول ہے تو بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ اس کو لے جاؤ اور اس کا سر اڑا دو اس نے کہا ٹھیک ہے اڑا دو۔ زیادہ سے زیادہ مرنا ہے۔ کل بھی مرنا ہے اور آج بھی مرنا ہے۔ اگر اللہ نے میری موت اسی طرح لکھی ہے کہ میرا باپ مجھے جلاد سے مروائے گا تو اللہ کی مرضی ہے "اٰمَنَّا بِاللّٰهِ" میں اللہ کے حکم پر راضی ہوں، میں اپنے استاذ کی توہین نہیں کر سکتا۔ اتنے میں وزیر بول پڑے کہ مہربانی کریں کہ بچے کو معاف کر دیں، بچے نے کوئی غلطی نہیں کی۔ ادھر باپ ہے اور ادھر بھی باپ ہے۔ بادشاہ نے کہا: ٹھیک ہے، معاف کیا۔ اس کو لے جاؤ۔ بیٹا ایک طرف چلا گیا۔

بادشاہ نے ایک دم رخ بدلا اور کہا: مولوی صاحب! آئیں کرسی پر تشریف رکھیں۔ اس نے کہا: میں نے یہ سارا

ڈرامہ کیا تھا۔ دیکھا! جو کم ذات لڑکا تھا وہ مارنے کے لیے جوتا لے کر آ گیا۔ یہ تو ہم نے پکڑ لیا، وگرنہ وہ تو شروع ہو جاتا، لیکن جو بادشاہ کا بیٹا تھا، حسب والے کی اولاد تھا، اس نے کہا: میں پھانسی چڑھ جاؤں گا، اپنی گردن کٹوالوں گا، لیکن اپنے استاذ کی توہین نہیں کروں گا۔ آج تم کو یہ بات سمجھ آئی ہے۔ اس نے کہا: آج اچھی طرح سمجھ آ گیا ہے۔ مجھے پتہ نہیں تھا، میں نے سمجھا کہ آپ واقعی ناراض ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ میں نے ویسے ڈرامہ بنایا تھا، میں کوئی ناراض نہیں تھا، میں تو آپ کو ایک سبق دینا چاہتا تھا اور ایک تعلیم دینا چاہتا تھا کہ اللہ نے ضرور کچھ حکمتیں تو رکھی ہیں کہ حضور پاک ﷺ جو نسب کو مٹانے کے لیے آئے، انہوں نے بھی پابندی لگا دی کہ اگر میرے بعد خلیفہ بناؤ تو قریش کو بناؤ۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ والوں کو نہ بناؤ، حالانکہ مدینہ والوں نے سب سے زیادہ قربانیاں دیں، مکہ والوں نے نکالا اور مدینہ والوں نے گلے لگایا، مکہ والوں نے ظلم وستم کے پہاڑ توڑ ڈالے اور مدینہ والوں نے خدمتوں کے اور عظمتوں کے ریکارڈ قائم کر دیے، لیکن فرمایا:

((اَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ)) [مسند أحمد بن حنبل، حديث: ۱۲۹۰۰۰]

میرے بعد تم خلیفہ جس کو بناؤ تمہاری مرضی، لیکن قریش میں سے بنانا، کیونکہ مدینہ والے لوگ زمینداری تو کر سکتے ہیں، باغبانی تو کر سکتے ہیں اور کھجوریں تو لگا سکتے ہیں، لیکن حکومت کرنا نہیں جانتے۔ اور مکہ والے سردار ہیں، وہ تو باپ دادے سے حکومتیں کرتے چلے آ رہے ہیں، ان کے خون میں سرداری رچی بسی ہوئی ہے۔ اسی لیے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے ایک دفعہ اپنی فارسی لغت میں کہا تھا:

سعدیا شیرازیا سبق مدہ کم ذات را
چوں عاقل شود گلہ کند استاد را

اس نے کہا: شیراز کے سعدی! خیال رکھنا، کسی کم ذات کو استاذ نہ بنالینا۔ جب وہ ملاں بن جائے گا تو سب سے پہلے تیرا مقابلہ کرے گا۔

اور یہ ایک دفعہ کا واقعہ نہیں ہے، سینکڑوں مثالیں ہیں۔ اس قسم کے لوگ جب پڑھنے کے لیے اور بڑے بنے تو سب سے پہلے اپنے استاذ سے مقابلہ کیا، استاذ کے مقابلہ پر مسجد بنائی، استاذ کے مقابلہ پر جمعہ شروع کیا، استاذ کے مقابلہ پر درس شروع کیا اور استاذ کے مقابلہ پر باقاعدہ اپنا اڈہ لگایا۔ اور پھر لوگوں کو استاذ کے عیب گنوائے۔ تمہیں مولوی کلی کا کیا پتہ ہے؟ اس کے پاس ہم بیس سال تک پڑھتے رہے، اس کے اندر یہ عیب ہے، یہ عیب ہے، تم لوگ

تو آتے تھے تقریر سن کر چلے جاتے تھے، ہم شاگرد تھے، اس کے قریب رہنے والے تھے، اس کے گناہ ہم سے پوچھو۔ اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ جو کم عقل لوگ ہوتے ہیں، کم اصل لوگ ہوتے ہیں وہ ان حقیر چیزوں کو سوچتے ہیں اور اعتراض کرتے ہیں اور جو بنیادی لوگ ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بھائی! یہ تو سب سے بڑی چیز ہے۔ ایک آدمی عظیم محل بنوادے، اس میں بیت الخلا نہ ہو تو کیا آپ رہ سکتے ہیں؟

اس لیے ہمیشہ لازمی بات ہے کہ جب اعلیٰ چیز کا ذکر آئے گا، جب اعلیٰ چیز بنائیں گے تو اس کے لوازمات کے ساتھ ادنیٰ چیزیں بھی ضرور آئیں گی۔ اگر وہ ادنیٰ چیزیں نہ آئیں تو وہ اعلیٰ کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔

ایک سردار کا عالی شان محل:

ہمارے اپنے ضلع میں بڑے مخدوم صاحب تھے...... اللہ ان کو معاف کرے، اللہ ان کی قبر پر رحمت فرمائیں...... بہت بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے اپنا محل بنایا تھا اور...... ماشاء اللہ...... اب بھی وہ محل ہے اور ان کے لڑکے اور پوتے بھی ہیں، ابھی تک ہم سے تعلق جوڑا ہوا ہے، بہت بڑے آدمی تھے، وہ پاکستان کی بہت بڑی شخصیت تھے...... انہوں نے اپنا محل بنایا اور چھ مربع میں باغ لگایا اور جب وہ محل بن گیا تو تمام دوستوں کو دعوت دی۔ اس میں ہماری بلوچ برادری کے سردار تھے، وہ فوت ہو گئے...... اللہ ان کی قبر پر رحمت فرمائے...... ڈی جی خان کے علاقہ سے تعلق تھا، بہت بڑے سردار تھے۔ مکان کی افتتاحی تقریب میں ان کو بھی دعوت تھی۔ سب لوگوں نے محل دیکھا، باغ دیکھا، سیر کی اور واپس آکر سب نے مبارکباد دی کہ مبارک ہو...... ماشاء اللہ...... بڑا اعلیٰ محل ہے...... اور یہ اس دور کی بات ہے جب ہمارے ضلعوں میں پکے مکانات بڑے کم ہوتے تھے اور اس زمانے میں کوئی محل بنائے تو بڑی بات تھی...... وہ بلوچ سردار صاحب جو تھے وہ چپ تھے۔ اب مخدوم صاحب کے دل میں ایک تھوڑا سا کھٹکا سا پیدا ہوا کہ سردار صاحب نے بات نہیں کی اور سب نے مبارکباد دی، سب نے تعریف کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو یا تو میرا محل پسند نہیں آیا یا...... نعوذ باللہ...... حسد کا شکار ہو گیا ہے، اس کے دل میں بغض آ گیا ہے۔ تو اس نے پوچھا کہ آپ کو محل پسند آیا نہیں؟ مزید اس میں ترمیم کا ارادہ ہے۔ سردار صاحب نے: کہا: مخدوم صاحب! آپ سید ہیں، اولادِ رسول ہیں اور بہت بڑے لوگ ہیں اور ہم تو بہت سیدھے سادے بلوچ ہیں، دیہاتوں کی زندگی گزارنے والے ہیں، کیسے تیرے محل کی تعریف کروں کہ اندر جتنے حمام لگے ہوئے ہیں وہ

سارے انگریزی ہیں اور ان کا رخ قبلہ کی طرف ہے، میں کیسے تعریف کروں؟ تم سید ہو کر اور آلِ رسول ہو کر اپنے نبی کی سنت اور فرامین کا خیال نہ کرو تو میں تیرے محل کی تعریف کیسے کروں؟ مخدوم صاحب کو عقل آ گئی کہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے افتتاحی تقریب ختم کرنے کے بعد ملازمین کو حکم دیا کہ میں اس وقت تک اس محل میں داخل نہیں ہوں گا جب تک کہ یہ سارے حمام بدل نہ دیے جائیں۔ تو جو سمجھدار لوگ ہوتے ہیں ان کی اپنی نظر ہوتی ہے۔

ایمان والوں کی مثال:

ایک ایمان والے کی نظر ہوتی ہے اور ایک کافر کی نظر ہوتی ہے۔ دونوں کی نظر میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ ایمان والے کی جب نظر پڑے گی وہ اس انداز میں سوچے گا کہ اگر خاتم الانبیاء حبیب الکبریاء ﷺ ایک عورت کو حیض کے مسئلے نہ سمجھا دیتے، غسل کے مسئلے نہ سمجھا دیتے، نفاس کے مسائل نہ سمجھا دیتے اور پاک ہونے کا طریقہ نہ بتلا دیتے تو ساری زندگی عورت پاک ہی نہ ہوتی، ناپاک ہی رہتی۔ نہ نماز ہوتی اور نہ دوسری عبادتیں ہوتیں، نہ اس کے اللہ کے ہاں کوئی نوافل فرائض قبول ہوتے۔ یہ سمجھانا تو بڑا ضروری تھا۔ اور ایک بدبخت آدمی کی نظر اس طرح پڑے گی اور وہ اس انداز میں سوچے گا کہ اللہ کے نبی اجنبی عورت کو فرما رہے ہیں کہ جب حیض سے پاک ہونے کے دن آ جائیں تو عورت کو کپاس لینی چاہیے، خوشبو لگانی چاہیے اور اس کو جسم کے اندر رکھنا چاہیے، پھر تسلی کرے کہ اس کپاس پر داغ تو نہیں لگا ہے، پھر اس کو غسل کرنا چاہیے اور اس کو سارے بال کھولنے چاہئیں، پانی کو اپنے بالوں کی جڑوں میں پہنچانا چاہیے، بدن کا کوئی ذرہ پانی کے بغیر نہ رہے۔ دیکھو! اللہ کا نبی اجنبی عورت سے ایسی ننگی بات کرے! بھلا یہ بات کوئی آدمی اپنی بیٹی سے بھی کرتا ہے؟ یہ بات بھلا کوئی آدمی اپنی بہن سے بھی کرتا ہے؟ اللہ کے نبی غیر عورت سے کر رہے ہیں۔ اس نظر سے سوچے گا تو یہ سوچنے والے کی سوچ کا قصور ہے، دیکھنے والے کی نظر کا قصور ہے، بتلانے والے کا مسئلہ میں تو کوئی قصور نہیں ہے، وہ تو بنیادی مسئلہ ہے۔ دیکھیں! استنجاء ایک معمولی بات ہے، لیکن اگر استنجاء صحیح نہ ہو تو وضو صحیح ہوگا؟ اگر وضو صحیح نہ ہو تو نماز صحیح ہوگی؟ تو مسئلہ سارے کا سارا طہارت پر آ گیا، جو آپ کے نزدیک ایک معمولی بات ہے۔ جو حقیر چیز ٹھیک ہوگی تو آگے آپ ٹھیک ہوں گے۔

قرآن میں تمثیل کا طرزِ بیان:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس میں جو مثالیں دی ہیں ان کے اندر حکم ہیں۔ اور کبھی حقیر چیز کے بارے میں

اگر مثال دینی ہو تو کسی حقیر چیز سے دینی ہوگی۔ جیسے قرآن میں ایک طرف توحید کا بیان تھا اور جب اللہ کی توحید کی کمال قدرتوں کا بیان آیا اور اس کے مقابلہ پر غیر اللہ کا ذکر آیا اور بتوں کا ذکر آیا تو اللہ پاک نے فرمایا:

﴿وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ۚ﴾ [الحج: ۷۳]

ادھر شان والے کی قدرت دیکھو! وہ چاہے تو آسمانوں کو تباہ کر دے یا چاہے تو زمینوں کو بدل ڈالے، اگر چاہے تو چاند سورج کو بے نور کر دے، چاہے تو اس عالم دنیا کو فنا کر کے اور عالم پیدا فرما دے اور ادھر ان بتوں کو دیکھو! جن کو تم نے خدا بنایا ہوا ہے کہ اگر ان کے بدن پر مکھی بیٹھی ہو، عطر لگاؤ اور مکھی اس کو چوس لے تو یہ مکھی کو پکڑ کر عطر بھی واپس نہیں لے سکتے۔

ایک حکیم صاحب کا واقعہ قرآن کی جامعت:

جیسے ایک حکیم تھا، اس کے دماغ میں ایک بھوت سمایا۔ وہ ایک عالم کے پاس آکر کہنے لگا کہ قرآن میں اللہ نے ہر مسئلہ بیان فرمایا؟ انہوں نے کہا: ہاں! اللہ نے ہر مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ اس نے کہا: میں بڑا حکیم اور طبیب ہوں، ساری زندگی کتابیں پڑھاتا رہا۔ طب اور حکمت کے بارے میں تو قرآن میں کوئی بیان نہیں ہے۔ انہوں نے کہا: تم نے پھر قرآن پڑھا اور سمجھا نہیں کہ قرآن نے تو ایک قاعدہ بتلا دیا ہے:

﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿٣١﴾﴾ [الاعراف: ۳۱]

اللہ نے فرمادیا کہ کھاؤ اور پیو، لیکن زیادتی نہ کرو۔ جب کھانا اعتدال میں ہوگا اور پینا اعتدال میں ہوگا تو نہ بیمار ہوگا اور نہ تمہاری اس کو ضرورت پڑے گی۔ تو اللہ نے ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا ہے تو یہ چیز قرآن کے اندر موجود ہے۔

قرآن میں ریاضی کے مسائل:

اسی طرح ایک ریاضی دان کا دماغ خراب ہوا، اس نے کہا کہ قرآن میں ہر مسئلہ موجود، ہے لیکن ریاضیات اور حساب کا کوئی مسئلہ موجود نہیں ہے۔ بزرگوں نے کہا: تم نے پھر قرآن کو پڑھا نہیں۔ اللہ پاک نے فرمایا:

﴿حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦١﴾﴾

[البقرۃ: ۲۶۱]

جب ہم کھیت پیدا کرتے ہیں تو ہر دانے کے ساتھ خوشے لگاتے ہیں، اور ہر خوشے میں ۱۰۰ (سو) دانے ہوتے

ہیں تو ۱۰۰ (سو) کو جب ۷ (سات) سے ضرب دو تو کتنا بنے گا؟ ۷۰۰ (سات سو) بنے گا تو کیا قرآن میں حساب کا مسئلہ موجود نہیں ہے؟ تم کیسے کہتے ہو کہ قرآن میں ریاضیات کا مسئلہ موجود نہیں ہے؟ کیا قرآن نے نہیں فرمایا:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ﴾ [الانعام:۱۶۰]

ایک کے دس۔ اور اسی طرح قرآن نے فرمایا:

﴿اِلٰی سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ﴾

ایک برابر سات سو کے۔ انہوں نے کہا: تم دیکھتے آؤ، قرآن میں جہاں جہاں تمہیں دیکھنا ہے، جمع بھی تمہیں ملے گی، ضرب بھی ملے گی اور نفی بھی ملے گی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ﴾ [البقرة:۲۶]

فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ استحیاء نہیں فرماتے ہیں ایک مثل بیان کرنے سے، مثل مچھر کی ہو یا اس سے بڑی، لیکن مچھر سے بڑی کا معنی یہ نہیں کہ اس سے بڑا، بلکہ معنی یہ ہے کہ جیسے مچھر حقیر ہے، اس سے بڑی اور حقارت میں زیادہ ہے۔

واقعات:

نمرود کا جب دماغ خراب ہوگیا تو اللہ نے اس کے علاج کے لیے ایک مچھر کو حکم دیا کہ خدا بنا بیٹھا ہے، ذرا اس کو ٹھیک کرو۔ وہ آرام سے محل کی چھت پر بیٹھا ہوا ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھا رہا ہے۔ اللہ نے حکم دیا تو مچھر ناک میں گھسا اور سیدھا دماغ میں چڑھ گیا۔ دماغ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اندر بیٹھ کر وہ پاؤں سے حرکت کرے تو اس کے دماغ کے اندر درد کی ٹیسیں اٹھیں۔ اس زمانے کے جو بڑے بڑے معالج تھے ان کو بلایا گیا، مختلف چیزیں دی گئیں۔ اگر وہ ایسی چیزیں دے دیں کہ بے ہوش پڑا رہے، ہوش آتا تو مچھر بھی چھیڑ دیتا، اب پھر چیخنا شروع کر دے۔ ہاں! اللہ پاک نے تو ہر چیز سمجھائی ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہم سمجھتے نہیں۔ بڑے بڑے بزرگوں کو آپ نے دیکھا ہوگا اور اللہ والوں کو دیکھا ہوگا کہ معذور ہو جاتے ہیں کہ کوئی نابینا ہوگیا اور کسی کو پیشاب کی بیماری لگ گئی، کبھی کسی کی ٹانگیں جواب دے گئیں، کبھی کسی پر فالج گر گیا، وجہ کیا ہوتی ہے کہ خدا اپنے جلوے دکھلاتا ہے کہ جن کو تم مختار سمجھتے ہو کہ یہ جو چاہیں کر دیں، دیکھو! ان کا اپنا حال کیا ہے؟ مجھے خود یاد ہے۔

شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ اور انگریز کا واقعہ:

حضرت شاہ جی بخاری رحمۃ اللہ علیہ جن کو اللہ نے اتنی اعلیٰ زبان دی تھی، خطابت دی تھی، فصاحت دی تھی، بلاغت دی تھی اور لحن دیا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی عظمت دی تھی کہ قرآن پڑھتے تھے تو ایسے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی قرآن اتر رہا ہے۔ ایسے کئی واقعات ہیں کہ آپ جیل میں ہیں اور سپریڈنٹ جیل وہ انگریز ہے اور آپ نے تہجد کے وقت قرآن پڑھنا شروع کیا وہ کافر ہے اور روتا ہوا آیا اور آنسو بہا رہا ہے اور کہتا ہے: شاہ جی! بس کریں، زیادہ نہیں برداشت کر سکتا۔ خدا کے لیے آپ پڑھنا بند کریں، ورنہ میں مر جاؤں گا۔ کافر چیخیں مار مار کر رو رہا ہے۔

شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تقریر:

لاکھوں کے مجمع میں خطاب فرمایا اور حال کیا ہوتا تھا کہ عشا کے بعد جلسہ شروع ہوتا تھا اور صبح کی اذان ہوگئی، یعنی سحری ہوگئی اور لوگوں پر سحر ٹوٹ گیا۔ اچھا بھائی! السلام علیکم اور تقریر ختم ہوگئی۔ لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلا۔ ایک ڈاکٹر ہیں ظفر حیات ان کا نام ہے، جو اب بھی موجود ہیں، ملتان کے بہت بڑے ڈاکٹروں میں سے ہیں، بہت بڑے پروفیسر اور ڈاکٹروں کے استاذ ہیں۔ خود ہمیں بتایا کہ بچپن میں ایم بی بی ایس کا امتحان دے رہا تھا، کالج کے اسٹوڈنٹ تھے۔ کہنے لگے: ہم لاہور سے گزرے تو دیکھا کہ تقریر ہو رہی ہے۔ پوچھا: کون ہیں؟ تو بتایا کہ شاہ جی تقریر کر رہے ہیں۔ تو ہم چار پانچ نوجوان اکٹھے پڑھنے کے لیے جا رہے تھے کہ رات کو کسی پارک میں بیٹھ کر پرچے کی تیاری کریں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا چلو دو چار منٹ سن لیتے ہیں۔ بخاری صاحب کا نام تو سنا ہوا ہے، چلو ان کو پانچ دس منٹ کے لیے سن لیں، پھر نکل جائیں گے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم آئے تو دیکھا کہ اتنا بڑا مجمع تھا کہ پیر دھرنے کی جگہ نہیں تھی، ہم باہر سڑک پر کھڑے ہو گئے اور شاہ جی تقریر کر رہے تھے۔ یوں ہم پر شاہ جی کی تقریر کا جادو ہوا کہ اذان ہوگئی اور حضرت نے تقریر ختم کی۔ ہم نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ ہم تو مارے گئے، ہم نے تو پرچہ پڑھا ہی نہیں ہے۔ امتحان کیسے دیں گے؟ ہم تو تیاری کے لیے آئے تھے اور ساڑھے پانچ گھنٹے ہم تقریر سنتے رہے، پتہ ہی نہیں لگا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا تو دماغ خراب ہو گیا کہ ہم امتحان کیا دیں گے؟ اب نماز پڑھ کر گھر جائیں گے اور کپڑے پہنیں گے تو اتنی دیر میں تو کالج کھل جائے گا۔ وہ کہتے ہیں: ہمیں اور تو کچھ نہ سوجھی تو ہم نے وہیں نماز پڑھی اور شاہ جی مجمع سے نکلنے لگے تو ہم نے شاہ جی کو پکڑ لیا کہ آپ کی تقریر کا لوگوں کو جو فائدہ ہوا سو ہوا،

لیکن ہمارا تو ستیا ناس ہو گیا کہ ہم کالج کے اسٹوڈنٹ ہیں اور آج ہمارا پرچہ ہے اور ہم دو منٹ تقریر سننے کے لیے آئے تھے اور پوری رات ہماری غائب ہو گئی، آپ نے اچھا ہم پر جادو کر دیا۔ آج ہمارا پرچہ بھی بڑا مشکل ہے۔ تو شاہ جی نے داڑھی مبارک پر ہاتھ مارا اور مسکرا کر میری پشت پر ہاتھ مارا اور کہنے لگے: ہم اللہ سے دعا کریں گے، اس پرچے میں تم فیل نہیں ہو گے۔ آگے تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ تو فرماتے ہیں: اسی پرچے کے اندر ہم نے سب سے زیادہ نمبر لیے۔

اتنے عظیم خطیب تھے! شاہ جی سے میری ملاقات میں جب خود ان کو آخری عمر میں ملنے کے لیے گیا مجھے آج بھی یاد ہے کہ انہوں نے ایک شعر پڑھا:

؎ ایک شمع تھی تو آخر شب کو بجھ گئی
اور حیرت کے ساتھ کون گزارے تمام رات

کہنے لگے: مولوی جی! جب تک یہ زبان کتیا بولتی تھی، زمانہ پیچھے بھاگتا تھا۔ اس نے بولنا چھوڑ دیا تو لوگوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔ اکیلے زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ شخص اکیلا، گھر میں ملنے والا کوئی نہیں۔ تو یہ اللہ کا امتحان ہوتا ہے کہ تم شاید غرور کا شکار نہ ہو جاؤ، ہم چاہیں تو زمانے کو پیچھے لگا دیں اور اگر ہم چاہیں تو کوئی تمہیں پوچھے بھی نہ، کوئی تمہیں سلام بھی نہ کرے اور کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے۔ یہ تو سارا میرے ہاتھ میں ہے۔

مچھر کی مثال پر کفار کا اعتراض:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت سدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے ان آیات مبارکہ کی تفسیر بیان کی کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس کے اندر یہ دو مثالیں ذکر فرمائیں:

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ [البقرۃ:۱۷]

اور......

﴿أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ﴾ [البقرۃ:۱۹]

تو جب یہ مثالیں دی گئیں اور سورۃ البقرۃ حضور ﷺ پر بعد الہجرت نازل ہوئی تو اب منافقوں کے پاس اور

تو کوئی چارا تھا نہیں، قرآن کا مقابلہ تو نہ مشرکین مکہ کر سکے اور نہ مدینے والے منافقین و یہود کر سکے تو جھوٹے اور بے ہودہ اعتراضات پر آ گئے کہ اللہ کی شان بڑی بلند ہے، اللہ تو شہنشاہوں کا شہنشاہ ہیں اور بڑے لوگ بھی ایسی ایسی چھوٹی چیزوں کی مثالیں نہیں دیتے۔ یہ اللہ کا کلام ہوتا تو اس کے اندر یہ چھوٹی مثالیں کیوں آتیں؟ تو اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی۔

حضرت عبدالرزاق رحمہ اللہ نے حضرت معمر رحمہ اللہ سے، انہوں نے حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے یہ تفسیر نقل فرمائی کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں عنکبوت کا ذکر فرمایا کہ:

﴿اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۝۴۱﴾ [العنکبوت:۴۱]

مکھی کا ذکر آیا تھا، مشرکین کہنے لگے کہ دیکھو! مکھی، مچھر اور مکڑی کا اللہ کے کلام سے کیا تعلق ہے کہ ان کا ذکر آئے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ﴾ [البقرۃ:۲۶]

ان اقوال میں دراصل کوئی تفاوت نہیں ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے جو یہ بات ارشاد فرمائی ہے وہ اپنی جگہ درست ہے کہ جب منافقوں نے ان دو مثالوں پر اعتراض کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے جو تفسیر بیان فرمائی وہ اپنی جگہ درست ہے، کیونکہ مشرکین مکہ کو بھی یہ واقعہ پیش آ گیا تھا کہ ان کے معبودوں کی مثال مکڑی سے دی گئی تھی۔ اب دیگر لوگوں نے بھی اعتراض کیا کہ اگر یہ اللہ کا کلام ہے تو مکھی وغیرہ تو گندی چیزیں ہیں، حقیر چیزیں ہیں، ان کا ذکر اللہ نے کیوں کیا؟

حضرت سعید قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کی ہے "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ" کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حق کے بیان سے حیا نہیں فرماتے۔ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ذکر فرما دیتے ہیں۔ اللہ پاک نے جب اپنی کتاب میں مکھی اور عنکبوت کا ذکر فرمایا تو مشرکین اور کافر کہنے لگے:

"مَاذَا اَرَادَ اللّٰهُ مِنْ ذِكْرِ هٰذَا؟"

"ان چیزوں کے ذکر کرنے سے اللہ نے کیا ارادہ فرمایا؟"

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿إِنَّ اللهَ لَا يَسْتَحْيِ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ [البقرۃ:۲۶]

پہلی روایت میں جو "عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ قَتَادَةَ" والی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ذباب اور عنکبوت کا ذکر کیا تو فرمایا "قَالَ الْمُشْرِكُونَ" "مشرکین تو مکہ میں رہتے تھے، مدینے میں نہیں تھے، ان کی اس روایت سے یہ بات معلوم ہوتی تھی کہ شاید یہ آیت مبارک مکہ میں نازل ہوئی، حالانکہ یہ آیت مکہ میں نازل نہیں ہوئی ہے۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دوسری روایت "عَنْ سَعِيدٍ عَنْ قَتَادَةَ" والی زیادہ راجح ہے اور تنزیل کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ یہ آیات مبارک مدنیہ ہیں...... وَاللهُ تَعَالَى أَعْلَمُ...... [تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۴، البقرۃ: الآیۃ: إِنَّ اللهَ لَا يَسْتَحْيِ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا]

قرآن میں مکھی کی مثال بیان کرنے کی وجوہ:

اسی طرح حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے "عَنْ مُجَاهِدٍ عَنْ قَتَادَةَ" سے دوسرا قول نقل کیا ہے جو حضرت سعید رحمہ اللہ نے حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بھی اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت ابوجعفر رازی رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس کے اندر مکھی کی مثال ذکر فرمادی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مثال دینے سے کئی چیزیں مراد ہوتی ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی مثال اس لیے مثال دی کہ وہ مثال دنیا والوں کے عین مطابق ہوتی ہے۔ آپ مکھی کو دیکھیں کہ اس کی بھی عادت ہے کہ کہیں ذرا میٹھا لگا ہوا ہوگا، دوڑی آئے گی۔ آپ لاکھ دفعہ ماریں پھر بھی اسی جگہ آئے گی۔ اور مکھی کی یہ صفت ہے کہ جب تک بھوکی رہے یہ زندہ رہتی ہے اور اگر اس کو پیٹ بھر کر غذا مل جائے اور یہ اچھی طرح موٹی تازی ہو جائے تو مر جاتی ہے۔ اسی طرح دنیا والوں کی مثال ہے کہ بھوکے ہیں تو دوڑ رہے ہیں، جب ساری چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے عذاب میں پکڑ لیا۔ تو اس وجہ سے بھی ان چیزوں کی مثال دی ہے۔ جیسے فرماتے ہیں:

﴿فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ﴾ [الانعام:۴۴]

جب ان لوگوں نے اس کو بھلا ڈالا جن سے ہم نے اپنے پیغمبر بھیج کر ان کو ڈرایا تھا تو نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے بھی دنیا میں ان پر نعمتوں کے دروازے کھول دیے اور وہ ان نعمتوں میں پڑ گئے اور ہر چیز کو بھول گئے تو اللہ کا عذاب آ گیا۔

اس لیے علماء نے فرمایا کہ اس چیز سے آدمی کو بڑا ڈرنا چاہیے۔ کبھی ہوتا ہے کہ آدمی گناہ کرتا ہے، لیکن کوئی نہ کوئی نعمت مل جاتی ہے، گناہ کیا کوئی پیسے مل گئے، گناہ کیا کوئی اور نعمت مل گئی تو یہ بڑی خطرناک علامت ہوتی ہے، کیونکہ اس طرح اللہ کافروں کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں کہ جتنا وہ کفر میں بڑھتے جائیں گے ان کو اور نعمتیں دیتے چلے جائیں گے اور ڈھیل دیتے چلے جائیں گے۔ جب وہ انتہا پر پہنچیں گے تو یکلخت اللہ کا عذاب آ کر ان کو پکڑ لے گا۔ ہم جاہل لوگ ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ کافروں کو پچاس سال گزر گئے، سو سال گزر گئے، عذاب نہیں آیا۔ یہ تو پچاس سال اور سو سال ہمارے لیے بڑی مدت ہے، اللہ کی نظروں میں تو پوری دنیا کی مدت کچھ نہیں ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی نظر میں پوری دنیا کے ہزاروں سال ایک لمحہ کے برابر بھی نہیں، اس لیے وہاں کا نظام علیحدہ ہوتا ہے۔ مکھی کی بھی یہ عادت ہے کہ جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے اور موٹی تازی ہو جاتی ہے تو مر جاتی ہے اور بھوکی رہے تو دوڑتی رہتی ہے، بعینہٖ کفار کی یہی مثال ہے۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مقدس میں ایسی باتیں اور ایسی مثالیں بیان فرمائیں۔ مفسرین کے درمیان سببِ نزول کے اندر اختلاف کی وجہ بن گئی۔

ایک قول تو یہ تھا کہ جب اللہ نے یہ مثالیں بیان کیں تو مشرکوں نے اعتراضات کیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی حقیر چیزوں کا ذکر کیوں کیا ہے؟ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ جب یہ آیت اتری تو منافقین مدینہ نے اعتراض کیا کہ اللہ کی شان بلند و بالا ہے کہ ان مکھیوں کا اور مچھروں کا ذکر فرمائیں۔ اور بعض نے فرمایا کہ یہ سورت اس وجہ سے نازل ہوئی جیسے مکھی موٹی تازی ہو کر مر جاتی ہے، اسی طرح کفار بھی دولت میں آ کر خدا کو بھول جاتے ہیں تو اللہ کا عذاب آ جاتا ہے۔ اس وجہ سے اختلاف ہوا کہ یہ مشرکوں کے بارے میں نازل ہوئی یا منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی یا ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو دنیا میں غفلتوں کے اندر مبتلا ہیں۔

مفسر فرماتے ہیں: اصل بات وہ پہلا قول ہے جو تم نے پڑھا ہے، وہ زیادہ راجح ہے، کیونکہ مقصد یہ تھا کہ مشرکین جب مقابلہ کر سکیں تو یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ جب آدمی کسی دلیل کا توڑ نہ کر سکے تو اس کے اندر وہ شبہات پیدا کرتا ہے، تاکہ اپنی پارٹی کو یقین دلا سکے کہ ہاں ہم بھی کوئی بات کر رہے ہیں تو ان کے رد میں اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اللہ تعالیٰ استحیاء نہیں فرماتے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس چیز کو برا نہیں سمجھتے، وہ چاہے کسی بڑی چیز کی مثال دیں یا کسی چھوٹی چیز کی مثال دیں، کسی صغیر کی مثال دیں یا کسی عظیم کی مثال دیں اور کسی حقیر کی مثال دیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان ہے اور ان کے کلام کے اندر حکم ہیں۔ جہاں بڑی چیزوں کی ضرورت ہے

وہاں مثالیں بھی بڑی آئیں اور جہاں ادنیٰ چیزوں کی ضرورت ہے وہاں مثالیں بھی ادنیٰ آئیں۔ ہر قسم کی اللہ تبارک وتعالیٰ نے مثالیں دی ہیں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾ [البقرة:٢٦]

[تفسیر ابن کثیر:١ / ٦٤، البقرة: الآیۃ: إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا]

﴿مَّا بَعُوضَةً﴾ کی پہلی تفسیر:

مفسر ابن کثیر ﷫ فرماتے ہیں کہ بعض کے نزدیک ''مَا'' تقلیل کے لیے ہے، یعنی مچھر اور اس سے بھی حقیر چیز اور ''بَعُوضَةً'' زبر کے ساتھ منصوب ہے، یہ بدل ہے۔ جیسے کہتے ہیں ''لَأَضْرِبَنَّ ضَرْبًا مَّا'' میں تمہیں ماروں گا مارنا تھوڑا سا۔ تو تھوڑی چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، یا اس کو نکرہ موصوفہ بنا دیں ''بَعُوضَةً''

﴿مَّا بَعُوضَةً﴾ کی دوسری تفسیر:

اور ابن جریر ﷫ فرماتے ہیں کہ ''مَا'' موصولہ ہے اور ''بَعُوضَةً'' معرب ہے ''مَا'' کے اعراب کے ساتھ۔ جو وہاں اعراب ہوگا اس پر بھی وہی اعراب ہوگا۔ وہاں چونکہ نصب تھی یہاں بھی نصب ہوگی۔ اور وہ فرماتے ہیں: کلام عرب میں یہ بات مشہور ہے کہ ''مَا'' اور ''مَنْ'' کا جو صلہ ہوگا جو ان کا اعراب آئے گا ان کے صلہ کا اعراب بھی وہی ہوگا، کیونکہ کبھی ''مَا'' اور ''مَنْ'' کو معرفہ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے اعراب کے مطابق صلہ چلے گا۔

ابن جریر ﷫ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/٦٤، البقرة: الآیۃ: إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا]

حضرت حسان بن ثابت ؓ کی نبی ﷺ کی شان میں مدح کرنا:

جیسے حسان بن ثابت ؓ نے شعر کہا۔ حضرت حسان بن ثابت ؓ زمانۂ جاہلیت میں بھی بہت بڑے شاعر تھے اور بادشاہوں کی تعریف میں اشعار کہتے تھے تو ان کو بادشاہوں کی طرف سے ہدایا ملتے تھے۔ خدا کی شان ہے کہ ان کو اسلام نصیب فرما دیا تو جو شاعرِ جاہلیت تھے وہ شاعرِ نبوت بن گئے۔ یہ حضور پاک ﷺ کی بڑی مدح فرمانے والے ہیں اور یہ ان شعراء میں سے ہیں کہ مسجد الحرام میں اللہ کے نبی ﷺ نے ان کے لیے منبر رکھوایا اور منبر پر کھڑے ہو کر حضرت حسان بن ثابت ؓ نے شعر پڑھے۔ حضور ﷺ نیچے بیٹھے ہیں اور حسان ؓ منبر پر کھڑے ہیں اور حضور ﷺ دعا فرما رہے ہیں:

((اَللّٰهُمَّ أَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ)) [صحیح البخاری، حدیث: ۴۵۳، باب: الشعر فی المسجد]

یا اللہ! جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے اس کے دل میں مضامین ڈال دے۔ یہ تیرے کافروں کو، تیرے دشمنوں کو کیسا جواب دے رہا ہے!!

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کافروں کا ایک بڑا شاعر تھا، اس نے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کی تو حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ آئے، انہوں نے کہا: یارسول اللہ! آپ مجھے اجازت دیں کہ میں ان کو جواب دوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسان بڑی مشکل ہے، کیسے جواب دو گے؟ چونکہ وہ دشمنی کرنے والے ہیں، وہ رشتہ دار ہیں، خاندان ہمارا ایک ہے، قبیلہ ہمارا ایک ہے تو جب تم قریش کی مذمت کرو گے تو اس میں......نعوذ باللہ......میری مذمت بھی تو ہو جائے گی تو اس لیے میں مناسب نہیں سمجھتا۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور! مجھے اجازت تو دیں، میں آپ کی شان مبارک کو ایسے بیان کروں گا جیسے بال آٹے سے نکالا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اجازت ہے۔ پھر جب حسان رضی اللہ عنہ نے اشعار پڑھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی خوشی ہوئی کہ آپ نے بڑی دعائیں دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((فَإِنَّهُ أَشَدُّ عَلَيْهِمْ مِنْ رَشْقِ النَّبْلِ)) [المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث: ۳۵۸۲]

حسان کے اشعار دشمن کو اتنا زخمی کرتے ہیں جتنا تیر بھی زخمی نہیں کرتا۔

اور یہ بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ ایک طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار بھی بنتے ہیں۔ بہر حال اس کا عام ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔

ویسے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زلف ہیں، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بیوی حضرت ماریہ قبطیہ تھیں تو اس کی بہن سیرین ہے تو وہ سیرین حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوی ہے، یعنی ایک بہن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں اور دوسری حضرت حسان بن ثابت کی بیوی تھیں۔ جن لوگوں نے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف تہمت لگائی تھی تو اس تہمت لگانے والوں میں بھی یہ بے چارے شریک ہو گئے، ان پر بھی بڑی سزا ہوئی اور بعد میں یہ بڑے روتے تھے۔ پھر ایک دفعہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر آئے اور کہا: اماں جان! مجھے معاف کر دیں۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اے حسان! تم نے میرے آقا اور میرے سرکار کی اتنی تعریف اور شان بیان کی، ان کی وجہ سے میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ تمہارے لیے یہی دنیا کی سزا کافی ہے جو تمہیں دنیا میں مل گئی ہے،

آگے میں نے تمہیں معاف کر دیا۔

دنیا میں ان کو حدِ قذف کی سزا ملی اور دوسرا یہ کہ نابینا ہو گئے تو بڑی تکلیف ہوئی۔ تو پھر آپ معافی مانگنے کے لیے آئے اور اس وقت بھی بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں قصیدہ لکھ کر آئے۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اب تو تم قصیدہ لکھ لائے ہو، اس وقت تو تم بھی تہمت لگانے والوں میں شریک ہو گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ بی بی! میں غلطی کر گیا، انسان ہوں، مجھے معاف کر دیں۔

طبلہ کے ساتھ قوالی اور نعت:

اس وجہ سے علماء نے یہ استدلال بھی نکالا ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت پڑھی جائے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی قصیدہ پڑھا جائے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی مدح پڑھی جائے تو ٹھیک ہے، سنت ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پڑھتے تھے، حضرت حسان رضی اللہ عنہ پڑھتے تھے، حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ پڑھتے تھے، بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قصیدے کہے ہیں اور حضرت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قصیدے فرمائے ہیں۔ تو جھگڑا ان میں نہیں ہے، بلکہ جھگڑا اس میں ہے کہ جو ہم نے قوالی کی طرز بنالی ہے، اس میں طبلے بھی ہیں، ڈھولک بھی ہے، تنبور بھی ہیں، ہارمونیم بھی ہے اور سر منڈل بھی، پتہ نہیں موسیقی کی کیا بلائیں ہوتی ہیں؟ یہ چیزیں ہیں۔ ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باجے گاجے کی جتنی چیزیں ہیں یہ شیطان کے آلات ہیں۔ تو ان کو استعمال کر کے کہنا کہ ہم حضور کی قوالی اور حضور کی مدح بیان کر رہے ہیں۔ تو مدح بیان کرنے کے لیے طریقہ وہی اختیار کریں جو سنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، یعنی یوں مثال سمجھیں! جیسے آج کل لوگ جھومر ڈالتے ہیں، ڈانس کرتے ہیں اور بھنگڑے ڈالتے ہیں۔ اب کوئی آدمی ایسا کرے کہ...... نعوذ باللہ...... کپڑے ٹھیک نہ پہنے ہوئے ہوں، بازاروں میں بھنگڑے ڈالے اور کہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بیان کر رہا ہوں۔ یہ شانِ نبی نہیں ہوگی، بلکہ یہ توہین نبی ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اِتنی بلند و بالا ہے کہ اس کو اسی انداز میں پیش کیا جائے جو سنت ہے۔

اسی طرح علماء یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ بعض نعت خواں نعتیں فلمی گانوں کی طرز میں پڑھتے ہیں، فلمی گانوں کی طرز پر ایک نعت لکھ دی جاتی ہے، پھر اس کی دھن پر نقل کر دی جاتی ہیں، جیسے فلمی گانا گایا جا رہا ہے۔ اس لیے علماء اس کو بھی منع کرتے ہیں کہ ہم پڑھ تو نعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم رہے ہیں اور نقل ان شیطانی گانوں کے ساتھ دے رہے

ہیں، جو شیطان کے بنائے ہوئے ہیں اور شیطانی امور میں استعمال ہوتے ہیں تو یہ غلط ہے۔ اسی لیے حکم ہے۔ اذان میں آواز بناتے چلے جانا منع ہے، بغیر تصنع اور بغیر تکلف کے اذان کہو۔ اسی طرح کوئی قاری اللہ کا قرآن پڑھے اور تصنع کرے اور بناوٹ کرے کہ اپنی آواز کو بنا رہا ہے کہ مد لمبی کرنی تھی تو چھوٹی کر دی، یا چھوٹی کرنی تھی تو لمبی کر دی، تاکہ میرا سانس نہ ٹوٹے، میرے زیر و بم میں فرق نہ آئے۔ تو ایسے پڑھنا ناجائز ہے۔

اسی طرح یاد رکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت پڑھنا محبت کی علامت ہے۔ سب کو اللہ نصیب کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قصیدہ پڑھنا سنت ہے، عملِ صحابہ ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعت پڑھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قصیدے لکھیں، لیکن ان میں یہ بھی خیال کرنا ہوگا کہ کوئی لفظ بھی ایسا نہ آئے جو عقیدے کے خلاف ہو، ان باتوں کا خیال رکھنا ہوگا، کیونکہ ایک جنگ میں فتح ہوئی، بچیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں خوشیاں منا رہی تھیں۔ جو گھر میں تین یا ڈبے پڑے ہوتے ہیں ان کو بجا رہی ہیں اور خوشیاں منا رہی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آنے لگیں تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی آئے، وہ روکنے لگے تو فرمایا کہ چھوڑو ان کو خوشی کرنے دو۔ بچیاں ہیں بے چاریاں خوش ہو رہی ہیں۔ تو ان بچیوں نے اس کے اندر ایک شعر کہہ دیا:

ع وَفِيْنَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ

''ہمارے پاس ایسا نبی ہے جو کل کی خبر بھی جانتا ہے۔''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیب کی باتوں کا علم اللہ کو ہے، مجھے نہیں ہے۔ یہ بات چھوڑ دو۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۴۰۰۱]

تو آدمی اگر نعت پڑھ رہا ہے اور کفر کر رہا ہے اس کو روکا جائے۔ تو کہیں گے کہ دیکھو! وہابی نعت کے بھی مخالف ہیں۔ وہ نعت کے مخالف نہیں ہوتے، وہ تو تمہارے کلامِ کفر کے مخالف ہوتے ہیں، وہ شرکیہ کلام کے مخالف ہوتے ہیں اور وہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے ہیں کہ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ غلط مصرعے میں لوگ غلط عقیدہ سمجھ جائیں گے۔ میرے سامنے یہ شعر پڑھا گیا ہے، اگر میں چپ رہا تو دوسروں کے لیے تو سند بن جائے گی کہ اگر غلط ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم منع کرتے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً منع کر دیا، حالانکہ نابالغ بچیاں ہیں، وہ ڈبے وغیرہ لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال میں خوشیاں منا رہی ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ شعر نہ کہو، مجھے کل کا پتہ نہیں ہے۔ اگر پتہ ہوتا تو میرے صحابہ احد میں شکست کیوں کھاتے؟ اگر مجھے کل کا پتہ ہوتا تو مجھے کبھی تکلیف پیش نہ آتی،

اگر مجھے کل کا پتہ ہوتا تو میرے صحابہ کو کبھی دکھ نہ ہوتا۔

﴿وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ ۚ﴾ [الاعراف:۱۸۸]

''اگر میں غیب کا جاننے والا ہوتا تو تمام بھلائیوں کی چیزیں سمیٹ لیتا اور کبھی مجھے کوئی برائی نہ پہنچتی۔''

﴿إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿١٨٨﴾﴾ [الاعراف:۱۸۸]

اللہ نے مجھے ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجا ہے، عالم الغیب تو بنا کر نہیں بھیجا ہے۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! اگر مدح ہے، قصیدہ ہے اور نعت ہے، اس میں کوئی کفر و شرک والا لفظ بھی نہیں ہے اور ساتھ باجے گانے ہامونیم اور فلمی طرزیں بھی نہیں ہیں تو ان کا پڑھنا بھی درست ہے اور سننا بھی درست ہے۔ آدمی پڑھے اور بار بار پڑھے اور ہر وقت پڑھے، کیونکہ کبھی کبھی شعر طبیعت پر ایسا اثر کرتا ہے کہ کلام اتنا اثر نہیں کرتا تو یہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر ہیں۔ خدا کی شان ہے!! ویسے طبعاً کمزور دل آدمی تھے کہ جنگ وغیرہ ہوتی تو بڑے ڈر جاتے تھے۔ بعض آدمی کمزور طبع ہوتا ہے، لیکن خدا کی قدرت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے حسان! تم نے جو جہاد کیا ہے وہ کسی اور نے نہیں کیا۔ لوگوں نے تیر چلائے اور تلواریں چلائیں، ہمارے شیروں نے کافروں کے سینے چھلنی کر ڈالے، کیونکہ جو تم ایک دفعہ قصیدہ پڑھ دیتے ہو پوری دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور کافر مرتے رہتے ہیں اور اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے۔ تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر، مدح خواں اور نعت خواں تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زلف تھے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے رشتہ داری بھی ہے، بی بی ماریہ رضی اللہ عنہا کی حقیقی بہن بی بی سیرین رضی اللہ عنہا حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔

جیسے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا شعر ہے:

؎ يَكْفِي بِنَا فَضْلًا عَلَى مَنْ غَيْرِنَا
حُبُّ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ إِيَّانَا

''یہی ایک فضیلت ہمارے لیے کافی ہے اور کسی فضیلت کی ہمیں ضرورت ہی نہیں ہے کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ملی اور تمہیں نہیں ملی۔''

ابن کثیر رحمہ اللہ نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے شعر سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ ''مَا'' اور ''مَنْ'' کے صلہ کا

اعراب موصولہ والا ہوتا ہے اور اسی اعراب کے تابع ہوتا ہے۔ اور بعض علمائے نحو کہتے ہیں ''بَعُوضَةً'' منصوب ہے، لیکن بدل نہیں، بلکہ حرف جار محذوف ہے، اصل کلام تھا: ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَیْنَ بَعُوضَةً إِلٰی مَا فَوْقَھَا'' اسی کو کسائی اور فراء نے ترجیح دی ہے۔ یہ دونوں نحو کے بڑے امام ہیں۔ اور ضحاک اور ابراہیم بن عبلہ ﷫ نے اس کو ''بَعُوضَةٌ'' پڑھا۔ اگر ہم رفع پڑھیں گے ''بَعُوضَةٌ'' تو اس کا معنی یہ ہے کہ ''تاء'' یہ ''باء'' کا صلہ ہے اور محذوف ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿تَمَامًا عَلَی الَّذِیْٓ اَحْسَنَ﴾ [الانعام: ۱۵۴]

''اَحْسَنَ'' زبر کے ساتھ ہے، اصل میں مرفوع ہے۔ یہاں ''ھُوَ'' محذوف ہے ﴿تَمَامًا عَلَی الَّذِیْٓ ھُوَ اَحْسَنَ﴾

علامہ سیبویہ ﷫ جو نحو کے بڑے امام ہیں، وہ فرماتے ہیں: جیسے محاورات میں کہتے ہیں ''مَا أَنَا بِالَّذِیْ قَائِلٌ لَکَ شَیْئًا'' اصل میں ''بِالَّذِیْ ھُوَ قَائِلٌ لَکَ شَیْئًا'' ہے، اسی طرح یہاں بھی ہے۔

﴿فَمَا فَوْقَھَا﴾ کی پہلی تفسیر:

''فَمَا فَوْقَھَا'' کے اندر بھی دو قول ہیں: جیسے محاوراتِ عرب میں کسی کے بخل کے بارے میں کہے کہ فلاں آدمی بڑا بخیل ہے، بڑا بخیل ہے۔ اور سننے والا کہے ''نَعَمْ! نَعَمْ! وَفَوْقَکَ ذٰلِکَ'' تم کہہ رہے، وگرنہ اس سے بھی بڑا ہے، یعنی اس سے زیادہ بخیل اور زیادہ حقیر ہے۔

کبھی کبھی ''فَوْقَ'' کا لفظ اصغر اور حقیر کے لیے استعمال ہوتا ہے اور آیت اس معنی میں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۴، البقرۃ: الآیۃ: إِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖۤ أَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا]

جیسا کہ حدیث میں ہے:

((لَوْ کَانَتِ الدُّنْیَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰہِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَا سَقٰی کَافِرًا مِنْھَا شَرْبَةَ مَاءٍ))

[سنن الترمذی، حدیث: ۲۳۲۰، باب: مَا جَاءَ فِيْ هَوَانِ الدُّنْيَا عَلَى اللّٰهِ]

''اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی مچھر کے پر کے برابر بھی کوئی اہمیت ہوتی تو اللہ کافروں کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا۔''

اپنے دشمن کو کون پانی دیتا ہے؟ لیکن اللہ کے نزدیک دنیا ذلیل چیز ہے، لہٰذا دشمنوں کو ملتی ہے اور اپنوں کو کم ملتی ہے۔

﴿فَمَا فَوْقَهَا﴾ کی دوسری تفسیر:

اور بعض نے کہا "فَمَا فَوْقَهَا" سے مراد اس سے بڑا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مچھر سے زیادہ اور کون سی چھوٹی چیز ہوگی؟ یہ قول قتادہ بن دعامہ رحمہ اللہ کا ہے اور اس قول کو ابن جریر رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۴، البقرۃ: الآیۃ: إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِیٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا]

مسلم شریف میں روایت ہے، جسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْ مُّسْلِمٍ يُّشَاكُ بِشَوْكَةٍ فَمَا فَوْقَهَا إِلَّا كُتِبَتْ لَهُ بِهَا دَرَجَةٌ، وَمُحِيَتْ عَنْهُ بِهَا خَطِيئَةٌ))

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۵۷۲، باب: ثَوَابِ الْمُؤْمِنِ فِيمَا يُصِيبُهُ ...]

"کوئی مسلمان ایسا نہیں کہ اس کو کانٹا لگے یا اس سے بھی زیادہ کوئی تکلیف پہنچے، مگر اللہ اس کے درجات بلند کر دیتے ہیں اور اس کے گناہ مٹا دیتے ہیں۔"

اب اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس بات کو حقیر نہیں سمجھتے کہ وہ چھوٹی چیز کی مثال بیان کرے یا بڑی کی مثال بیان کرے۔ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے پیدا کرنے کے اندر کسی قسم کی کوئی استحیاء نہیں فرمایا تو جب اللہ نے مکھی اور مچھر کو پیدا فرمایا تو پیدا کرنے میں اس کی قدرت کو کوئی استحیاء نہیں۔ تو مثال دینے میں کیا استحیا ہو سکتی ہے؟

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِیٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيرًا ۙ وَّيَهْدِي بِهٖ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ إِلَّا الْفٰسِقِينَ ﴾ [البقرۃ: ۲۶]

حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے اس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ﴾ کہ جو لوگ ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور یہ اللہ کی طرف سے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اتار دی گئی ہے۔

اور حضرت ابوالعالیہ فرماتے ہیں ﴿فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ﴾ يَعْنِي هٰذَا الْمَثَلُ" یعنی یہ مثال دینا حق ہے اور اللہ کی طرف سے ہے۔

﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ﴾ [البقرة:٢٦]

اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کیا کیا منشا ہے ایسی مثالیں بیان کرنے سے؟

[تفسیر ابن کثیر: ١/ ٦٥، البقرة: الآیة: إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا]

قرآن کے احکام پر عمل کرنا مشکل نہیں:

آپ دیکھیں کہ تیرہ تیرہ سال تک مدارس میں بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے اور اتنے مباحث پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً: قرآن کا ایک پارہ، اس کی تفسیر پورے سال پڑھائی جاتی ہے، کیونکہ اس میں تمام علوم سے بحث ہوتی ہے، ان علوم اور مباحث کا نتیجہ کیا ہے؟ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو کبھی یہ بحثیں پڑھائیں؟ حضور ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو کبھی ان مباحث سے روشناس کرایا؟ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب، بڑے بڑے قراء قرآن، اتنے بڑے مفسرین عظام اور پھر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم جو حقیقی معنوں میں قرآن میں ڈوب جاتے تھے اور جو حقیقی معنوں میں قرآن کو سمجھا کرتے تھے، انہوں نے اپنے آپ کو ان مباحث میں نہیں الجھایا۔ انہوں نے قرآن کی دعوت کو سمجھا کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن ہم سے چاہتا کیا ہے؟ قرآن نازل کرنے کا منشا کیا ہے؟ اور قرآن کا مطالبہ کیا ہے؟ جس دن سے قوم نے اس کو چھوڑا ہے، اسی دن سے قومیں بھٹک گئی ہیں، ذلیل ہوگئی ہیں اور آج تک ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہیں۔

اب آپ دیکھیں کہ اسلامی ملکوں کے اندر بھی اسلام کے آئین کو نافذ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ان مباحث میں پڑے ہوئے ہیں کہ رجم کا حکم قرآن میں ہے یا نہیں؟ ان بحثوں میں پڑنے کا انجام یہ نکلا کہ امت اللہ کے قانون کو توڑ بیٹھی اور اللہ کے قانون کے خلاف فیصلے کرتی رہی اور نتیجہ یہ نکلا کہ ظاہراً مسلمان اور باطناً کافروں سے بھی بدتر ہیں۔ جو قرآن کا منکر ہے وہ تو کافر ہے اور ایک جو قرآن کو ماننے کے باوجود بھی قرآن کے قانون کو نہیں مانتا وہ تو اس کافر سے بھی زیادہ بدتر ہے۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ [المائدة:٤٤]

قرآن جو ہم نے اتارا ہے اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے ان کے کفر میں کوئی شبہ ہے؟ ابھی تک ہم اسی بحث میں پڑے ہوئے ہیں کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے تو کہاں سے کاٹا جائے؟ صرف اس کی انگلیاں کاٹی جائیں یا اس کا

ہاتھ یہاں سے کاٹا جائے یا وہاں سے کاٹا جائے یا کندھے سے کاٹا جائے؟ انہی مباحث میں الجھ گئے اور جو اللہ کے قرآن کا حکم تھا ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ [المائدۃ: ۳۸] اس قانون سے محروم ہو گئے۔ ان مباحث عقلیہ میں پڑنے کے بعد قوم اسی الجھن میں پڑی ہوئی ہے اور رات دن بحثوں میں پڑی ہوئی ہے، حالانکہ موٹی سی بات ہے کہ ایمان والے کو یہ دیکھنا تھا کہ جس پاک نبی ﷺ پر اللہ نے یہ قرآن اتارا ہے ان کی زندگی میں ہاتھ کاٹا گیا یا نہیں کاٹا گیا؟ اور ہاتھ کاٹا گیا تو کہاں سے کاٹا گیا؟ تو بات ختم ہو گئی۔ اور اس کے بعد کسی بحث میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں، کسی پیچیدگی میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اب ان مباحث میں آ گئے کہ ہاتھ اگر کاٹ دیا گیا ہے تو چور کو تو سزا مل گئی تو کیا یہ ہاتھ چور کو واپس کر دیا جائے گا یا حکومت کی ملکیت ہو گا۔ اگر ہم چور کو واپس کر دیں گے تو وہ پلاسٹک سرجری کروا لے گا تو اسی طرح لگ جائے گا جس طرح وہ پہلے لگا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں تو سرجری نہیں تھی تو ان مباحث سے کیا تعلق ہے؟ حدیثوں میں موجود ہے کہ ہاتھ کاٹا گیا اور عبرت کے لیے لٹکا دیا گیا اور جس کا ہاتھ کاٹا گیا اس کو جلا کر خون بند کر دیا گیا۔ جب وہ زخم جل جائے تو وہاں پلاسٹک سرجری ریپیڈ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جب اس ہاتھ کو تین چار دن کے لیے لٹکا دیا گیا، تاکہ قوم اس سے عبرت پکڑے۔ اگر وہ چور کا ملک ہوتا تو وہ اسی وقت واپس کر دیا جاتا کہ تم اپنا یہ مال لے کر چلے جاؤ۔ یہ تمام چیزیں بڑی وضاحت کے ساتھ قرآن میں موجود ہیں، احادیثِ رسول پاک ﷺ میں موجود ہیں۔ جن لوگوں نے عمل کرنا تھا انہوں نے کبھی نہیں پوچھا۔ آپ اندازہ کریں کہ جن کا قرآن کی دعوت پر ایمان تھا اس سے اگر زنا بھی ہو گیا تو وہ خود آ گیا کہ مجھے رجم کرو، اس نے مسئلے نہیں پوچھے کہ قرآن میں آیت موجود ہے یا موجود نہیں؟ اس نے مسائل نہیں پوچھے کہ حضور! یہ آپ کا حکم ہے یا اللہ کا حکم ہے؟ اور جناب مدعی کوئی نہیں ہے، گواہ کوئی نہیں ہے، میں بلاوجہ پتھر کھانے کے لیے کیوں چلا جاؤں؟ اس کا ضمیر زندہ تھا، اس کو پتہ تھا کہ اللہ نے قرآن میں ایک سزا رکھی ہے اور اگر دنیا میں سزا مل گئی تو میں آخرت کی سزا سے بچ جاؤں گا۔ اس کا ایمان اس کو آرام سے بیٹھنے ہی نہیں دیتا تھا کہ غلطی ہو گئی ہے تو اب مجھے پاک ہونا ہے، حضور ﷺ کی خدمت میں آ گئے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

حضرت امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جیسے آدمی کہہ رہے ہیں کہ مسئلہ شریعت میں یہ تھا کہ اگر رمضان

المبارک کی راتوں میں کوئی آدمی عشا کی نماز پڑھ کر سو جائے تو سونے کے چاہے ایک گھنٹے بعد بھی اٹھ جائے تو کھانا بھی منع، پینا بھی منع اور عورت بھی حرام۔ یا تو جاگتا رہے اور سب کچھ کھانے کے بعد سو جائے پھر تو ٹھیک ہے۔ اگر اس کو پہلے نیند آ گئی تو آنکھ چاہے آدمی رات کو بھی کھل جائے تو اس کا اس وقت سے روزہ شروع ہو جاتا تھا اور رات کو میاں بیوی کا ملنا جائز نہیں تھا، لیکن دیکھیں! حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا آدمی پوچھ رہا ہے۔ اور آج ایک طالب بھی مسئلہ پوچھنے کے لیے نہیں آئے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا عبقری انسان جس کی ایک عظیم شخصیت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی بیٹھے ہیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں تو برباد ہو گیا، یا رسول اللہ! میں تو ہلاک ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر کیا ہو گیا ہے؟ کہا: یا رسول اللہ! رات کو اللہ نے بیوی سے ملنا منع فرمایا تھا، میں صبر نہ کر سکا اور رات کو بیوی سے مل بیٹھا تو لہٰذا میں تو برباد ہو گیا، مجھے سزا دیں، تاکہ وہ سزا میں دنیا کے اندر قبول کرلوں۔

انہوں نے قرآن کی دعوت کو سمجھا تھا کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن کیا چاہتا ہے؟ اور قرآن کیا مطالبہ کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ایسی رحمت فرمائی، قرآن نازل فرما دیا:

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ﴾ [البقرۃ:۱۸۷]

اللہ نے فرمایا: میرے مدنی! عمر کو بھی کوئی سزا نہ دو، ان کی غلطی کی وجہ سے قیامت تک امت کو چھوٹ مل گئی۔ اس نے تو غلطی کر لی، لیکن ہم نے پوری امت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما دیا ہے کہ اب رات کو کھانے کی بھی اجازت ہے، پینے کی بھی اجازت ہے اور میاں بیوی کے ملنے کی بھی اجازت ہے۔ جب تک صبح صادق نہ ہو کھاتے رہو، پیتے رہو اور میاں بیوی ملتے رہیں، کیونکہ اللہ جانتے ہیں کہ میرے بندوں کو بڑی تکلیف تھی کہ دن کو بھی نہیں مل سکتے تھے۔ بعض آدمی بڑی قوت والے ہوتے ہیں، ان سے صبر نہیں ہوتا، اس لیے اللہ پاک نے رحمت فرما دی۔

[سنن أبي داود، حديث:۵۰۶، باب: كيف الأذان؟]

سود کے خلاف قرآن کا مطالبہ:

تو اصل قرآن اس لیے آیا تھا کہ ہم قرآن مقدس کی دعوت کو سمجھیں اور قرآن پاک کے مطالبے کو سمجھیں کہ یہ قرآن ہم سے کیا چاہتا ہے؟ لیکن ہم نے مباحث میں، نکات میں، اشارات میں اور انہی بحثوں میں قوم کو ایسا اُلجھا ڈالا ہے

کہ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج قرآن کی تنفیذ اتنی مشکل ہوگئی ہے...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ کفر کے ماحول میں قرآن کا نفاذ اتنا مشکل نہیں تھا، جتنا مسلمانوں کے اندر اس کو نافذ کرنا مشکل ہوگیا ہے، کیونکہ وہ تو کافر تھے، ان کے لیے تو ایک حکم آ گیا:

﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ [التوبۃ:۲۸]

بات ختم ہوگئی کہ مشرک پلید ہے، نکال دو، لیکن مسلمان کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، کلمہ پڑھتا ہوں، قرآن کو سینے سے لگاتا ہے، قرآن کو چومتا ہے، بوسے دے رہا ہے، قرآن کو سر پر رکھ رہا ہے، ریشمی غلافوں میں لپیٹ رہا ہے اور قرآن جو مطالبہ کرتا ہے تو کہتے ہیں بہرحال بات تو بالکل ٹھیک ہے، ہمارا اللہ کے قرآن پر ایمان ہے، لیکن حضرت! بینک کے بغیر گزارہ نہیں ہوسکتا ہے، سود کے بغیر ہم انڈسٹری کیسے لگائیں؟ اور جناب سود کے بغیر فیکٹری کیسے چلائیں؟ اب دیکھیں! ہم کپاس کا کام کریں گے تو ہم نے تو لاکھوں روپے کی کپاس خریدنی ہے، اتنا کہاں سے ملے گا؟ مجبوراً ہماری لمٹ بڑھے گی تو بینک ہم سے سود لے گا۔ خدا کے بندے! جب پورے معاشرے کو تم نے سودی بنادیا ہے، اس لیے مشکل ہو رہی ہے، ورنہ اگر لینے والا بھی سود کو حرام کو سمجھے اور دینے والا بھی سود کو حرام سمجھے تو کسی لمٹ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر معاشرے میں اسلام ہو اور مجھے پتہ ہو کہ میں نے دو ہزار من کپاس فلاں فیکٹری کو بھیجی ہے اور میرا پیسہ بھی نہیں مرے گا، میرا پیسہ مجھے صحیح ملے گا، ایک پیسے کی بھی بددیانتی نہیں ہوگی تو میں پیسے کا مطالبہ بھی نہیں کروں گا۔ آج کتنے بڑے بڑے زمیندار ہیں، جن کی بیس ہزار من کپاس فیکٹری میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم فیکس کریں گے تو آپ کو ٹیلی فون کردیں گے۔ اور زمیندار کہتے ہیں کہ جب ہمیں ضرورت ہوگی ہم پیسے لے لیں گے۔ اگر ہمارا اسلام کا معاشرہ ہوتا، کپاس بھیجنے والا بھی دیانتدار ہوتا، وہ اندر اینٹیں ڈال کر نہ بھیجتا کہ پہلے دو ہزار من پانی کپاس پر چھڑکاؤ کرے، تاکہ وزن کریں تو کپاس بھاری نکلے اور لینے والے حضرات بے ایمان نہ ہوتے کہ اڑھائی من پورا ہو تو اس وقت کٹوتی لگا دو اور دس سیر ہم بعد میں کاٹیں گے، بیس سیر من ایک بورے کے پیچھے کٹ جائے گی۔ اور جس فیکٹری میں دس ہزار بار آئے اوسطاً دس سیر اگر کاٹا جائے تو فیکٹری والا کتنی کپاس حرام کی کھا گیا؟ تو اب اگر سود نہیں آئے گا، حرام نہیں آئے گا تو کیا آئے گا؟

آپ معاشرے کو اسلامی بنادیں۔ اب آپ کے ملک میں اللہ کی رحمت سے کتنے لوگ ہیں جو سود کے بالکل

قریب نہیں جاتے۔ انہوں نے باقاعدہ مضاربت پر اپنے کاروبار کھول لیے کہ بھائی! ہم نے دو کروڑ کی انڈسٹری لگانی ہے۔ جو آدمی ہمارے ساتھ حصہ رکھنا چاہے حصہ رکھے۔ پارٹی ایماندار تھی، لوگوں کی لائنیں لگ گئیں، یعنی انہیں دو کروڑ ضرورت تھا، تین کروڑ جمع ہو گیا۔ انہوں نے کہا: ہم نے تو دو کروڑ سے کام کرنا ہے، باقی واپس لے جاؤ۔ کسی نے دس ہزار کا شیئر خرید لیا، کسی نے لاکھ کا، کسی نے دو لاکھ کا، کسی نے دس لاکھ کا اور کسی نے پچاس لاکھ کا۔ اپنے پیسے آ گئے اور اپنے پیسے سے انڈسٹری لگائی، سود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تو اس لیے ہمیں یہ چیزیں کیوں مشکل نظر آتی ہیں؟

جدید حرام کاروبار:

نام بدل کر حرام کو حلال کرنا۔ اب ایسے مولوی پیدا ہو گئے کہ انہوں نے کہا کہ سود علیحدہ چیز ہے، ربوا علیحدہ چیز ہے اور بینک کے جو سروسز چارجز ہیں علیحدہ چیزیں ہیں۔ جو علیحدہ چیز ہے اور انشورنس پالیسی علیحدہ چیز ہے، اس سے تو غریبوں کا تحفظ ہو رہا ہے۔ اگر ایک غریب آدمی مر جاتا ہے تو اس کے بچوں کے مستقبل کا ذریعہ بنتے ہیں اور جوئے میں تو آدمی ہار جاتا ہے، حالانکہ واقعی یہ تمام چیزیں جواء ہیں۔ یہ ہے کہ اس جوئے کو اچھا لباس پہنا دیا گیا ہے، جیسے آدمی خالص برانڈی بوتل میں ڈال دے اور اوپر لکھ دے ''شراب المؤمنین'' یا اوپر ''شراب الصالحین'' لکھ دے تو وہ اندر تو پاک نہیں ہو جائے گی، وہ اندر تو برانڈی ہی رہے گی، اندر تو شراب ہی رہے گی، نام لکھنے سے تو کچھ نہیں ہو جائے گا۔ تو جوئے کا کیا معنی ہوتا ہے کہ جوا کھیلنے والے دس دس ہزار روپے پھینک رہے ہیں، میرا پتہ نکل آیا تو میں نے سب کے دس ہزار لے لیے، اس کا نام جوا ہے۔ میں نے پتہ دس ہزار کا ڈالا تھا اور لے لیا نوے ہزار۔ تو دس ہزار تو میرے اپنے تھے، وہ بھی مجھے مل گئے اور مزید نوے ہزار دوسروں کے بھی مجھے بغیر محنت کے مل گئے کہ صرف نمبر اس پتے کے مطابق پڑ گیا یہ جوا ہوتا ہے۔

اسی طرح انشورنس ہے۔ ایک لاکھ آدمی کی انشورنس کی اور ایک ایک ہزار روپیہ فیس کا لیا، ایک کروڑ جمع ہوا۔ سال میں دو حادثے ہوئے، دو لاکھ ادا کر دیا، یا دس حادثے ہوئے اور باقی کے ہضم ہو گئے اور دس حادثوں کی پیمنٹ کر دی تو اسی کا نام جوا ہے۔ جس نے ایک قسط ادا کی تھی تو اس کو پالیسی کا دو لاکھ مل گیا، جس غریب نے پوری پیمنٹ کی تھی حادثہ نہیں ہوا تو وہی پیسے سود ملا کر مل گئے اور سود مثال سات پرسنٹ ملا۔ انہوں نے تمہارا وہی پیسہ سترہ

پرسنٹ سود پر ڈال دیا اور سات تمہیں دے دیا اور دس خود کھاتے رہے۔ کوئی گھر سے نہیں دیتا ہے، یہ تو ایک ہیر پھیر ہے، ایک کاروبار ہے اور یہودیوں کا بنایا ہوا جال ہے، جس کے اندر قومیں الجھتی جارہی ہیں۔

آپ یقین کرلیں! میرا اپنا تجربہ ہے، میرے اپنے علاقوں میں جن غریب زمینداروں نے ٹریکٹر سود پر لیے، زرعی بینکوں سے قرضہ لے کر ٹریکٹر خریدے، تجربہ ہے کہ ان کی زمینیں بک گئیں، پھر جا کر پیسے ادا ہوئے۔ اور جن لوگوں نے نقد پر لیے تھے، اللہ کی رحمت سے ان کو برکت ہوئی، منافع ہوا اور ایک سال کے بعد ان کے ایک ٹریکٹر کی بجائے دو ٹریکٹر ہو گئے اور حوادث سے بھی محفوظ رہے اور فصلات بھی محفوظ رہیں اور کامیاب رہے۔ جس نے سود کی لعنت میں ہاتھ ڈالا، انجام کاروبار برباد ہوا۔ ایک آدمی بڑے اونچے درجے پر سود پر چلا گیا، اولاد پاگل ہوگئی یا بیوی بے حیا ہو کر نکل گئی یا خود کینسر کا مریض ہو گیا، اللہ نے کسی نہ کسی شکل میں تو عذاب کا نمونہ دکھانا ہے تو اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ ہم نے قرآن کو اس لیے پڑھا ہے:

''ہم تو بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں۔''

مسلمان کا کام ہی شرعی احکام کو ماننا ہے، اسی لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ جو مومن ہیں ان کا ایمان ہوتا ہے کہ اللہ کا حکم ہے اور خالق مالک کا حکم ہے، اسی میں ہماری بہتری ہے، اس میں فلاح ہے، اسی میں ہماری کامیابی ہے۔ اگرچہ مگر چہ، چنانچہ چونکہ میں نہیں پڑتا اور کہتا ہے: ''اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ صَدَّقْنَا''۔

حدیبیہ کی جو صلح ہو رہی ہے وہ بظاہر سمجھ نہیں آرہی، لیکن جب حضور ﷺ نے حکم دے دیا کہ میں نے مشرکین کے ساتھ صلح کر لی ہے تو بس مان لیا کہ حضور! ہمیں سمجھ آئے یا نہ آئے، حتیٰ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اتنے پریشان تھے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اٹھو، اپنے جانور ذبح کر دو، بال منڈاؤ اور احرام کھول دو تو سارے صحابہ بیٹھے رہے۔ حضور ﷺ غصہ میں اپنے خیمے میں گئے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: یا رسول! کیا وجہ ہے کہ آج آپ کو بڑا جلال ہے؟ فرمایا: میں نے صحابہ کو حکم دیا ہے کہ اپنے جانور ذبح کرو، سر منڈاؤ اور احرام کھول دو۔ اس دفعہ عمرہ نہیں ہوگا، اگلے سال...... ان شاء اللہ...... عمرہ قضا کریں گے، لیکن صحابہ میں سے ایک آدمی بھی اپنا قربانی والا جانور ذبح کرنے کے لیے نہیں اٹھا، میرے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اتنی سمجھدار تھیں، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! صحابہ بڑی لمبی امیدیں لگا کر اور آٹھ دن اونٹوں پر سوار ہو کر اور پیدل احرام باندھ کر مدینہ سے عمرہ کے لیے روانہ ہوئے تھے، اب چونکہ عمرہ نصیب نہیں ہو رہا، صحابہ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ جبرئیل علیہ السلام کو نازل کر دے کہ

چلو عمرہ کے لیے۔ وہ انتظار میں ہیں، وگرنہ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کے حکم کی وہ تعمیل نہ کریں۔ آپ اپنا قربانی کا جانور ذبح کریں اور دیکھیں کہ صحابہ کیا کرتے ہیں؟ حضور ﷺ خیمہ سے باہر تشریف لائے، اپنا جانور منگوایا اور اس کو ذبح کیا۔ اب صحابہ کو یقین ہو گیا کہ اب عمرہ کی کوئی امید نہیں رہی تو سب جانور ذبح کرنے کے لیے دوڑ پڑے، سب نے تعمیل حکم کر دی کہ اب امید ختم ہو گئی۔ اگر اللہ نے عمرہ کرانا ہوتا تو اپنے نبی کو احرام نہ کھولنے دیتے۔ تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ اب منشاء خداوندی یہی ہے کہ جو ہمیں حضور ﷺ نے حکم دیا، اس کی تعمیل کریں۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۲۷۳۱، باب: الشُّرُوطِ فِي الْجِهَادِ وَالْمُصَالَحَةِ...]

آپ مجھے ایک صحابی دکھلا دیں جس نے حضور ﷺ سے جا کر یہ پوچھا ہو کہ داڑھی اتنی رکھوں یا اتنی رکھوں؟ بڑی رکھوں یا چھوٹی رکھوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: داڑھی رکھو تو سب نے داڑھی رکھی۔ جب حضور ﷺ کا حکم ہے تو آگے چونکہ چنانچہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر ابحاث میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ کا حکم آ گیا:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ [الحشر: ۷]

''جو میرا مدنی حکم دے پکڑ لو اور جس چیز سے منع کریں رک جاؤ۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: شراب حرام ہے۔ ایک صحابی دکھلائیں کہ اس نے آپ کی خدمت میں آ کر کہا ہو کہ حضور! مجھے بیس سال سے عادت ہے، میرے لیے ذرا چھوڑنا مشکل ہے، حضور! میں ایک یا دو مہینے میں چھوڑ دوں گا، آہستہ آہستہ خوراک کم کروں گا، طبیعت ذرا برداشت کے قابل ہو جائے، لیکن آپ کو ایسا ایک صحابی نہیں ملے گا، شراب کا گلاس ہاتھ میں تھا توڑ دیا اور بات ختم۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے دیکھا کہ مدینہ کی گلیوں میں شراب ایسے بہہ رہی تھی جیسے ندیاں چلتی ہیں، کیونکہ ہر گھر میں شراب بھری ہوئی تھی، شراب تو ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ پانی نہیں پیتے تھے وہ تو شراب پیتے تھے، وہ تو اپنے اونٹوں کو بھی شراب پلاتے تھے، اپنے گھوڑوں کو بھی جنگ میں شراب پلاتے تھے، ان کی تو شراب کا یہ عالم تھا کہ ان کی قوم شرابی تھی، لیکن جب اللہ نے حکم دیا کہ شراب حرام ہے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے مدینہ کی گلیوں میں ایک چکر لگایا ''یَا اَیُّهَا النَّاسُ'' خبردار! لوگو! اللہ نے شراب حرام کر دی۔ جس آدمی کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا اس نے یہ نہیں کہا کہ میں یہ تو پی لوں، میں اور نہیں پیوں گا۔ اس نے کہا: حرام کا حکم پہنچ گیا تو بات ختم۔

حضور ﷺ نے فرما دیا: جادو ختم کہ جادو حرام ہے، پھر کوئی پوچھنے نہیں گیا کہ حضور! وہ جادو انتر منتر والا حرام

ہے یا جنتر منتر والا بھی حرام ہے؟ بنگال والا جادو حرام ہے یا سینگال والا جادو حرام ہے، انہوں نے کہا: جب جادو حرام ہے تو بس حرام ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کتا حرام، بکری حلال۔ اب کسی نے نہیں پوچھا کہ کالا کتا حلال ہے یا حرام ہیں؟ پالتو کتا حرام ہے یا جنگلی کتا حرام ہے؟ بڑے سر والا حرام ہے یا چھوٹے سر والا حرام ہے؟ چھوٹی ٹانگوں والا حرام ہے یا بڑی ٹانگوں والا حرام ہے؟ کبھی ایک صحابی کا سوال دکھادیں۔

دوسری شادی:

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے چار بیویوں کی اجازت دی ہے تو بات ختم۔ کسی کے گھر میں پانچ ہیں تو ایک کو طلاق دو، چار رکھ سکتے ہو، اسی وقت کسی کے گھر میں سے ایک فارغ، کسی کے گھر میں تین فارغ اور کسی کے گھر سے دس عورتیں فارغ، چار رکھ سکتے ہو، تو اب کوئی پوچھنے نہیں آیا کہ پہلی بیوی سے اجازت لیں یا نہ لیں؟ اگر پہلی بیوی نہ مانے تو تو کیا ہم دوسری شادی کر سکتے ہیں؟ کہ جب دوسری شادی کریں تو پہلی بیوی کو تکلیف ہوگی، اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ کوئی پوچھنے کی ضرورت نہیں، عدل کر سکتے ہو تو چار بھی رکھ سکتے ہو۔ لمبی چوڑی بحثوں میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں، کون راضی ہوتا ہے کہ ایک پلیٹ تو مجھے روزانہ کھانے کو ملتی ہے وہ کسی اور کے گھر میں چلی جائے وہ تو راضی نہیں ہوگی، بلکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام کیا چاہتا ہے؟ اسلام یہ چاہتا ہے کہ زنا نہ ہو، گناہ نہ ہو، آدمی آوارہ کتے کی طرح پھر کر لوگوں کے گھروں میں لڑکیاں نہ ڈھونڈتا پھرے۔ اگر ایک بیوی سے گزارہ نہیں تو دوسری شادی کر لے، اگر دو کے ساتھ بھی گزارہ نہیں ہو رہا تو تین کر لے اور تین کے ساتھ بھی اس کی زندگی کا گزارہ نہیں ہو رہا چار کر لے۔ اپنا آرام سے رہے، حرام سے بچا رہے اور عزت سے رہے۔ یہ تو نہیں کہ اگر معشوق رکھنا چاہے تو سو رکھ لے اور بیوی راضی ہے۔ اور دوسری شادی کرنا چاہے تو سارا خاندان ڈنڈے لے کر کھڑا ہے، یعنی حرام کرے تو خاندان راضی ہے کہ مرد ایسے کرتے رہتے ہیں، مردوں کا منہ کسی نے روکا ہے؟ جانور ہے، وہ تو چرتا رہتا ہے، اس کی مرضی ہے کبھی گھاس میں منہ ڈالے کبھی کانٹے میں منہ ڈال دیا، لیکن جب ان کو کہو کہ شادی کر رہا ہے تو کہتے ہیں کہ ہماری بچی کو طلاق دے، بچے ہم لے جائیں گے، ہم کورٹ میں جائیں گے، ہم تمہاری جائیداد چھین گے اور ہم تم کو مار ڈالیں گے۔ وجہ کیا ہے؟ ہم کہاں سے مسلمان ہیں؟

فرشتوں کی کثرتِ تسبیح:

حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور ﷺ بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے اپنی نظر مبارک اٹھا کر آسمان کی طرف

دیکھا اور آپ نے فرمایا کہ آسمان سے چڑ چڑاہٹ کی آوازیں آرہی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ آنی بھی چاہئیں، کیونکہ آسمان میں ایک بالشت کے برابر بھی جگہ خالی نہیں ہے، مگر کوئی نہ کوئی اللہ کا فرشتہ رکوع میں ہے، سجدے میں ہے اور اللہ کی تسبیح و تقدیس بیان کر رہا ہے۔ جب اتنی بڑی مخلوق آسمانوں میں ہوگی تو آسمان سے آوازیں تو آئیں گی۔ اس لیے فرمایا:

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ﴾ [المدثر:٣١]

میرے مدنی! فرشتوں کا جو عدد ہے اس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

فاسق کا لغوی معنیٰ:

﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا ۙ وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ﴾ [البقرة:٢٦]

اس کو گمراہی دی اور اس کو ہدایت دی۔ اللہ نے فرمایا: گمراہ نہیں ہوتے، مگر وہ لوگ جو میرے علم میں ہیں کہ یہ فاسق ہیں۔

''فَاسِقِيْنَ'' کا لفظ ''كَافِرِيْنَ'' پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اصل فسق کا معنی ہے ''اَلْخُرُوْجُ عَنْ طَاعَةِ اللّٰهِ'' (اللہ کی فرمانبرداری سے نکلنا) اس کا نام فسق ہے، اس لیے محاوراتِ عرب میں چوہے کو ''فُوَيْسِقَةٌ'' کہتے ہیں، یہ بھی فاسق ہے، کیونکہ یہ بھی نکلنے کے مختلف راستے بناتا ہے۔ داخل ہونے کا ایک راستہ ہوگا اور نکلنے کا دوسرا راستہ ہوگا۔ فاسق کا معنی ہے اللہ کی فرمانبرداری سے نکلنے والا۔ تو جو بالکل نکل گیا وہ کافر کے درجہ پر پہنچ گیا۔ اور ایک فاسق وہ ہے جو کافر تو نہیں، لیکن گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے یا صغیرہ گناہ کو بار بار کرتا ہے وہ بھی فاسق ہے۔

حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا ﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا ۙ﴾ کہ اس سے بہت زیادہ گمراہ ہوتے ہیں، یعنی منافق جن کے دلوں میں نفاق ہے ﴿وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ﴾ اور قرآن سے ہدایت ایمان والے حاصل کرتے ہیں، یہ جو منافق اور کافر ہیں ان کی گمراہی پر گمراہی بڑھتی گئی، حالانکہ وہ جانتے بھی ہیں کہ اللہ کا قرآن حق ہے، پھر بھی انکار کر رہے ہیں۔

﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا ۙ وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴾ [البقرة:٢٦]

حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں ''فَاسِقِيْنَ'' سے مراد منافق ہیں، جو اللہ کی فرمانبرداری سے نکلنے

والے ہیں۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اصل وجہ یہ ہے کہ قرآن جب نازل ہوا تو یہ منافق، کافر اور فاسق اللہ کی اطاعت سے نکلے۔ جب انہوں نے خود فسق اختیار کیا تو اللہ نے ان کے لیے ہدایت کے راستے بند کر دیئے۔

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مثالیں بیان فرمائی ہیں کہ حضرت ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ اس سے خوارج کا فتنہ مراد ہے کہ وہ بظاہر مسلمان تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور بظاہر وہ قرآن پاک کی تلاوت بھی کرتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کے قرآن کے احکام کو من و عن اس طرح نہ مانا جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، بلکہ اس کے اندر اپنی طرف سے تاویلات کیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین اور جمہور صحابہ کی متفق علیہ باتوں کو چھوڑا اور ایک نیا راستہ پیدا کیا۔ اسی لیے خوارج کو خوارج کہا جاتا ہے کہ وہ اہل سنت والجماعت سے خروج کر گئے اور اپنی من مانی تاویلات کرتے رہے۔ تو آیت کا معنی یہ ہوا کہ جیسے کافر کفر میں بڑھتا چلا جاتا ہے، اسی طرح گمراہ فرقے جب قرآن مقدس کو پڑھتے ہیں اور اپنی تاویلات کرتے ہیں تو وہ بھی گمراہیوں میں بھٹک جاتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۵، البقرۃ: الآیۃ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا]

اصل اہل قرآن کون لوگ ہیں؟

اسی طرح جیسے موجودہ دور میں بہت بڑا فتنہ انکارِ حدیث کا شروع ہوا۔ وہ لوگ بظاہر اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں اور وہ اپنی کتابوں میں، رسالوں میں، تحریرات میں اور تقریروں میں یہی تاثر دیتے ہیں کہ ہم سب سے زیادہ قرآن کو ماننے والے ہیں، یعنی وہ...... نعوذ باللہ...... قرآن کا سہارا لے کر احادیثِ رسول کا انکار کر دیتے ہیں، حالانکہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار دراصل قرآن کا انکار ہے۔ کیونکہ دنیا میں کہیں قاعدہ نہیں ہے کہ آدمی لفظوں کو تو مان لے اور معنی کو تسلیم نہ کرے۔ یعنی ایک آدمی کو آرڈر لکھیں، وہ کہے کہ آپ کے حروف، آپ کے الفاظ، آپ کے جملے اور آپ کے لکھے ہوئے احکام میری آنکھوں پر، لیکن میں اس پر عمل نہیں کروں گا اور معانی کو بدل ڈالوں گا۔ اس لیے جب تک ہم حدیث رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائیں گے اس وقت تک ہم قرآن کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور حدیث پر ایمان لانے کا حکم بھی تو ہمیں قرآن پاک نے دیا ہے، اللہ کے قرآن ہی نے فیصلہ فرما دیا کہ میری اطاعت

کرو اور میرے رسول پاک ﷺ کی اطاعت کرو۔ اللہ پاک نے فرمایا:

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء:۸۰]

''جس نے میرے رسول کی اطاعت کی اس نے گویا میری اطاعت کی۔''

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا آتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر:۷]

''جن چیزوں کا تمہیں اللہ کے پیغمبر حکم کریں ان کو پکڑ لو اور جن کو روکیں ان سے رک جاؤ۔''

تو اب...... نعوذ باللہ...... کتنا خوش کن نعرہ ہے ''اہل قرآن'' کہ اس کے اوپر لیبل کتنا پیارا ہے کہ ہم تو اہل قرآن ہیں۔ ایک اسلام، ایک دین، ایک اللہ، ایک کعبہ اور ایک رسول، یعنی کتنا اعلیٰ نعرہ لیا ہوا ہے اور پھر یہ ہے کہ ہم حدیث پاک کا اس لیے انکار کر رہے ہیں یہ تو اڑھائی سو سال بعد لکھی ہوئی چیز ہے۔ پتہ نہیں کہ یہ رسول پاک ﷺ کا فرمان بھی ہے یا نہیں ہے؟ پتہ نہیں یہ حضور ﷺ نے فرمایا بھی تھا یا نہیں فرمایا تھا؟ تو اب نتیجہ کیا نکلے گا کہ جب آپ پہلے اسٹیٹ پر آئیں گے، حدیث رسول پاک ﷺ کا انکار کر بیٹھیں گے۔ تو اب قرآن کا انکار کرنا آسان ہو جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ جب آدمی ائمہ اربعہ کے خلاف کرتا ہے تو بظاہر تو اس کے پاس خوش کن نعرہ ہوتا ہے کہ ہم خود ایک بات کو سمجھ رہے ہیں، لیکن کچھ عرصہ کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب بات سمجھ نہ آئی تو ٹھوکر کھائی اور صراط مستقیم سے ہٹ گیا۔ اور جب آدمی ائمہ کرام کا بھی ادب کرے گا، یعنی کوئی آدمی حضرت امام احمد بن حنبل، امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کی شان میں گستاخی نہیں کر سکتا، ان کی بے ادبی نہیں کر سکتا تو صحابہ رضی اللہ عنہم یا حضور ﷺ کا بے ادب کیسے ہو سکتا ہے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی اس کے اندر حکمتیں ہیں۔ اور پھر یہ کہہ دینا کہ اللہ نے قرآن کو محفوظ رکھنے کا وعدہ کیا ہے، لیکن حدیث کو محفوظ رکھنے کا وعدہ ہی نہیں کیا تو کیا مطلب ہے کہ لفظ محفوظ رہیں گے، معنی ختم ہو جائے گا؟ تو پھر کیا محفوظ ہو گیا کہ قرآن پاک کے لفظ محفوظ رہیں اور اس کا معنی ختم ہو جائے اور معنی سمجھانے والے حضرت محمد رسول ﷺ ہیں۔

اور اسی طرح یاد رکھیں کہ ان کے جو شبہات ہیں کہ اڑھائی سو سال کے بعد حدیث لکھی گئی۔ حدیث لکھے جانے کا معنی یہ ہے کہ تدوین حدیث کا باقاعدہ کام اڑھائی سو سال کے بعد شروع ہوا، ورنہ حضور ﷺ کے فرمان

حضور ﷺ کی زندگی میں ہی لکھے جاتے تھے، لیکن اب ان کو ترتیب دینا، ان کو جمع کرنا، ان کو مدون کرنا اور پھر ان کو صحاح یا سنن کے طریقے کے اندر کتابوں کی شکل میں لے آنا، یہ سارا کام دو اڑھائی سو سال کے بعد ہوا۔ جیسے قرآن میرے سرکار ﷺ پر اترا، لیکن جمع کرنے کا کام حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شروع ہوا، قرآن لکھا ہوا تو موجود تھا اور قرآن سینوں میں بھی موجود تھا۔

اور حدیث کی صحت کی سب سے بڑی دلیل آپ یہ دیکھیں کہ آج جوامت پورے عالم اسلام میں نمازیں ادا کر رہی ہے، یعنی پانچ نمازیں، فجر کی دو رکعتیں، ظہر کی چار رکعتیں، عصر کی چار رکعتیں، مغرب کی تین رکعتیں اور عشا کی چار رکعتیں، یہ قرآن میں تو کہیں نہیں، کسی جگہ قرآن مقدس میں یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ آپ فجر کی نماز پڑھیں تو دو رکعت پڑھیں، کسی جگہ یہ نہیں لکھا کہ فجر کی نماز پڑھیں تو قراءت زور سے پڑھیں، ظہر و عصر میں آہستہ پڑھیں، قرآن کی کسی آیت میں یہ نہیں لکھا ہوا کہ عشا کی نماز کے اندر چار رکعتیں اور مغرب کی نماز کے اندر تین رکعتیں ہیں۔ یہ ہمیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے سکھلایا ہے۔ آج چودہ سو سال گزر گئے اور آج پندرھویں صدی میں ہم داخل ہو گئے، آج تک کوئی کلمہ پڑھنے والا مسلمان یہ نہیں کہہ سکا ہے کہ مغرب کی تین رکعتیں نہیں ہیں، بلکہ چار رکعتیں ہیں، یا عشا کی چار رکعتیں نہیں، تین رکعتیں ہیں، یا فجر کی دو نہیں تین ہیں تو حدیث اگر محفوظ نہ ہوتی تو یہ عمل کیسے محفوظ ہے؟ چودہ سو سال تک ایک طرز پر عمل چلا آ رہا ہے اور ذرے کے برابر کوئی فرق نہیں آیا۔

اب کوئی اختلاف کا بہانہ یہ ڈھونڈے کہ کچھ لوگ آمین آہستہ سے کہتے ہیں اور بعض زور سے کہتے ہیں، حالانکہ یہ اصول کا مسئلہ تو نہیں ہے۔ اصول کا مسئلہ یا فرائض کا مسئلہ ادائیگی نماز ہے کہ اتنی رکعتیں ہیں، ان میں رکوع ہے، قعود ہے۔ اس کے اندر امت اسلام کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور بعض مسائل اختلافیہ میں افضل اور اولیٰ کا فرق ہے کہ بعض ائمہ کے نزدیک آمین کا زور سے کہنا زیادہ ثواب رکھتا ہے، زیادہ اعلیٰ ہے اور زیادہ اولیٰ ہے اور بعض ائمہ نے کہا کہ آمین چونکہ دعا ہے اور دعا آدمی جتنا آہستہ سے مانگے اتنا زیادہ اللہ کو پسند ہے، لہٰذا انہوں نے آہستہ کو ترجیح دی۔ آج تک امت میں ایسا کوئی فرد پیدا نہیں ہوا جس نے یہ کہا ہو کہ جو آمین آہستہ کہتے ہیں ان کی نماز نہیں ہوتی یا جو زور سے کہے نماز نہیں ہوتی ہے، وہ تو صرف افضل اور غیر افضل کے مسائل ہیں اور اعلیٰ و اولیٰ کے مسائل ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی آدمی مثال بنائے کہ ان کا تو نماز میں ہاتھ باندھنے میں اتفاق نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے، ہاتھ باندھنے کے بارے میں سینے سے نیچے باندھنا بھی ثابت ہے، ناف پر بھی ثابت ہے اور ناف سے نیچے

باندھنا بھی ثابت ہے۔ یہ تو اللہ کی شان ہے کہ اللہ نے امت کے لیے آسانیاں پیدا فرما دیں، جس آدمی نے جہاں ہاتھ باندھ لیا اللہ نے نماز قبول کر لی۔ یہ تو راحت اور رحمت ہے میرے اللہ کی طرف سے، یہ تو جھگڑے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ تو اس لیے جیسے قرآن پاک محفوظ ہے، ہمارا ایمان ہے کہ اسی طرح اس کے لفظ بھی محفوظ ہیں۔ معنی بھی محفوظ ہے اور فرمانِ رسول پاک ﷺ بھی محفوظ ہے۔ اور جس طرح ہم اللہ کے حکم کے پابند ہیں اسی طرح ہم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے حکم کے پابند ہیں۔ اور یہ بھی ہمارا ایمان ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ دین کے معاملہ میں کوئی حکم اللہ کے سوا دیتے ہی نہیں، دنیاوی معاملات علیحدہ ہوتے ہیں، دنیاوی معاملات میں بات ذاتی نہج پر آجاتی ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی بیویوں سے کوئی معاملہ فرمایا، ذاتی محبت میں کوئی معاملہ فرمایا، حضور ﷺ نے کسی کو باغبانی میں کھجوروں کے بارے میں کوئی مشورہ عطا فرمایا، ورنہ جتنے احکام دیے ہیں اللہ کے نبی اس وقت تک نہیں دیتے جب تک اللہ اس پر حکم جاری نہیں فرما دیتے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ [النجم: ۳،۴]

اللہ نے فرمایا کہ میرے نبی اپنی خواہش سے نہیں بولتے، بلکہ وہ تو وہ بولتے ہیں جو اللہ ان پر وحی فرماتے ہیں۔

گمراہ فرقوں کا ہتھیار:

اس لیے جتنے فرق ضالہ دنیا میں پیدا ہوئے ہیں وہ اسی طرح لوگوں کے دل و دماغ میں شبہات پیدا کرتے ہیں۔ جیسے روافض پیدا ہوئے، خوارج پیدا ہوئے، اسی طرح معتزلہ کے فرقے پیدا ہوئے، کرامیہ پیدا ہوئے، قدریہ پیدا ہوئے اور جہمیہ پیدا ہوئے۔ جیسے اب دنیا کے اندر قادیانیت کا فتنہ پیدا ہوا، کئی فتنے پیدا ہوئے، وہ سب اللہ کے دین کو سامنے رکھ کر لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے وہ ایک ایسی روایت کا سہارا لیتے ہیں، تاکہ مسلمانوں کے ذہن میں ایک الجھن بٹھا دی جائے، ایک شبہ ڈال دیا جائے اور آدمی کو شبہ پڑ جائے تو بات خود بخود بڑھتی چلی جاتی ہے۔

دیکھیں! اگر میرا آپ کے ساتھ ایک معاملہ ہے، لیکن ایک آدمی آکر میرے کان میں شبہ ڈال دے کہ یہ جو طالب آپ کے سامنے بیٹھتے ہیں میں نے ایک جگہ دیکھا ہے کہ یہ آپ کی فلاں بات میں بڑی دشمنی کر رہے تھے۔ اب میرے دماغ میں ایک شبہ ڈال دیا، اب میں دشمنی والی عینک سے ان کو دیکھنا شروع کر دوں گا۔ تو جب بھی ان

کی کوئی بات میری سمجھ نہیں آئے گی تو فوراً سوچوں گا کہ اس نے ٹھیک کہا تھا۔

اسی طرح اعدائے اسلام اللہ کے دین میں شبہات ڈالتے ہیں۔ جہاں انہیں کوئی واقعہ نظر آیا انہوں نے قوم کے ذہن میں ایک شبہ ڈال دیا، جیسا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ چونکہ بطل الاسلام تھے، اللہ نے انہیں اسلام کی عزت، خدمت اور جہاد میں ایک اعلیٰ مرتبہ عطا فرمایا تھا، حتیٰ کہ وہ ''سیف اللہ'' کے لقب سے ملقب ہوئے اور ''بطل الاسلام'' قرار پائے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جن سے کفر کانپ جاتا تھا اور جنہوں نے اپنی جنگی مہارت سے، اپنی جنگی تدبیروں سے اور اپنے بے لوث جہاد سے کفار کے ملکوں کے ملک فتح کر ڈالے اور اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ اب کافروں کو تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے عداوت ہے، ان کی عداوت کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے، وہ تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا نام برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

مالک بن نویرہ کے قتل کا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر اعتراض اور جواب:

اب فرق باطلہ نے ایک راستہ نکالا۔ ایک قصہ کتابوں میں آتا ہے، اس قصے کو اس انداز سے پیش کیا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی عظمت بھی ختم ہو جائے اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اعتراض بھی آ جائے۔ ایک تیر سے دشمن نے دو شکار کیے۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک شخص مالک بن نویرہ تھا، اس کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔ ان کے قتل کے بعد اس کی بیوی سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے شادی کی۔

تو اب اندازہ کریں کہ اس واقعہ کو کچھ اس انداز میں پیش کیا گیا، انہوں نے سب سے پہلے یہ کہا کہ مالک بن نویرہ مسلمان آدمی تھا، اس کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسی لیے قتل کیا تھا کہ اس کی بیوی پر قبضہ کر سکیں۔

- ......تو ایک تو قتل کا الزام لگایا کہ ایک مسلمان آدمی کو ناحق حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔
- ......دوسرا الزام یہ لگایا کہ قتل کا سبب ایک عورت تھی کہ آپ کی خواہش تھی کہ مالک بن نویرہ کی بیوی بڑی خوبصورت تھی اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے تھے۔ اب اس کی زندگی میں شادی کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا تو لہٰذا ان کو قتل کرا دیا، تاکہ اس کی بیوی کو اپنے گھر میں لے آ سکیں۔
- ......تیسرا الزام یہ لگایا کہ جس دن مالک بن نویرہ قتل ہوا اسی دن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان کی بیوی کو اپنے گھر بلایا، اسی رات نکاح کر لیا، حالانکہ اس کی عدت بھی نہیں گزری تھی، چار مہینے دس دن اس کو عدت گزارنی

تھی۔عدت کے اندر نکاح نہیں ہو سکتا تو......نعوذ باللہ......ان پر زنا کا الزام بھی لگا دیا۔

اسی طرح ایک تیر سے دوسرا شکار یہ کیا، انہوں نے کہا کہ یہ سارا واقعہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ہوا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے باقاعدہ قصاص لیا جائے کہ انہوں نے مالک بن نویرہ کو کیوں قتل کیا ہے؟ اور اسی طرح ان پر حد جاری کی جائے کہ انہوں نے اس کی بیوی سے بغیر عدت کے گزرنے کے اسی رات اسے اپنے گھر میں ڈال لیا ہے۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں کمانڈر ہونے کے عہدے سے ہٹا دیا، لیکن چند دن انکوائری کرنے کے بعد انہیں چھوڑ دیا۔تو اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول نے قصاص بھی نہ لیا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اتنے بڑے جرم پر پردہ ڈالا تو اب ایک تیر سے دو شکار کر لیے۔

اب جب لوگ پڑھیں گے کہ اچھا! حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا تو پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی ایسا کیا تو یہ کیسے خلیفۃ الرسول ہو سکتا ہے؟ جو قاتل سے قصاص نہ لے اور ایک آدمی نے......نعوذ باللہ......زنا کیا ہے اور اسے کچھ نہیں کہتا ہے کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بڑا طاقتور کمانڈر تھا، لہٰذا وہ اپنے اک فوجی جرنیل سے دب گئے اور شریعت کے احکام کو چھوڑ دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات بھی نہ مانی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی مخالفت کی۔اس انداز میں انہوں نے کڑیاں ملائی ہیں......إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ......کہ ایک آدمی جب پڑھتا ہے تو وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ اصل قصہ کیا ہے؟

حالانکہ واقعہ یہ ہے مالک بن نویرہ اور ان کے دوسرے بھائی متمم بن نویرہ ہیں۔یہ دونوں بھائی اسلام لے آئے اور یہ اپنے علاقے کے برابر سردار تھے۔اسلام لانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے علاقے کی سرداری پر قائم رکھا کہ تم اپنے علاقے کے اسی طرح سردار ہو۔اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذمہ لگایا کہ آئندہ زکوٰۃ اور صدقات اپنے علاقے اور اپنی قوم کا وصول کر کے مرکز یعنی مدینہ منورہ بھیجنا تمہاری ذمہ داری ہے۔مالک بن نویرہ وہ شخص ہے جو اسلام لانے کے بعد آہستہ آہستہ......نعوذ باللہ......ارتداد کی طرف بڑھنے لگ گیا اور صحیح کتابوں میں یہ روایت موجود ہے کہ جس دن میرے رسول پاک خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی ہے اس دن مالک بن نویرہ کے گھر میں مہندیاں لگائی گئیں، ڈھول بجائے گئے اور خوشیوں کے شادیانے بجائے گئے تو کیا کسی مسلمان سے آپ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دن خوشیاں منائے؟ آپ کا ایمان یہ گوارہ کر

سکتا ہے کہ جو دن میرے مدنی ﷺ کی وفات کا ہو اس دن کسی مسلمان کے گھر میں مہندیاں لگائی جائیں، ڈھول بجائے جائیں اور خوشیاں منائی جائیں؟ تو یہ اسلام کی علامت ہو سکتی ہے؟

اس لیے بات کو سمجھیں! علماء اہل سنت والجماعت جو ہیں اور یہ ۱۲ ربیع الاول کے جلوس نکالے جاتے ہیں یا جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں، ایک اس وجہ سے بھی ان کو یہ مسئلہ بڑا مشکل ہو جاتا ہے کہ جیسے ۱۲ ربیع الاول پیدائش کا دن ہے اسی طرح وفات کا دن ہے۔ اگر ایک جانب سے ہم پیدائش کی خوشی منا رہے ہیں تو دوسری جانب وہی دن حضور ﷺ کی وفات کا دن ہے۔ تو دشمن اگر یہ کہہ دے کہ یہ ولادت کی خوشی نہیں، بلکہ موت کی خوشی منا رہے ہیں تو آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ تو ایسا کام کیوں کریں جس میں دشمن کو دین کے خلاف بات کرنے کا موقع ملے؟ جبکہ وہ کام نہ فرض ہو، نہ واجب ہو، نہ سنت ہو، نہ مستحب ہو اور نہ اس کی اجازت ہو۔

باقی جو اس کی بیوی تھی تو اس کو اس نے اپنی زندگی میں اپنے ارتداد سے ایک سال پہلے طلاق دی ہوئی تھی، لیکن چونکہ بڑا سردار تھا، اس لیے ویسے ہی گھر میں رکھا ہوا تھا۔ اب جناب حضور ﷺ کی وفات کے بعد جب یہ باتیں کھلیں، حضرت سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی تحقیق کے لیے بھیجا۔ اس نے جب جا کر مالک بن نویرہ سے بات کی۔ اس نے کہا کہ یہ بات تمہارا آدمی تمہارے اس ساتھی نبی کے بارے میں کہہ رہا ہے، یہ نہیں کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا، ہمارے آقا ﷺ نے فرمایا یا ہمارے مدنی سرکار ﷺ نے فرمایا۔ وہ تمہارا جو ایک ساتھی ہے، جیسے مکہ کے کافر کہتے تھے ''قَالَ صَاحِبُكُمْ، قَالَ رَجُلُكُمْ'' انہی الفاظ میں مالک بن نویرہ نے حضور ﷺ کی شان کے بارے میں وہی گستاخانہ لفظ کہے۔ حضرت امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان واقعات کا کوئی پتہ ہی نہیں ہے۔ حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ آپ اس علاقے میں جائیں اور تحقیق کریں۔ اگر وہ واقعتاً مرتد ہو چکا ہے اور دین اسلام سے نکل گیا تو اس کو عبرتناک سزا سے دوچار کریں، اسے قتل کر دیں اور اس کی پوری قوم کو سزا دیں۔ اگر بات غلط ہے تو پھر تحقیق کرنے کے بعد واپس آجائیں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جا کر اس کا محاصرہ کیا تو وہاں یہ بھی پتہ چلا کہ جتنا زکوٰۃ وصدقات کا پیسہ جمع ہو چکا تھا، حضور ﷺ کی وفات کے دن اس نے اپنی قوم کو بلایا، کہا کہ یہ سارے زکوٰۃ وصدقات کے پیسے واپس لے لو،

اچھا ہوا کہ نبی فوت ہو گیا، تمہارا مال بچ گیا۔ اس سے بڑی دلیل ارتداد کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی پوری قوم میں یہ کہہ رہا ہے، ایک آدمی کے سامنے نہیں کہہ رہا۔ اس بنا پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حملہ کیا، اسے قتل کیا اور سزا دی۔ قوم کے کچھ لوگ گرفتار ہو گئے، کچھ نے توبہ کر لی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جہاں اس کے قتل کے بعد مال غنیمت کے طور پر مال حاصل کیا تو اس کی بیوی بھی مال غنیمت میں آئی۔ اس کی بھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے تحقیق کی۔ اس نے کہا: وہ تو مجھے کئی سال سے طلاق دے چکا ہے۔ ظالم انسان تھا، اس نے جبراً مجھے روکا ہوا تھا۔ تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس سے با قاعدہ نکاح کیا۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بات پہنچی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے کہ مالک بن نویرہ تو مسلمان تھا، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کر دیا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فوراً حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عہدے سے ہٹا دیا، معزول کر دیا اور فرمایا کہ اب انکوائری کرو، تا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ جرنل اپنے عہدے پر ہے تو انکوائری کیسے ہو؟ [مرقاۃ المفاتیح: ۱۲/۴۴۷، جامع الاحادیث، حدیث: ۲۷۴۲۹]

آپ نے دیکھا نہیں کہ ہمارے ملک میں جب کسی عہدے دار کے بارے میں انکوائری ہو اور عہدہ اس کے پاس ہے، کرسی اس کے پاس ہے تو سارے لوگ اس کا ساتھ دیں گے تو اس کے خلاف انکوائری کیسے ہو سکتی ہے؟ تو آپ نے ان کو معزول کر دیا۔ انکوائری ہوئی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سچے ثابت ہوئے اور اُس کا ارتداد ثابت ہو گیا۔ اور متمم بن نویرہ جو اس مالک بن نویرہ کا بھائی ہے اور ان بھائیوں میں اتنا پیار تھا کہ اس نے مالک بن نویرہ کے مرنے پر بڑے بڑے مرثیے لکھے اور قصیدے لکھے، لیکن جب اس کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے بلایا اور پوچھا کہ بھائی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: وہ مرتد ہو گیا تھا، اسلام سے نکل گیا تھا۔ اب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پھر اپنے عہدے پر بحال کر دیا، کیونکہ ان کا ایکشن عین اسلام کے مطابق ثابت ہوا۔

اب اتنی ساری تحقیق ایک عام فہم اہل سنت الجماعت کا فرد کہاں پڑھے گا؟ اتنی ساری کتابوں کو کہاں کھولے گا؟ اس کے دماغ میں تو یہ کیڑا ڈال دیا گیا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے یہ کیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ کیا۔ جب پوری بات کا پتا نہیں ہے تو فوراً حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف بھی دل میں بغض آ گیا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے خلاف بھی دل میں بغض آ گیا، اصحابِ رسول کے خلاف بھی دل میں بغض آ گیا اور وہ خود بھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں مانتے، لیکن چونکہ یہاں اپنا مطلب تھا تو کہہ دیا کہ دیکھو! حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ

بات نہیں مانی، کیا تم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مانتے ہو کہ تمہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات نہ ماننے کا دکھ ہو رہا ہے اور اگر عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے درمیان کسی قسم کا اختلاف ہوتا آپ اللہ کے کعبہ میں بیٹھے ٹھنڈے دل سے سوچیں تو کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی موت کے وقت یہ فیصلہ کرتے کہ میرے بعد خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دی جائے؟

بعض فرقِ ضالہ کے نظریات:

اسی طرح بعینہٖ روافض کا فتنہ پیدا ہوا، انہوں نے بعض اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑا اور باقی صحابہ رضی اللہ عنہم پر الزام لگائے، خوارج بالکل بعینہٖ ان کی ضد میں آئے۔ انہوں نے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سہارا لیا اور اہل بیت رسول کے خلاف الزام تراشیاں کیں اور اتنا حد سے بڑھے اتنا حد سے بڑھے......نعوذ باللہ......کہ انہوں نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تو ایمان ہی نہیں۔ انہوں نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے مخالف ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی سیدہ فاطمۃ الزہرا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جگر کا ٹکڑا ہے ان پر ایک سوکن لانا چاہتے تھے، دوسری شادی کرنا چاہتے تھے اور وہ بھی ابوجہل کی بیٹی سے۔ اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ تم فاطمہ کے بعد دوسری شادی نہ کرو، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار کیا اور دوسری شادی کر لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلیفہ برحق کا قصاص نہ لیا، ان کے قاتلوں سے آپ نے بیعت لی اور ان کو عہدے دیے۔ دیکھو کہ یہ کیسا بیٹا ہے جو دس ہزار کا لشکر لے کر اللہ کے نبی کی بیوی، ام المؤمنین، بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے مقابلہ پر نکلا، وہ تو ایمان سے بھی نکل گیا ......نعوذ باللہ......تو خوارج نے صحابہ کا سہارا لیا اور اہل بیت رسول کا انکار کر دیا۔ اب ایک اہل سنت والجماعت جس کو اللہ نے صحیح عقل دی ہو وہ تو پورے دین کو سامنے رکھے گا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ہماری آنکھوں پر، اہل بیت بھی ہماری آنکھوں پر۔ ہم تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے بھی غلام ہیں، اہل بیت کے بھی غلام ہیں۔ جیسے ہمارے نزدیک حضرت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق ہیں، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق ہیں۔ وہ خلیفہ راشد ہیں۔ اگر ماں بیٹے میں جھگڑا ہوا ہے تو غلط فہمیاں تھیں، جو دشمنوں نے ڈال دی تھیں اور لڑانے کی کوشش کی۔ نہ ماں میں کوئی غلطی تھی اور نہ بیٹے میں کوئی غلطی تھی۔ ہم تو دونوں کے غلام ہیں اور دونوں کے دامن کے صاف کریں گے اور دونوں کے دامن پر جو کیچڑ آئے گی اور اعتراض آئے گا ہم اسے دفعہ کریں گے اور ان کا تحفظ کریں گے۔ اور خوارج نے اصحاب رسول کا سہارا لیا اور اہل بیت کا انکار کر دیا۔

اور بعض لوگوں نے اللہ کی توحید میں اتنی سختی اختیار کی کہ اللہ کے انبیاء اور اولیاء کی تنقیص کر بیٹھے، ان کی شان میں کمی کر بیٹھے، راستے سے ہٹتے چلے گئے اور یہ امت فرقوں میں بٹتی چلی گئی۔ اور یہی دشمن چاہتا تھا کہ امت محمد مصطفیٰ ﷺ کو لڑائے رکھو، ان کو مسائل میں الجھائے رکھو۔ جب تک یہ آپس میں لڑتے رہیں گے یہ کفر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر یہ اکٹھے ہو گئے، ان کے اختلافات مٹ گئے، یہ جسد واحد بن گئے اور یہ امت واحدہ بن گئے تو دنیا میں کفر باقی نہیں رہ سکتا۔ تو آج بھی اس نہج پر ہمیں ہر ہر مسئلہ میں لڑایا جا رہا ہے، اس لیے اللہ نے فرمایا کہ قرآن سراپا ہدایت ہے، ہم نے ہدایت کے لیے بھیجا۔ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ کیے وہ ہدایت میں پڑ گئے، جن لوگوں نے قرآن کو اپنے مقاصد میں استعمال کیا وہ کفر اور گمراہیوں میں گر گئے۔ گمراہیوں میں ڈھلتے گئے اور گمراہیوں میں بڑھتے گئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ ہدایت عطا فرمائیں اور قرآن سے ایمان حاصل کرنے والا بنائے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم قرآن پڑھ کر اور گمراہیوں میں بڑھتے چلے جائیں۔ ہمیشہ یاد رکھیں کہ یہ قاعدہ اور ضابطہ ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے، صراطِ مستقیم پر زندگی گزارنے کی توفیق بخشے اور صراطِ مستقیم پر اپنی رحمت سے موت نصیب کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نماز میں کھڑے ہیں اور کہتے ہیں ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ [الفاتحہ: ۵] اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھلا دے، سیدھے راستے کی ہدایت فرما۔ ہم نماز پڑھ رہے ہیں، نماز تو سیدھا راستہ ہے، لیکن ہم کیوں بار بار مانگ رہے ہیں؟ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اے اللہ! ہمیں ہدایت پر قائم فرما، ہدایت پر ثابت قدم فرما اور اسی ہدایت والے راستے پر موت عطا فرما۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم راستوں سے بھٹک جائیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں راستے میں ٹھوکر لگ جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اہل سنت والجماعت نے اللہ کی توحید کے مسئلے کو جیسے...... الحمد للہ...... سینے سے لگایا، اسی طرح شانِ نبوت اور شانِ رسالت کو اپنی آنکھوں میں بسایا، اسی طرح حقانیتِ صحابہ پر ایمان لے آئے، اہل بیت پر ایمان لے آئے، اسی طرح انہوں نے اولیاء کرام کا احترام سکھلایا، اسی طرح انہوں نے صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ محدثین، ائمہ مجتہدین، ائمہ فقہاء اور ائمہ قراء رحمہم اللہ اور علماء حقہ جو صحیح معنوں میں علمائے کتاب وسنت ہیں اور صحیح معنی میں وارث انبیاء ہیں، ان کا احترام ہمارے سینوں میں رکھا۔ اگر ایک سیڑھی چھوٹ گئی تو ہمارے پاؤں پھسلنے کا ایک تخت ایک پائیدان ٹوٹ گیا۔ کسی وقت آپ چڑھتے ہوئے اترتے ہوئے گر جائیں گے اور اگر وہ

سیڑھیاں سلامت ہوں اور بالکل ترتیب سے بنی ہوں، اندھیرا بھی ہو جائے، بجلی بھی چلی جائے، آپ آرام سے قدم رکھتے ہوئے اندازے سے چلتے چلتے منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے، کیونکہ سیڑھیاں جو سالم تھیں۔ تو جن لوگوں نے اسی سلسلہ کو اپنے اساتذہ اور اپنے علماء سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک اپنے سینوں سے لگایا ہوا ہے، اللہ کی مہربانی سے وہ بھٹکنے سے محفوظ ہو جاتے ہیں، ورنہ یہ مختلف انداز ہوتے ہیں۔

کبھی کبھی ذہنوں کے اندر یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ چار امام ہوئے، اس لیے قوم چار حصوں میں بٹ گی۔ پھر بھی تو ٹکڑے گنیں کہ کتنے ٹکڑے ہوں گے؟ ابھی تو شکر ہے کہ چلو چار تک تو بات ہے اور اگر ہم نے ہر آدمی کو کہا کہ تم اپنی مرضی سے جو چاہو کرو، اپنی مرضی سے قرآن کی ہر آیت کو سمجھو اور فرمانِ رسول پاک ﷺ کو سمجھو اور اس کا خود ہی ترجمہ کرو اور تاویل کرو تو کتنے ٹکڑے ہوں گے؟ پھر آپ ٹکڑے گن ہی نہیں سکتے۔ تو سیدھی بات ہم کیوں نہ کریں جو اللہ نے کہی اور میرے نبی پاک ﷺ نے کہی۔ اگر ایک آدمی جاہل ہے تو عالم سے پوچھے، علم والے کے دروازے پر آئے اور اگر وہ خود عالم ہے، یعنی اللہ نے اس کو اتنا علم عطا فرمایا ہے کہ وہ کسی عالم سے پوچھنے کا محتاج نہیں رہا تو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تو دیکھو کہ جو لوگ حج پر آتے ہیں، ان کو حج کرنا آتا ہے یا انہوں نے ایک حج کر لیا اور دو حج کر لیے، ایک عمرہ کر لیا اور دو عمرے کر لیے، چار عمرے کر لیے تو ان کو کیا پڑی ہوئی ہے کہ پوچھیں کہ عمرہ کیسے کرنا ہے؟ وہ کہے گا: ......الحمد للہ...... مجھے پتہ ہے کہ غسل کرنا ہے، دو رکعت پڑھنی ہیں، احرام باندھنا ہے، اللہ کے گھر میں جا کر طواف کرنا ہے، دو رکعت پڑھنی ہے، صفا و مروہ دوڑنا ہے، بال منڈوانے ہیں اور احرام کھول دینا ہے، عمرہ ہو گیا۔ جب وہ مسئلہ سیکھ گیا ہے اب اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ۴۳]

جب وہ عالم ہے، یعنی اس کو دین کے احکام کا علم ہے، اس کو قرآن وحدیث سے مسائل کے استنباط کا علم ہے، اس کو ناسخ و منسوخ کا علم ہے اور اس کو سب احکام پر نظر ہے تو وہ مسئلہ کیوں پوچھے؟ اسے کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جو آدمی نہیں جانتا وہ پوچھے، کیونکہ جہل کا علاج سوال ہے۔ اگر ایک آدمی کسی مسئلے میں جاہل ہے تو وہ سوال کرے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، وگرنہ اللہ فرما دیتے کہ ہر آدمی اکیلا نماز پڑھ لے، کوئی حکمت تو ہے کہ اللہ نے ہمیں پانچ وقت جماعت کی نماز کا پابند کر دیا ہے، ورنہ اللہ کی نماز ہے، اکیلے پڑھو، ادا تو ہو جاتی ہے۔ اگر ایک

آدمی اکیلے میں نماز پڑھ لے، نماز تو ادا ہو جائے گی، لیکن پانچ وقت پابند کیا گیا، اذان ہو، تکبیر ہو، امام ہو، جماعت ہو، ایک مسجد میں ہوں، ایک مقام پر ہوں اور ہر آدمی ایک امام کے حکم کے مطابق چلے رکوع میں اور سجود میں۔ اور اتنی سختی کی گئی کہ حضور ﷺ نے بددعا فرمائی: اگر کوئی شخص امام سے پہلے سر اٹھالے تو اللہ اس کے چہرے کو گدھے کا چہرہ بنادے۔ ہمیں اکٹھا کرنے کی کوئی حکمت تو تھی اور کوئی منشا شریعت تو تھا ہمیں ایک بات پر جمع کرنے کا۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! سونے کے پانی سے لکھنے والا جملہ ہے، اگر اپنے دماغ میں رکھ لو کہ بزرگوں نے فرمایا ہے:

"لَنْ يُصْلِحَ آخِرَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا مَا أَصْلَحَ أَوَّلَهَا." [تفسیر القرآن: ۶/۴۲]

"اس امت کا جو آخری زمانہ ہے یہ لوگ کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتے، مگر اس طریقہ سے جس طرح پہلی امت ٹھیک ہوتی تھی۔"

اور پہلی امت کیسے ٹھیک ہوتی تھی؟ اللہ کے قرآن سے اور محمد مدنی ﷺ کی غلامی سے ٹھیک ہوئی تھی۔ اور ہم بھی اس وقت ٹھیک ہوں گے جب اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی غلامی اختیار کریں گے، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ جب آدمی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا غلام بن جاتا ہے، چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی ہو، پھر اس ماحول میں خیر ہی خیر ہے، رحمت ہی رحمت ہے اور برکت ہی برکت ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ ایک آدمی زمیندار ہے، لیکن بیٹا نافرمان ہے، فاسق و فاجر ہے، شرابی ہے اور فتنہ والا آدمی ہے، چند دنوں کے اندر جائیداد بھی ختم، گھر بھی ختم، باپ دادا کے عزت بھی ختم اور پتہ لگتا ہے کہ کہیں جیل میں پڑا ہے یا کہیں گولی لگ گئی۔ اور اگر اس کے مقابلہ پر بڑا زمیندار ہے اور بیٹا دیندار ہے، اللہ نے بیٹے کو دین نصیب کر دیا، اتباع قرآن و سنت نصیب فرمادی تو اب وہ برسوں تک اپنے باپ کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے کہ یہ فلاں کا بیٹا ہے۔ باپ تو خیر اتنا اچھا نہیں تھا، لیکن ......سبحان اللہ!...... بیٹا بڑا اچھا ہے،...... ماشاء اللہ...... جب دیکھو قرآن میں ہے، نماز میں ہے، صدقہ و خیرات میں اور دین کے کاموں میں لگا ہوا ہے،...... سبحان اللہ!...... اس نے تو پورے علاقے کو بدل ڈالا۔ تو اصلاح کا حل اتباع کتاب و سنت ہے، اللہ اور اللہ کے رسول پاک ﷺ کی اطاعت ہے۔ اور جتنے سارے میں نے راستے بتائے ہیں وہ اسی بات کو پکا کرنے کے لیے ہیں۔

اب دیکھیں کہ ایک شہر میں کتنی مسجدیں ہیں، کتنے امام نماز پڑھا رہے ہوں گے، لیکن سب کا مقصد نماز، جماعت اور حضور ﷺ کی سنتوں کو زندہ کرنا ہے تو گویا اب آدمی تو بہت زیادہ ہیں، لیکن ہمیں سبق ایک ہی پڑھا رہے ہیں۔ جیسے کسی شاعر نے کہا تھا:

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں
زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سجا رہا ہوں
چراغ میرا ہے رات ان کی

بات کہنے والی زبانیں تو بہت ہیں، لیکن میں سب بات حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی کر رہا ہوں۔ اب ہم یہ کیسے دیکھیں کہ ان تمام باتیں کرنے والوں میں سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے؟ تو ہم ان کو قرآن وسنت کی روشنی میں دیکھیں گے۔ جس کا کہنا قرآن کے مطابق ہے اور جس کا کہنا حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق ہے وہ سچا ہے اور جس کا کہنا قرآن کے مخالف ہے، حضور ﷺ کے فرمان کے مخالف ہے وہ جھوٹا ہے۔ زبان سے تو کہہ رہا ہے، لیکن اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل اور حجت نہیں رکھتا۔

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ کا مصداق کون ہے؟

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ کا مطلب یہ نہیں ...... نعوذ باللہ ...... کہ قرآن سے گمراہی پھیلتی ہے۔ لفظی ترجمہ تو یہی ہے، لیکن مقصد اور مفہوم یہ ہے کہ جو قرآن پر ایمان لے آئے وہ ہدایت پا گئے اور جس نے انکار کیا وہ گمراہی میں پڑ گئے۔

مفسر نے بیان کیا کہ حضرت شعبہ رحمہ اللہ نے حضرت عمرو بن مرہ رحمہ اللہ سے روایت کی ہے، انہوں نے مصعب رحمہ اللہ سے روایت کی ہے، انہوں نے سعد رحمہ اللہ سے روایت کی ہے، مصعب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا کہ ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝﴾ [البقرۃ: ۲۶، ۲۷] سے کیا مراد ہے اور کون لوگ مراد ہیں؟ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس سے مراد خوارج ہیں۔

مفسر فرماتے ہیں کہ اگر یہ سند ٹھیک ہے اور یہ بات حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے تو معنی یہ ہے کہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر ومعنی بیان فرمایا، یہ مراد نہیں ہے کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ

جب یہ آیت نازل ہوئی ہے تو اس وقت خوارج کا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ خوارج تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں، لہٰذا یہ تفسیر بالمعنی ہوگی، یعنی جن پر گمراہوں کی صفت آرہی ہے اور جو اللہ کے ساتھ عہد و میثاق کو توڑنے والے، اللہ کے احکام کو توڑنے والے ہیں، جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں۔ چونکہ خوارج بھی ایسے تھے، انہوں نے بھی عہد کو توڑا، اسلام کے احکام کا انکار کیا، وہ بھی اسلام کے حکم سے نکل گئے اور خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف نہروان پر جنگ کی، لہٰذا اس آیت کا مصداق وہ بھی بنتے ہیں، وگرنہ جس وقت قرآن اترا اس وقت روافض، خوارج اور معتزلہ نہیں تھے۔ دیکھنا ہوگا کہ قرآن نے جو صفات گمراہوں کی بیان کی ہیں وہ جن جن پر صادق آتی ہیں وہ گمراہ ہیں اور جو ہدایت کی صفتیں بیان کی ہیں وہ جن جن پر صادق آتی ہیں وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۵، البقرۃ: الآیۃ: إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا]

عہد و میثاق میں فرق:

یہاں ﴿الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ﴾ [البقرۃ: ۲۷] میں دو لفظ آئے: ایک ''عَهْدَ'' کا لفظ اور دوسرا ''مِيثَاق'' کا لفظ آیا ہے۔ ''مِيثَاق'' کا معنی بھی ''عَهْدَ'' ہوتا ہے اور ''عَهْدَ'' کا معنی بھی معاہدہ ہوتا ہے، جیسے ایک چیز پر عقد کرتے ہیں۔ لیکن دو لفظ اس لیے لائے کہ ان دو لفظوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ''عَهْدَ'' کہتے ہیں کہ آپس میں کسی چیز کا عہد کرنا۔ یہ عام ہے بندے کا اللہ سے عہد کرنا اور بندے کا بندوں سے عہد کرنا۔ اور ''مِيثَاق'' ایسا معاہدہ ہے جس کے ساتھ قسم بھی شامل ہو، مجھے اللہ کی قسم ہے! میرا عہد ہے۔ تو یہ میثاق ہوگیا، لیکن مسلمان ہر مشکل میں ''عَهْدَ'' کا بھی پابند ہے اور ''مِيثَاق'' کا بھی پابند ہے۔ قسم سے معاہدہ کرے یا بغیر قسم کے معاہدہ کرے، ''عَهْدَ'' اللہ اور اپنے درمیان ہے تب بھی پابندی کرے اور ''عَهْدَ'' بندوں کے درمیان ہے تو پھر بھی پابندی کرے، کیونکہ قیامت والے دن عہد کے بارے میں سوال ہوگا۔

خوارج کی وجہ تسمیہ:

اب مفسر فرماتے ہیں کہ خوارج کو خوارج کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ لوگ بھی اسلام کے حکم سے نکل گئے، اسلام کے عہد کو توڑ ڈالا۔ خلیفہ برحق خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خوارج اور نواصب نے جنگیں لڑیں اور نہروان کے مقام پر ان کا مقابلہ کیا تو وہ دین سے نکل گئے اور عہد کو توڑ ڈالا اور زمین میں فساد مچایا تو یہ صفتیں ان پر منطبق ہوگئیں۔ اس

بنا پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے مراد حرور یہ ہیں یا اس سے مراد خوارج ہیں۔

یاد رکھیں! قرآن جتنے بھی حکم بیان کرتا ہے انسان کو چاہیے کہ ان کو منطبق کرے۔ جہاں قرآن نے ایمان والوں کی صفتیں بیان کی ہیں وہاں اپنے گریبان میں نظر ڈالیں کہ تمہارے اندر وہ ایمان والی صفات ہیں یا نہیں ہیں؟ قرآن نے جہاں منافقوں والی صفات بیان کی ہیں وہاں اپنے دامن اور گریبان میں نظر ڈالو کہ کہیں ہمارے اندر تو کفر و شرک کے جراثیم داخل نہیں ہیں؟ یہ نہیں کہ قرآن پڑھیں کہ قرآن تو نازل ہوا تھا مکہ میں اور مدینہ منورہ میں، لہٰذا یہ ان لوگوں کے لیے تھا...... نعوذ باللہ...... یہ ہمارے لیے تو ہے ہی نہیں...... نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... قرآن کا حکم قیامت تک باقی ہے۔ قرآن پاک ایک نمونہ پیش کرتا ہے کہ مومن کی یہ صفتیں ہیں، منافق کی یہ صفتیں ہیں، مشرک کی یہ صفتیں ہیں، فاسق کی یہ صفتیں ہیں اور فاجز کی یہ صفتیں ہیں۔ اور مسلمان کا کام یہ ہے کہ قرآن کی جب اس دعوت کو پڑھے تو اپنے بدن پر، اپنے گھر والوں پر اور اپنے ماحول پر نظر ڈالے کہ ان کے اندر ایمان کی صفات ہیں یا نفاق کی صفات ہیں؟ اللہ پاک آپ کو، مجھے اور ہر مسلمان کو ایمان کی صفات نصیب کرے، اسی پر قائم و دائم رکھے اور اسی پر موت عطا فرمائے۔

یہودیوں میں چوہے کی صفات:

اب جدید اطباء نے یہ تحقیق کی ہے کہ اگر چوہے مر جائے اور آدمی اس کو ایسے پھینک دے تو اس سے بڑی غلیظ قسم کی بیماریاں پھیلتی ہیں، حتیٰ کہ طاعون تک بھی پھیل سکتا ہے۔ اس لیے ان کی تحقیق کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو اگر مارا جائے تو پھر اس کو اچھی طرح مٹی میں دبا کر دفن کر دیا جائے، تاکہ اس کے جراثیم باہر نہ پھیلیں۔ یہ اتنا خطرناک جانور ہے۔

اسی طرح ایک یہودی جس کا نام آپ نے سنا ہوگا ہیٹر فورڈ کہ اس کی گاڑیاں ہیں، فورڈ کمپنی ہے۔ وہ اصل یہودی ہے، اس نے خود یہودیت پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس نے کہا: یہودی جتنی پالیسیاں بناتے ہیں یہ چوہے سے سیکھتے ہیں۔ تو اسی طرح کا یہ عمل کرتے ہیں کہ جب وہ دیکھے گا بات بنائے گا تو چھپ جائے گا۔ جہاں سے گھسے گا نکلنے کا راستہ کسی اور جگہ سے رکھے گا۔ اسی طرح یہ اندر اندر کام کا شتار ہے گا اور بظاہر نظر نہیں آئے گا تو اس نے کہا: جتنی یہودیت کی پالیسیاں ہیں وہ اسی سے لی ہوئی ہیں کہ اتنا چھوٹا جانور ہو کر اتنے بڑے درخت کو گرا دیتا ہے، کتنی بڑی

بڑی بلڈنگوں کو گرانے کا باعث بن جاتا ہے۔ تو ہم چھوٹی قوم ہو کر پورے عالم اسلام کو کیسے نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ حالانکہ وہ خود یہودی ہے۔ جب جھگڑا ہوا تو اس نے خود ایک کتاب لکھ ماری۔ جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، اختلاف ہوتے رہتے ہیں تو یہ باتیں بھی باہر نکل آتی ہیں۔ بہر حال فاسق کا معنی حد سے نکل جانا۔

پانچ چیزوں کو حرم میں بھی قتل کرنے کا حکم:

صحیحین کے اندر یہ حدیث موجود ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ پانچ چیزیں فواسق ہیں، حد سے نکلنے والی ہیں "يُقْتَلْنَ فِي الحِلِّ وَالحَرَمِ" حل کے اندر ہوں قتل کی جائیں اور حرم کے اندر ہوں تب بھی ان کو مار ڈالا جائے، یعنی ان کی کوئی ضرورت نہیں کہ حرم میں نہ مارا جائے۔ حل کہتے ہیں حرم سے باہر کا علاقہ اور حرم حرم ہے۔ حرم کے اندر تو جانور کا مارنا جائز نہیں، شکار کھیلنا جائز نہیں اور درختوں کا توڑنا جائز نہیں، لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ پانچ ایسی چیزیں ہیں جو حد سے نکلنے والی ہیں۔ یہ چاہے آپ کو حل میں ملیں یا حرم میں ملیں ان کو مار ڈالا ڈالا کرو۔ آپ نے فرمایا: کوا، چیل، بچھو، چوہا اور کاٹنے والا کتا۔ فرمایا: یہ جہاں بھی ملیں ان کو مار ڈالو۔ [سنن ابن ماجہ، حدیث: ۳۰۸۷، باب: مَا يَقْتُلُ المُحْرِمُ]

ایک کتا شکار کے لیے ہوتا ہے اور ایک کتا مویشی کی حفاظت کرنے کے لیے ہوتا ہے، ان کو نہیں مارا جاتا، کیونکہ اگر آپ ان کا ماریں گے تو ضمان دینی ہوگی، لیکن آوارہ کاٹنے والا کتا ہوتا ہے تو ایسے کتوں کو مار ڈالیں۔ اسی طرح چیل آکر نقصان کرتی ہے۔ اگر چھوٹے بچے گوشت اٹھا کر آرہے ہوں تو ایسا نقصان کرتی ہے کہ ان کے ہاتھ کو بھی کاٹ کر لے جاتی ہے۔ اسی طرح کوا گندگی کھانے والا ہے، گندگی پھیلانے والا۔ اور اسی طرح چوہا حرم میں ملے جہاں نظر آئے اس کو مار ڈالو۔

تفسیر:

﴿الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾﴾ [البقرة: ۲۷]

فساد کافر پھیلاتا ہے، مسلمان نہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا میں فساد پھیلانے والا کافر ہوتا ہے،

مسلمان تو کبھی فساد پھیلا ہی نہیں سکتا، مسلمان کا فساد سے کیا تعلق ہے؟ اور فساد ہمیشہ وہ پھیلاتا ہے جو ایک عہد کو توڑنے والا ہو۔ جو عہد کو قائم رکھنے والا ہے وہ فساد کو کیسے پھیلا سکتا ہے؟ اور جو آدمی رشتہ داروں کو بھی جوڑنے والا ہے، صلہ رحمی کرنے والا ہے اور دوستوں کو بھی جوڑنے والا ہے وہ کیسے فساد پھیلا سکتا ہے؟

اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے! یہ محض دشمنوں کا پروپیگنڈہ ہے کہ کبھی مسلمانوں کو...... نعوذ باللہ...... فساد پھیلانے والا کہتے ہیں، کبھی مسلمانوں پر الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے تلوار کے زور سے اسلام پھیلایا، کبھی ان پر الزام لگاتے ہیں کہ مسلمانوں کا کام لوٹ مار کرنا ہے، لوگوں کی لڑکیوں کو کنیزیں بنالینا اور ان کے لڑکوں کو غلام بنالینا ہے، ان کی جائیدادیں چھین لینا ہے، مسلمانوں کا کام گوشت کھالینا، جانوروں کو ذبح کر لینا اور چار چار عورتوں کو گھر میں رکھ لینا ہے۔

تو یہ دراصل اسلام کے خلاف ایک پروپیگنڈہ ہے، وگرنہ جو لفظ اسلام ہے اس کا مادہ ہی سلامتی ہے۔ مسلمان تو سلامتی کا خواہاں ہوتا ہے، اسی طرح ایمان کا مادہ ہی امن ہے کہ جو ایمان والا ہے وہ امن والا ہے، جو مومن ہے وہ امن والا ہے اور جو مسلمان ہے وہ سلامتی والا ہے۔ کبھی سلامتی والا فساد نہیں پھیلاتا، لیکن جتنے فرقے کافر ہیں اور جتنے فرقے ضالہ ہیں وہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے ایسی ایسی باتیں چھیڑتے ہیں، ورنہ اگر آپ تاریخ عالم کو اٹھا کر مطالعہ کریں، آپ تاریخ پڑھ کر دیکھیں کہ سب سے بڑا فساد پھیلانے والا کافر ہوتا ہے، سب سے بڑا مفسد کافر ہوتا ہے، سب سے بڑا ظالم کافر ہوتا ہے، سب سے بڑا فاسق کافر ہوتا ہے، سب سے بڑا مجرم کافر ہوتا ہے اور سب سے بڑا دہشت گرد کافر ہوتا ہے۔

آپ اندازہ فرمائیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: عین جنگ کے عالم میں بھی خبردار کسی بچے کو قتل نہ کیا جائے، کسی عورت کو قتل نہ کیا جائے، کسی بوڑھے کو قتل نہ کیا جائے اور کسی مذہب کے پنڈت کو، راہب کو اور پادری کو قتل نہ کیا جائے۔ ہاں اس صورت میں کہ اگر وہ خود جنگ لڑ رہے ہیں، وہ خود قتال کر رہے ہیں تو ان کو قتل کیا جائے۔

[مسند أحمد بن حنبل، حدیث: ۲۷۲۸]

حضور ﷺ نے فرمایا: خبردار! کسی بستی کے بارے میں اگر تمہیں پتہ نہیں ہے، انتظار کرو رات کو شب خون مت مارو، انتظار کرو صبح کا۔ اگر اذان کی آواز آجائے تو اس بستی پر حملہ نہ کرو، ہوسکتا ہے وہاں غریب مسلمان بھی رہتے ہوں، وہ مفت میں مارے جائیں اور اگر اذان کی آواز نہ آئے تو پھر لڑائی کریں۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۱۵۴۹]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ:

آپ اندازہ لگائیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے روم کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ معاہدے کی مدت متعین تھی کہ دو سال میں ہم آپ پر چڑھائی نہیں کریں گے اور روم والے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر چڑھائی نہیں کریں گے۔ یہ معاہدہ تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے بابصیرت وقت کے امیر تھے۔ جب معاہدہ ختم ہونے کا وقت آ گیا، مثلاً: دو سال کی مدت ختم ہونے کو آ گئی تو آپ نے اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ آہستہ آہستہ روم کی طرف مارچ کرنا شروع کرو، تا کہ ہم دشمن کے بارڈر کے بالکل قریب پہنچ جائیں۔ اور جس وقت ہمارا معاہدہ ختم ہو جائے اس کے دوسرے دن ہم ان پر حملہ کر دیں گے، کیونکہ معاہدے کے اندر حملہ نہیں کر سکتے، ہم مسلمان ہیں، ان کے ساتھ عہد کیا ہوا ہے، لیکن جب معاہدے کی مدت گزر جائے تو پھر ہمارا کوئی معاہدہ نہیں۔ پھر ہمیں حق ہوگا کہ دشمن پر چڑھائی کر دیں اور وہ تیار نہیں ہوں گے اور ہم ان پر حملہ کر کے فوراً فتح حاصل کر لیں گے۔

آپ کی فوجیں چل رہی تھیں۔ ایک صحابی دوڑتے ہوئے آئے اور فرمایا: خبردار! مسلمانوں کو وفا کرنی چاہیے، غداری نہیں کرنی چاہیے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا معنی؟ انہوں نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہے، چاہے وہ معاہدہ گزر جائے جب تک ایک دوسرے کو خبر نہ دے دو اور ایک دوسرے کو اطلاع نہ کر دو کہ اب ہمارا تمہارا معاہدہ ختم ہو چکا ہے، اب ہم تم سے لڑیں گے تو جب تک ان کو باخبر نہ کر دو نہ لڑو۔ چوری چوری ان پر حملہ کر دینا، چاہے مدت معاہدے کے بعد بھی کیا جائے، اسلام کی وفاداری کی خلاف ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فوج کو حکم دیا: واپس آجاؤ۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مل گیا تو بات ختم۔

اسلام تو اتنا بڑا محافظت کرنے والا ہے اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی۔ اب آپ قرآن کی آیت کو پڑھیں اور اندازہ کریں کہ فساد کرنے والے کون ہیں؟

عہد توڑنے سے کیا مراد ہے؟

مفسر فرماتے ہیں کہ ان کافروں کے عہد توڑ ڈالنے سے کیا مراد ہے؟ فرماتے ہیں: اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے اپنی مخلوق کو جو حکم دیا کہ تم میرے نبیوں پر، میری کتابوں پر اور میرے شرائع پر ایمان لاؤ اور جن چیزوں کو چھوڑنے کا اللہ نے حکم دیا تھا تو جب کافروں نے ان کرنے والی چیزوں کو چھوڑ دیا اور نہ کرنے والی چیزوں کا ارتکاب کر لیا تو

گویا کہ انہوں نے اللہ کا وعدہ توڑ ڈالا۔

اور بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ آیت اہلِ کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کے بارے میں ہے۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں صرف یہ دو قومیں تھیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس سے مراد منافق ہیں، جنہوں نے اللہ پاک سے عہد کیے اور ایمان لائے اور توڑ ڈالے۔ اور اسی طرح اہل کتاب ہیں، جن سے ان کی کتابوں کے اندر باقاعدہ عہد لیا گیا تھا کہ جب میرے نبی حضرت محمد ﷺ پیدا ہوں گے تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کرو گے، باقاعدہ بشارتیں دی گئیں، باقاعدہ عہد لیا گیا اور یہ کتابوں میں پڑھے ہوئے ہیں، جانتے ہیں کہ تورات اور انجیل میں بھی لکھا ہوا ہے، لیکن ان اہل کتاب نے اس عہد کو پسِ پشت ڈال دیا، چند پیسے دنیا کے حاصل کر کے اللہ کے اس عہد کو توڑ ڈالا۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی بات کو زیادہ ترجیح دی ہے کہ اس سے مراد اہلِ کتاب ہیں۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد جمیع کفار ہیں، جمیع مشرکین ہیں اور جمیع منافقین ہیں۔ اور عہد سے مراد اللہ تعالیٰ نے سب سے اپنی توحید اور ربوبیت کا عہد لیا، اس کے بعد اپنے نبیوں کو ایسے ایسے معجزات دے کر بھیجا کہ دنیا کا کوئی آدمی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان معجزات کو دیکھنے کے بعد لوگ جانتے تھے کہ یہ اللہ کے نبی ہیں، لیکن اس کے بعد بھی وہ ایمان نہ لائے۔ اور مقاتل بن حیان نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔

زمخشری نے بھی اسی طرف میلان کیا ہے۔ انہوں نے بطورِ سوال ذکر کیا کہ کوئی پوچھے کہ وہ کیا عہد تھا جو انہوں نے توڑ ڈالا؟ تو جواب یہ دیا کہ عہد سے مراد وہ ہے جو اللہ نے ان کے دماغوں کے اندر توحید کا مسئلہ ڈالا تھا، گویا کہ اللہ نے ان سے عہد لیا اور اللہ نے ان کو اپنے نفسوں پر گواہ کیا ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ﴾ [الاعراف:۱۷۲] انہوں نے اقرار کیا۔

ابو جعفر رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو توڑنے والے ہیں ان سے مراد منافق ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۶، البقرۃ، الآیۃ: الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ...]

منافقین کی نشانیاں:

منافقوں کی چھ نشانیاں ہیں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ منافقوں کو اگر غلبہ ملے موقع ملے تو ان کی یہ نشانیاں صفتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ یعنی اگر منافق کمزور ہو اور دبا ہوا ہو تو اپنی حرکتیں ظاہر نہیں کرتا، لیکن جب اس کو کوئی موقع مل جائے تو

پھران کی یہ عادتیں نکل آتی ہیں۔منافقین کی چھ نشانیاں کیا ہیں؟اس لیے علماء نے فرمایا کہ جب یہ نشانیاں پڑھو تو اپنے اندر غور کرو کہ کیا یہ ہمارے اندر تو نہیں آ گئی ہیں؟

۞......پہلی ان کی نشانی ہے"اِذَا حَدَّثُوْا كَذَبُوْا" کہ جب بات کریں تو جھوٹی بات کریں۔

آج کل مسلمان تو جھوٹ نہیں بولتا ویسے آدمی غور کرے کہ میں جھوٹ تو نہیں بولتا ہوں؟ کیا مسلمانوں میں اب جھوٹ کی بیماری تو نہیں پھیل گئی؟ اب تو......نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ...... کہ ایک تو تھا جھوٹ بول کر نہ شرمانا، ایک جھوٹ بول کر فخر کرنا اور اب تو یہ ہے کہ جھوٹ کے بغیر تو آدمی چل ہی نہیں سکتا۔یعنی اب......نعوذ باللہ......اس کو اتنا عام بنا دیا گیا ہے۔آج کل سب سے بڑا لیڈر وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا جھوٹا ہو، جو زیادہ قوم کو دھوکہ دے اور جو زیادہ قوم کو سبز باغ دکھلائے، وہ سب سے بڑا لیڈر ہوتا ہے۔اور جو سچی بات کہنے والا ہو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ قوم اس کے ساتھ چلے،سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شاہ جی رحمہ اللہ کی تقریر اور ایک شخص کا تجزیہ:

اس لیے حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: لوگ تقریر میری سنتے ہیں، نعرے ہمارے ساتھ لگاتے ہیں اور جہاں میرا اعلان کر دو وہاں دو لاکھ کا مجمع تقریر سننے کے لیے آجاتا ہے، لیکن ووٹ دوسرے کو دیتے ہیں۔ان کو پتہ ہے کہ اگر عطاء اللہ شاہ بخاری کامیاب ہو گیا تو یہ کہے گا کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو، یہ اگر کامیاب ہو گیا تو کہے گا کہ زانی کو سنگسار کر دو تو ایسے آدمی کو کون لے آئے گا؟ تو حضرت شاہ جی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں ایک جگہ تقریر کر رہا تھا کہ ہمیں کامیاب کیا تو ہم اسلام نافذ کریں گے، ہم سود ختم کر دیں گے، چور کا ہاتھ کاٹیں گے اور زانی کو سنگسار کریں گے تو ایک بوڑھا سا آدمی میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے، ایسے ایسے بار بار سر ہلاتا ہے۔تقریر کرنے والے کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، جب اس کے مزاج کے خلاف کوئی کام کر رہا ہو۔شاہ جی فرماتے ہیں کہ میں ادھر ادھر دیکھوں، لیکن پھر بھی اس پر نظر پڑ جائے۔پھر وہ اسی طرح سر ہلائے اور ہنسے۔میں نے کہا: میرے ساتھ مذاق بنا رہا ہے، سفید اس کی داڑھی ہے، بوڑھا آدمی ہے، اب میں کیا کروں؟ جب تقریر ختم ہوئی تو میں نے غصے سے اس کو پکڑ لیا کہ تم عجیب آدمی ہو میرے سامنے بیٹھ کر دانت نکالتے ہو!! اس نے کہا: شاہ جی! میں دانت نہیں نکال رہا تھا۔تم تقریر کر رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ تم کیسے عقل والے آدمی ہو؟ جن لوگوں نے تم کو ووٹ دینا ہے ان کے

تم ہاتھ کاٹو گے، وہ پاگل ہیں کہ تمہیں ووٹ دیں؟ جنہوں نے تمہیں ووٹ دینا ہے وہ تو چکلے باز ہیں، زانی ہیں، وہ تمہیں ووٹ دیں؟ کیا وہ پاگل ہیں؟ اپنی پشت پر کوڑے کھائیں گے؟ میں نے کہا: تم بھی بن گئے، میں تو تمہاری کم عقلی پر ہنس رہا تھا کہ تم کس چکر میں پڑے ہوئے ہو؟ اس نے کہا: سیدھی سی بات ہے کہ علماء اگر یہ دیکھنا چاہیں کہ ہمیں کتنے ووٹ ملیں گے؟ آسان سی بات ہے، مسجد کے نمازی گن لیں اور ایک سینما کے آدمی گن لیں۔ جتنے مسجد میں نماز پڑھنے آتے ہیں سمجھ لیں کہ اتنے تمہارے ووٹ پکے ہیں۔

منافقین کی دوسری نشانیاں:

یہ منافق کی نشانی ہے کہ جب بات کرے تو جھوٹی کرے۔

- ......دوسری نشانی ''وَإِذَا وَعَدُوْا أَخْلَفُوْا'' جب وعدہ کریں تو خلاف کریں۔
- ......تیسری نشانی ''وَإِذَا أُتُمِنُوْا خَانُوْا'' اور جب امانت رکھو تو خیانت کریں۔
- ......چوتھی نشانی ''وَنَقَضُوْا عَهْدَ اللهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهِ'' اور ہمارے دیے ہوئے عہد کو توڑ ڈالیں۔
- ......پانچویں نشانی ''وَقَطَعُوْا مَا أَمَرَ اللهُ بِهِ أَنْ يُّوْصَلَ'' اور توڑ ڈالیں اس چیز کو جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا۔
- ......چھٹی نشانی ''وَأَفْسَدُوْا فِي الْأَرْضِ'' اور زمین میں فساد کریں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۶، البقرة، الآیۃ: الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللهِ مِنْ بَعْدِ...]

تفسیر:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ [البقرة: ۲۸]

''کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم بے جان تھے، پھر تمہیں جلایا۔ پھر تمہیں مارے گا، پھر تمہیں جلائے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

آیات کا آپس میں ارتباط:

ماقبل میں منکرین کا ذکر تھا، اب ان کو جھنجھوڑا جا رہا ہے۔ اگر تمہیں اللہ کی توحید پر ایمان نہیں تو اللہ کی نعمتوں کا کچھ خیال کرلو۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق کفارِ مکہ کا نظریہ:

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں ایک عجیب انداز سے خطاب فرمایا ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ کیسے تم اللہ سے کفر کرنے کی جرات کرتے ہو؟ اور اسی میں ایک مسئلہ ساتھ سمجھ لیں کہ حالانکہ مکہ کے مشرکین ہوں یا اہل کتاب ہوں اللہ کا انکار تو نہیں کرتے تھے، خدا کو تو مانتے تھے اور مشرکین مکہ بھی خدا کو مانتے تھے۔ ایک موٹی سی بات ہے کہ خدا کو نہ مانیں تو خدا کا گھر بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ خدا کو نہ مانیں تو اس کے گھر کا طواف کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ علیحدہ بات ہے کہ شرک کرتے تھے، دہریے یا کیمونسٹ تو نہیں تھے کہ خدا ہے کہ یا نہیں؟ آج کل دنیا...... نعوذ باللہ...... اور فسادات میں مبتلا ہوگئی، دہریت پیدا ہوگئی۔ کیمونزم پیدا ہوا، اللہ کی رحمت سے اپنی موت آپ مر گیا۔ اب لوگوں کے دماغوں کے اندر جو کیڑے ہیں وہ بھی آہستہ آہستہ مر جائیں گے۔ اللہ کی ذات کا بھی انکار کرتے ہیں، مشرک تو اللہ کو مانتے تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ کو خالق مانتے تھے اور رازق مانتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اللہ کو بھی مانتے تھے اور اللہ کے ساتھ شریک بھی کرتے تھے، اس لیے وہ مشرک بنے، لیکن انہوں نے خدا کا انکار کبھی نہیں کیا، حضور ﷺ کے بعد بھی وہ خدا کو مانتے تھے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جب ابرہہ آیا تو عبدالمطلب نے کس سے دعا مانگی تھی؟ اللہ کے کعبہ کا غلاف پکڑ کر کہا کہ میرا رب یہ تیرا گھر ہے اور اپنے گھر کی آپ ہی حفاظت کر سکتے ہیں، ہم تو عاجز ہیں، ہم تیرے گھر کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ اسی طریقے سے سارے قرآن مقدس میں دیکھ لیں کہ جب بھی ان پر کوئی مصیبت آتی تھی تو خدا کو پکارتے تھے تو پھر اللہ نے ان کو یہ کیسے فرمایا ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ حالانکہ وہ اللہ سے کفر نہیں کرتے تھے۔ تو اس لیے بات کو سمجھیں! ایک آدمی چاہے لاکھ خدا کی توحید کو مانتا رہے، لیکن اگر وہ حضور ﷺ کی نبوت و رسالت کو نہ مانے تو گویا اس نے خدا کو نہیں مانا۔ ایک آدمی لاکھ دعوے کرتا پھرے کہ میں اللہ کو مانتا ہوں، اللہ کی ذات موجود ہے، اللہ خالق ہے اور رازق ہے، لیکن اللہ کے پاک نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لایا تو گویا اس نے خدا کو نہیں مانا۔ تو مسئلہ سمجھ آیا کہ انکارِ نبوت در اصل یہ بھی انکارِ خدا ہے، یعنی اگر کوئی آدمی حضور ﷺ کی اطاعت نہ کرے تو اللہ کی فرمانبرداری شمار نہیں ہوگی۔ اس لیے اللہ نے ان لوگوں کو فرمایا ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ حالانکہ وہ خدا کو مانتے تھے، اللہ کو خالق مانتے تھے، اللہ کو رازق مانتے تھے، اللہ کو پیدا کرنے والا مانتے تھے اور اللہ کو مُدَبِّر فِی الْاُمُوْر اور مُصَرِّف فِی الْاُمُوْر مانتے تھے، لیکن حضور ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے تھے، حضور پاک ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے تھے اور قرآن

کے کلام اللہ ہونے کا انکار کرتے تھے۔اس لیے جب نبوت کا انکار، رسالت کا انکار اور قرآن کا انکار کیا تو گویا کہ اللہ کا انکار کیا۔

اسی سے یہ مسئلہ سمجھ لیں! جیسے ہمارے بعض مسلمان بھائی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں کہ مثلاً: قرآن کے احکام کو نہیں مانتے اور حضور ﷺ کے فرامین مبارکہ کو بھی نہیں مانتے، لیکن کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور کلمہ پڑھتے ہیں۔تو اس کلمہ کا پھر کوئی اعتبار نہیں، یعنی آج اگر ایک آدمی......نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ......سزائے رجم کا منکر ہو یا ایک آدمی چور کے ہاتھ کاٹنے کا منکر ہو، اسے ظالمانہ سزا کہے کہ قرآن نے جو سزائیں دی ہیں یہ بڑی وحشیانہ ہیں، ظالمانہ ہیں، لاکھ کلمہ پڑھتا رہے اللہ کے ہاں وہ کافر ہے جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے۔اپنے غلط عقائد سے اگر توبہ کر لے، اسلام کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے، رحمت کا دروازہ تو بند نہیں ہوا۔

کفر کی لغوی تفسیر:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ کیسے تم اللہ کا کفر کرتے ہو؟ کفر کا اصل معنی ہوتا ہے ناشکری اور انکار۔کفر کا ایک معنی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی چیز کو چھپانا۔کفارِ مکہ اللہ کے منکر نہ تھے، لیکن پھر بھی ان کو یہ کہا گیا کہ تم اللہ کا انکار کیسے کرتے ہو؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی رسالت کے منکر تھے اور انکارِ رسالت گویا کہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرنا ہے۔

﴿وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا﴾

اور تھے تم مردے یعنی نطفہ۔

بعض علماء نے فرمایا کہ ذرا وسعتِ نظر سے کام لیں کہ نطفہ جن چیزوں سے بن رہا ہے وہ پورے عالم میں بکھری پڑی ہیں۔آدمی غور کرے! نطفہ کیا ہے؟ وہ خون سے بنتا ہے اور خون غذا سے بنتا ہے اور غذا کے حصول میں کئی لوگوں کی محنت اور کئی جگہوں سے ہو کر وہ انسان تک پہنچتی ہے اور وہ غذا کھانے کے بعد جا کر خون بنا۔یہ ساری چیزیں تو مردہ تھیں، ان کے اندر کیا تھا؟ اور پھر خون بنا، وہ مردہ ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت میں ہمیں توجہ دلائی کہ اے انسان! تم کیسے ہو؟ مردہ سے تم کو زندہ کیا، بے جان غذاؤں سے بنے ہوئے نطفہ سے تمہاری زندگی بنائی، یعنی ایک مردہ چیز کو ہم نے زندہ کیا۔

بیٹی بیٹا دینا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے:

ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بہت بڑا رئیس اور سردار آدمی تھا، اس نے بڑے شوق سے اور چاہت سے ایک جگہ

شادی کی۔ شادی ہوگئی...... اور بڑے آدمیوں کے لیے شادی کیا مشکل ہے!؟ پیسہ ہو تو ہر رات شادی ہے، اسی لیے اردو کا محاورہ ہے کہ اگر دولت ہو تو ہر رات شب برات ہے اور ہر دن عید ہے۔ مسئلہ تو غریب کے لیے ہے...... جب اس رئیس نے شادی کر لی۔ بہر حال جب اس کی اولاد ہوئی تو بچی پیدا ہوئی۔ کہا: ٹھیک ہے۔ دوسری بھی بچی پیدا ہوئی، تیسری بھی بچی پیدا ہوئی۔ جب تین بچیاں ہوئیں تو اس کی طبیعت میں نفرت آگئی، اس نے اس بیوی کے ساتھ آنا جانا اور ملنا جلنا بند کر دیا۔ اس نے کہا: میں نے اتنی محبت سے شادی کی اور لڑکیاں پیدا ہو رہی ہیں تو اس کی بیوی نے اشعار کہے ہیں، جو بڑے عجیب اشعار ہیں! علماء نے کتابوں کے اندر نقل کیے ہیں۔

مجھ سے ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ عورت زمین ہے، جو بیج ڈالو گے وہی اگے گا۔ عورت کے ذمہ تو نہیں ہے کہ لڑکی پیدا کرے یا لڑکا پیدا کرے۔ یہ تو تمہارا بیج ہے، عورت تو زمین ہے۔ اگر تم نے گندم کا بیج ڈالا ہے تو گندم نکلے گا، جو ڈالا ہے وہ نکلے گا۔ اس میں عورت کا کیا مسئلہ ہے کہ عورت لڑکی پیدا کر رہی ہے۔

﴿فَاَحْيَاكُمْ﴾ پھر اللہ نے تمہیں زندہ کیا۔

﴿ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾ پھر تمہیں موت دیں گے اور پھر تمہیں زندہ کریں گے۔

یہاں موت دینے کو بھی اللہ نے نعمت شمار کیا ہے، کیونکہ اگر موت نہ آئے تو پھر وہ ابدی زندگی نصیب ہی نہیں ہو سکتی، اگر موت نہ آئے تو عالم دنیا سے عالم آخرت کی طرف انتقال ہو ہی نہیں سکتا۔

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ:

اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بڑا مشہور واقعہ ہے۔ بہر حال اللہ نے فرمایا: میرے پیغمبر سے کہہ دو کہ ایک جانور پر ہاتھ رکھ دیں، مثلاً: ایک گائے پر یا ایک بیل پر ہاتھ رکھیں۔ ان کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آجائیں اتنے سال ہم ان کی زندگی بڑھا دیتے ہیں، مثلاً: سو بال آگئے یا دو سو بال آگئے تو سو دو سو سال بڑھ گئے۔ تو انہوں نے کہا کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ کہا: اس کے بعد مرنا تو ہے۔ انہوں نے کہا: جب پھر مرنا ہے تو اب مرنا بہتر ہے، کیونکہ دو سال کے بعد بھی تو مرنا ہی ہے۔

یہاں تو صرف ایک موت کا ذکر ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے تم مردہ تھے تو تمہیں زندہ کیا۔ زندگی کے بعد پھر تمہیں موت دیں گے اور پھر موت کے بعد زندگی دیں گے اور پھر تم آخرت میں چلے جاؤ گے اور اس کے بعد تو موت ہوگی نہیں۔

عذابِ قبر برحق ہے:

بہت سارے لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ قبر میں عذاب کیسے ہوتا ہے؟ قبر والوں کو سلام کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ اور قبر میں سوال و جواب کا کیا مسئلہ ہے؟ بس ایک موت پہلے تھی، مردہ تھے، زندہ ہو گئے۔ زندہ ہونے کے بعد مر گئے، مرنے کے بعد تو ہمیں پھر اسی دن اٹھایا جائے گا جب ہم آخرت میں جائیں گے۔ تو قبر میں تو زندگی کا کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں، قرآن نے ذکر ہی نہیں کیا تو قبر میں سوال جواب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پہلے لوگوں نے یہ غلط فہمی پیدا کی کہ مردے سنتے نہیں ہیں، پھر کہا کہ جب سنتے نہیں ہیں تو سوال جواب کس بات کا ہوگا؟ تو انجام اس غلط فہمی سے عذابِ قبر کا انکار کر دیا۔ علماء اہل سنت والجماعت نے جواب دیا ہے کہ ایک زندگی دنیا کی ہے، جس پر تمام احکام مرتب ہوتے ہیں، تکلیف مرتب ہوتی ہے اور اسی طرح پھر ایک زندگی ہے آخرت کی۔ دنیا کی زندگی میں عمل ہوگا اور آخرت کی زندگی میں جزا ہوگی اور بدلہ ہوگا۔ وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، وہاں احکام کی پابندیاں نہیں ہوں گی، وہاں راحت ہی راحت ہے۔ تو اصل زندگی دنیا کی تھی یا آخرت کی تھی، اس کا ذکر تو اللہ نے فرما دیا اور برزخ کا معاملہ نہ دنیا کی طرح مستقل زندگی ہے اور نہ آخرت کی طرح زندگی ہے، وہ تو گویا ایسے ہے جیسے ایک زندہ انسان کو نیند اور خواب کی کیفیت ہوتی ہے۔ تو عالم برزخ میں اللہ تعالیٰ جتنا قرآن مقدس میں ثابت ہے، جتنا احادیث پاک میں ثابت ہے، بس اتنی قسم کی ایک زندگی دے دیتے ہیں، وہ ہمارے سامنے ہے۔ آخرت میں جب اٹھائیں گے پھر بھی ہم اسی طرح زندہ ہوں گے، لیکن جو درمیانی کیفیت ہے، عالم برزخ ہے، وہ علم غیب ہے۔

اب اس کے اندر ایسا ہے کہ مثلاً سورج اپنے مقام پر موجود ہے اور آپ زمین پر ایک چیز رکھتے ہیں اور مصنوعی شیشے کو لے کر اس پر سورج کی شعاعیں ڈالتے ہیں تو کوئی حساب کرنے کی مشینیں یا گھڑیاں دھوپ لگے گی تو چل پڑے گی، اس کو کسی بیٹری کی ضرورت نہیں، وہ شمسی توانائی سے چلتی ہے۔ اگر سورج نہ ملے مثلاً: رات کو ضرورت ہے اسی عام لائٹ کے بھی سامنے کر دیں تو اس سے بھی وہ توانائی لے لیتی ہے، حالانکہ وہ مشین یا کیلکولیٹر جو ہے آپ کے ہاتھ میں ہے، کوئی تار نہیں، کچھ نہیں ہے اور سورج اپنی شعاعیں آسمانوں سے بکھیر رہا ہے، لیکن جب اس مشین پر پڑتا ہے تو اس کی بیٹری چارج ہو جاتی ہے اور وہ کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ روح کو علیین میں رکھتے ہیں اور کافروں کی روح کو سجین میں رکھتے ہیں، لیکن جس بندے کو نعمتیں دینی ہیں یا عذاب دینا ہے تو اس

روح کا تعلق اور روشنی اس میں ڈال دیتے ہیں، اس کے اندر وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

کوئی جھگڑے والا مسئلہ تو ہے ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا کہ ہمارا سارے قرآن پر ایمان ہو جائے گا، جیسے کہ اللہ پاک نے فرمایا کہ فرعون کو جب ہم نے غرق کیا اور غرق ہونے کے فوراً بعد اسے عذاب نار میں داخل کر دیا گیا:

﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا﴾ [غافر:۴۶]

''وہ صبح و شام آگ پر پیش کیے جاتے ہیں۔''

اسی طریقہ سے آیا کہ مومن سے بھی سوال ہوگا اور کافر سے بھی سوال ہوگا:

((مَنْ رَّبُّكَ؟ مَا دِيْنُكَ؟ مَاتَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ؟))

تو اب پھر ان تمام حدیثوں کا انکار کرنا پڑے گا کہ اگر ہم کہیں گے کہ جب بندہ مر گیا تو اس کے بعد بھی عذاب نہیں ہے۔

اب نتیجہ کیا نکلا کہ لوگ راستے سے ہٹ گئے۔ جو لوگ قبر کی زندگی کے قائل تھے وہ بڑھتے گئے، بڑھتے گئے، انہوں نے کہا: قبر کی زندگی کے اندر سوال جواب تو ہر آدمی سے ہوگا، اتنا تو کافر کو بھی زندگی ہے تو مومن کو زیادہ ہے، اچھا جی! اللہ کے ولیوں کو اور زیادہ ہے، اللہ کے نبیوں کو اور زیادہ ہے۔ وہ جہاں چاہتے ہیں مرضی آئے تو چلے بھی جاتے ہیں، وہ آگے بڑھتے گئے، انہوں نے کہا کہ ان کی زندگی تو بہت اعلیٰ ہے تو وہ جہاں چاہیں آئیں جائیں۔ اسی لیے بزرگوں کی زندگی بہت اعلیٰ ہے، جب چاہتے ہیں مریدوں کے گھروں میں ان کو ملنے کے لیے آجاتے ہیں۔ اور آگے بڑھتے گئے اور ادھر والے گھٹتے گئے، انہوں نے کہا: بس معمولی سی زندگی ہوتی ہے، بس سوال جواب ہوگا اور اس کے بعد کچھ نہیں۔ وہ ادھر گھٹتے گئے اور وہ ادھر بڑھتے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں پٹڑی سے ہٹ گئے، حالانکہ اصل بات کیا تھی کہ جتنا قرآن فرماتا ہے اور حدیث فرماتی ہے اتنا ہمارا ایمان ہے۔ قرآن نے فرمایا اور حدیث نے ہمیں بتلایا کہ جب قبرستان پر گزرو تو سلام کرو:

((اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ!)) [صحیح مسلم، حدیث: ۹۷۴، باب: مَا يُقَالُ عِنْدَ دُخُوْلِ الْقُبُوْرِ]

حدیث میں موجود ہے، ہمارا ایمان ہے کہ جب ہمیں سلام کا حکم دیا گیا ہے تو اللہ ان کو سنواتے بھی ہوں گے، وگرنہ ہم ہر دیوار، درخت اور ہر بے جان چیز سے گزرتے تو حکم ہوتا کہ سلام کرو۔

اور اسی طرح سوال جواب ہوتا ہے، ہمارا ایمان ہے، کیونکہ جو حدیث میں موجود ہے اس سے آگے نہ بڑھیں گے۔ قدم بڑھائیں گے تو پھر ہلاکت کے گڑھوں میں گرتے چلے جائیں گے، یعنی جتنا ثابت ہے مان لیں اور جس کا ذکر نہیں چپ ہو جائیں۔ جن جن چیزوں کی ہمارے سرکار ﷺ نے وضاحت فرما دی ہمارا ایمان ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے دیکھا ان دو قبروں پر عذاب ہو رہا ہے[1]۔ حضور ﷺ سے کہا گیا کہ آج فلاں آدمی نے بڑی بے جگری سے جنگ لڑی ہے اور شہادت پا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس نے مالِ غنیمت سے ایک چیز چرائی اور اس کی وجہ سے آگ جل رہی ہے[2]۔ تو جتنی چیزیں میرے نبی پاک ﷺ نے بتلائی ہیں اتنی مانیں، آگے قدم نہ بڑھائیں، کیونکہ جو آگے بڑھیں گا تو پھر ٹھوکریں لگیں گی۔

جیسے ہماری دوسری برادری آگے چلی گئی۔ جو آدمی پیر کی قبر پر کھڑے ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ پیر کو سب پتہ ہے کہ فلاں میرا مرید آیا ہوا ہے اور اس کو یہ بھی پتہ ہے کہ مرید کیا مانگنے آیا ہے؟ دنیا میں پیر کے سامنے بیٹھو تو اس کو پتہ نہیں، مرنے کے بعد اس کو یہ بھی پتہ لگ جاتا ہے۔ عجیب سی بات ہے!!

واقعہ:

ایک پیر صاحب تھے، انہوں نے اپنی بڑی شہرت کی کہ پیر صاحب اتنے اعلیٰ مقام کو پہنچے ہوئے ہیں کہ جو آدمی سامنے جاتا ہے حضرت سب جان لیتے ہیں کہ یہ آدمی کیوں آیا ہے؟ کیوں بیٹھا ہے؟ کیا غرض ہے؟ تو ایک طالب علم تھا...... طالب شرارتی ہوتے ہیں، طالب علم چاہے بوڑھے بھی ہو جائیں طالب طالب ہوتا ہے...... خدا کی قدرت ہے کہ ایک طالب علم کو شرارت سوجھی، اس نے عربی میں ایک شعر لکھا، جس میں اس کو گالی لکھی۔ وہ گندا شعر ہے، میں پڑھنا نہیں چاہتا۔ تو اس نے لکھنے کے بعد یہ کیا کہ جو شعر کاغذ میں لکھا ہوا تھا وہ جا کر حضرت کے بیٹھنے کی جگہ پر اونچے مقام پر رکھ دیا کہ جہاں حضرت آکر بیٹھیں تو وہ کاغذ نظر آجائے اور اس کے نیچے لکھا کہ چونکہ حضرت آپ سب کچھ جانتے ہیں تو مجمع میں یہ بھی بتا دیں کہ یہ شعر کس نے لکھا ہے؟ اب حضرت نے وہ شعر پڑھا۔ جب شعر پڑھا تو چہرہ بگڑنے لگ گیا۔ پھر اس کو رکھ دیا، پھر غصہ آئے، پھر پڑھے اور پھر چپ کر کے رکھ دے۔ مریدوں نے پوچھا: حضرت! کیا بات ہے؟ اس نے کہا: چھوڑو!۔ انہوں نے کہا: حضرت! بتائیں تو سہی آخر کیا ہے؟ انہوں نے

---

[1] [صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۶۱، باب: الجرید علی القبر]
[2] [صحیح البخاری، حدیث: ۳۰۷۴، باب: القلیل من الغلول]

جب زیادہ تنگ کیا تو اس نے کہا کہ کسی مردود نے بڑی بکواس لکھی ہے۔ انہوں نے پوچھا: کون ہے وہ شرارتی؟ تو اس نے کہا: پتہ نہیں؟ تو اس کا علم غیب تو وہیں کھل گیا۔ بھائی! جب تمہیں گالی دینے والا کا پتہ نہیں لگتا، صرف پیسے دینے والا کا پتہ لگتا ہے۔ اچھا تمہارا علم غیب ہے! جو تمہیں آ کر نذر و نیاز چڑھاتا ہے، اس کا پتہ لگتا ہے اور جو تمہیں گالی دے رہا ہے اس کا تمہیں پتہ نہیں لگتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائے۔

اسی لیے شیخ غلام اللہ خان مرحوم کہا کرتے تھے کہ بابا! تمہارے پیروں میں کوئی زور ہوتا تو غلام اللہ زندہ رہتا!؟ میں نے جو کراچی سے خیبر تک تمہارے دروازے اکھاڑ ڈالے ہیں۔ اگر تمہارے پیروں میں زور ہوتا تو میں کہاں زندہ رہتا؟ وہ تو سب سے پہلے میری جان نکال لیتے۔ موت وحیات کا مالک تو صرف اللہ ہے۔

آیات کا ربط:

اس مسئلہ میں ہمیشہ یہ اصول یاد رکھیں کہ جتنی چیز قرآن وسنت میں ثابت ہے اس پر ایمان لانا ہے اور جس چیز کا اللہ کے قرآن اور حضور ﷺ کی حدیث میں ذکر نہیں ہے اس کی بحث میں پڑنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

فرمایا:

﴿كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ﴾

"تھے تم مردہ، پس اس نے تم کو زندہ کیا۔"

وہاں "فاء" لگائی، کیونکہ اس زندگی میں فاصلہ بڑا تھوڑا ہے۔ نطفہ آیا، پھر قرار پکڑا اور اللہ نے اس کو زندہ کر دیا۔ لیکن اس کے بعد عمر پچاس سال ہے، سو سال ہے، ستر سال ہے، دس سال ہے، کیونکہ فاصلہ زیادہ ہے، اس لیے فرمایا

﴿ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ﴾

اور اس کے بعد قبر کی زندگی کا بھی اللہ کو پتہ ہے کہ ہم نے کتنی دیر قبر میں رہنا ہے؟ وہاں بھی فرمایا:

﴿ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾

چونکہ "فاء" تعقیب کے لیے ہوتی ہے اور "ثُمَّ" بُعد مدت کے لیے ہوتا ہے اور تراخی کے لیے ہوتا ہے، فرمایا:

﴿ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾

اور اٹھنے کے بعد کتنے مراحل سے گزرنے کے بعد ہمیں میدان حشر میں حاضر ہونا ہوگا! اس لیے فرمایا:

﴿ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾

اور پھر تم اپنے اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، میدانِ حشر میں جاؤ گے اور پھر اس کے بعد حساب و کتاب ہوگا۔
اللہ نے فرمایا: کم از کم اپنی زندگی اور اپنے بدن پر نظر ڈال لو، تمہیں میری قدرت کا اقرار کرنے پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ نعمتوں کا تذکرہ کیوں فرماتے ہیں؟

ان آیات مبارکہ میں اللہ نے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب نعمتوں کا ذکر کیا جائے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آدمی اس نعمت دینے والی ذات کو پہچانے کہ ہمارا منعم حقیقی کون ہے؟ اور اس کی نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور کفر اور نافرمانی نہ کرے۔ اس آیت میں یہ فرمایا گیا کہ تم لوگ جس طرح اللہ کے نازل کیے ہوئے قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اسی طرح اللہ کی دی ہوئی حیات اور بدن کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے اپنی حیات و موت پر غور کرو کہ جس ذات نے موت و حیات دی ہے اس نے رسول اور احکام بھیجے ہیں، پھر ان کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ [البقرۃ:۲۹]

اللہ نے فرمایا: زمین اور کل کائنات میں جو کچھ میں نے پیدا کیا ہے وہ میرے بندے کے لیے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ اگر تمہیں پیدا فرما دیتے، لیکن پیدا ہونے کے بعد غذا کا انتظام نہ کرتے تو پھر تو تم زندہ نہ رہتے۔

اشیاء میں اصل حلت ہے یا حرمت؟

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ [البقرۃ:۲۹]

بعض علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ جب اللہ نے ہر چیز ہمارے لیے پیدا کی ہے تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز کے اندر اصل حلت و اباحت ہے، لیکن جن چیزوں کا اللہ نے حرام ہونے کا اعلان فرما دیا وہ حرام ہیں، کیونکہ جب پیدا ہمارے لیے کیا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ سب نعمتیں حلال ہیں۔

اور بعض علماء نے فرمایا: اصل ہر چیز میں حرمت ہے، لیکن وہ چیزیں جو اللہ نے ہمارے لیے حلال کر دی ہیں وہ حلال ہیں، باقی حلال نہیں ہیں۔

اگر غور کریں تو یہ مقام اس بحث کا نہیں ہے، اس میں تو اللہ اپنی نعمتوں کا ذکر فرمار ہے ہیں کہ میرے بندو! دیکھو! زمین اور جو کچھ اس میں ہے میں نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔

[معارف القرآن: ۱/۱۷۴]

ایک بادشاہ کی بیماری کا واقعہ:

اس لیے تاریخ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بادشاہ نے زمین پر ایک کیڑا دیکھا، جو گندگی اپنے اوپر اٹھا کر چلتا ہے۔ بادشاہ کو بڑی نفرت آئی، کہنے لگا: دیکھو! یہ کیا گندی چیز ہے! اوپر گند اٹھایا ہوا ہے۔ اگر اللہ میاں اس کو پیدا نہ کرتے تو کون سا دنیا میں کمی آجاتی؟ یہ بھلا پیدا کرنے کی چیز تھی؟ اس کو پیدا کر دیا گیا۔ اگر یہ پیدا نہ ہوتا تو کون سا مخلوق کا کام رک جاتا؟ کون سا نظام درہم برہم ہو جاتا؟...... تو بات تھی ختم ہوگئی اور بادشاہ یہ بات بھول گیا۔

مدتوں کے بعد بادشاہ کے پاؤں پر پھوڑا نکل آیا، اس کا بڑا علاج کرایا، لیکن شفا نہ ہوئی۔ تمام جراح تنگ آگئے، بادشاہ مجبور ہے، پاؤں میں پھوڑا ہے، نہ جراب پہن سکتا ہے، نہ جوتا پہن سکتا ہے...... یہ تو جب نعمت چھن جاتی ہے پھر پتہ لگتا ہے۔ ابھی ہمارے ہاتھ پاؤں سالم ہیں، ایک ناخن ذرا ٹوٹ جائے تو پھر اندازہ ہوگا، آنکھ میں تمہارا اپنا بال گر جائے تو پھر پتہ لگے گا کہ کتنی بڑی نعمت ہے! کیونکہ ابھی تو ہم دیکھ رہے ہیں، کھا رہے ہیں اور پی رہے ہیں، اس لیے خدا کو بھولے ہوئے ہیں، ہمیں اللہ کی کوئی نعمت یاد نہیں۔ دیکھا نہیں!! ان سے آنکھوں والی نعمت کی قدر پوچھو جو اندھے ہیں، ان سے ٹانگوں کی قدر پوچھو جو لنگڑے ہیں، ان سے ہاتھوں کی قیمت پوچھو جو ہاتھوں سے محروم ہیں، ان سے عقل کی قیمت پوچھو جو پاگل ہو گئے ہیں، ان سے قوت کی قیمت پوچھو جو کمزور ہو گئے ہیں اور ان سے صحت کی قدر پوچھو جو بیمار ہو گئے ہیں۔ جب تک وہ نعمت موجود ہے انسان خدا کو بھولا ہوا ہے، لیکن جب وہ نعمت چھن جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ بڑے صحتمند نوجوان پر فالج کا حملہ ہوتا ہے، معذوری میں پڑا ہوا ہے کہ کوئی آئے تو اسے حمام اٹھا کر لے جائے۔ گھر والے بھی تنگ آگئے، ماں باپ بھی تنگ آگئے اور دوست بھی تنگ آگئے۔ اب اپنے پیشاب میں پڑا ہے، اپنی گندگی میں پڑا ہے، لیکن اٹھنے کی طاقت نہیں، حمام جانے کی طاقت نہیں، کوئی اور چارپائی

سے اٹھا کر وہیل چیئر پر لے جائے، اس کو پتہ ہوتا ہے کہ میری صحت کا کیا عالم تھا؟ میرے چلنے کی کیا نعمت تھی؟ جب نعمت چھن جاتی ہے تو پھر قدر معلوم ہوتی ہے...... تو خیر بڑا علاج معالجہ ہوا، لیکن بادشاہ ٹھیک نہ ہوا۔

ایک دن بادشاہ شکار پر گئے ہوئے تھے، دریا کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مجذوب فقیر آدمی گزرا، اس نے سلام کیا۔ بادشاہ موڈ میں بیٹھے ہوئے تھے، کچھ انعام بھی دیا۔ اس فقیر کی نظر جب پاؤں پر پڑی تو اس نے کہا کہ بادشاہ سلامت! آپ کے پاؤں پر کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ایک پھوڑا ہے، میں تو بڑا تنگ آ گیا ہوں۔ میں نے بڑے بڑے اطباء بلائے ہیں، لیکن یہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس نے کہا: میں سنیاسی قسم کا آدمی، جوگی قسم کا آدمی ہوں اور جنگلوں میں پھرنے والا ہوں۔ ایک کیڑا جو گندگی اٹھا کر پھرتا ہے مل جائے تو میں ایک مرہم بنا دوں گا اور آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جلدی کرو، تلاش کرو۔ اب سارے سپاہی دوڑ پڑے اب اسی کو ڈھونڈ رہے ہیں جس کے بارے میں کہتا تھا کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے بارے میں اس کا یہ خیال تھا کہ اس کو اللہ نے پیدا کیوں کیا؟

اسی لیے بعض جاہل کہہ دیتے ہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اور ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ میرا مولیٰ جانتا ہے کہ اس میں کیا حکمتیں ہیں؟ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی ہے، غریب ہے، نماز پڑھ رہا ہے، تہجد پڑھ رہا ہے، اشراق پڑھ رہا ہے، اللہ کے قرآن پر ایمان ہے اور حضور پاک ﷺ پر ایمان ہے۔ سارا دن مزدوری کرتا ہے اور بچوں کا پیٹ بڑی مشکل سے پالتا ہے۔ اور اس کے مقابلہ پر ایک فاسق فاجر ہے، شرابی ہے، زانی ہے، بدکردار ہے، بداعمال ہے، بدصورت ہے اور جاہل ہے اور وہ کروڑوں میں کھیلتا ہے۔ بندہ کہتا ہے کہ عجیب بات ہے! اللہ نے اپنے بندے کو تو کچھ نہیں دیا ہے، جو اس کی عبادت کرنے والا ہے۔ اور جو اس کا مخالف ہے، فاسق فاجر ہے اور بے دید ہے، وہ سارا دن اللہ کے قوانین کو توڑنے والا ہے، اسے عورتیں بھی مل رہی ہیں، شراب بھی مل رہی ہے اور پیسہ بھی مل رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم جاہل ہیں، ہمارا علم محدود ہوتا ہے، ہماری پوری کائنات پر نظر ہو ہی نہیں سکتی، محلے میں نظر نہیں ہو سکتی، چہ جائیکہ کائنات میں ہماری نظر ہو، لیکن وہ جانتے ہیں: جس کو اللہ نے غریب رکھا ہے تو اس کے غریب رکھنے میں کوئی حکمتیں ہیں، جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے دولت دی ہے، دولت دینے میں امتحان اور آزمائشیں ہیں، وہ دینے والا سمجھتا ہے، ہم نہیں سمجھتے۔

تو اب اس کیڑے کو ڈھونڈ رہے ہیں، وہ مل گیا، اس کو پکڑا، اس کو کاٹا، اس کے اندر کا حصہ نکالا اور اس سے ایک

مرہم تیار کی اور بادشاہ کو کہا کہ اس کو تیس دن کے لیے باندھیں اور پھر اس کے بعد میں حاضر ہوں گا اور پھر دیکھیں گے کہ کیا ہوا ہے؟ بادشاہ نے مرہم باندھی تو نہ پھوڑا رہا اور نہ زخم رہا، سب ختم ہو گیا۔ اس نے کہا: اس فقیر کو ڈھونڈو، اس کو انعام دیں، لیکن وہ کہاں ملے؟ وہ تو اللہ نے تنبیہ کرنے کے لیے کسی کو بھیج دیا تھا۔

تفسیر:

یہاں آیت میں زمین کا مطلقاً ذکر ہے، لیکن آسمانوں کی تقسیم کا بھی ذکر آ گیا، لیکن صحیح قول سلف صالحین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان بھی سات پیدا کیے اور زمین بھی سات پیدا کی ہیں۔ اور ہر آسمان سے دوسرے آسمان تک کا جو فاصلہ ہے، حدیث پاک میں آتا ہے: حضور ﷺ نے فرمایا: ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال تک آدمی چلتا رہے گا وہاں تک پہنچے گا، اسی طرح پھر تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا اور ساتواں آسمان ہے۔ اللہ نے پھر زمینوں کو بھی سات زمینیں بنایا۔

یہاں ﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ﴾ ہے اور دوسری جگہ ہے ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝﴾ [طٰہٰ:۵]۔ وہاں ''علیٰ'' یعنی اللہ عرش پر مستوی ہے، جیسے اس کی شان کو زیبا دیتا ہے اور یہاں ''اِلیٰ'' صلہ آیا ہے کہ اللہ نے آسمانوں کی طرف توجہ فرمائی اور آسمانوں کو سات حصے میں بنایا۔

بعض آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے آسمان پہلے بنائے، زمین بعد میں بنائی اور بعض آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے زمین پہلے بنائی اور آسمان بعد میں بنائے، جیسے قرآن مقدس کی ایک آیت میں آتا ہے:

﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝﴾ [النازعات:۳۰]

''آسمانوں کو بنانے کے بعد زمینوں کو بچھایا۔''

بعض مفسرین نے فرمایا ہے: دراصل اللہ نے زمین پیدا فرمائی، اس کے بعد آسمانوں کو بنایا۔ پھر اللہ نے زمین کو بچھایا اور پھیلایا۔ پیدا کرنا علیحدہ چیز ہے اور بچھانا علیحدہ چیز ہے۔ یہی قول راجح ہے اور اسی پر تقریباً تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ [تفسیر ابن کثیر:۱/۶۷، البقرۃ: الآیۃ: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ...]

قیامت کا علم صرف اللہ کو ہے:

اب جدید علماء کہہ رہے ہیں کہ ایک دم دار تارا مشتری سے ٹکرائے گا۔ کہتے ہیں کہ ایک کروڑ سال کے بعد ٹکراتا

ہے۔ اب اندازہ کریں کہ خدا کی زمین پیدا ہوئے کتنی صدیاں گزر گئیں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی جانتا ہے، کون حساب لگا سکتا ہے؟ ہمارے حساب تو زیادہ سے زیادہ ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت کے بعد چودہ صدیاں گزر گئیں اور ہم پندرھویں صدی میں داخل ہیں، لیکن حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر میرے مدنی پاک ﷺ کا بھی زمانہ نکالیں تو تقریباً آٹھ ہزار سال بنتا ہے۔ ہزار ہا سال گزر چکے ہیں اور اس کے بعد خدا جانے اور کتنے گزریں گے؟ یہ جاہلوں کا قول ہے کہ چودھویں صدی آ گئی، اس کے بعد قیامت آئے گی۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی یہی دعویٰ کیا تھا کہ چودھویں صدی آخری صدی ہے، پندرھویں صدی نہیں آئے گی۔ اگر پندرھویں صدی آ گئی تو میں جھوٹا۔ یہ جاہلانہ بات ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں، کیونکہ جب اللہ نے قیامت کا علم ہی کسی کو نہیں دیا تو صدیاں گننے کا کیا معنیٰ ہے؟ قیامت کا علم ملے پھر تو ہم تاریخ گن سکتے ہیں کہ باقی سو سال ہے یا پچاس سال ہے؟ تو جب قیامت کے آنے کا کسی کو علم ہی نہیں ہے تو جتنی مدت باقی ہے اس کا بھی کسی کو علم نہیں ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اس نظام پر غور کرو ﴿وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ﴾ [ق:٦] کہ آسمان کے اندر کسی قسم کا کوئی سوراخ نہیں ہے۔ جیسے آج کل کہتے ہیں کہ اوزون میں ایک سوراخ ہو گیا ہے۔ یہ تو آسمان سے نیچے کی باتیں ہیں، آسمان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بادل جیسے آسمان سے نیچے ہیں اور چاند آسمان سے نیچے ہے اسی طرح اوزون کا غلاف بھی آسمانوں سے نیچے ہے۔ آسمانوں پر تو خدا جانے ہماری نظر بھی پہنچتی ہے کہ نہیں پہنچتی؟ اس لیے بعض کہتے ہیں کہ آسمان نیلا ہے، یہ ہمیں نیلگوں ایک خلا نظر آتا ہے، جس کو ہم نے آسمان بنایا ہوا ہے، ورنہ خدا جانے کہ آسمان کہاں ہے؟ وہاں تک ہماری وسعت نظر نہیں جاتی۔

زمین والوں کی طرح آسمان میں بھی کعبہ ہے:

حدیث مبارک میں آیا: اللہ نے ساتوں آسمانوں پر جو کعبہ بنایا ہے ساتوں آسمان والوں کے لیے۔ جیسے زمین والوں کے لیے کعبہ ہے، اسی طرح آسمان والوں کے لیے کعبہ ہے۔ اور آسمانوں سے اوپر ایک اللہ کا گھر ہے، اس کا نام بیت المعمور ہے۔ اگر اللہ کے کعبہ کو نیچے اتاریں تو بعینہٖ اسی کعبہ کے اوپر بیٹھے گا، یعنی اس کعبہ کا حکم تحت الثریٰ تک بھی ہے اور آسمانوں تک بھی ہے۔ حدیث مبارک کے اندر آتا ہے کہ اس کعبہ کا طواف کرنے کے لیے روزانہ

ستر ہزار فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور جو ایک دن طواف کرتا ہے اس کو قیامت تک پھر نمبر نہیں ملے گا۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۳۲۰۷، باب: ذِكْرِ الْمَلَائِكَةِ]

سب سے زیادہ علم والے کون؟

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمام مخلوق پیدا کی ہے اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور سات آسمان بنائے، شاید تم یہ سمجھو کہ اب اللہ کو ہمارا کوئی پتہ نہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۷، البقرۃ: الآیۃ: هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ]

جب بھی اللہ کی توحید کا مسئلہ آئے گا تو دو صفتوں کا ضرور ذکر آئے گا: ایک عالم کامل کا ذکر آئے گا اور ایک قدرت کاملہ کا ذکر آئے گا۔ دو باتیں اگر انسان کے دماغ میں مستحکم ہو جائیں تو اللہ کی رحمت سے آدمی کفر اور شرک سے بچ جاتا ہے کہ قدرت کامل کا مالک اللہ ہے۔ بندے اور ہر جاندار کو اللہ نے عقل و قدرت دی ہے، لیکن وہ کامل نہیں ہوتی، بیماری عوارض وغیرہ سے ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح علم اللہ نے ہر چیز کو دیا ہے، جانوروں کو بھی ان کی ضرورت کے مطابق علم دیا ہے۔ سب سے زیادہ علم انسانوں کو دیا ہے اور انسانوں میں سب سے زیادہ علم انبیاء علیہم السلام کو دیا ہے اور انبیاء علیہم السلام میں سب سے زیادہ علم اللہ نے اپنے رسولوں کو دیا ہے، لیکن علم کامل کسی کا نہیں ہے، علم کامل صرف اللہ کی ذات کا علم ہے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا: مسلمانو! قدرت کاملہ بھی میرے ہاتھ میں ہے اور علم کامل بھی میرے ہاتھ میں ہے۔ جب یہ سب چیزیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور ہم نے بھی اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے تو ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ﴾ کیسے تم میرے ساتھ کفر و شرک کر رہے ہو؟

عذابِ قبر برحق ہے:

ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا یہ متفق علیہ مسئلہ ہے:

"عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ"

"قبر کا عذاب حق ہے۔"

"لَا يُنْكِرُهَا إِلَّا ضَالٌّ أَوْ مُضِلٌّ"

"اس کا انکار نہیں کرتا، مگر جو گم کردہ راہ ہے اور لوگوں کو بھی گمراہ کرنے والا ہے۔"

ہر چیز کا علم صرف اللہ کو ہے:

اللہ نے پھر سات آسمان پیدا فرمائے اور اللہ تعالیٰ کا علم تمام مخلوقات کو محیط ہے، مخلوقات کا ذرہ ذرہ اللہ کے علم میں ہے۔

اسی لیے یاد رکھیں کہ جیسے آپ نے قرآن کے اندر پڑھا ہے اور کوئی مقامات میں آپ پڑھتے بھی ہیں، اللہ نے فرمایا:

﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ [ق:١٦]

''میں ہر بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں۔''

اور اس طرح فرمایا کہ جب بھی مجھے پکارو تو میں سنتا ہوں۔

اور اسی طرح اللہ نے فرمایا:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ﴾ [الحدید:٤]

''اللہ کی ذات تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہوتے ہو۔''

اس کا معنی یہ نہیں ہوتا، جیسے بعض لوگ گمراہی میں پڑ گئے کہ اللہ شہ رگ سے قریب ہے تو شہ رگ تو اندر ہوتی ہے تو اللہ اندر داخل ہو جاتا ہے، جیسا کہ بعض روافض نے یہ عقیدہ رکھا۔ اور اسی طرح ہمارے بعض لوگ...... جو غلو میں مبتلا ہوئے...... انہوں نے بھی یہ عقیدے رکھے کہ ہمارے پیر میں اللہ کا حلول ہو گیا۔ کسی نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں اللہ کا حلول ہو گیا۔ یہ عقائد کفریہ ہیں اور یہ عقائد شرکیہ ہیں۔ قریب ہونے کا معنی یہ ہے کہ ہر چیز اس کے علم میں ہے۔ جو چیز علم میں ہو وہ قریب ہوتی ہے اور جو چیز علم میں نہ ہو...... چاہے قریب بھی ہو...... دور ہوتی ہے۔ تو اس لیے اللہ کے قرب سے معیت علم مراد ہوتی ہے۔ جب اللہ کے علم میں ساری مخلوق ہے کہ کوئی چیز اللہ کے علم سے باہر نہیں ہے۔ اب اسی طرح دیکھیں مثال سمجھانے کے لیے: اگر تم نے گھر میں کوئی چیز رکھی ہو، الماری کے اندر ہو اور تالے کے اندر ہو، لیکن آپ کو علم ہے کہ میری چیز فلاں صندوق اور فلاں الماری کے خانے میں رکھی ہوئی ہے، گویا تمہیں ڈھونڈنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، بس الماری کھولی اور نکال لی۔ اور ایک چیز اس کا تمہیں علم نہ ہو، چاہے وہ تمہارے سامنے بھی رکھی ہو تو سارا دن ڈھونڈتا ہے اور دوسرے دن نظر آتی ہے تو کہتا ہے ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا

باللہِ'' یہ تو یہاں پڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ علم نہیں ہوتا تو وہ چیز عدم علم کی وجہ سے دور ہو جاتی ہے اور علم ہونے کی وجہ سے چاہے کتنی دور ہو، لیکن قریب ہو جاتی ہے۔

اس کی دوسری مثال یوں سمجھ لیں! مثلاً: آپ کا بیٹا آپ سے ناراض ہو کر چلا گیا اور اسی مکہ میں چھپ گیا، لیکن آپ سے دور ہے۔ اب آپ ڈھونڈ رہے ہیں اور دوستوں سے پوچھ رہے ہیں اور سارا سارا دن آپ اس کے لیے پریشان ہیں، لیکن اگر آپ کا بیٹا سینکڑوں ہزاروں میل دور ایک ملک میں نوکری کر رہا ہے، لیکن ٹیلی فون پر آپ کا اس سے رابطہ ہے، وہ روزانہ شام کو آپ سے بات کرتا ہے کہ میں خیریت سے ہوں، میری ڈیوٹی ٹھیک ہو رہی ہے تو کوئی آپ سے پوچھے تو آپ کہیں گے: الحمدللہ! ٹھیک ہے، میری روزانہ ان سے بات ہوتی ہے، حالانکہ وہ اتنی دور ہے، لیکن آپ کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کے گھر میں ہے، کیونکہ اس کا روزانہ جو آپ سے کنٹیکٹ ہے اور آپ کے علم میں ہے کہ وہ فلاں جگہ پر ہے اور فلاں وقت پر نوکری کر رہا ہے۔

اور اگر وہ اسی شہر میں ہے کہ جس محلہ میں تم رہتے ہو، اس محلے کے دوسرے مکان میں بیٹا چھپ گیا، لیکن کسی کو بتا تا نہیں۔ اب باپ ڈھونڈ رہا ہے کہ پتہ نہیں، بیٹا کہاں گیا؟ تو جو چیز علم میں نہیں ہوتی وہ معلوم ہوتی ہے اور جو چیز علم میں ہو چاہے وہ کتنی دور ہو وہ نزدیک معلوم ہوتی ہے۔ اللہ کا علم ساری کائنات کو احاطہ میں لیے ہوئے ہے، یعنی کوئی چیونٹی، کوئی پتہ نہیں، مگر اللہ کے علم میں ہے۔ کوئی دنیا کے اندر تغیر و تبدل نہیں ہوتا، مگر اللہ کے حکم اور علم سے۔ اور کوئی ہماری حرکت اور سکون ایسی نہیں ہے کہ اللہ کے علم میں نہ ہو۔ ہم حرکت کرتے ہیں تو اس کے علم میں ہے، اٹھتے ہیں تو اس کے علم میں ہے، ہم نماز پڑھتے ہیں تو اس کے علم میں ہے اور عبادت کرتے ہیں تو اس کے علم میں ہے۔ اسی لیے ''عِلْمُہٗ مُحِیْطٌ'' کہ اللہ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تو جہاں آتا ہے کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے تو اس سے معیت علمی مراد ہوتی ہے۔ اور بعض مقام پر بطور خاص آتا ہے کہ میں اپنے عبد کے ساتھ ہوں، یا آتا ہے کہ میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔ ایک تو معیت عامہ ہے جو ساری مخلوق کو حاصل ہے اور جو اس کے پیارے بندوں کو حاصل ہوتی ہے وہ معیتِ نصرت ہے کہ اللہ کی مدد ان کے لیے آجاتی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿قَالَ كَلَّا ۚ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٦٢﴾﴾ [الشعراء: ۶۲]

''میرا رب میرے ساتھ ہے اور وہ مجھے راستہ دکھلائے گا۔''

اسی طرح حضور پاک ﷺ کو فرمایا گیا کہ آپ بھی اپنے ساتھی سیدنا ابی بکر سے فرما دیں:

﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ﴾ [التوبۃ: ۴۰]

''آپ غم نہ کرو، اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے۔''

تو اس کا معنی یہ نہیں کہ اللہ غار میں ہم دونوں کے ساتھ ہے۔ اسی لیے بعض جاہل بے چارے غلط فہمیوں کی بنا پر، جہالت کی بنا پر اور بلا وجہ غلو کی بنا پر ایک عادت ہو جاتی ہے تو پھر انسان ایسے ایسے غلط ترجمے کرتے ہیں کہ اسلام سے نکل کر کفر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہر مسلمان کو شرک سے محفوظ فرمائیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض علماء کے نزدیک آیت میں ''ثُمَّ'' سے خبر کا عطف خبر پر کیا گیا ہے، نہ کہ فعل کا عطف فعل پر، جیسے کسی شاعر نے کہا تھا:

قُلْ بِمَنْ سَادَ ثُمَّ سَادَ اَبُوْهُ
ثُمَّ قَدْ سَادَ قَبْلَ ذٰلِكَ جَدُّهُ

''جس نے سرداری کی پھر سرداری کی اس کے باپ نے پھر اس سے پہلے سرداری کی تھی اس کے دادا نے۔''

حالانکہ دادا پہلے تھا، پھر باپ تھا اور پھر یہ تھا تو اس لیے فرمایا: عطف خبر علی خبر ہے، فعل کا عطف فعل پر نہیں ہے کہ اللہ نے زمینوں کو پہلے پیدا فرمایا، بعد میں آسمانوں کو بنایا۔

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾﴾

وہی ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ساتھ آسمان کر دیے۔ اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

مخلوقات کی پیدائش کی ترتیب:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سدی نے ابی مالک اور ابی صالح رحمہما اللہ کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

سے اور حضرت مرہ ﷫ نے حضرت ابن مسعود ﷜ سے آیت مبارکہ کی یہ تفسیر بیان فرمائی کہ اللہ تبارک تعالیٰ کا عرش مبارک پانی پر تھا اور اس وقت کوئی چیز پیدا نہیں کی گئی تھی ماسوا پانی کے اور پانی پر ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کا عرش تھا۔ ''فَلَمَّا أَرَادَ أَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ'' جب اللہ نے ارادہ فرمایا کہ مخلوق کو پیدا فرماؤں تو پھر اس پانی سے دھواں اٹھا، جیسے دھواں اٹھتا ہے، پھر وہ دھواں اٹھتے اٹھتے گویا پانی کے اوپر ایک سطح بن گئی اور اس کے اوپر چھا گیا۔ اس لیے اس کا نام سماء ہوگیا، یعنی آسمان ہوگیا۔ پھر جو اس دریا کا پانی تھا اس کو خشک کر ڈالا تو اس سے زمین بن گئی۔ پھر اس زمین کو بھی حصے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے سات زمینیں بنائیں۔ اتوار اور سوموار کے دنوں میں اللہ نے زمینوں کو پیدا فرمایا۔ فرماتے ہیں: اور وہ زمین ایک مچھلی پر ہے اور یہ مچھلی وہ ہے جس کا ذکر قرآن مقدس میں بھی آیا ﴿نٓ وَالْقَلَمِ﴾ [القلم:۱] تو ''نون'' اور ''حوت'' مچھلی کو بھی کہتے ہیں۔ اس لیے بعض علماء نے یہ بھی تفسیر فرمائی ہے، تو گویا مچھلی پانی میں ہے اور اس کے اوپر زمین ہے اور پانی ایک چٹیل پتھر پر ہے اور وہ پتھر ایک فرشتے کی پشت پر ہے اور پھر وہ فرشتہ ایک بڑی چٹان پر ہے اور وہ چٹان ایک ہوا کے اندر ہے۔ اب جب حوت مچھلی نے حرکت کی تو اس سے اضطراب پیدا ہوا، جس سے زمین کے اندر بھونچال آیا اور اللہ نے اس زمین کو جمانے کے لیے پہاڑوں کو بوجھ کار کھا، پھر وہ زمین قرار پکڑ گئی۔ اور منگل اور بدھ کے دن زمین پر درخت، پہاڑ اور وہ چیزیں پیدا کیں جس سے انسان نفع حاصل کرتا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:

﴿وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ۝﴾

[حٰم سجدہ:۱۰]

پھر بنائے سات آسمان۔ دونوں جمعرات اور جمعہ میں بنائے۔ اور جمعہ کو جمعہ اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ جمعہ کے دن آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش جمع ہوگئی۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر آسمان میں ملائکہ کو پیدا کیا اور آسمانوں کو ستاروں وغیرہ سے زینت بخشی۔

دوسری آیت میں بھی ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴾ [الاعراف:۵۴]

اور جب اللہ تعالیٰ نے اس کام سے اپنی شان کے مطابق فراغت پائی تو جمعہ کے دن کی آخری گھڑی باقی تھی اسی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہی جمعہ کے دن کا آخری حصہ ہے جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کو بھی پیدا فرمائیں گے، لیکن وہ کون سا جمعہ ہوگا اس کا علم اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہے۔ یہ روایات مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کی ہیں، کیونکہ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے بہت پہلے پیدا کر دی تھیں۔ اس لیے ابن کثیر اور دیگر تمام محققین فرماتے ہیں کہ ان چیزوں پر اجمالی ایمان لانا کافی ہے کہ اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ حق و سچ اور عدل ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے چاہے وہ چیزیں ہماری سمجھ میں آسکیں یا نہ آسکیں۔

لیکن کئی روایات اگرچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں، لیکن وہ سنداً ثابت نہیں ہیں، اسرائیلیات میں سے ہیں۔ مفسرین ان کو نقل کر دیتے ہیں، مگر ان کی بنا پر کوئی عقیدہ بنا لینا درست نہیں ہے، جب تک ان کی حیثیت واضح نہ ہو جائے۔ کسی معتمد مفسر کا نقل کر دینا کافی نہیں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۸، البقرۃ: الآیۃ: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ]

کار اچھی کہ گھوڑی:

ایک بلوچ سردار تھا، خیال آیا، زندگی میں پہلی دفعہ کار لی۔ جب گاڑی لے کر آئے تو ان کے راستے کی سڑکیں تو کچی ہوتی تھیں، تو ایک چھوٹا سا پانی کا کھالہ تھا، ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ سردار صاحب نے کہا کہ گاڑی کیوں روک دی ہے؟ اس نے کہا: آگے کھالہ ہے اور کھالے کے اندر تو گاڑی نہیں جا سکتی۔ انہوں نے کہا: چلاؤ۔ اس نے کہا کہ حضرت! کیسے چلاؤں؟ اگر میں گاڑی چلاؤں گا، آپ تو نہیں جانتے، لیکن میں جانتا ہوں کہ کھالے میں گاڑی ٹوٹ جائے گی، نئی گاڑی ہے۔ اس نے کہا کہ ہم نے اتنے پیسے خرچ کیے ہیں، یہ تو گھوڑی سے بھی خراب ہے۔ اس نے کہا کہ ایسی گاڑی کا کیا فائدہ ہے جو کھالہ بھی عبور نہیں کر سکتی؟ تو اس نے کہا کہ لے جاؤ! ہماری اپنی گھوڑی ٹھیک ہے۔ اس کو تو اشارہ کرتے ہیں، وہ تو نہر کود جائے گی۔ دریا میں بھی ڈال دو تو چلی جائے گی، یہ کیسی کار ہے؟

ترتیب تخلیق کے متعلق حدیث:

((خَلَقَ اللّٰهُ التُّرْبَةَ یَوْمَ السَّبْتِ وَ خَلَقَ فِیْهَا الْجِبَالَ یَوْمَ الْاَحَدِ وَ خَلَقَ الشَّجَرَ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَ خَلَقَ الْمَكْرُوْهَ یَوْمَ الثُّلَاثَاءِ وَ خَلَقَ النُّوْرَ یَوْمَ الْاَرْبِعَاءِ وَ بَثَّ فِیْهَا الدَّوَابَّ یَوْمَ الْخَمِیْسِ وَ خَلَقَ آدَمَ علیہ السلام بَعْدَ الْعَصْرِ مِنْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ فِیْ آخِرِ الْخَلْقِ فِیْ اٰخِرِ سَاعَةٍ مِنْ سَاعَاتِ الْجُمُعَةِ فِیْمَا بَیْنَ الْعَصْرِ اِلٰی

اللَّيْلِ)) [صحیح مسلم، حدیث:۲۷۸۹]

"اللہ تعالیٰ نے زمین ہفتے والے دن پیدا فرمائی، اتوار والے دن پہاڑ، اللہ تبارک وتعالیٰ نے درخت سوموار کے دن پیدا فرمائے، جتنی مکروہ پیش آنے والی ہیں وہ منگل کے دن پیدا ہوئیں، اللہ پاک نے بدھ کے دن نور پیدا فرمایا، خمیس کے دن (جمعرات والے دن) پھر جانور پیدا فرمائے اور اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن عصر سے لے کر مغرب کے درمیان میں آخری گھڑی میں پیدا فرمایا۔"

مفسر فرماتے ہیں: امام مسلم نے یہ روایت نقل فرمائی ہے، یہ ان کے غرائب میں شمار کی جاتی ہے۔ اس روایت پر علی المدینی، امام بخاری اور بہت سارے حفاظ رحمہم اللہ نے کلام فرمایا کہ کیسے آپ نے یہ روایت نقل فرمائی؟ انہوں نے فرمایا: یہ دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تو نہیں، بلکہ یہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا قول معلوم ہوتا ہے۔ حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی شاید یہ سنا ہے حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے۔ کہتے ہیں کہ بعض راویوں کو شبہ لگا کہ بجائے اس کے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی بات کو جو انہوں نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، اس لیے اس روایت پر بڑا کلام کیا گیا اور مفسر نے جو پہلی روایت نقل کی ہے وہ زیادہ صحیح ہے" وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ عِلْمُهُ أَتَمُّ" اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح راستے پر قائم رکھے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۶۹، البقرۃ: الآیۃ: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ]

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسی مخلوق قائم کرتا ہے جو اس میں فساد کرے یا خون بہائے؟ اور ہم تیری خوبیاں بیان کرتے ہیں اور تیری پاک ذات کو یاد کرتے ہیں۔ فرمایا: بے شک مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔

آیات کا ربط:

نعمتیں دراصل دو قسم کی ہوتی ہیں:

1 ......ایک نعمتیں ظاہری وصوری ہوتی ہیں، جیسے کھانا پینا زمین اور اس کی تمام اجناس وغیرہ۔

2 ......اور ایک معنوی نعمتیں ہیں، جیسا کہ انسان کو علم حاصل ہونا، خوشی مسرت سکون کا حاصل ہونا اور زندگی خوش

اسلوبی سے گزارنا وغیرہ۔

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے صوری نعمتوں کا ذکر فرمایا اور ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے معنوی نعمتوں کا ذکر فرمایا کہ اگر تمہارا کوئی باپ ہی نہ ہوتا اور تمہیں کوئی تعلیم وتربیت نہ دی جاتی تو دنیا پیدا ہونے کے بعد معاملہ درہم برہم ہوجاتا۔ تو اس لیے انسانیت کی ابتداء یعنی آدم علیہ السلام کا واقعہ اور ان کو تعلیم دینے کا ذکر کیا جارہا ہے۔
[معارف القرآن:۱/۱۷۷]

اس آیت سے ایک مسئلہ یہ سمجھ آیا کہ ملائکہ انسان سے پہلے پیدا ہوئے، کیونکہ ابھی حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہی نہیں ہوئے اور اللہ تعالیٰ ملائکہ سے فرمارہے ہیں ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ تو بات سمجھ آئی کہ ملائکہ کی مخلوق انسان سے پہلے پیدا ہوئی ہے اور اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ جنات بھی انسان سے پہلے پیدا کیے گئے۔

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ [البقرة:۳۰]

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے یہ بات کی کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں تو اس کا ایک مقصد یہ تھا کہ اپنے بندوں کو تعلیم دی جائے کہ جب کوئی اہم کام کیا جائے تو اس کے لیے مشورہ ضروری ہے۔ تم اللہ کے اس امر سے سبق سیکھو کہ کبھی کوئی اہم کام کرنا ہو تو مشورے سے کرو۔

[تفسیر ابن کثیر:۱/۸۰، البقرة، الآية: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ]

حضور ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ [آل عمران:۱۵۹]

یہ امر بھی اس امت کو تعلیم دینے کے لیے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے ذکر کیا ہے، جنوں کے سامنے ذکر نہیں کیا، اس سے یہ اصول معلوم ہوا کہ مشورہ ان سے کرنا چاہیے جن میں مشورہ دینے کی صلاحیت وقابلیت ہو، ہر شخص سے مشورہ نہیں کرنا چاہیے۔ نیز اگر شرعی احکام میں مشورہ کرنا پڑے تو ان کے طریقۂ تنفیذ میں تو مشورے دے سکتا ہے، لیکن اللہ کے قانون کو تبدیل کرنے میں کوئی مشورہ نہیں دے سکتا، امت کو تعلیم دی جائے۔ اسی لیے اللہ نے قرآن میں فرمایا:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ [الشوریٰ:۳۸]

مسلمانوں کے معاملات مشورے سے طے ہوتے ہیں، مشورے کے بعد فیصلہ ہوتا ہے۔ اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد خلافت کا جو معاملہ ہے مشورہ ہے۔ جو مشورہ ہو جائے اور اربابِ حل وعقد کی رائے ہو جائے اس کے مطابق فیصلہ کرنا۔

اسی لیے ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ ایک دفعہ میرے آقا ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ تیرے باپ کو بلا کر یہ بتا دوں کہ میرے بعد خلیفہ ہوں گے، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ اللہ بھی ابوبکر کے بغیر کسی کو نہیں چاہتے اور رسول ﷺ بھی ابوبکر کے بغیر کسی کو نہیں چاہتے۔ اس لیے فرمایا: کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، کیونکہ یہ ایسا معاملہ ہے کہ میرے اللہ کو بھی یہی پسند ہے اور مومنین کو بھی یہی پسند ہے۔ مومنین کے دلوں میں ابوبکر کا انکار آ ہی نہیں سکتا۔ تو اس لیے حضور پاک ﷺ نے چھوڑ دیا۔

[صحیح مسلم، حدیث: ۲۳۸۷، باب: مِنْ فَضَائِلِ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رضی اللہ عنہ]

مسائلِ شریعت مشورے سے طے نہیں ہو سکتے، ان کی تنفیذ ہو سکتی ہے:

متعلقہ جمہوریت اور یہ بھی یاد رکھیں کہ آج کل جو مغربی دنیا نے آپ کے ہاں جو ڈیموکریسی ہے، جمہوریت جس کو کہتے ہیں، وہ انہوں نے اللہ کے اس قرآن سے اور شوریٰ کے اس پیغام سے نظریہ لیا ہے کہ جب خدا نے نظام مشاورت پر رکھا ہے، اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ ہم اسمبلی بناتے ہیں، پارلیمنٹ بناتے ہیں اور مشورہ ہوتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ انہوں نے میٹھا میٹھا تو ہپ کیا ہے اور سارے قرآن کو نہیں مانا تو اس لیے ان کا نظام تباہی سے دو چار ہو گیا ہے۔ اگر وہ اللہ کے قرآن کو پورے کا پورا مان لیتے تو پوری دنیا میں امن قائم ہو جاتا۔ اللہ کے نظام میں اور ان کے نظام میں فرق کیا ہے؟ بنیادی بات یاد رکھ لیں! انگریزی نظام میں...... چاہے وہ پارلیمانی ہو یا صدارتی نظام ہو...... اس کے اندر اور اسلام کے اندر ایک فرق ہے۔ کافرانہ نظام یہ کہتا ہے کہ جب ہم نے لوگوں کے ووٹ سے اور مشورے سے پارلیمان چن لی تو اب پارلیمنٹ کی اکثریت جو فیصلہ کر دے وہ قانون نافذ ہوگا اور واجب العمل ہوگا۔ اور اسلام یہ کہتا ہے کہ مشورہ تو تم کر سکتے ہو، لیکن اللہ کے حکم میں تبدیلی نہیں کر سکتے، حکم اللہ کا چلے گا:

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ﴾ [یوسف:]

﴿لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ﴾ [البقرة:۱۰۷]

فرمایا:

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الاعراف: ۵۴]

یہاں اسلام میں مسئلہ کیا ہے کہ حکم اللہ کا ہوگا، اس کے حکم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اب نافذ کرنے کے طریقوں میں مشورہ ہوسکتا ہے کہ اس قانون کو ہم کیسے چلائیں؟ اس مسئلے کو ہم کیسے لاگو کریں؟ اس کا ہم انتظام کیسے کریں؟ اس کا ہم ثبوت کیسے مہیا کریں؟ لیکن اللہ کے قانون میں تبدیلی نہ ہو، وہاں تو بندوں کا قانون بنایا ہوا، بندوں کا چنا ہوا ہے کہ بندوں کے لیے ہے اور یہاں حکم اللہ کا ہے اور بندہ نائب ہے، اس کے حکم کو تنفیذ کرنے والا ہے، اس کے حکم کو توڑنے کا کوئی اختیار نہیں۔ انگریزی قوانین جمہوری شورائی ہیں، اب کافرانہ نظام میں اگر ان کی پارلیمنٹ ایک فیصلہ کر دیتی ہے، جیسے بعض یورپ کے ملکوں میں فیصلے ہو چکے ہیں کہ لڑکوں نے مطالبہ کیا کہ...... نعوذ باللہ...... ہمیں بدفعلی کرانے کی اجازت دی جائے، انہوں نے کہا: عورتیں اگر فحاشی کرتی ہیں، بے حیائی کرتی ہیں...... یہ حقیقت ہے کہ اس کا ذریعہ اللہ نے لوگوں کو بنا دیا ہے۔ ایک عورت سینکڑوں دوستوں سے تعلقات رکھتی ہے اور وہ سب کی گرل فرینڈ بن کر رہتی ہے...... تو ہمیں بھی اجازت دیں ہم بھی بدفعلی کرائیں۔ جب پورے ملک میں شور اٹھا تو ان کو قانون میں اجازت دینی پڑی کہ ٹھیک ہے، جاؤ جو مرضی آئے کرو۔ کیونکہ ان کی اکثریت ایک بات پر آگئی۔ یہ تو علیحدہ بات ہے کہ اس کے نتائج خراب نکلنے پر وہ پھر چیخ اٹھے، لیکن اس کو روک نہیں سکے، اس لیے کہ وہ بندوں کا قانون تھا۔ بندوں کی اکثریت جو مطالبہ کرتی ہے۔ اسی طریقہ سے انہوں نے ایک دفعہ یہ بھی قانون بنایا کہ طلاق کا معاملہ مرد کے ہاتھ میں دیا گیا کہ مرد چاہے طلاق دے دے، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، عورت کو طلاق کا حق دے دیا جائے۔ تو اب چونکہ ان کے قانون کا تقاضا یہ ہے کہ جو اکثریت کہہ دے، لیکن اسلام یہ اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کہتا ہے ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ﴾ [یوسف: ۴۰] حکم اللہ کا نافذ ہوگا۔ یہ زمین بھی اللہ کی ہے اور آسمان بھی اللہ کا ہے ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ﴾ یہ مخلوق بھی اللہ کی ہے اور حکم بھی اللہ کا چلے گا ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الاعراف: ۵۴] ساری کائنات کے بندے اکٹھے ہو کر اللہ کے نظام کو نہیں توڑ سکتے۔

اس لیے حضور ﷺ نے ایک دفعہ قسم کھالی کہ آئندہ شہد نہیں پیوں گا تو اللہ نے فوراً قرآن نازل کر دیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [التحریم: ۱]

اے میرے نبی! آپ نے کیسے اللہ کے حلال کو حرام کر دیا ہے؟ محض اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میرے قانون کو بدل رہے ہو۔ ایک چیز میں نے آپ کے لیے حلال کر دی ہے، اس کو حرام کوئی نہیں کر سکتا۔ جس کو میں نے حرام کر دیا اس کو حلال کوئی نہیں کر سکتا۔ حالانکہ حضور ﷺ نے امت پر حرام نہیں کی، یعنی حضور ﷺ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ شہد امت کے لیے حرام ہے۔ حضور ﷺ نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ آئندہ میں شہد نہیں پیوں گا، آئندہ اپنی باندی ماریہ قبطیہ کو نہیں بلاؤں گا۔ جب اللہ نے حلال کیا تو تو نہ بلانے کا کیا مطلب ہے؟ اگر ایک بیوی ناراض ہوتی ہے ہوتی رہے، جب اللہ نے چار بیویاں حلال کی ہیں تو لازمی بات ہے کہ پہلی بیوی تو دوسری بیوی سے کبھی خوش نہیں ہوگی، تیسری بیوی کبھی دوسری بیوی سے خوش نہیں ہو سکتی، اگر خوش نہیں ہو سکتی تو نہ ہو۔ جو چیز اللہ نے حلال کی ہے اسے کوئی حرام نہیں کر سکتا اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے کوئی حلال نہیں کر سکتا۔ تو انسانوں کے قانون میں اور اللہ کے نظام میں یہ فرق ہے۔

اسی طرح دوسری بات یہ سمجھیں! اسلام جہاں مشورے کا حکم دیتا ہے اب دیکھیں کہ اللہ نے خلیفہ بنانا چاہا، اس کا معاملہ فرشتوں کے آگے رکھا:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ [البقرۃ:۳۰]

تیرے رب نے ملائکہ سے فرمایا، حالانکہ جن بھی تو موجود تھے۔ اگر ہر کسی سے ووٹ لینا ہوتا تو پھر فرشتوں کو جیسے بتایا تھا کہ میں نے خلیفہ بنانا ہے تو جنوں کو بھی بتاتے کہ میں نے خلیفہ بنانا ہے۔ تو جیسے فرشتوں کے اعتراض سنے تھے ویسے جنوں کے بھی اعتراض سنتے، کیونکہ اعلیٰ مخلوق اللہ کے ملائکہ تھے تو اس لیے اسلام یہ بھی سکھاتا ہے کہ مشورہ کرنے کے لیے مشورہ کس سے لیا جائے؟

اب تفسیر ابن کثیر کا ایک مسئلہ مجھے سمجھ نہ آئے تو میں پوچھنے کے لیے کہاں جاؤں؟ ہوٹل پر جاؤں، ہوٹل کے مینجر کے پاس جا کر کہوں کہ اتنے بڑے ہوٹل کو چلا رہے ہو، مجھے تفسیر ابن کثیر سمجھا دو۔ وہ کہے گا: مولوی صاحب! آپ پاگل تو نہیں ہو گئے؟ ٹھیک ہے میں نے ہوٹل کے معاملہ میں ماسٹر ڈگری کی ہوئی ہے، مجھے بڑے بڑے ہوٹلز کا تجربہ ہے، لیکن عجیب بات ہے! آپ مجھ سے تفسیر ابن کثیر کے بارے میں پوچھنے آگئے؟ میں کہوں کہ تمہیں تو نہیں آتا۔

اس کے بعد میں فوری طور پر ایک وکیل کے پاس چلا جاؤں، اس سے کہوں کہ آپ...... ماشاء اللہ...... بڑے

بار ایٹ لاء ہیں، آپ نے ایل ایل بی کیا ہوا ہے، آپ نے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ وہ کہے گا: میں نے تو برٹش لاء پڑھا ہے، مجھے کیا پتہ ابن کثیر کیا کہتی ہے؟

ایک جاہل ہے، ایک عالم ہے۔ دونوں میں سے جس کو پسند کرتے ہو ووٹ دے دو، دونوں برابر ہیں۔ اور ادھر کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کو اسلام نے برابر کر دیا، تم نے سب کو برابر کر دیا، تم نے تو سارے جہان کو برابر کر دیا، تم نے مرد اور عورت کا ووٹ اور جاہل اور عالم کا ووٹ برابر رکھا ہے۔ اور ایک عورت بے چاری اس نے پی ایچ ڈی کی، ڈگریاں لی ہوئی ہیں اور ایک جاہل ہے، اس کو بھی تم نے برابر رکھا ہوا ہے۔ اور ایک فاسق فاجر ڈاکو ہے اور ایک جج ہے، دونوں ووٹ ڈالیں گے، ووٹ برابر ہے۔ اس کی بھی ایک پرچی گنی جائے گی اور اس کی بھی ایک پرچی گنی جائے گی۔

تو اس لیے کسی شاعر نے بڑا اچھا فرق کیا تھا! اس نے کہا کہ اسلام میں انسانوں کو تولا جاتا ہے اور کفر کے نظام میں گنا جاتا ہے۔ اب چاہے نو عالم کھڑے ہیں اور ادھر دس جاہل کھڑے ہیں، جاہلوں والا جیت گیا ہے اور عالموں والا ہار گیا ہے۔ اس لیے کہ عالم نو بنتے ہیں اور جاہل دس بنتے ہیں۔ اسلام گنتا نہیں ہے، بلکہ اسلام وزن دیکھتا ہے ﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [الاعراف: ۸] ایک آدمی متقی پرہیزگار اور درجہ صحابیت کو پہنچا ہے تو اسلام کہتا ہے: جس آدمی نے خود میرے مدنی ﷺ کے ہاتھ میں ہاتھ رکھ کر اسلام سیکھا ہے، اس کے مقابلہ پر تم ساری دنیا کے بندے لے آؤ اس ایک کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اس لیے کہ اس نے براہِ راست حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے دین سیکھا ہے۔

اسی لیے دیکھیں کہ میرے آقا سرکارِ مدینہ ﷺ کا جب کوئی مشورہ ہوتا تو پوچھتے کہ ابوبکر! تمہاری رائے کیا ہے؟ عمر! تمہاری رائے کیا ہے؟ عثمان! تمہاری رائے کیا ہے؟ علی! تمہاری رائے کیا ہے؟ حدیثیں یاد کرانی ہوتیں تو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کام لیتے، تقویٰ زہد کا کام ہوتا تو ابوذر رضی اللہ عنہ سے کام لیا جاتا، تلوار کا معاملہ ہوتا تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بلایا جاتا اور اگر رائے دین کے اہم معاملے ہوتے تو پھر خلفائے راشدین کو بلایا جاتا کہ جو آدمی جس منصب کے لائق ہے اس سے پوچھو۔

اور یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں بے چینیاں ہی بے چینیاں ہیں، کیونکہ جب ہم غلط آدمی سے مشورہ لیں گے، جو مشورہ دے سکتا ہی نہیں ہے۔ ایک آدمی نے کبھی زراعت زمینداری کا کام ہی نہیں کیا، اس سے آپ مشورہ لیں

کہ آج جولائی کی فلاں تاریخ ہوگئی ہے تو میں گندم کاشت کروں یا نہ کروں؟ اس بے چارے کو کیا پتہ کہ گندم کاشت کب ہوتی ہے؟ گندم تو اس موسم میں کٹ جاتی ہے، اس کا تو موسم بھی گزر جاتا ہے۔ اس کو کیا پتہ کہ یہ کپاس کی کاشت کا زمانہ ہے، اب تو ان فصلات کا زمانہ ہے اور وہ بھی اب لیٹ ہو رہے ہیں، کیونکہ بارشیں آ رہی ہیں۔ جب بارشیں آئیں گی تو آپ کی کاشت متاثر ہوگی۔ اس لیے آپ اس آدمی سے مشورہ لیں گے جو زرعی امور کا ماہر ہو۔ ایک آدمی بیمار ہے، جیسے میرے پاس ایک آدمی آیا، اس نے کہا کہ آپ کو خواب کی تعبیر آتی ہے؟ میں نے جان چھڑائی کہ مجھے نہیں آتی، میں نے کہا: یہ جان چھوڑے، یہ ابھی خواب سنانے شروع کر دے گا۔

مجھے طلباء کی دعا اور درس کی برکت سے دو رکعت کا جو موقع ملتا ہے وہ بھی نہیں ملے گا۔ یہ حقیقت ہے، اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے، یہ سارا آپ لوگوں کی برکت کی وجہ سے نصیب ہو جاتا ہے۔ جمعرات کو دیکھیں! درس نہیں ہوتا تو ہم دعوتیں اڑانے کے لیے گئے ہوتے ہیں۔ کبھی اس دوست کی دعوت ہے اور اس دوست کی پارٹی ہے۔ حرم کی نماز نصیب نہیں ہوتی۔ یہ تو ساری حقیقت میں آپ لوگوں کی دعائیں ہیں، مجھے خوشامد کی ......الحمد للہ...... عادت نہیں ہے۔ حقیقت ہے کہ اس کا ذریعہ اللہ نے آپ لوگوں کو بنا دیا ہے۔ ایک درس اور علم کا ذریعہ، کتاب پڑھنے کا ذریعہ، پھر طواف کا ذریعہ، سب آپ حضرات کی برکت ہے، ورنہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔

بہر حال میں نے ان سے کہا کہ مجھے اتنا پتہ تو نہیں لگتا۔ اس نے کہا کہ نہیں جی، کچھ نہ کچھ تو پتہ لگتا ہوگا۔ اس نے جناب ایک خواب سنا دیا۔ مجھے جو آتا تھا میں نے بتا دیا۔ اس نے ایک اور سنا دیا۔ میں نے کہا: کتنے خواب دیکھتے ہو؟ اس نے کہا: مجھے تو روز خواب نظر آتے ہیں۔ میں نے کہا: کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤ، معدے کا علاج کراؤ، تمہارا معدہ خراب ہے، کیونکہ جب آدمی کا معدہ خراب ہو تو تبخیر دماغ پر چڑھتی ہے۔ جو کچھ تو رات کو دیکھتا ہے یہ خواب نہیں ہے۔ تم جا کر اپنا علاج کراؤ۔ اس نے کہا کہ اچھا پھر آپ معدے کا علاج بھی بتا دیں! میں نے کہا کہ اللہ کے بندے! میں ڈاکٹر نہیں ہوں، کسی ڈاکٹر کے پاس، کسی طبیب کے پاس جائیں۔ مجھے کیا پتہ کہ معدے کا علاج کیا ہوتا ہے؟

تو اس لیے یاد رکھیں کہ اسلام کہتا ہے کہ شوریٰ ہو، لیکن مشورہ اس سے لیا جائے جو مشورہ کا اہل ہو۔ صحت کا معاملہ ہے تو ڈاکٹر بتلائے گا، علم کا معاملہ ہے تو عالم بتائے گا، کوئی ٹیکنیکل مسئلہ ہے تو انجینئر بتلائے گا ''لِكُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ'' اللہ نے ہر فن کے لیے انسان پیدا کیے ہیں، وہ اپنے ان علوم کو ماہرانہ طریقہ سے جانتے ہیں۔ تو ان سے

رائے لی جائے گی۔

اس لیے اللہ نے جنات کے آگے یہ مسئلہ نہیں رکھا، اللہ نے ملائکہ کے آگے مسئلہ رکھا۔ یہ خلافة فی الارض کا مسئلہ ہے، جن کیا بتلائیں گے؟ ان کی طبیعتوں میں سرکشی ہی سرکشی ہے اور فساد ہی فساد ہے، وہ آگ والی شورش ہے، بھڑکنا ہے، جلنا ہے، مرنا ہے، انہوں نے کیا مشورہ دینا ہے؟ البتہ یہ لوگ (فرشتے) تسبیح والے ہیں، تقدیس والے ہیں، یہ اللہ کی عبادت والے ہیں، اطاعت والے ہیں، فرمانبرداری والے ہیں، ان کے آگے معاملہ رکھا جائے۔ اللہ نے اپنے بندوں کو تعلیم دی ہے، وگرنہ اللہ تعالیٰ کو مشورے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اللہ علام الغیوب ہیں ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ [ھود: ۱۰۷] ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُونَ﴾ [الانبیاء: ۲۳] اس کی تو شان ہی یہی ہے کہ وہ جو چاہے کردے، اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ ساری مخلوق سے وہ پوچھ سکتا ہے، لیکن اللہ کی ذات سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اسی لیے اس کی صفت آئی ﴿اللَّهُ الصَّمَدُ﴾ [الاخلاص: ۲] اللہ وہ جس کا اپنا کام اٹکے ناں اور دوسرے کا کام جس کے بن ہو نہ سکے، وہ ذات پاک ہے، لیکن اللہ نے اپنے بندوں کو تعلیم دی کہ فرشتوں کے آگے معاملہ رکھا۔

حضور پاک ﷺ نے بھی مشورے کی تعلیم دی کہ جب کوئی معاملہ ہو تو مشورہ کرو۔ اللہ نے بھی اپنے پیغمبر کو حکم دیا:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ [آل عمران: ۱۵۹]

تم مشورہ کرلو اور پھر اس کے بعد جب تم ارادہ باندھ لو تو پھر اپنے اللہ پر توکل کرو اور اس عمل کو نافذ کردو۔ حضور ﷺ بھی مشاورت فرماتے رہے اور اسی طرح میرے آقا ﷺ نے فرمایا: جس رائے پر ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما اکٹھے ہو جائیں، یعنی جس رائے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے مل جائے، پھر مجھے سوچنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ اللہ نے ان دونوں کو اتنی صائب رائے دی ہے۔ تو جب ان کی رائے مل جاتی ہے تو اللہ کی بھی وہی رائے ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ کے حکم کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب خلافت کا معاملہ سنبھالا، جو مشورے سے طے کیا گیا اور پھر جب خلیفہ بن گئے تو چونکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی جانا تھا، اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اللہ کے نبی نے تمہیں پرچم پکڑایا ہے اور تمہیں حکم دیا تھا کہ یہ بڑے بڑے صحابہ تیرے ساتھ جائیں گے۔ اگر تم اجازت دو تو

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ جاؤ۔ مجھے ان کے مشوروں کی ضرورت ہوگی۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنا ہر کام مشورہ سے کام کرتے تھے، جیسے ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا تو آپ نے فرمایا: آج علی نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ [أضواء علی الصحیحین: ١/١٨٠]

دیکھیں! کتنی عظمت والی بات ہے! لیکن افسوس یہ ہے کہ روافض حضرات کو سمجھ نہ آئی، انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا کہ دیکھو! خلافت کے حقدار تو حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ نہیں تھا، غلط فتویٰ دے رہے تھے، خود فرمار ہے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا۔ یہ تو دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے مستحق تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہیں تھے۔ انہوں نے یہ نہ سوچا کہ خلیفہ ہونے کے بعد ایک مسئلے کا علم نہ ہونا یہ کوئی بڑی بات تو نہیں ہوتی۔

اصل مسئلہ کیا تھا کہ ایک عورت پیش ہوئی، اس نے اعتراف زنا کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دے دیا۔ خدا کی قدرت یہ ہے کہ عورت نے بھی قبول کر لیا۔ جب اس عورت کو لے کر جانے لگے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آرہے تھے، آپ نے پوچھا: کیوں عورت کو پکڑ کر لے جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رجم کا فیصلہ فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا: ٹھہرو! وہ وہیں رک گئے۔ آپ آئے اور کہا: اے امیر المؤمنین! آپ نے فیصلہ تو فرما دیا، جو بالکل شریعت کے مطابق ہے، لیکن آپ نے یہ تحقیق کر لی ہے کہ یہ عورت حاملہ تو نہیں ہے؟...... اب فطری بات ہے دو چار مہینے کا حمل تو نظر نہیں آتا، قاضی کے سامنے چاہے عورت کھڑی بھی ہو۔ ہاں! آٹھ نو مہینے کا حمل تو ظاہر ہو جاتا ہے...... تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تحقیق نہیں کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تحقیق تو کریں، اگر عورت حاملہ ہو اور جو بچہ پیٹ میں ہے وہ رجم میں مارا جائے تو اس بچے کا کیا قصور ہے؟ جرم تو اس عورت نے کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس عورت کو واپس بلاؤ۔ جب آئی تو پوچھا۔ اس نے کہا: مجھے حمل ہے۔ آپ نے روک دیا کہ جب تک وضع حمل نہ ہو رجم نہ کیا جائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا: اے علی! اگر آج تم نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا اور ایک بچہ بلا وجہ میرے حکم سے مارا جاتا۔

یہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کتنا بڑا مقام ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے پر فوراً عمل کیا، اپنے فیصلے کو بدل ڈالا۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ یہ تو خلافتِ عمر رضی اللہ عنہ کی دلیل ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ناحق ہوتے تو جوان کے کہنے سے اپنا فیصلہ بدل

دیتے ہیں، ان کے ہوتے ہوئے خلیفہ کب بنتے؟ اور اگر اسی فیصلہ سے خلافت نکلتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں سے کہتے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو فیصلے کا علم نہیں، تم نے ان کو خلیفہ بنا دیا، مجھے بناؤ۔ حضرت علی نے بھی مطالبہ نہیں کیا، چودہ سو سال بعد ان کو یاد آ گیا۔ یہی تو کمال ہے کہ خلافت کی کرسی موجود ہے، لیکن فیصلہ لے رہے ہیں۔

اسی طرح ایک عورت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پکڑ کر لایا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا: اس عورت نے زنا کیا ہے۔ اس عورت نے بھی اقرار کر لیا۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جاؤ! اس عورت پر حد جاری کر دو، اقرار ہو گیا اور اعتراف ہو گیا ہے۔ صحابہ پکڑ کر لے جا رہے تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو فرمایا: کیوں پکڑ کر لے جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ اس پر حد جاری ہو گئی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ٹھہرو! اس کو کچھ نہ کہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ آپ نے اس عورت پر حد جاری کر دی ہے، آپ کو پتہ نہیں ہے یہ تو فلاں قبیلہ کی عورت ہے، یہ تو پاگل ہے، مجنونہ ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے کہ تین آدمیوں سے اللہ کا قلم اٹھ گیا ہے: اگر آدمی نیند میں ہے اس پر کچھ جرم نہیں ہے، اگر آدمی نابالغ ہے اس پر بھی جرم نہیں لگے گا اور اگر آدمی دیوانہ ہے تو اس پر بھی جرم نہیں لگے گا۔ یہ فلاں قبیلہ کی عورت ہے، میں جانتا ہوں یہ پاگل ہے۔ کبھی کبھی اس کا دماغ ٹھیک ہو جاتا ہے، لیکن اکثر یہ پاگل رہتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ نہیں تھا، آپ نے فوراً مشورہ قبول فرما لیا۔ اس قبیلے کے لوگوں کو بلایا، ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس عورت کو دورے پڑتے ہیں، اکثر یہ پاگل رہتی ہے، کبھی کچھ کہتی ہے اور کبھی کچھ کہتی ہے۔ پتہ نہیں آج اس کے دماغ میں کیا آ گیا ہے اور اس نے کہہ دیا، وگرنہ یہ پاگل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو، یہ پاگل ہے۔ [فیض القدیر: ۱۵/ ۳۷۲]

تو مشورہ لینا اور اس پر عمل کرنا چاہیے، لیکن مشورہ اس سے لیا جائے جو مشورہ دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو اور جو مشورہ دینے کے قابل بھی ہو۔ ہر آدمی کا مشورہ قابل قبول نہیں ہوتا، ہر آدمی زید، عمر اور بکر جو آ کر کہہ دے ٹھیک ہے۔

اور یاد رکھیں! مشورے کے بعد بھی اللہ کے قانون کو نہ توڑا جائے۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سزا دی تو قانون کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا۔ تو قانون کے مطابق بس تحقیق میں فرق تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً نافذ کر دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم کے اندر تھا کہ یہ عورت پاگل ہے۔ اب کوئی کہے کہ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ نہیں تھا، اس طرح تو...... نعوذ باللہ...... نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی علم نہیں تھا، تو نبی کیسے بن گئے؟ جیسا کہ آگے واقعہ آ رہا ہے۔

دورِ نبوی میں ایک عورت کے ساتھ واقعہ اور آپ ﷺ کا فیصلہ:

جیسے ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک عورت مدینہ کی گلیوں میں سے صبح کی نماز کے لیے نکلی تو ایک آدمی نے زبردستی پکڑ کر زنا کر لیا۔ حضور ﷺ کے زمانے میں تو وہ آدمی زنا کر کے بھاگ گیا۔ عورت اٹھی، اس نے کپڑے وغیرہ ٹھیک کیے۔ ایک آدمی سامنے نظر آیا، اس نے سمجھا یہی ہے۔ اس نے اس آدمی کو پکڑ لیا کہ تم نے میرے ساتھ زنا کیا ہے۔ اس نے کہا: خدا کی بندی! میں نے کچھ نہیں کیا، لیکن عورت کہے کہ تم نے زنا کیا۔ اتنے میں لوگ اکٹھے ہو گئے...... اس زمانہ میں مدینہ کی آبادی زیادہ نہ تھی، ایک آدمی گزرا تو آدھے گھنٹے کے بعد دوسرا گزرا...... تو اب لوگ اکٹھے، شور ہو گیا۔ اس آدمی کو پکڑ کر لے آئے، حضور ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش ہو گیا۔ حضور ﷺ نے عورت سے پوچھا تو اس نے کہا کہ اس نے میرے ساتھ زنا کیا ہے۔ ان صحابہ سے پوچھا، انہوں نے کہا کہ ہم نے موقعہ پر آکر دیکھا ہے کہ یہ عورت تھی اور یہ مرد تھا۔ اس کو عورت نے پکڑا ہوا تھا اور یہ شور کر رہی تھی۔ جس کو عورت نے پکڑا وہ بے چارا اتنا شریف آدمی تھا کہ الزام لگنے کے بعد اس پر ایسا سکتہ طاری ہوا کہ وہ بول ہی نہ سکے...... اگر ایک بدمعاش پر تہمت لگے تو وہ کہے گا: چار اور لگا دو، کیا فرق پڑے گا؟ اور ایک شریف آدمی پر تہمت لگے تو وہ بالکل بے ہوش ہو جاتا ہے، اس کا تو زندگی کا کیریئر ہی ختم ہو گیا کہ میں نے کبھی گناہ نہیں کیا، لوگ مجھے کیا کہیں گے؟ مدینۃ الرسول میں اور حضور ﷺ کے زمانہ میں ایک عورت سے جبراً اور ظلماً زنا کیا...... وہ بے چارا گنگ اور چپ تھا۔ سارے گواہ اس کے خلاف گزر گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: حد جاری کرو۔ اب حد مارنے کے لیے جب اس کو پکڑ کر لے جانے لگے تو ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا، اس نے کہا: حضور! گناہ میں نے کیا ہے اور یہ بے گناہ ہے۔ اصل مجرم میں ہوں۔ ایک تو میں نے گناہ کیا اور دوسرا میری وجہ سے ایک بے گناہ مارا جائے تو میں اللہ سے ڈر گیا ہوں، اصل مجرم میں ہوں، یہ غریب تو وہاں تھا ہی نہیں۔ جب میں بھاگ رہا تھا تو یہ اس وقت آ رہا تھا۔ اس نے اعتراف کر لیا تو اب معاملہ بدل گیا تو حضور ﷺ کو علم نہیں تھا تو...... نعوذ باللہ...... کیا نبوت ختم ہو گئی؟

ایسے ہی اگر تم فیصلے کرنے شروع کر دو گے پھر تو اللہ کے نبیوں پر اثر آ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے! حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے تو کیا حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت ختم ہے؟ کیا یونس کی رسالت بھی ختم؟ تو یہ ایسے مسائل نہیں ہوتے۔

بہر حال مشورے کا کتنا بڑا فائدہ ہے!! قانون اللہ کا رہے گا۔ یہی دنیا کی پارلیمنٹ میں اور اسلام کے حکم میں

فرق ہے۔ یہاں پارلیمنٹ کی اکثریت قانون بناتی ہے اور توڑتی ہے۔ یہاں کوئی اللہ کے قانون کو توڑ نہیں سکتا، نبی اور خلیفہ تو اللہ کا نائب ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق کام کو چلاتا رہے۔ اپنی طرف سے وہ کوئی ایسا قانون بنائے جو مالک کے خلاف نہ ہو، بلکہ ایسے معاملات جن کا قرآن وسنت میں کوئی واضح حکم نہ ہو تو قرآن وسنت کے دوسرے مسائل کی روشنی میں وہ اجتہاد کر کے قیاس کریں گے۔ اصل حکم تو نہیں ہے، لیکن اس سے ملتا جلتا ہے۔

جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ شرابی کے لیے کتنی حد ہونی چاہیے؟ حضرت علی نے فرمایا: میرے خیال میں اسی (۸۰) کوڑے مارے جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اے علی! اسی (۸۰) کوڑے مارنے کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے کہا: دیکھیں کہ جو آدمی کسی بندے پر ناحق تہمت لگائے تو قرآن نے اس کے لیے اسی (۸۰) کوڑے رکھے ہیں تو جو شراب پیے گا، نشہ ہو گیا۔ جب نشہ ہو گا تو بکواس کرے گا۔ جب بکواس کرے گا تو کبھی کسی کو کچھ کہے گا اور کسی کو کچھ کہے گا تو اس کی حد اس سے ملتی جلتی ہونی چاہیے جو ناحق الزام لگانے والے کی حد ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ٹھیک ہے تمہاری دلیل۔ شراب پینے کی سزا کا حکم بھی اسی طرح ہو گا۔

[مشکاۃ المصابیح، حدیث: ۳۶۲۴، باب: حَدِّ الخَمرِ]

خلیفة اللهِ فِی الأَرضِ:

اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے سامنے یہ ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں تو ملائکہ نے عرض کیا: اے پروردگارِ عالم! آپ ایک ایسی مخلوق کو نیابت اور خلافت کی خلعت سے سرفراز فرمانا چاہتے ہیں جو زمین میں فساد کریں گے اور خون ریزی کریں گے۔ اس مخلوق کے مقابلہ پر ہم ہر وقت تیری پاکی بولتے ہیں، تیری تحمید کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ تو یہ ایک طریقے سے گزارش بھی تھی کہ ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنِّيٓ أَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُونَ ۝٣٠﴾ [البقرۃ: ۳۰]

”تحقیق میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“

خلافت کا معنی یہاں نیابت ہے، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے احکام کے لیے اپنا نائب مقرر فرمانا چاہتے ہیں۔ دوسرا معنی ہے بعد میں آنے والا، جو کسی کے بعد آئے وہ خلیفہ ہوتا ہے، مثلاً: باپ چلا گیا اور بیٹا آ گیا تو بیٹا گویا

کہ باپ کا خلیفہ ہے۔ جیسے قرآن مقدس میں یہ لفظ اس معنی میں بھی موجود ہے، فرمایا:

﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَٱتَّبَعُواْ ٱلشَّهَوَٰتِۖ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا﴾ [مریم: ۵۹]

تو خلیفہ کا معنی کسی کے جانے کے بعد آکر اس چیز کو سنبھالنا۔

خلفائے راشدین:

جیسے کہ خلفائے راشدین کہ سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی وفات کے بعد مسند خلافت پر آگئے، اس لیے ان کا لقب خلیفہ ہے۔ اسی لیے علماء نے فرمایا کہ دراصل اللہ کے نبی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ حقیقی جو ہے اور خلیفہ بلافصل جو ہے اور جس پر صحیح معنی میں لفظ ''خلیفہ'' کا انطباق ہوتا ہے وہ سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اسی لیے جب سیدنا امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو ''خلیفہ'' کے لفظ کے ساتھ لکھا گیا تو آپ نے منع فرمادیا کہ مجھے ''خلیفہ'' نہ لکھو۔ آپ نے فرمایا: مجھے زیادہ سے زیادہ ''امیر المؤمنین'' لکھ دو، کیونکہ اگر آپ مجھے ''خلیفہ'' کہتے ہیں تو میں ابی بکر رضی اللہ عنہ کا خلیفہ ہوں تو میرے نام کے ساتھ یہ لکھنا پڑے گا ''خَلِيفَةُ خَلِيفَةِ رَسُولِ اللهِ'' اور جو میرے بعد آئے گا وہ میرا خلیفہ ہوگا۔ تو اصل خلیفہ تو سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آئے۔

[جامع الاحادیث للسیوطی، حدیث: ۳۰۸۷۳، مسند عمر بن الخطاب]

خلیفہ کا اصل معنی ومطلب:

اب اللہ تعالیٰ تو حی وقیوم ہیں، آپ کی ذات تو ازل سے ابدالآباد تک ہے۔ تو یہاں خلیفہ کا یہ معنی نہیں کہ...... نعوذ باللہ...... اللہ تعالیٰ کے چلے جانے کے بعد آدم علیہ السلام خلیفہ ہوئے، بلکہ یہاں خلیفہ کا معنی یا تو یہ ہے کہ آپ سے پہلے چونکہ جنات کی قوم زمین میں موجود تھی تو ان کے بعد نیابت خلافت سلطنت امارت نظم کا چلانا آدم علیہ السلام کے ذمہ لگا۔ تو حضرت آدم علیہ السلام خلیفہ ہوئے کہ ان کے بعد آئے، بایں اعتبار حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ کہا جائے گا۔

اور دوسرا معنی یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توالد وتناسل میں اللہ نے یہ نظام رکھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پھر نوح آئیں گے، پھر اور انبیاء آئیں، پھر اور انبیاء واولاد آئیں گے، نبوت کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا اور اولادِ آدم علیہ السلام قیامت تک رہے گی تو اس بنا پر انہیں ''خلیفہ'' کہا جائے گا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۰، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

تخلیقِ آدم کی ضرورت کیوں پڑی؟

دو مخلوق جب اللہ نے پہلے پیدا فرمائیں: ایک کا تعلق عالمِ علوّ سے ہے اور ایک کا تعلق عالم سفلی سے ہے۔ اب مخلوق اور دنیا کا جو اللہ تعالیٰ نے ایک نظام قائم فرمانا تھا، اصل میں یہ دونوں مخلوقات اس نظام کے لیے مناسب نہیں تھیں، کیونکہ اللہ نے فرشتوں کی جو مخلوق پیدا فرمائی ہے تو ان کے اندر تو قوتِ شہوانیت، کھانا، پینا، ان چیزوں کی خواہش ہی نہیں، اللہ نے ان کے اندر یہ قوتیں رکھی ہی نہیں ہیں۔ جس میں یہ قوت ہی نہ رکھی جائے وہ ان کے مسائل کو کیسے سمجھ سکتا ہے؟ ایک آدمی کو بھوک ہی نہیں لگتی تو اس کو بھوک کا کیا پتہ کہ بھوک کیا ہوتی ہے؟ ایک آدمی کے اندر مادہ شہوانیت ہے ہی نہیں تو اس کا گناہوں سے بچنا کیسا؟ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ جو چیزیں اللہ نے زمین میں پیدا فرمائی ہیں ان سے منتفع بھی نہیں ہو سکتے تھے کہ انسانوں کی طرح نہ تو ان کو سر چھپانے کی ضرورت ہے، نہ گھر بنانے کی ضرورت ہے اور نہ کسی کھیتی باڑی وغیرہ کی ضرورت ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے اتنی ساری چیزیں جو پیدا کی تھیں تو ان سے آخر کون منتفع ہوتا؟

اور جنات پر غور کریں تو جنات بھی ایک لطیف بدن رکھتے ہیں، آگ سے پیدا ہوئے ہیں، ان کو بھی ان چیزوں سے منتفع ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور خدا کی قدرت ہے کہ جیسے اللہ نے ملائکہ میں قوتِ شہوانیت نہیں رکھی، قوتِ حیوانیت نہیں رکھی جنات میں بھی قوتِ خیالیہ ان کی قوتِ عقلیہ پر غالب ہے۔ ان کے اندر قوتِ عقلیہ ہے، لیکن بڑی کمزور ہے، ان کی قوتِ خیالیہ ان پر غالب ہے۔ جو خیال آیا بس اسی کو وہ کر گزرے۔

اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا، جس کے اندر ایسی قوتیں رکھی جائیں کہ ایک طرف سے اس کا تعلق عالمِ علوی سے ہو اور دوسری طرف سے اس کا تعلق عالم سفلی سے ہو۔ یعنی اس کے اندر ایسی قوتیں رکھی جائیں کہ وہ ترقی کرنے پر آئیں تو ملائکہ سے بھی آگے نکل جائیں اور ان کے اندر دوسری طرف سے ایسی قوتیں بھی ہوں کہ عالم سفلی میں اللہ نے جو چیزیں پیدا کیں ان سے منتفع ہو سکیں تو اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین میں خلیفہ پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا اور ملائکہ کے سامنے رکھا:

﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ [البقرة:٣٠]

فرشتوں کے سامنے یہ بات رکھنے میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ جس کو اللہ نے تمکن فی الارض اور خلافت دینی تھی تو

اس کے لیے ضرورت ہے کہ اس کو ماننے والے تو ہوں۔ اور اس وقت جو مخلوق تھی، جس سے نظامِ عالم قائم کرنے کی خدمت لی گئی تھی وہ فرشتے تھے، لہٰذا اللہ نے فرشتوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا، پھر آدم علیہ السلام کی عظمت کا ان سے اعتراف کرایا اور اس کے بعد ان سب کو آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ میں ڈال کر سرنگوں کیا، تب جا کر نظام چلا۔ جیسے آپ ایک آدمی کو کسی ادارہ کا منیجر بناتے ہیں تو ملازمین سے کہیں گے کہ آج کے بعد یہ آپ کے منیجر ہیں، یہ ان کے اختیارات ہیں اور ادارہ کے تمام امور ان کے حکم سے سرانجام پائیں گے۔ اگر آپ اس کا ملازمین سے تعارف نہیں کرائیں گے تو ان کو کیسے پتہ چلے گا کہ یہ ہمارے منیجر ہیں۔ اور اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کسی کا خلیفہ ہونا صرف اس بات کا تقاضہ نہیں کرتا کہ آپ زبان سے ''خلیفہ'' کہتے رہیں، بلکہ اس کے لیے تمکن فی الارض بھی ضروری ہے کہ اس کو نظامِ سلطنت و حکومت ملے، تب ہی تو وہ ''خلیفہ'' کہلانے کا مستحق بنے گا۔

فرق:

اسی لیے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد صاحب رحمہ اللہ نے بڑا عجیب اور اچھا جملہ لکھا ہے! انہوں نے لکھا کہ خلافت مسیحیت کی طرح ان کے اثنا عشر خلفاء پوپ نہیں ہیں، جیسے عیسائیوں کے پوپ پادری ہوتے ہیں کہ ہفتے کے بعد آپ گئے اور ان کو سلام کر لیا کہ جس کے لیے دلوں کا اعتقاد اور پیشانیوں کا سجدہ کافی ہو کہ آدمی صرف دل میں کہے کہ یہ ہمارے پوپ صاحب ہیں، پادری صاحب ہیں اور اس کے بعد کبھی جھک کر ان کو سلام کر لیا اور بات کر لی، بلکہ خلافت کا معنی ہے تمکن فی الارض کہ اللہ زمین پر کنٹرول بھی دیں کہ حکومت چلانے کا اختیار بھی دیں، تب خلیفہ بنے گا۔ اس طرح نہیں جس طرح لوگ ۱۲ خلیفہ بنائے پھرتے ہیں، ایک انچ زمین پر بھی کبھی ان کو حکومت نہیں ملی؟ صرف زبانی کلامی خلافت نہیں ملتی۔ جن کو تم خلیفہ بناتے ہو کم از کم یہ تو ثابت کرو کہ ان کو کہیں کبھی کسی جگہ تمکن فی الارض نصیب ہوا، کوئی اقتدار ملا، کوئی سلطنت ملی، اور کہیں انہوں نے کام کیا، صرف کہہ دینے سے مسئلہ نہیں ہوتا۔

ہم تو...... الحمد للہ...... جس طرح اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں، اسی طرح اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں۔ ہمارے تو دلوں میں ان کے لیے احترام ہے، لیکن جو حقائق ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بنے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی اور مسلمانوں کو قتال سے، خونریزیوں سے اور جھگڑوں سے بچایا۔ اللہ ان کی عظمتوں کو بلند فرمائے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ایک ایسا فیصلہ کیا کہ اس کا فائدہ قیامت

تک کے لیے عالم اسلام کو پہنچا۔ اسی لیے میرے پاک نبی ﷺ نے پیشن گوئی فرمادی تھی کہ یہ جو میرا بیٹا ہے (حضرت حسن رضی اللہ عنہ) ایسا سردار ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے دو بڑی جماعتوں میں صلح کرائیں گے۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۲۷۰۴، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ لِلْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ]

اور اس صلح کا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مشرق و مغرب تک اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے، اسلام اندلس تک جا پہنچا، چین تک جا پہنچا اور اسلام کی عظمتوں کا پوری دنیا کو اعتراف کرنا پڑا۔ پھر اس صلح کے بعد تو مسئلہ ہی ختم ہو گیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد یزید آ گیا۔ اس کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا معاملہ ہو گیا، پھر اس کے بعد تو معاملہ ہی نہ رہا، جو نبوت کے طریقہ پر مسئلہ چل رہا تھا پھر وہ مسئلہ ختم ہو گیا۔ تو انہوں نے اپنے یہ خلیفے خدا جانے کہاں سے بنا لیے؟ اور یہ بڑے عجیب لوگ ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ''دروغ گو را حافظہ نباشد'' کہ جھوٹے آدمی کا حافظہ نہیں ہوتا۔ جھوٹ بولنے والا آپ کو ایک بات سنائے گا اور دوسرے دن اسی کے خلاف بات سنا دے گا۔ یہ بات اس کو بھول جائے گی کہ کل میں نے کیا کہا تھا؟ کیونکہ جھوٹا ہے، کل بھی جھوٹ بولا تھا اور آج بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ جب ان سے کہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی میراث کیوں نہیں تقسیم کی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فدک کا مال کیوں نہ تقسیم کیا؟ تو کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کہاں ملی؟ وہ تو چند دن گزارہ ہی کرتے رہے، ان کو تو ایک دن بھی قرار نہیں ملا۔ چلو اہل سنت و الجماعت ان کو چوتھا خلیفہ تو مانتی ہی رہے گی، لیکن یہ ان کو چوتھی خلافت سے بھی محروم کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں کہ خلافت کا معنی صرف زبانی کلامی بات نہیں ہوتی، بلکہ خلافت کا معنی ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کو تمکن حاصل ہو۔ اب دیکھیں! اس کے لیے کتنا بڑا انتظام ہے۔ اب حضور ﷺ کی منشا میں حضرت ابی بکر رضی اللہ عنہ کو خلافت دینا تھا تو آپ نے اپنی زندگی میں انتظام فرما دیا کہ حج آیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کھڑا کیا اور زندگی میں جہاد کے کئی ایسے مواقع آئے ہیں کہ جہاں حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا، یعنی اہم معاملات تو یہی حج، نماز اور جہاد ہے۔ تینوں میں حضور ﷺ نے انہیں امارت کے منصب پر بٹھا کر لوگوں کے سامنے ایک مسئلہ رکھ دیا۔ بھائی! سوچنا تمہارا کام ہے، مشورہ کرنا تمہارا کام ہے، لیکن دیکھ لو اور ساتھ قریشی ہونے کی قید بھی لگا دی۔ ان

سب میں اشارہ تھا کہ تمکن فی الارض ضروری ہے۔ اللہ نے جو خلیفہ بنایا اب یہ تو نہیں کہ ہوا میں خلیفہ بنا دو۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو کہتے ہیں کہ میں آدم کو خلیفہ بنا رہا ہوں تو کہتے رہتے کہ آدم خلیفہ...... آدم خلیفہ...... اور بس۔ پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے آگے یہ مسئلہ رکھا، تا کہ ایک تو ان کو عظمتِ آدم علیہ السلام کا علم ہو سکے، پھر ان کے دل و دماغ میں حضرت آدم علیہ السلام کی عظمت جاگزیں ہو جائے اور پھر چونکہ اس نظام کی تدبیر پر اللہ نے ملائکہ کو رکھا، تا کہ ان کو صحیح معنوں میں آدم علیہ السلام کے معاملات کا پتہ چل سکے اور پھر اتنا بڑا اشرف اور عظمت بخشی کہ آدم علیہ السلام کو مسجود الملائکہ بھی بنا دیا۔

آدم علیہ السلام کو زمین پر خلیفہ مقرر کرنے کی حکمت:

جب یہ مسئلہ ہوا تو فرشتوں نے ایک بات عرض کی...... اعتراض اور حسد نہیں تھا، کیونکہ فرشتے اعتراض کر ہی نہیں سکتے ﴿لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُم بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ﴾ [الانبیاء: ۲۷] وہ اللہ کے حکم کے مقابل تو بول ہی نہیں سکتے۔ یہ تو بالکل ایسے ہے جیسے بادشاہ اپنے ماتحت کے سامنے کوئی چیز رکھے اور ماتحت مزید اس کو سمجھنے کے لیے اور حکمت جاننے کے لیے کوئی سوال کر دے تو وہ اعتراض نہیں کہلائے گا، اس لیے فرشتوں نے اعتراض نہیں...... بلکہ عرض کیا کہ ایک تو زمین میں فساد کرے گا اور دوسرا خون ریزی کرے گا۔

ان دونوں چیزوں کا علم ملائکہ کو کیسے ہوا؟ علم غیب ملائکہ کو تو ہوتا نہیں، تو اس کے بارے میں مفسرین نے فرمایا:

- ......ایک تو وہ جنات کو دیکھ چکے تھے کہ ان کا کام بھی سارا دن ہی فساد اور لڑائی ہے، کمزور کو طاقتور کھا جاتا ہے۔
- ......ایک روایت بیان کی گئی ہے، جس کو ابن کثیر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں خود فرمایا تھا کہ میں جو زمین میں آدم اور آدم کی اولاد بنانا چاہتا ہوں، ان میں فساد بھی ہوگا۔ یہ حدیث درست ہو تو بات ختم ہوگئی۔ اس لیے فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے رب کریم! آپ نے تو فرمایا کہ وہ فساد بھی کریں گے اور خون بھی بہائیں گے، پھر بھی آپ ان کو خلیفہ بنائیں گے؟ اس میں کون سی حکمتیں ہیں؟
- ......اور تیسری وجہ مفسرین نے یہ لکھی کہ آدم علیہ السلام کو اللہ نے مٹی سے پیدا فرمانے کا ارادہ کر لیا تو اس وجہ سے ملائکہ نے کہا کہ مٹی کا تعلق عالم سفلی سے ہے اور سفلی چیزوں کے اندر شہوانیت لازمی بات ہے۔ اور جب قوت

شہوانیت آئے تو لازمی بات کہ لذت اور پھر لذت کے ساتھ لازمی بات ہے کہ قوتِ غضبیہ بھی آئے گی اور جب غصہ آئے گا تو لڑائی ہوگی، اس وجہ سے ملائکہ نے اللہ کے آگے عرض کیا: اے اللہ! آپ جو مخلوق پیدا فرمارہے ہیں وہ تو زمین میں فساد کرے گی اور وہ تو خون ریزیاں کرے گی:

﴿قَالُوٓا۟ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ ٱلدِّمَآءَ﴾ [البقرة:٣٠]

اگر اس مخلوق کے پیدا کرنے کا مقصد عبادت ہے تو عبادت واطاعت میں تو ہم کافی ہیں۔ اللہ نے فرمایا: میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ تمہارا علم بھی محدود ہے، تم تو اتنا جانتے ہو جتنا تمہیں بتایا ہے۔ تم جس بات سے ڈر رہے ہو کہ فساد کرے گا اور خون بہائے گا، اگر فساد اور خون ریزی نہ ہو تو حکومت کس پر کرے گا؟ تو خلیفہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

اسی پر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ بنی آدم پر اپنے احسانات کی خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے بنی آدم! تم اپنی شان کو دیکھو کہ تمہارے باپ کو پیدا کرنے سے پہلے ملاء اعلیٰ میں اس کا ذکر کیا ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ﴾ [البقرة:٣٠]۔

[تفسیر ابن کثیر:١/٧١، البقرة، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّى جَاعِلٌ]

مفسر فرماتے ہیں: یہاں ایک حرف مقدر ہے، اصل تھا "وَاذْكُرْ يَا مُحَمَّدُ!" اللہ نے حکم دیا: اے محمد! آپ یاد کریں اس بات کو جب کہا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اور اس سے مقصود یہ تھا کہ آپ اپنی امت کو آدم علیہ السلام کا یہ قصہ بیان فرمائیں۔ اس صورت میں یہ جملہ "وَاذْكُرْ" کے متعلق ہوگا۔

اور دوسرا قول علماء قواعد کے نزدیک یہ ہے کہ "إِذْ" یہاں زائدہ ہے، اصل معنی ہے ﴿قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ﴾ لیکن ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کا رد کیا ہے۔

قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ تمام مفسرین نے یہ قول رد کیا ہے کہ "إِذْ" زائدہ نہیں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر:١/٦٩، البقرة، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّى جَاعِلٌ]

خلیفہ کا معنی:

❁ ..... مفسر فرماتے ہیں کہ خلیفہ کا معنی ہے کہ میں ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہوں جو قوم ایک دوسرے کے بعد آئے گی۔ ایک صدی گزرے گی تو وہ ایک دوسرے کے پیچھے آئیں گے۔

- ......بعض مفسرین نے فرمایا: خلیفہ سے مراد یہاں صرف حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔
- ......بعض نے کہا کہ اس سے مراد صرف آدم علیہ السلام نہیں، بلکہ جنس آدم مراد ہے، چونکہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے آئیں گے اس لیے ان کو خلیفہ کہا گیا۔
- ......اور بعض نے کہا: آدم علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کی اولاد مراد ہے، کیونکہ اگر خلیفہ کے لفظ سے صرف حضرت آدم علیہ السلام مراد ہوتے تو فرشتے یہ نہ کہتے ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ [البقرۃ:۳۰] کہ آپ زمین میں ایسی مخلوق بنانا چاہتے ہیں جو زمین میں فساد کرے گی اور خون بہائے گی؟ وہ صرف آدم علیہ السلام کے بارے میں ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟ انہوں نے لفظ خلیفہ سے یہ سمجھا، کیونکہ خلیفہ کا معنی ہی یہی ہوتا ہے جو لوگوں کے درمیان لڑائیوں و جھگڑوں کے فیصلے کر سکے۔ تو جب جھگڑے ہوں گے تو خلیفہ فیصلہ کرنے کے لیے جائے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ ایک ایسی مخلوق پیدا ہو رہی ہے جو جھگڑے کرے گی اور مظالم کرے گی، ورنہ خلیفہ بنانے کی ضرورت کیا ہے؟

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۹، ۷۰، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ]

آیات میں ربط:

فرشتوں نے دو چیزوں کے بارے میں سوال کیا کہ وہ زمین میں فساد کریں گے اور خون ریزی کریں گے تو اللہ کے جواب بھی دو ہیں: ایک حاکمانہ جواب ہے ﴿قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۳۰] اور دوسرا حکیمانہ جواب ہے ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ [البقرۃ:۳۱]۔ [معارف القرآن: ۱/۱۷۸]

نکات:

بنی آدم کے اندر جہاں سفکِ دماء ہوگی تو وہاں پھر شہادت کا جذبہ بھی ہوگا۔ تو اللہ پاک نے فرمایا کہ اس عالم کو عالمِ ابتلاء، عالمِ امتحان اور عالمِ اختبار بنانا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں اپنے بندوں کی آزمائش کی جائے، امتحان لیا جائے اور ان کو ساری قوتوں اور نعمتوں سے سرفراز فرمایا جائے۔ تو اب ہم نے جو ان کے اندر قواتِ علمیہ رکھی ہیں، قواتِ عملیہ رکھی ہیں، قواتِ نظریہ رکھی ہیں، قواتِ شہوانیہ رکھی ہیں، قواتِ غضبیہ رکھی ہیں اور قواتِ حیوانیہ رکھی ہیں، ان ساری قوتوں میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں، کیونکہ جب ان قوتوں کا رخ آدمی سیدھے رخ کی طرف موڑ دے، پھر مدارج پر پہنچتا ہے اور روحانی ترقیوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یعنی ایک آدمی کو اللہ نے قوتِ علم دی ہے، اب اس سے وہ عالم بنیں گے، معلم بنیں گے، مفسر بنیں گے اور محدث بنیں گے۔ اگر وہ......نعوذ باللہ......اپنے اس علم کو

شیطان کے تابع کردیں تو خسران وذلت میں گر جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں قوات شوانیہ رکھی ہیں، وہ لذتیں حاصل کرتا ہے کھانے پینے سے اور عورت سے، ماکولات ومشروبات سے متمتع ہوتا ہے اور لذت حاصل کرتا ہے۔ اگر وہ حدود اللہ میں رہ کر لذت حاصل کرے گا تو عبادت ہے اور اگر وہ حدود اللہ کو توڑے گا تو سرکشی کا مرتکب ہوگا۔ تو اس کے لیے جہنم بھی تیار ہے اور سزائیں بھی تیار ہیں۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنی قوتوں کو پیدا کیا ہے تو ان کے اندر حکمتیں ہیں۔ اور جب ایک مخلوق کے اندر اللہ نے ایک قوت ہی نہیں رکھی ہے تو ان کے اندر اختیار، ابتلاء اور امتحان کا کوئی معنی ہی نہیں ہے، جیسا کہ اللہ نے فرشتوں کو معصوم بنایا۔ فرشتوں کی عصمت اضطراری ہے، اختیاری نہیں ہے، وہ گناہ کر سکتے ہی نہیں، ان کے اندر گناہ کا مادہ ہی نہیں ہے۔ اصل عصمت اختیاری انبیاء علیہم السلام کو ہے۔ اللہ نے اپنے انبیاء کو، رسولوں کو معصوم بنایا۔ اللہ نے ان کو اتنی بڑی قوت دی، طاقت دی، اتنی بڑی صحت دی، اتنی بڑی جوانی دی اور اتنا بڑا کمال دیا، پھر بھی وہ اللہ کے راستے پر اللہ کے حدود کے اندر پابند رہے۔ مجال ہے کہ نظر ادھر ادھر بھٹک جائے۔ اصل یہ مقامِ عصمت ہے۔ جب ایک آدمی کے پاس وہ قوت ہی نہیں ہے تو اس میں بہادری کی کون سی بات ہے؟

اب دیکھیں کہ ایک آدمی بوڑھا ہوجاتا ہے، وہ کہے: میں بڑا شریف آدمی ہوں، صفِ اوّل میں نماز پڑھتا ہوں، میری نماز قضا ہی نہیں ہوتی اور میں تو آنکھ اٹھا کر بھی نوجوان عورت کی طرف نہیں دیکھتا۔ جب اس کے اندر دیکھنے کی قابلیت ہی نہیں رہی۔ اگر دیکھو گے تو وہ تمہارے منہ کے اوپر تھوک دے گی، اس وجہ سے تم نہیں دیکھتے ہو۔ تو یہ کون سی بڑی بات ہے؟ اور تم نماز میں آجاتے ہو کون سی بہادری کی بات ہے؟ تم فارغ ہو، گھر والے تم سے تنگ ہیں۔ جب تم مسجد آجاتے ہو تو وہ کچھ آرام حاصل کر لیتے ہیں۔ اصل بہادری تو تب ہے جب تم جوان ہو اور تمہاری بیوی بلا رہی ہے کہ میرے ساتھ لیٹو، آرام کرو، ابھی نماز میں پندرہ منٹ دیر ہے، لیکن وہ کہتا ہے: نہیں میری تہجد چلی جائے گی۔ میں پہلے تہجد پڑھ لوں، نماز پڑھ لوں، تمہارے لیے پھر بھی دن موجود ہے، تمہارے حقوق پھر بھی ادا کرسکتا ہوں۔ یہ کمال ہے کہ بستر دعوت دے رہا ہے، حسن دعوت دے رہا ہے اور جوانی بلا رہی ہے، لیکن اللہ کی خشیت غالب ہے۔ وہ سب کچھ جھٹک دیتا ہے اور غسل کر رہا ہے اور ہاتھ باندھے اپنے پروردگار عالم کے سامنے کھڑا رو رہا ہے۔

اسی لیے علماء نے فرمایا کہ چار چیزیں ایسی ہیں کہ وہ بظاہر حسن ہیں، لیکن وہ کسی دوسرے کے لیے احسن بن جاتی

ہے، یعنی توبہ کرنا بوڑھے آدمی کا حسن ہے۔ چلو بڑھاپے میں توبہ نصیب ہو جائے، لیکن اگر جوان توبہ کرے تو احسن ہے، جوانی کے اندر آدمی گناہوں کو چھوڑ دے، توبہ تو تب ہوئی۔ حیا مردوں کے اندر حسن ہے، بڑا اچھا ہے، لیکن اگر عورت میں حیا آئے تو احسن کے درجہ پر پہنچتا ہے۔ ہر آدمی عدل کرے یہ درجہ حسن ہے، لیکن کاتب معاملات اور امراء عدل کریں تو یہ درجہ احسن کو پہنچ جاتا ہے، کیونکہ وہ خود محتاج ہے، لیکن خرچ کر رہا ہے ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر:۹] یہ مقام صحابہ کرام کا تھا۔ وہ اپنے نفسوں اور اپنی اغراض پر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے کہ خود محتاج ہیں، لیکن کہتے ہیں: چلو میرے بھائی کا وقت تو گزر جائے، ہمارا بھی گزر ہی جائے گا۔ اس لیے اللہ نے فرمایا: اے میرے فرشتو! اے میرے بندو! میں جو مخلوق پیدا کر رہا ہوں، تمہیں ان کی برائیوں والی جانب تو نظر آئی ہے، لیکن ان کے اندر جو مراتب ہیں اور مقامات ہیں وہ تمہیں نظر ہی نہیں آتے، ان کے اندر میں نے جو مصلحتیں رکھی ہیں وہ تمہیں پتہ نہیں ہیں۔ میں آدم علیہ السلام کی اولاد میں نبی پیدا کروں گا، رسول پیدا کروں گا، انہی کے اندر صدیق پائے جائیں گے، انہی کے اندر شہداء پائے جائیں گے، انہی کے اندر صالحین پائے جائیں گے، انہی کے اندر عباد پائے جائیں گے، انہی کے اندر زہاد پائے جائیں گے، دنیا کو چھوڑ دینے والے کہ دنیا ہے، لیکن پھر بھی غرض نہیں ہے، انہی میں اولیاء ہوں گے، انہی میں ابرار ہوں گے، انہی میں وہ لوگ ہوں گے جو درجہ مقربین کو پہنچیں گے اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں گے اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ سے محبت کرنے والے ہوں گے اور انہی لوگوں کے اندر ان لوگوں کو پیدا کروں گا جو میرے انبیاء اور رسولوں کی اتباع کریں گے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ہوں گے۔ تو جہاں تمہیں مفسدین کا پہلو نظر آیا اور تمہیں لِيُفْسِدَ فِيهَا کا پہلو نظر آیا، تمہیں دوسرے پہلو کا علم ہی نہیں ہے کہ ان کے اندر مراتب کتنے ہیں؟ ان کے اندر مدارج کتنے ہوں گے؟ ان کے اندر ایسے ایسے لوگ پیدا کروں گا۔

اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے بندوں کے متعلق سوال:

اس کے بعد مفسر فرماتے ہیں: جیسے صحیح حدیث میں یہ بات موجود:

((إِنَّ الْمَلَائِكَةَ إِذَا صَعِدَتْ بِصَحِيفَةِ الْعَبْدِ إِلَى الرَّبِّ تَعَالَى يَسْأَلُهُمْ وَهُوَ أَعْلَمُ كَيْفَ تَرَكْتُمْ عِبَادِيْ؟))

جب فرشتے بندوں کے عمل لے کر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتے ہیں، پروردگار عالم ان سے سوال کرتے ہیں......

حالانکہ رب جانتا ہے، پھر بھی سوال فرماتا ہے...... تم میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آرہے ہو؟

((فَيَقُولُونَ: تَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّونَ وَأَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّونَ))

''تو وہ کہیں گے: تیرے بندوں کو ہم نے اس حال میں چھوڑا کہ وہ نماز میں مصروف تھے اور تیرے بندوں کے پاس اس حال میں آئے کہ وہ نماز میں مشغول میں تھے۔''

چونکہ ملائکہ صبح کے وقت میں اور عصر کے وقت میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ جو رات والے ہیں وہ عصر کو اوپر سے آگئے، اسی طرح جو صبح والے ہیں وہ صبح کو آگئے اور رات والے واپس چلے گئے۔ تو جب وہ صبح کو جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اللہ کے بندے نماز کے اندر ہیں اور جب وہ عصر کو دیکھتے ہیں تو اللہ کے بندے نمازوں میں مصروف ہوتے ہیں۔

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۴۲۹، باب: قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى: تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ]

اور اسی طرح حدیث پاک میں آیا، میرے آقا نبی پاک ﷺ نے فرمایا: اللہ کی طرف بندوں کے اعمال اٹھا لیے جاتے ہیں اور ان کے عمل دن ہونے سے پہلے پہلے چلے جاتے ہیں، یعنی نماز کے وقت۔ اور دن کے اعمال رات کے آنے سے پہلے پہلے یعنی غروب آفتاب سے پہلے پہلے آسمانوں پر چلے جاتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے ان کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

خوش نصیب ہیں وہ بندے جو ان وقتوں میں اللہ کی نماز میں شریک ہوتے ہیں۔

بازار میں جانے کی دعا اور اس کی فضیلت:

جیسے حدیث میں آتا ہے کہ جب آدمی بازار میں جائے اور وہ یہ کلمہ پڑھے ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِي وَ يُمِيتُ، وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ'' تو اللہ تعالیٰ اس کی دس لاکھ نیکیاں لکھ دیتے ہیں، دس لاکھ گناہ معاف فرما دیتے ہیں اور دس لاکھ درجات بلند کر دیتے ہیں۔ [سنن الترمذی، حدیث: ۳۴۲۸، باب: ما يقول إذا دخل السوق]

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے بارے میں وعید:

حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ایک قوم پر اللہ کا عذاب آیا، وہ پیمائش میں کمی وبیشی کرتے تھے، یعنی جب دینا ہوتا تو تھوڑا دے دیا اور لینا ہوتا تو زیادہ لے لیا۔ کیا اب اس امت میں یہ عیب نہیں؟ آپ کسی مسلمان ملک کو آرڈر

دے کر دیکھ لیں اوپر لکھا ہوگا تیس گز اور اندر سے انتیس گز۔

جب تم اللہ کی نافرمانی کرو گے تو مخلوق بھی تمہاری نافرمانی کرے گی:

اسی لیے مالک بن دینا رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ میں جب گھر میں دیکھتا ہوں کہ میری بیوی نے میری بات نہیں مانی، میں نے اپنے نوکر سے کام کہا، اس نے کام نہیں کیا، میں فوراً سمجھ جاتا ہوں کہ آج مجھ سے ایسا گناہ ہوا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں نافرمانی پیدا کر دی۔ وہ دراصل میرے گناہ کی سزا ہوتی ہے کہ بچہ نافرمان ہے، بیوی نافرمان ہے، نوکر نافرمان ہے اور دوست...... نعوذ باللہ...... نافرمان ہو گئے۔ اصل ان کی وجہ نہیں ہوتی۔

یہی تو غلطی ہے کہ ہم اپنا علاج غلط طریقے سے ڈھونڈ رہے ہیں اور جب تک تم صحیح بیماری کی تشخیص نہ کرو اور صحیح نسخہ استعمال نہ کرو تو تکلیف کیسے دور ہوگی؟

تمہارے اعمال کے مطابق تمہارے حکمران آئیں گے:

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب تم پر کوئی ظلم کرے اور تم پر سختی کرے تو اس کی ہلاکت کی دعا نہ مانگو، تم اپنے گناہوں سے توبہ کرو، تاکہ اللہ راضی ہو جائے۔ وہ اسی کو تمہارے لیے نرم کر دے گا، اسی کو تمہارے لیے مہربان کر دے گا۔ اور جب تم اللہ کے نافرمان ہو گے تو تمہارے اوپر جو حاکم ہیں ان کو اللہ تم پر ظالم بنا دے گا۔

اس لیے میرے عزیزو! اللہ نے فرمایا:

﴿وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ كَانُوٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ [البقرة: ۵۷]

''میں اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا، وہ اپنی جانوں پر خود ظلم کرتے ہیں۔''

اللہ نے فرمایا: ہم کبھی کسی قوم کو عذاب نہیں دیتے جب تک کہ وہ عذاب کے پورے اسباب مکمل کر کے انتہاء تک نہیں پہنچ جاتے۔

اللہ کو چھوڑ کر دنیا کے اسباب کے پیچھے کیوں لگ گئے؟

ایک دفعہ بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے زمانہ میں بہت مصائب آئے تو انہوں نے تمام کو خط لکھا کہ یہ جتنے عذاب آ رہے ہیں، ہماری معصیت کی وجہ سے ہیں۔ تم سب لوگ اپنے گھروں سے باہر نکلو اور سڑکوں پر اور دھوپ پر آ جاؤ، نمازیں پڑھو، اللہ کے آگے تضرع اور عاجزی کرو اور خدا کے دروازے پر گر جاؤ اور اللہ سے مانگو اور جس کو اللہ نے

توفیق دی ہو وہ اللہ کے راستے میں خیرات بھی کرے۔ امت نے فوراً یہ کام کیا تو ساری پریشانیاں دور ہو گئیں۔

لیکن جو علاج ہے وہ تو ہم ڈھونڈ ہی نہیں رہے، اس کی طرف تو ہم جا ہی نہیں رہے۔ ہم اسباب کی طرف جا رہے ہیں، ہم اپنی فتح ظاہری اسباب کی طرف ڈھونڈ رہے ہیں اور ہم اپنی نجات کفر کی مدد کے ساتھ ڈھونڈ رہے ہیں، حالانکہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے دعا کریں اللہ ہم سے اپنے عذاب رفع فرمائے اور پریشانیاں رفع فرمائے اور ہمیں ہدایت کے راستے پر لگائے۔

آیات کا آپس میں ربط:

بعض علماء نے فرمایا کہ جب فرشتوں نے کہا ﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ﴾ تو اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا ﴿إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝﴾ [البقرۃ: ۳۰] اور بعض علماء نے فرمایا کہ جب فرشتوں نے کہا ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ﴾ تو اس پر اللہ نے جواب دیا ﴿إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝﴾ [البقرۃ: ۳۰] تم جو کہتے ہو کہ ہم تسبیح کرنے والے ہیں، پاکی بولنے والے ہیں، تمہارے اندر بھی تو ابلیس ہے، تمہیں اس کا بھی پتہ نہیں ہے، جسے تم نہیں جانتے ہو، میں جانتا ہوں۔ لیکن جمہور مفسرین اس طرف ہیں کہ یہ پہلی بات کا جواب ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۰، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

بعض مفسرین نے فرمایا کہ دراصل فرشتوں کے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمارے مولیٰ! زمین میں آدم اور آدم کی اولاد کی بجائے ہمیں آباد کر دو، ہم تیری تسبیح، تحمید اور تیرے حکم کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ اللہ نے فرمایا ﴿إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝﴾ [البقرۃ: ۳۰] اللہ ہی حکمتیں جانتا ہے کہ زمین کے اندر جو چیزیں ہیں ان سے نفع حاصل کرنے کی تمہارے اندر صلاحیت ہی نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ میری کیا حکمتیں ہیں؟ وہاں ایسی مخلوق کو پیدا کروں گا جو زمین کے اندر اور زمین کی نعمتوں سے منتفع ہونے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو اور ان کے اندر خیر اور شر دونوں ہوں گے، تمہارا آسمانوں میں رہنا تمہارے لیے زیادہ لائق ہے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ نے جب فرمایا ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ﴾ [البقرۃ: ۳۰] معنی یہ تھا کہ میں خلیفہ بنانے والا ہوں، یعنی اللہ نے ان کو اس کی خبر دی ہے۔

اور حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ خبر نہیں، بلکہ اللہ نے بندوں کی تعلیم کے لیے گویا فرشتوں سے مشورہ لیا۔

مفسر فرماتے ہیں کہ استشار بھی ہو تو اس کے اندر اخبار کا معنی خود بخود پایا جاتا ہے۔ اگر مشورہ لیا جائے تو اس کے اندر خبر آ گئی، وگرنہ مشورہ کس بات کا ہے؟

فرمایا ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ [البقرة: ۳۰] اس میں زمین سے مراد مکہ ہے، جیسے حدیث پاک میں آیا ہے: حضور ﷺ نے فرمایا: زمین کو مکہ سے بچھایا گیا اور اس اللہ کے گھر کا سب سے پہلے فرشتوں نے طواف کیا۔

مفسر فرماتے ہیں: اس کے اندر ضعف ہے اور ''ارض'' سے مراد جنس ارض ہے، کیونکہ ''اَلْأَرْض'' پر الف لام جنس کا ہے۔ اس آیت ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ [البقرة: ۳۰] میں ''اَلْأَرْض'' سے مراد یہ نہیں کہ مکہ میں خلیفہ بھیج رہا ہوں، بلکہ پوری زمین کے لیے ہے، یہ لفظ عام ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۰، البقرة، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

''خَلِيفَةٌ'': ''فَعِيلَةٌ'' کے وزن پر ہے۔ جیسے کوئی اپنی قوم میں اپنا خلیفہ بنائے تو کہا جاتا ہے ''خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا'' کہ فلاں نے اس کو خلیفہ بنایا اس کام کے اندر، جب وہ اس کام میں اس کا قائم مقام بن گیا ہے۔ جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ [یونس: ۱۴]

محمد بن اسحاق نے ایک اور ترجمہ بھی کیا ہے ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ [البقرة: ۳۰] انہوں نے کہا کہ اللہ نے فرمایا: میں زمین میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے والا ہوں جو اس زمین میں رہیں گے، اس زمین کو آباد کریں گے، زمین کے سکان بنیں گے اور وہ مخلوق تم میں سے نہیں ہوگی، بلکہ ایک اور جنس کی مخلوق پیدا کروں گا۔

مفسر فرماتے ہیں: ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہ بات ذکر کی گئی ہے:

''إِنَّ أَوَّلَ مَنْ سَكَنَ الْأَرْضَ الْجِنُّ فَأَفْسَدُوا فِيهَا وَسَفَكُوا الدِّمَاءَ''

پہلے اللہ نے زمین میں جنات کو پیدا کیا، لیکن جب جنات آئے تو انہوں نے فساد کیا اور خون ریزیاں کیں ایک دوسرے کو قتل کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر ابلیس کو بھیجا۔ ابلیس نے آ کر ان کو مارا، ان کو قتل کیا، ان کو بھگایا اور ایسے جزیروں کی طرف ان کو بھگایا جو دریاؤں اور سمندروں کے اندر تھے۔ وہاں جا کر ان کو بند کیا۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو آدم علیہ السلام چونکہ جنات کے بعد آئے اس لیے ''خلیفہ'' کہلائے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۰، البقرة، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

مشورہ کے اہل لوگ:

اللہ ان کو بھی حکم دیتے ہیں:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ [آل عمران: ۱۵۹]

جب کوئی مسئلہ ہو تو آپ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرلیں، لیکن اسلام اس میں ایک سبق دیتا ہے کہ مشورہ لینے کا یہ معنی نہیں ہوتا کہ اس میں ہر آدمی اپنی رائے کا اظہار کرے۔ ہر آدمی کی رائے کا اظہار تو مغلوبہ بن جائے گا، پھر تو دنیا کا کوئی نظام نہ چل سکا ہے اور نہ قیامت تک چل سکے گا، کیونکہ اللہ نے جتنی زبانیں پیدا کی ہیں اور جتنے دماغ پیدا کیے ہیں سب کی سوچ اپنی ہوتی ہے۔ ایک آدمی کو ایک چیز پسند ہے اور دوسرے آدمی کو وہی چیز ناپسند ہے، اسی طرح ایک آدمی کو ایک رنگ بڑا اچھا لگتا ہے اور دوسرے آدمی کو اسی رنگ سے نفرت ہے، ایک آدمی کو کھانے میں ایک چیز مرغوب ہے اور دوسرے کو اسی چیز سے چڑ ہے، ایک آدمی کو بندہ پسند ہے اور دوسرے کو وہ ناپسند ہے اور ایک آدمی ایک پابندی کو اچھا سمجھتا ہے اور دوسرے پر وہ پابندی ناگوار گزرتی ہے۔

کیا فرشتے عالم الغیب ہیں؟

اب دوسری بات یہاں یہ پیدا ہوتی ہے کہ غلو کرنے والے لوگ جن کے اعتقاد میں اولیاء اللہ بھی عالم الغیب ہوتے ہیں، انبیاء علیہم السلام بھی عالم الغیب ہوتے ہیں اور پیر بھی عالم الغیب ہوتے ہیں، وہ بھی انہی قرآن کی آیات سے غلط معانی لیتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں کہ ابھی آدم علیہ السلام پیدا نہیں ہوئے، ابھی آدم علیہ السلام کی اولاد بھی پیدا نہیں ہوئی، لیکن فرشتوں نے پہلے خبر دے دی کہ وہ فساد بھی کریں گے اور ناحق خون بھی بہائیں گے تو فرشتوں کو بھی علمِ غیب تھا۔ اور جب فرشتوں کو علمِ غیب ہے تو نبی تو فرشتوں سے افضل ہوتے ہیں، لہٰذا ان کو بھی علم الغیب ہو گیا۔ جب انبیاء علیہم السلام کو علمِ غیب ہوتا ہے تو اولیاء ان کے وارث ہوتے ہیں، وارثوں کو بھی اس جائیداد میں سے حصہ مل گیا۔ تو اس طرح کے مسائل بنا کر اور فرضی صغریٰ کبریٰ بنا کر لوگوں کو پیش کرتے ہیں۔ ہمیشہ یاد رکھیں کہ باطل مذہب جب بھی کوئی بات کرے گا صغریٰ بھی خود بناتا ہے، کبریٰ بھی خود بناتا ہے اور نتیجہ بھی خود نکالتا ہے۔ تو اب صغریٰ یہ بنایا کہ ملائکہ نے خبر دی اور کبریٰ یہ بنایا کہ جب ملائکہ نے خبر دی تو ملائکہ کو علم تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو علمِ غیب تھا۔ جب ان کو علمِ غیب تھا تو نبی اور رسل تو ان سے افضل ہوتے ہیں، ان کا علم تو ان سے بھی بڑا ہے، لہٰذا انہوں نے یہ استدلال کیا۔

حالانکہ اللہ کے قرآن کی تحریف معنوی ہے۔ اگر قرآن پاک کی اسی آیت مبارک کو مکمل پڑھ لیتے تو غلط بات کہہ کر مسلمانوں کے عقیدوں کو خراب نہ کرتے۔ اسی آیت میں جب اللہ نے تردید فرمادی: ﴿اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝۳۰﴾ [البقرۃ: ۳۰] (میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے) تو بات ساری کی ساری ختم ہوگئی۔ ایک آیت کو بھی پورا نہ پڑھنا اور آیت کے بعض الفاظ کو پڑھ کر معانی حاصل کرنا یہ باطل فرقوں کی عادت ہے۔

نادانی کی ایک مثال:

جیسا کہ ایک مثال مشہور ہے کہ ایک بادشاہ اپنی بیگم کے ساتھ ایک جنگل میں سیر کے لیے گئے تھے۔ لوگوں نے آکر شکایت پیش کی کہ ہم غریب ہیں اور ہمیں گندم نہیں ملتی، ہم بھوکے مر رہے ہیں، کھانے کے لیے روٹی نہیں ملتی۔ مہربانی کریں! گندم کا انتظام کریں۔ تو ان کی بیگم نے پوچھا کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ تو سیکرٹری نے سمجھایا کہ غریب ہیں، بھوکے ہیں اور ان کو روٹی نہیں ملتی۔ اس نے کہا کہ اگر ان کو روٹی وغیرہ نہیں ملتی تو بسکٹ پیسٹری وغیرہ کھالیں۔ یہ اس نے اس لیے کہا کہ اس نے کبھی بھوک دیکھی نہیں تھی اور اس کو پتہ نہیں تھا کہ بھوک کیا ہوتی ہے؟ اس لیے اس نے بڑا مناسب مشورہ دیا۔

انسان اشرف المخلوقات کیوں ہے؟

اور یاد رکھیں! اسی سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو اشرف بنایا ہے اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ نے قرآن مقدس میں بھی فرمادیا:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۝۷۰﴾ [الاسراء: ۷۰]

''ہم نے آدم کی اولاد کو عزت والا بنایا، انہیں خشکی اور تری میں ہم نے سوار کیا، گویا کہ یہ ہر چیز ان کے تابع ہوگئی بحر و بر تابع ہوگئے۔''

انسان تو اشرف المخلوقات ہے، لیکن اشرف کیوں ہے؟ اس میں مختلف علماء کے مباحث ہیں۔ ان کا صرف خلاصہ عرض کردیتا ہوں، لمبی چوڑی بحثیں اگر کسی نے پڑھنی ہیں تو کتابوں میں موجود ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ انسان اس لیے افضل ہے کہ انسان بولنے والا ہیں اور جتنے حیوانات ہیں وہ بولنے والے نہیں ہیں، یعنی نطق کی وجہ

سے انسان اشرف المخلوقات ہے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بول کر بیان کر دیتا ہے۔ مجھے پانی چاہیے تو میں کہہ کر مانگ لوں گا، مجھے کھانا چاہیے تو میں کہہ کر مانگ لوں گا۔ اور جتنے جانور ہیں: چرند ہیں، پرند ہیں اور حیوانات ہیں، ان کو اللہ نے یہ چیز نہیں عطا فرمائی کہ وہ زبان سے بول کر اپنے مالک سے کہیں۔

مثلاً: یہ ہے کہ ہدہد نے اپنی بولی میں بات کی، اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کا علم عطا فرما دیا، ورنہ یہ نہیں کہ چیونٹی کی زبان ہوتی ہے یا ہدہد کا نطق ہوتا ہے کہ جب وہ بولے گا تو ہم بھی سمجھ لیں گے، یا وہ اپنی تکلیفیں بیان کر دیں گے، اسی طرح آگر اونٹ نے آ کر میرے آقا سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکایت کی کہ مالک مجھ سے کام زیادہ لیتا ہے اور میری خوراک کا انتظام نہیں کرتا۔ وہ معجزۂ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہوتا کہ اونٹ بولنے والا ہے۔ اس کو کوئی بھی بولنے والا نہیں سمجھتا، لہٰذا یاد رکھیں! علماء نے فرمایا کہ انسان اس لیے افضل ہے کہ انسان بولنے والا ہے، ورنہ کوئی جانور بولنے والا نہیں ہوتا، حالانکہ یہ دعویٰ کوئی اتنا بڑا دعویٰ نہیں ہے۔ جانور بولنے والا نہیں ہوتا، لیکن اللہ نے ان کو کوئی نہ کوئی تو زبان دی ہے، کوئی نہ کوئی آوازیں تو نکالتے ہیں، جس سے مالک سمجھ لیتا ہے کہ اس کو پیاس لگی ہوئی ہے، مالک سمجھ لیتا ہے کہ گائے صبح سے آواز نکال رہی ہے، اس کو بھوک لگی ہوئی ہے یا اس کو پانی کسی نے نہیں پلایا ہے۔ تو یہ اتنی فضل والی بات نہیں ہے، یعنی انسان اپنے نطق میں زیادہ فصاحت و بلاغت رکھتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کی بولی میں کچھ نہ کچھ کہنے کی توفیق بخشی ہے۔

اسی طرح بعض لوگوں نے کہا کہ انسان افضل ہے، کیونکہ اللہ نے اس کو عقل دی ہے۔ اس کی عقل اتنی مکمل ہوتی ہے کہ کوئی مخلوق اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور مخلوق میں شعور تو ہوتا ہے اور ادراک تو ہوتا ہے، لیکن عقل نہیں ہوتی۔ انسان کو اللہ نے عقل سے نوازا ہے۔ اس لیے یہ افضل ہے۔ حالانکہ یہ بات بھی نہیں ہے، کیونکہ ہر چیز کو اللہ نے عقل دی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کو زیادہ دی ہے اور کسی کو تھوڑی دیا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہر جانور میں عقل ہے۔ آپ اسے ایک صحرا میں چھوڑ دیں، شام کو لوٹ کر گھر آ جاتے ہیں۔ آپ اس کو جنگل میں چھوڑ دیں، وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے سیدھا اپنے گھر میں پہنچتا ہے، دوسرے کے گھر میں بھی داخل نہیں ہوتا۔ شہروں میں ساری گلیاں ہوتی ہیں، وہ گلیوں کا چکر کاٹتے کاٹتے اپنے گھر میں پہنچ جاتا ہے۔ ایک بلی ہے، آپ اس کو دوسرے محلے میں ڈالیں، وہ بھی شام کو گھر آ جائے گی۔ اس کے اندر بھی اپنے گھر پہچاننے کی عقل تو ہے، وگرنہ وہ کیسے پہچان لیتی ہے کہ یہ میرا گھر ہے۔ ایک کتا ہے، اس کو آپ چھوڑ دیں، وہ بھی لوٹ کر گھر آ جائے گا۔ نجس ہے، پلید ہے، لیکن اتنی عقل تو

اس کے اندر بھی موجود ہے۔ اور خاص طور پر بندر ہے۔ آپ جو حرکتیں کریں وہ اسی طرح کی حرکتیں کرے گا، بالکل ایسی نقل کرے گا کہ آدمی حیران ہو جائے! ایسی ایسی شرارتیں اس کو سوجھتی ہیں اور ایسی ایسی حرکتیں اس کو سوجھتی ہیں کہ آدمی دنگ رہ جاتے ہیں۔ اتنی عقل تو ان کو بھی ہے، لہٰذا عقل کی وجہ سے انسان کو اشرف کہنا کوئی دلیل نہیں بنتی ہے۔ ہر چیز میں عقل ہے، کسی کی زیادہ ہے اور کسی کی تھوڑا ہے۔

اصل میں انسان کو اللہ نے افضل جو بنایا ہے یا انسان کو جو شرف ملا ہے وہ یہی ہے جو آپ قرآن میں پڑھ رہے ہیں کہ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ [البقرۃ:۳۱] علم اور تعلم کی صفت کسی اور مخلوق میں نہیں ہے۔ یہ صفت صرف آدم علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کی اولاد کو اللہ نے عطا فرمائی ہے۔

ایک ہے علم ہونا اور ایک ہے علم ہونے کے بعد دوسروں کو پڑھانا، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اتنا شرف عطا فرمایا کہ وہ ملائکہ اور جنات سے بھی افضل قرار پا گئے۔ علم اور تعلیم یہ سب سے بڑا اشرف ہے۔ اور پھر علم میں اعلیٰ علمِ دین ہے۔ دنیا کے جتنے بھی علوم ہیں آپ حاصل کریں ان کا ایک مرتبہ ہے، لیکن سب سے اعلیٰ مرتبہ علم کا یہ ہے کہ علم سے اس خالق اور مالک کو پہچانے جس نے اس کو پیدا کیا ہے اور اس کے بعد وہ اس کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کو پہچانے، کیونکہ اگر اللہ کا خالق ہونا پہچان لیا، لیکن اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کو نہ پہچانا، اللہ نے جو احکام جاری کیے ان کو نہ جانا اور ان کے اوپر عمل نہ کیا تو یہ علم کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ تو انسان کو اللہ نے افضل اس لیے بنایا کہ اس کو علم عطا فرمایا۔ قرآن مجید میں جہاں نبیوں کو علم دینے کا ذکر آیا ہے وہاں اللہ نے اس علم کی نسبت اپنی طرف کی ہے، جیسے:

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ﴾ [البقرۃ:۳۱]

اسی طرح فرمایا:

﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ﴾ [الانبیاء:۸۰]

اور......:

﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ [الکہف:۶۵]

معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کو براہِ راست اللہ کی طرف سے علم ملتا ہے۔ پھر اس علم ملنے کے کئی طریقے ہیں جو وحی کی

اقسام میں بیان ہو چکے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے سینے میں تمام چیزوں کا القاء فرما دیا۔

اور بعض علماء نے فرمایا کہ اللہ نے پڑھایا تو ملائکہ بھی موجود تھے، لیکن ملائکہ استعداد نہ ہونے کی وجہ سے اس علم کو سمجھ نہ سکے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقاہت:

جیسا کہ ایک مثال بڑی مشہور ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاذ حضرت امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے...... وہ بہت بڑے امام تھے اور بہت بڑے محدث تھے۔ امام صاحب جن کے شاگرد ہوں استاذ کتنا بڑا ہوگا...... تو ایک آدمی نے آ کر مسئلہ پوچھا تو حضرت امام صاحب کے استاذ نے فرمایا کہ اس وقت مسئلہ میرے ذہن میں حاضر نہیں ہے...... اور یہ عالم کی شان ہوتی ہے کہ مسئلہ نہ آئے تو کہہ دے کہ مجھے نہیں آتا۔ یہ علم نہیں ہوتا کہ نہ آئے تو غلط بتلا دے اور قیامت تک اس کے گناہ کو اپنے سر پر لے لے...... تو انہوں نے فرمادیا کہ مجھے اس وقت اس مسئلے کا استحضار نہیں ہے۔ حضرت امام صاحب ساتھ بیٹھے تھے، استاذ سے اجازت لی کہ اگر اجازت ہو تو میں بتادوں؟ انہوں نے فرمایا: ٹھیک ہے، تم بتلا دو۔ امام صاحب نے جب اس مسئلہ کو سمجھایا، استاذ ناراض ہوئے کہ کیسے مسئلہ بتا رہے ہو؟ تمہارے پاس اس پر حدیث مبارک سے کوئی دلیل ہے؟ یا خود اپنے سے ایک مسئلہ بیان کر رہے ہو؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: حضرت! فلاں حدیث مبارک ہے، آپ نے ہمیں سبق میں پڑھائی تھی۔ یہ حدیث ہے اور یہ مسئلہ ہے۔ استاذ صاحب نے جب سنا تو بڑے خوش ہوئے!!! اسی طرح جب دو چار دفعہ مسائل آئے اور آپ نے بتلائے اور حدیث مبارک کا استدلال پیش کیا تو استاذ صاحب بڑے خوش ہوئے اور فرمایا: خدا کے بندے! تم یہ کیسے سمجھ لیتے ہو؟ حالانکہ حدیثیں تو میں نے تمہیں پڑھائی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت! آپ تو محدث ہیں، آپ کا کام تو پڑھانا ہے اور ہمارا کام اس کے اندر کھوج لگانا ہے اور مسائل کا استنباط کرنا ہے۔ ہم مسئلہ تو اسی سے سمجھتے ہیں جو حدیث آپ ہمیں پڑھا رہے ہیں، ہم مسئلہ اپنے سے نہیں بتا سکتے۔

[الخیرات الحسان، ص: ۱۶۰، جامع بیان العلم وفضلہ ۲/ ۲۵۷]

کوئی امام...... نعوذ باللہ...... اپنے گھر سے کیسے مسئلہ بتا سکتا ہے؟ فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن پاک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمجھا تو ان سمجھنے والوں کی سمجھ میں فرق تھا، تابعین کا دور آیا تو ان میں سمجھنے والوں کی سمجھ

میں بھی فرق تھا اور تبع تابعین کا دور آیا اور جن لوگوں نے صحابہ ﷺ کا دور دیکھا تھا ان کو مسائل کو سمجھنے کا ملکہ حاصل ہوا تھا، وہ بات کسی اور کو حاصل نہیں ہوسکتی۔

بدھ کے دن نور پیدا کیا گیا:

ابوجعفر رازی رحمہ اللہ نے ابوالعالیہ رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ بھی نقل فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو بدھ کے دن پیدا فرمایا۔ اسی کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ نے نور بدھ کے دن پیدا فرمایا اور اسی کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ نے نور بدھ کے دن پیدا فرمایا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۰، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

تعلیمی کتاب کو بدھ کے دن شروع کرنا:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے یہ قول ملتا ہے کہ اگر کوئی علم کی چیز ہو، یعنی قرآن، حدیث یا علم دین تو اس کو اگر بدھ کے دن شروع کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرماتے ہیں۔ اور اس میں ان لوگوں پر رد بھی ہے جو بدھ کے دن یا منگل کے دن کو منحوس سمجھتے ہیں، حالانکہ اس دن تو اللہ نے نور پیدا فرمایا، اس دن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ملائکہ کو پیدا فرمایا۔ تو چونکہ علم بھی ایک نور ہے تو نور کو اس نور سے ایک مناسبت ہوتی ہے۔

شادی بیاہ میں مسلمانوں میں ہندوانہ رسم ورواج:

اس وجہ سے بزرگوں نے کہا کہ ایک تو لوگوں کے دماغ سے وہ رسم بد نکلے کہ بدھ کا دن منحوس ہے یا منگل کا دن منحوس ہے یا...... نعوذ باللہ...... صفر کا مہینہ یا محرم کے دنوں میں شادی نہیں کرنی چاہیے۔ اصل میں مشکل یہ ہے کہ یہ سب جاہلانہ عقیدے ہیں، جو حضور ﷺ سے پہلے کفار کے عقیدے تھے اور ہمارے ملک میں بدقسمتی سے یہ ہندوؤں سے نقل ہوئے ہیں، کیونکہ مسلمانوں کی جو زیادہ تر معاشرت رہی ہے وہ ہندوؤں کے ساتھ رہی ہے کہ ہندو اور مسلمان مل کر رہتے تھے۔ تو جو ہندوؤں کے اندر رسمیں تھیں وہ مسلمانوں میں آگئیں۔ اب اتنا رواج پڑ گیا، اتنی مجبوری بن گئی کہ پڑھے لکھے لوگ اس کو غلط بھی سمجھتے ہیں، لیکن پھر بھی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے، لیکن باپ دادا سے یہ رسمیں چلی آرہی ہیں۔ آپ شادی میں، غمی میں، موت میں اور کسی بچے کے پیدا ہونے میں، تمام معاملات میں دیکھیں! بعینہ وہی رسمیں ہیں جو ہندوؤں کے اندر ہیں۔ وہ رنگ ڈالتے ہیں، یہ رنگ ڈالتے ہیں۔ وہ

لوہے کے بید پکڑتے ہیں، یہ بھی لوہے کے بید پکڑتے ہیں۔ وہ سرخ دھاگے ہاتھوں میں باندھتے ہیں، یہ سرخ دھاگے ہاتھوں میں باندھتے ہیں اور اسی طریقہ سے وہ دولہا کو گھوڑی پر بٹھا کر لے آتے ہیں...... جو ساری زندگی گدھا پر بھی نہ بیٹھا ہو شادی والے دن اس کو گھوڑا یاد آجاتا ہے...... اس کو بڑی کلاہ والی پگڑی باندھ کر اس کے گلے میں پھول ڈالیں گے اور اس کو تاج پہنائیں گے کہ آگے پھول لٹکے ہوئے ہوں گے، چونکہ دلہن تو پردہ نہیں کرتی تو اب دولہا کو پردہ کرادیتے ہیں۔ اسی طرح دولہا کے ساتھ ایک چلنے والا ہوگا۔ یہ بڑی عجیب عجیب رسمیں ہوں گی! یہ تمام کفر کی رسمیں ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کا دین محمد عربی ﷺ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے اور سنت ہے کہ جو دولہا ہے اچھے کپڑے پہنے، اچھا لباس پہنے جو اللہ نے اس کو عطا فرمایا ہو، اسی طرح دلہن کے لیے اس کے سنگھار کا سامان خریدے، اس کے میک اپ کے لیے جو ضرورت ہو وہ دینا، یہ سب چیزیں سنت ہے، کوئی منع نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں جو آج کل جہیز کی رسم ہے کہ جب لڑکے کی شادی کرتے ہیں تو لڑکے والے شرط کرتے ہیں کہ ہم آپ کی لڑکی اس شرط پر قبول کریں گے کہ آپ گاڑی دیں گے، فریزر دیں گے اور فلاں سامان دیں گے، یعنی لڑکے کی قیمت لگاتے ہیں۔

یہ بالکل حرام ہے، اس کا لینا بھی حرام ہے، استعمال کرنا بھی حرام ہے، بلکہ یہ ایک قسم کی رشوت ہے۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت بھیجی ہے کہ بھائی! آپ کس بات کا عوض لے رہے ہیں؟ کہ لڑکی بھی دیں اور جہیز بھی دیں، ورنہ یہ ہے کہ کوئی اچھا لڑکا رشتہ نہیں کرے گا، اچھا لڑکا نہیں ملے گا تو اب والدین مجبور ہیں کہ وہ اپنی بیٹیاں بھی دیں اور جہیز بھی مہیا کریں۔ اس لیے علماء نے لکھا کہ یہ رشوت کے ضمن میں آتا ہے۔ لینے والا بھی لعنتی ہے اور دینے والے بھی لعنتی ہیں۔ حالانکہ شریعت میں حق یہ ہے کہ لڑکا لڑکی کو حق المہر دے، اسی طرح شریعت یہ بھی کہتی ہے کہ لڑکے والوں کو اگر اللہ نے توفیق دی ہو تو وہ لڑکی کے والدین کی بھی مدد کرسکتا ہے۔ اگر وہ غریب ہیں اور یہ لڑکا امیر ہے تو جہاں لڑکی کو حق المہر دے وہاں اس کے والدین کی بھی مدد کرے تو یہ سنت ہے۔ اور ہمارے ہاں بالکل الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ یہ تمام بدعات ہیں اور احداث فی الدین ہیں۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا:

((إِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ، فَإِنَّهَا ضَلَالَةٌ))

''تمام محدثات سے بدعات سے بچا کرو کہ بدعت کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے۔''

[سنن الترمذی، حدیث:۲۶۷۶ بَابُ مَا جَاءَ فِي الْأَخْذِ بِالسُّنَّةِ وَاجْتِنَابِ الْبِدَعِ]

اور بدعت سے ہی آدمی کفر کی طرف جاتا ہے۔ بہرحال عجیب عجیب رسمیں ہیں۔ اللہ پاک مسلمانوں کو پناہ عطا فرمائیں اور ہدایت عطا فرمائیں۔

فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو بدھ کے دن پیدا فرمایا، جنات کو خمیس کے پیدا فرمایا اور آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن پیدا فرمایا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۱، البقرة، الآیۃ: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ]

امام باقر رحمہ اللہ کی طرف منسوب ایک روایت:

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابوجعفر محمد بن علی بن حسین رحمہ اللہ سے، یعنی امام باقر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: سجل ایک فرشتہ ہے۔ ہاروت اور ماروت بھی اس کی جماعت میں سے تھے اور اس کو اجازت تھی کہ وہ تین دفعہ تین وقت میں ام الکتاب میں نظر ڈال سکتا تھا جتنا کہ اس کو اجازت تھی۔ ایک دن اس نے زیادہ نظر ڈالی تو اس کتاب میں دیکھ لیا کہ اللہ آدم علیہ السلام کو پیدا فرمائیں گے، ان کی اولاد ہوگی اور ایسے ایسے حالات ہوں گے تو اس نے اس بات کو چھپایا اور رازداری سے ہاروت اور ماروت کو بتلایا، چونکہ وہ اس کی جماعت میں سے تھے۔ جب اللہ نے فرمایا ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ [البقرة: ۳۰] کہ میں زمین میں خلیفہ بنانا چاہتا ہوں، انہوں نے چونکہ ام الکتاب میں پڑھا ہوا تھا، اس لیے ملائکہ پر اپنا زیادہ علم ظاہر کرنے کے لیے یہ بات کی۔

لیکن یہ بات بالکل غلط ہے۔ ایک تو امام باقر رحمہ اللہ سے یہ بات نقل کرنا ہی صحیح نہیں۔ اور مفسر فرماتے ہیں: اگر واقعی یہ روایت صحیح ثابت ہو جائے کہ حضرت ابوجعفر باقر رحمہ اللہ نے یہ بات کہی ہے تو پھر ہم یہ سمجھیں گے کہ انہوں نے اہل کتاب کی کسی کتاب میں یہ قول دیکھا ہوگا، لیکن اصل یہ ہے کہ یہ ان کی گھڑی ہوئی ہے، وہ ساری روایتیں اس طرح نقل کرتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۱، البقرة، الآیۃ: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ]

ہاروت اور ماروت کا من گھڑت قصہ:

جیسا کہ ہاروت اور ماروت کے قصہ میں انہوں نے گھڑا ہے کہ ایک عورت تھی اور اللہ نے ان کو امتحان میں ڈالا اور پھر اس عورت نے ان کو کہا کہ یا تو تم قتل کرو اور قتل نہیں کرتے ہو تو زنا کرو۔ انہوں نے قتل سے بھی انکار کیا اور زنا سے بھی انکار کیا تو اس نے کہا: چلو شراب پی لو۔ انہوں نے شراب پی لی تو شراب پی کر انہوں نے زنا بھی کر لیا اور ایک بت تھا اس کو سجدہ بھی کر لیا۔ اور ہاروت اور ماروت نے اس عورت کو اسم اعظم سکھلایا تھا۔ وہ اسم اعظم پڑھنے

سے آسمانوں پر چلی گئی تھی، زہرہ بن گئی۔ یہ سارے ان کے گھڑے ہوئے قصے ہیں۔ نہ تو ان کی کوئی اصل ہے اور نہ کوئی حقیقت ہے، نہ کوئی واقعہ ہے۔ بس ان کو ایک لفظ ہاروت اور ماروت ہاتھ آ گیا تو اگلا انہوں نے خود گھڑ لیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۳۸، البقرۃ، الآیۃ: وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ...]

اس معاملے میں بڑے یہودی بادشاہ ہیں، جھوٹی روایات گھڑنے کے استاذ ہیں۔ یعنی جھوٹ سے بڑی سے بڑی کتابیں لکھ ڈالیں گے اور پھر اس کو فوراً بعد انکار بھی کر دیں گے کہ ہم تو نہیں مانتے۔ اور پھر جب ان پر کوئی دباؤ ڈالا جائے گا تو کہیں گے کہ ہاں انکار تو ہم کر رہے تھے، لیکن ہم نے تکیہ کیا تھا۔ تو اس لیے یہ بھی روایت ان کی گھڑی ہوئی ہے کہ ام الکتاب میں انہوں نے دیکھ لیا، جبکہ اللہ نے خود فرمایا ﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ [البقرۃ: ۳۰] تو ان کو دیکھنے اور ام الکتاب کے کھولنے کی ان کو کیا ضرورت پڑ گئی؟

اسرائیلی روایات اور ان کی تردید:

مفسر فرماتے ہیں کہ اس روایت میں یہ آتا ہے کہ ان دو فرشتوں نے صرف یہ بات کی ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا﴾ [البقرۃ: ۳۰] تو یہ بات بھی غلط ہے، کیونکہ ملائکہ جمع کا صیغہ ہے اور اللہ نے ان کو خود فرمایا۔ جب نص قطعی میں ایک بات موجود ہے کہ رب نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں تو پھر کتابوں میں دیکھنے اور چوری سے علم حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ چوری سے تو وہ علم حاصل ہو جو اور کسی کو حاصل نہ ہو، جبکہ اللہ نے تو سب ملائکہ کو فرما دیا تھا۔ ایک اور روایت میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ جب اللہ نے ﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۳۰] فرمایا تو دس ہزار فرشتوں نے یہ بات کہی۔ جب انہوں نے پروردگار پر یہ اعتراض کیا تو ایک آگ نکلی جس نے ان کو جلا ڈالا۔ یہ بھی ساری اسرائیل منکر روایات ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۱، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ]

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب تک اللہ خود ہمیں خبر نہ دیں تو کون ہے جو وہاں کیلکولیٹر لے کر کھڑا تھا کہ دس ہزار فرشتوں نے یا اتنی تعداد نے یہ جواب دیا۔ ایسی باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے مفسرین کا ایک اصول ہے کہ اللہ نے جن چیزوں کو قرآن میں مبہم رکھا ہے، یعنی خود نہیں بیان کیا، تم ان کو کھولنے کے پیچھے نہ پڑو، کیونکہ اگر ان کے پیچھے پڑو گے تو ٹھوکروں کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ انتہاء جا کر یہ ہوگی کہ آخر کار انکار کرنا پڑے گا کہ میں

نے بے سود محنت کی ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنی کتابیں اتاری ہیں انسانوں کی ہدایت کے لیے ہیں۔ تو جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنی اللہ تعالیٰ کھول دیتے ہیں اور جس چیز کے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ بیان ہی نہیں فرماتے۔

دیندار لوگوں کی کیا صفات ہونی چاہئیں؟

جیسے حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ لوگ مثال دیتے ہیں کہ یہ دنیا دار اور ہم دیندار ہیں تو وہ فرماتے تھے کہ یہ مثال ہی سرے سے غلط ہے کہ پیسے والوں کو، سرمایہ داروں کو، جاگیرداروں کو اور زمینداروں کو آدمی دنیا دار سمجھے اور پیر کو، مولوی کو اور طالب کو دیندار سمجھے۔ یہ مثال ہی غلط ہے، کیونکہ دار کا معنی ہے کہ جو ہر وقت دنیا کا طالب ہو۔ ان میں جو ہماری طرف آتے ہیں اصل دیندار تو وہ ہیں جو دنیا کے باوجود دین کے متلاشی ہیں اور ہمارے جب دنیا والوں کے پیچھے بھاگتے ہیں دنیا دار تو اصل ہم ہیں کہ ہم ان کے پیچھے جا رہے ہیں، اپنے علم کو بیچ رہے ہیں، اپنی عزت کو بھی داؤ پر لگا رہے ہیں اور اپنے وقار کو بھی خراب کر رہے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ کا بادشاہ کے بچوں کو گھر پر نہ پڑھانے کا واقعہ:

امام مالک رحمہ اللہ سے بادشاہِ وقت نے کہا: مہربانی فرمائیں! میرے بچوں کو علم پڑھا دیں، یعنی دنیا کا کام بھی نہیں کہا، بلکہ دین کا کام کہا کہ مہربانی فرما کہ میرے بچوں کو مؤطا امام مالک پڑھا دیں اور اس کام کے لیے اتنی تکلیف فرمائیں کہ محل میں کسی جگہ بیٹھ کر پڑھا دیں، کیونکہ بادشاہ کے بچے ہیں، شہزادے ہیں۔ اب اگر وہ ادھر آئیں گے تو ان کے لیے پہرے کا انتظام اور حفاظت کا انتظام مسئلہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ علم کے پاس لوگ آتے ہیں، علم کسی کے دروازے پر نہیں جاتا۔ فرمایا: جس کو پیاس ہوتی ہے پیاسا کنواں کے پاس آتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ کنواں پیاسے کے پاس جائے؟ بادشاہ نے کہا: بات تو ٹھیک ہے تو اس نے کہا کہ اچھا حضرت! آپ اتنی مہربانی فرمائیں کہ میں اپنے لڑکوں کو پابند کروں گا اور ان کی حفاظت کا انتظام کروں گا، لیکن جب آپ یہاں اپنے مدرسے میں سبق دیں تو ان کو علیحدہ بٹھا دیں، دوسرے طالب علموں میں نہ بٹھائیں، کیونکہ آخر وہ بادشاہ کے بیٹے ہیں، لوگوں کی سطح پر اتر کر بیٹھیں گے تو مسئلے پیدا ہوں گے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: علم تقسیم نہیں ہوسکتا، یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ میں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا رہا ہوں اور اس میں کہوں کہ بڑا آدمی تو بیٹھے اور غریب نہ بیٹھے۔ جب

حضور ﷺ بیان فرماتے تھے تو جہاں ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم بیٹھے تھے تو وہاں ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی بیٹھتے تھے، کہیں اور کبھی حضور ﷺ نے نہیں فرمایا کہ تم علیحدہ پڑھو اور تم علیحدہ پڑھو۔ میں نبی پاک ﷺ کی حدیث کو کیسے تقسیم کرسکتا ہوں؟

اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ علم کی عظمت قائم ہوتی تھی، ورنہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں تھی۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ وہیں جا کر بھی پڑھا سکتے تھے۔ اگر آپ تشریف لے جاتے اور پڑھا دیتے تو شرعاً کوئی منع بھی نہیں تھا، لیکن عظمتِ علم کے خلاف ایک بات بنتی تھی کہ ان کے دلوں میں جو علماء کا احترام ہے وہ ختم ہوجائے گا، اس لیے حضرت امام مالک رحمہ اللہ اپنی بات پر اڑ گئے۔ چنانچہ وہ دونوں شہزادے امام مالک رحمہ اللہ کے پاس اسی عام مجلس میں ہی حدیث پڑھا کرتے تھے۔

حضرت لاہوری رحمہ اللہ کا صدر ایوب کے بیٹے کا نکاح پڑھانے کا واقعہ:

اور ہمارے اپنے دور کی بات ہے کہ صدر ایوب کے بیٹے کی شادی تھی یا کسی اور کی، بہر حال مجھے پورا یاد نہیں ہے۔ حضرت لاہوری رحمہ اللہ کی خدمت میں گورنر کالا باغ کو بھیجا اور ان کے ذمہ لگایا کہ حضرت لاہوی رحمہ اللہ میرے لڑکے کا نکاح پڑھادیں۔ حضرت لاہوری رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس نے کہا کہ صدر صاحب کی یہ تمنا ہے کہ آپ اس کے بچے کا نکاح پڑھادیں۔ آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ شریعت کا مسئلہ ہے، میں انکار نہیں کرتا، لیکن میری چند شرائط ہیں۔ اس نے پوچھا: کیا ہیں؟

1 ......آپ نے فرمایا کہ میں اپنی سواری پر آؤں گا اور اپنی سواری پر واپس جاؤں گا، سرکاری گاڑی پر نہیں بیٹھوں گا۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

2 ......دوسری شرط یہ ہے کہ میں وہاں جب بیٹھوں تو مجھے کھانا پانی، یا پینے کے لیے بوتل یا چائے وغیرہ پیش نہیں کریں گے، کیونکہ آپ پیش کریں گے، میں نہیں پیوں گا تو بدمزگی ہوگی، اس لیے بہتر ہے کہ آپ پیش ہی نہ کریں۔

3 ......تیسری شرط یہ ہے کہ میں جب آؤں تو مجلس بالکل تیار ہو اور میں بیٹھتے ہوئے خطبہ شروع کردوں۔ میں اس کے بعد زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔

4 ......اور چوتھی شرط یہ ہے کہ میں نکاح پڑھانے پر کچھ لوں گا نہیں، جیسا کہ ایک رواج ہے کہ نکاح پڑھانے

کے بعد قاضی کی خدمت میں ہدیہ پیش کیا جاتا ہے، وہ بھی نہیں لوں گا، کیونکہ آپ اگر دینے کی کوشش کریں گے تو میں لوں گا نہیں تو پھر بھی آپ کی مجلس میں بدمزگی ہوگی، اس لیے بہتر ہے کہ میں یہ شرائط پہلے آپ کو پیش کر دوں اور آپ صدر صاحب کو بتلا دیں۔ اگر انہیں قبول ہے تو فقیر حاضر ہے، ورنہ سلام علیکم...... مجھے کیا ضرورت ہے؟ تو انہوں نے ساری شرطیں قبول کر لیں۔

چنانچہ حضرت سائیکل چلا کر تشریف لائے، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی، رکشہ پر بھی آسکتے تھے، ٹیکسی بھی کرایہ پر لے سکتے تھے، لیکن اپنے فقر کی عظمت کو بحال رکھنے کے لیے اور علماء کی عزت کو بحال رکھنے کے لیے کہ سائیکل بھی صدر ہاؤس میں جا سکتی ہے۔ یہ نہ سمجھیں کہ یہاں قیمتی گاڑیاں کھڑی ہوسکتی ہیں، وہاں غریبوں کا سائیکل نہیں کھڑا ہوسکتا۔ تو حضرت سائیکل چلا کر آئے اور اس سے اتر کر مجلس میں بیٹھے اور خطبہ شروع فرما دیا۔ نکاح فرمایا اور اس کے بعد دعا کی اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ واپس آئے تو وہ گورنر پیچھے دوڑتے آئے اور صدر دوڑتے آئے کہ حضرت! چلو سلام علیکم کی اجازت تو دیں۔ فرمایا: شریعت کا جتنا کام تھا وہ میں نے کر دیا۔ اس کے بعد مجھے آپ سے ہاتھ ملانے کی نہ کوئی خوشی ہے اور نہ مجھے کوئی فرحت ہے، بلکہ مجھے یہ یقین ہے کہ میں جتنی دیر آپ سے ملوں گا اتنی دیر دل پر سیاہی ہوگی، اتنا مجھ پر کدورت کا اثر ہوگا، کیونکہ کسی فاسق سے ہاتھ ملانے میں کون سی خوشی ہوسکتی ہے؟ آپ لوگ شریعت کے کھلے مخالف ہیں، بس کلمہ پڑھتے ہیں کہ مسلمان ہیں، اس لیے میں نے نکاح پڑھا دیا۔ بس بات ختم ہوگئی اور سائیکل چلا کر واپس آ گئے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا واقعہ:

یہ تو اب کی باتیں ہیں، پرانے دور کی بھی نہیں ہیں۔ اسی طرح سارے ملتان کو پتہ ہے کہ شاہ جی موجود تھے اور اس وقت سکندر مرزا آیا۔ اس نے خود خواہش کی کہ کوئی ایسا سبب بنا دیا جائے کہ میں ملتان آرہا ہوں تو شاہ جی سے ملاقات ہو جائے...... تو ڈاکٹر تاثیر تھے جہاں تک مجھے یاد ہے ان کو شاہ جی سے بڑی محبت تھی، یا مظفر علی شمسی تھا تو وہ رفض کی طرف مائل تھا، لیکن ختم نبوت کے معاملے میں حضرت شاہ جی کے ساتھ تھا۔ مجھے یاد آ گیا، وہ مظفر علی شمسی تھا وہ روافض کا بہت بڑا مولوی تھا، اس وقت وہ ختم نبوت کے مسئلے پر حضرت شاہ جی کا بڑا ساتھی تھا، کیونکہ مولوی لوگ جلدی ڈھال لیتے ہیں...... تو اس کے ذمہ لگایا گیا کہ آپ کسی طرح مجلس بناؤ اور شاہ جی کو راضی کرو اور ایسے

حالات پیدا کرو کہ شاہ جی آ جائیں تو ملاقات ہو جائے۔

خیر! مظفر علی شمسی آیا، شاہ جی اپنے غریب خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بڑا تیز آدمی تھا، لیڈر تھا اور خطیب قسم کا بندہ تھا۔ اس نے پہلے شاہ جی کا ادھر ادھر موڈ بنایا، تاکہ طبیعت ذرا ہموار ہو جائے۔ شاہ جی جب ٹھیک ٹھاک اپنے مزاج پر آئے، خوش ہوئے اور چائے پلائی تو کہنے لگا کہ شاہ جی! ہم تو آپ کے لیے جیلیں بھی کاٹتے رہے، ہم تو آپ کے لیے ہر تکلیف برداشت کرتے رہے، آپ بھی کبھی ہمارا لاڈ برداشت کریں گے کہ نہیں کریں گے؟ حضرت نے فرمایا: تم چھوڑو، کیا نخرے کر رہے ہو؟ اتنی بڑی تمہید کی کیا بات ہے؟ تم کہو۔ تو اس نے کہا کہ سکندر مرزا کی خواہش ہے کہ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مہربانی فرمائیں تو میری بھی لاج رہ جائے گی، میں نے وہاں ناز کر لیا کہ میں شاہ جی کو لے آؤں گا۔ تو اصل بات آپ کے ملنے یا نہ ملنے کی نہیں ہے، اب تو میری عزت کا سوال ہے، میری لاج رکھ لیں۔ تو فرمایا: شمسی! بات سنو! اگر وہ فقیر کی کٹیا پر چل کر آ جائے تو اس کی عزت بڑھ جائے گی اور اگر فقیر وہاں چلا گیا تو میرا تو سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ کیا تم مجھے برباد کرنے آئے ہو؟ فقیر اس کے دروازے پر کیوں جائے؟ اگر اس کی عزت بڑھانا مقصود ہے تو اس سے اس کی اور زیادہ عزت بڑھے گی۔ جب وہ یہاں آئے گا، لوگ کہیں گے کہ صدر ہو کر فقیر کی کٹیا پر گیا تھا اور وہاں شاہ جی کے پاس نمک کی چائے پی تھی تو بھائی! تم اس کو فقیر کی کٹیا پر لے کر آؤ۔ فقیر کو کیا پڑی ہے کہ وہاں جائے؟ میرا سب کچھ برباد کرانا چاہتے ہو؟ ساری زندگی خدا کے سوا کسی کو فدوی نہیں لکھا، ساری زندگی اللہ کا بھکاری بن کر رہا ہوں۔ تم مجھے صدر کے دروازے پر لے کر جانا چاہتے ہو، کوئی عقل کی بات کرو۔ تو وہ چھوٹا سا منہ لے کر نکل گیا۔ تو یہ علماء کی عزت اور عظمت کا دور تھا۔

اصل تفسیر کی طرف عود:

اور ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ نے فرشتوں کو یہ بات بتائی تو انہوں نے یہ بات بطور تعجب کی تھی کہ کیسے وہ آپ کی نافرمانی کریں گے اور کیوں کریں گے؟ تو اللہ نے فرمایا ﴿إِنِّيٓ أَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُونَ ۝﴾ [البقرۃ: ۳۰]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا ارادہ فرمایا اور ملائکہ پر ظاہر فرمایا تو ملائکہ سوچنے لگے کہ ہم سے بھی زیادہ عزت والی مخلوق اللہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ ہم معصوم ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کرنے والے ہیں۔ جب انہوں نے ایسی بات کی تو امتحان میں ڈال دیے گئے، کیونکہ

جب کوئی بھی ذرہ فخر کرے تو امتحان تو آجاتا ہے، اسی لیے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق ایسی پیدا نہیں فرمائی جس پر کوئی امتحان نہ آیا ہو، جیسا کہ آسمان اور زمین پر بھی ابتلاء آئی، اللہ نے ان کو فرمایا:

﴿ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا ۖ قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ⑪﴾ [فصلت: ۱۱]

حضرت عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے معمر رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا کہ ﴿نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ﴾ [البقرۃ: ۳۰] میں تسبیح سے مراد اللہ کی پاکی بیان کرنا، یعنی ''سُبْحَانَ اللهِ... اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' مراد ہے اور اسی طرح تقدیس سے مراد اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا، یعنی نماز پڑھنا مراد ہے۔

﴿نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ﴾ [البقرۃ: ۳۰] کے معنی ہیں ایک قول یہ بھی ہے ''نَحْنُ نُصَلِّي لَكَ'' ہم آپ کی نماز پڑھتے ہیں۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: تسبیح و تقدیس کا معنی ہے کہ ہم تیری عظمت و بڑائی کا اعتراف کرتے ہیں۔

حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: تقدیس کا معنی تطہیر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمام صفاتِ نقصان سے پاک ہے۔

محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے معنی کیا کہ ''لَا نَعْصِي'' ہم تیری نافرمانی نہیں کرتے، ہم ایسا کام ہی نہیں کرتے جو آپ کو ناپسند ہو، یعنی تسبیح و تقدیس یہ نہیں کہ زبانی وکلامی کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں بھی کرتے رہو۔

مفسر ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: تقدیس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی عظمت اور اس کی ذات کی پاکی کا اقرار کرنا۔ اسی لیے فرشتے کہتے ہیں ''سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ'' یعنی اس کی تنزیہ بیان کرتے ہیں کہ وہ تمام قسم کے شریکوں سے پاک ہے۔ ''قُدُّوْسٌ'' یعنی تعظیم کے لائق بھی وہی ہے تو ﴿نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ﴾ [البقرۃ: ۳۰] کا معنی یہ ہوا کہ اے میرے مولیٰ! ہم تیری تنزیہ بیان کرتے ہیں اور تیری عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۱، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضرت ابی ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ''أَيُّ الْكَلَامِ أَفْضَلُ؟'' (کون سا وظیفہ یا کون سا کلام پڑھنے میں زیادہ افضل ہے؟) حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَا اصْطَفَى اللهُ لِمَلَائِكَتِهِ'' اللہ تعالیٰ نے جو اپنے ملائکہ کے لیے پسند فرمایا، یعنی ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سب سے افضل کلمات ہیں۔ اگر یہ افضل کلمات نہ ہوتے تو اللہ

اپنے فرشتوں کو نہ سکھلاتے۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۲۷۳۱، باب: فَضْلِ سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ]

اسی طرح امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے کہ میرے آقا ﷺ معراج کی رات آسمانوں پر تشریف لے گئے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں: میں نے خود فرشتوں کی تسبیح سنی جو پڑھ رہے تھے: ''سُبْحَانَ الْعُلٰى الْأَعْلٰى، سُبْحَانَ الْعُلٰى الْأَعْلٰى، سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰى'' آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تسبیح میں نے پڑھی ہے۔

[الجامع الکبیر للسیوطی، حدیث: ۱۳۱۸۱]

اللہ کی تسبیح کے کلمات:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری کو اس حدیث مبارک پر ختم فرمایا ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ'' کہ حضور ﷺ نے فرمایا: دو کلمات ایسے ہیں کہ زبان کے اوپر ان کے پڑھنے سے کوئی بوجھ نہیں ہوتا، کوئی ثقل نہیں ہوتا اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ اور فرمایا کہ دو کلمات ایسے ہیں جو رحمٰن کو بہت محبوب اور بہت پسند ہیں:

((كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ))

''رحمٰن کو بڑے محبوب ہیں، میزان میں بڑے بھاری ہیں اور زبان پر ہلکے ہیں۔''

اور وہ یہ ہیں:

((سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ))

[صحیح البخاری، حدیث: ۷۵۶۳، باب قَوْلِ اللهِ تَعَالٰى: وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ...]

حضور پاک ﷺ فرماتے ہیں: میں نے خود فرشتوں کی تسبیح سنی جو پڑھ رہے تھے:

((سُبْحَانَ الْعُلٰى الْأَعْلٰى، سُبْحَانَ الْعُلٰى الْأَعْلٰى، سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰى))

آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تسبیح میں نے پڑھی ہے۔

[الجامع الکبیر للسیوطی، حدیث: ۱۳۱۸۱]

اور اسی طرح ''سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ'' فقط یا ''سُبْحَانَ الْعُلٰى الْأَعْلٰى'' یا اسی طرح ''سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَاللهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ'' یا ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' یا ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى، سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوْحِ'' یعنی جن انداز میں اور جن صیغوں میں اللہ کی تسبیح بیان کی جائے تو یہ کلمات بڑے افضل

ہیں اور اللہ کو بڑے محبوب ہیں۔

آدمی کو چاہیے اور کوشش کرے کہ جو وظائف، جو کلمات اور جو ادعیات حضور ﷺ سے ثابت ہیں ان کے ساتھ دل لگائے، کیونکہ ان میں جو برکات اور ثمرات ہیں وہ دنیا کے کسی کلام میں نہیں ہوتیں۔

سفر کی ایک دعا اور اس کی اہمیت:

دو آیات قرآن شریف میں آتی ہیں:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۴۱﴾ [ھود: ۴۱]

اور دوسری آیت مبارک ہے:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝۶۷﴾ [الزمر: ۶۷]

اور اسی طرح ایک سفر کی دعا ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۝۱۳ وَاِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ۝۱۴﴾ [الزخرف: ۱۳، ۱۴]

اگر کوئی آدمی انہیں سات سات دفعہ پڑھ لے تو اللہ کی رحمت سے اسے کسی حادثہ میں نقصان نہیں ہوگا۔ اتنی بڑی بات ہے کہ تفسیر قرطبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول مبارک نقل فرمایا ہے کہ یہ ایک دعا اور یہ دو آیتیں جو آدمی سفر میں کم از کم تین دفعہ اور زیادہ سے زیادہ سات دفعہ پڑھ لے گا اگر وہ ایکسیڈنٹ میں مرجائے تو قیامت والے دن اس کی دیت اللہ کو میں ادا کروں گا۔

[الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۹/ ۳۷، ھود، الآیۃ: وَقَالَ ارْكَبُوْا فِیْهَا بِسْمِ اللّٰهِ...]

واقعہ:

ایک طالب علم نے مجھے خود سنایا کہ ہم ریاض کا سفر کر رہے تھے۔ اپنے استاذ کو ملنے کے لیے گئے کہ حضرت! ہم سفر پر جارہے ہیں، ہمارے لیے دعا کردیں تو فرماتے ہیں کہ ہمارے استاذ نے ہمارے لیے دعا بھی کی اور اس کے بعد یہ دعا بھی سکھلائی کہ یہ سفر کی دعا ہے اور یہ دو آیتیں ہیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ یہ دو آیتیں امان کی آیات ہیں میری امت کے لیے۔ تو جب تم گاڑی میں جہاز میں سفر کرو یا کسی جانور پر سفر کرو تو یہ دعا پڑھ لیا کرو۔

طلبہ کہتے ہیں کہ اس وقت ٹیکسیاں چلتی تھیں تو ان کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔ ہم نے یہ دعا پڑھ لی۔ راستے میں گئے تو اللہ معاف فرمائے! گاڑی ۱۶۰ کی رفتار سے چل رہی تھی اور اس کے ٹائی راڈ نکل گئے...... ۱۶۰ کلومیٹر کی رفتار سے گاڑی جا رہی ہو تو پورا ہوائی جہاز ہو گیا تو جب اس کے ٹائی راڈ نکل جائیں تو آپ کس سے کنٹرول کریں گے؟ اور روڈ کی جگہ ہے، آپ شارع عام پر جا رہے ہیں، سامنے سے گاڑیاں آ سکتی ہیں، پیچھے سے گاڑیاں آ سکتی ہیں...... لیکن فرماتے ہیں کہ ایسا قدرت کا نظام ہے کہ فوری طور پر ہم سب نے کلمہ شہادت پڑھ لیا، کیونکہ موت سامنے تھی، واضح بات تھی۔ اور ڈرائیور نے بتا دیا تھا کہ ٹائی راڈ نکل چکے ہیں، سب کلمہ پڑھ لیں، تاکہ خاتمہ ایمان پر ہو جائے۔ تو ہم نے کلمہ پڑھ لیا اور اس کے بعد ڈر کے مارے آنکھیں بھی بند کر لیں کہ ابھی مرنا ہے، بس سیکنڈوں کا فاصلہ ہے۔ اس طرح کرتے کرتے گاڑی ٹھہر گئی تو ہم نے اتر کر دیکھا کہ گاڑی سڑک کے آدھا کلومیٹر نیچے تک چلتی گئی، کیونکہ ریت تھی، چلتے چلتے بالکل سیدھی ریت اور کوئی گڑھا نہیں آیا۔ تو بڑے آرام سے گاڑی جا کر کھڑی ہو گئی۔

ڈرائیور جب اترا تو اس نے کہا کہ تمہارے اندر کوئی آدمی ضرور ہے جس نے کوئی دعا پڑھی ہے؟ ہم نے کہا: ہم کون سے اتنے بڑے پیر فقیر آ گئے۔ اس نے کہا کہ ایسے معاملات میں اللہ کے سوا کوئی بچانے پر قادر ہی نہیں ہو سکتا، اسباب تو بچا ہی نہیں سکتے۔ ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلا، بڑے آرام سے گاڑی رکی اور کسی کو دھکا بھی نہ لگا۔ ہم نے کہا ہم نے تو قرآن شریف کی یہ آیتیں پڑھی تھیں اور ہمیں کوئی پتہ نہیں ہے۔ حضور پاک ﷺ کی حدیث مبارک بھی ہے تو اللہ نے اپنے کلام کی برکت سے ہماری حفاظت فرمائی، یعنی یقین کامل ہو۔ اور میں نے بھی الحمدللہ...... کئی دوستوں کو حضور ﷺ کی یہ حدیث مبارک بتلائی، مجھے بھی کئی دوستوں نے پھر بتایا کہ ہمارے ساتھ ایسے ہوا اور ایسے ہوا۔ ہم نے دعا پڑھی تھی تو اللہ نے ہمیں محفوظ رکھا تھا۔ اب میں نے اس کو دعا کے طور پر چھپوایا بھی ہے، گاڑی پر لگا لیا ہے۔ آپ لوگ بھی اس کو چھپوا کر گاڑی اور اپنے گھر میں رکھ لیں۔

مخلوق میں خلیفۃ اللہ کا قیام ضروری ہے:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ إِنِّيٓ أَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُونَ ۝﴾ [البقرۃ: ۳۰]

''تحقیق میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔''

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اللہ کے علم میں چونکہ یہ بات موجود تھی کہ اس خلیفہ سے میں نبی و رسول پیدا کروں گا اور اس خلیفہ کی اولاد سے میں ایسی قومیں پیدا کروں گا جو عباد صالحین ہوں گے، اسی کی اولاد سے میں ایسے لوگ پیدا کروں گا جو جنت کو آباد کریں گے، لیکن فرشتوں کی ایک پہلو پر نظر تھی، لیکن مالک الملک جو علام الغیوب ہیں، عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہیں، ان کے علم میں تو ہر چیز تھی۔ اس لیے فرمایا: میں جانتا ہوں، تم نہیں جانتے۔

مفسر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت مبارکہ سے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ بندوں میں کوئی خلیفہ ہو، جو ان کے مسائل حل کر سکے، ان کے مظلوم کی مدد کر سکے، ظالم کو ظلم سے روک سکے، اگر کوئی گناہ کرے تو اللہ کی حدود جاری کر سکے، لوگوں کو برائی سے منع کرے اور امور مہمہ کو ادا کرے۔ یہ سارے مسائل خلیفہ کے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ جب یہ واجبات خلیفہ کے بغیر ادا ہی نہیں ہو سکتے تو ان کا ادا کرنا جس ذریعے سے ممکن ہو تو وہ واجب ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں میں امام ہو، امیر المومنین ہو اور خلیفۃ المسلمین ہو۔ اس کی باقاعدہ بیعت ہو، لوگ اس کی اطاعت کریں۔ اور اس خلیفہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ کی حدود اور اللہ کے احکام کو نافذ کرے۔ اسی کی برکات وثمرات ہوتی ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۲، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ]

اسلام میں خلیفہ کا انتخاب:

مفسر نے فرمایا کہ امامت یا تو نص سے ثابت ہو یا قرآن سے یا حدیث پاک سے۔ جیسے کہ علماء نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جو خلافت مبارکہ ہے تو گویا وہ بالکل ایسے ہے جیسے نص ہے، یعنی ایسے ہے جیسے ایک حکم قرآن پاک میں آجائے۔ یا نص کا معنی یہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ایک ایسی بات آجائے کہ جس کے اندر دو باتیں ہو بھی نہ سکتی ہوں۔ تو بعض حضرات تو اسی طرف گئے ہیں کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں اپنی زبان مبارک سے اور اپنے عمل مبارک سے ایک فیصلہ فرمادیا کہ ان کو اپنے مصلی پر کھڑا کردیا تو اس کے بعد سوچنے سمجھنے کی اور کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اور بعض نے فرمایا: ایسا تو نہیں، لیکن بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ تو کردیا۔ معنی یہ ہوتا ہے کہ جو پہلا خلیفہ ہو وہ کسی دوسرے کو خلیفہ بنادے، جیسا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے پہلے ارشاد فرمادیا کہ میرے بعد خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ہو۔ بس بات ختم ہوگئی، لوگوں نے اس بات کو قبول فرمالیا، یا یہ ہوتا کہ خلیفہ یہ کرے کہ ایک جماعت معین کردے کہ اتنے افراد کی جماعت ہے، یہ جس کو

چن لے تم اس کو منظور کر لو، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھ آدمی معین کر دیے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان چھ آدمیوں کا جو بھی فیصلہ ہو جائے، اس کو امت قبول کر لے۔ اس میں یہ بھی نصیحت فرما دی کہ میرا بیٹا بھی ان ٦ میں داخل ہے، لیکن اس کو نہیں بنانا۔ اس لیے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلافت اپنے بیٹے کو دے کر گئے تھے، ورنہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما شان والے صحابی ہیں۔ اور یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ ''اِتِّبَاعَ أَهْلِ الْحَلِّ وَ الْعَقْدِ'' یعنی جن کے ہاتھ میں باندھنا چھوڑنا ہو، جو علم والے، عظمت والے، شان والے، کسی پر بیعت کا اتفاق ہو جائے تو وہ بھی خلیفہ ہوگا۔

تو اسی طرح یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں کوئی آدمی جبراً ڈنڈے کے زور سے بھی خلیفہ بن جائے تو پھر اس کے بھی خلاف نہ کرو، کیونکہ خلاف کرو گے تو فتنہ اور فساد پیدا ہوں گے، اس لیے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے بادشاہ، اپنے حاکم اور امیر کے حکم کو سنیں اور اس کی فرمانبرداری کریں۔

اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی ایک کالے رنگ کا غلام (یعنی حقیر آدمی) تمہارا حاکم بن جائے، اس کی بھی تم فرمانبرداری کرو۔ [سنن أبي داود، حدیث: ٤٦٠٧] اگر فرمانبرداری نہیں کرو گے تو فتنے اور فساد پھوٹ پڑیں گے، کیونکہ اس کی فرمانبرداری کرو گے تو وہ کم فتنہ ہے۔ اگر اس کے خلاف بغاوت کرو گے تو جو فتنے ہوں گے وہ زیادہ خطرناک ہیں، اس لیے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایسی ایسی باتیں نہ کریں۔ اپنے امام، اپنے حاکم اور اولی الامر کی سمع اور اطاعت ضروری ہے۔ اس لیے قرآن نے بھی فرما دیا:

﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ﴾ [النساء:٥٩]

''اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔''

اولی الامر سے مراد بعض نے فرمایا کہ اپنے علماء اور بعض نے فرمایا کہ حکام کی اطاعت کرو۔ پہلے تو...... الحمد للہ...... یہ ہوتا تھا کہ حاکم بنتا وہی تھا جو...... ماشاء اللہ...... علم والا ہوتا تھا، کیونکہ یہ قاعدہ ہوتا تھا کہ جو بادشاہ اور امیر المومنین ہو جمعہ پڑھائے، عیدین کی نمازیں پڑھائے، قوم کو خطبات کرے اور قوم کو دین کے راستے پر لگائے۔ یہ تو اب ہمارے ہاں رواج آگیا ہے کہ جس کے پاس دولت ہو، پیسہ ہو اور دنیا ہو، بس وہ بڑا آدمی بن جاتا ہے اور جو صلاحیتوں والے ہیں ان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے، لیکن شریعت کا مسئلہ یہ نہیں ہے۔

آگے فرمایا کہ جب خلیفہ بنایا جائے تو اس کے لیے گواہوں کی بھی ضرورت ہے۔ تو بعض علماء نے فرمایا کہ ہاں دو آدمی گواہ ہوں: ایک تجویز کرنے والا اور ایک بننے والا ہو گیا۔ اور اسی طرح انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ٦ آدمیوں میں رکھا تھا: ایک عاقد حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ہو گئے اور ایک معقود بن گئے جن پر اتفاق کیا گیا، یعنی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور گویا کہ چار گواہ ہو گئے۔

[تفسیر ابن کثیر: ١/٧٢، البقرة، الآیة: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

مسلمانوں کے خلیفہ کے لیے چند شرائط:

مسلمانوں کا جو خلیفہ بنے اور بادشاہ بنے اس کے اندر کیا کیا شرطیں ہونا ضروری ہیں؟ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مرد ہو۔ اب تو مسلمان عورتوں کو بناتے ہیں۔ تو پہلی شرط یہ ہے کہ تمہارا امیر، خلیفہ اور بادشاہ مرد ہو۔ جب قوم نامرد ہو جائے تو مرد کیسے بنیں گے؟ مرد ہی مردوں کا خلیفہ بنتا ہے، عورتوں پر تو نہیں بنتا۔ تو جب قوم نامرد ہو جائے تو بات ختم ہو گئی۔ دوسری شرائط یہ ہیں کہ وہ غلام نہ ہو، نابالغ نہ ہو، پاگل نہ ہو، کافر نہ ہو، بالکل ٹھیک ٹھاک انصاف کرنے والا ہو، مسائل کے اندر اجتہاد کرنے والا ہو، مسائل کو سمجھنے والا ہو اور اس کے اعضا بھی سالم ہوں، یہ نہ ہو کہ لنگڑا لولا ہو کہ لوگ اعتراض نہ کریں کہ لنگڑا جا رہا ہے۔ اس کی بھی دلوں میں عظمت نہیں بیٹھتی اور جنگی امور کا ماہر ہو، تا کہ ملک کی بھی حفاظت کر سکے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بے عقل ہو اور کوئی کچھ کرتا رہے۔ اور اگر قریشی ہو تو زیادہ بہتر ہے، ہاشمی ہونے کی شرط نہیں ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ١/ ٧٢، البقرة، الآیة: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

خلیفہ کے لیے معصوم ہونے کی شرط درست نہیں:

البتہ مفسر فرماتے ہیں: ان کے نزدیک ایک اور بھی شرط ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ خلیفہ وہ بنے جو معصوم ہو، گناہگار نہ ہو۔ اور ان کی یہ بھی شرط ہے کہ معصوم عن الخطا ہو۔ تو وہ نبی کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ہمارے سب امام خطا سے پاک تھے، اس لیے انہوں نے ایک شرط اور بھی بڑھائی ہوئی ہے کہ وہ ہاشمی ہو، صرف قریشی نہ ہو، بلکہ قریش کے قبیلہ بنو ہاشم سے ہو۔ لیکن ہاشمی ہونے یا معصوم ہونے کی شرط صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ دنیا میں کوئی معصوم ملتا ہی نہیں، پھر تو دنیا میں کوئی مسلمانوں کا امیر ہی نہ بنے۔ معصوم عن الخطا تو صرف انبیاء علیہم السلام کی ذات ہے، اللہ کے نبی معصوم ہوتے ہیں، ورنہ خطا تو سب سے ہو جاتی ہے۔ اگر ایسی بات نہ

ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوجاتے کہ آپ حضرت فاطمۃ الزہراء کے بعد دوسری شادی فرمانا چاہتے تھے، آپ نے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور آپ نے معافی مانگ لی۔ تو معصوم سے تو غلطی ہو نہیں سکتی، معصوم کیسے غلطی کر سکتا ہے؟ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۲، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

واقعہ:

اسی طریقہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے آپ کو خدا بنایا تھا ان کو آگ میں جلوا دیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو ان کو آگ میں نہ جلانے دیتا، کیونکہ آگ کا عذاب اللہ دیتا ہے، بندے نہیں دیتے ہیں تو ان کو قتل کر دینا کافی سمجھتا۔ ان کو آگ میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو اب حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی معصوم نہ رہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کئی معاملات ہیں تو اس لیے معصوم ہونے والی شرط جو ہے تو چونکہ ان کے نزدیک بارہ امام ہی معصوم ہیں۔ اور یہ بڑا عجیب مذہب ہے! یہ کہتے ہیں کہ غار میں امام چھپا ہوا ہے امام مہدی، اس کے قائم مقام جو بن جائے وہ بھی معصوم بن جاتا ہے، وہ بھی پاک ہو جاتا ہے، جو مرضی آئے کرتا پھرے، اس لیے یہ اس کے حکم کو ٹال نہیں سکتے، کیونکہ ان کے نزدیک اس کا حکم ایسے ہوتا ہے جیسے قرآن کا حکم۔ اس لیے وہ جو حکم دے گا اس پر فوراً عمل کریں گے۔

بہرحال خلافت کے لیے اسلام کے اندر یہ شرائط ہیں کہ وہ مرد ہو، آزاد ہو، مسلمان ہو، عقل والا ہو، بالغ ہو، اسی طرح مسائل میں نظر رکھنے والا ہو، ہاتھ پاؤں کا سالم ہو، جنگی امور کا سمجھنے والا ہو، مجتہد ہو اور قریشی ہو۔ اگر قریشی نہ ملے تو پھر کسی اور کو لے سکتے ہیں۔ اسی طرح پھر یوں دیکھنا پڑتا ہے مثلاً چار آدمی آ گئے تو ان میں جو سب سے زیادہ شان والا ہوگا، اس کو مقدم کریں گے اور اگر اس کے اندر برابر ہوں تو ان میں جو عالم ہوگا اس کو مقدم کریں گے، اسی طرح اگر چاروں عالم ہیں تو پھر دیکھیں گے کہ کس کے اندر اجتہاد اور سمجھنے کی بصیرت زیادہ ہے؟ تو اس کو مقدم کریں گے۔ اگر اس میں بھی برابر ہیں تو پھر دیکھا جائے گا کہ جو عمر میں بڑا ہو اس کو حق دیا جائے، جو آدمی عمر میں زیادہ ہوگا وہ کم عمر والے سے زیادہ قابل احترام اور تجربہ کار ہوگا۔

اگر بادشاہ سے گناہ صادر ہو جائے تو معزول کر دیا جائے؟

اگر مسلمانوں نے بادشاہ بنایا یا خلیفہ بنایا، امیر بنایا وہ اگر فاسق ہو جائے، بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب

شروع کر دے تو کیا اس کو بادشاہت سے ہٹا دیں؟

تو مفسر فرماتے ہیں صحیح قول یہ ہے کہ نہیں ہٹایا جائے گا، کیونکہ کوئی انسان خطاؤں سے پاک نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا: کبھی اپنے امیر کا انکار نہ کرو۔ اگر وہ کوئی ایسا کام کرے جو کھلا ہوا کفر ہے اور اس پر تمہارے پاس کوئی دلیل بھی ہو۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۷۰۵۶] ایسے نہیں کہ لوگ کہہ دیں۔ لوگوں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں بھی الزام لگا دیتے تھے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر بھی الزام لگایا، لوگوں نے تو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ پر بھی الزام لگایا اور لوگوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر بھی الزام لگائے۔ لوگوں نے تو کسی کو بھی معاف نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی ایسا عمل ہو جو بالکل کھلا ہوا کفر ہو اور تمہارے پاس دلیل ہو تو ٹھیک ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۲، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

کیا اس بادشاہ کو یا امیر کو یہ بھی حق ہے کہ خود آپ کو ہٹا دے؟ مفسر فرماتے ہیں: جیسے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے خود استعفیٰ دے دیا، اپنا اقتدار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا، یہ بھی ایک طریقہ ہے، لیکن کہتے ہیں: اگر بادشاہ یا والی یا حاکم معزول ہو جائے، یعنی اس کو اتنا لاچار کر دیا جائے کہ وہ اب سمجھے کہ میں حکومت نہیں چلا سکتا، وہ اپنے آپ کو استعفیٰ کے لیے پیش کر دے تو ٹھیک ہے، جیسا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کیا اور اسی پر ان کی مدح ہوئی کہ...... الحمد للہ...... وہ مسلمانوں کے اندر صلح کا ذریعہ بن گئے، ورنہ قتال و فساد، لڑائیاں اور جھگڑے ہوتے، مسلمانوں کا قتل عام ہوتا۔ اللہ معاف فرمائے۔ ایک ملک کے اندر دو بادشاہ نہ بنائیں، بلکہ ایک ہی رہے، کیونکہ دو بنانے سے جھگڑے ہوں گے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۲، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]

حکومت کے خلاف بغاوت نہ کریں:

جیسا کہ حدیث پاک میں آیا کہ ایک جگہ مسلمانوں کا بادشاہ ہے، والی ہے اور امیر ہے، نظام چلا رہا ہے۔ اب دوسرا آ کر کھڑا ہو گیا کہ مجھے بناؤ تو ایسے آدمی کو کہ جب معاملہ چل رہا ہو اور نظام چل رہا ہو، اس کو آ کر توڑنے کی کوشش کرے، اس کو قتل کر دیا جائے، چاہے کوئی بھی ہو، کیونکہ وہ بغاوت پھیلانا چاہتا ہے۔ جب ایک آدمی والی بن گیا ہے، اس کو کام کرنے دیں، وہ اپنا کام اطمینان کے ساتھ کرے۔ اور اسی پر جمہور ہیں۔ کرامیہ ایک فرقہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ دو بادشاہ بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں حق پر تھے، حالانکہ خلیفہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں خلافت راشدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس تھی۔ اور انہوں نے

ایک استدلال یہ بھی کیا کہ جب ایک وقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ دو نبی بھیج دیتے ہیں تو جب دو نبی اکٹھے آ سکتے ہیں اور نبوت امامت سے بڑا درجہ ہے تو دو امام اکٹھے کیوں نہیں ہو سکتے؟

اور امام الحرمین نے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ مسلمانون کے دو بادشاہ بنائے جا سکتے ہیں، کیونکہ ملک بہت بڑا ہے، اس کے اندر صوبے ہیں، کچھ حصے ادھر تقسیم ہو گئے۔ اگر ملک چھوٹا ہے تو زیادہ والی نہیں بنانے چاہئیں۔ امام الحرمین کو اس مسئلے میں بڑا تردد رہا۔

اصل بات وہی یاد رکھیں کہ ایک ہی خلیفہ ہوگا، ایک بادشاہ ہوگا اور ایک ہی امیر المومنین ہوگا۔ پھر وہ اپنے نیچے نائب مقرر کر دیں گے تو ان کے نیچے جتنے صوبے ہوں گے وہاں اپنے والی بٹھا دیں گے، کیونکہ اگر دو ہوں تو لازماً اختلاف کا خطرہ ہوتا ہے۔

مفسر فرماتے ہیں: جیسے بنی عباس کا زمانہ آیا تو اس زمانہ میں یہی تھا کہ بنو عباس عراق میں تھے، فاطمین مصر میں تھے اور اموییں مغرب کے علاقوں میں تھے۔

مفسر فرماتے ہیں: جب ان آیات اور ان احکام کا موقع آئے گا تو میں وہاں تفصیل سے یہ احکام بیان کروں گا۔

ابھی تو چونکہ ایک لفظ آیا تھا کہ ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ اس کے مطابق اجمالی طریقہ پر مفسر نے خلیفہ کی صفات، خلیفہ کی شرائط اور خلیفہ کے حقوق کا ذکر کر دیا۔ کتاب میں ان احکام کے اندر اس کی باقاعدہ مفصل بحثیں موجود ہیں اور مفصل احکام ومسائل موجود ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۲، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ]



وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھا کر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ کہنے لگے: تو پاک ہے۔ ہمیں معلوم نہیں، مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا۔ بے شک تو ہی اصل جاننے والا، حکمت والا ہے۔ فرمایا: اے آدم! فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتایئے۔ پھر جب انہوں نے ان کے نام بتا دیئے فرمایا: کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ کہ آسمانوں کی اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں میں جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدے کے بعد اسماء کی تعلیم دینے کی وجہ:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کا ذکر فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو چیزوں کے اسماء اور خواص وآثار بتلائے اور ملائکہ کو نہیں بتلائے۔

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو اللہ نے اسماء کی تعلیم دی اور ملائکہ کو تعلیم نہ دی تو اس سے بھی حضرت آدم علیہ السلام کا شرف واضح ہوا کہ ان اسماء کی تعلیم کے اہل اور مستحق آدم علیہ السلام تو ہیں، لیکن ملائکہ نہیں ہیں اور خلافتِ ارضی کے مستحق بھی آدم علیہ السلام ہیں، ملائکہ نہیں ہیں۔

لیکن مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جہاں تک ملائکہ کے سجدے کا تعلق ہے وہ سجدہ پہلے تھا اور یہ تعلیم الاسماء سجدے کے بعد ہے، پہلے نہیں ہے۔ پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے کے بعد اس کو سجدہ کرو اور پیدا کرنے سے پہلے فرمایا:

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ﴾

''میں زمین میں خلیفہ بنانا چاہتا ہوں۔''

اس پر ملائکہ نے عرض کیا:

﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ﴾

''کیا آپ ان کو بنائیں گے جن کی اولاد زمین میں فساد کرے گی، خون ریزی کرے گی اور ہم آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور تسبیح وتحمید بیان کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝﴾ [البقرۃ:۳۰]

''میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔''

اور اس کے بعد حکم ہوا:

﴿اسْجُدُوا لِآدَمَ﴾

''آدم کو سجدہ کرو تو تمام ملائکہ نے سجدہ کیا۔''

اب یہ سجدے کا واقعہ گزرنے کے بعد اللہ نے آدم علیہ السلام کو اسماء سکھلائے۔ اگر اللہ چاہتے تو سجدہ عظمت اس کے بعد بھی کرا سکتے تھے، لیکن پھر اللہ کی قدرتِ کاملہ اور ملائکہ کی اطاعتِ کاملہ واضح نہ ہوتی، کیونکہ کسی آدمی پر جب کسی کا شرف وعظمت واضح ہو جائے تو آدمی خود بخود جھک جاتا ہے، اپنے دل میں مان لیتا ہے کہ وہ مجھ سے بڑا عالم ہے۔ تو پھر اگر اس کا سجدہ ہو تو کوئی اتنی بڑی بات نہیں، لیکن اس سے پہلے جب اللہ نے حکم دیا تو اللہ کی قدرتِ کاملہ کا اظہار ہے کہ میں جس کو چاہوں عزت اور شرف بخشوں۔ اور ملائکہ کی اطاعت کا بھی کمال ہے کہ ان کو حکم دیا گیا تو انہوں نے فوراً سجدہ کیا اور اللہ کے حکم کی اطاعت کی، کیونکہ ان کی صفت ہے:

﴿لَّا يَعْصُونَ اللَّهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝﴾ [التحریم:۶]

کسی کی عظمت اس کے علم کے بعد آجاتی ہے:

مثلاً کہ حضرت بنوری جو بہت بڑے عالم گزرے ہیں...... اللہ ان کی قبر پر رحمت فرمائے...... بہت بڑے محدث تھے، انہوں نے ترمذی شریف پر شرح بھی لکھی۔ تو وہ ایک دفعہ حضرت حماد اللہ ہالیجوی رحمہ اللہ کی خدمت میں تشریف لے گئے جو سندھ کے علاقے میں بزرگ تھے۔ حضرت بنوری رحمہ اللہ کی ان سے پہلے ملاقات نہیں تھی، یعنی غائبانہ تعارف تھا، دونوں ایک دوسرے کو غائبانہ تو جانتے تھے، لیکن باقاعدہ ملاقات نہیں تھی۔ تو حضرت بنوری رحمہ اللہ

جب حاضر ہوئے تو اتفاق سے بخاری شریف کی کسی حدیث پر مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ حضرت ہالیجوی رحمہ اللہ کی یہ عادت تھی کہ اگر کوئی مسئلہ پیش آجاتا تھا تو ان کی مجلس میں جتنے علماء موجود ہوتے تھے، ان میں سے کسی ایک عالم کو فرما دیتے تھے کہ اس مسئلے پر تم بات کرو یا اس مسئلہ پر تم بیان کردو۔ اگر وہ مسئلہ اس عالم نے صحیح معنوں میں سمجھا دیا اور اطمینان کامل ہوگیا تو ٹھیک ہے اور اگر حضرت الشیخ کے دل میں کوئی بات کھٹکی کہ مسئلہ واضح نہیں ہوا تو آخر میں حضرت خود اس مسئلہ پر تقریر فرماتے تھے۔ تو حضرت بنوری رحمہ اللہ بھی مجلس میں بیٹھے تھے۔ ایک مسئلہ آیا، ایک عالم نے تقریر فرمائی اور اس کے بعد جب حضرت الشیخ نے اس حدیث پاک کی شرح بیان فرمائی تو حضرت بنوری رحمہ اللہ نے خود مجلس سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ آج ہم پر اپنا جہل منکشف ہوا ہے، ہم تو دل میں سمجھتے تھے کہ ہم اتنے بڑے عالم ہیں اور اتنے بڑے محدث ہیں اور زندگی گزر گئی پڑھاتے پڑھاتے اور بھی کوئی آدمی اتنا سمجھے گا جتنا ہم نے سمجھا ہوا ہے؟ لیکن حضرت الشیخ کی تقریر سننے کے بعد پتہ چلا کہ ہم نے تو کچھ بھی سمجھا ہوا نہیں۔ تو جب آدمی کسی کے علم کا مقام دیکھتا ہے تو عظمت خود بخود دل میں پیدا ہوجاتی ہے۔

سجدہ ملائکہ پہلے اور تعلیم بعد میں، وجہ مناسبت کیا ہے؟

فرشتوں کے سجدے کے بعد ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ [البقرة:۳۱] آدم علیہ السلام کو اسماء کا علم عطا فرمایا۔

مفسر فرماتے ہیں کہ سجدے کا مقام پہلے تھا، اس کو بعد میں ذکر کیا گیا اور تعلیمِ اسماء کو پہلے ذکر کیا، اس کی وجہ مناسبتِ مقام ہے، کیونکہ اللہ نے فرمایا ﴿اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرة:۳۰] اور اس کے بعد امتحان ہوگیا کہ اللہ نے فرشتوں سے کہا: خبر دو۔ اور فرشتے خبر نہ دے سکے، چونکہ مناسبتِ مقام کا تقاضہ یہ تھا تو اس لیے اس آیت کے بعد اس کو ذکر کیا اور سجدے کو بعد میں ذکر کیا گیا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۲، ۷۳، البقرة، الآية: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

کس چیز کے اسماء سکھلائے گئے؟ سدی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ [البقرة:۳۱] سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی اولاد کے اسماء بتلادیے کہ اتنی اولاد ہوگی، ہر انسان کا نام ان کو بتلایا گیا اور اس کے بعد جتنے جانور پیدا ہوں گے ان کا بھی بتلا دیا گیا۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو جو نام سکھلائے تو ان ناموں سے وہ نام مراد ہیں جو اب دنیا میں لوگوں کے اندر متعارف ہیں۔ اللہ نے ان کو بتلایا کہ یہ انسان ہے، یہ جانور ہے، یہ آسمان ہے، یہ زمین ہے اور یہ خشکی ہے وغیرہ۔

بعض مفسرین نے یہ روایت بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف نام نہیں بتلائے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے آثار، خواص، خصلتیں اور صفات بھی بتلا دیے اور ان ساری چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے مثالی وجود دے کر آدم علیہ السلام کو دکھا دیا، تاکہ سب کی مکمل معرفت حاصل ہو جائے۔

آیت سے یہ معلوم ہوا کہ لغت کا علم سب سے پہلے اللہ نے آدم علیہ السلام کو عطا فرمایا، اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے آپس میں اختلاط کی وجہ سے حروف و معانی میں کچھ اور چیزیں بھی بنتی اور بڑھتی گئیں۔

حضرت ابن ابی حاتم رحمہ اللہ اور ابن جریر رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ﴿الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ سے مراد یہ ہے کہ پیالہ، ہنڈیا اور چھوٹی چیزیں جیسے ہوا کا نکلنا ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ہر چیز کے نام بتائے، ہر جانور و پرندے کے نام بتائے۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ سے روایت ہے کہ اللہ نے ان کو تمام چیزوں کے نام بتائے۔

حضرت ربیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ نے ان کو فرشتوں اور ستاروں کے بھی نام بتلائے اور جتنی ان کی اولاد ہونی تھی ان کے نام بھی بتائے۔

مفسر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان کو صرف ملائکہ کے نام بتلائے اور اولادِ آدم کے نام بتائے، کیونکہ ﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ [البقرۃ:۳۱] میں جو ضمیر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو عقل والی چیزوں کے نام بتلائے اور غیر عقل والی کے نام نہیں بتلائے اور جانور عقل والے نہیں ہوتے۔ اور اسی کو ترجیح دی ہے۔

لیکن مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفسر ابن جریر رحمہ اللہ کا اس قول کو راجح قرار دینا زیادہ قوی نہیں ہے، کیونکہ "هُمْ" ضمیر سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اس سے صرف ذوی العقول ہی شامل ہیں، لیکن عقل والوں کو تغلیباً بطور غلبہ کے ذکر کر دیا، جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [النور:۴۵]

"هُمْ" ضمیر ہے۔ بعض ایسے ہیں جو اپنے پیٹ پر چلتے ہیں، جیسے سانپ وغیرہ اور بعض جانور ایسے ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں، جیسے انسان اور بعض چوپائے ایسے ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں، وہاں بھی ضمیر جمع کی ہے، لہٰذا یہاں ذوی العقول کو تغلیباً ذکر کر دیا ہے تو اس لیے ابن جریر رحمہ اللہ کا یہ دلیل دینا مضبوط نہیں ہے۔ [تفسیر ابن

کثیر: ۱/ ۷۳، البقرۃ، الآیۃ: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

قرآن میں قراءتوں کا اختلاف:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک قراءت یہ بھی ہے کہ ﴿ثُمَّ عَرَضَهُنَّ﴾ اور ابن ابی کعب کی قراءت میں ﴿ثُمَّ عَرَضَهَا﴾ ہے۔

فرق:

یاد رکھیں یہ قراءت کے اختلاف ہوتے ہیں، یعنی ایک جگہ ضمیر مذکر کی آگئی اور ایک مونث کی ضمیر آگئی، اسی طرح ایک دفعہ ضمیر ما یعقل کی آگئی اور ایک جگہ ما لا یعقل کی آگئی۔ یہ اختلاف قراءت ہیں، اسی سے بعض اوقات فرقِ باطلہ وہ استدلال کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یوں فرماتے ہیں اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ یوں فرماتے ہیں اور باقی قراء صحابہ کچھ اور پڑھ رہے ہیں تو معلوم ہوا یہ کہ قراءت کا اختلاف ہے کہ اللہ نے قرآن کو سات قراءتوں میں نازل فرمایا اور سات کی سات قراءت معروف و مشہور ہیں۔ آدمی جس قراءت سے بھی پڑھے گا ......الحمد للہ......ترجمہ صحیح ہوگا۔

مفسر فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ اللہ نے ان کو تمام اشیاء کے نام بتلائے، یعنی ذات کا نام بھی بتلایا اور ان کی صفات و افعال بھی بتلائے، کیونکہ آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد نے دنیا آباد کرنی تھی۔ اگر ان کو دنیا کی اشیاء کے استعمال کا طریقہ نہ آتا تو وہ ان سے نفع نہ اٹھا سکتے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۳، البقرۃ، الآیۃ: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

حضرت آدم علیہ السلام کا علم:

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اتنا وسیع علم دیا کہ تمام عالم کی چیزوں کے نام بتلا دیے، ان کے خواص بتلا دیے، ان کی صفات بتلا دیں اور ان کے افعال بتلا دیے، لیکن اس کے باوجود بھی آدم علیہ السلام کا علم اللہ کے مقابلہ پر قلیل ہے۔ اسی سے اندازہ کریں کہ اللہ کا علم کتنا ہوگا؟ اس لیے فرمایا:

﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ [یوسف: ۷۶]

تمہیں جتنا علم دیا جائے تم سے بڑا اور عالم ہے، اس سے اور بڑا عالم ہے، لیکن سب سے بڑے علم والی اللہ کی

ذات ہے۔ اس لیے اتنے بڑے علوم کے باوجود بھی انبیاء ﷺ کہتے ہیں:

﴿إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ﴾ [المائدۃ:۱۰۹]

حدیثِ شفاعت کا بیان:

امام بخاری نے کتاب التفسیر میں صحیح بخاری کے اندر یہ روایت مبارک نقل فرمائی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن لوگ جمع ہوں گے، وہ آپس میں کہیں گے کہ آج کوئی ذات ہو جو پروردگارِ عالم کے دربار میں ہماری سفارش کرے، تاکہ ہم جو محشر کی سختی میں ہیں اس سے اللہ پاک ہمیں نجات عطا فرمائیں۔ (تاکہ مقدمات ہمارے کی کاروائی تو شروع ہو جائے) اس کے بعد وہ سب اکٹھے ہو کر حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے: اے آدم! تم ہی سب انسانوں کے باپ ہو، تمہیں اللہ نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا، اپنے فرشتوں کو تجھ سے سجدہ کروایا اور تمہیں ہر چیز کے ناموں کا علم عطا فرمایا۔ تو اس حدیث میں بھی ہے "وَعَلَّمَكَ أَسْمَاءَ كُلِّ شَيْءٍ" تمہیں ہر چیز کا علم سکھلایا، آپ اپنے رب کی بارگاہ میں ہماری سفارش کریں، تاکہ ہمیں اس مقام سے راحت اور چھٹکارا ملے، لیکن آدم علیہ السلام کہیں گے کہ میں اس کا اہل نہیں اور اس کے بعد وہ اپنی غلطی کو یاد کریں گے کہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ [البقرۃ:۳۵]

اس درخت کے قریب نہ جانا، لیکن میں کھا بیٹھا تو اس لیے میں ڈرتا ہوں، مجھے حیا آتی ہے کہ میں اللہ کے آگے جا کر کیسے سفارش کروں؟

دراصل یاد رکھیں کہ یہ بھی انبیاء ﷺ کی شان ہے، کیونکہ علم جتنا بڑا ہوتا ہے اور جتنی بڑی شان ہوتی ہے اتنا اللہ کا ڈر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جتنے علماء ہوں گے اور جتنے اہلِ علم ہوں گے ان کے دلوں میں اللہ کی عظمت زیادہ پیدا ہوتی ہے، ورنہ حضرت آدم علیہ السلام سے غلطی ہوئی اور اللہ نے معاف فرما دی۔ جب انہوں نے اللہ سے درخواست کی ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ [الاعراف:۲۳] تو غلطی معاف ہو گئی، معافی مل گئی، لیکن معافی کے بعد ان کا ڈر باقی ہے۔ یہ ایک مقام ہوتا ہے۔

اس کی چھوٹی سی مثال دیکھیں! اگر ایک آدمی تہجد گزار ہے، شب بیدار ہے، یعنی رات کو اللہ اسے جاگنے کی توفیق

دیتے ہیں اور وہ تہجد پڑھنے کا عادی ہے، اگر کسی دن اس کی تہجد رہ جائے تو سارا دن اس کو بے چینی رہتی ہے کہ رات میری تہجد رہ گئی، حالانکہ اس کو پتہ ہے کہ تہجد ایک نفلی عبادت ہے، پڑھے تو ثواب ہے اور نہ پڑھے تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس کو پتہ ہوتا ہے کہ میں نے رات کو تہجد نہیں پڑھی، کوئی گناہ تو نہیں کیا ہے اور پھر میں نے عمداً بھی نہیں چھوڑی، میں غفلت میں آ گیا، نیند میں آ گیا اور اگر انسان کی فرض نماز نیند کی وجہ سے قضا ہو جائے تو گناہ گار نہیں ہے، اللہ کے ہاں پکڑ نہیں ہوگی، کیونکہ وہ غفلت میں آ گیا، کسی نے جگایا نہیں، اس نے بعد میں اٹھ کر قضا کر لی، جب فرض نماز پر بھی اتنا مؤاخذہ نہیں ہے تو تہجد پر اگر نہ اٹھے تو کیا فرق پڑے گا؟ لیکن اس کو آرام نہیں ہوتا، وہ اتنی رکعتیں پڑھ رہا ہے، توبہ کر رہا ہے، استغفار کر رہا ہے اور سوچ رہا ہے کہ لازماً آج مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی وجہ سے مجھے تہجد نصیب نہیں ہوئی یا کوئی نہ کوئی حرام کا لقمہ میرے اندر چلا گیا ہے یا میں نے کوئی زبان سے گندی بات نکالی ہے جس کی سزا مجھے یہ ملی کہ رات کو جاگنے سے محروم ہو گیا۔ اور اس کے مقابلہ میں جو فرض نماز بھی نہ پڑھتا ہو اس کو تہجد کا کیا درد ہوگا؟

اس لیے پھر یہ حضرت نوح علیہ السلام کی خدمت میں آئیں گے، حضرت آدم علیہ السلام ان کی طرف بھیجیں گے کہ تم نوح علیہ السلام کی طرف جاؤ۔ وہ پہلے رسول ہیں، جن کو اللہ نے زمین والوں کی طرف بھیجا تو حضرت نوح علیہ السلام بھی فرمائیں گے کہ میں بھی اس مقام پر کھڑے ہونے والوں میں سے نہیں ہوں کہ تمہاری سفارش کر سکوں، میں نے بھی بغیر علم کے بیٹے کی بخشش مانگ لی تھی، مجھے بھی حیا آتی ہے کہ میں آج کیسے جاؤں؟ وہ کہیں گے کہ تم حضرت ابراہیم الخلیل علیہ السلام کے پاس جاؤ، کیونکہ وہ اللہ کے خلیل ہیں۔ وہ فرمائیں گے: موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، وہ اللہ کے ایسے بندے ہیں اور ایسے رسول ہیں، ان کو اللہ نے اپنے کلام سے مشرف فرمایا اور جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تورات جیسی جامع کتاب عطا فرمائی۔ ان کے پاس آئیں گے تو وہ بھی انکار کر دیں گے، وہ فرمائیں گے کہ میرے ہاتھوں سے ایک آدمی مر گیا تھا، کہیں اللہ پاک مجھ سے پوچھ نہ لیں۔ وہ کہیں گے کہ تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کے رسول ہیں، جن کو اللہ نے "کلمۃ اللہ" کا خطاب دیا، کیونکہ وہ اللہ کے کلمہ سے پیدا ہوئے اور جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے جبرئیل علیہ السلام کو بھیج کر روح پھونکی، ان کے پاس جاؤ، وہ سفارش کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ میں بھی اس مقام پر نہیں ہوں۔ میں تم کو مشورہ دیتا ہوں کہ سب کے سب حضرت محمد رسول اللہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں جاؤ، کیونکہ وہ ایک ایسی شان والا بندہ ہے، جس کے بارے میں اللہ نے فرما دیا کہ

میرے مدنی! اگر آپ سے نبوت سے پہلے کوئی بات ہو یا بعد میں ہو میں نے سب معاف کر دیا تو ان کے پاس جائیں، وہ آپ کی سفارش کریں گے۔ فرماتے ہیں کہ میں چلوں گا، حتیٰ کہ میں اپنے پروردگار سے اجازت مانگوں گا۔ جب میں اپنے پروردگار کی زیارت کروں گا تو میں سجدے میں گر جاؤں گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے اس حالت سجدہ میں رہنے دیں گے جتنی دیر چاہیں گے۔ میں سجدے میں اللہ کی حمد وثنا بیان کروں گا۔ اس کے بعد حکم ہوگا: اے محمد! آپ اپنا سر سجدے سے اٹھائیں، مانگیں دیے جائیں گے، بات کریں سنی جائے گی، سفارش کریں قبول کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ جو مانگو گے میں دوں گا۔ پھر میں سجدے سے سر اٹھاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ اس وقت مجھے اپنی حمد کرنے کا طریقہ بتلائیں گے، پھر میں اللہ کی حمد بیان کروں گا۔ اس کے بعد حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اللہ کے آگے سفارش کروں گا تو ایک بڑی مقدار کو جنت میں داخل کیا جائے گا۔ پھر میں اپنے پروردگار کی زیارت کروں گا اور سجدے میں گر جاؤں گا۔ پھر اجازت مانگوں گا، پھر اللہ مجھے اجازت دیں گے، میری سفارش دوبارہ قبول ہوگی اور دوسری تعداد جنت میں داخل کی جائے گی۔ اس کے بعد میں پھر سجدہ کروں گا اور اللہ سے درخواست کروں گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ پھر میری سفارش قبول فرمائیں گے اور پھر ایک تعداد کو جنت میں داخل فرمادیں گے۔ اسی طرح ایک اور دوسری حدیث مبارک میں آتا ہے میں سفارشیں کروں گا، سفارش کروں گا اور سفارش کروں گا۔ صرف ایک شفاعت نہیں، بلکہ حضور پاک ﷺ کئی بار شفاعت کریں گے۔ اور اس کے بعد فرماتے ہیں کہ میری شفاعت منظور ہوگی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

((هَلْ رَضِيتَ؟ يَا مُحَمَّدُ!))

''اے محمد مصطفیٰ! اب آپ اپنے رب سے راضی ہو گئے کہ نہیں؟''

تو میں کہوں گا:

((رَضِيتُ يَا رَبِّيْ! رَضِيتُ يَا رَبِّيْ! رَضِيتُ يَا رَبِّيْ!))

''اے اللہ! میں راضی ہوں۔ اے اللہ! میں راضی ہوں۔ اے اللہ! میں راضی ہوں۔''

کیونکہ اللہ نے وعدہ فرمایا تھا کہ آپ کو راضی کریں گے:

﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝﴾ [الضحیٰ: ۵]

اللہ نے قرآن میں وعدہ فرمایا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ جہنم میں صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جن کو

قرآن نے روکا ہوا ہے، یعنی جن کے بارے میں قرآن کا فیصلہ ہے کہ وہ جہنمی ہیں، وہ تو جہنم میں رہیں گے، ان کے بارے میں تو سفارش قبول نہیں ہوگی، اسی طرح وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ جہنم میں رکھنے کا فیصلہ کیا ہے، یعنی جو کافر ہیں، مشرک ہیں یا جن جرائم پر قرآن میں سزا آگئی ہے، پھر وہی باقی بچیں گے، وگرنہ سب کے بارے میں اللہ سفارش قبول کریں گے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی سیاق کے ساتھ اس کو ذکر کیا ہے، مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث امام مسلم اور نسائی نے بھی روایت کی ہے۔

[صحیح البخاري، حدیث: ٤٧١٢، باب: ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ...]

فرشتوں کا اللہ کے سامنے عاجزی اور ضعف کا اعتراف:

پھر ان فرشتوں کے سامنے وہ مسمیات اور وہ چیزیں پیش کی گئیں جن چیزوں کا نام رکھا گیا تھا، مثلاً: گلاس تھا، تو فرشتوں کے سامنے رکھا گیا کہ اس کا نام کیا ہے؟ تو اس طرح باقی مسمیات رکھے گئے، کیونکہ جب تک مسمیات ہی سامنے نہ ہوں تو نام کیسے بتلائیں گے؟ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت مرہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کی یہ تفسیر فرمائی کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو نام بتلائے اور ان تمام چیزوں کو اپنے فرشتوں پر پیش کیا کہ تم ان چیزوں کے نام بتاؤ۔

اور حضرت ابن جریج رحمہ اللہ نے حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ ان ناموں والوں کو فرشتوں کے سامنے رکھا۔

حضرت حسن رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ اللہ نے ہر چیز کا نام بتلایا اور ہر چیز کا مسمی بھی بتادیا اور پھر اللہ پاک نے جو امتیں قیامت تک آئیں گی ان امتوں کی تفصیل ان کے نام اور ان کی صفات اور افعال آدم علیہ السلام کو بتلائے۔ اللہ نے فرشتوں سے فرمایا: تم کہتے ہو کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ جو مخلوق ہے ہم ان سب سے افضل ہیں۔ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ تم افضل ہو تو ان چیزوں کے نام بتلاؤ، ہم امتحان کرتے ہیں کہ انسان افضل ہیں یا تم افضل ہو؟

مفسر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب سے راجح قول وہی ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے، یا جن لوگوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق ذکر کیا، یعنی اللہ فرمائیں گے:

﴿فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ﴾ [البقرة: ٣١]

اے فرشتو! ان چیزوں کے نام بتاؤ جو میں نے تمہارے اوپر پیش کی ہیں۔ یہ تمہارے سامنے موجود ہیں تو جب ان کے بارے میں تم نہیں بتلا سکتے تو وہ مخلوق جو تم نے دیکھی نہیں ان کے بارے میں تم کیسے جان سکتے ہو؟ تو ملائکہ نے

لاجواب ہوکر اپنی عاجزی وضعف کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ پاک ہے تیری ذات، تنزیہ وتقدیس کرتے ہیں، ہم نہیں جانتے، مگر جتنا تو نے ہمیں بتلایا۔ آپ کے مخلوق پیدا کرنے میں جو حکمتیں ہیں وہ سراپا عدل اور حق ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۳، ۷۴، البقرۃ، الآیۃ: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' سے توحید کا مفہوم ہمیں سمجھ آگیا اور ''سُبْحَانَ اللّٰهِ'' سے کیا مراد ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ ایک ایسا کلمہ ہے جس نے کہا اس سے اللہ راضی ہوئے اور اللہ محبوب رکھتے ہیں کہ اس کی پاکی بیان کی جائے۔

حضرت میمون بن مہران رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ'' کا کیا معنی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اللہ کی عظمت وبڑائی کا اقرار اور ہر صفت نقصان سے اس کی پاکی کا اعتراف کرنا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۴، البقرۃ، الآیۃ: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

صحابہ کرام کا ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ'' کہنے میں کیا حکمت تھی؟

جب صحابہ رضی اللہ عنہم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات پوچھی تو صحابہ رضی اللہ عنہم فوراً کہتے تھے ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ'' (اللہ جانے اور اللہ کا رسول جانے) حالانکہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کو صحابہ رضی اللہ عنہم کو علم ہے، جیسا کہ حجۃ الوداع کے دن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کونسا دن ہے؟ سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پتہ تھا کہ جمعہ کا دن ہے، سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پتہ تھا کہ یوم الوقوف ہے اور سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پتہ تھا کہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود فوراً کہا: ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ'' کیونکہ یہی مقام ہوتا ہے جو لوگ صحیح معنوں میں عظمت رکھتے ہیں اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے، کیونکہ ایک عام چیز ہے، سب جان رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی پوچھ رہے ہیں: یہ کون سا دن ہے؟ کون سا مہینہ ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کوئی خاص حکمت ہے جو اللہ نے اپنے رسول کو بتلائی ہے اور ہمیں نہیں معلوم تو اس لیے فوراً کہہ دیا: اللہ جانتے ہیں اور اللہ کا رسول جانتے ہیں، ہم تو نہیں جانتے۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یوم الوقوف ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں جی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کا دن ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں جی!۔ تصدیق کرتے گئے۔

حضرت درخواستی رحمۃ اللہ علیہ کے حافظے کے واقعات:

حضرت درخواستی رحمۃ اللہ علیہ کو ہم نے دیکھا ہے...... ماشاء اللہ...... ان کی عمر بھی تقریباً ۱۰۰ سے متجاوز ہوگی (اب ان

کا انتقال پر ملال ہو چکا ہے۔) فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی بیس سال پہلے یا تیس سال پہلے کسی جلسے میں ملا تھا...... حالانکہ جلسے میں کیا آدمی کو کوئی ہوش ہوتا ہے؟ اس کے بعد مجھے کئی لوگ خط لکھتے ہیں کہ ہم آپ کو ملے اور آپ نے بڑی بے مروتی سے ہمیں ہاتھ دیا۔ اب وہ بے چارے حج میں ملتے ہیں۔ جب ایک آدمی نے حج پر ایک گھنٹہ تقریر کی ہو تو تھکان اتنا ہوتی ہے کہ آدمی ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ ہل چلانے میں آدمی اتنا نہیں تھکتا، جتنا دماغی کام سے تھک جاتا ہے۔ تو اب دماغ تھکا ہوتا ہے اس نے کہا کہ "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" اب ان کے جواب دیتے گئے۔ باقی تو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کون ملا تھا یا کون تھا؟...... لیکن حضرت کو اگر کوئی تیس سال پہلے ملا ہو وہ بھی جلسے میں اور اس کے بعد پھر سامنے آئے تو حضرت فرماتے ہیں کہ اچھا بھائی! تمہارا نام فلاں ہے اور فلاں جلسہ میں تم مجھے ملے تھے؟ تو وہ کہتا: ہاں جی! ۔ یعنی بڑھاپے میں بھی اتنا حافظہ تھا۔

ایک دفعہ مجھے یاد ہے کہ یہاں تشریف لے آئے تو امام الحرم مدظلہ کی خدمت میں، ہم انہیں ملاقات کے لیے لے گئے۔ اس وقت صحت کچھ زیادہ بہتر تھی۔ اب علماء کی مجلس میں تو علمی بات ہی ہو گی۔ کبھی حدیث پر بحث ہو گئی اور کبھی کسی اور کتاب کا ذکر چھڑ گیا۔ تو حضرت امام صاحب نے فرمایا کہ ماشاء اللہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنا بڑا علم عطا فرمایا ہے۔ انہوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں پوچھا کہ ان کی کتابیں بھی آپ کی نظر سے گزری ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ میں نے ان کی فلاں فلاں کتاب پڑھی تھی۔ ان کا ایک قصیدہ بڑا مشہور ہے کہ اس کی انتہاء نون پر ہوتی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ ان کا قصیدہ نونیہ بھی میری نظر سے گزرا تھا، آج سے بیس سال پہلے وہ کتاب مجھے ملی تھی اور میں نے پڑھی تھی۔ تو اس وقت حضرت نے کوئی ڈیڑھ سو اشعار یاد سے پڑھے۔ اب آگے والے دنگ بیٹھے ہوئے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے!! ہمارا امام اور ہمارے ملک کی کتاب ہے اور ہمیں بھی ڈیڑھ سو اشعار یاد نہیں اور اس آدمی کو ڈیڑھ سو اشعار یاد ہیں جو کہتا ہے کہ بیس سال پہلے کتاب دیکھی تھی۔ امام الحرم بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے بڑی عزت دی۔ اللہ انہیں بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔ علماء کی تو تکریم کرتے ہیں، کیونکہ جوہری جوہر کو پہنچانتا ہے۔ ایک آدمی موتی کو نہ پہنچانتا ہو، اس کو کیا پتہ کہ یہ ہیرا ہے یا پتھر ہے؟ جوہری کو قدر ہوتی ہے کہ ہیرے کی کیا قیمت ہے اور پتھر کی کیا قیمت ہے؟ تو انہوں نے خود کہا کہ اب آپ گاڑی نہ چلائیں، میں گاڑی خود چلاؤں گا اور حضرت کو ان کے مقام پر چھوڑ آؤں گا۔ تو یہ ایک اور نعمت ہے کہ اللہ علم دے اور پھر اس کو سینوں میں محفوظ بھی رکھے، دماغوں میں محفوظ بھی رکھے۔

تین ماہ میں ایک بچے کا قرآن یاد کرنا:

میں نے پتہ نہیں پہلے بھی بتایا ہے کہ نہیں بتایا کہ ایک بچے نے تین ماہ میں قرآن پاک حفظ کیا، عبدالعزیز بن یحییٰ اس کا نام ہے، موجود ہے اور اب...... ماشاء اللہ!...... وہ قراءت سبعہ حفظ کر رہا ہے۔ تو آپ اندازہ کریں کہ تین مہینے میں تیس سپارے حفظ کرنا۔ ابھی وہ بچہ ہے، یہ نہیں کہ پڑھا لکھا عالم ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ترجمہ ہوتا ہے، لیکن ایک بچہ اللہ نے اس کو ہمت عطا فرمائی۔ اسی طرح جنوبی افریقہ کے ابی بکر میرے دوست ہیں، ایک لڑکے نے چھ مہینے میں قرآن حفظ کیا اور پھر پورا قرآن ضبط بھی ہے، یہ نہیں کہ آگے حفظ کرتے جاؤ اور پیچھے بھولتے جاؤ۔

غیب کا معنی کیا ہوتا ہے؟ اس لیے بعض لوگوں نے مسلمانوں کے عقیدے برباد کرنے کے لیے عجیب عجیب ڈھونگ رچا رکھے ہیں...... نعوذ باللہ...... انہوں نے کہا کہ اللہ کے آگے تو غیب ہے ہی نہیں، اصل عالم الغیب تو انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں، اولیاء ہوتے ہیں کہ جن کے آگے غیب ہوتا ہے اور پھر وہ جانتے ہیں۔ خدا کے آگے تو ہر چیز موجود ہے، لہٰذا عالم الغیب کیا ہوا؟ اس لیے غیب کا معنی سمجھیں ''غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' کا معنی یہ ہے کہ جو چیزیں آسمانوں و زمین میں ساری مخلوق سے غیب ہیں ان کو بھی اللہ جانتے ہیں، یعنی جو چیزیں تمام مخلوق سے غیب ہیں، وہ نہیں جانتے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو بھی جانتے ہیں۔ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت تو قرآن میں بھی موجود ہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾[الحشر:۲۲]

اور کہیں آیا:

﴿عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴾[المائدۃ:۱۰۹]

اور کہیں فرمایا:

﴿عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾[آل عمران:۱۱۹]

اور کہیں آیا:

﴿اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴾[البقرۃ:۳۲]

اس لیے یہ تمام صفتیں ہیں۔ یہ لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ اللہ سے تو کوئی چیز غائب نہیں تو علم غیب اللہ کو کیا ہوا؟ علم

غیب تو نبی کو ہوتا ہے، نبی کا معنی ہی خبر دینے والا ہوتا ہے اور آگے ایک لفظ اور ساتھ بڑھا دیا کہ غیب کی خبر دینے والا۔

تو بھائی! خبر دینے کا کیا معنی ہے؟ جو اللہ اپنے نبی کو بتلاتے ہیں وہ اس کی آگے خبر دیتے ہیں اور جو اللہ نہ بتلائیں نبی خبر نہیں دیتے۔ اس لیے کہا گیا: نبی کو نبی مانا گیا۔ نبی کا معنی خبر دینے والا، یعنی وہ خبریں جو اللہ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو عطا فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں سب علم غیب جاننے والا ہوں، چاہے ظاہر ہو چاہے چھپا ہوا ہو:

﴿وَإِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَى ۝﴾ [طٰہٰ:۷]

چاہے تو زور سے بات کرو یا آہستہ آہستہ کرو اور ایک چیز وہ ہے جو ابھی زبان پر بھی نہیں، دل میں اخفا کیا ہوا ہے، اللہ نے فرمایا: وہ بھی میں جاننے والا ہوں، میرے ہاں وہ بھی چھپی ہوئی نہیں ہے۔

اور جیسا کہ قرآن پاک میں ہدہد کے قصے کے بارے میں خبر آئی، انہوں نے بھی سلیمان علیہ السلام کو آکر عرض کیا:

﴿أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ۝ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝﴾ [النمل:۲۵،۲۶]

حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں ہدہد نے آکر عرض کیا کہ قوم کو کیا ہو گیا ہے کہ سورج کی پوجا کر رہے ہیں؟ چاند تاروں کی پوجا کر رہے ہیں؟ اس ذات کی عبادت کیوں نہیں کرتے جو نکالنے والا ہے ہر وہ چیز جو آسمان و زمین میں چھپی ہوئی ہے اور جاننے والا ہے ان چیزوں کو جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ اصل عبادت کا تو وہ مستحق ہے جس کے سامنے کائنات کے ذرے ذرے کا راز ہے۔ ایسی چیز کی عبادت کرنے کا کیا فائدہ جس کو اپنے عابد کا بھی پتہ نہ ہو؟ کوئی سورج کی عبادت کرے تو سورج کو کیا پتہ کہ کون میری عبادت کر رہا ہے؟ جب وہ اپنے عابد کو نہیں جانتا تو اس کو نفع نقصان کیسے پہنچائے گا؟ کوئی اگر آگ کی عبادت کر رہا ہے تو آگ کو کیا پتہ کہ میرا عابد کون ہے؟ آپ دیکھیں کہ آگ پرست آگ کی عبادت کرتے ہیں...... نعوذ باللہ...... نفع نقصان خدا سب کچھ آگ ہے، اسی عبادت کرنے والے کو کہو کہ آگ کو ہاتھ تو لگاؤ۔ آخر تم اتنے عرصہ سے عبادت کر رہے ہو، تم ہاتھ ڈال کر دیکھو شاید تمہیں نہ جلائے، کیونکہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو۔ دو منٹ میں پتہ لگ جائے گا کہ ہاتھ جلاتی ہے یا نہیں جلاتی؟ کیونکہ اس کا کام جلانا ہے، چاہے مولوی ڈالے، پیر ڈالے، کوئی بھی اس کے اندر ہاتھ ڈالے اس کا کام جلانا ہوتا ہے۔

یہ جو دکھاتے ہیں کہ آگ میں گزر گیا، یہ شعبدے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ آگ اپنے خصائص کو کھو دیتی ہے۔

کبھی تو ایسے ہوتا ہے کہ ساحر لوگ آنکھوں پر ایک قسم کا تصرف کرتے ہیں کہ تمہیں وہ چیز نظر آئے گی جو وہ دکھانا چاہتا ہے، جیسے ہپناٹائزم کر دیتے ہیں کہ اس کو معمول بنا لیتے ہیں۔ اب وہ وہی کہے گا جو تم کہہ رہے ہو، وہی بولے گا جو تم بلاوانا چاہتے ہو اور وہ وہی سوچے گا جو تم کر رہے ہو۔

اور کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ بعض چیزیں بطور دوا استعمال ہوتی ہیں، مثلاً: اس کو استعمال کر لیا اور آگ پر کھڑا ہوا تو آگ نے کچھ نہ کیا اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قدرت اپنا نظارہ دکھانے کے لیے بھی اور بندوں کے امتحان کے لیے بھی ایسے حالات کر دیتی ہے کہ بندہ گزر جائے۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عبادت کے لائق تو وہ ہوتا ہے جو اپنے عبادت کرنے والوں کو جانے تو سہی کہ یہ میرا فرمانبردار ہے یا نافرمان ہے، یہ مانگ رہا ہے اور یہ نہیں مانگ رہا۔ اگر وہ جانتا ہی نہ ہو تو اس کی عبادت کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

تفسیر:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر منقول ہے کہ ﴿أَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ [البقرۃ: ۳۳] جیسے میں چھپی ہوئی چیز کو جانتا ہوں اسی طرح ظاہر کو جانتا ہوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ﴾ [البقرۃ: ۳۰] یہ بات تو انہوں نے ظاہر کی تھی اور جو کچھ ابلیس نے بڑائی تکبر اور عداوت اپنے دل میں چھپائی ہوئی تھی اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں۔

حضرت ابو العالیہ، حضرت ربیع بن انس اور حضرت قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ایک تو فرشتوں نے یہ بات کی تھی ﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا﴾ آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرنا چاہتے ہیں جو زمین میں فساد کرے گی اور خون ریزی کرے گی؟ اور ایک ان کے دل میں یہ بات تھی کہ ہم سے افضل کوئی مخلوق پیدا نہیں ہوگی، ہم سب سے افضل ہیں۔ تو اللہ نے فرمایا: جو تم ظاہر کرتے ہو میں جانتا ہوں اور جو تم نے چھپایا ہوا ہے وہ بھی جانتا ہوں۔ یہ تو میرے ہاتھ میں ہے کہ میں جس کو چاہوں فضیلت دے دوں۔

حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرشتوں نے جو چھپایا تھا وہ یہ تھا کہ اللہ نے جو مخلوق پیدا کی ہم ان سے زیادہ علم اور زیادہ عزت والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: جیسے تم ان چیزوں کے نام نہیں جانتے اسی طرح تم یہ بھی نہیں جانتے کہ میں جن کو پیدا کرنے والا ہوں، جو مخلوق میری اطاعت بھی کرے گی اور میری

نافرمانی بھی کرے گی ان کو بھی جنت میں داخل کروں گا اور ان کو جہنم میں بھی داخل کروں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو علم عطا فرمایا تو فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کا اقرار کرلیا۔

مفسر ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: راجح قول وہی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿أَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ...﴾ (میرے علم میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں مخفی ہے۔) کا معنیٰ یہ ہے کہ "مَا تُظْهِرُوْنَهٗ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ فِيْ أَنْفُسِكُمْ" [تفسیر ابن کثیر، البقرۃ، الآیۃ: ۳۳] اور جس کو تم اپنی زبانوں سے ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم اپنے جی میں چھپاتے ہو میں سب جانتا ہوں، میرے اوپر کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ اور جو کچھ فرشتوں نے اپنی زبانوں سے ظاہر کیا تھا وہ یہ تھا کہ مولیٰ! آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرنے والے ہیں جو زمین میں فساد کریں گے اور خون ریزی کریں گے؟ اور جو چھپایا ہوا تھا وہ ابلیس کے دل کے اندر تھا کہ میں اللہ کے اوامر کی مخالفت کروں گا۔ اس کے دل کے اندر تکبر اور جو آدم علیہ السلام سے حسد اور آدم علیہ السلام سے عداوت تھی وہ بھی اللہ کے علم میں تھی۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۴، ۷۵، البقرۃ، الآیۃ: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

اعتراض:

اگر ابلیس نے دل کے اندر چھپایا ہوا تھا، باقی ملائکہ نے تو نہیں چھپایا تھا، یہاں صیغہ جمع کا آیا ہے کہ ﴿أَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ اللہ نے مخاطب تو سب کو فرمایا کہ جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو، حالانکہ چھپانے والا ایک ہے۔

جواب:

محاوراتِ عرب میں ایسا ہوتا ہے کہ جیسے کہا جاتا ہے "قَتَلَ الْجَيْشُ وَ هَزَمُوْا" کہ لشکر نے لڑائی لڑی اور لشکر نے شکست کھائی۔ اب یہ ضروری تو نہیں ہوتا کہ سب نے لڑائی کی ہو اور سب نے شکست کھائی ہو، گویا کہ خبر یہ دی جاتی ہے کہ لشکر ہار گیا۔ اب ضروری تو نہیں کہ ہر بندہ ہارا، لیکن اس کی جمع کے صیغہ کے ساتھ خبر دی اور اسی طرح آیت میں ہے ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ [الحجرات: ۴] حالانکہ وہاں پکارنے والا بنی تمیم کا ایک آدمی تھا، لیکن اللہ نے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا۔ یہاں بھی چاہے چھپانے والا ایک ابلیس تھا، لیکن اللہ نے مخاطب سب کو فرمادیا۔ "وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ وَعِلْمُهٗ أَتَمُّ" [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۵، البقرۃ، الآیۃ: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا]

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۠ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب سجدہ میں چلے گئے، مگر شیطان، اس نے نہ مانا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

آیات کا ربط:

گزشتہ آیات میں آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر علمی فضیلت بیان کی تھی، اب اس آیت مبارکہ میں عملی فضیلت کا اظہار ہے کہ اللہ نے پھر ملائکہ کو حکم دے کر آدم علیہ السلام کو اتنا بڑا شرف اور اعزاز بخشا کہ تمام ملائکہ نے باقاعدہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ اللہ نے ملائکہ کو سجدے کا حکم دیا، لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ ابلیس ملائکہ میں سے نہیں ہے، ابلیس جن ہے۔ جیسے قرآن مجید میں موجود ہے:

﴿ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ ﴾ [الکھف: ۵۰]

''ابلیس جنات میں سے ہے اور اس نے اللہ کے حکم سے خروج کیا۔''

ابلیس جن تھا، ابلیس کا ملائکہ کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ اس کے بارے میں محققین علماء کرام کی تحقیق یہ ہے کہ دراصل ابلیس جنوں میں سے تھا اور جنوں کو زمین میں آباد کیا گیا۔ ابلیس بھی زمین میں رہتا تھا، ابلیس کا مقام آسمانوں میں نہیں تھا۔ جنات نے زمین میں جب فساد برپا کیا اور خون ریزی کی تو ابلیس ان کے فساد اور خون ریزی میں شریک نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت اور ذکر میں مشغول رہتا تھا۔ سنت اللہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہر مخلوق کو کچھ موقع دیتے ہیں کہ وہ گناہ سے سنبھل کر توبہ کر لیں، لیکن جب نافرمانی حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی پکڑ آتی ہے۔ تو جب ان کا حدود سے تجاوز کرنے کا وقت آیا تو اللہ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ جا کر جنات کو ماریں، جنوں کو سزا دیں اور انہیں مجبور کریں کہ وہ زمین کے علاوہ جزیروں، پہاڑوں اور دور افتادہ جگہوں میں جا کر رہیں۔ ان کو آزادی سے رہنے کی اجازت نہ ہو، ملائکہ نے آکر جب اللہ کے حکم کی تعمیل کی تو ابلیس عبادت گزار تھا، اس کا فسادات سے کوئی تعلق نہیں تھا تو اس نے بھی جنات کو مارنے بھگانے سزائیں دینے میں فرشتوں کا ساتھ دیا۔ ملائکہ کی سفارش پر اور ملائکہ کے عرض کرنے پر اس کو بھی ملائکہ کے ساتھ آسمان پر رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ تو اس طرح ابلیس آسمان میں پہنچا۔

اب اس آیت کے اندر صراحت ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ جب ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے یہ سارا واقعہ حضور ﷺ کو بتلایا، اس لیے یہاں پر ایک لفظ مقدر ہے ''وَاذْكُرْ يَا مُحَمَّدُ!'' اے محمد! آپ یاد کریں اس وقت کو کہ جب ہم نے ملائکہ سے فرمایا کہ تم آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہیں کیا۔

اور بعض علماء نے فرمایا: خطاب براہِ راست اگرچہ حضور ﷺ کو ہے، لیکن مراد ساری امت کو مخاطب کرنا ہے۔ اس لیے یہاں لفظ ''اُذْكُرُوْا'' مقدر، ہے یعنی اللہ پاک بنی آدم کو یاد دلاتے ہیں: یاد کرو اے آدم کی اولاد! جب ہم نے ملائکہ کو حکم دے کر تمہارے ابا کو مسجود الملائکہ بنایا، تمہارا ابا آدم کو ہم نے اتنا بڑا اشرف بخشا۔

سوال: ابلیس فرشتوں میں کیسے شمار ہوا؟ ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تھا اور اس کو براہِ راست مخاطب بھی نہیں کیا گیا، اس کے بعد اس پر یہ عذاب اور غضب کیوں آیا؟

اس کے علماء کرام نے دو جواب دیے ہیں۔

پہلا جواب:

1 ......ایک جواب تو یہ ہے کہ ملائکہ کو حکم ملا تھا۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب اعلیٰ کو حکم ملے تو ادنیٰ خود بخود اس کے اندر آجاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ پھر سب کو نام لے لے کر حکم کیا جائے، جیسے سردار کو حکم ملے کہ تم اس کے آگے جھک جاؤ تو نوکر خود بخود جھک جائیں گے۔ جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا:

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ [طٰہٰ:۲۴]

اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ تم فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو چکا ہے۔

اور دوسری جگہ آتا ہے:

﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ [طٰہٰ:۴۳]

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف فرعون یا اس کے سرداروں کے لیے تو پیغمبر اور رسول نہیں بنائے گئے تھے، بلکہ بنو اسرائیل اور قبط کی تمام قوم کے لیے رسول اور نبی تھے، لیکن جب فرعون کو دعوت دی جائے گی تو وہ دعوت سب کو شمار ہوگی، یہ نہیں کہ ایک ایک کا نام لے کر ہدایت کی جائے کہ اس کے پاس بھی جاؤ اور اس کے پاس بھی جاؤ۔ اسی طرح ابلیس لعین بھی ملائکہ کے ساتھ رہ رہا تھا تو جب ملائکہ جیسی قوم کو یہ حکم ملا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، اس کے بعد

ابلیس کو براہِ راست حکم دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی، اس لیے ابلیس بھی اس حکم کے اندر شامل تھا۔

ازواج مطہرات کے لیے پردے کا حکم:

جیسا کہ اللہ نے بعض احکام میں اپنے پاک نبی ﷺ کی بیویوں کو حکم دیا:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ﴾ [الاحزاب: ۳۳]

اے میرے مدنی کی بیویو! اے میرے نبی کی بیویو! تم اپنے گھروں میں رہا کرو، اپنے گھروں میں قرار پکڑا کرو اور گھروں سے باہر زینت جاہلیت کر کے باہر نہ نکلا کرو۔ اب بظاہر خطاب حضور ﷺ کی بیویوں کو ہے، لیکن حکم سب امت کی عورتوں کے لیے ہے۔ جب اللہ کے پاک پیغمبر کی پاک بیویوں کو یہ حکم ہے کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلیں اور کسی کی بیوی کی کیا حیثیت ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اولوالعزم کی شان والی، عزت والی اور عصمت والی بیویوں کو یہ حکم گیا گیا تو وہ بھی اس حکم کے اندر شامل ہیں اور دوسری خواتین بھی۔

دوسرا جواب:

❷ ......اس کا دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا تھا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، اسی طرح اللہ نے ابلیس لعین کو بھی حکم دیا تھا، کیونکہ قرآن پاک میں دوسری جگہ یہ صراحتاً مذکور ہے۔ فرمایا:

﴿مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ﴾ [الاعراف: ۱۲]

اور بعض علماء نے یہ فرمایا ہے کہ وہ تبعاً للملائکہ بھی اس حکم میں شامل تھا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے بطورِ خاص بھی اس کو حکم دیا تھا کہ تم بھی سجدہ کرو، لیکن اس نے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو اس بنا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر لعنت آئی۔

روایات میں آتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ کے فرشتوں میں سے اسرافیل علیہ السلام نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا اور بعد میں سب نے سجدہ کیا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ انہوں نے اللہ کے حکم کی سب سے پہلے تعمیل کی تھی تو اللہ نے حضرت اسرافیل علیہ السلام کو بھی یہ شرف بخشا کہ ان کی پیشانی پر پورا قرآن لکھ دیا کہ قرآن مقدس جس طرح اللہ نے لوحِ محفوظ اور بیت العزت میں محفوظ رکھا اور اسی طرح حضور پاک ﷺ کے سینے میں محفوظ رکھا، اس کو ایک مقام یہ بھی بخشا گیا کہ اسرافیل علیہ السلام

کی پیشانی پر اللہ کے حکم سے قرآن کامل لکھ دیا گیا۔ اس کو بھی محدثین کرام نے ذکر فرمایا ہے۔

[الدر المنثور للسیوطي: 1/115]

اب جو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا گیا وہ کونسا سجدہ تھا؟ سجدہ عبادت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ تو بالکل نہیں تھا، اس کے اندر تو کوئی شبہ نہیں ہے، کیونکہ کسی بھی شریعت وملت میں اللہ کے سوا کسی غیر کے لیے سجدۂ عبادت جائز نہیں، کیونکہ عبادت وسجدہ صرف اللہ کے لیے ہے۔ یہ سجدۂ تعظیم تھا یا سجدۂ تحیہ یا سجدۂ تکریم تھا۔

[تفسیر ابن کثیر: 1/77، البقرة، الآیة: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ]

سجدۂ عبادت اور سجدۂ تعظیم میں فرق:

علماء نے سجدۂ عبادت اور سجدۂ تعظیم کے حکم میں فرق کیا ہے:

بطور عبادت سجدہ کیا جائے، جیسے ہم نماز میں اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں تو یہ خالص بندگی اور عبادت ہے۔ ایسا سجدہ جسے بھی ہو، خواہ وہ ملک ہو، اللہ کا نبی ہو، ولی ہو یا اور کوئی ذی مرتبہ شخصیت ہو تو اس کے کفر میں تو کوئی شبہ ہی نہیں، کیونکہ اللہ کے سوا کسی غیر کا سجدہ کفر ہے۔

لیکن اگر بطور تعظیم سجدہ کرے، جیسے لوگ سردار یا استاذ یا بزرگ کے آگے جھک جاتے ہیں، ان کا مقصد تعظیم و تحیہ ہوتا ہے، اس کو تمام فقہاء کرام نے حرام قرار دیا ہے، کفر قرار نہیں دیا۔

یہ سجدہ تعظیمی پہلی شریعتوں میں جائز تھا، اس امت کے لیے جائز نہیں ہے۔ جب آدم علیہ السلام کو ملائکہ نے سجدہ کیا، یا یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے اور ان کے ماں باپ یا جو اس وقت خالہ تھیں انہوں نے سجدہ کیا اس سے استدلال پکڑ کر اپنے پیروں کو یا قبروں پر سجدہ کرتے ہیں کہ دیکھو! ملائکہ نے بھی تو تعظیم کا سجدہ کیا تھا، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اور والدین نے بھی تو تعظیمی سجدہ کیا اور جس نے انکار کیا وہ شیطان بن گیا، لہٰذا ہم جو بزرگوں کو سجدہ کر رہے ہیں یہ تعظیمی سجدہ ہے اور جو انکار کرتا ہے......نعوذ باللہ...... وہ شیطان ہے کہ وہ تعظیم کا انکار کر رہے ہیں۔ اس سے استدلال پکڑتے ہیں تو یہ بالکل جاہلیت والی بات ہے اور ایسا قیاس ہے جس کی کوئی دلیل بھی نہیں بن سکتی۔ سب سے پہلے تو یہ بات سمجھیں کہ جو معاملات آسمانوں میں ہوں ان کا زمین سے کیا تعلق ہے؟ یہ ایک موٹی سی بات یاد رکھ لیں! زمین کے احکام علیحدہ ہوتے ہیں اور آسمانوں پر جو احکام ہوتے ہیں وہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ اب طواف تو ملائکہ بھی بیت المعمور کا کرتے ہیں، نماز اور عبادت ملائکہ بھی کرتے ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی

تسبیح وتحمید وتقدیس کرتے ہیں، لیکن ان کی عبادت اور ہماری عبادت کا کیا جوڑ ہوسکتا ہے؟ کیا ان پر روزے فرض ہیں؟ جس طرح ہم پر رمضان کے مہینے میں فرض ہیں، ان کے لیے کوئی پانچ نمازیں فرض ہیں؟ جس طرح ہم پر پانچ نمازیں فرض ہیں، ان کے لیے نکاح کرنا سنت ہے؟ جیسے بندوں کے لیے نکاح کرنا سنت ہے، ان کے لیے توالد تناسل اولاد کا ہونا ان سارے احکام کا ان سے تعلق ہی نہیں ہے، کیونکہ آسمان کے سارے احکام ہی نرالے ہیں۔ اسی لیے جب اللہ تبارک وتعالیٰ عالم آخرت میں اپنے بندوں کو اپنی رحمت سے شرف بخشیں گے اور اپنی مہربانی سے ہم جیسوں کو بھی جنت میں بھیجیں گے، وہاں احکام علیحدہ ہوں گے، نہ تکلیف ہوگی اور نہ شریعت ہوگی، نہ وہاں نماز ہوگی، نہ روزہ ہوگا اور نہ کوئی عبادت ہوگی۔ وہاں تو آرام ہی آرام ہے۔ ہاں! اگر اپنی مرضی سے کوئی عبادت کرنا چاہے تو اس کی مرضی ہوگی۔ اس لیے آسمان کے احکام کو زمین پر قیاس کرنا یہ کوئی عقل میں آنے والی بات نہیں۔ یہ تو ایسے ہو جائے گا مثلاً: کوئی آدمی یہ کہے کہ میں جو اپنے ملک میں نماز پڑھتا تھا میں تو اسی طرح پڑھوں گا، ہم روز روز نماز کیوں بدلتے رہیں؟ ہم ساری زندگی اپنے ملک میں نماز پڑھتے آئے ہیں، جس ٹائم پر پڑھتے تھے ہم اسی ٹائم پر پڑھیں گے۔ اور وہ اپنی گھڑی کو بھی نہ بدلے۔ اب وہ کہے کہ ہم وہاں پونے پانچ بجے نماز پڑھتے تھے اور میں یہاں اسی گھڑی کے مطابق پڑھوں گا۔ وہ تو پونے سات ہو جائیں گے۔ وہ تو ایک اقلیم سے دوسری اقلیم کا ٹائم بدل جائے گا، مثلاً: یوں اندازہ کریں کہ یہاں سے آدمی ایک ملک کا سفر کرتا ہے تو یہاں سے مثلاً: ایک بجے ہم رات سفر کر رہے ہیں تو آج کل یہاں اس ٹائم کے مطابق آدمی اس ملک میں پہنچتا ہے تو وہاں ابھی فجر کی نماز میں دو گھنٹہ باقی ہوتا ہے اور یہ نماز راستے میں گزر گئی تو اس وجہ سے جب اس اقلیم کا دوسری اقلیم سے وقت نہیں ملتا، ایک جگہ دن ہے اور دوسری جگہ رات ہے، ایک جگہ رات ہے اور دوسری جگہ دن ہے، ایک جگہ مثلاً: ہم ابھی مغرب کی نماز پڑھ رہے ہیں اور دوسری جگہ آدھی رات بھی ہوگئی ہے، ایک جگہ آدھی رات ہوگئی ہے تو دوسری جگہ صبح کا سورج نکل رہا ہے اور بعض ملک ایسے بھی آجاتے ہیں کہ وہاں مغرب اور عشا کا ٹائم اتنا قریب ہے کہ آپ جب مغرب کی نماز ختم کرتے ہیں تو عشا شروع ہوگئی، اتنا قریب ٹائم ہے۔ بعض ملک ایسے ہیں جہاں عشا کی نماز کا وقت ملتا ہی نہیں، سورج ادھر سے غروب ہوا اور ادھر سورج نکل گیا تو فجر ہوگئی، عشا کا وقت ہی نہ ملا اور فجر ہوگئی۔

تو اگر زمین کے احکامات میں اتنے اختلافات ہیں تو یہ کتنی بڑی جہالت ہے کہ آسمانوں کے فیصلے کو زمین پر نافذ کیا جائے۔ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا تو ہم بھی پیروں کو سجدہ کریں گے۔ اور دوسری یہ بات کہ

یوسف علیہ السلام کو سجدہ ہوا تھا تو یوسف علیہ السلام کی شریعت کا زمانہ الگ ہے، میرے آقا محمد عربی ﷺ کی شریعت کا زمانہ علیحدہ ہے۔ اُس دور کے احکام علیحدہ ہیں اور اِس دور کے احکام علیحدہ ہیں۔ تو یہ بہت بڑی جہالت ہے۔ اصل بات یاد رکھیں کہ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو اگر ملائکہ نے سجدہ کیا ہے تو آدم علیہ السلام کی بزرگی دیکھ کر، ان کی شکل وصورت دیکھ کر اور ان کی عظمت کو دیکھ کر خود سجدے میں گر پڑے یا اللہ نے حکم دیا، ان کو تو اللہ نے حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اور ان کے باپ نے سجدہ کیا تو یوسف علیہ السلام نے خواب دیکھا تھا اور نبی کا خواب ایسا ہوتا ہے جیسے اللہ کی وحی ہو، اللہ کے نبی کا خواب کبھی جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ میں بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں، اسی طرح بعینہٖ یوسف علیہ السلام نے بچپن میں خواب دیکھا تھا:

﴿إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۝﴾ [یوسف:۴]

ابا جان! میں نے دیکھا ہے کہ آسمان سے گیارہ ستارے ٹوٹے ہیں اور سورج اور چاند میرے آگے جھک رہے ہیں۔

ابا نے کہا: اس خواب کو راز رکھو، کسی کو نہ بتاؤ، مبادا لوگ حسد میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں شرف دیں گے، عزت دیں گے اور مقام دیں گے۔ یہ تمہاری بہت بڑی عظمت کی دلیل ہے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے سجدہ کیا تو اس وقت انہوں نے یہی بات فرمائی:

﴿هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا﴾ [یوسف:۱۰۰]

''ابا جان! یہ میرے خواب کی تعبیر ہے جو آج اللہ نے پوری کر دی۔''

وہاں بھی اگر سجدہ ہوا تو اللہ کے حکم سے سجدہ ہوا، یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو اگر سجدہ ہوا تو اللہ کے حکم سے سجدہ ہوا اور یوسف علیہ السلام کو سجدہ ہوا تو اللہ کے حکم سے ہوا۔ اور ہم جو کہتے ہیں قبر پر سجدہ نہ کرو، کسی زندہ انسان کو سجدہ نہ کرو، کسی سورج چاند کو سجدہ نہ کرو، ہم بھی اللہ کے حکم کے مطابق کہتے ہیں۔

تفسیر:

جیسے قرآن مجید میں اس سے رد کا گیا ہے:

﴿لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝﴾ [حم سجدہ:۳۷]

حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ صحابہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم جب قیصر و کسریٰ کے ملک میں جاتے ہیں تو وہاں لوگ اپنے بادشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں۔ اگر دنیا کے بادشاہوں کو سجدہ ہو رہا ہے تو آپ ہمارے دنیا اور آخرت میں بادشاہ ہیں تو آپ کو ہم سجدہ کیوں نہ کریں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: خبردار! اگر میں کسی کے لیے سجدے کی اجازت دیتا تو میں بیوی کے ذمہ لگاتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، لیکن اللہ کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں۔ [سنن أبي داود، حدیث: ۲۱۴۰، بَابٌ: فِي حَقِّ الزَّوْجِ عَلَى الْمَرْأَةِ]

دوسری حدیث شریف میں ارشاد ہے:

((لَعَنَ اللهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ))

''یہود و نصاریٰ پر اللہ لعنت کریں کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

[صحیح البخاری، حدیث: ۱۳۹۰، بَابُ مَا جَاءَ فِي قَبْرِ النَّبِيِّ ﷺ، وَأَبِي بَكْرٍ...]

اسی طریقہ سے دیکھیں کہ انہوں نے متعہ کا مسئلہ نکالا، حالانکہ وہ ابتداء اسلام میں تھا۔ اور ابتداء اسلام میں تو لوگ شراب بھی پیتے تھے۔ جب شراب کی حرمت نہیں آئی تھی تو لوگ شراب پیتے رہے۔ جب حرام ہی نہیں کیا گیا تو کیا جرم ہے؟ جب تک اللہ نے کعبہ نہیں بدلا لوگ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے۔ کعبہ میں کھڑے ہوتے تھے، لیکن نماز ادھر پڑھتے تھے۔ اسی طرح متعہ ابتداء میں تھا، لیکن جب متعہ کے بارے میں صراحتاً تصریح آگئی، نفی آگئی اور نہی آگئی، اعلان ہو گیا کہ آج کے بعد متعہ نہیں ہو گا۔ اور اللہ نے قرآن پاک میں دو چیزوں کا فیصلہ کر دیا، اللہ نے فرما دیا: تمہارے لیے وہ عورت حلال ہے جو آزاد ہے، مسلمان ہے، تیرے نکاح میں آئی ہے یا وہ باندی جو جہاد میں تیرے نصیب میں آئے۔ ان دو کے علاوہ اور کوئی عورت تمہارے لیے حلال نہیں۔ تو اللہ نے قرآن میں بھی پابندی لگا دی اور حضور ﷺ کی طرف سے اعلان آگیا، لیکن انہوں نے متعہ کو ایک گنجائش دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا آپ توجہ کریں کہ آج پوری دنیا میں جتنا طوائف کا کاروبار ہے وہ سب انہی جیسے لوگوں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ پوری دنیا کی طوائفوں کی تاریخ پر آپ نظر ڈالیں، چاہے وہ نسلی طوائف ہو چاہے اصلی طوائف ہو، یا کسی شریف گھرانے کی لڑکی کو کسی نے اغوا کیا اس کو سنبھال نہ سکا اور اس کے بعد وہ پھرتی پھراتی طوائف بن گئی۔ ان سب کے پاس آپ جا کر معلومات کر لیں، اخبار موجود ہیں، رسالے موجود ہیں اور کتابیں موجود ہیں تو اس مذہب میں ان کو گنجائش مل رہی ہے کہ یہ جو میں پیشہ کر رہی ہوں زنا نہیں ہے، بلکہ متعہ ہے، لہٰذا جرم نہیں ہے۔ دنیا

کے اندر کوئی آدمی کتنا خراب کیوں نہ ہو، لیکن کون کہتا ہے کہ میں جہنم میں جاؤں؟ کوئی آدمی اپنے آپ کو آگ میں جلانا نہیں چاہتا، چاہے وہ گناہ گار ہو، شرابی ہو۔ ان کے دماغ میں بھی یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ یہ متعہ جائز ہے اور متعہ ہوتا ہی یہی ہے کہ نہ گواہوں کی ضرورت، نہ خطبہ کی ضرورت، نہ نکاح کی ضرورت، نہ رخصتی کی ضرورت، نہ طلاق کی ضرورت، نہ نسب کی ضرورت اور نہ حسب کی ضرورت۔ بس ایک ٹائم کا فیصلہ کر لیا کہ اتنے ٹائم کے لیے اتنے پیسے ہیں۔ تو جو زنا والا گروہ ہے وہ سب کا سب ان کے گروہ میں چلا گیا، سارے کے سارے اس مذہب میں چلے گئے کہ ان کو وہاں مذہب میں تسکین ملی۔ اہل سنت کے نزدیک اگر میں فاحشہ ہوں اور زانیہ ہوں تو رجم کی حقدار ہوں، میں کوڑے کی حقدار ہوں اور میں جہنم کی حقدار ہوں، لیکن یہ کتنا میٹھا مذہب ہے کہ جو کہتا ہے جو مرضی آئے کرو۔

اسی طرح اگر زکوٰۃ کا مسئلہ آجائے تو کہا جاتا ہے کہ ان کی زکوٰۃ نہ کاٹی جائے، کیونکہ ان کے مسلک میں زکوٰۃ کا مسئلہ ہے ہی نہیں جو اہل سنت والجماعت کے مسلک میں ہے۔ لیکن اس کی گنجائش کا نتیجہ کیا نکلا جتنے مالدار سنی تھے اپنا پیسہ بچانے کے لیے فارم بھر کر ان میں شامل ہو گئے کہ بھائی! ہمارے اڑھائی پرسنٹ بچ جائیں۔ ایمان جاتا ہے تو جائے، ایمان کا کیا ہے؟ وہ تو پھر کلمہ پڑھ لیں گے، لیکن اڑھائی پرسنٹ تو بچ جائیں گے۔ اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! جب بھی آپ لچک دیں گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ تباہی کے غار میں چلے جائیں گے، لوگ کرتے کرتے پھر کفر و شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔

یہودی عورت کے چوری کرنے اور سفارش کرنے کا واقعہ:

یہی وجہ تھی کہ ایک فاطمہ نامی عورت کا کیس آیا اور یہودیوں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس کا ہاتھ نہ کٹے۔ اگر اس کا ہاتھ کٹ گیا تو ہمارے خاندان کی ناک کٹ جائے گی کہ ان کے تو خاندان کی عورتیں بھی چور ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ کون سفارش کرے؟ تاکہ حضور ﷺ سے رعایت مانگی جائے کہ جھگڑا یہودی عورت کا ہے، جو آپ کے دین کو بھی نہیں مانتی تو آپ اگر تھوڑی سی رعایت دے دیں گے تو یہودیوں کے دل میں آپ کی محبت پیدا ہو جائے گی، دین اسلام کی رغبت پیدا ہو جائے گی کہ حضور پاک ﷺ نے ہماری رعایت کر دی، ہماری عزت رکھ دی اور ممکن ہے اس عورت کا قبیلہ مخزومیہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ جو حضور ﷺ کے اتنے

محبوب تھے کہ حضور ﷺ کے بیٹے تھے، ان کو انہوں نے بریفنگ کی کہ دیکھو! ایک تو یہ ہے کہ مسلمان کا مقدمہ ہی نہیں تو اللہ کے نبی کا دین مسلمانوں کے لیے ہے اور جو کلمہ نہیں پڑھتے ان کا دین کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اصل میں وہ خود پھنس گئے تھے، اپنا مقدمہ اپنی مرضی سے حضور ﷺ کی خدمت میں لے آئے، حضور ﷺ نے انہیں نہیں بلایا تھا، وہ تو اس لیے لائے تھے کہ نیا دین ہے، نئے نبی ہیں، شاید ادھر سے ہمیں کوئی رعایت مل جائے تو اب جب انہیں پتہ چلا کہ اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، کوئی رعایت نہیں ہے تو اب انہوں نے کہا کہ ہم نے فیصلہ خود کورٹ میں جا کر پیش کر دیا، اللہ نے بھی حکم دیا کہ اگر کوئی ہمارے پیغمبر علیہ السلام کے پاس یا ہمارے حاکم کے پاس دوسرے مذہب والا فیصلہ کرانے آتا ہے تو اللہ کے قرآن کے مطابق فیصلہ کریں۔

اب حضرت اسامہ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ایک یہودی عورت کا مسئلہ ہے، ہمارے دین سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر آپ انہیں تھوڑی سی رعایت دے دیں، کوئی سزا مقرر فرما دیں اور پھر وہ مدعی کو بھی راضی کرنے پر تیار ہیں، جرمانہ بھگتنے پر بھی تیار ہیں، صرف ہاتھ نہ کاٹا جائے، اتنی رعایت کر دیں تو شاید یہ خاندان اسلام میں آجائے۔ حضور پاک ﷺ کا چہرہ مبارک سرخ ہوگیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسامہ! خبردار! اللہ کی حدود ہیں، سفارش کرنے کی جرات کرنے کے لیے آئے ہو؟ شریعت کا مسئلہ ہے کہ سفارش اس وقت تک کی جاتی ہے جب تک معاملہ عدالت میں نہ پہنچے۔ جب معاملہ عدالت میں آگیا تو اب سفارش کا کیا مطلب؟ ہاں! اگر کوئی جھگڑا ہے، آپ نے ان کے عدالت کے پاس جانے سے پہلے اور حکومت کے پاس مقدمہ دائر کرنے سے پہلے آپس میں صلح کر لی تو معاملہ ختم ہوگیا۔ اگر وہ جھگڑا قاضی کے پاس گیا تو پھر رعایت نہیں ہے۔ تمہیں اتنی جرات ہوگئی کہ تم اللہ کی حدود میں سفارش کرنے کے لیے آگئے؟ خبردار! سن لو یہ تو فاطمہ مخزومیہ ہے، یہودی قبیلہ کی لڑکی ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟ میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں ہاتھ کاٹ دیتا۔ اسلام کے قانون میں لچک کا کیا معنی ہے؟ [صحیح البخاري، حدیث: ۳۴۷۵، کتاب: حدیث الغار]

﴿فَسَجَدُوٓا﴾ میں فا تعقیب کے لیے ہے۔ جب اللہ نے ملائکہ کو حکم دیا تو ملائکہ فوراً سجدے میں گر گئے۔ ﴿أَبَىٰ﴾ مگر ابلیس نے انکار کیا ﴿وَاسْتَكْبَرَ﴾ اور استکبار کیا۔ اس کے بعد فرمایا ﴿وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة: ۳۴] لفظ "کان" آیا ہے، یعنی تمہیں اب معلوم ہوا، لیکن اللہ کے علم میں تو وہ پہلے ہی کافر تھا اور منکر تھا۔

دوسری آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ شیطان نے کہا:

﴿أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ﴾[الاعراف:۱۲]

''میں اس سے بہتر ہوں۔ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔''

(حدیث) اللہ تبارک وتعالی نے انبیاء علیہم السلام کو ساری دنیا سے زیادہ علم عطا فرمایا تو وہ ساری مخلوق سے افضل ٹھہرے اور ان میں سے اللہ تعالی نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو زیادہ علم عطا فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اوّلین و آخرین کا علم عطا فرمایا گیا۔ جو علوم اوّلین وآخرین کو دیے گئے تھے اللہ نے مجھے وہ بھی عطا فرمائے ہیں۔

جیسا کہ حدیث پاک میں یہ بات واضح موجود ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک ابن آدم جنت والوں کے عمل کرتا ہے، گویا کہ جنت ایک ہاتھ کے فاصلے پر رہ جاتی ہے، یعنی بالکل جنت کے قریب پہنچ جاتا ہے، لیکن پھر وہ کافروں والے عمل کرتا ہے اور جہنم میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی ساری زندگی دوزخ والوں کے عمل کرتا رہا، کافروں کے اعمال کرتا رہا، جہنم بالکل قریب آگئی، لیکن اللہ تعالی کی رحمت غالب آئی، اللہ نے اس کا رخ ہدایت کی طرف موڑ دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے پلٹا کھایا، کفر وشرک سے توبہ کی، توحید اور اعمالِ صالحہ پر آیا اور جنت میں داخل ہوگیا۔ [صحیح البخاري، حدیث:۳۲۰۸، بَابُ: ذِكْرِ الْمَلَائِكَةِ]

نجاتِ اعمال کا دارومدار نیک خاتمے پر ہے:

اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ آخری زمانے میں میری امت پر ایک وقت ایسا آئے گا، ایک ایسا دورِ فتن آئے گا کہ صبح کو ایک آدمی باقاعدہ ایمان والا ہوگا، لیکن شام کو کافر ہو جائے گا۔ اور فرمایا کہ شام کو ایمان والا ہوگا اور صبح کو کافر ہو جائے گا۔ اس لیے اس دور کے اندر خصوصی طور پر اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے اور اللہ سے ایمان اور حسن خاتمہ کی دعا کرتے رہنا ضروری ہے۔ [صحیح مسلم، حدیث:۱۱۸، بَابُ: الْحَثِّ عَلَى الْمُبَادَرَةِ بِالْأَعْمَالِ...]

سجدہ نہ کرنے سے ابلیس کافر کیسے ہوگیا؟

یہاں ایک اشکال ہے کہ سجدہ نہ کرنا بدعملی ہے، جس کی وجہ سے بندہ فاسق ہو جاتا ہے تو ابلیس سجدہ نہ کرنے سے کافر کیسے ہوگیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی بدعملی نہیں ہے، بلکہ یہاں اس نے اعراض کیا اور اللہ کے حکم سے منہ موڑا کہ یا اللہ! تو نے مجھے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے، میں تو آدم سے زیادہ بہتر اور افضل ہوں۔ تو اللہ تبارک

تعالیٰ کے حکم سے کوئی اعراض کرے اور اس پر اعتراض کرے تو اس کے کفر میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا اور اس کے ساتھ اس نے تکبر کیا، جس کا ذکر دوسری آیت میں ہے۔ اس نے کہا:

﴿أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ، خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ﴾ [الاعراف: ۱۲]

تکبر کرنا تو صرف میرے اللہ کی شان ہے۔

جیسے حدیث صریح میں آتا ہے: پروردگار عالم نے فرمایا:

((اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي وَ الْعَظَمَةُ إِزَارِي)) [سنن أبي داود، حديث: ۴۰۹۰، باب: ما جاء في الكبر]

کبریائی اور عظمت میرے لیے لازم و ملزوم ہے۔ اگر کوئی تکبر کرے گا تو میں اس کی گردن توڑ ڈالوں گا۔ اس لیے مخلوق کا تکبر کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کی دوسری وجہ:

اور دوسری وجہ ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کی حسد تھا۔ حسد کا معنی یہ ہے کہ آدمی دوسرے سے زوالِ نعمت کا ارادہ کرے کہ وہ نعمت اس سے چھین لی جائے اور مجھے مل جائے۔ حسد اتنا بڑا جرم ہے کہ ابلیس نے آسمانوں میں کیا، دنیا میں آنے کے بعد آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کے ساتھ حسد کیا، اس لیے سب سے پہلا گناہ جو اسمانوں اور زمینوں میں کیا گیا ہے وہ حسد ہے اور حسد کی وجہ سے ابلیس ملعون و مردود بنا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۸، البقرة، الآية: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ]

حجر اسود کئی بار بادشاہ لے گئے:

جیسا کہ تاریخوں کے اندر موجود ہے کہ کئی بار حجر اسود کو نکالا گیا، کئی دفعہ لوگ حجر اسود کو لے گئے، یعنی کعبۃ اللہ سے نکال کر دوسروں ملکوں میں لے گئے۔ ایک دفعہ ایک بادشاہ یمن میں لے گیا، اس نے جا کر پہاڑوں میں پتھروں میں پھینک دیا۔ قریشِ مکہ بے چارے جا کر ڈھونڈ کر لے آئے۔ اور اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا اور حجر اسود کو نکال کر لے گیا۔ افغانستان کے مجاہدوں کو اللہ نے توفیق دی، افغانستان کی نسل میں سے ایک بادشاہ اٹھا (افغانستان اور عرب کا فاصلہ ملاحظہ کر لو) وہاں سے وہ اپنی فوجیں لے کر یمن میں آ کر لڑا اور حجر اسود لے آیا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو پہلے سے چنا ہوا ہے۔

حضور ﷺ کو سابقہ انبیاء علیہم السلام پر بہت سی چیزوں میں فضیلت دی گئی:

یہی وجہ ہے کہ اہل سنت والجماعت میرے پاک نبی ﷺ کی اس حدیث پر عمل کرتے ہیں، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: تمام کائنات کی زمین پاک ہے اور ساری زمین کو پاک بنا دیا اور سجدہ کی جگہ بنا دیا۔ [صحیح مسلم، حدیث: ۵۲۳، کِتَابُ الْمَسَاجِدِ] یعنی میری امت کا بندہ کسی جگہ موجود ہے، یہ دیکھ لے کہ کوئی پلیدی تو نہیں پڑی ہوئی، نجاست اور غلاظت پارس کی علامت تو نہیں پڑی ہوئی ہے، اگر نہیں ہے تو زمین پر تیمم بھی کر سکتا ہے اور سجدہ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن جن کے دل کے اندر شرک کا روگ ہوتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ ملنگ ایک ٹھیکری اپنے ساتھ رکھتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک کربلا کی زمین کا سجدہ ہے۔ اب وہ بت پرستی کر رہے ہیں، اہل سنت والجماعت کا بت پرستی سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ ان ملنگوں کا سجدہ ایک مخصوص ٹھیکری پر ہے، ایک مخصوص مٹی پر ہے اور ایک مخصوص چیز پر ہے۔ اس کے بغیر وہ کہتے ہیں: ہمارا سجدہ بھی نہیں ہوتا۔ تو جب ان کا سجدہ کسی خاص چیز پر کیا گیا تو مخالفت آئی اس حدیث کی اور دوسری عمل محمد عربی ﷺ کی مخالفت آئی کہ حضور ﷺ نے کبھی ٹھیکری ساتھ نہیں لی، حضور پاک ﷺ جنت سے بھی کوئی ٹھیکری ساتھ نہیں لائے، حالانکہ معراج کی رات آپ کو جنت کی سیر کرائی گئی۔ اگر آپ چاہتے تو جنت سے کوئی پتھر کا ٹکڑا لے آتے، اس پر نماز پڑھتے، لیکن حضور پاک ﷺ جب مکہ میں ہیں تو مکہ میں پڑھی اور مدینہ میں ہیں تو مدینہ میں پڑھی، نہ کبھی ٹھیکریاں رکھیں، نہ کبھی ٹکڑے رکھے اور نہ کبھی سامنے کوئی تصویریں رکھیں۔ اسی طرح آپ دیکھیں کہ جب آپ جنازہ پڑھتے ہیں، حالانکہ جنازہ بھی نماز ہے، دعا ہے، لیکن جنازہ میں رکوع بھی نہیں ہے اور سجود بھی نہیں ہے۔ وجہ کیا ہے کہ میت سامنے رکھی ہوتی ہے، اگر اس نماز میں رکوع اور سجود ہوتا تو کوئی جاہل آدمی یہ عقیدہ بنا لیتا کہ بندے کو سجدہ ہو رہا ہے، بندے کو رکوع ہو رہا ہے۔ اللہ نے فرمایا: تم کھڑے کھڑے درود بھی پڑھ لو، دعا بھی پڑھ لو، سلام پھیر لو اور چلے جاؤ، تاکہ امت قیامت تک شرک کے راستے پر نہ چل پڑے۔ جتنے شرک کے راستے تھے وہ شریعت اسلام نے بند کر دیے ہیں۔ تو اس لیے ایسی باتوں سے استدلال کرنا جہالت ہے۔

آدم و موسیٰ علیہما السلام کا مناظرہ:

مفسر فرماتے ہیں اور بھی بہت سی احادیث مبارکہ ہیں جو اس موضوع پر دلالت کرتی ہیں، جیسا کہ آپ نے

حدیث شفاعت پہلے پڑھی ہے، موسیٰ علیہ السلام کی وہ بات جو حدیث مبارک میں موجود ہے:

((قَالَ: أَنْتَ آدَمُ الَّذِيْ خَلَقَهُ بِيَدِهِ وَنَفَخَ فِيهِ رُوْحَهُ وَ أَسْجَدَ لَهُ مَلَائِكَتَهُ))

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا تھا کہ یا اللہ! مہربانی فرمائیں اور مجھے آدم علیہ السلام کی زیارت کرائیں، کیونکہ جس نے اپنی ذات کو بھی جنت سے نکالا اور اسی وجہ سے ہم بھی جنت سے نکالے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے ملا دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: تم ہی وہ ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے پیدا فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم مبارک سے اس میں روح پھونکی اور جن کو ملائکہ سے سجدہ کروایا، یعنی اتنی بڑی فضیلت اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہیں نصیب فرمائی۔

حدیث مبارک کا مضمون طویل ہے، لیکن یہاں مختصراً مفسر نے ذکر فرمایا کہ جس سے یہ ثابت کرنا تھا کہ آدم علیہ السلام بھی یہ اعتراف کریں گے کہ اللہ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا اور اللہ نے خود آپ کے اندر نفخ روح فرمایا، پھر اللہ نے تمام فرشتوں سے سجدہ کروایا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ابا حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ اگر آپ غلطی نہ کرتے (اس درخت سے چکھ نہ لیتے) تو نہ آپ جنت سے باہر آتے اور نہ پھر ہمیں جنت سے محروم ہونا پڑتا۔ آدم علیہ السلام پھر جواب میں فرمائیں گے: اے موسیٰ! تم وہی ہو جس کو اللہ نے تورات عطا فرمائی ہے اور جس کو اللہ نے نبی بنایا اور رسول بنایا؟ وہ کہیں گے: ہاں جی! میں وہی ہوں جس کو اللہ تعالیٰ نے معجزات بھی عطا فرمائے۔ تو حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: کیا پھر تورات میں تم نے یہ نہیں پڑھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے سے بھی پہلے فیصلے کر لیے تھے کہ اس طرح آدم پیدا ہوں گے، اس طرح ان کو جنت میں رکھا جائے گا اور اس طرح آدم کو درخت سے منع کیا جائے گا؟ وہ کہیں گے: ہاں یہ تو میں نے پڑھا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ پھر آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ [صحيح البخاري، حديث: ٣٤٠٩، باب: وَفَاةُ مُوسَى وَذِكْرُهُ بَعْدُ]

ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ حضرت ضحاک رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

"كَانَ إِبْلِيسُ مِنْ حَيٍّ مِنْ أَحْيَاءِ الْمَلَائِكَةِ"

ابلیس بھی دراصل ملائکہ کے ایک قبیلے میں سے تھا، اس کو جلانے والی آگ سے پیدا کیا گیا تھا، ملائکہ کے اندر اس کا نام حارث تھا اور وہ جنت کے خزانوں کا داروغہ تھا۔ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو نور سے پیدا کیا اس قبیلے کے علاوہ جو ابلیس والا قبیلہ ہے، ان کو آگ سے پیدا کیا گیا تھا۔ پھر زمین میں جنات

نے سرکشی کی تو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو حکم کیا کہ تو ان فرشتوں کی جماعت لے جا، جن کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور جا کر ان جنات کو زمین کے اطراف جزائر وغیرہ میں پہنچا دے۔ جب ابلیس نے یہ کیا تو اس کے دل میں غرور پیدا ہوا کہ جنات کے مقابلہ کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہے اور میں نے ایسا کام کیا ہے جو کسی نے نہیں کیا، میں نے جنات کو شکست دی اور ان کو بھگا دیا۔ اللہ نے جان لیا کہ اس کے دل میں غرور پیدا ہو گیا ہے اور ملائکہ مطلع نہ ہو سکے، ان کو کیا پتہ کہ اس کے دل کے اندر کیا ہے؟ کیونکہ ملائکہ تو ظاہر کو جانتے تھے، علم غیب تو خاصۂ خدا ہے، اس کے سوا تو کوئی علم غیب کو نہیں جانتا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۵، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ]

تخلیقِ آدم علیہ السلام:

پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ مٹی کو لایا جائے۔ تو مٹی کو آسمانوں پر لے گئے تو وہ ایسی مٹی تھی جو اعلیٰ قسم کی تھی کہ جس کو گوندھا جائے تو چکناہٹ پیدا ہو۔ پھر اس مٹی کو گوندھا جائے یا پکایا جائے۔ جیسے برتن بناتے ہیں تو پہلے اچھی سے اچھی مٹی ڈھونڈتے ہیں، پھر مٹی کو صاف کرتے ہیں کہ گرد و غبار نکالا جائے، پھر پانی ڈال کر اس کو گوندتے ہیں، تا کہ چکناہٹ پیدا ہو، پھر اس سے برتن بناتے ہیں۔ اس کے بعد ان برتنوں کو سکھاتے ہیں، سکھانے کے بعد پھر ان برتنوں کو بھٹیوں میں پکاتے ہیں، پھر ان سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ تو یہ مراحل ہیں کہ پہلے مٹی تھی، پھر گوندھی گئی، پھر سکھائی گئی اور پھر پکائی گئی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے دست قدرت سے بنایا اور جب آدم علیہ السلام کا جسد بنایا تو چالیس دن تک وہ جسد ایسے پڑا رہا۔ اب جب ابلیس گزرتا تو اس کو چھیڑتا اور اس سے آواز پیدا ہوتی تو وہ کہتا کہ ہے تو یہ کوئی خالی چیز، جس کے اندر سے یہ آواز آتی ہے۔

اللہ پاک نے ان کو ایسی مٹی سے بنایا:

﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿١٤﴾﴾ [رحمٰن: ۱۴]

جیسے پکی ہوئی مٹی کو فخار کہتے ہیں کہ جب اینٹیں پک جاتی ہیں اس کو مارو تو اس سے آواز آتی ہے۔ مٹی کو اگر پکا لیا جائے تو اس کو اگر آپ برتن پر ماریں گے تو آواز کرنے والا ہوگا۔ تو جسدِ آدم ایسے تھا، اندر سے خالی تھا، یعنی بھرا ہوا نہیں تھا۔

اب ابلیس آتا تو منہ کی طرف سے داخل ہوتا تو نیچے سے نکل جاتا اور نیچے کی طرف سے داخل ہوتا تو منہ کی طرف

سے نکل جاتا، کیونکہ اندر سے خالی تھا اب اس کے بعد کہتا کہ تم اسی لیے تو نہیں بنائے گئے کہ بس آواز آتی رہے۔ اگر مجھے تم پر غلبہ ملا تو میں تمہیں ہلاک کردوں گا، اگر مجھے تم پر مسلط کیا گیا تو میں تجھے نافرمانی پر تیار کروں گا۔

اب اللہ تعالیٰ نے روح پھونکی اور وہ روح سر سے پھونکی گئی، یعنی اس کی ابتداء دماغ کی طرف سے کی گئی۔ پہلے سر میں روح آئی، پھر منہ میں روح، ایسے آہستہ آہستہ چلتے چلتے سارے بدن کے اندر روح پیدا ہوگئی۔ جیسے روح چلتی گئی ویسے گوشت بھی بنتا گیا، ہڈیاں بھی بنتی گئیں اور ہر چیز اپنے مقام پر بنتی گئی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۵، البقرة، الآیة: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ]

اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ یہ اللہ کا نظام ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو روح اعلیٰ جانب سے داخل کی گئی، یعنی اوپر سے داخل کی گئی، لیکن جب آدمی پر موت آتی ہے تو روح نیچے سے نکالی جاتی ہے۔ پہلے پاؤں جواب دیں گے، پھر پنڈلیاں جواب دیں گی، اسی طرح نیچے کا حصہ جواب دے گا۔ اور اسی طرح کرتے کرتے آنکھوں سے اور سر سے روح نکل گئی اور آخر کار انسان ختم ہوگیا، کیونکہ جب آدمی پر موت آتی ہے ﴿وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ﴾ [القیامۃ: ۲۹] پنڈلی پنڈلی سے ٹکرا رہی ہے، پاؤں حرکت کرنا چھوڑ گئے، دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے، آدھا بدن ٹھنڈا ہوگیا ہے۔

اس لیے قاعدہ ہوتا ہے کہ اگر موت کے قریب ہے تو جب اس پر موت آجائے تو اس کی آنکھوں کو بند کردیں، کیونکہ جب آنکھیں کھلی ہوں اور روح نکل جائے تو اب وہ بے چارہ کیسے آنکھیں بند کرے؟ روح تو پرواز کرگئی اور جس حالت میں آدمی پڑا ہے اس حالت میں پڑا رہے گا، کیونکہ اب وہ حرکت تو کر نہیں سکتا۔

اس لیے حکم ہوتا ہے کہ جو اس کے قریب بیٹھے ہوں وہ اس کی ٹانگوں کو بھی سیدھا کردیں، کیونکہ اگر یوں ہی رہ گئیں تو یوں ہی اکڑ جائیں گی، لیکن چونکہ اس وقت ان کے اندر سے روح تازہ نکلی ہوتی ہے تو بدن میں گرمی اور حرارت موجود ہوتی ہے، لہٰذا حکم ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھ بھی سیدھے کردیں، پاؤں بھی سیدھے کردیں، رخ بھی قبلے کی طرف کردیں اور اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اچھی طرح بند کردیں اور اگر باندھ دیں تو اور اچھی بات ہے، تاکہ منہ کھلا ہوا نہ رہ جائے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پٹی باندھ دیتے ہیں، کیونکہ اگر منہ کھلا ہوا ہے تو پھر وہ خود تو منہ بند کر نہیں سکتا، وہ تو اس دنیا سے چلا گیا۔

ہمارے ہاں جاہلیت میں رواج بن گیا ہے، لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ اگر آنکھیں کھلی ہوں تو کہتے ہیں کہ

بیٹے کا انتظار کر رہا ہے، باپ کا انتظار کر رہا ہے اور بھائی کا انتظار کر رہا ہے۔ دیکھا نہیں کہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور دروازے کی طرف نظر ہے؟ اس کی روح جب ختم ہوگئی تو مٹی کا وہ انتظار کر رہا ہے۔ باتیں تو اس وقت تک ہیں جب تک روح اندر ہے۔ جب روح پرواز کر گئی تو بات ختم ہوگئی۔ کہاں کا بیٹا؟ کہاں کا بھائی؟ وہ تو قصہ ہی ختم ہوگیا۔ پھر آدمی کو کیا پتہ کہ کس نے آنا ہے اور کس نے نہیں آنا ہے؟

تو اس لیے روح جب نکالی جاتی ہے تو نیچے سے نکالی جاتی ہے اور جب ڈالی گئی تو اوپر سے ڈالی گئی ہے۔ جب آدمی کی روح نکل جاتی ہے تو وہ چیزیں اس کے سامنے ہیں۔ اگر اللہ کا صالح بندہ ہے تو اللہ کے ملائکۃ الرحمۃ اس کے سامنے ہوتے ہیں، ان پر وہ نظریں لگائے ہوئے ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے اگر برا آدمی ہوتا ہے تو عذاب والے فرشتے آئے ہوتے ہیں، ان پر اس کی نظریں ہوتی ہیں۔ اس لیے حکم ہوتا ہے کہ اب اس کی آنکھیں بند کر دیں، کیونکہ جب روح نکل جائے تو آدمی کے پلے میں کچھ نہیں رہتا۔ اسی طرح آنکھیں کھلی رہیں گی، جہاں بازو پڑا ہے پڑا رہے گا، جہاں ہاتھ مڑے ہوئے ہیں تو مڑے رہیں گے اور اگر سیدھے کر دیں تو آسانی ہو جائے گی غسل میں، تدفین میں اور تجہیز میں، کیونکہ اسلام نے جن جن چیزوں کا حکم دیا ہے اس کے اندر کروڑوں حکمتیں ہیں۔

اب دیکھیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: انسان کی جب قبر بناؤ تو قبر بہت زیادہ گہری بھی نہ ہو اور بہت زیادہ اونچی بھی نہ ہو۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ چار اور پانچ فٹ کے درمیان ہو، اس سے زیادہ نیچے نہ لے جائیں۔ اور تین چار فٹ سے زیادہ چوڑی نہ ہو، اسی طرح سات آٹھ فٹ لمبی ہونی چاہیے۔ تو اس کے اندر کروڑوں حکمتیں ہیں۔ میں آج ہی پڑھ رہا تھا، جدید تحقیق آئی ہے کہ اگر آدمی کو زمین میں دو یا تین فٹ نیچے رکھا جائے تو زمین کے اثرات اس پر زیادہ جاتے ہیں اور اس کے بدن کے اثرات مٹی سے باہر بھی آتے ہیں اور جانوروں کو بھی اس کی ہوا پہنچ جاتی ہے اور جانور بھی اس کو نکال سکتے ہیں۔ اور اگر آپ اسے چھ فٹ سے زیادہ نیچے لے جائیں تو نیچے جو پانی کے اثرات ہیں وہ قبر میں جلدی آجاتے ہیں اور اس کی وجہ سے مردے پر اثرات پیدا ہوتے ہیں، لیکن اگر آپ اسے چار پانچ فٹ کی سطح پر رکھیں گے تو نہ اس کے اثرات باہر جائیں گے اور نیچے متاثر ہوں گے۔ تو اب حضور ﷺ نے تو چودہ سو سال پہلے ہمیں یہ بات سمجھا دی تھی، انہوں نے تو اب طبقات الارض پر بحث کی ہے کہ زمین کی تہیں کتنی ہیں؟ زمین کی گہرائی کے اثرات کتنے ہیں؟ کہاں تک جراثیم کا اثر جاتا ہے؟ کہاں تک زمین کے اثرات نہیں جاتے؟ اور نیچے پانی کی سطح کہاں تک آکر اس کو متاثر کرتی ہے اور کہاں تک نہیں کرتی؟ مختلف علاقوں کی مختلف زمینیں ہیں۔

اس لیے پھر حضور ﷺ نے ہمیں قبر کی تعلیم دے دی کہ ایک لحد ہے اور ایک شق ہے۔ یعنی ایک تو یہ ہے کہ اسی طرح آپ قبر کھودیں اور مردے کو نیچے زمین پر رکھ دیں اور ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ قبر کی دیوار میں کھدائی کر کے پھر میت کے لیے ایک جگہ بنائیں، پھر میت کو اس کے اندر رکھا جائے۔ تو یہ دونوں حکمتیں تھیں، کیونکہ زمینیں مختلف ہیں۔ بعض زمینیں ایسی ہیں کہ آپ اس میں لحد بنا ہی نہیں سکتے۔ اگر لحد بنائیں گے تو ٹوٹ جائے گی تو وہاں آپ شق کا فائدہ لے لیں گے اور جہاں آپ کو زمین بڑی اچھی ملتی ہے، اعلیٰ مٹی ہوتی ہے کہ آپ اس کو جہاں کھود کر کھڑا کر دیں تو ایسے کھڑی ہے جیسے سیمنٹ کھڑی ہوتی ہے تو اس میں آپ لحد بنائیں۔ تو بہر حال اب چودہ سو سال کے بعد جدید علوم بھی تحقیق کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے جو چودہ سو سال پہلے محمد عربی ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا، یعنی حیرت ہوتی ہے!!

سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی بیماری بتلا دینا معجزۂ رسول ﷺ ہے:

آج اسی طرح میں ایک حدیث مبارک پڑھ رہا تھا۔ ایک صحابی حضرت سعید رضی اللہ عنہ ایک دفعہ بیمار ہوئے، ان کو شدید تکلیف ہوئی...... حضور ﷺ کی عادت مبارک تھی کہ جب انہیں کسی صحابی کی بیماری کا پتہ چلتا تو اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے۔ عیادتِ مریض سنت رسول ﷺ ہے، اس کے اندر بڑا اجر و ثواب ہے...... حضور ﷺ تشریف لے گئے تو وہ صحابی فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ میرے پاس آئے، میرے قریب بیٹھے اور آپ نے میری تسلی کے کلمات بھی فرمائے۔ اس کے بعد اپنا دایاں ہاتھ میرے دل والی جگہ پر رکھا اور اس کے بعد فرمایا کہ تمہیں دل کی تکلیف ہے۔ اور فرمایا کہ حارث بن کلدہ طائف میں بنو ثقیف کے اندر طبیب ہے، اس کے پاس جا کر تم علاج کرواؤ۔ صحابی فرماتے ہیں کہ بہت اچھا! حضور میں جاتا ہوں۔ حارث بن کلدہ اس زمانے میں بڑا طبیب تھا، وہ حضرت معاویہ کے زمانے تک رہا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تم حارث کے پاس جاؤ تو اس کو یہ بھی بتلا دینا کہ وہ تمہیں عجوہ کھجور بھی کھلایا کرے، اس کی گٹھلیاں نکال کر سات کھجوریں تم کو کھلایا کرے۔

[سنن أبي داود، حديث: ۳۸۷۵، باب: في تمرة العجوة]

یعنی چودہ سو سال پہلے جبکہ نہ کوئی ای سی جی تھا، نہ اس وقت تک کوئی ایکو مشینیں بنیں تھیں اور نہ اس وقت اسکوپ آئے تھے۔ بس ہاتھ رکھا اور فرما دیا کہ دل خراب ہے۔ یہ معجزہ ہے۔ اور ایک یہ بھی ہے کہ ہاتھ رکھنے کے بعد دل کی حرکات سے معلوم کر لیتا کہ اس کی حرکت درست کام نہیں کر رہی؟ اور اس کے بعد پھر علاج بھی تجویز کر دیا۔

عجوہ کھجور کی برکات اور فوائد:

حضور ﷺ پر اللہ کے کروڑوں صلوۃ وسلام ہوں۔ آج دنیا اس تحقیق پر پہنچی ہے کہ عجوہ کھجور بہترین ٹانک ہے۔ کھجور کے اندر بڑی قوتیں ہیں اور بڑے فوائد ہیں۔ میں نے خود ایک آدمی کو دیکھا تھا، پتہ نہیں زندہ ہے یا نہیں ہے، میرے خیال میں وہ اس زمانہ میں پولیس میں افسر تھے، چھوٹے چھوٹے تھے...... ماشاء اللہ...... ان کی بڑی عمر تھی، ریٹائرڈ ہو گئے اور پنشن ہو گئی۔ پھر بھی میں نے ان کو دیکھا، اس وقت بھی ان کی صحت بڑی ٹھیک ٹھاک تھی۔ میں نے ان سے ایک دفعہ پوچھا: ماشاء اللہ آپ کی صحت اسی طرح ہے، عمر کا اثر آپ پر نہیں آتا؟ اس نے کہا: ہم تو ساری زندگی ایک ایسے محکمے میں رہے اس میں جہنم کے سوا اور کچھ بنتا نہیں، لیکن حضور ﷺ کی ایک حدیث مبارک پڑھی تھی اس کو میں نے زندگی میں نہیں چھوڑا۔ میں نے کہا: فرمائیں۔ اس نے کہا کہ میں نے کھجور کے بارے میں حضور ﷺ کی ایک حدیث مبارک پڑھی تھی اور میں نے اپنی زندگی کا معمول بنالیا ہے کہ رات کو میں کھانا کھاتا ہی نہیں ہوں، میں سات دانے کھجور کے لے کر کھالیتا ہوں اور اس کے اوپر ایک گلاس دودھ کا پی لیتا ہوں...... الحمد للہ...... آج تک مجھے کوئی کمزوری قریب نہیں آئی، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے۔

شہد سے شوگر کے علاج کا واقعہ:

اسی طرح دو تین سال پہلے کی بات ہے۔ ایک ڈاکٹر صاحب کا جماعت کے ساتھ تعلق ہے، بہت سادہ اور اللہ والے آدمی ہیں، انہوں نے مجھے ناشتے پر بلالیا۔ میں ان کے پاس گیا تو وہاں ایک آدمی...... ماشاء اللہ...... وہ بھی بڑے پڑھے لکھوں میں سے تھے، کسی ملک کے اندر سفیر کے عہدے پر رہے، انہوں نے کہا کہ مجھے شوگر کی تکلیف تھی، میں نے پہلے خبر نہیں رکھی اور جب میں نے چیک اپ کرایا تو شوگر بالکل آخری درجوں پر پہنچی ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ یہ چھوڑ دو اور یہ چھوڑ دو، یہ گولی کھاؤ اور یہ انجکشن لگواؤ اور یہ کرو، میں گھر آیا اور میں نے کہا کہ کچھ بھی نہیں کرنا، نہ انجکشن نہ گولی اور نہ کچھ اور، حضور ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے کہ پیدل چلا کرو۔ اس نے کہا کہ ایک تو میں نے اس حدیث پر فوراً عمل شروع کر دیا کہ پیدل چلو۔ تو صبح اٹھا اور ایک دو کلومیٹر پیدل چلا۔ بس اس وقت پہنچا جب فجر کی نماز کھڑی ہو رہی ہے۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اور گھر آ گیا۔ دوسرا میں نے ناشتہ میں اور شام کے کھانے میں شہد کا کھانا لازم قرار دے دیا کہ میں شہد ضرور کھاؤں گا، چاہے ایک چمچ کھالوں۔ اور اس نے کہا کہ میں نے بیس پچیس دن کے بعد جا کر ڈاکٹروں کا چیک اپ کرایا تو انہوں نے کہا کہ تم تو بالکل نارمل ہو گئے

ہو،تم کون سی دوائی کھار ہے ہو؟ میں نے کہا: شہد کھار ہا ہوں۔انہوں نے کہا: شہد تو میٹھی چیز ہے،تم اس کے ساتھ کیسے علاج کرر ہے ہو؟اس نے کہا کہ میں تو بس اس کے ساتھ علاج کرر ہا ہوں، میرے پاس ایک ہی دلیل ہے کہ قرآن نے کہا کہ شفاء ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ شفاء ہے اور پیٹ کی بیماریوں میں حضور پاک ﷺ نے شہد دی ہے، لہٰذا میں بس اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں نے شہد شروع کردی اور اللہ نے مجھے شفاء دی ہے، بس میں تو گولی نہیں کھاتا، بس یہی شہد آپ کے سامنے کھار ہا ہوں اور اب بھی مجھے آپ چیک کروالیں میری شوگر نارمل ہے، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔

یہ ایمان کی بات ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ایمانِ کامل نصیب فرمائیں اور اتباعِ سنت رسول پاک ﷺ نصیب فرمائیں۔

واقعہ:

پرانی بات ہے، حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ زندہ تھے۔ایک وزیر شاہ جی کی خدمت میں ملنے کے لیے آئے کہ حضرت! آپ ووٹوں میں ہماری امداد فرمائیں اور ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اگر اللہ نے ہمیں کامیاب کر دیا تو اسلام کے لیے جتنا ہوگا ہم کوشش کریں گے۔شاہ جی سنتے رہے اور اس کے بعد مسکرا دیے! فرمایا: بابو! تم اپنے اس چار فٹ کے بدن پر اسلام نافذ نہیں کرتے ہو تو پورے ملک میں کیسے اسلام نافذ کرو گے؟ اپنے گھر میں اپنی بیوی پر اور بیٹی پر بہو پر تو نافذ نہیں کر سکتے تو باہر کیا کریں گے؟

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے شیخ کے ساتھ ادب کا واقعہ:

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جبکہ ادب کا یہ عالم تھا کہ حضرت کے بال جب گر جاتے تو اکٹھے کرتے رہتے اور لفافے میں رکھتے رہتے اور حضرت کی خدمت میں بھیجے کہ میں اپنے شیخ کی کوئی خدمت تو کر نہیں سکتا، یہ میرے سر کے بال اور چہرے کے بال ہیں ان سے جوتے سلوالیں، تا کہ کم از کم آپ کے جوتے میں تو رہوں۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، یہ عشق کی بات ہے، یہ ادب کا مقام تھا۔

انسان جلد باز کیوں ہے؟

مفسر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جب آدم علیہ السلام کو ناف تک روح آئی تو آپ نے دیکھا تو آپ کو بڑا اچھا لگا کہ ہاتھ میں

بھی ہے تو جلدی سے اٹھنے لگے، تو کیسے اٹھتے؟ نیچے تو ابھی روح آئی نہیں تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ﴾ [الانبیاء:۳۷]

انسان کو پیدا ہی جلد باز کیا گیا ہے، ابھی روح مکمل نہیں ہوئی اور حضرت اٹھنے پر تیار ہو گئے...... یہ اللہ تعالیٰ نے بطور فخر کے فرمایا کہ اگر خوشی آئے تو سنبھال نہیں سکتا، دکھ آئے تو صبر نہیں کر سکتا، دولت ملے تو فرعون اور قارون بن جاتا ہے اور غریب بنے تو کیمونسٹ بن جاتا ہے۔ یعنی اگر دولت آئے تو فرعون بن جاتا ہے کہ پدرم سلطان بود کہ باپ بھی ایسا تھا، دادا بھی ایسا تھا اور پردادا بھی ایسا تھا اور اگر نہ ملے اور بھوکا مرنے لگے تو کہتا ہے کہ اچھا خدا ہے! ان کافروں کو دیا اور ہمیں نہیں دیا، ہم بھوکے مر رہے ہیں۔ چلو جی خدا کو چھوڑ و، ہم خدا کو مانتے ہی نہیں ہیں...... نعوذ باللہ...... اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فخر فرمایا...... جب روح مکمل ہوئی تو حضرت آدم علیہ السلام کو چھینک آئی تو کہا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' اللہ نے الہام کیا کہ چھینک آئے تو ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' کہنا ہے۔ جب آدم علیہ السلام نے اللہ کا شکر ادا کیا تو انہوں نے فرمایا: اے آدم! تجھ پر اللہ رحم کرے، تو کتنا خوش نصیب ہے کہ ہم میں سے کسی کو چھینک آئے تو کہے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' اور سننے والا کہے ''يَرْحَمُكَ اللّٰهُ''۔ پھر چھینکنے والا کہے ''يَهْدِيْنَا وَ يَهْدِيْكُمُ اللّٰهُ'' لیکن تو شان والا نبی اور خلیفہ ہے، جس کو اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں: اللہ تجھ پر رحم کرے۔

پھر آگے اس روایت میں ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو حکم دیا جو صرف ابلیس کے ساتھ گئے تھے جنات پر کنٹرول کرنے کے لیے اور جنہوں نے کہا تھا:

﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ:۳۰]

تو ان کو کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ سب ملائکہ نے سجدہ کیا، لیکن ابلیس نے انکار کیا اور تکبر کیا، کیونکہ اس کے دل میں بڑائی اور غرور آ چکا تھا۔ ابلیس نے کہا: میں تو سجدہ نہیں کرتا، کیونکہ میں بڑا ہوں اور یہ آدم چھوٹا ہے، کیونکہ میں تو پہلے پیدا ہوا ہوں اور یہ تو ابھی پیدا ہوا ہے، لہٰذا بطور عمر کے میں بڑا ہوں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ میں بطور خلقت کے اس سے زیادہ قوت والا ہوں۔ مجھے آگ سے پیدا کیا گیا اور اس

کو مٹی سے پیدا کیا گیا اور آگ مٹی سے زیادہ قوت رکھتی ہے۔ جب ابلیس نے انکار کیا کہ آدم کو سجدہ کرے تو اللہ نے ابلیس کو بھی ہر خیر سے اور بھلائی سے دور کر دیا۔ ابلیس ابلس سے ہے، یعنی اس کو بعد کر دیا گیا، اس کو مایوس کر دیا گیا، خیر سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو شیطان، مردود، مرجوم اور ملعون بنایا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۵، البقرۃ الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا...]

اور اللہ نے اس کو مردود اس لیے بنایا کہ اس نے جو گناہ کیا جو نافرمانی کی، چونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو ایسی سزا نہیں دیتے جب تک کہ وہ نافرمانی نہ کرے، اللہ کا عذاب نہیں آتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى إِلَّا وَأَهْلُهَا ظٰلِمُونَ﴾ [القصص: ۵۹]

''ہم کسی بستی والوں پر ہلاکت نازل نہیں کرتے جب تک کہ وہ ظلم نہ کریں۔''

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا: ہم اس بستی پر عذاب نہیں کرتے اگر بستی والے اسلام کے ساتھ رہیں اور اطاعت و فرمانبرداری کرتے رہیں۔

گزشتہ باتوں پر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تنقید:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سیاق کے ساتھ ہم نے جو واقعہ نقل کیا ہے اس کے اندر غرابت ہے اور اس کے اندر بہت ساری چیزیں ایسی آئیں جو قابل بحث ہیں۔ اگر ایک ایک چیز پر ہم بحث کریں تو بات لمبی ہو جائے گی، چونکہ اس کو بعض مشہور مفسرین نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی نسبت سے نقل کیا ہے تو ہم نے بھی علوم میں اضافہ کے لیے اس کو نقل تو کر دیا، وگرنہ اس کے اندر بہت ساری چیزیں قابل اعتراض بھی ہیں اور قابل بحث بھی ہی...... وَاللّٰهُ تَعَالٰی أَعْلَمُ وَعِلْمُهٗ أَتَمُّ......

نکات:

اب مفسر ایک اور روایت نقل فرماتے ہیں جو انہوں نے حضرت ابن عباس، حضرت مرہ، حضرت ابن مسعود اور بہت سارے صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کی ہے کہ جب اللہ نے تمام مخلوق کو پیدا فرما دیا، زمین پیدا فرما دی، آسمان پیدا فرما دیے اور تمام مخلوقات پیدا فرما دیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ابلیس کی ڈیوٹی لگائی گئی آسمانِ دنیا پر اور یہ ابلیس ملائکہ کے قبیلے سے جن کو جن کہا جاتا تھا، یعنی پہلے آپ نے یہ قول پڑھا تھا کہ کچھ ملائکہ ایسے ہیں جن کو اللہ نے آگ

سے پیدا کیا۔ اب یہ دوسرا قول ہے کہ ملائکہ میں سے ہے اور ان ملائکہ کو جن کہا جاتا ہے۔ اور انہیں جن اس لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی ''هُمْ خَزَانُ الْجَنَّةِ'' کہ وہ جنت کے داروغہ ہیں اور جنت کے نگہبان ہیں، اس لیے ان کو جن کہا جاتا ہے۔

ویسے جن کا معنی ہے کہ ایسی چیز جو چھپی ہوئی ہو، یعنی میں پردے میں ہو، اندھیرے میں ہو۔ علماء نے لکھا ہے کہ جنات کا وجود عام طور پر ہم سے چھپا ہوا ہے، نظر نہیں آتا اور اس طرح اگر وہ کسی ہیئت میں بھی آئیں تو ان کے بدن پر بال اتنے ہوتے ہیں کہ وہ بالوں میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور بشر کو بشر اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی چیزیں کھلی ہوئی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو جسم کے ایسے حصے عطا فرمائے ہیں جو کھلے ہوئے ہیں اور واضح ہیں اور اس کے خطوط نظر آنے والے ہیں۔ تو ایک قول میں یہ بھی آیا کہ ابلیس کو آسمانِ دنیا پر ڈیوٹی دی گئی کہ تمہاری یہاں خدمات ہیں، اس لیے اس کے دل کے اندر ایک تکبر پیدا ہو گیا کہ میں شاید کوئی بڑی چیز ہوں تو اس لیے میری اتنی بڑی ڈیوٹی لگائی گئی ہے، میرے اندر کوئی ایسی بات ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۶، البقرة، الآية: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ]

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ اگر آدمی کو اللہ جمال عطا فرمائیں تو پھر بھی تکبر نہ کرے، کیونکہ خدا جو جمال دینے والا ہے وہ چھیننے پر قادر بھی ہے۔ کتنے خوبصورت لوگ ہیں! بیماری آئی اور دیکھنے کے قابل بھی نہ رہے۔ اس لیے جمال ایک فانی چیز ہے۔

لڑکی کے جمال کو دیکھ کر محبت کرنے والے کا واقعہ:

جیسا کہ لکھا ہے کہ ایک شخص کو کسی لڑکی سے عشق ہو گیا اور وہ پڑھنا بھی بھول گیا، ہر چیز بھول گیا، بس اس کا حسن یاد رہا۔ تو اس لڑکی کو بھی بڑی سمجھ تھی، اس نے یوں کیا کہ کسی طبیب سے جا کر ایک دوالی جو پیٹ چلانے والی ہو اور دست آور ہو۔ اس نے جب وہ دوائی لی تو اسہال لگے تو وہ تین دن میں ہی اس لڑکی کا رنگ بدل گیا...... اللہ معاف کرے! انسان کو جب اسہال لگ جائیں اور آدمی کے بدن سے نمک کم ہو جائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ آدمی چل نہیں سکتا، کھڑا نہیں ہو سکتا، اٹھ بھی نہیں سکتا...... اب کچھ دنوں کے بعد اس لڑکے نے دیکھا تو حیران ہو گیا! تو اس لڑکی نے بلایا اور کہا کہ تمہارا وہ عشق کدھر گیا؟ اس نے کہا: تم اس بات کے عاشق تھے، جاؤ اس ڈبے میں گند بھرا

ہوا ہے، اس کو لے لو، تم اسی بات کے عاشق تھے کہ جب تک میرے اندر یہ گندگی کھڑی تھی تو عشق تھا، وہ گندگی نکل گئی تو تمہارا عشق بھی ہوا ہو گیا۔ تو اس لیے آدمی کو اگر جمال ملے تو شکر کرے کہ اللہ نے انسان بنایا۔

تخلیقِ آدم علیہ السلام کے وقت مٹی کی پناہ:

اللہ پاک نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ زمین سے جا کر مٹی لے آئیں۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام زمین سے مٹی لینے کے لیے آئے تو زمین نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتی ہوں تم سے کہ تم مجھے اٹھانے کے بعد نقصان پہنچاؤ (جتنا اٹھاؤ گے تو مٹی کم ہو گئی) یا مجھے اس لیے اٹھاؤ کہ مجھے عیب دار کر دو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام چلے گئے اور نہ اٹھایا۔ اور عرض کیا: اے اللہ! زمین نے آپ کے نام سے پناہ پکڑ لی ہے تو میں نے نہیں اٹھایا، میں نے اس کو پناہ دے دی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت میکائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم جاؤ اور مٹی اٹھا کے لے آؤ۔ میکائیل نے بھی نہیں اٹھائی اور واپس چلے گئے اور وہی بات عرض کی۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو حکم دیا کہ جاؤ اور مٹی لے کر آؤ۔ ملک الموت جب آئے تو زمین نے کہا: میں پناہ پکڑتی ہوں اللہ کے نام سے، مجھے نہ اٹھاؤ۔ ملک الموت نے کہا کہ میں بھی پناہ پکڑتا ہوں اللہ کے نام سے کہ اللہ حکم دیں اور میں تعمیل نہ کروں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم پناہ پکڑتی ہو تو میں بھی پناہ پکڑتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا تو انہوں نے مٹی کو ایک جگہ سے نہ اٹھایا بلکہ کئی جگہوں سے مٹی اٹھائی۔ کہیں مٹی کا رنگ سرخ تھا، کہیں مٹی کا رنگ سفید تھا اور کہیں سیاہ تھا۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۶، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ]

لوگوں کی رنگت مختلف ہونے کی وجہ:

یہی وجہ ہے کہ ہماری اصل مٹی سے ہے اور مٹی مختلف ہے: کہیں سفید ہے، کہیں لال ہے، کہیں سیاہ ہے، کہیں زیادہ سرخ، کہیں سفیدی سرخی ملی ہوئی ہے اور کہیں سیاہی سفید ملی ہوئی ہے۔ اسی لیے اللہ نے آدم علیہ السلام کی اولاد میں بھی مختلف رنگ رکھے ہیں۔ کہیں کوئی رنگ ہے اور کہیں کوئی رنگ ہے۔ ایک وجہ یہ ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارے اصحاب میں چونکہ اختلاف ہے، وہ اختلاف پھر نسل میں آئے گا ذریت میں بھی آئے گا۔ مثلاً: یوں دیکھیں کہ جو لوگ کالے ہیں تو ان کی اولادیں بھی کالی ہوتی ہیں اور جو لوگ گورے ہیں تو ان کی اولادیں بھی گوری ہوتی ہیں، اسی طرح اگر عورت کا رنگ سفید ہے اور مرد کا سیاہ ہے تو اولاد متوسط قسم کی ہوتی ہے۔

اسی طرح اختلاف باعتبار موسم کے بھی ہوتا ہے کہ ٹھنڈے علاقے میں اکثر گورے ہوتے ہیں، جہاں بالکل گرمی پڑتی

ہے تو وہاں لوگ سیاہ ہوتے ہیں اور جہاں گرمی بھی ہے اور سردی بھی ہے وہاں گندم گوں ہوتے ہیں۔ کبھی چھ مہینے سردی ہے اور چھ مہینے گرمی ہے تو ایک وجہ اختلاف موسم بھی ہوتا ہے۔

اور اس اختلاف کی ایک اصل وجہ بھی ہے۔ بنیادی طور پر مٹی میں اختلاف آیا تو وہ بھی اپنی جگہ اثر انداز ہوتا ہے۔ تو اس لیے کوئی یہ نہ کہے کہ یورپ میں تو سب سفید ہوتے ہیں، سارے لوگ گورے چٹے ہوتے ہیں اور جتنے کافروں کے ملک ہیں خدا کی قدرت ہے سارے ٹھنڈے ہیں، وہاں اکثر لوگ گورے ہوتے ہیں، جیسے ہمارے ہاں جو ٹھنڈے علاقے ہیں وہاں لوگ سفید رنگ کے ہوتے ہیں، جو گرم علاقے ہیں وہاں کے لوگ سیاہی مائل ہوتے ہیں۔ تو بہر حال ایک وجہ یہ ذکر کی گئی ہے۔

جب اس مٹی میں پانی ڈالا گیا تو وہ ''طِينٍ لَّازِبٍ'' بن گئی۔ ''لَازِب'' کا معنی ہے ایک دوسرے کو چپکنے والی۔

اس کے بعد اللہ نے ملائکہ سے فرمایا:

﴿إِنِّي خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّن طِينٍ ۝ فَإِذَا سَوَّيْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُۥ سَاجِدِينَ ۝﴾ [ص: ۷۱، ۷۲]

''میں ایک بشر پیدا کروں گا مٹی سے۔ جب میں اس کو بنالوں اور اس میں روح پھونک دوں پس تم اس کے آگے سجدے میں گر پڑو۔''

تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ہاتھ مبارک سے پیدا فرمایا، جیسا اس کو اس کو ہاتھ زیبا ہے، تاکہ ابلیس تکبر نہ کر سکے، تاکہ اللہ پاک اس کو فرما سکیں کہ تم کیسے تکبر کرتے ہو اس انسان سے جس کو میں نے تقریباً چالیس سال کی مدت میں پیدا کیا؟ حضرت آدم علیہ السلام دھڑ کی شکل میں رہے، یعنی ان میں روح نہ پھونکا گیا۔ ملائکہ گزرتے تو ڈرتے کہ خدا جانے یہ کیا چیز ہے؟ اور سب سے زیادہ ڈرنے والا ابلیس تھا کہ پتہ نہیں یہ کیا چیز پیدا ہو رہی ہے؟ اور اس کے بعد ابلیس جب اس کو دیکھتا اور اس کو چھیڑتا تو اس کے اندر سے آواز پیدا ہوتی، جیسے پکی اینٹ سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر بھی فرمایا:

﴿خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝﴾ [الرحمٰن: ۱۴]

تو وہ ابلیس کہتا کہ پتہ نہیں کہ یہ کس چیز کے لیے پیدا ہوا؟ منہ کی طرف سے ابلیس داخل ہوتا اور نیچے کی طرف سے نکل جاتا اور ملائکہ سے کہنے لگا کہ ڈرو نہیں، یہ کوئی خدا نہیں ہے، یہ اندر سے خالی ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: اللہ پاک نے حکم دیا کہ جب اس میں روح پھونکی جائے تو تم اس کو سجدہ کرو۔ جب روح پھونکی گئی، جب سر میں ڈالی گئی اور دماغ نے حرکت کی تو حضرت آدم علیہ السلام کو چھینک آئی تو ملائکہ نے کہا کہ کہو ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' تو انہوں نے کہا کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' اللہ پاک نے جواب میں فرمایا: ''یَرْحَمُكَ رَبُّكَ'' اور جب آنکھوں میں روح آگئی، جب آنکھیں کام کرنے لگیں تو جنت کے پھل وغیرہ نظر آنے لگے تو انہوں نے جلدی کی کہ میں جاؤں، تاکہ جنت کے پھل حاصل کرلوں۔ اسی لیے اولاد میں بھی ابھی تک جلدی ہے، اس کے اندر عجلتیں ہیں تو وہ چاہتا ہے کہ ہر بات عجلت کے اندر ہوجائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جب حکم کیا تو تمام ملائکہ نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا، انکار کیا اور تکبر کیا ﴿وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ اور تھا کافروں میں سے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم فرمایا: اے ملعون! تم نے کیوں سجدہ نہیں کیا؟ جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور میں نے تجھے حکم بھی دیا تھا کہ سجدہ کرو؟ کہنے لگا کہ میں تو اس سے زیادہ بہتر ہوں، بشر کو سجدہ نہیں کرسکتا، میں اس مخلوق کو جو مٹی سے پیدا کی گئی سجدہ نہیں کرسکتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ۝﴾ [الاعراف: ۱۳]

یہ خلاصہ ہے، ورنہ تفصیل بعض آیات میں آتی ہے۔ اس لیے قاعدہ ہوتا ہے کہ قرآن میں کہیں اجمال ہوتا ہے اور کہیں تفصیل ہوتی ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۶، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا...]

اس لیے آدمی بعض اوقات قرآن پڑھتے ہیں تو گھبرا جاتے ہیں کہ وہاں تو آیا کہ پہلے اللہ نے پیدا فرمایا پھر ملائکہ کو حکم ملا اور یہاں ہے کہ جیسے ہی آدم علیہ السلام کو پیدا کروں تو تم سجدے میں گر جاؤ۔ اصل میں ایک جگہ اجمال ہے اور ایک جگہ تفصیل ہے، ایک جگہ اللہ نے واقعات کو کھول کر بیان کیا ہے اور ایک جگہ صرف خلاصے کو ذکر کردیا۔ تو اس لیے کوئی تعارض نہیں ہوتا۔ جب ساری آیات کو سامنے رکھا جائے تو بات سمجھنا آسان ہوجاتی ہے۔

نکات:

اب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کی تعلیم دی اور پھر اس کے بعد ملائکہ پر پیش کیا:

﴿فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝﴾ [البقرۃ: ۳۱]

تم ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔

انہوں نے عرض کیا:

﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝﴾[البقرۃ:۳۲]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سدی کی تفسیر کے اندر یہ قول صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن اس کے اندر بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو روایات اسرائیلیہ میں سے داخل کر دی گئیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۶، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ]

غیر مسلم کا اسلام کی تعریف لکھنے کا مقصد:

ایک انگریز نے لکھا کہ اسلام جیسا اعلیٰ دین کوئی نہیں۔ مسلمان بڑے خوش ہو گئے کہ فلاں گبن نے تو بڑا اچھا لکھا ہے، فلاں نے بڑا اچھا لکھا ہے۔ خدا کے بندے! وہ اچھا نہیں لکھتے، وہ تو آپ کو زہر کھلانا چاہتے ہیں، اس زہر کے اوپر انہوں نے شکر لگا دی ہے۔ جیسے کونین کے اوپر شوگر لگا دیتے ہیں کہ کڑوی نہ لگے اور جلدی نگلی جائے، اب اندر تو کونین ہے۔ کوئی عیسائی کبھی آپ کے نبی کی تعریف نہیں کرتا:

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ﴾[البقرۃ:۱۲۰]

یہود و عیسائی کبھی تمہارے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ اگر اس نے کہیں تعریف کی ہے تو اس کا مقصد تمہیں اپنے قریب کر کے پھر غار ہلاکت میں ڈالنا ہے کہ تمہارے دماغ میں یہ آ جائے کہ کافر ہو کر کتنا سچا لکھتا ہے، یہودی ہو کر کتنی سچی بات لکھی، عیسائی ہو کر اس نے ہمارے آقا ﷺ کیسی شان بیان کی، جبکہ ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک جال ہے۔ جیسے ایک مچھلی کو پھنسانے کے لیے جال کے آگے چھوٹی مچھلی کو لگاتے ہیں۔ مچھلیوں نے مچھلی کو دیکھا، آئیں اور پھنس گئیں۔ ہم نے دیکھا کہ حضور ﷺ کی شان بیان کر رہا ہے قریب آئے تو اس نے برباد کر دیا۔

اس لیے ہمیشہ یاد رکھیں! کبھی کوئی الجھن ہو تو فوراً اہل علم سے رجوع کریں، ایسا نہ ہو کہ آدمی پھر بھٹکتا ہوا چلا جائے۔

مرزا قادیانی اور حکیم نوردین بھیروی:

سب سے بڑا جو قادیانیوں کے گمراہ کرنے کا ذریعہ تھا وہ حکیم نورالدین تھا، وہ بڑا علم والا تھا اور وہ سب سے پہلے مرزا قادیانی بدبخت کا خلیفہ بنا۔ اس کے بعد جب مرزا قادیانی مر گیا تو اس کی اولاد سے اس حکیم کا جھگڑا ہوا، اس

جھگڑے کے بعد وہ بدبخت قادیان سے نکلا اور لاہور پہنچا تو اس نے قادیانی جماعت کے مقابلہ پر لاہوری مرزائی کی ایک نئی بنیاد رکھی۔ان کا جو احمد علی مرزائی تھا، جس نے تفسیر قرآن بھی لکھی، لاہوری فرقہ کا مرزائی تھا، پھر وہ بھی اسی نوردین کا پیدا کردہ تھا۔تو یہ اتنے خطرناک لوگ تھے! علامہ اقبال کتنے پڑھے لکھے تھے! اس کی پوری فیملی کو اس نے گھیر لیا تھا۔اللہ تبارک وتعالیٰ معاف فرمائے! ان کے بھائی کو تو قادیانی بنادیا اور علامہ صاحب بھی کافی عرصہ تک اس کے چنگل میں رہے اور اس کے دلائل سے متاثر رہے۔ یہ تو اللہ نے کرم فرمایا کہ علامہ صاحب کی حضرت انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ سے ملاقات ہوئی تو ان پر جب حقائق کھلے تو علامہ صاحب کو اللہ پاک نے توفیق دی کہ انہوں نے قادیانیت کے خلاف جہاد کیا۔پھر ساری زندگی قادیانیت سے ٹکر لی۔اللہ ان کی قبر پر کروڑوں رحمتیں فرمائے۔

اسی لیے حضرت شاہ جی بخاری رحمہ اللہ کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میرا بس چلے تو میں شاہ جی کی تقریروں پر پابندی لگا دوں۔محبت میں فرمایا کہ اتنا بڑا ساحر البیان آدمی، جو دو دو لاکھ کے مجمع پر جادو کر دیتا ہے۔اگر خدانخواستہ یہ پٹڑی سے اتر گیا تو یہ قوم کو لے ڈوبے گا، پوری قوم برباد ہو جائے گی، کیونکہ انسان ہے۔اس لیے بڑے بڑے عابد اور بڑے بڑے زاہد راستے سے جب بھٹکتے ہیں تو اللہ پاک رحمت فرمائے پھر بڑی تباہیاں ہوتی ہیں۔

اسی لیے حکم ہوتا ہے کہ علم استاذ سے حاصل کرو اور اگر آپ تزکیہ کی طرف جانا چاہتے ہیں، اگر وہ تصوف جو کتاب وسنت کے مطابق ہے، اس کے اندر جانا چاہتے ہیں تو کسی شیخ کامل کی صحبت اختیار کریں، ورنہ انجام یہ ہوگا کہ آپ پٹڑی سے اتریں گے تو آپ کو روکنے والا کوئی نہیں ہوگا، آپ کا راستہ بدلنے والا کوئی نہیں ہوگا، سڑک پر قائم رکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ رحمت فرمائیں۔ یہاں ہمارے ایک ساتھی تھے، بہت بڑے عبادت گزار تھے۔اس شخص نے بڑی محنت کی، ریاضت کی اور عبادت کی۔اللہ کے گھر میں ایک دن اس نے مجھے کچھ باتیں سنائیں تو میں نے کہا کہ مہربانی کریں! معلوم ہوتا ہے کہ آپ پٹڑی سے اتر رہے ہیں، کسی شیخ کی خدمت میں جائیں، کسی عالم کی صحبت اختیار کریں اور ان کی نگرانی میں رہیں۔ کہنے لگے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا کہ ایسی بات ہے، آپ کی باتوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ تھوڑا تھوڑا ہٹ رہے ہیں۔اس نے کہا کہ نہیں تو۔ کچھ دن گزرے تو وہ اپنی راہ پر

آ گیا کہ میں رات بدر گیا تھا اور اصحابِ بدر مجھے ملنے کے لیے آئے تھے، فلاں جگہ گیا تو فلاں بزرگ قبر سے نکل کر مجھے ملنے کے لیے آگئے۔ بس وہ بے چارہ گیا۔

ابلیس کا تعارف:

ایک روایت مبارک میں آیا کہ ابلیس کا نام عزازیل تھا اور یہ بڑے شرف والے فرشتوں میں سے تھا اور ان فرشتوں میں سے تھا جس کو اللہ نے چار پر عطا فرمائے تھے، یعنی بعض ملائکہ کے ہزار پر بھی ہوتے ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۷، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ]

اور اسی طرح بعینہٖ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے خواب میں دکھایا گیا کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام دو فرشتے...... جو انسانوں کی شکل میں تھے...... ان پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ طواف کر رہے ہیں۔

دجال مکہ میں:

اور اسی طرح ایک روایت میں یہ بھی ذکر ہے کہ دجال بھی طواف کر رہا ہے تو اب اس میں اشکال یہ پیدا ہوتا تھا کہ دجال کیسے طواف کر رہا ہے؟ دجال کا تو حرم میں داخلہ ہی بند ہے۔ تمام دنیا پر دجال پھرے گا، تمام زمین پر دجال اپنی قوت استدراجیہ سے پوری زمین پر گھوم لے گا، لیکن یہ جو دو مقام ہیں، اللہ نے ان کو عظمت بخشی ہے: حرم مکہ اور حرم مدینہ کہ ان کے اندر دجال داخل نہیں ہو سکے گا[1]۔ ایک حدیث مبارک میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حرمین شریفین کی حدود پر فرشتوں کا پہرہ لگا دیں گے۔ دجال اگر داخل ہونے کی کوشش کرے گا تو فرشتے اس کو دھکیل دیں گے۔ [صحیح البخاری، حدیث: ۱۸۸۱، باب: لَا يَدْخُلُ الدَّجَّالُ الْمَدِينَةَ] تو پھر یہ کیسے ہوا کہ دجال طواف کر رہا تھا؟ اس میں بھی یہی ہے کہ اس میں کچھ اس قسم کی علامات تھیں کہ اس کے بارے میں شبہ ہوتا تھا کہ آیا یہ دجال ہو۔ اس لیے علماء نے فرمایا کہ دجال حرمین میں داخل نہیں ہوگا۔ جب وہ دجالیت کا دعویٰ کرے گا...... نعوذ باللہ...... خدائی کا دعویٰ کرے گا، اپنی حدود سے تجاوز کرے گا تو دجال بنے گا۔ تو دجالیت سے پہلے تو کوئی دجال نہیں ہے۔ اب جب دجالیت کا دعویٰ کرے گا تو پھر حرمین شریفین میں داخل نہیں ہو سکے گا، ورنہ اس سے پہلے وہ داخل ہو تو کوئی اشکال اور مشکل نہیں۔ [المنہاج شرح صحیح مسلم: ۱۸/ ۴۹۲]

---

[1] [الجامع الصغیر السیوطی، حدیث: ۴۲۵۲]

مرزا قادیانی مسلمانوں میں:

مثال کے طور پر جیسے قادیانی تھا۔ جب تک اس نے نبوت کا دعویٰ نہ کیا اس وقت تک تو علماء بھی اس سے ملتے تھے، بیٹھتے اٹھتے تھے۔ اس نے ابتدائی زندگی میں عیسائیت کے خلاف مناظرے کئے اور کتابیں لکھیں اور ان کتابوں پر تقریظات علماء اہل حدیث نے لکھیں، کیونکہ اس وقت وہ بد بخت مرزائی تو نہیں تھا، اس وقت تو اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ اتفاق یہ ہوگیا کہ اس کو عیسائیت کے خلاف جب شہرت ملی، حالانکہ یہ بھی دراصل انگریزوں کی ایک سازش تھی۔ انہوں نے یہ مناظرے خود کروائے تھے، لیکن عام مسلمانوں کو پتہ نہیں چلتا تھا، تا کہ اس کی دنیا میں شہرت ہوجائے کہ یہ انگریزوں کا بڑا دشمن ہے، نصرانیوں کا بڑا مخالف ہے اور عیسائیوں کا بڑا مخالف ہے۔ اور جب اس کی شہرت ہوگئی تو اب انگریزوں نے اس سے کام لیا کہ اس سے نبوت کا دعویٰ کراؤ اور مسلمانوں کے اندر دو ٹکڑے کرو، کیونکہ ان کی یہ تحقیق تھی اور ان کی یہ رپورٹ تھی کہ یہ جو ہندوستان کا علاقہ ہے یہ بڑا مذہبی علاقہ ہے اور اس پر مذہب کے بڑے اثرات ہیں کہ آدم علیہ السلام کو یہاں اتارا گیا اور پھر نوح علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے، ان کی اولادیں وہاں تشریف لے گئیں۔ تو اس وجہ سے ایک مذہبی اثرات کا حامل علاقہ قرار دیا گیا اور آپ دیکھیں کہ کتنے بڑے بڑے لوگ اللہ نے وہاں پیدا کیے!! حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ، حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ اور اسی طرح سید احمد شہید رحمہ اللہ، شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کتنے بڑے خانوادے ہیں۔ اللہ پاک ان کی قبروں پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ یہ لوگ ہندوستان میں پیدا ہوئے، اسی طرح حضرت نانوتوی رحمہ اللہ، حضرت شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ یہ سب بڑے بڑے لوگ وہیں پیدا ہوئے اور بڑا دین کا کام ہوا۔ ان انگریزوں نے یہ سوچا کہ یہاں کوئی مذہبی فتنہ کھڑا کرو، اس پر کنٹرول کرنا بڑا مشکل ہوجائے گا تو انہوں نے نبی پیدا کردیا۔ اب نبی بننے سے پہلے وہ عام آدمی تھا، ہر بندے کے ساتھ ملتا تھا اور علماء بھی ملتے تھے جلسوں میں جاتے تھے۔

ابلیس فرشتوں میں:

تو اس لیے یاد رکھیں کہ ابلیس لعین نے جب انکار خداوندی کیا تو لعین بنا۔ جب تک اس نے انکار نہیں کیا، وہ چاہے آسمانوں میں رہے، زمین میں رہے، سوال پیدا نہیں ہوسکتا کوئی کہے کہ پہلے کیوں رہتا تھا؟

انسان کو سجدہ جائز نہیں:

اسی طرح فرماتے ہیں کہ ایک روایت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نقل کی گئی۔ وہ حضور ﷺ کے بڑی شان والے صحابی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

((قَدِمْتُ الشَّامَ فَرَأَيْتُهُم يَسْجُدُونَ لِأَسَاقِفِهِمْ وَ عُلَمَائِهِمْ فَأَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَحَقُّ أَنْ نَسْجُدَ لَكَ فَقَالَ: لَا، لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا مِنْ عِظَمِ حَقِّهِ عَلَيْهَا.))

[سنن ابن ماجہ، حدیث: ۱۸۵۳، باب: حَقِّ الزَّوْجِ عَلَى الْمَرْأَةِ، واللفظ تفسیر ابن کثیر]

جب میں شام آیا تو میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ اپنے پادریوں کو سجدہ کرتے ہیں تو جب واپس آئے تو انہوں نے آکر عرض کیا: اگر لوگ اپنے پادریوں کو اپنے مولویوں کو اپنے پنڈتوں کو سجدے کر رہے ہیں تو حضور! آپ تو سب سے زیادہ اس بات کے حقدار ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں، کیونکہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اللہ کے نبی ہیں، خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں، سید الاولین والاخرین ہیں، اللہ نے آپ کو ہمارا بادشاہ بھی بنایا ہے تو آپ زیادہ حق دار ہیں کہ ہم بھی آپ کو سجدہ کیا کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: خبردار! نہیں۔

تو اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ صحابہ جو حضور ﷺ کو سجدہ کرنا چاہتے تھے وہ سجدہ عبادت والا نہیں تھا، کیونکہ صحابی غیر اللہ کو عبادت کا سجدہ تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ غیر اللہ کا سجدہ تو شرک ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم تو شرک سے نکل کر توحید کے علمبردار بنے ہوئے ہیں تو وہ بھی سجدۂ تعظیم کے لیے کرنا چاہتے تھے، لیکن حضور ﷺ نے فرمایا: خبردار! نہیں۔ اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ کسی کے لیے سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، کیونکہ زوج کا جو زوجہ پر حق ہے خاوند کا عورت پر حق ہے وہ اتنا بڑا حق ہے اتنا بڑا حق ہے کہ اگر تعظیم کی ضرورت ہوتی تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، لیکن فرمایا کہ سجدہ کسی غیر کے لیے، کسی بشر کے لیے اور کسی انسان کے لیے جائز ہی نہیں تو عورت کو بھی حکم نہیں دیا۔

حاکم وقت کی اطاعت:

اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا ''اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ'' تم پانچ چیزوں کو پلے باندھ لو۔ سب سے پہلا سبق دیا ''اَلسَّمْعُ وَ الطَّاعَةُ'' جو بھی تمہارا امیر ہو، تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اس کی بات کو سنو اور اطاعت کرو، کیونکہ اگر تم

اطاعت سے خروج کرو گے تو فتنہ وفساد دنیا میں پھیلے گا، کوئی کنٹرول نہیں کر سکے گا۔

[سنن الترمذي، حديث: ٢٨٦٣، باب: ما جاء في مثل الصلاة...]

خرابیاں اور برائیاں کس میں نہیں ہوتیں، جیسے جیسے ادوار بدلتے جائیں گے، جیسے جیسے ہمارے اعمال بدلتے جائیں گے اسی طرح ہمارے معاملات بدلتے جائیں گے۔ یہ تو ایک فطری بات ہے کہ رات آئے گی تو رات کے لوازم آئیں گے۔ دن آئے گا تو دن کے لوازم آئیں گے۔ جب رعایا صحابہ تھے تو حاکم محمد رسول اللہ ﷺ تھے اور جب رعایا خیر القرون تھے تو آگے بھی سیدنا ابو بکر، سیدنا عمر، سیدنا عثمان، سیدنا علی، سیدنا حسن اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہم حاکم تھے۔ اب اگر آگے ہم آ گئے ہیں تو معاملہ تو اسی طرح ہوگا۔

تو اسی طرح جب گھریلو زندگی ہے تو لازمی بات ہے کہ ایک عورت اور ایک خاوند ہے۔ ان دو میں سے کسی ایک کو تو بڑا بنانا ہے، وگرنہ تو گھر کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لیے وہاں اللہ نے خاوند کو بڑا بنایا۔ حقوق زوج کے بھی ہیں اور زوجہ کے بھی ہیں:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ [البقرة: ٢٢٨]

دونوں پر حقوق ہیں، لیکن شانِ قوامیت جو اللہ نے دی ہے وہ مردوں کو عطا فرما دی۔

اس لیے یہ مسئلہ سمجھ لیں! حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے یہ بات واضح ہو گئی، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ خبردار! اگر کسی بشر کو سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو میں عورت کو حکم دیتا کہ خاوند کو سجدہ کرے، لیکن یہ تو اس زمانہ کی باتیں ہیں جب عورت عورت تھی اور مرد مرد تھا اور دونوں کے دلوں میں اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام تھے۔ اب نہ مرد مرد ہے اور نہ عورت عورت رہی، عورت مردوں سے آگے نکل گئی اور مرد نامردوں میں عورتوں سے نیچے گر گئے۔ اب تو پوری جنس بھی بدل گئی، حالات بھی بدل گئے۔ اللہ تعالیٰ رحمت فرمائے! اب جب آدمی احادیث مبارکہ کو پڑھتا ہے تو ہمارے نوجوان سوچتے ہیں کہ ایسے تھا کہ عورت اتنا اپنے خاوند کے تابع ہو، اب تو یہ باتیں ایسے لگتی ہیں جیسے کوئی حکایات ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کو تھا یا آدم قبلہ تھے؟

اور ایک قول یہ ہے کہ دراصل یہ سجدہ بھی اللہ تعالیٰ کو تھا اور آدم علیہ السلام کی پوزیشن ایسے تھی جیسا قبلہ ہے۔ تو اب ہم

کعبہ کی طرف سجدہ کرتے ہیں، حالانکہ ہم سجدہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کو کر رہے ہیں۔

مفسر فرماتے ہیں کہ یہ قول ضعیف ہے۔ اس مثال وتشبیہ میں اعتراض ہے، کیونکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو قبلہ بنایا گیا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ [البقرۃ: ۳۴] آدم کو سجدہ کرو سجدہ آدم کے لیے ہی تھا تو یہاں تو اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ کعبہ کو سجدہ کرو ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرۃ: ۱۴۴] صرف اپنے رخ کو مسجد حرام کی طرف کرو، سجدہ تو اللہ کے لیے ہے۔ اور صاف فرق ہے کہ ﴿اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ امر ہے تو اس کو اس مثال کے ساتھ تشبیہ دینا ضعیف ہے، اس لیے کہ وہ سجدہ آدم علیہ السلام ہی کے لیے ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ہے ﴿وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا﴾ [یوسف: ۱۰۰] وہاں بھی لام ہے کہ یوسف علیہ السلام کے لیے سجدہ ہے، یوسف علیہ السلام کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔ سیدھی سی بات ہے کہ ان کی شریعت علیحدہ تھی اور شریعت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم علیحدہ ہے۔ پہلا قول زیادہ راجح ہے کہ اللہ نے جو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو یہ آدم علیہ السلام کا اکرام وتعظیم وتحیہ تھا، تاکہ دنیا پر خلیفہ کی عظمت واضح ہو سکے اور پتہ چل سکے کہ جو خلیفہ ہوگا اس کی اطاعت ضروری و لازمی ہوگی۔ تو یہ سجدہ آدم علیہ السلام کے لیے تھا اور اطاعت اللہ کے لیے تھی، یعنی سجدہ تو آدم علیہ السلام کو کیا گیا، لیکن فرمانبرداری اللہ کی کی گئی، کیونکہ اللہ نے حکم دیا تھا:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۤ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾

[البقرۃ: ۳۴]

مفسر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس قول کو ترجیح دی ہے، باقی جو دونوں قول ہیں رازی رحمہ اللہ نے ان کی تضعیف کی ہے کہ اگر آدم علیہ السلام کو قبلہ کی طرح بنایا جائے تو پھر کوئی عظمت واضح نہیں ہوتی، کیونکہ اگر ایک دیوار کو بھی کعبہ بنایا گیا تو کیا فرق پڑے گا۔

اور بعض لوگوں نے کہا کہ یہ حقیقتاً سجدہ نہیں تھا، بلکہ صرف سر جھکانا وتواضع تھا۔ یہ قول بھی ضعیف ہے۔ جب اللہ قرآن میں لفظ سجدۃ فرماتے ہیں تو اس کی تاویلات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو راجح قول بھی یہی ہے کہ یہ سجدہ اکرام وتعظیم تھا، آدم علیہ السلام کے لیے اور اللہ کے لیے اطاعت تھی۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۷، ۷۸، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ]

متکبر جنت میں نہیں جائے گا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ))

''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل کے اندر رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا۔''

[سنن الترمذی، حدیث: ۱۹۹۸، باب: ما جاء في الكبر]

داخل نہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ اوّل وہلہ میں عزت والے مومنین کے ساتھ آخر میں داخل تو ہوگا کہ مسلمان جو ہے، لیکن اوّل دخول سے محروم ہو جائے گا، اوّل اس عظمت سے محروم ہو جائے گا، اگر اس کے دل کے اندر ذرے کے برابر کبر ہے۔ تو اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی فوراً استغفار کرے۔

﴿وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ﴾ کا کیا معنی ہے؟

بعض علماء نے فرمایا: ''كَانَ'' ''صَارَ'' کے معنی میں ہے کہ جب اس نے سجدہ نہ کیا اور انکار کیا تو کافروں میں سے ہو گیا، جیسے ﴿فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ﴾ [ھود: ۴۳] حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں آیا کہ جب اس نے انکار کیا تو ہو گیا ڈوبنے والوں میں سے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ''كَانَ فِي عِلْمِ اللهِ مِنَ الْكَافِرِينَ'' اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ وہ کافروں میں سے ہے۔ [تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۸، البقرة، الآية: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ]

امت کا معنی:

مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی کے ہاتھوں پر کسی خارق عادت چیز کا ہو جانا (یعنی ایسی نئی چیز جو خلاف عادت کسی دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہو سکے) جیسے اللہ کے اولیاء کے لیے کرامت ہے، انہوں نے فرمایا کہ ان چیزوں سے بھی آدمی کو حیران نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ کبھی کبھی خارقِ عادت اللہ معاف کرے ولی کی تو بڑی شان ہے، لیکن فاسق فاجر کے ہاتھوں پر بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

اس لیے دیکھیں! ابلیس ملعون و مردود ہے، لیکن کتنی خوارقِ عادات ہیں کہ چاہے تو انسان کی شکل بن جائے، چاہے جانور بن جائے، گدھا بن جائے، سانپ بن جائے یا بچھو بن جائے، چاہے ہوا بن جائے اور ایک منٹ میں لاکھوں میلوں کا سفر کر ڈالے۔ تو یہ ساری چیزیں بزرگی کی دلیل تو نہیں ہوتیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۸، البقرة، الآية: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ]

سچے پیر کی پہچان:

اس لیے علماء نے لکھا: اگر کسی کی ولایت کو پرکھنا ہے تو اس کی اتباع رسول ﷺ کو پرکھیں۔ اگر اس کا عمل، اس کا کردار، اس کی صورت و سیرت اور اس کی شکل سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق ہے تو اللہ کا ولی ہے، چاہے اس کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو یا نہ ہو۔ ضروری تو نہیں کہ کرامت کا اظہار ہو۔ اللہ چاہیں گے تو ظاہر کریں گے اور اگر اللہ نہیں چاہیں گے تو ظاہر نہیں کریں گے۔ اور اس کے مقابلہ پر ایک آدمی شکل میں فاسق ہے، فاجر ہے اور شریعت کا مخالف ہے، لیکن ایسے ایسے کمالات دکھاتا ہے کہ کبھی پانی پر چل رہا ہے، کبھی آگ پر چل رہا ہے اور کبھی آپ کے دلوں کی باتیں بتا رہا ہے تو یہ شیطان ہوسکتا ہے، اللہ کا ولی نہیں ہوسکتا۔ کاہن ہوسکتا ہے، منجم ہوسکتا ہے، دجال من الدجاجلہ ہوسکتا ہے، اللہ کا ولی نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ کے ولی کے لیے تو شرط ہے کہ وہ محمد عربی ﷺ کے نقش قدم پر ہو۔ ایک آدمی سنت رسول کا پابند ہے وہ اللہ کا ولی ہے، چاہے اس کے ہاتھ پر کچھ ظاہر نہ ہو۔ اب آدمی کہے کہ ہم نے تو کوئی کرامت نہیں دیکھی، ہم نے کوئی بزرگی نہیں دیکھی، یہ کوئی بات نہیں۔

اصل ولایت کمالِ اتباعِ سنت ﷺ ہے:

ایک اللہ والے کی خدمت میں ایک آدمی گیا، کچھ دن کے لیے رہا اور اجازت لی تو فرمایا کہ کیسے آئے تھے؟ اس نے کہا: ارادہ تھا کہ حضرت! آپ سے بیعت ہو جاؤں، لیکن میں اتنے دن آپ کی خدمت میں رہا، آپ کی کوئی کرامت کوئی نئی چیز تو میں نے دیکھی نہیں تو میرے دل کو آپ کی پیری لگی نہیں، اس لیے میں اب جا رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا: یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ نے ہماری کوئی کرامت اور کوئی بزرگی نہیں دیکھی، لیکن جتنے دن رہے ہو ہمارا کوئی عمل حضور ﷺ کی سنت کے مخالف دیکھا ہے؟ اس نے کہا: یہ تو ہے۔ میں نے واقعی کوئی عمل سنت کے مخالف نہیں دیکھا۔ تو ان بزرگوں نے فرمایا: ہم تو بس اتباع سنت جانتے ہیں، باقی پیری کرامت ہمیں نہیں آتی۔ وہ تو اللہ چاہیں تو ظاہر فرما دیں۔

ابن صیاد کا ذکر جس پر دجال کا شبہ ہوتا تھا:

حضور ﷺ کے زمانہ میں ایک لڑکا ابن صیاد تھا۔ اس پر بھی ایسے جنون وغیرہ کے دورے پڑتے تھے اور وہ بھی ایسی باتیں کرتا۔ ایک دن حضور ﷺ آئے تو وہ کپڑا لے کر پڑا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم کہتے ہو غیب کی باتیں میں جانتا ہوں، چلو بتاؤ میں نے اس وقت اپنے دل میں کیا چھپایا ہوا ہے؟ تو اس نے اپنے اوپر کپڑا ڈالا اور

اپنے جنات وغیرہ سے پوچھ کر بتایا کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ دُخ دُخ اور کوئی پتہ نہیں لگتا، اتنا مجھے معلوم ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارا غیب ہے، یہ تو ظن وتخیل کی بنا پر کسی ایک لفظ کا آدھا حرف بتلانا یہ تو غیب نہ ہوا۔ غیب کا معنی تو یہ ہے کہ تو پوری بات کھول دے کہ میرے دل میں کیا ہے؟ اور حضور ﷺ نے آیت بھی وہ رکھی جو علامات قیامت میں تھی:

﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾ [الدخان:۱۰]

تو اب ابن صیاد تو وہ ہے جس کے دجال ہونے کا شبہ لگتا تھا۔

[صحیح البخاری، حدیث:۳۰۵۵، باب: كَيْفَ يُعْرَضُ الْإِسْلَامُ عَلَى الصَّبِيِّ]

اس کے بعد فرمایا کہ اسی ابن صیاد کے بارے میں یہ ہے کہ اگر اس کو غصہ آتا یا کوئی چھیڑ دیتا تو ایسے پھیل جاتا تھا کہ پورا راستہ بند کر دیتا تھا اور پھر سمٹ جاتا تھا۔ تو ایسی چیزیں تو فاسق فاجر کے ہاتھوں پر بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۸، جامع الاحادیث للسیوطی، ۳۹۸۱۵]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو دجال ہونے کے شبہ میں قتل کر دینا چاہتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ دجال جب قرب قیامت دجالیت کا دعویٰ کرے گا تو اس سے خوارقِ عادات ظاہر ہوں گی۔ آسمانوں سے کہے گا: بارش برساؤ تو بارش برسنی شروع ہو جائے گی۔ زمین سے کہے گا: کھیتی نکالو تو کھیتی نکل آئے گی اور اس کے پیچھے زمین کے خزانے ایسے بھاگ رہے ہوں گے جیسے چرواہے کے پیچھے جانور چلتے ہیں۔ اور ایک آدمی کو قتل کرے گا اور پھر زندہ کر دے گا (مگر اس کو نہ قتل کر سکے گا اور نہ زندہ کر سکے گا)

تو ایسی چیزیں تو ان کے ہاتھوں پر بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ یہ کوئی کمال نہیں ہوتا کہ کوئی آدمی آسمانوں میں اڑنے لگ جائے، پانی پر چلنے لگ جائے اور آگ پر چلنے لگ جائے، ایسا آدمی ولی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اتباعِ سنتِ رسول پاک ﷺ نہ ہو گی۔ اتباعِ سنت ہے تو پھر وہ ولی ہے، پھر ہمارا اس پر ایمان ہے۔ اس لیے حضرت لیث بن سعد رحمہ اللہ فرماتے تھے: اگر تم کسی کو دیکھو کہ پانی پر چل رہا ہے اور ہواؤں میں اڑ رہا ہے تو اس کو پہلے قرآن وسنت کے مطابق جانچو۔ اگر قرآن وسنت کے مطابق اترتا ہے تو ولی ہے اور اگر قرآن وسنت کے مطابق نہیں ہے تو ولی نہیں ہے۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۸، البقرۃ، الآیۃ: وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ]

تفسیر:

مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آیت کا ظاہر یہی ہے کہ سجدہ کرنے والے سب فرشتے تھے، کیونکہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝﴾

[الحجر: ۳۰، ۳۱]

خلیفہ بنانے کے بعد ظاہری عملی فضیلت ظاہر کی کہ ملائکہ کو سجدہ کروا دیا۔

[تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۸، البقرۃ، الآیۃ: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ]

نوٹ:

یہاں تک تفسیر انوار الحرم حضرت مولانا محمد مکی حجازی حفظہ اللہ کے سلسلہ دروس سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۳۴ کی تفسیر مکمل ہوئی۔ آگے جلد نمبر ۳ سے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۳۵ سے تفسری دروس شروع ہوں گے۔

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَ بِتَوْفِيْقِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ

امداد اللہ انور غفرلہ اللہ



تفسیرِ مکی

اس کائنات رنگ و بو میں تین اشیاء ایسی ہیں جو مخلوق کے قلوب کے لیے مقناطیس کی تاثیر رکھتی ہیں: بیت اللہ، کتاب اللہ اور اہل اللہ۔ اگر کسی جگہ پر ان تینوں کا اجتماع ہو تو مخلوق کے دلوں کا کھنچ آنا امر بدیہی ہے جس کا مشاہدہ مسجد الحرام میں بقیۃ السلف حضرت مولانا مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درس قرآن کے حلقہ میں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا مکی دامت برکاتہم العالیہ کے درس کا یہ حسن ہے کہ وہ جہاں توحید خداوندی کے رسوخ اور شرک و بدعت کی تردید پر زور دیتے ہیں، وہاں عشق رسول ﷺ اور سلف صالحین کی عقیدت و احترام پر حرف نہیں آنے دیتے، بلکہ اپنے اکابر کے طریق پر چلتے ہوئے جس کمال مہارت سے سامعین کو راہ اعتدال پر گامزن کرتے ہیں یہ انہی کے درس کا خاصہ ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس میں جہاں علمی نکات کی کثرت ہوتی ہے، وہیں عقائد کی درستی، فکر آخرت، اخلاص و تقویٰ، اخلاق حمیدہ اور سیرت و کردار کی بلندی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ زیر نظر تفسیر "انوار الحرم" المعروف "تفسیر مکی" حضرت اقدس دامت برکاتہم العالیہ کے دروس کا مجموعہ ہے۔

مکتبۃ الفقیر
223 ستیانہ روڈ فیصل آباد